مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ التوبہ

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ توبہ

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۂ توبہ)
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	نومبر 2016ء
مطبع	....	باقر یونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخرالزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۴۷ از۔ علامہ پرویزؒ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورة التوبة
مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۂ توبة (آیات 1 تا 16)

ہجرت کے بعد قریش مکہ کی طرف سے 7 سال تک مخالفت کی نوعیت اور توحید کا عملی مفہوم ____ 38

محسوس علامت کے طور پر کعبہ کا مقام اور اس کی اہمیت کی وجہ جواز ____ 38

کعبہ کے متعلق نبی اکرم کے دل میں پیدا ہونے والی شدت آرزو کے تحت دعا کی قبولیت کا مرحلہ ____ 39

پیش گوئی یعنی مستقبل کے متعلق غیب کے علم کی وضاحت کے سلسلہ میں انسان کی کیفیت ____ 40

2 ہجری کو جنگ بدر کے بعد 9 ہجری کو حج کے فریضہ کی نوعیت اور اس کا مقصد ____ 40

حج کا فریضہ تو اپنے اندر ایک عظیم فلسفہ لیے ہوئے ہے ____ 41

فتح مکہ کے بعد جب اسے مملکتِ اسلامیہ کا کیپٹل بنا دیا گیا تو 9 ہجری کو حج فرض ہوا ____ 41

حج اکبر کے عظیم اجتماع میں معاہدوں کا پاس نہ کرنے پر انہیں توڑ دینے کے اعلان کی بازگشت ____ 41

معاہدے توڑنے والوں سے آپ کا حسن سلوک اور مہلت کا وقفہ ____ 43

حضورؐ کی زندگی کے 21 سال اذیتیں برداشت کرتے ہوئے گزر گئے ____ 43

فتح مکہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کا پا بجولاں قیدیوں سے ایک سوال و جواب ____ 44

خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کا اعلان جسے اذان کہا جاتا ہے جسے ہم نے آج بانگ کہتے ہیں ____ 44

قرآن حکیم کے نزدیک لفظ حج اکبر کا مقام لیکن ہمارے ہاں اس کے متعلق پایا جانے والا تصور ____ 44

باہمی تعلقات کو توڑتے وقت بھی حسن کارانہ انداز اختیار کرنا ہوگا ____ 45

معاہدے نہ توڑنے والوں کے لیے استثناء کا پہلو ____ 45

قرآنِ حکیم نے معاہدات کی پاسداری کرنے والے غیر مسلم کو بھی متقی کہا ہے جب کہ اس چیز کے خلاف جانے والوں کے ساتھ جنگ کا حکم ہے ____ 46

امن کے ساتھ رہنے والے غیر مسلموں کے متعلق قرآن کے احکام ____ 47

غیروں کی مملکت میں قرآنی نظام حکومت چہ معنی ____ 47

اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ مملکت اسلامیہ کی دو بنیادی خصوصیات ہیں ____ 47

صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا بنیادی اور عملی مفہوم معاشرے کا ایک مربوط نظام ہے جو باہمی مشاورت سے عملی شکل اختیار ____ 48

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے نظام کو عملی شکل دینے کا طریقِ کار 48
اپنے ہاں کے مصلحین کا فتویٰ کہ اسلام شمشیر سے پھیلا تھا 49
جنگ کے دوران دشمن کے قیدیوں سے یا پناہ مانگنے والوں سے
حسن سلوک کرنے کا انداز 49
سورۃ بقرہ کی پہلی آیت کے لفظ للمتقین پر اُٹھنے والے
اعتراض کی وضاحت 51
جنیوا کنونشن کے سلسلہ میں ڈان کے ایڈیٹر مظہر علی خاں کی
طرف سے پیش کی جانے والی رپورٹ کی روداد 52
لفظ فاسق کا لغوی مفہوم 52
انڈر ٹیکنگ کے باوجود عملی طور پر انڈیا کے کردار کی ایک جھلک 52
قرآن حکیم میں وعدے کی اہمیت ۔ خدا خود پوچھے گا کہ تم نے
اسے پورا کیوں نہیں کیا 53
عام معاشرتی آداب کے متعلق اہم ہدایات 53
باہمی اختلافات کی بنا پر طعن وتشنیع سے کام نہ لو 54
عہد شکنی کی عادی قوموں پر کبھی اعتبار نہ کرو 54
انسان کے لیے خوف وحزن کی اصل وجہ خدا تعالیٰ کی طرف
سے عطا کردہ قانون کی نافرمانی ہوتی ہے 55
خوف کے سلسلہ میں خواجہ فرید الدین گنج شکر کا فرمان 55
خدا تعالیٰ کے رحیم وکریم ہونے کے باوجود بڑھنے والے
ظلم کے سلسلہ میں پیدا ہونے والا سوال اور اس کا حل 56
خدا ظلم کو ختم کرنے کی ذمہ داری میدان بدر میں انسانوں کے
ہاتھوں پوری کراتا ہے ایک اجر عظیم کے ساتھ 56
خدا کی طرف سے اس کی مدد اس کے قانون کی مدد کرنے سے
حاصل ہوتی ہے 57
قرآنِ حکیم نے نفسیاتی تبدیلی کو شفاء قلب سے تعبیر کیا ہے
جسے اطمینان اور یقین محکم کہا گیا ہے 57
توبہ کے لغوی معنی پلٹ جانے یا لوٹ آنے کے ہوتے ہیں 58
مایوسی تو انسان میں بغاوت کے جذبات پیدا کر دیتی ہے 58
انسانیت پر قرآن حکیم کا احسانِ عظیم یہ ہے کہ وہ اسے مایوس
نہیں ہونے دیتا بلکہ بڑی حکمت سے اس کی راہنمائی کرتا ہے 58
توبہ کے بعد ایک دوسری منزل یعنی جہدِ مسلسل کی نشاندہی 59
ایک ایسی صبر آزما زندگی کہ پاؤں کے نیچے زلزلہ آ جائے 59
توبہ کی قبولیت کے لیے اب کہیں زیادہ ہمواریاں پیدا
کرنی ہوں گی 60

دوسرا باب: **سورۂ توبة** (آیات 17 تا 28)

فتح مکہ کا اصل مقصد کشور کشائی کے بجائے احکامات خداوندی
کو عملی شکل میں متشکل کرنا تھا 62
خدا کو ماننے کے علاوہ لفظ شرک اور سیکولر سٹیٹ کا عملی مفہوم 62
آج ہمارے ہاں مذہب کی طرف سے پیش کردہ قانون
سازی کے فارمولے کی بنیاد اور پھر دنیا بھر کی قوموں
کے نزدیک ضوابط اخلاق کی نوعیت 62
توحید پرستی کے متعلق سورۃ توبہ کے شروع میں واضح تر آیات
کا مفہوم 63
مشرکین کو تو مساجد میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں 63
دین خداوندی کو دنیا سے الگ کرنے کا نتیجہ اور پھر دو قومی
نظریہ کی شدید بے حرمتی کا وہ عمل جو جاری وساری ہے 64
مشرکین کا کعبے کے قریب نہ آنے کا حقیقی مفہوم دین میں
دخل انداز ہونے کے ہیں 65
نبی اکرم ﷺ کے ساتھ قریش کی وجدل کی وجہ ان کے
اپنے معاشرتی نظام کا تحفظ تھا 65

اسلامی مملکت کے بنیادی اصولوں کے نفاذ کے لیے غیر مسلم
کی شرکت قرآن حکیم کے ہی منافی ہے ______ 66
قرآنی قوانین کے تابع ایک سنٹرل اتھارٹی امتِ واحدہ
کی تشکیل کا باعث بنتی ہے ______ 66
فرقہ بندی کا وجود مختلف فقہ کی بنیاد پر ہے ______ 67
فرقوں کی موجودگی میں نظام صلوٰۃ قائم ہی نہیں ہوسکتا
اور نہ ہی امت واحدہ کی تشکیل ہوسکتی ہے ______ 67
کوئی فرقہ بھی ہو اس کی آخری سند کسی انسان پر ہی
جا کر رکتی ہے ______ 67
آج تو کسی مسلمان کی تعریف فرقہ بندی کی نسبت کے
بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی ______ 68
فرقہ بندی کی بنیاد پر مدینہ منورہ میں تعمیر ہونے والی
مسجدِ ضرار کا ذکر ______ 68
قرآن حکیم کے متعلق مشرکین کا نبی اکرم ﷺ سے مطالبے
کے علاوہ ہماری صورت حال ______ 69
فرقہ بندی کا وجود قرآن حکیم کے خلاف ہی نہیں بلکہ خدا اور
اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اعلان جنگ ہے ______ 69
قرآن حکیم کے خلاف فرقہ بندی کے وجود کو نیک نیتی تو نہیں
کہا جا سکتا ______ 70
اذان کی آواز پر ہر فرقہ اپنی اپنی مساجد کی طرف چل پڑتا ہے 70
دنیا بھر میں ہر سطح پر مسلمانوں میں انتشار کی بنیادی وجہ
فرقہ واریت کا پیدا کردہ ذہنی اضطراب ہے ______ 71
نماز میں پیدا ہونے والا فرق صرف فروعات کا ہی نہیں بلکہ
اصول کا ہے جس کا نتیجہ تفریق بین المومنین ہے ______ 71
توحید خداوندی کی خاطر قائم ہونے والے مراکز میں مشرک
کا مقام ______ 72
اُن میں کوئی مشرک شریک ہی نہ ہو ______ 72
کیا کتاب وسنت کے تحت کوئی متفقہ علیہ آئین بن سکتا ہے؟ _ 72
آج کے اس غیر قرآنی معاشرے میں پیدا ہونے والے سوال
کے مطابق کیا فرقہ بندی اور مکاتب فکر میں کوئی فرق ہے؟ __ 73
فرقہ بندی کے خلاف کسی قسم کی بات کرنا بھی گوارہ نہیں کی جاتی 73
مذہب اور دین خداوندی میں ایک بنیادی فرق ہے ______ 73
مذہب دین کی بلندیوں کو چھو بھی نہیں سکتا ______ 74
مذہب کے چند ایک عقائد ورسومات نے دین کے چہرے کو
مسخ کر دیا ہے ______ 74
مذہب میں ثواب کے معنی صرف ثواب ہی ہوتا ہے جبکہ
قرآن حکیم نے فائزون کے الفاظ استعمال کیے ہیں ______ 75
خدا کا انسانوں سے راضی ہونے کا حقیقی مفہوم قوانین
خداوندی سے ہم آہنگی کا ہے ______ 75
انسانی زندگی میں ہجرت کا مفہوم صرف کسی مقام کو چھوڑنے
کے ہی نہیں ہیں ______ 76
ہجرت کے ایمان اور اسلام کے معیار کو ملحوظ خاطر رکھنے کی اہمیت 76
قرآن حکیم کے الفاظ میں اَحَبَّ الیکم کا مقام اور دنیائے تصوف 77
لفظ فسق کا مفہوم یعنی وہ پھل جو اپنے پیٹرن سے باہر نکل جائے 78
عرب قبائل میں بنی ثقیف کی ثقافت کافی مشہور تھی، ہمارے
ہاں یہ ثقافت کئی رنگوں میں بدل گئی ______ 78
ہماری رنگ برنگی ثقافت ______ 78
میدانِ بدر میں نبی اکرم e کی اپنی حامل صفات شخصیت کا کردار 79
میدان جنگ میں خدا کی طرف سے مدد کے حصول کی نوعیت
اور اس کا طریق ______ 79

زندگی کے میدان میں اگر سکون قلب میسر نہ ہو تو پھر افرادی
قوت بھی کوئی تعمیری نتیجہ پیدا پیش نہیں کرتی ________ 80
قوانین خداوندی پر یقین محکم کے سہارے سکون قلب کا
پیدا ہونا ہی تو ملائکہ کا نزول ہے جو نظر نہیں آتے ________ 80
توبہ کی اس قبولیت کے بعد پھر مشرکین کا تذکرہ اور لفظ نجس
یا نجاست کا قرآنی اور لغوی مفہوم ________ 81
قرآن حکیم نے شرک کو نجس کے مفہوم میں بھی پیش کیا ہے،
نجاست تو کہتے ہی گدلے پن کو ہیں ________ 81
قوانین خداوندی کے ساتھ انسانوں کے بنائے ہوئے
قوانین کو شامل کرنا شرک ہے ________ 82
کسی مشرک کی غیر موجودگی کے باعث اقتصادی لحاظ سے
کسی قسم کا نقصان ہو جانے کا تصور غلط ہوگا ________ 82
فتح ایران کے بعد حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاصل ہونے
والے مال غنیمت کی نوعیت اور وہاں کے تاثرات ________ 83
مال غنیمت کی موجودگی میں صحابہ کبار کے کردار پر
حضرت عمر فاروق کی نفسیاتی کیفیت ________ 84
1947ء میں تقسیم کے دوران ہمارے ہاں مالِ غنیمت
کو حاصل کرنے کی نوعیت ________ 84

تیسرا باب: **سورۂ توبة** (آیات 29 تا 31)

سورۃ الانفال اور سورۂ توبہ میں جنگ ہو یا امن ہر دور کے
لیے ابدی اصولوں کی مکمل نشاندہی کر دی گئی ہے ________ 85
ہر وہ مظلوم جس پر کوئی دوسرا ظلم کر رہا ہو اس کی حفاظت کرنا
قرآنی حکومت کا فریضہ ہے ________ 86
دوسرے مذاہب کی آزادی کو تحفظ فراہم کرنا تو اسلامی
مملکت کا فریضہ ہے ________ 86
قرآن حکیم کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے
تلوار سے دوسروں کو ہم خیال بنانا تو بذات خود ظلم ہے ہمارے
ہاں کے تراجم اور تفاسیر کی پھیلائی ہوئی گمراہی کا نتیجہ
نیز جزیہ وصول کرنے کی نوعیت ________ 87
قرآن حکیم کا دعویٰ کہ اس میں ایک بات بھی اختلافی
یا متضاد نہیں ________ 88
قرآنِ حکیم کے نزدیک مشرکین کے ساتھ ہونے والے
سلوک کی وضاحت ________ 88
مکہ کے مشرکین کی طرف سے مخالفت کی وجہ نظام کی مخالفت تھی 88
ایران اور بازنطینی مملکتوں کے نظام زندگی کی کیفیت اور
نبی اکرم ﷺ کی طرف سے قیصر و کسریٰ اور مقوقس کو لکھے
جانے والے خطوط کا نتیجہ ________ 89
ہمسایہ حکومتوں پر مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی
قرآنی حکومت کے اثرات ________ 90
ایران، بازنطین امپائر، شام اور عراق، مصر اور فلسطین وغیرہ کو
تسخیر کرنے کی بنیادی وجہ قرآن حکیم کا نظام تھا ________ 91
قرآن حکیم کی رو سے دوسروں کے مذہب کی حفاظت
تو فریضہ ہے ________ 91
یروشلم کے بعد یہودیوں کی اپنی کوئی مملکت نہ تھی جبکہ نسل
پرستی کی بنیاد پر مالی نظام پر ان کا ہمیشہ قبضہ رہا ________ 92
مدینے سے نکالے گئے یہودی، بازنطینی امپائر اور ایرانی امپائر
کی، مملکت اسلامیہ کے خلاف سازشوں کا جال اور ہماری
اپنی تاریخ ________ 92
ہمارے ہاں کے مروجہ غلط تراجم اور تفاسیر سے پیدا ہونے
والا تاثر ________ 93

تصورات Concepts پیش کرتا ہے ______ 94
اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا اور آخرت کو ماننا کوئی
معنی نہیں رکھتا ______ 94
قرآن حکیم کی ہر آیت باہمی ربط پر مبنی حقائق کو اپنے
اندر لیے ہوئے ہے ______ 95
خدا تعالیٰ کے متعلق انسان کا محدود ذہن اس لامحدود ہستی کا
صحیح ادراک کر ہی نہیں سکتا ______ 95
قرآن حکیم کے علاوہ آج کوئی آسمانی کتاب ایسی نہیں جس
میں خدا کا صحیح تصور پیش کیا گیا ہو ______ 95
آخرت کی زندگی کے متعلق عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف
سے پیش کردہ عجیب وغریب تصور اور اس کے برعکس اصل
حقائق کی وضاحت ______ 96
خدا تعالیٰ کے متعلق عقل انسانی کا خود ساختہ تصور وحی کے
عطا کردہ تصور سے بالکل مختلف ہے ______ 97
اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق اور ان کی ذمہ داری ______ 97
ہمارے ہاں زکوٰۃ کا مفہوم اور اس کو ادا کرنے کا طریق ______ 98
حضرت ابوبکر کے دور میں کفار نے مملکت کے Dues دینے
سے انکار کر دیا تھا ______ 98
مملکت کے اندر سرکشی کرنے والے اگر خود کو سرنڈر کر دیں
تو ان کی حفاظت مملکت پر فرض ہے ______ 99
کسی ذمی کو مملکت اسلامیہ کی فوج میں بھرتی نہیں کیا جا سکتا ______ 99
جزیہ کے بارے ہماری پیدا کردہ سوچ غیر قرآنی ہے ______ 101
یہودیوں کے نزدیک عزیز جو کچھ بھی تھے وہ اسے خدا کا بیٹا
تصور کرتے ہیں ______ 101
مختصر الفاظ میں یہودیوں کی سرگزشت اور اولڈ ٹسٹامنٹ کا ذکر 101
تورات کے مدون ہونے کی روئداد ______ 102
عزیز نامی مصریوں کے ہاں ایک دیوتا کا نام تھا جسے وہ خدا
کا بیٹا تصور کرتے تھے ______ 102
عیسائیوں کے نزدیک مسیح کو خدا کا بیٹا مانا جاتا ہے ______ 103
قلب ودماغ کی بجائے صرف زبان سے کہی ہوئی باتوں
میں فرق کی نوعیت ہے حضرت مسیحؑ کے سلسلہ میں عیسائیت
عقیدے کی وضاحت ______ 103
مجوسیت میں مشرا کے عقیدے کی وضاحت کے علاوہ
قربِ قیامت ان کا آسمانوں سے زمین پر آنے کا
تصور اور اس ہنگامہ آرائی پر تبصرہ ______ 104
اس قسم کے باطل عقائد کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ______ 104
قرآن حکیم نے صاحبانِ شریعت ارباب طریقت کی طرف
سے پیش کردہ نظریہ حیات کی حالت زار پر تنقید کی ہے ______ 105
قرآن حکیم کے نزدیک نظریاتی لحاظ سے ذہنوں کی آبیاری
سب سے زیادہ مقدم عمل ہے ______ 105
قرآنی تعلیم کے برعکس ارباب شریعت اور طریقت کی جانب
سے پائے جانے والے اختلاف کی وضاحت ______ 106
کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان چیزوں کو حرام دے
جن کو قرآن حکیم نے حلال قرار دیا ہے ______ 106
رسول ﷺ کی شخصیت کا خلاف طبع کسی شے کے استعمال نہ
کرنے پر انسانی آزادی کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی راہنمائی 107
وحی کی وارننگ کے باوجود خود ساختہ حرام اور حلال کی فہرستوں
کی جرأت کیوں ______ 107
ایک مملکت میں دو مختلف قسم کی متضاد Authorities
کا وجود شرک ہے ______ 108

عبادت کا قرآنی مفہوم کوئی پوجا پاٹ نہیں بلکہ اس کے معنی خدا کا حکم ماننے کے ہیں _______ 109

چوتھا باب: **سورۂ توبة** (آیات 32 تا 35)

عرب قبائل کی طرف سے انقلاب نو کی مخالفت کی اصل وجہ نظام کہن کا تحفظ تھا _______ 110

مدنی قبائل کے علاوہ بازنطینی حکومت کی طرف سے مخالفت ___ 111

وحی کا چراغ مٹی کے دیئے کی مانند پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا 111

ظلمات کے مقابلے میں قرآن حکیم کو کتاب نور کہا گیا ہے ___ 111

اس کتاب نور کو نازل کرنے اور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد 112

روشنی کے مقابلے میں توہم پرستی کی کیفیت _______ 112

حضرت موسیٰ کو قوم موسیٰ کی طرف بھیجنے کا مقصد اور قرآنی حقائق کو بیان کرنے کا انداز _______ 113

تاریکیوں میں سے تین بڑی تاریکیوں کا ذکر اور ان کی وضاحت 113

حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کے گلے سے تین طوق اتروا کر اسے آزادی سے ہم کنار کیا _______ 113

نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرامؓ کا یہودیوں کے سرمایہ داری نظام اور عیسائیت کے احبار و رہبان سے مقابلہ تھا ___ 114

انسانی دنیا میں مذہب کی حفاظت اور قرآن حکیم کی مخالفت ہمیشہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوتی ہے _______ 114

قرآنی نظام حیات کی مخالفت کے سلسلہ میں ایک گہری سازش کا آغاز مثلہ ومعہ کا تصور اور اس کی حقیقت _______ 115

مروجہ اسلام جو قرآن حکیم کے خلاف ہے صدیوں سے ہم پر مسلط ہے _______ 115

خدا تعالیٰ کی ذات کو نور سے تشبیہ دینے کا تصور غلط ہے نور السمٰوٰت والارض کے الفاظ وحی کے متعلق ہیں _______ 116

دنیا بھر میں تمام مسلمانوں کی ذلت اور رسوائی کی وجہ جواز ہمارا خود ساختہ مذہب ہے، دینِ خداوندی نہیں _______ 116

مذہبی ماحول میں پرورش پانے والی شخصیت پرویز کی اوائل عمری کے بعد کے دور کی کہانی خود ان کی اپنی زبانی _______ 117

مختلف نظریات سے بھرپور پورے جوش و جذبے کے ساتھ مناظروں کے شور و شغب کے اجتماعات کی شکل و صورت ___ 118

مذہب اور دین میں پائے جانے والے فرق کو نمایاں کرنے کی سعادت علامہ پرویزؒ کو حاصل ہوئی _______ 118

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ مسلمان قرآنی اسلام کے ترازو میں پورے اترتے ہیں _______ 119

مروجہ خود ساختہ اسلام کی اصلیت کو سمجھنے اور تسلیم کیے بغیر قرآنی تعلیم ذہن نشین ہو ہی نہیں سکتی _______ 119

زندگی کے میدان میں خود ساختہ مذہبی اقدار اور وحی کی عطا کردہ اقدار میں بنیادی فرق ہے _______ 120

انسانی اقدار کے سلسلہ میں صدیوں سے عقلِ انسانی کا طریق اور اس کا ماحصل _______ 120

ارشادِ خداوندی کے مطابق کسی انسان کو انسانوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے _______ 120

معاملات زندگی کے حل کے لیے باہمی مشاورت قرآن حکیم کا بنیادی اصول _______ 121

بازنطین حکومت کی طرف سے اس مشاورتی نظام کی مخالفت، بادشاہی نظام کا تحفظ ہی تو تھا _______ 121

وحی کے مقابلے میں عقل انسانی کا دوسرا نام تجربہ گاہ ہے ___ 121

عقل و فکر سے کام نہ لینے والی قوم دین خداوندی کو اپنانے میں سب سے پیچھے ہوتی ہے _______ 122

عقل وفکر کو خیر باد کہنے کے بعد مقلدین کے سہارے زندگی
بسر کرنے والی قوم ہمیشہ چشم شاہین سے محروم رہتی ہے _____ 122
عالم میں جمہوریت کے باوجود ان میں باہمی ٹکراؤ کی بنیادی وجہ
وحی کے غیر متبدل اصولوں سے بے اعتنائی ہے _______ 123
آج عقل انسانی انہی حدود اللہ کی تلاش میں سرگرداں ہے ___ 123
نزول قرآن کے وقت دنیائے اقوام کی حالتِ زار _____ 123
1973ء میں مرکزی مجلس آئین ساز کے اجلاس میں
مولانا نعمت اللہ نے کہا کہ غلامی کو منسوخ قرار دینا کتاب
وسنت کے خلاف ہے ____________ 124
مولانا نعمت اللہ کی طرف سے ایک ایک لونڈی رکھنے کی
اجازت بھی طلب کی گئی ____________ 125
14 سو سال پہلے نظام سرمایہ داری کے خلاف قرآن
حکیم کی آواز ________________ 125
مسلم ممالک کی طرف سے سرمایہ داری نظام کے خلاف اُٹھنے
والی آواز کی مخالفت ____________ 126
زمین پر حق ملکیت' خدا کا شریک بنانے کے مترادف ہے
جب کہ عقلِ انسانی وحی کے معیار پر پوری اتر ہی نہیں سکتی ___ 126
ہندو قوم کے اندر ذاتوں اور گوتوں کی تمیز تو ختم ہوگئی لیکن
مسلمانوں کے ہاں پنجابی سندھی بلوچی بنگالی کا غیر قرآنی
تصور بدرجہا اُتم باقی ہے ____________ 127
افسوس کہ ہم تحریک پاکستان کے ثمرات سے لطف اندوز
ہونے کے لیئے خود کو چار قوموں میں تقسیم نہ کرتے _____ 127
یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ ملوکیت کا نخلِ تمنا' مذہبی پیشوائیت
کی آبیاری کا رہن منت ہوتا ہے ________ 128
ملوکیت خواہ بادشاہت کی شکل میں یا بے لگام مغربی جمہوریت
کی شکل میں' اس کی نظر ہمیشہ غیر کی کھیتی پر ہی ہوتی ہے _____ 128
نظام سرمایہ داری کا ماحصل صرف ایک آیت میں _______ 129
نظامِ سرمایہ داری ایک عذاب ہے ___________ 129
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے راستے میں حائل ہونے
والے کون ہیں؟ ________________ 130
ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے کی ترغیب انسان کو
ننانوے کے پھیر میں الجھائے رکھتی ہے _________ 130
غیر قرآنی سوچ کے ہاتھوں انسانی زندگی ہمیشہ اذیت ناک
میں مبتلا رہتی ہے _______________ 130
زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے والوں کے برعکس ان میں
گریز کی راہیں نکالنے والوں کا ذکر ___________ 131
مال جمع کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی ایک آیت
کے نازل ہونے پر بخاری کی ایک وضعی روایت _______ 132
نبی اکرم ﷺ کی زندگی جونوع انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ تھی
ان ﷺ کی زندگی کی آخری جھلک ___________ 133
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ نظام کے متعلق اس
کا اپنا دعوٰی ___________________ 134
قرآن حکیم کے نظام کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا _____ 135

پانچواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 36 تا 41)

مختصر طور پر سابقہ درس کی یاد دہانی ___________ 136
تین ماہ کے لیے جنگ بندی کو ممنوع قرار دینا بین الاقوامی سطح
پر ہی ممکن ہے ________________ 138
سورج اور چاند کے کیلنڈر میں پائے جانے والے فرق کی نوعیت 138
چاند کے برعکس سورج کے مطابق بنائے گئے کیلنڈر میں
آسانی کا ذکر ________________ 139

چاند کے کیلنڈر میں لوند کے مہینے کا تذکرہ ____ 139

جنگ وجدل سے باز رکھنے کے طریق کے خلاف مہنتوں کی طرف سے ایک مصلحت آمیز چال کی وضاحت ____ 140

ہندوؤں میں شادی کے لیے تاریخ کا تعین برہمنوں کے رحم وکرم پر تھا ____ 141

چاند کے مطابق کیلنڈر رکھنے کی بنیادی وجہ صحرا نورد قوم کی تمدنی اور معاشرتی زندگی تھی ____ 142

انگریزی دور میں وقت کے اندر تغیر وتبدل پر ہمارے ہاں کے مذہبی تصورات ____ 142

قرآنی حقائق کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں ہماری سوچ کا معیار 143

زیرِ نظر درس کے لیے اتنی زیادہ تمہید کی ضرورت کیوں؟ ____ 144

دینِ خداوندی کا آدھا حصہ انسان کی تمدنی زندگی کے متعلق ہے جب کہ اس کا آدھا حصہ قوانینِ فطرت کے متعلق ہے ____ 145

سرسید کی مخالفت کرتے ہوئے مذہبی پیشوائیت نے اسے نیچری کہتے ہوئے کافر جانا مرتد جانا اور اسے بے دین جانا ____ 145

صحیفہ کائنات اور صحیفہ قرآنی کے مجموعے کا نام دینِ فطرت ہے اور اس سے انکار کا نتیجہ جہنم ____ 145

آج یورپ کی خستہ حالی اور پھر ہماری اپنی تباہی دین فطرت سے بغاوت کا نتیجہ ہے ____ 146

جو قوم بھی صحیفہ فطرت کا مطالعہ نہیں کرتی وہ ہمیشہ تباہ ہو جاتی ہے 146

قرآنِ حکیم نے کائنات کے فطرتی قوانین اور انسانی زندگی کے تمدنی معاشی سیاسی اور عائلی قوانین کے غیر متبدل اصولوں کو الدین القیم کہا ہے ____ 147

ہمارے ہاں الدین القیم کی شکل وصورت کو ہی مسخ کر دیا گیا _ 147

قرآن حکیم کے نزدیک جنگ کرنے کا بنیادی مقصد ____ 148

لفظ متقین کا مفہوم ____ 148

عید کے چاند پر سال ہا سال سے سر پھٹول ہونے کی بنیادی وجہ اور اس کا علاج ____ 149

مفاد پرستی کے پیش نظر مذہبی پیشوائیت کے پروگرام کی اس نوعیت کو کفر کہا گیا ہے ____ 149

ہر سال عید کے چاند پر مذہبی پیشوائیت کا کردار قوم کے شیرازے کو پارہ پارہ کرنے کے مترادف ہے ____ 150

چاند دیکھنے والے فوجی وفد پر اُٹھایا جانے والا اعتراض اور پھر اس کا حل ____ 150

مکے میں گھرے ہوئے صحابہ کرامؓ کی مشکلات اور قرآن حکیم کی طرف سے اس کا حل ____ 150

مفادِ عاجلہ کے مقابلے میں جہانِ فردا کے مفادات کی اہمیت _ 151

الم انگیز سزا کی نوعیت تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی ____ 151

بنگلہ دیش میں محبوس پاکستانیوں کی حالت زار اور اس کا علاج ___ 152

عقاب اپنے پنجے میں لی ہوئی چڑیا کب چھوڑتا ہے ____ 153

ظالم قوم کے استبداد سے بچنے کا طریق نظام سرمایہ داری کی جگہ نظام ربوبیت کو اپنانے میں ہے ____ 153

قوموں کے جرائم کو تولنے کا ترازو اور اس سے بچنے کا طریق _ 154

جنگِ بدر کے صرف ڈیڑھ سال کے بعد مسلمانوں کی تمدنی زندگی کا سابقہ دور کے ساتھ موازنہ ____ 154

ہجرت کے دوران نبی اکرم ﷺ کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حزن کی کیفیت ____ 155

لفظ حزن کی محسوس شکل کے لیے ایک زندہ مثال ____ 155

حساس ترین حالات کے اندر بھی مقام نبوت کی طرف سے یقین محکم کا اظہار استقامت، یہ مقام عظمت کا اظہار ہے ____ 155

قیام پاکستان کے وقت ہماری عسکری اور مالی ناگفتہ بہ حالت _ 156
جنگ بدر میں غیبی مدد کی وہ نوعیت جیسے انسان دیکھ نہیں سکتا ___ 156
کلمہ تو انسانی زندگی کے حقائق کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنے
کا نام ہے ____ 156
دنیا بھر میں انسانی زندگی کے خود ساختہ نظام حیات پر
فتح حاصل کرنے کے لیے خدا کے کلمے کو بلند کرنا ہوگا ____ 157
خدا کے کلمے کی دو بنیادی خصوصیات وہ عزیز بھی ہے
اور حکیم بھی ہے ____ 157
قوانین قرآنی پر یقین محکم اور جہاں فرد اپر ایمان نصرتِ خداوندی
کے حصول کا ذریعہ ہیں ____ 158
جسم و جاں کا فرق موت و حیات کے فرق کو واضح کر دیتا ہے
جس سے نہ خوف باقی رہتا ہے، نہ ہی حزن ____ 158
حیات بے شرف اور حیات مرگِ با شرف کے لوازمات
اور مقامات میں ایک بنیادی فرق ہے ____ 158
جہاد کے خلاف سطح ہموار کرنے کی خاطر انگریز کی سازش اور
سید احمدؒ بریلوی اور مولانا اسماعیلؒ شہید کی سعی و کاوش کا ذکر ___ 159
آہمسہ کی آواز کو بلند کرنے کی خاطر گاندھی کی طرف سے
شعبہ تعلیم کا سہارا ____ 159
امت مسلمہ کا ہر فرد ٹکنیکی طور پر مجاہدانہ صفات کا حامل
ہونا چاہیے ____ 160

چھٹا باب: سورۂ توبة (آیات 42 تا 51)

جہاد کی اہمیت کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کی بشری حیثیت سے
آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی وضاحت ____ 161
جہاد ایک ایسا عظیم ترین احسنِ عمل ہے کہ جس سے
پہلوتہی کا نتیجہ جہنم بتایا گیا ہے ____ 161
جہاد فی سبیل اللہ ایک ایسی جست ہے جس سے انسان اپنی
ہر منزل کو باآسانی عبور کر لیتا ہے ____ 162
صدرِ اول میں جماعت مومنین کا تو ہر فرد مجاہدانہ صلاحیتوں
کا حامل تھا ____ 162
جہاد کے تصور سے دوری اور نظام سرمایہ داری کا نتیجہ
صرف جہنم ہے ____ 163
خوف و حزن کے اس جہنمی نظام سے بچنے کا طریق ____ 163
وحی کی طرف سے پیش کردہ جنگی جذبہ محرکہ ____ 163
غیر قرآنی معاشرے میں انسانی زندگی انسانیت کے
ثمرات سے محروم ہو جاتی ہے ____ 164
نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے بعد جماعت مومنین کے
اندر مختلف غیر مہذب قبائل کی شمولیت کا نتیجہ ____ 164
ایمان کی ناپختگی کے باعث جماعت مومنین میں شامل
ہونے والی اخلاقی پسماندگی کا ذکر ____ 165
میدانِ جنگ سے کنارہ کشی اختیار کرنے والوں کی
ہلاکت کی شکل و صورت ____ 165
کذب کا بنیادی مفہوم اور پھر منافقت کو ظاہر کیے بغیر
نبی اکرم ﷺ سے جہاد میں شامل نہ ہونے کے لیے
اجازت کا ماجرا ____ 166
وحی کی دو قسموں کے تصور کی وضاحت ____ 167
نبی اکرم ﷺ کے بارے میں مروجہ عقائد کا جائزہ
قرآن حکیم کی روشنی میں ____ 167
کہی ہوئی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے مختلف تاویلوں
کے برعکس وحی کی حقیقت، رسول اکرم ﷺ کی عظمت اور
فریضۂ نبوت کی عظمت ____ 168

نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس کا بطور بشر اسوۂ حسنہ ______ 168
قرآن حکیم کے متعلق فرقہ اہل قرآن کی سوچ اور
اہل حدیث میں فرق کی نوعیت ______ 169
نبی اکرم ﷺ کی طرف سے جہان نو کی نمود کے سلسلہ میں
سعی کاوش کا ذکر ______ 170
فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ کا مخالفین کے ساتھ کیے گئے
حسنِ سلوک کی ایک روشن مثال ______ 171
نبی اکرم ﷺ کی ذات سے علامہ پرویزؒ کی اس قدر عقیدت
کے باوجود ان پر کفر کے فتوی چہ معنی ______ 172
تخلیق آدم کے متعلق فرشتوں کے اعتراض پر خدا کا جواب
جو بڑا معنی خیز ہے ______ 172
قصہ آدم کے تمثیلی تعارف کے بعد نبی اکرم ﷺ کے
فریضہ حیات کی تکمیل کے متعلق آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا ذکر ______ 173
آسمانوں سے ماموِر من اللہ کے آنے کا تصور جو حقیقت
پر مبنی نہیں ______ 174
کیا بشری حیثیت سے نبی اکرم ﷺ کے کسی قول، کسی عمل
یا کسی قدم میں کوئی تدبیری غلطی ہونے کا امکان نہ تھا؟ ______ 175
نبی اکرمؐ کے لیے منافقین کے فیصلے کرنا بڑا مشکل مرحلہ تھا
جسے آپ نے اپنی فراست سے ہی حل کرنا تھا ______ 175
آپ ﷺ کی زندگی میں ہی تمام خبیث الگ ہو گئے تھے ______ 175
انسانی زندگی کا ایک اور پہلو جہانِ فردا کا تصور اور ایمان ______ 176
حصولِ رزق کے لیے نظامِ ربوبیت مومن کو تو غم زدہ ہونے
ہی نہیں دیتا ______ 176
نظامِ ربوبیت کی عملی شکل انسانوں کے ہاتھوں ہی
پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے ______ 177
لفظ ''ریب'' اور ''شک'' میں فرق کی نوعیت ______ 178
منافق کی پہچان اس کی اپنی غداریوں سے ظاہر ہو جاتی ہے ______ 178
ہمارے ہاں کے تراجم کی پیدا کردہ غلط سوچ کا نتیجہ ______ 179
علامہ پرویزؒ کی طرف سے پیش کردہ تصنیف کتاب التقدیر
شائع کردہ طلوع اسلام ٹرسٹ، گلبرگ لاہور ______ 179
لفظ اُمّم کا قرآنی مفہوم یعنی کسی کی بات کو اپنے لیے نہیں بلکہ
دوسروں کے لیے سننا مقصود ہو ______ 179
نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں قدم قدم پر پیدا کردہ مشکلات
کی نوعیت اور اس کا نتیجہ ______ 180
جنت اور جہنم تو انسان کے ایک ایک نس کو گھیرے میں
لیے ہوئے ہے ______ 180
زندگی کے حالات کو بدلنے کے لیے اپنے تصورات کو بدلنا ہوگا 181
غلط تراجم کی بھرمار نے قرآنی حقائق کو مسخ کر رکھا ہے ______ 182
قرآن حکیم درحقیقت قانون فطرت کی ترجمانی کا ہی
دوسرا نام ہے ______ 182

ساتواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 52 تا 59)

قرآن حکیم فلسفۂ تاریخ اور غیر متبدل اصول وقوانین کی کتاب 183
قرآن حکیم کے آئینہ میں ہماری موجودہ حالت ______ 184
منافق کے مقابل میدان جنگ میں مومن کے کردار کی بلند فکری 185
بدنیتی سے خرچ کیا ہوا مال قابل قبول نہیں ہوگا ______ 186
مال ودولت کے سلسلہ میں حاکم وقت کے لیے
حضرت عمر فاروقؓ کا قولِ زریں ______ 187
جہنم میں پست ترین مقام منافق کے لیے ہوگا ______ 188
دین میں ثواب کا وہ مفہوم جو آپ کے ہاں اہمیت کا حامل ہے 188
مذہب کی دنیا میں کوئی بات بھی مفہوم کے اعتبار سے واضح

نہیں ہوتی جب کہ دین میں ایسا نہیں ہوتا ________ 189
مذہبی دنیا ہمیشہ نظری تصورات اور عقائد میں الجھی رہتی ہے __ 189
دراصل دین و دنیا میں کامیابی کے لیے ایمان اور
اعمال صالحہ کے نتیجے کو ہی ثواب کہا گیا ہے ________ 190
قدم قدم پر رسوائی محکومی اور مسکینی ثواب نہ ہونے کا
بین ثبوت ہے ________________ 190
ثواب حاصل کرنے کا قرآنی فارمولہ اوراس کی اہمیت _____ 191
قرآن حکیم کے نزدیک کسی بات کو سمجھانے کا طریق قلب
اورزبان کی رفاقت پر مبنی ہے ____________ 191
قرآن حکیم میں جو الفاظ جہاں جہاں استعمال ہوئے وہاں
عربی کا دوسرا لفظ مناسب ہی نہیں ہوسکتا__________ 192
بڑی بڑی تفسیروں کے علاوہ جلالین کی تفسیر میں جگہ جگہ
مرادفات کی کمی کا سوال ____________ 192
قرآن حکیم تو اپنے مفہوم کو بیان کرنے میں ایک پرسنٹ کے
ہزارویں حصے کی کمی بھی محسوس نہیں ہونے دیتا________ 192
فکر قرآنی کے ایک حصے کو تسلیم کرنے اور دوسرے سے انکار
کرنے کا نتیجہ شدید عذاب کی شکل لیے ہوتا ہے_______ 193
دین کو جھٹلانے والے نمازیوں کے متعلق ارشاد خداوندی ____ 193
صلوٰۃ کے مقصد کو صرف چند ایک جزئیات تک محدود کرنے
والوں کا تذکرہ اور اس کا نتیجہ ____________ 194
قرآنِ حکیم کے نزدیک دل اور دماغ کی ہم آہنگی کے بغیر کوئی
عمل قابلِ قبول نہیں ہوتا _____________ 195
ہماری تباہی و بربادی ذلت و رسوائی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ
ہم نے قرآنی فلسفہ حیات کو قصوں اور کہانوں سے زیادہ
اہمیت نہیں دی________________ 195
مذہبی تصورات میں الجھی ہوئی قوم کی ذہنی پسماندگی اور
اس کا نتیجہ ______________________ 196
جو قوم تانت کو الگ اور کمان کو الگ رکھے وہ عزت وتکریم
کی کبھی حامل نہیں ہوسکتی ________________ 196
غیر قانونی طور پر دولت کی فراوانی ہو یا افرادی قوت کا ہجوم
دونوں سکون قلب مہیا نہیں کر سکتے ___________ 197
امروز و فردا زندگی کے غیر متبدل اصولوں سے لاتعلقی
کا نتیجہ اور لفظ یَحْلِفُوْنَ کا لغوی اور قرآنی مفہوم _______ 197
انسانیت کے سب سے بڑے دشمن کی پہچان ان کا اپنا
مقرر کردہ یفرقون کا ترجمان ہوتا ہے ___________ 198
منافقانہ سوچ کے حامل اشخاص کو شریکِ محفل بنائے رکھنے
کا نتیجہ نیز ان منافقین کی ذہنیت کی عکاسی _________ 198
قرآن حکیم کی طرف سے جماعت مومنین کو افتراق سے
بچنے کے لیے واضح اور دوٹوک ہدایات ___________ 199
جماعت مومنین کا دوسروں کے متعلق وہ پہلا ری ایکشن
حسن ظن ہی ہونا چاہیے _________________ 200
آج ہمارے معاشرے کی حالت یہ ہے کہ کوئی خارجی
معیار ہی باقی نہیں رہا___________________ 200
قرآنی معاشرے میں مومن کا انداز زیست اور انا للہ وانا
الیہ راجعون کے الفاظ جو ایک انقلابی پروگرام کے ترجمان ہیں 201
مومن کا ہر اُٹھنے والا قدم نئی منزل کی نشان دہی کے لیے ہے _ 202
مومن کی جان و مال اور زندگی کا ایک ایک لمحہ ملت اسلامیہ
کے لیے وقف ہوتا ہے ________________ 203

آٹھواں باب: **سورۂ توبة** (آیت 60)

اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا بنیادی مفہوم

قرآن حکیم کے آئینہ میں ____ 205

تمکن حاصل ہونے کے بعد جماعتِ مومنین کے لیے اسلامی مملکت کا پہلا فریضہ ____ 206

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے مروجہ مفہوم کے تحت کسی تمکن کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ____ 206

استخلاف فی الارض کے بعد مملکت زکوٰۃ لوگوں سے وصول نہیں کرتی بلکہ لوگوں کو زکوٰۃ دیتی ہے ____ 207

زکوٰۃ کا مفہوم بطورِ چیریٹی خیرات یا دان قرآن حکیم کے نزدیک انسانیت کی تذلیل ہے ____ 207

روحانی تصورحیات کے لیے تمکن فی الارض چہ معنی؟ ____ 208

امر بالمعروف نہی عن المنکر کے قرآنی حکیم کو ہم نے مساجد میں وعظ کہنے کی شکل میں بدل رکھا ہے ____ 208

قرآنی الفاظ کے معنی عربی مبین سے متعین کرنے ہوں گے جس میں زکوٰۃ کے معنی نشوونما کے ہیں ____ 209

دنیا کی حکومتوں کے برعکس قرآنی حکومت کا فریضہ اور اس کا طریق ____ 209

قرآنی حکومت صرف طبعی ضروریات کی فراہمی تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذمہ تو انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرنا بھی ہے 210

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے تصریفِ آیات کے فارمولے کو پیشِ نظر رکھنا لازم ہے ____ 210

ہمارے ہاں نہ تو حضورﷺ کی تاریخ وفات ہی یقینی طور پر متعین ہے اور نہ ہی قرآنی آیات کے نزول کا کوئی حتمی مہینہ _ 210

ہجرت سے پہلے مکے میں جماعت مومنین کو جن جن حالات سے نمرد آزما ہونا پڑا، اس کا ذکر ____ 211

مملکتِ اسلامیہ کے پہلے دور میں صدقات کی کیفیت اور آیاتِ قرآنی کی ترتیب کے معاملے کی وضاحت ____ 211

انسانی معاشرے میں استحصالی نظام کی بنیاد مال و دولت کی کشش ہوتی ہے ____ 212

ذاتِ انسانی کی نشوونما کا دارومدار بطیّب خاطر دوسروں کی ضرورت کو پورا کرنے میں ہے ____ 213

دوسروں کی دل جوئی ہمیشہ کشادِ قلب کا باعث بنتی ہے۔ نبی اکرمﷺ کے متعلق خداتعالیٰ کی طرف سے تحسین بھرے الفاظ 213

خداتعالیٰ اور جماعتِ مومنین کے مابین معاہدہ ترتیب پانے کا ذکر ____ 214

فکرِ قرآنی کی روشنی میں رزق کے الفاظ جسمانی پرورش کے لیے استعمال کیے گئے ہیں، جب کہ انسانی ذات کے لیے نشوونما کے الفاظ آئے ہیں ____ 215

ذات انسانی کی نشوونما کے لیے نسخۂ کیمیا کی آخری سٹیج (قل العفو) ہے ____ 215

مال جمع کرنے کے معاملہ میں ایک وضعی حدیث کا سہارا جو قابل صد افسوس ہے ____ 216

قرآنِ حکیم کی روشنی میں اقامو الصلوٰۃ کی نوعیت اور ہماری تاریخی روایات کا ذکر ____ 217

مال و دولت کے سلسلہ میں حکم خداوندی اور نبی اکرم کی طرف سے پیش کردہ تفسیر میں باہمی تضاد ____ 217

جمع شدہ مال کو پاک کرنے کے سلسلہ میں کتاب الحیل کا بیان کردہ طریقہ ____ 218

زکوٰۃ کے سلسلہ میں مقرر کردہ نصاب کی شکل وصورت ____ 218

کیا زکوٰۃ کے مصارف قرآن حکیم میں کہیں موجود بھی ہیں؟ ایک اہم سوال ____ 218

قبیلۂ اشعر کی ایک روش کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ___ 219
نبی اکرم ﷺ کے دورِ اول میں صدقات کی پوزیشن اور ان
کی تقسیم کا طریقۂ کار ___ 219
لفظ فقر کا لغوی اور قرآنی مفہوم ___ 219
ہر پیدا ہونے والا بچہ فقیر ہوتا ہے ___ 220
نبوت سے پہلے حضرت موسیٰ کی طرف سے مدین کی سرزمین
پر پانی کے ایک چشمہ کو استبدادی قوت سے آزاد کرنے کے
ایک اہم واقعہ کی تفصیل ___ 220
استبدادی نظام کے خلاف حضرت موسیٰؑ کی حساس خیالی ___ 221
وحی کی روشنی کے بغیر نوع انسانی کا ہر فرد خدا کا فقیر ہے
جس کا اظہار حضرت موسیٰ نے کیا تھا ___ 221
ذات خداوندی غنی بھی ہے اور حمید ہے ___ 222
مسکین کا لغوی مفہوم ___ 222
دروسِ قرآن کا یہ دوسرا دور 5 سال کی طوالت کے بعد ابھی
دسویں پارے کی منزل تک ہی پہنچا ہے لیکن اصل بات تو
قرآن حکیم کو سمجھنے کی ہے شبینہ کروانے کی نہیں ___ 222
لفظ مسکین کی وضاحت کے علاوہ حضرت موسیٰ اور
حضرتِ خضرؑ کے قصہ کی حقیقت ___ 223
لفظ مسکین اور فقیر کے مفہوم میں پائے جانے والے
فرق کی نوعیت ___ 223
صدقات تو انفرادی طور پر دینے کی بجائے مرکز میں
اکٹھے کیے جاتے تھے ___ 224
تالیف قلب کے اس بنیادی مفہوم کے برعکس مودودی صاحب
اس وقت وہ حیات تھے؟ کے نزدیک طلوع اسلام کے دفتر سے
پتے حاصل کرنے کا طریق ___ 224
مکے کے مستبد نظام کی شکل وصورت، پھر تقسیم سے پہلے مہاجنوں
کا کردار، پٹھان کے قرضے اور غلاموں کی کٹھن زندگی ___ 225
قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ زندگی بخش
نظامِ حیات کے خدوخال اور ان کا طریق ___ 226
غلام اور لونڈیوں کے متعلق ہمارے ہاں اسلام کا پیش
کردہ نظام زندگی اور اصول حیات کی ایک جھلک ___ 226
وہ اگر ہمارے نوے ہزار قیدیوں کے متعلق پیش کردہ
شریعتِ اسلامی پر عمل کرتے تو پھر ہمارے پاس کیا جواب تھا ___ 226
خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی راہنمائی کے لیے ہر
دور استوں کی نشان دہی کا طریق ___ 227

نواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 61 تا 67)

قرآن حکیم کے مطابق جنگ کے سلسلہ میں جذبۂ محرکہ
کی اہمیت کا ذکر ___ 228
قرآنِ حکیم میں بیان کردہ واقعات کا مقصد اور ہماری
قرآن خوانی کا انداز ___ 229
قرآنِ حکیم میں بیان کردہ واقعات تو ہر دور کے لیے قوموں
کے مرضِ کہن کی ترجمانی کرتے ہیں ___ 230
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ راہنمائی سورج کی کرنوں کی
طرح نہ تو کسی خاص قوم کے لیے ہے اور نہ ہی کسی خاص دور کے لیے 230
قرآن حکیم نے انسانوں کی خصوصیات کو کسی دور یا نسل
تک محدود نہیں کیا ___ 231
قرآنی احکامات کے میں قلب ونظر کی ہم آہنگی کے سلسلہ
میں منافق اور مومن میں فرق کی نوعیت ___ 231
احکاماتِ قرآنی کی اطاعت تو مکمل طور پر کرنا ہوگی ___ 232
تکذیب دین کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا ___ 232

اگر عالم گیر سچائیاں تمام مذاہب میں برابر پائی جاتی ہیں
تو پھر مذہب اور دین میں فرق کیا ہے؟ _______ 232
قرآنِ حکیم کا پیش کردہ دین اجتماعی طور پر ایک مستحکم اور ابدی
نظامِ حیات کی تصدیق کرتا ہے اور سچ کر دکھاتا ہے _____ 233
الدین الحق کا دعویٰ کرنے والوں کے ہاں قرآنی نظام
حیات کی بنیاد رکھنی تو فرض ہے _______ 234
حق بات کو ذہنی طور پر تسلیم نہ کرنے کی غرض سے فقہ کی
''کتاب الحیل''میں مختلف طریقوں کا اندراج _______ 234
اصل صورتِ حال خدا کو ماننا نہیں بلکہ اس کے احکامات کی
اطاعت کرنا ہے' مختلف عذر پیش کرنا نہیں ہے _______ 235
قرآنِ حکیم کا کوئی حکم مقصود بذا الذات کے عمل کے بغیر نہیں ہوتا 236
ہمارے ہاں کا یہ تصور کہ ہم نے اسلام چھوڑ دیا ہے یہ ایک
سطحی سا تصور ہے _______ 236
قرآن حکیم کا پیش کردہ تصورِ حیات صرف جذبات تک
محدود نہیں رہتا _______ 237
صلوٰۃ کی کیفیت صرف ظاہری حرکات وسکنات تک محدود نہیں
ہیں' بلکہ معاشی نظام کے ساتھ اس کا گہرا تعلق بھی ہے _____ 237
خود کوئی تعمیری کام کیے بغیر دوسروں کی نظروں میں قابلِ احترام
بننے کی نفسیاتی خواہش _______ 238
قرآن حکیم کسی خاص گروہ کا ذکر کرنے کی بجائے انسانوں کے نفسیاتی
خدوخال بیان کرتا ہے _______ 238
نبی اکرم ﷺ پر کانوں کا کچا' جیسے حقیر الزامات کی نوعیت
اور لفظ اذن کا لغوی مفہوم _______ 239
بغیر تحقیق کے کسی بات کو تسلیم کرنا قرآن حکیم کی تعلیم کے
صریحاً خلاف ہے _______ 239
قرآن حکیم کے احکام اور نبی اکرم ﷺ کی سنت _______ 240
قرآنِ حکیم کا معاشی نظام انسان کے لیے رزقِ کریم کی شکل
میں رحم مادر کی صفات کا حامل ہوگا _______ 241
غیر قرآنی معاشرے میں رزق کی دستیابی اور جنتی معاشرے
میں رزق کی فراوانی میں ایک بنیادی فرق ہے _______ 241
کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے
بغیر نہ رہ جائے _______ 242
اعمالِ انسانی کا نتیجہ روایت کی روشنی میں _______ 242
شرفِ انسانیت اور احترام آدمیت کے سلسلہ میں
رحمت اللعالمین کا ذکرِ خیر اور اس کی عملی وضاحت _______ 243
رحمت کا لفظ وحی کے لفظ کے علاوہ' اصول واقدار کے
معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے _______ 243
نبی اکرم ﷺ کے حضور منافقین کا کردار اور مومنین کا فریضہ ___ 244
مذہبی سطح پر خدا تعالیٰ پایا جانے والا تصور _______ 245
افراد کو خوش کرنے کی غرض سے قانونِ خداوندی سے
اجتناب کا نتیجہ ذلت ورسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا _______ 245
ہمارے ہاں گذرے واقعات کو پیش کرنے کا مقصد
صرف مناظرے جیتنے کے لیے ہوتا ہے _______ 246
قرآنی نظام حیات کو عملاً متشکل کرنے کا تصور صدیوں
سے اوجھل ہے _______ 246
مذہب کا تمام تر دارومدار ہمیشہ اشخاص تک محدود ہوتا ہے'
دیکھیے دورِ خلافت کے بعد کی تاریخ ان حقائق کی آئینہ دار ہے 246
ملتِ اسلامیہ پر علامہ اقبال اور قائداعظم کا احسان عظیم اور
دین حق کے قیام کا تذکرہ _______ 247
مومن اور منافق کے کردار میں فرق اور اس کا انجام _______ 247

انسانی زندگی کا سب سے بڑا جہنم ذاتِ انسانی سے مذاق

کی نوعیت ہے ____ 248

معاشرے میں منافق کی پہچان انسان کو خود کرنا ہوگی ____ 249

خدا کے اٹل قوانین سے مذاق اپنی ذات سے مذاق ہے ____ 249

ذہنی اور دلی طور پر اپنی غلطی کے احساس کا دوسرا نام توبہ کی

قبولیت ہے ____ 250

خدا کو بھلا دینے کا حقیقی مفہوم قوانین خداوندی کو نظر انداز

کرنے کے ہیں ____ 251

دسواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 68 تا 72)

جنگ کے معرکہ میں انسان کا ظاہر اور باطن نکھر کر

سامنے آجاتا ہے ____ 252

قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کیے گئے واقعات ہر دور

اور ہر قوم کے لیے باعثِ عبرت ہیں ____ 253

قرآن حکیم کے نزدیک نیکی کا معیار ____ 253

مومن اپنے ایمان کے پیشِ نظر اپنے کسی عمل کو ظاہریت

پر استوار نہیں کرتا ____ 254

خدا کو بھلا دینا دراصل اپنی ذات کو بھلا دینا ہے ____ 254

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا نکتہ ماسکہ انسان کو اس کے اپنے مقام

سے آگاہ کرنا ہے ____ 254

اعمالِ صالحہ کا حتمی نتیجہ اقتدارِ مملکت کی نعمت سے سرفراز ہونا ہے

تاکہ کوئی اسے اچک نہ سکے ____ 255

حقائق کے برعکس قرآنی احکامات کی مختلف تاویلوں کا ذکر ____ 256

کرامتیں طلب کرنے والوں کے سلسلہ میں عمر فاروقؓ کے

دور میں ایک پادری کو جواب ____ 256

علامہ پرویزؒ کی طرف سے اسلام کی تاریخ لکھنے کا

پروگرام زیرِ غور تھا ____ 256

سب سے زیادہ جہنم میں مبتلا منافق ہوتا ہے ____ 257

آج کرہ ارض پر مسلمانوں کی حالت زار اور پھر اس پر

پیش کی جانے والی تاویلیں ____ 257

ہمیں ان حقائق کو بڑی جرأت سے تسلیم کرنا ہوگا ____ 258

لفظ ''لعنت'' کا قرآنی مفہوم خوشگواریوں اور نعمتوں سے

محروم ہو جاتا ہے ____ 258

حق کی تلاش کے لیے کثرت کے ترازو کو استعمال کرنا

کوئی معنی نہیں رکھتا ____ 259

مقامِ عقل کو وحی کے ترازو میں تولنا ہوگا ____ 259

مومن اور منافق کی پہچان یہ ہے کہ مومن عمل کرتا ہے

اور منافق باتیں ____ 260

لفظ ''حبط'' کا قرآنی لغوی مفہوم ____ 260

قوموں کی موت و حیات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد ____ 261

انسانوں کی اس دنیا میں قوانین خداوندی کی نوعیت اور حکمت ____ 261

غیر اسلامی اصطلاحات اور خود فریبی کا جادو دنیائے اسلام کے

لیے ہمیشہ خسارے کی شکل میں ظاہر ہوا ہے ____ 262

اسبابِ زوالِ امت کے تاریخی حقائق کو قلم بند کرنے کے

سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کا اظہارِ خیال ____ 262

قرآن حکیم میں پیش کردہ تاریخی واقعات کو پیش کرنے کا مقصد 263

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق اور اس کا نتیجہ ____ 263

قرآنِ حکیم کے لفظ معروف کی وضاحت ____ 264

خود مختار مملکت کے وجود کے بغیر امر بالمعروف

نہی عن المنکر کا فریضہ کیونکر ادا کیا جا سکتا ہے ____ 265

نظام صلوٰۃ کو عملاً نافذ کرنا قرآنی حکومت کا بنیادی فریضہ ____ 265

خدااوررسول کی اطاعت کا قرآنی مفہوم اور ہمارا طرزِ عمل ___ 266

قرآنِ حکیم کے مطابق حکومت نہ کرنے والا کافر ہے ___ 267

مملکتِ اسلامیہ کے تحت قانون خداوندی کے الفاظ کے
مقابلے میں فتویٰ سازی کے عمل کی کیفیت ___ 267

دین کی حکمرانی اور مذہبی اجارہ داری کی بنیاد ___ 267

خداعلیم وخبیر تو انسان کو جہاں فرداکے متعلق دی گئی
اصطلاحات پر بھی غور وفکر کی دعوت دیتا ہے ___ 268

قرآنی آیات کے آخر میں خدا تعالیٰ کی دی گئی صفات اپنے
اندر ایک خاص مقصد لیے ہوئے ہوتی ہیں ___ 268

لفظ جنت اور جہنم کے سلسلہ میں پائے جانے والے تصورات
کی حقیقت کے علاوہ ہمارے ہاں کے مقربین کی پہچان ___ 269

ایران اور مدائین کی فتح جو سعدؓ بن وقاص کے ہاتھوں ہوئی
وہاں کی تمدنی زندگی کا ذکر ___ 270

حضرت صدیق اکبر کے بعد حضرت عمر فاروق کے عہد میں
تمدنی زندگی کے محسوس خدوخال اپنی مثال آپ ہیں ___ 270

قرآنِ حکیم کے اصولوں پر قائم ہونے والا معاشرہ عملی طور
پر جنتی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے ___ 271

جنتی زندگی سے بھی اگلا قدم رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ
کا مفہوم سمجھنے میں ہے ___ 271

فکرِ قرآن کو سمجھنے کے لیے سب سے ضروری چیز خدا
کے تصور کو سمجھنا ہے جو تمام انسانی تصورات سے بلند ہے ___ 272

عربی زبان میں لفظ ''رضا'' کا ترجمہ بڑا غور طلب ہے ___ 272

اعمال صالحہ کا معاوضہ تو بڑا ہی لطیف ہوتا ہے اور وہ حسن کی
شکل میں ملتا ہے ___ 273

ذاتِ خداوندی کے ساتھ ذات انسانی کا ہم آہنگ ہونا
جنت کی نعما سے کہیں مختلف اور بلند ہوتا ہے ___ 274

ذاتِ انسانی کا خدا کی ذات سے ''تعلقات'' میں اضافہ ہوتے چلے جانا
نعمائے جنت کی ایک الگ نوعیت ہے ___ 275

قرآنِ حکیم کے نزدیک بعض کیٹگریز کو متعین کرنے کی وضاحت
اور معاشرتی طور پر انہیں استعمال کرنے کی نوعیت اور ان کا مقام 275

گیارہواں باب: **سورۃ توبة** (آیات 73 تا 79)

دین اور مذہب میں جہاد کا مفہوم ایک متضاد کیفیت کا حامل ___ 278

قرآن حکیم مسلمان یا مومن ہونے کے لیے ایک کسوٹی عطا کرتا ہے
ایک پیمانہ مقرر کرتا ہے ___ 279

قرآن حکیم تو انسان کے ایک ایک سانس کی کیٹگری
متعین کرتا ہے ___ 280

قرآن حکیم کے نزدیک منافقین اور کفار میں کوئی فرق پیدا کرنا 280

لفظ جنگ اور قتال ایک ہی سکے دو رخ ہیں ___ 280

لفظ رقیق القلب' غلیظ القلب کا حقیقی مفہوم اور اس کا استعمال ___ 281

نبی اکرم ﷺ کے متعلق لفظ نرم دلی کے ساتھ غلیظ القلب کے
الفاظ کو استعمال کرنے کا مفہوم ___ 281

خدا تعالیٰ کی دو متضاد صفات غفور رحیم اور پھر شدید العقاب
کا بنیادی مفہوم اور ان کا استعمال ___ 282

قرآنی تصور کے برعکس نرم دلی اور سنگ دلی کے متعلق پائی
جانے والی سوچ کا عملی نتیجہ ___ 283

عیسائیت کے ہاں نجات کا دارومدار عمل کے بجائے
صرف رحم پر ہے ___ 283

بزدلی اور رحم میں پائے جانے والے بنیادی فرق کو ملحوظ نہ
رکھنے کا نتیجہ ___ 283

قرآن حکیم کے نزدیک جہاد اور قتال کی اہمیت اور ہمارے

ہاں تصوف کے پیدا کردہ تصورات کا نتیجہ ________ 284

تصوف نے پٹھان کے بیٹے کو تنکا توڑنے کے قابل نہ رہنے دیا 284

قرآن حکیم کے نزدیک دنیا میں باوقار زندگی گزارنے کا راز

اس قوت کے حصول میں ہے جو مفادِ عامہ کے لیے ہو _____ 285

ہمارے ہاں اخلاقیات کے نام پر پڑھایا جانے والا لٹریچر جو

اپنی ذات کی نمود کے بجائے اسے مٹانے کی ترغیب دیتا ہے _ 285

انگریز کی طرف سے جہاد کے خلاف پنجاب کی نبوت ایک

بہت بڑی سازش تھی __________________ 286

جہاد کے خلاف مرزا صاحب کا فرمان اور پھر نبی یا رسول

کہلوانے کی بحث کا تذکرہ ______________ 286

مسیح موعود کے وقت جہاد کا کام تمام کر دیا گیا ________ 287

متضاد صفات دراصل انسانی ذات کی مختلف صلاحیتوں کے

استعمال کا نام ہے ___________________ 287

انسان کے اندر پائی جانے والی کوئی بھی صلاحیت Evil

نہیں ہے ________________________ 288

ہر صلاحیت کا استعمال وقت کے تقاضوں کا رہین منت ہوتا ہے 289

قرآنی حقائق کو سمجھنے میں علامہ پرویزؒ کی تگ و تاز سال ہا سال

کے غور و فکر نتیجہ ہے __________________ 290

الحاد کی بنا پر صفات خداوندی کو غلط نظری سے دیکھنے اور اسے

اپنانے کا نتیجہ ____________________ 290

تمام صفات میں توازن برقرار رکھنے ہی میں حسن کی بحالی ہے _ 291

نبی اکرم ﷺ کی سیرت نوع انسانی کے لیے اپنے اندر اعتدال

پسندی کا بہترین نمونہ لیے ہوئے ہے _________ 292

حضرت عمرؓ کی شخصیت کردار کے آئینہ میں _________ 292

لفظ عزت کا بنیادی مفہوم Respect نہیں بلکہ غلبے کا ہے _ 293

علامہ اقبال کے الفاظ میں لفظ عزیز اور عزت کا حقیقی مفہوم اور

اس کا استعمال ____________________ 293

نبی اکرم ﷺ کی سیرت کا ایک اہم واقعہ دو متضاد جذبات

کا مظہر تھا _____________________ 294

علامہ اقبال کی زبانی تلوار کے استعمال کا طریق ________ 294

فرعون کا کفر اختیار کرنا بھی منافقت پر مبنی تھا _________ 295

موت کے ڈر سے فرعون کا ایمان لانا منافقت اور بزدلی پر مبنی تھا 295

حاسد اور منافق کی سوچ رکھنے والے کا انجام یہ ہے کہ دنیا میں

کوئی ان کا دوست نہیں ہو سکتا ______________ 296

معاشی میدان میں قرآن حکیم کے نزدیک نفاق کے سلسلہ

میں گریز کے ایک پہلو کی وضاحت __________ 297

منافق کی ایک شکل کذب کی صورت میں بھی ہے _______ 297

مومن کی طرف سے اور منافق کی طرف سے خدا کے رسول

کو خدا کا رسول کہنا، کبھی برابر نہیں ہو سکتا _________ 298

نفاق سے چھٹکارا حاصل کرنا مقصود ہو تو اپنے ہر وعدہ کو

پورا کرنا ہوگا ____________________ 298

ذات خداوندی تو انسان کے دل سے گذرنے والے

ہر ہر خیال تک سے بھی واقف ہوتی ہے __________ 299

خود فریبی انسانی ذات پر کس نوعیت سے اثر انداز ہوتی ہے؟

بڑی قابل غور بات ہے _________________ 299

قرآن حکیم کی تعلیم انسان کے غیر شعوری غلط تصورات کو

بھی باقی نہیں رہنے دیتی _________________ 299

دل و دماغ کی رضامندی کے بغیر حاصل کردہ نتائج'

اطاعت کی بجائے استبداد کہلاتے ہیں ____________ 300

خدائے علیم و خبیر کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا ________ 300

قرآن حکیم کے الفاظ میں بطیّب خاطر اپنی خدمات پیش
کرنے والے صحابہ کرام کی قلبی و دماغی کیفیت ____ 301
انسانی زندگی میں دردناک عذاب یہ ہے کہ اپنوں میں
منافقت کا پردہ چاک ہو جائے ____ 301

بارھواں باب: سورۂ توبة (آیت 80)

منافق اپنے انداز میں مختلف کیفیات کا حامل ہونے کے
باعث قوموں کے لیے سب سے زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے 302
قرآن حکیم کے نزدیک مغفرت اور استغفار کا حقیقی مفہوم
اور ہمارے ہاں کے تراجم اور تصورات ____ 303
ہمارے تمام تر تراجم کی بنیاد امام طبری کی لکھی گئی تفسیر اور تاریخ
پر ہی رکھی گئی ہے ____ 303
ہمارے یہاں مذہبی طور پر پائے جانے والے یہ تصورات
قدیم ایرانی مذہب کے ترجمان ہیں ____ 304
قرآنی آیات کے نازل ہونے کے معاملے میں
شانِ نزول کے عقیدہ کی وضاحت اور اس کا نتیجہ ____ 304
بخشش کے تصور نے تو دین کی ہیئت کو ہی بدل دیا ہے ____ 304
مٹھی بھر عرب قوم کے ہاتھوں رومن امپائر جیسی شان و شوکت
کی مالک تہذیب ملیا میٹ ہو کر رہ گئی آخر کیوں؟ ____ 305
قانون اور آئین میں فرق ____ 305
سائنس کی ساری بنیاد ہی لفظ Law پر استوار ہوتی ہے ____ 306
عیسائیت کے ہاں حضرت مسیحؑ کے کفارے کے
عقیدے کی نوعیت ____ 306
مجوسیوں کا عقیدۂ تقدیر جس نے انسانی صلاحیتوں کو بھی
تباہ و برباد کر دیا ____ 307
قرآن حکیم نے جہالت پر مبنی اس انسانی سوچ کا
رُخ ہی بدل دیا ____ 307
سب پر غالب آنے کے لیے قرآنِ حکیم کی تعلیم قدم قدم
پر انسان کو سوچنے کی ترغیب دیتی ہے ____ 307
قانون خداوندی کے سلسلہ میں استثنا کے پہلو کی وضاحت
خود نبی اکرم ﷺ کی زبانی ____ 308
قانون کی حکمرانی کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے عہد میں
تاریخ کا بیان کردہ ایک اہم واقعہ ____ 308
بائبل اور بخاری شریف کے ورد کرانے کے پروگرام کا
مقصد دراصل دو سوچوں کا ٹکراؤ تھا ____ 309
خدا کے صحیح تصور نے ملتِ اسلامیہ کی سوچ کو بدل دیا تھا ____ 309
گہری سازش کے تحت قرآنی اصطلاحات کا مفہوم بدل جانے
پر اصل تصویر کا اصل رخ نظروں سے اوجھل ہو گیا ____ 310
ہمارے ہاں مجوسی تصورات پر مبنی وہ دلائل جو اسلام کا
روپ اوڑھے ہوئے ہیں ____ 310
ہمارے ہاں کی قدامت پرست مذہبی پیشوائیت اور
کیتھولک فکر و نظر میں ہم آہنگی ____ 310
علامہ اقبال کے نزدیک نیٹشے اور لوتھر قابلِ قدر اہمیت
کے حامل تھے ____ 311
یورپ کی تمدنی زندگی کو تبدیل کرنے میں نیوٹن اور کاپرنیکس
کا بڑا اہم رول تھا ____ 311
مکافاتِ عمل کا تمام تر دار و مدار انسانی خیالات پر مبنی ہوتا ہے ____ 312
غلط روش کی موجودگی میں بخشش کے پردوں میں نجات کا
تصور کرنا قرآن حکیم کے تصورِ زندگی کے خلاف ہے ____ 312
اپنی ذات کے سلسلہ میں دعویٰ حق و باطل کے متعلق
علامہ پرویزؒ کی حساس خیالی ____ 312

قرآن حکیم انسان کو بخشش کی بجائے سامان حفاظت کا تصور پیش کرتا ہے ____ 313

لفظ استغفر اللہ کا قرآنی مفہوم اور ہمارا طرزِ عمل ____ 313

یہودیت کے اور ہندو دھرم کے ہاں لغزش یا غلطی کے ازالہ کے طریق کے برعکس قرآن حکیم کے نزدیک اس کا علاج ____ 314

قوت مدافعت کے بڑھ جانے کا دوسرا نام مغفرت بھی ہے جبکہ ہمارے ہاں کی غلط سوچ نے مغفرت کے حقیقی مفہوم کو ہی بدل دیا ہے 314

لغزشوں کے نتائج کو ہموار اور تعمیری سوچ کے ترازو میں تولنا ہوگا 315

کوئی عمل کرنا یہ تو انسان کے اختیار میں ہے لیکن اس عمل کے نتیجہ کو بدلنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ____ 315

لفظ توبہ اور لفظ عمل صالح کی حقیقت پر مبنی محسوس وضاحت قرآن حکیم کی روشنی میں ____ 315

ظہورِ نتائج کے وقت کوئی کسی کا پرسان حال ہو ہی نہیں سکتا ____ 316

ایصالِ ثواب کے تصورات کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے پیاس صرف اسی کی بجھے گی جو خود پانی پئے گا ____ 317

خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے جذبات سے بالاتر ہے وہاں صرف قانون کی حکمرانی ہے ____ 318

انسانی ذات کی نشو و نما کا دارومدار صرف اور صرف قانون کی اتباع پر منحصر ہے ____ 318

خدا کے ہاں قانون کی بارگاہ میں رسول اکرم ﷺ کی شخصیت اور اختیارات کے ذکر کے علاوہ زہر کے استعمال کا معاملہ ____ 318

بخشش کا تمام تر تصور عیسائیت کا پیدا کردہ ہے جس کا قرآن حکیم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ____ 319

خون جگر کے برعکس بخشش گداگری کا دوسرا نام ہے ____ 319

بخشش کے غلط نظریے کے نتیجہ نے اقوام کو گداگر بنا رکھا ہے ____ 319

خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا بنیادی مفہوم اور پھر ہمارا تصور ____ 320

استغفار کے سلسلہ میں شان نزول کے علاوہ شفاعت کے متعلق پائے جانے والے تصورات کی حقیقت قرآن حکیم کی روشنی میں 320

نبی اکرم ﷺ کی طرف سے منافقین کو غور و فکر کی دعوت موجودہ زندگی کے متعلق ہے نہ کہ مرنے کے بعد کے معاملات سے ____ 321

متکبرون کی ذہنیت تو کسی مرحلہ پر بھی اپنی غلطی کا احساس نہیں کرتی ____ 322

محاورے کی زبان کے لیے ضروری ہے کہ اسے اسی انداز سے سمجھا جائے ____ 322

نبی اکرم ﷺ کی حساس مشفق طبیت کے متعلق قرآن حکیم کا بیان ____ 323

اسلامی نظام میں اور مذہبی دنیا میں سربرائے مملکت کے لیے عمل پیرائی کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے ____ 323

قرآنی نظام حکومت اور مذہبی دنیا میں اطاعت کرنے کے انداز میں فرق ____ 323

ذاتِ انسانی پر نفسیاتی طور پر مرتب ہونے والے اثرات کی نوعیت ____ 323

قانون خداوندی کے تحت رسول کی اپنی حیثیت کا معاملہ ____ 324

قرآنی قانون کی مکمل عمل داری کی خاطر انسان کو مرکزِ ملت کی طرف لوٹنا ہی ہوگا ____ 324

آخر کار انسان کو لفظ استغفار کے اس بیان کردہ عملی زندگی کی طرف لوٹنا ہی پڑے گا ____ 324

جنازے کی دعا کا مفہوم آئندہ پیش ہوگا ____ 325

تیرہواں باب: **سورۃ توبة** (آیات 81 تا 84)

سلموا تسلیماً کی حقیقت قرآن حکیم کے آئینہ میں 326
منافقین کا تفصیلی تعارف 326
قرآن حکیم کی نظر میں جنگ تبوک کے موقعہ پر نبی اکرم ﷺ
کی رفاقت کے برعکس منافقین کا کردار 327
قرآن حکیم نے جہنم کی آگ کا خواہ وہ امروز ہو یا
جہانِ فردا' دنوں کا ذکر کیا ہے 327
انسانی جذبات وحی کے تابع ہوئے بغیر صحیح روش زندگی
اختیار کر ہی نہیں سکتے 328
قرآنی معاشرے کی تعریف یہ ہے کہ اس میں ہر شخص
ہر آن معاشرے کی خوشی اور غمی میں برابر کا شریک ہوتا ہے 329
بدعملیوں کا ازالہ کرنے کے لیے اگر وقت ہی نہ رہے تو
پھر توبہ کیسی 329
نماز جنازہ کی اصل حقیقت' ایصال ثواب کی نوعیت اور
ہمارے ہاں کی تقلید پرستی کا عملی نتیجہ 329
انسانی اعمال کے سوا زمین و آسمان کی ساری دولت ایک
دوسرے کو منتقل کی جاسکتی ہے 331
مرنے کے بعد ان کو ثواب کی ترسیل اور دیگوں کی منتقلی
قرآن حکیم کی فکر کو ماؤف کرنا ہے 331
شفاعت کا عقیدہ فریب نفس کے سوا کچھ نہیں اس نے
امت مسلمہ کو بے عملی کی طرف راغب کر دیا ہے 332
بیماری کے دوران عیادت انسان کے لیے نفسیاتی
سہارے سے کم نہیں 332
قرآن حکیم کے ہاں لفظ صلوٰۃ یا صلّی بڑی اہم اصطلاحات ہیں 332
انسانی معاشرے میں Social Justice کی اہمیت
اور اس کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی 333
اکنامک جسٹس کے علاوہ میرٹ کی بنیاد پر تحسینی جذبات
کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت 333
انسان کا مرتبہ و مقام اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی بنیاد پر
ہی متعین ہوگا 334
کسی کے تخلیقی جذبے کی تعریف یا حوصلہ افزائی کرنے کا
عمل انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے 334
تزکیہ نفس کا لغوی اور قرآنی مفہوم بڑا غور طلب ہے 335
کسی کی طرف سے حوصلہ افزائی کے چند بول انسان کے
قلبی اضطراب کو سکون فراہم کرتے ہیں 335
منزل کے حصول کے دوران پیش آنے والی مشکلات سے
نبرد آزما ہونے کا طریق اور انا للہ وانا الیہ راجعون کا حقیقی مفہوم 336
زبردست مشکلات کے باوجود حصول منزل کے لیے ثابت
قدمی کے ساتھ کھڑے رہنا' یہ ہے راجعون کا مفہوم اور
سلّموا تسلیما کے فریضہ کی عملی شکل کا نتیجہ 337
خدائے علیم و خبیر و رحیم و کریم کی طرف سے رسول اکرم ﷺ
کو صحابہ کے لیے حوصلہ افزائی کی تاکید اور اس کی اہمیت 338
نبی اکرم ﷺ کی زندگی بھر کے مشن کے خدوخال کے پیش نظر
قرآن حکیم کی طرف سے تحسین آفروز الفاظ کا ذکر 338
سَلّموا تسلیماً کی عملی شکل صل علیٰ کے انداز میں اطاعت اختیار
کرنا ہوگی 339
انسان کے حسنِ عمل کو خدا اور اس کی قوتیں بھی
Appreciation کرتی ہیں 340
یصلون علی النبی اور لفظ صلوٰۃ کے مروجہ تراجم کی نوعیت 340
قرآن حکیم کے مروجہ تراجم ملت اسلامیہ کے ساتھ بہت
بڑی سازش' اطاعت کا یہ لفظ درود و سلام میں بدل گیا 340

علامہ پرویز پر لگائے گئے الزامات کی تردید ____ 341
قرآن حکیم میں صلوٰۃ، اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے
جب کہ یسلموا تسلیماً تو انتہائی درجے کی اطاعت ہے ____ 342
خدا اور ملائکہ جماعت مومنین پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں ____ 342
نزولِ قرآن کے مقصد کی وضاحت کے سلسلہ میں
داستانِ بنی اسرائیل کی مثال ____ 343
سلموا تسلیما جیسے عظیم پروگرام کا ماحصل تو اصل طلوع
آفتاب کی نوید ہے ____ 343
درود کے سلسلہ میں بخاری کی ایک حدیث کی نوعیت اور
پھر اللھم صل علیٰ کے الفاظ کا تجزیہ ____ 344
مروّجہ تراجم سے باہر نکلے بغیر قرآن حکیم کی حقیقی تعلیم
سامنے آ ہی نہیں سکتی ____ 344
قرآن حکیم کے نزدیک انسانیت کی نشو ونما کا یہی ایک
واحد عملی طریق ہے ____ 345
قوموں کی تباہی اور بربادی کی بنیادی وجہ تین الفاظ میں
پوشیدہ ہے کہ ہوجائے گا، ہوجائے گی، ہوجائیں گے ____ 345
خدا تعالیٰ کے ہاں Appreciation ہمیشہ ''ہوجائے گا''
کے بجائے ''ہوگیا ہے'' کی ہوتی ہے ____ 346
دھاندلی کی بنا پر کھڑے کیے گئے مجسمے کبھی حیات جاوید
حاصل نہیں کرتے ____ 346
مرنے کے بعد کسی کے متعلق چند معاشرتی ادب وآداب کا ذکر 346
کسی کی فوتیدگی کے بعد بغیر سوچے سمجھے قرآن حکیم پڑھ
پڑھ کر اسے ثواب پہنچانا، چہ معنی؟ ____ 347
خوش بخت ہے وہ شخص جس کے مرنے کے بعد لوگ اسے اچھے نام سے
یاد کریں ____ 348

چودھواں باب: **سورۃ توبة** (آیات 85 تا 89)

مذہب اور دین کے معاملات میں فرق کے ساتھ
متضاد رویہ کا ذکر ____ 350
ہم نے صدرِ اوّل کے بعد سے دین کو مذہب میں بدل رکھا ہے 351
جہاد کی ضرورت نے منافقانہ ذہنیت کو بے نقاب کر دیا ____ 351
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ تعلیم، انسانیت کے عروج
وزوال کے اصولوں سے وابستہ ہے ____ 351
مذہبی تصورات میں الجھی ہوئی زندگی کے نشیب وفراز کی حالت 352
انسانی معاشرے میں منافق کا طرزِ عمل اور مومنانہ زندگی
کے خدوخال ____ 352
دیانتدار کے لیے غلط معاشرے کی پیدا کردہ الجھن کا نتیجہ ____ 353
قرآن حکیم میں معاشرتی تباہی کی بنیادی وجہ منافق کو دولت
کی بنا پر صاحبِ احترام جاننا ہے ____ 354
وسیع سے وسیع تر مملکتوں کی تباہی ان کے اختیار کردہ منافقانہ
نظام کی ہی وجہ جواز بنتی ہے ____ 354
انسانیت کی فلاح وبہبود کا راز مفادِ عامہ میں ہے ____ 355
علامہ پرویزؒ کی طرف سے پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ ____ 355
قرآن حکیم کی عظمت اور تاریخی فلسفہ کی اہمیت ____ 356
قرآنِ حکیم تو قوموں کے نشیب وفراز کو بیان کرنے کا
ایک خاص مقصد لیے ہوئے ہے ____ 356
قرآن حکیم کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں قوموں کی اُجڑی
ہوئی بستیوں کے کھنڈرات تاریخ کی معتبر ترین گواہی ہے ____ 357
ہم نے دین کو مذہب میں بدل دیا ہے ____ 357
اپنے اپنے خودساختہ نظام ہائے زندگی کے نتائج کے ہاتھوں
تباہ وبرباد ہونے والی قوموں کو خطاب ____ 358

استبداد کی بنیاد ضرورت سے زیادہ جمع کرنے میں
شروع ہوتی ہے ________ 358
غلطی کا اعتراف نتائج نکلنے سے پہلے کرنا ہوتا ہے قرآن حکیم
نے فرعون کی زندگی کو بطور مثال کہا ہے ________ 359
غلط نظام یا غلط ماحول میں قرآنی اقدار کو پیش نظر رکھنا بڑی
جرأت کا کام ہے ________ 359
مجرم قوم خواہ اس کا تعلق کسی دور سے ہو آخر کار اس
پر روڈ رولر پھیر دیا جاتا ہے ________ 360
لفظ جرم مجرمین کے مفہوم پر دورِ حاضر کی سیاست کا
مدار اور اس کا فلسفہ حیات ________ 360
ابدی قوانین کی خلاف ورزی کے باعث علم و فضل کی دولت
سے مالا مال مملکتیں مکافات عمل کی زد سے نہ بچ سکیں ________ 361
روما اور ایران جیسی عظیم مملکتوں کی تباہی کی وجہ جواز اور
آج نظام سرمایہ داری کی پیدا کردہ تباہ کاریاں ________ 361
نظامِ سرمایہ داری کے متعلق قرآن حکیم کی وضاحت اور فیصلہ ________ 362
انسانی صلاحیتوں کے فرق کی نوعیت اور قرآنی نظام میں
ان کے استعمال کا طریق ________ 363
مختلف انسانوں میں مختلف صلاحیتیں پیدا کرنے کی وجہ
جواز تقسیمِ کار کو سرانجام دینے کے لیے ہے ________ 364
عقل و فکر کی روشنی میں قائم ہونے والے معاشرے میں
تفاوت کو کم سے کم حد تک بھی لایا جا سکتا ہے ________ 364
قرآنِ حکیم کی روشنی میں زیادہ صلاحیتیں پانے والوں کی
بلند فکری جو باعثِ تقلید ہے ________ 365
سوشل ازم کے نظام کی موجودہ حالت اور حیوانی سطح کی
اقدار کے منتہا فلسفۂ حیات کا نتیجہ ________ 365
کیا نظام سرمایہ داری نے انسانیت کے مسائل کو حل کر دیا ہے؟ 366
قرآنی اقدار ہی انسانی اور حیوانی سطح زندگی میں فرق پیدا
کرتی ہیں ________ 366
قران حکیم عقل انسانی کو ایک مستقل روشنی عطا کرتا ہے ________ 366
کسی کی متواتر ثابت قدمی کے ساتھ کی گئی محنت نسل در نسل
پھل دیتی ہے ________ 367
قوموں کی زندگی کا معیار صرف دولت کی فراوانی پہ ہی نہیں ہوتا 367
دنیا میں آج تک کوئی بھی قوم یونہی تباہ نہیں ہوئی ________ 367
نوع انسانی کے لیے اب پیغام رسانی کا سلسلہ سن بلوغت
تک پہنچ چکا ہے ________ 368
قرآن حکیم کے نزدیک لفظ ظلم کی وضاحت اور اس کا انجام ________ 368
قرآن حکیم میں استعمال ہونے والے مرادفات اور شاعری
کے مرادفات میں فرق کی نوعیت ________ 369
کلمت اللہ اور سنۃ اللہ میں پائے جانے والے فرق کی نوعیت ________ 370
تمت کلمت اللہ اور سنۃ اللہ کی اصطلاحات کو استعمال کرنے
کا مقصد ________ 370
قرآن حکیم ذات خداوندی کو ماننے اور نہ ماننے کا متعین مفہوم پیش
کرتا ہے جب کہ قوموں کا عروج و زوال اسی تصور سے ہی وابستہ ہے 371
لفظ ''قعدین'' اور ''خوالف'' کا قرآنی لغوی مفہوم ________ 371
ہر قسم کے مالی وسائل کو اقدار کے تابع نہ رکھنے سے
انسانی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں ________ 372
فارسی تراجم نے قرآنی الفاظ کے حقیقی مفہوم کو ہی بدل دیا ہے ________ 372
خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان پر لگائے جانے والی پابندیوں
کا تصور انسانی اختیارات کو وسعت دینا ہے ________ 373
مذہب کی دنیا میں نجات کا تصور ________ 373

مومن کی زندگی تو ہمیشہ اختیارات اور خیرات ہے مفلحون
سے اور فائزوں کے زیور سے آراستہ ہوتی ہے ______ 373

پندرہواں باب: **سورۃ توبۃ** (آیات 90 تا 99)

لفظ جہاد کا بنیادی مقصد اقدار خداوندی کے لیے
مسلسل تگ وتاز ہے ______ 375
مذہب کی دنیا میں تو دین کی پیش کردہ اصطلاحات کو ہی
بدل دیا جاتا ہے ______ 376
منافق کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ صداقت کا عملی
ثبوت پیش نہیں کرتا ______ 376
جہاد اصغر اور جہاد اکبر مذہب کی پیدا کردہ اصطلاحات ہیں ___ 377
ادبی دنیا میں شاعری کا ایک اپنا مقام ہے ______ 377
قرآن حکیم نے میدان جنگ سے فرار کی راہیں تلاش کرنے والے کو
منافق کہا ہے ______ 377
ہماری ہزار سالہ تاریخ کا انجام ______ 378
جذبۂ جہاد کو ختم کرنے کے سلسلہ میں انگریز کی یہ چال کہ جہاد
اکبر جہاد بالقلم ہے جس کے لیے وحی نازل ہوئی ہے ______ 378
جہاد بالسیف کا تصور سابقہ دور کی ایک یادگار جہاد کو
منسوخ کرانے کی ایک نئی چال ہے ______ 379
قرآن حکیم کی آیات کے متعلق ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ ______ 380
کسی معاملے کو حق تسلیم کرنے کا معیار عقل انسانی کی بجائے
وحی کو حرف آخر تسلیم کرنا ہوگا ______ 380
ہمارے ہاں قرآنی اصطلاحات کا قرآنی مفہوم بدل دینے
کا نام مذہب ہے ______ 381
قرآن حکیم نے شہری اور صحرائی آبادی کو جن اور اُنس کے
نام سے پکارا ہے ______ 381
قرآن حکیم نے مال غنیمت کے حصول کی خاطر
جنگ وقتال کے جذبۂ محرکہ کے تصور کو ہی بدل دیا ______ 382
ابوجہل کی آخری خواہش اور قرآن حکیم کا فلسفہ حیات
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی ______ 382
انسان کے جذبۂ محرکہ کا نام ہی تو ایمان ہے ______ 382
مسلمان ہونے کی پہلی شرط خدا کے ساتھ بیع وشری کے
معاملے کو قبول کرنا ہوتا ہے ______ 383
عہد نبوت میں ریگولر آرمی کا یا Paid فوج کا کوئی وجود نہ تھا ___ 383
کفار کے ساتھ جنگ کے لیے پیچھے رہ جانے والے منافقین
کا کردار ______ 384
پیچھے رہ جانے والے محسنین کی مصروفیات کا ذکر خیر ______ 384
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا کی کیفیت رکھنے والی
موتیوں سے لبریز آنکھوں کا ذکر ______ 385
قرآنی معاشرے میں خوف وحزن کے سلسلہ میں مومنوں کی کیفیت
اور غیر قرآنی معاشرے میں انسانوں کی حالت زار کی تصویر کشی 385
قرآنی مفہوم میں مجرم کی تعریف ______ 386
دروسِ قرآن حکیم کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کی طرف
سے ایک وضاحت ______ 387
کوتاہیوں کا اعتراف کرنے پر قرآن حکیم کی کشادہ دلی
اور لفظ عالم غیب اور لفظ شہادت کی وضاحت ______ 387
فرعون کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ کی طرف سے سینے
میں کشادہ پیدا کرنے کی دعا ______ 388
نبی اکرم ﷺ کی بلند ظرفی اور کشادہ نگہی تو اپنی مثال آپ تھی ___ 388
ہمارے ہاں قرآن حکیم کے تراجم کا معیار لفظ رِجس کے
سلسلہ میں کیے گئے ترجمے سے دیکھا جا سکتا ہے ______ 389

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ منافقین کی طرف سے انفرادی سطح پر ایک اور چال ____ 390
دین میں سوال خدا تعالیٰ کے ساتھ انفرادی رضامندی کا نہیں بلکہ نظام خداوندی کو راضی کرنے کا ہے ____ 390
وحی کی اقدار کے بغیر انارکی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ____ 391
قرآن حکیم کی متعین کردہ ڈیموکریسی اور مغرب کی ڈیموکریسی میں بنیادی فرق ____ 391
خدا تعالیٰ کی صفات میں سے الحکیم صفت بڑی جامع ہے ____ 392
اس پوری کائنات کی تخلیق بہت بڑی حکمت پر مبنی ہے ____ 392
تعمیر کائنات اور حکمت آمیز قوانینِ کائنات' خدائے علیم وخبیر کے نازل کردہ ہیں ____ 392
کائناتی قوانین کی حکمت یہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے بغیر نہ رہ جائے ____ 393
مرکز ملت کی طرف سے کوئی چیز طلب کرنے پر منافقین کی قلبی کیفیت ____ 393
خدا کا مقرب ہونے کا مفہوم اور اس کا عملی مظاہرہ ____ 394
صَلَوٰتِ الرسول کے سلسلہ میں Appreciation کی اہمیت اور اس حسن عمل کا نتیجہ ____ 394
مخلصانہ عمل کے دلی طور پر اعتراف کے سلسلہ میں نیک تمناؤں کے اظہار کی اہمیت کا ذکر ____ 395
عیسائیت کا خدائی تصور رحم مادر میں جنین کی پرورش کے آئینے میں' رب کا مفہوم ____ 395
''رب'' کی وضاحت کے بعد ''غفور'' کی اہمیت اور عالمی سطح پر مقام نبوت کی حدود نا آشنا صفات ____ 396
امت اور نبوت کے درمیان تعلیمی رشتہ اور عالمی سطح پر کتاب وحکمت پہ مبنی باہمی تعلقات شائد آپ کا مدعا ایسے ہے؟ 397

سولھواں باب: **سورۃ توبۃ** (آیات 100 تا 106)

صحابہ کرام کے متعلق قرآنی حقائق کو نظر انداز کرنے میں ہماری تاریخ کا کردار ____ 398
جہاد کے قرآنی مفہوم کے برعکس روایتی سوچ کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دینے کا نتیجہ ____ 399
وضعی روایات کے بعد کشف والہام کی بنیاد پر پیش کردہ تصورات کی نوعیت ____ 399
کیا قرآن حکیم کو کافی کہنے والا کافر ہے ____ 400
مختلف تاویلوں اور تفسیروں کے ذریعے قرآنی حقائق کو ہی بدل دیا گیا جو ایک سنگین جرم تھا اور ہے ____ 400
قرآن حکیم نے زندگی کے حقائق کو تقابلی انداز میں بیان کرنے اور سمجھانے کا بڑا موثر انداز اختیار کیا ہے ____ 400
قرآنِ حکیم میں منافقین کا مقام اور صحابہ کرام کے مدارج کے تعین کا ذکر ____ 401
دین سے ہٹ کر مذہب کے اندر وطن کی کوئی تفریق نہیں ہوتی 401
مدینے کی طرف ہجرت کا مرحلہ' وہاں کی تمدنی زندگی کی استطاعت اور پھر مسجد کی تعمیر کا ذکر ____ 402
ہجرت کے ایک سال بعد جنگ بدر کا معرکہ اور اس کے خدوخال ____ 402
اہل مدینہ کی طرف سے مکہ کے مہاجرین کے ساتھ حسنِ سلوک کی ایک درخشندہ مثال اور اساسِ باہمی کے انمٹ نقوش کی زندہ جاوید داستان اور تاریخ کا ایک روشن باب 403
قرآن حکیم کے لفظ ''الفوز'' کا مفہوم اور مذہب میں نجات کے ماحصل کی نوعیت ____ 404

صحابہ کرام کی تگ وتاز اس چیز کی ترجمان ہے کہ
جنت کا حصول، خونِ جگر کا متقاضی ہوتا ہے ________ 404
قرآنی حقائق کے برعکس تاریخی طور پر صحابہ کرام کے
سلسلہ میں ہمارے ہاں ہونے والی سازش کا ذکر ______ 405
صحابہ کرام کے متعلق بخاری کی ایک حدیث کے برعکس
صحابہ جیسی عظیم ہستیوں کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد _____ 405
صحابہ کرام کا باہمی روابط تو تالیف قلب کی کیفیت
سے آراستہ تھے ________________ 406
مومنین کے مابین ذہنی رفاقت کی قدر و قیمت ________ 407
قرآن کریم کے نزدیک جماعت مومنین اور
نبی اکرم ﷺ کے مابین ذہنی رفاقت کی قدر و منزلت کی کیفیت 407
تورات اور انجیل میں جماعتِ مومنین کی ذہنی آسودگی کا
ذکرِ خیر اور سورۃ التوبۃ اور سورۃ فتح کا بیان ________ 407
قرآنی حقائق کے برعکس تاریخ کی سازش ________ 408
انسانی معاشرے میں مدارج کا فرق تو ہوگا لیکن آسودہ
زندگی کا وعدہ تو تمام کے لیے ہے ____________ 408
ذہنی اور قلبی ہم آہنگی کا ماحصل ہمیشہ آسودہ حالی کی
شکل میں نکلتا ہے ________________ 409
صحابہ کے متعلق اصل حقائق کے برعکس تاریخ کے
خود ساختہ چند بدنما داغوں کی کیفیت __________ 409
ہم نے قرآنی حقائق کی بجائے تاریخ کو مقدس تصور کر رکھا ہے 410
دوسو سال بعد بخاری کی ایک حدیث کہ جنگ جمل میں
10 ہزار صحابہ باہمی طور پر قتل ہوگئے ____________ 410
تقلید پرستی حقائق کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ
کا باعث بنتی ہے ________________ 411
قرآن حکیم کے برعکس روایت کے متعلق مولانا اسلمؒ
جیراجپوری کا فرمان ________________ 411
تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا بلکہ
تم سے تو یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا ________ 411
سب سے زیادہ فخر کی بات کسی مملکت کے وجود کو قائم کرنا
نہیں بلکہ کسی کو انسان بنانا ہے ________________ 412
حضرت عمرؓ کے دور میں اقدار خداوندی کی نوعیت ________ 412
نبی اکرم ﷺ کے زیرِ نگرانی تیار کردہ معاشرے کی خصوصیت _ 413
قرآنی اقدار کے ترازو میں ہماری حالت تو بالکل بے
وزن ہو چکی ہے ________________ 414
مہاجرین اور انصار کے علاوہ ایک تیسری کیٹگری کا ذکر
اور موجودہ اسلام کی پس ماندگی کی وجہ جواز __________ 414
خدا تعالیٰ کی طرف سے رسولوں تک وحی کی حدود کا تعین
اور رسول اکرم ﷺ کی نگاہ بصیرت کا ذکر __________ 415
ظاہریت پر مبنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا انجام ________ 415
منافقت کے دھاگے سے تیارہ کردہ لباس ایک ہی تاؤ میں
تار تار ہو جاتا ہے ________________ 416
خود پر زیادتی کرنے والوں کی طرف سے احساس ندامت
کے اظہار پر خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا انداز __________ 416
اعتراف جرم کرنے والوں کے متعلق نبی اکرم ﷺ کو خدا تعالیٰ
کی طرف سے ارشاد ________________ 416
Appreciate کرنے کی اہمیت کے
برعکس Demoralise کا نقصان ____________ 417
لفظ درود و صلوٰۃ کا مفہوم دراصل Appreciation کے
معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی تحسین و آفرین کے معنوں میں 417

نماز اور درود کا لفظ عربی کے بجائے پہلوی زبان کا ہے ____ 418
نبی اکرم ﷺ کے فرمان کی روشنی میں درجات کی بلندی کا معیار 418
قصہ آدم میں بیان کردہ حقائق بڑے غور طلب ہیں ____ 419
زندگی کے کسی موڑ پر غلط راستے سے لوٹ کر واپس آنا ہی
کافی نہیں ہوتا ____ 419
ظاہریت کی بجائے دنیا میں خلوص ہی وہ شے ہے
جسے ترازو میں تولا جائے گا ____ 420
قرآن حکیم تو نفاق کی بنیاد پر تعمیر کردہ مسجد کو بھی قبول نہیں کرتا _ 420

سترہواں باب: **سورۃ توبة** (آیات 107 تا 110)

نبی آخرالزماں کی بعثت کا مقصد پوری نوع انسانی کے لیے
اُمت واحدہ کی تشکیل تھا ____ 421
پرویزؒ کی طرف سے ایک اہم وضاحت قرآن حکیم کی تعلیم
کا بنیادی محور عالمگیر برادری کی تشکیل ہے ____ 421
وحی کا بنیادی مقصد نوع انسان کو اس کے باہمی اختلافات
اور خون ریزیوں سے بچنے کے طریق سے روشناس کروانا ہے 422
قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق اور لفظ شجر کا لغوی مفہوم ____ 422
انسانوں کے باہمی اختلافات کو مٹانے کے لیے
انبیائے کرام کی معرفت وحی کا پیغام ____ 423
خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر نبی کو کتاب دی گئی تا کہ وہ لوگوں
کی اس کے مطابق راہنمائی کرے ____ 423
آخری نبی ﷺ اور آخری مکمل کتاب ____ 424
نزولِ قرآن کے وقت تو انسانیت کا ہر شعبۂ زندگی
متضاد تصورات میں الجھا ہوا تھا ____ 424
نبوت کا فریضہ پوری انسانیت کو ایک عالمگیر برادری کی تشکیل تھا 424
عالمگیر برادری کی تشکیل کے لیے ایک جماعت کی ضرورت کا
''الحق'' ہونا لازم ہے ____ 425
انسانیت کی سطح پر قائم ہونے والی سوسائٹی کی کیفیت
ایک مرکز کی سی ہوتی ہے ____ 425
نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد پوری انسانیت کے
اعمال کی نگرانی کرنا تھا ____ 426
لفظ طواف کا لغوی مفہوم اور جماعتِ طائفین کا فریضہ
شہدآء علی الناس کا مقصد ____ 426
دین میں تفرقہ پیدا کرنے والے کا رسول اکرم ﷺ
سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہتا ____ 427
رسول اکرم ﷺ کی اُمت میں شمولیت کی تو پہلی شرط ہی'
فرقہ بندی سے اجتناب ہے ____ 428
اپنے اپنے مفاد کی خاطر فرقہ بندی کو دوام بخشنے کے
سلسلہ میں فریبِ نفس کے سہارا کی قرآنی تردید ____ 428
ایمان لانے کے بعد فرقہ بندی کو ہوا دینے اور
افتراق و اختلاف پیدا کرنے والوں کے متعلق
قرآن حکیم کا ارشاد ____ 429
قرآنی ضابطہ حیات کیا تھا' نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا بنیادی
مقصد نوعِ انسانی کو عالم گیر برادری کی لڑی میں پرونا تھا ____ 429
انسانوں سے خدا تعالیٰ کے تعلقات کی نوعیت اور وضاحت _ 430
الصلوٰۃ کا بنیادی مقصد احکاماتِ خداوندی کے سامنے
سرِ تسلیم خم کرنا ہے ____ 431
قرآن حکیم کے ساتھ ہونے والی سب سے بڑی سازش'
اس کی اصطلاحات کے مفہوم کو بدلنا ہے ____ 431
آج اپنے اپنے طور پر ہر فرقہ دوسرے فرقے کو غلط قرار دیتے
اور خود کو اُمت محمدی ﷺ سے ہونے کا داعی ہے ____ 432

فرقوں کی موجودگی میں توحید کا کیا کام ______ 432
صلوٰۃ کا لفظ نظام زندگی کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی ایک اصطلاح
ہے جب کہ مسجد کو ایوان حکومت اور چیمبر کا مقام حاصل ہے _ 433
مساجد میں اجتماعات کے بنیادی مقصد کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ 433
وحدتِ انسانیت کے پیشِ نظر پر مساجد اللہ کے نام کے
علاوہ کسی دوسرے نام سے نہیں پکاری جائے گی ______ 434
ہمارے ہاں تو صدیوں سے مساجد کو امت وحدہ کے
تصور کے برعکس مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے ______ 434
مختلف فرقوں کی متضاد نظریاتی سوچ کا نتیجہ باہمی
انتشار اور اُمت کی بربادی ______ 435
اعتراف حقیقت کی بجائے مکاتب فکر کے نام پر
ایک نئی چال' ایک نئی گمراہی ______ 435
بوقت اذان مختلف مساجد کی طرف مختلف مکاتب فکر کی
سمت بھاگ دوڑ کا منظر ______ 435
ان الگ الگ مکاتب فکر والوں کی ''باہمی رفاقت'' کا تجزیہ _ 436
نماز پڑھنے کے دوران باہمی اختلافات کے محسوس نشانات _ 436
دورِ نبوت میں مسجد ضرار کی تعمیر پر وحی خداوندی کا نزول ____ 437
خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کی طرف سے
مسجدِ ضرار کی تعمیر کی سازش قرآن حکیم کی روشنی میں ____ 438
ایک ہی محلے میں مسجد کے مقابل دوسری مسجد کی تعمیر آخر کیوں؟ 438
مسجد ضرار بنانے والوں کے متعلق قرآن حکیم کا بیان ____ 439
جس مسجد کی بنیاد وحدتِ ملت پر نہیں خدا تعالیٰ اسے کسی
صورت پسند نہیں کرتا ______ 440
مسجد کی عمارت کی بجائے اس کی بنیاد پر نگاہ ڈالنا ہوگی ____ 440
وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وضع قطع میں فرق اور
پھر نماز کی ادائیگی میں فرق ______ 441
فرقہ واریت پر تعمیر ہونے والی مسجد کی بنیاد دریا کے کنارے
ریت پر رکھی جاتی ہے ______ 441
مسجد کا مقام اور اس کی عظمت تو امت واحدہ کے تصور
کے ساتھ مشروط ہے ______ 442
فرقہ واریت پر تعمیر ہونے والی مسجد کی بنیاد دریا کے کنارے
ریت پر رکھی جاتی ہے ______ 442
وحدت انسانیت کے تصور کے تحت امت واحدہ کی
تشکیل ہی دین کی بنیاد ہے ______ 443
اُمت واحدہ کے تصور کے برعکس فرقہ واریت پر مبنی سوچ شرک
اور جہنم کو دعوت دیتے ہوئے خدائے علیم وخبیر کو فریب دینا ہے 443
قرآنی فلسفہ حیات کے برعکس یورپ کے علاوہ پوری
ملت اسلامیہ صدیوں سے سیکولرازم کے تحت مختلف قوموں
کا گہوارہ بنی ہوتی ہے ______ 443
حصول پاکستان کے دوقومی تصور کو مکمل طور پر نظر انداز
کرنے کی سرتوڑ کوشش ______ 444
بلآخر نظریاتی طور پر مملکت پاکستان کو ہم نے پوری
طرح سیکولر سٹیٹ بنا دیا ______ 444
اٹھارہواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 111 تا 112)
قرآنِ حکیم کے بیان کردہ حقائقِ زندگی اگر بے مثل ہیں
تو اس کا اندازِ بیان بھی لاثانی ہے ______ 445
مذہبی سطح پر زندگی گزارنے والوں کا طرزِ زندگی اور
ان کی طرف سے پیش کردہ تاویلات کی نوعیت ______ 445
ایک طرف تو مسجد کو گرایا جا رہا ہے اور دوسری طرف جان
اور مال تک بیچ دیا جاتا ہے ______ 446

قرآن حکیم کے نزدیک معاہدے اور خرید وفروخت میں فرق _ 447
قرآن حکیم کے نزدیک معاہدے کا انداز' سوشل ازم میں
ذاتی ملکیت کی حیثیت اور پھر منڈی میں بیع وشرح کی نوعیت _ 447
مومن تو اپنی وہبی اور اکتسابی صلاحیتیں بھی جنت کے
عوض خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے __________ 448
قرآن کریم میں بیان کردہ جنت کی تفصیل ________ 448
خدا کے ہاں قیمتِ فروخت کی نوعیت ________ 449
انسانوں کے وضع کردہ معاشی نظام کا ماحصل قرآنی
معاشرے کی نوعیت نیز حیوانی سطح زندگی اور انسانی زندگی
میں بعین فرق کی وضاحت __________ 449
انسان کی بنیادی ضروریات کو مکمل طور پر پورا کرنے کا
اعلان ابھی تک کوئی ازم نہیں کرسکا __________ 450
مارکس کی ناکامی کی بنیادی وجہ اور اس کا اعتراف ______ 450
انسانیت کے لیے قرآن حکیم کا معاشی نظام سب
سے بڑی ضمانت فراہم کرتا ہے __________ 450
قرآنی نظام حیات کی تشکیل کے لیے جان ومال کا سودا کرنا ہوگا
اور پھر اس کا نتیجہ الفوز العظیم کی شکل میں نکلتا ہے ______ 451
خدا تعالیٰ کے ساتھ اتنے سستے سودے پر جشن مناؤ۔
یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے زلیخا نے سوت کی ایک مالا سے
یوسف جیسی جان خرید لی ہو __________ 452
ہمارے ہاں پائے جانے والے اکثر تصورات کی
اصلاح ضروری ہے __________ 453
ملکیت زمین کے سلسلہ میں آج کی شریعت حقہ کا فتویٰ ___ 453
نظری طور پر مذہبی عقائد کے برعکس قرآن حکیم کی
واضح دوٹوک تعلیم __________ 454
خدا تعالیٰ اپنے وعدے ایک نظام کے ذریعے پورے کرتا ہے 454
خدا تعالیٰ کے نام پر حکومت قائم کرنے والے کی ذمہ داری
اور اس کی حیثیت کا ذکر __________ 454
خدا کی اطاعت نظری اور ذہنی نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے ایک
مرکز ملت تشکیل پاتا ہے __________ 455
خدا تعالیٰ کی طرف سے لیے گئے وعدوں کو پورا کرنا مرکزیت
ملت کی ذمہ داری ہوگی، اس امر کے بغیر تو خدا کا کوئی
نمائندہ بن ہی نہیں سکتا __________ 456
خدا کی ہاں تو قیمتِ فروخت میں تو مال کے علاوہ جان
بھی شامل ہوتی ہے __________ 456
ہمارے ہاں اسلامی مملکت کا معیار یا مسلمان ہونے کی
نشانی صرف کلمے کا پڑھنا ہی ہے __________ 457
قرآن حکیم نے جماعت مومنین کی ترجمانی سورۃ فاتحہ
کے اندر بڑی جامعیت سے بیان کردی ہے ________ 457
کسی بزرگ سے غلطی سرزد ہو جانے پر اس کے ازالے
کی بجائے اسلاف پرستی کا شیوہ __________ 458
مولانا اسلم جیراجپوریؒ کے سفر حج کے ایک واقعہ کا
ذکر ان کی اپنی زبانی __________ 458
نبی اکرم ﷺ کا اپنی ذات کے متعلق فرمان اور قرآن حکیم
کے الفاظ میں آپ ﷺ کا مقام کبریٰ اور آپؐ کی عظمت ____ 459
ہمارے ہاں کے تراجم نے قرآن حکیم کے الفاظ کی حرمت
اور عظمت کو بدل کر رکھ دیا ہے __________ 459
سورۃ فاتحہ میں دیئے گئے لفظ ''حمد'' کا قرآنی مفہوم کائنات
کی پستیوں اور بلندیوں پر غور وفکر کرنے والا ہی سمجھ سکتا ہے ___ 460
الحمدللہ کا لفظ کہنے کا حق صرف اولی الالباب کو ہے' مومن کو ہے 460

کائنات کی تخلیق کے بارے اہل فلسفہ کی سوچ دو حصوں
میں تقسیم ہے نمبر 1 اور نمبر 2 ____ 461
مذہبی تصورات کی نظری صورت گری صرف وعظ و نصیحت
تک محدود ہوتی ہے ____ 461
مذہبی اندازِ فکر کے برعکس دین کی اطاعت کے لیے عملی طریق ____ 461
مذہب کو ماننے والوں کے مقابلے میں دین پر عمل کرنے
والوں کا عملی انداز اور شکل وصورت ____ 462
مذہب کے مقابلے میں دین میں حدود متعین اور نمایاں
ہوتی ہیں جبکہ ایک ریفری بھی ہوتا ہے ____ 462
صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے ہدایت طلبی کی ضرورت اور
اس کی فراہمی ____ 463
دینی نظام کی تشکیل انسانی صفات کی رہین منت ہوتی ہے اور
ان صفات کے حامل کو ہی مومن کہتے ہیں ____ 463
زندگی کے اس میدان میں صفاتِ مومن کی حامل یہی
وہ ٹیم ہے جو انسانیت کو منزل مقصود تک رسائی حاصل کرنے
میں ممد ثابت ہوگی ____ 464
حالات حاضرہ کے تحت ایک اہم سوال اور اس کا جواب ____ 465
زکوٰۃ کے موجودہ تصور کی نوعیت اور عصمت کی حفاظت کی
اجتماعی اہمیت اور اہل یورپ کی حالت زار ____ 465
عصمت کی حفاظت کے متعلق قرآن حکیم کی وضاحت نیز نزول
قرآن حکیم کے وقت غلاموں اور لونڈیوں کے معاملے کا حل ____ 465
لفظ امانت کے قرآنی مفہوم کی اہمیت اور پھر وعدہ ایفا
کے ثمرات کی نوعیت ____ 466
انیسواں باب: **سورۃ توبۃ** (آیات 113 تا 114)
صفاتِ مومن کی مزید تفصیل ____ 469
صفات مومنین قرآن حکیم کے آئینہ میں ____ 469
احکام خداوندی کے برعکس گریز کی راہیں نکالنے والے
کا طرزِ عمل ____ 470
قرآن حکیم نے مال و دولت کو جمع کرنے کے برعکس
''انفاق'' کی اصطلاح استعمال کی ہے ____ 470
قرآن حکیم کی کھلی وضاحت کے بالمقابل ڈھائی
پرسنٹ کا شرعی فتویٰ ____ 470
کیا انسان کی کوئی فطرت ہوتی ہے؟ ____ 471
کیا انسان کو خدا نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا؟ انسان تو
جلد باز بھی ہے جھوٹا بھی جاہل بھی ہے اور لالچی بھی ____ 472
فطرت کا لفظ تو صرف مجبور کے لیے مختص ہے ____ 472
آدمی کو انسان خود بننا ہوتا ہے اور یہی قانون فطرت ہے ____ 473
انسان کی نفسیاتی کیفیت تو یہ ہے کہ یہ بڑا بے صبرا واقع ہوا ہے 474
صلوٰۃ کی غایت سے بے خبر مصلحین کا کردار اور جو مصلی ہیں
ان کا طرزِ عمل ____ 475
صلوٰۃ کا لفظ (وسیع تر مفہوم رکھنے کے باعث) زندگی
کی پوری روش کا ہی دوسرا نام ہے ____ 475
مصدق کا مفہوم یہ ہے کہ مومن جس چیز کو تسلیم کرے
وہ اسے عملی طور پر اختیار بھی کرتا ہے ____ 476
قوموں کے عروج و زوال کا راز صرف عصمت کی
حفاظت میں ہے ____ 476
شہادت کا بدرجہ اتم اصول یہ ہے کہ انسان خود اپنے
خلاف شہادت دے ____ 477
صلوٰۃ کی حفاظت کا بنیادی مقصد خدا کے ہاں سے مکرموں
کے طور پر رزق کا حاصل کرنا ہے ____ 478

قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق اور اس کا اسلوب نگارش ______ 478
عورت کے سلسلہ میں لفظ ''الرِّجالُ'' کا حقیقی مفہوم
اور ہمارے ہاں پائی جانے والی ذہنیت ___________ 479
قرآن حکیم میں مسلم اور مومن میں فرق کی وضاحت اور
لفظ ''قانت'' کا قرآنی مفہوم ___________ 480
لفظ صبر کا قرآنی مفہوم حصول منزل کے لیے استقامت
کے ساتھ چٹاں کی طرح کھڑے رہنے کو کہتے ہیں ______ 480
لفظ صوم کا مفہوم حدود اللہ کے اندر رہنے والا ________ 481
دو فریقین کے مابین السلام علیکم و علیکم السلام کو عملی طور پر
اپنانے والوں کی مسرت بھری زندگی ____________ 483
قرآنی معاشرے کے استحکام کے لئے زیر بحث آنے
والے موضوعات کا تعلق صرف قوانین خداوندی کے
نفاذ سے متعلق ہوتے ہیں ______________ 483
مومن اور مشرک کی سوچ میں فرق ____________ 484
آخر کار غلط معاشرے کے مضر اثرات کے نتائج
بھگتنے ہی پڑتے ہیں _________________ 484
کسی جرم کی سزا یا مواخذہ قانون کی وضاحت کے بعد ہو سکے گا 485
حضرت ابراہیم کے اپنے والد سے تعلقات کی نوعیت _____ 486
اگر کسی غلطی کو پہلے دن ختم نہ کیا جائے تو پھر زمانے کی تہیں'
گردشیں اسے چٹان کی طرح سخت سے سخت تر کر دیتی ہیں ___ 486
حضرت ابراہیم کے والد کی پوزیشن اور آپ ﷺ کی جرأت _ 486
بت پرستی کو دوام ملنے کی وجہ یہ ہے کہ بت اسے ٹوکتا نہیں ___ 487
ہم نے قرآن حکیم کو قرآن ناطق کے طور پر سمجھا ہی نہیں ___ 487
حضرت ابراہیم کی اپنے باپ سے کھلی کھلی گفتگو _______ 487
حضرت ابراہیم کا اپنے والد سے قطع تعلق کا اعلان نبی اکرم ﷺ اور
حضرت ابراہیم کے اسوۂ حسنہ کو بہترین نمونہ قرار دینے کا اعلان 488
حضرت ابراہیم کا اپنے والد سے قطع تعلق کرنے کے
باوجود نیک تمناؤں کا اظہار ______________ 488

بیسواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 115 تا 125)

جہاد میں شامل ہو کر جان دینے اور اس کے برعکس اس سے
جی چرانے والوں کے مقامات کا تعین ___________ 490
انسانوں کے ایک نوع ہونے کے باوجود ان کے باہمی کردار'
سوچ اور عمل کے متضاد ہونے کی نوعیت اور پھر قوموں کی
ہلاکت کی وجہ جواز _________________ 491
قوموں کو ہلاکت سے محفوظ رکھنے کے بنیادی اصول ______ 491
انسانیت پر قانون کی حقیقت اور اس کی اہمیت واضح
کرنے کا مقصد اُسے ہلاکت سے بچانا ہی تو ہے _______ 492
صدرِ اوّل میں بادشاہتوں کے اندر مفتی مقرر کرنے کا
مقصد قانون کی حکمران ہی تھی ______________ 492
ہمارے ہاں عدل حاصل کرنے کی نوعیت اور
مصائب و آلام کی داستانیں ______________ 493
تعزیری قوانین کی دوسری خاص شق اور پھر لفظ ''ضل''
کا قرآنی مفہوم __________________ 493
اجتماعی زندگی میں قوموں کے عروج و زوال کے متعلق
قرآن حکیم کا فرمان ________________ 494
قرآنی اصولوں کی خلاف ورزی کے باعث ہونے والی
تباہی سے کسی کو کوئی نہیں بچا سکتا ____________ 494
جنگ تبوک کی دل جلا دینے والی روئداد' قوت ایمان کا
مظاہرہ اور رومن امپائر کی آخری کوشش جو ناکام ہو گئی _____ 495
جنگ تبوک کی تیاری کے لیے حضور ﷺ کا بطور سالار پروگرام 495

جنگی پروگرام کے دوران گریز کی راہیں اختیار کرنے والوں کا ذکر ___ 495

جنگ کے پروگرام کے دوران 3 ارکان کی طرف سے لغزش ہو جانے کے واقعہ کی روداد ___ 497

خطا ہونے پر حضرت سعد بن مالک کا بیان ___ 497

انسانی دنیا میں مسلط ہونے والے نظام زندگی کے برعکس حقائق اور احساسات کی بنیاد پر پرورش پانے والے نظام زندگی میں فرق 498

چند ساتھیوں کا جنگ میں شامل نہ ہونے کی بنا پر اظہارِ ندامت کے باعث ماتھے پر عرق انفعال کے قطرے ___ 498

تین کے علاوہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جنگِ تبوک کے مجاہدین پر تحسین وتبریک کے پھولوں کی بارش اور باقی 3 کے کیلئے خدا کی طرف سے زمین تنگ ہوگئی ___ 499

حضرت کعبؓ پر زمین تنگ ہوگئی' بیوی نے چھوڑا' بھائیوں نے چھوڑا' نبی اکرم ﷺ نے منہ پھیرلیا' جماعت نے قطع تعلق کرلیا 499

انسان کے لیے سب سے کڑی سزا برادری سے کٹ جانے کی تھی ___ 500

برادری سسٹم میں جرائم کی تعداد بہت کم ہو جاتی تھی ___ 501

علاقے کے بادشاہ کی طرف سے حضرت کعب کو رفاقت کی پیش کش، لیکن حضرت کعب نے رفاقت کی اس دعوت کو نظرآتش کردیا ___ 501

معذرت کی قبولیت تک کی کیفیت ___ 502

مذہب کے اندر انفرادی نجات کی بجائے توبہ کے معیار کا ذکر ___ 502

جماعت سے الگ ہونے والوں کے لیے تو زمین تنگ ہو جاتی ہے جب کہ ہمارے ہاں تو ایک مسجد دوسرے سے الگ ہے _ 503

نبی اکرم ﷺ کے نزدیک مومنین کی جان کی قیمت ___ 504

جنگ اُحد میں نبی اکرم ﷺ کی جان کی حفاظت کے سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کا کردار ___ 504

جہاد کے لیے جذبہ صادق ہو تو راستے کے کانٹے بھی پھول نظر آتے ہیں ___ 505

جہاد کے راستے کی ایک ایک تکلیف ان کے نامہ اعمال کا ذرہ ذرہ موتیوں کی طرح محفوظ کیا جاتا ہے ___ 505

جہاد سے قبل جہاد کی تیاری کے لیے کن پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے ___ 506

عہد اولاً میں آبادکاری کے حالاتِ زندگی ___ 507

خدا کے دین میں مذہبی پیشوائیت کی کوئی الگ جماعت نہیں ہوتی ___ 507

مذکورہ آیت کا حقیقی مفہوم ___ 508

قرب وجوار کے دشمنوں پر قابو پانے کا طریق ___ 508

حکم خداوندی ہے کہ تم اپنی قوت مستحکم کیئے رکھو تاکہ دشمن اسے دیکھ کر ڈھل جائیں ___ 509

ہمارے ہاں متقی کے خودساختہ مفہوم نے عقل وفکر کو ہی ماؤف کودیا ہے متقین کا لفظ تو جنگ میں جانے والوں کے لیے استعمال ہوا ہے ___ 509

جہاد کے احکامات نازل ہونے پر متقیوں کے جذبہ ایمانی کی کیفیت ___ 510

یہ مال ودولت کیا، کسی عظیم مقصد کے حصول کے لیے تو جان کی بھی کوئی قیمت نہیں ہوتی ___ 510

اکیسواں باب: **سورة توبة** (آیات 126 تا اختتام)

جہاد کے سلسلہ میں منافقین اور مومنین کا اپنا اپنا کردار

اوراس کا نتیجہ ________ 513
اپنی غلط روش کومحسوس کرنے یا تسلیم کرنے کے بجائے
روش کہن پر چلے جانے کا نتیجہ ________ 514
مذہبی سوچ میں قرآن کی حکیم کی طرف سے دیئے گئے
حقیقی تصورات کو بالکل بدل دینے کی مثال ________ 514
ہمارے مقابلے میں ترقی یافتہ میں اقوام قدرتی طور
پر ہونے والے نقصان سے بچنے کا طریقہ ________ 515
خدائے رحیم کسی پر مصیبت نازل نہیں کرتا بلکہ یہ انسانوں
کی اپنی بدعملی کا ہی نتیجہ ہوتی ہیں جسے خدانے عذاب کہا ہے _ 516
کائنات کے ذرّے ذرّے کو مسخر کرتے ہوئے اس کے
ماحصل کو منفعت عامہ کے لیے صرف کرنا دینِ خداوندی
کا بنیادی نکتہ ہے ________ 516
ہمارے ہاں تو دین کی چابی دنیا کے دروازے کو کھولنے
کے لیے استعمال ہی نہیں ہوئی ________ 517
دین خداوندی کی حکمرانی انسانوں کے ہاتھوں
ظہور پذیر ہوتی ہے ________ 517
لفظ توبہ کا بنیادی مفہوم تو اپنی روش زندگی کے بدلنے کا نام
ہے چنانچہ اس سلسلہ میں لفظ ''ذکر'' کا مفہوم قابل غور ہے __ 518
خدا کی طرف سے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے کا حقیقی مفہوم
نیز تقدیر کے مفہوم کی وضاحت ________ 519
خدا دلوں پر مہریں کیوں لگاتا ہے، کس طرح لگاتا ہے
اس کی وجوہات کیا ہیں اور اس کا علاج کیا ہے ________ 519
قوم کی قیادت کرنے والی شخصیت کے کردار کی علامت ____ 520
کائنات کو پیدا کرنے کا مقصد صفات خداوندی کا
محسوس پیکر میں سامنے آنا ہے ________ 521
دراصل مومن کی ذات علیٰ حدِ بشریت صفات خداوندی کا
ہی عکس ہوتی ہے ________ 521
عربی زبان میں مرادفات کی اہمیت اور پھر خدائی صفت رؤف
کا ذکر رحمانیت سے پہلے لانے کی وضاحت ________ 523
نبی اکرم کی 13 سالہ مکی زندگی صفت رافت کا ہی مظہر تھی ____ 523
نبی اکرم ﷺ کی وفات ایک عظیم حقیقت کی ترجمانی ہے ____ 525
خالق کائنات کی طرف سے ایک اہم سوال کہ کیا قرآن
تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟ ________ 525
خدا علیم وخبیر کی طرف سے ہر دور کے آنے والے انسان
کے لیے ایک کھلا چیلنج ________ 525

پہلا باب: **سورۂ توبة** (آیات 1 تا 16)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1973ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ توبہ سے ہو رہا ہے 9ویں سورۃ سے۔

ہجرت کے بعد قریش مکہ کی طرف سے 7 سال تک مخالفت کی نوعیت اور توحید کا عملی مفہوم

سابقہ سورۃ میں یعنی سورۃ الانفال میں پہلی آویزش کا ذکر جو قریشِ مکہ اور جماعتِ مؤمنین میں بدر کے میدان پر ہوئی۔ اس کے بعد قریب چھ سات سال کا عرصہ انہی آویزشوں اور معرکہ آرائیوں میں گذر گیا۔ قریش نے اس مخالفت اور مخاصمت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مسلسل جنگوں کا یہ زمانہ رہا۔ اور ان کی یہ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ کعبہ جو تمام اہلِ عرب کے لیے کھلا ہوا تھا ان کا ایک قومی مرکز تھا۔ قریش نے ان مسلمانوں پر جو بہرحال عرب ہی تھے ان پر اس کے راستے بھی بند کر دیے۔ صلح حدیبیہ اس باب میں بڑا مشہور واقعہ ہے کہ یہ جماعت گئی تھی حج میں شرکت کے لیے۔۔ تو انہیں روک دیا گیا اور انہیں وہاں سے واپس آنا پڑا۔ لیکن اس کے بعد قریش سے آخری جنگ ہوئی اور مکہ فتح ہو گیا۔ اسلام کی تاریخ میں یہ اہم ترین واقعہ ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ مکہ کسی شہر کا نام نہیں نہ ہی اس کی کوئی سیاسی Importance تھی یا فوجی اہمیت تھی کہ مکہ کی فتح کے بعد ہم کہدیں کہ صاحب یہ نزاع باہمی یا یہ جو تصادمات تھے یہ اس کے بعد ختم ہو گئے۔ مکہ کی پوزیشن کچھ اور تھی۔

محسوس علامت کے طور پر کعبہ کا مقام اور اس کی اہمیت کی وجہ جواز

جیسا کہ اب آپ کو معلوم ہے اسلام تو دین کا نام ہے اور دین اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ اس دین کی بنیاد توحید پر تھی اور اس

توحید کی محسوس علامت یعنی ایک خدا کے قوانین کا دنیا میں نافذ کرنا۔۔ یہ ہیں توحید کے معنی صرف ایک خدا کا ماننا نہیں' ماننا تو بڑا مبہم سا لفظ ہے۔خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ایک خدا کے احکام کو دنیا میں نافذ کرنا اوران کے تابع زندگی بسر کرنا۔کسی اور کی اس میں شرکت ہوگی تو یہ شرک ہوجائے گا۔ یہ تھا مقصد اس مملکت سے۔اوراس مملکت یا اس مقصد کی ایک محسوس علامت کعبہ تھی جو حضرتِ ابراہیمؑ کے وقت سے چلی آ رہی تھی۔دنیا میں مابہ الامتیاز تھی یہ علامت ان لوگوں کے لیے جو صرف خدا کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ یہی دوقومی نظریہ ہے تو کعبہ اس مقصد کی ایک محسوس علامت ہے۔تو ظاہر ہے کہ جو مملکت اس مقصد کے لیے وجود میں آئی ہو جس کی وجہ جواز ہی یہ مقصد ہو۔تو جو اس Symbol کا کنٹرول بہ حال اپنے پاس ہونا چاہیے تھا۔کنٹرول کے لیے بھی لفظ تولیت ہے ہمارے ہاں۔ قرآن نے جو لفظ استعمال کیا ہے' اس میں بھی ملکیت کا تصور نہیں ہے بلکہ اس کے نظم ونسق کا تصور ہے۔اس کی حفاظت کا تصور ہے' اس کی ولایت کا تصور ہے۔یہ اس قوم کے پاس ہونا چاہیے تھا کہ جو اس قسم کی مملکت قائم کرنے کی مدعی تھی یا انہوں نے قائم کیا تھا۔یہ وجہ ہے جو آپ دیکھیں گے۔

کعبہ کے متعلق نبی اکرم کے دل میں پیدا ہونے والی شدت آرزو کے تحت دعا کی قبولیت کا مرحلہ

یہ وجہ ہے جو آپ دیکھیں گے کہ شروع ہی میں جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے ہیں اوراس مملکت کا آغاز ہوا ہے تو قرآنِ کریم میں سورۃ بقرہ میں دوسرے پارے کی ابتداء میں یہ چیز ایسے عجیب حسین انداز میں کہی گئی ہے کہ قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِي السَّمَآءِ (2:144) اے رسول ہم دیکھتے تھے تیرے دل کی آرزوئیں کس طرح یہ شکل اختیار کرتی تھیں تو بار بار آسمان کی طرف تکتا تھا یہ آرزو لیے ہوئے کہ یا اللہ جس مملکت کی ابتداء یوں کی جارہی ہے اس کا نقطۂ ماسکہ' اس کی محسوس علامت' اس کا مرکز اس کا سنٹر بھی تو بہر حال اس مملکت کے لیے ہی تولیت کیا جانا چاہیے۔ہمیں خبر تھی کہ کس طرح یہ آرزو تیرے دل سے ابھرتی ہے اور تو بار بار آسمان کی طرف تکتا ہے۔اور یہ اس زمانے میں کہہ دیا گیا تھا کہ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰىهَا (2:144) جس قبلہ کی آرزو تو اس طرح اپنے دل میں رکھتا ہے یقیناً اس کی تولیت ہم تمہیں دیں گے۔سوچئے مدینے کے ابتدائی ایام میں جہاں خود اس مٹھی بھر جماعت کی اپنی موت اور زندگی کا سوال درپیش تھا انہیں زندہ رہنے کی بھی اس زمانے میں توقع نہیں تھی۔وہ دعا تو بدر کے میدان میں نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے کہا تھا یا اللہ یہ مٹھی بھر جماعت سارا اثاثہ ہے جسے میں لے کے آج آ گیا ہوں ان کے مقابلے میں۔۔اگر اس جماعت کو آج شکست ہوگئی اور یہ نہ رہی تو پھر قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔آخری رسول کی تو آخری امت ہوتی ہے نا' امت تو رسول کی نسبت سے بنتی ہے۔تو اگر یہ چیز نہ رہی۔۔بڑا صحیح فرمایا حضور ﷺ نے عجیب انداز میں کہ پھر قیامت تک تیرا نام لینے

والا کوئی نہیں رہے گا۔تو اس دور میں جب مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ قرآن میں یہ چیز آئی اور خدا نے اس دور میں یہ کہا کہ یقیناً ہم اس مرکزِ مملکتِ خداوندی کی تولیت تیرے سپرد کر دیں گے' یہ ہو کے رہے گا۔بہت بڑا وعدہ تھا بڑی عظیم جسے آپ کہتے ہیں' پیش گوئی تھی۔

پیش گوئی یعنی مستقبل کے متعلق غیب کے علم کی وضاحت کے سلسلہ میں انسان کی کیفیت

پیش گوئی تو صرف خدا کر سکتا ہے یاد رکھیے کوئی انسان پیش گوئی نہیں کر سکتا۔یہ خدائی اختیارات میں ایسا کہنا شرک تھا کہ کوئی انسان پیش گوئی کر سکتا ہے۔پیش گوئی کے معنی ہیں مستقبل کے متعلق کسی یقین سے بات کہنا۔یہ غیب کا علم ہے اور قرآن کی نص صریح کے مطابق غیب کا علم کسی اور کو نہیں دیا جاتا بجز رسول کے۔اور اس کو بھی وہی کہ جو وحی کے ذریعے سے ملے اس کے علاوہ نہیں۔لیکن یہ خدا کی طرف سے وعدہ تھا ایک پیش گوئی تھی' یقین آفرینی تھی کہ ہاں وہ مرکز آئے گا تمہاری تولیت میں ورنہ دین نا تمام رہ جاتا ہے۔لیکن یہ مرکز یونہی بیٹھے بٹھائے دعائیں مانگ کے ہاتھ میں نہیں آ گیا۔اس چھ سات سال کے عرصے میں تاریخ کے بیان کے مطابق نبی اکرمﷺ اور اس جماعت کو قریباً بیاسی کے قریب چھوٹی موٹی جھڑپیں اور لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ساری زندگی اس جہاد میں گذر گئی۔اور اس کے بعد پھر سن 8 ہجری میں مکہ فتح ہو گیا۔اور وہ وعدہ جو اس زمانے میں کیا ہوا تھا کہ یہ مرکز تمہاری تولیت میں آئے گا' وہ وعدہ پورا ہو گیا۔

2 ہجری کو جنگ بدر کے بعد 9 ہجری کو حج کے فریضہ کی نوعیت اور اس کا مقصد

غور کیجیے سن 2 ہجری میں جنگِ بدر ہوئی اور یہ وہ سال تھا جب پہلے پہل روزے فرض ہوئے ہیں۔ابھی سترہ ہی روزے رکھے گئے تھے کہ بدر کے میدان میں یہ جنگ لڑنی پڑ گئی پھر مکہ فتح ہونے کے بعد سن 9 ہجری میں جو پہلا حج آیا تو اس زمانے میں حج فرض ہوا مسلمانوں پہ۔جسے اب ہم فرض ہوا کہتے ہیں تو اب تو یہ چیز محض ایک فقہی یا شرعی سی اصطلاح رہ گئی ہے کہ یہ فرض ہے' یہ واجب ہے' یہ سنت ہے' یہ مستحب ہے۔اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اب تقاضا ہو گیا ان حالات کا جس کے اندر یہ امت تھی کہ ایسا کیا جائے۔ابتدائی مدنی زندگی میں تھا حالات کا تقاضا کہ اتنی بڑی استقامت ہو اس قوم کے اندر اور بھوک اور پیاس اور سردی اور گرمی کی مصیبتیں جھیلنے کی اتنی بڑی قوت ان کے اندر آ جائے کہ انہوں نے تو پانچ چھ برس تک مسلسل جنگوں میں رہنا تھا۔اس کے لیے جسے آپ کہیں گے روزے فرض ہوئے۔امت کے حالات کا تقاضا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے۔اور اس کے بعد یہ آٹھ نو برس تک جسے آپ کہیں گے کہ حج فرض نہ ہوا۔ویسے جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے حج تو چلا آ رہا تھا عربوں کے اندر صدیوں قرنوں سینکڑوں ہزاروں سال سے۔یہ ان کا ایک قومی تہوار بن گیا تھا ان کا یہ اجتماع پورے عرب کا اجتماع تھا جو مکہ میں ہوتا تھا حج کے ایام میں۔عربوں کی حیثیت سے یہ لوگ یہ بھی حج میں شریک ہو سکتے تھے۔لیکن جب تک وہ مرکزِ محسوس حکومتِ خداوندی کا ان کی تولیت میں نہ آئے ان کا اپنا اجتماع وہاں نہیں ہو سکتا تھا۔اسے کہتے

ہیں حج فرض ہوا۔ آزاد ملتِ اسلامیہ کی مملکت کا مرکز وہاں ان کا ان کے نمائندوں کا اجتماع تاکہ یہ مملکت اور عالمگیر انسانیت کے مسائل کا حل باہمی دلیل و حجت سے دریافت کریں۔ یہ ہے حج۔

حج کا فریضہ تو اپنے اندر ایک عظیم فلسفہ لیے ہوئے ہے

افسوس آپ کو یاد ہے میں نے اعلان کیا تھا کہ حج کی تقریب پہ میں ایک مخصوص ایک درس اسی عنوان پہ دونگا۔لیکن میں اپنی بیماری کی وجہ سے اس قابل نہیں تھا کہ وہ درس دیتا اس لیے یہ باتیں رہ گئیں ورنہ میں یہ عرض کرتا کہ یہ حج ہے کیا چیز۔ یہ مذہبی رسومات نہیں ہیں عزیزانِ من! یہ دین کے تقاضے ہیں۔ دین کے معنی ہیں مملکتِ اسلامیہ۔۔ خدا کی حکومت کے تقاضے ہیں یہ۔ یہ اجتماع تمام مملکت کے نمائندوں کا اجتماع تھا خود سربراہِ مملکت وہاں اس اجتماع کو جا کے Lead کرتا تھا، تمام گورنرز وہاں جاتے تھے، تمام عمالِ حکومت وہاں آتے تھے اور تمام امت کو یہ دعوت دی جاتی تھی کہ وہ یہاں آئیں اور جتنی شکایتیں کسی کو ہوں، یہاں آ کے پیش کریں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شکایتیں پیش ہوتی تھیں، وہاں ان کے فیصلے ہوتے تھے، مملکت کے جو اہم اصولی کاروباری معاملات تھے وہ اس اجتماع کے اندر آ کر حل ہوتے تھے، Discussion ہوتی تھی، مشورے ہوتے تھے، طے ہوتا تھا۔ یہ تھا وہ حج۔ تو جب یہ مرکز اس مملکت کی تحویل میں ہی نہیں یعنی کیپٹل ان کے پاس نہیں تھا تو حج کے فرض ہونے کے معنی کیا تھے۔

فتح مکہ کے بعد جب اسے مملکتِ اسلامیہ کا کیپٹل بنا دیا گیا تو 9 ہجری کو حج فرض ہوا

غور فرمایا آپ نے۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہوا تو اس کے بعد سن 9 ہجری میں حج فرض ہوا ہے۔ ہونا ہی یہ چاہیے تھا۔ تو سن 9 ہجری میں سربراہِ مملکت کو خود جانا چاہیے تھا لیکن نبی اکرم ﷺ بعض وجوہات کی بناء پر معذور تھے، وہ وہاں خود تشریف نہیں لے گئے۔ آپ نے حضرت ابوبکر کی بطورِ اپنا نمائندہ بھیجا۔ اور سن 10 ہجری میں خود نبی اکرم ﷺ تشریف لے گئے اور یہ حج فرض ہونے کے بعد آپ کا یہ پہلا اور آخری حج تھا۔ سن 9 ہجری کی بات اب ہم کر رہے ہیں۔ مکہ کی تولیت یا کعبہ کی تولیت اس مملکت کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ یہ جو اس کے بعد پہلا حج آ رہا ہے یہ اجتماع جو وہاں ہو رہا ہے تمام اہلِ عرب کا اسے حجِ اکبر کہا ہے۔ ابھی وہ آتی ہے آیت۔

حجِ اکبر کے عظیم اجتماع میں معاہدوں کا پاس نہ کرنے پر انہیں توڑ دینے کے اعلان کی بازگشت

اس اجتماعِ عظیم میں سب سے پہلے جب جمع ہوئے ہیں تو ایک Proclamation ہوا ہے ایک اعلان ہوا ہے مملکت کی طرف سے۔ اور آپ غور کیجیے کہ یہ اعلان جو ہے سورۃ توبہ کی ابتداء اس سے ہوتی ہے پہلی آیت سے، آپ دیکھیں گے کہ قرآن حکیم کی سورتوں

سے اس سورۃ کی ابتداء کا انداز ہی کچھ مختلف ہے۔اس میں کوئی تمہیدی بات نہیں کہی، کوئی تعارفی بات نہیں کہی گئی۔۔سیدھے طور پر ابتداء کردی گئی ہے اس اعلان سے۔بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (9:1)ان غیر مسلموں سے جو اس وقت تک معاہدے ہوئے تھے انہوں نے ان معاہدوں کی پاسداری نہ کی وہ توڑتے رہے تمہارے خلاف یہ مخالفتیں اب تک کرتے رہے ۔الفاظ ابتداء یوں ہوتی ہے کہ اعلان کیا جاتا ہے اس امر کا کہ آج مملکتِ خداوندی جسے خدا اور رسول کہہ کر قرآن پکارتا ہے ۔ان معاہدوں سے بری الذمہ ہیں کہ جو ان کے ساتھ کیے گئے تھے۔ان الفاظ سے ابتداء ہو رہی ہے۔دیکھتے ہیں آپ کہ یہ ایک اعلان ہے Proclamation ہے۔اور یہی بات ہونی چاہیے تھی۔جب اجتماع ہوا ہے تو سورۃ توبہ کی ابتداء اس اعلان سے ہوئی ہے جو اجتماع میں سب سے پہلے سربراہِ مملکت کے نمائندے نے آ کر جبلِ رحمت پہ کھڑے ہو کر پورے عرب کو للکار کے یہ کہا ہے کہ سن لیجیے' وہ مشرکین جن کے ساتھ کچھ معاہدے تھے اور انہوں نے معاہدوں کی پاسداری نہیں کی' معاہدے توڑتے رہے۔۔اعلان ہے اس امر کا کہ بری الذمہ ہے مملکتِ خداوندی اب ان معاہدوں سے۔آپ کو یاد ہے سورۃ انفال میں پیچھے یہ آیا تھا کہ اگر تم دیکھو کہ یہ معاہدوں میں خیانت کر رہے ہیں تو بغیر اعلان کیے ہوئے معاہدے کو مت توڑو۔پہلے ان کا معاہدہ ان کی طرف لوٹا دو تاکہ تم اور وہ دونوں ایک سطح پہ آ جائیں اور پھر آگے قدم اٹھاؤ۔اس حکمِ خداوندی کی تعمیل میں یہ اعلان کیا گیا۔کعبہ کی تولیت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد' فتح مکہ کے بعد' یہ اعلان کیا گیا کہ بری الذمہ ہے مملکتِ خداوندی ان معاہدات سے جو ان لوگوں کے ساتھ کیے۔آگے آتا ہے کہ کیوں یہ ہوا۔اس لیے کہ انہوں نے معاہدوں کی پاسداری نہیں کی' یہ بار بار توڑتے رہے اور ہر بار انہوں نے بغاوت کی انہوں نے عہد شکنی کی اس لیے یہ توڑ دیا جاتا ہے۔سورۃ توبہ کی ابتداء اس اعلانِ عظیم سے ہوتی ہے کیونکہ پہلے کوئی تعارفی بات اس قسم کی نہیں آئی۔ہمارے ہاں ایک سوال آیا ہوا ہے کہ کیا یہ الگ سورۃ ہے یا پچھلی سورۃ کے تسلسل میں ہی یہ چیز ہے۔اور وہ سوال اس لیے پیدا ہوا جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے اس کا انداز وہ نہیں جو عام سورتوں کا ہے کہ کچھ تھوڑا بہت تو تعارف کے طور پہ کہا جائے۔۔یہاں کچھ نہیں کہا گیا۔اعلان کر دیا گیا ہے۔اور ہونا ہی یہ چاہیے تھا عزیزانِ من!۔مملکت کے قیام کے بعد پہلا اعلان ہمیشہ آپ دیکھیں گے کہ قیامِ مملکت جب ہوتی ہے تو گورنر اٹھ کے اعلان کرتا ہے سب سے پہلے اس مملکت کی طرف سے۔یہ اعلان ہوا۔چنانچہ یہ بحث ہمارے ہاں ہوئی کہ یہ سورۃ الگ سورۃ ہے یا پچھلی سورۃ کا تسلسل اس بات کا فیصلہ نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے ہاں اس سورۃ سے پہلے بسم اللہ نہیں لکھی جاتی۔۔ہر سورۃ سے پہلے لکھی جاتی ہے۔ویسے اس کو نئی سورۃ شمار کر لیتے ہیں' نئی سورۃ ہے لیکن اس سے پہلے بسم اللہ نہیں لکھتے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ طے شدہ نہیں کہ اسے الگ سورۃ قرار دیں یا پہلی سورۃ کے تسلسل میں ہی سمجھیں۔بہر حال اس کا تعلق ترتیب سے تھا۔۔اصلِ موضوع جیسے ایک مملکت وجود میں

آ کر اپنا Proclamation پیش کرے۔ یہ Proclamation تھا کہ بری الذمہ ہے یہ۔

معاہدے توڑنے والوں سے آپ کا حسن سلوک اور مہلت کا وقفہ

اب آپ کہیں گے کہ ہاں اعلان کر دیا معاہدے کو توڑنے کا تو اس کے فوری بعد ان کو جھپٹ لیا ہو گا۔ لیکن یہ تو مملکتِ خداوندی تھی یہ تو قرآن ہے۔۔ بری الذمہ ہونے کے بعد بھی کہتا ہے کہ فَسِيۡحُوۡا فِى الۡاَرۡضِ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ (9:2) چار مہینے کی ان کو مہلت دی جاتی ہے اس چار مہینے کے عرصے میں یہ اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کر لیں۔ اگر انہوں نے بطیبِ خاطر اپنی رضامندی سے اسلام قبول کرنا ہے تو اس امت کے اجزاء بن جائیں' اگر انہوں نے غیر مسلموں کی حیثیت سے اس مملکت کے تابع زندگی بسر کرنی ہے تو اس کے لیے پھر وہ معاہدہ ہو گا۔ اور اگر یہ صورت بھی نہیں ہے تو پھر انہیں یہ ملک چھوڑ کر چلے جانا چاہیے۔ اور اس کے لیے معاہدے فسخ کرنے کے بعد بھی کہا کہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اور اس چار مہینے کی مہلت میں فَسِيۡحُوۡا ان کو نظر بند نہیں کیا جاتا ان کو اجازت ہے اس ملک میں چلنے پھرنے کی' ہم ان پر کوئی پابندی عائد نہیں کر رہے۔ فیصلہ کر لیں چار مہینوں کے اندر۔ اور یہ بات کان کھول کر سن لیں وَّ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ (9:2) کان کھول کے سن لیں کہ اگر تمہارے ذہن میں یہ بات ہے کہ ہم اب بھی مقابلہ کر کے اس جماعتِ مؤمنین کو اس مملکتِ خداوندی کو شکست دیدیں گے تو یہ بات دل سے نکال دو۔ یہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخۡزِى الۡكٰفِرِيۡنَ (9:2) اس کے برعکس اب یہ مملکت اس پوزیشن میں آ گئی ہے کہ یہ اس کے خلاف جو سرکشی کرنے کے لیے اٹھے گا' اُسے یہ یقیناً نیچا دکھا دیں گے۔ اب یہ اس قابل ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اعلان۔۔ اس میں کس قدر دبدبہ اور جلال ہے اس اعلان کے اندر۔ ایسا ہونا چاہیے تھا۔

حضورؐ کی زندگی کے 21 سال اذیتیں برداشت کرتے ہوئے گزر گئے

تیرہ سال پہلے مکے کی زندگی کے پھر مدینے کی زندگی کے آٹھ سال قریباً۔۔ اب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے بڑی تکالیف ان کو دی تھیں' بڑی اذیتیں پہنچائی تھیں اس کے انتقام میں یہ اب کہا جا رہا ہے۔ سوال ہی نہیں ہے انتقام کا تو۔ انتقام کا فیصلہ تو فتح مکہ کے دن ہو گیا تھا کہ جب وہ سارے لوگ جنہوں نے ذاتی طور پر نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے متعلقین اور تمام صحابہ کبارؓ اور جماعتِ مؤمنین کو اس قدر اذیتیں دی تھیں۔

فتح مکہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کا پابجولاں قیدیوں سے ایک سوال وجواب

ذاتی طور پہ ان میں سے ایک ایک شخص سامنے پابجولاں کھڑا تھا مفتوح قوم کے قیدیوں کی حیثیت سے۔اور وہاں یہ چیز تھی کہ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کہو تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔وہ بھی عرب تھے اُنہوں نے کہا ہے کہ جیسا دشمن کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔آپ ﷺ نے کہا کہ ٹھیک ہے تم اپنی اس قومی روش کے مطابق یہی کہو گے لیکن تمہیں معلوم نہیں ہے جس سے کہہ رہے ہو اس کے سامنے زندگی کے کچھ اور اصول ہیں۔جتنی اذیتیں تم نے دی تھیں ان میں بہت سی اکثر و بیشتر ذاتی طور پہ مجھے تکلیف پہنچائی تھی' میرے عزیزوں کو تکلیف پہنچائی تھی' تمہارے ہاتھوں ہمارے خون بھی ہوئے تھے۔ہوسکتا ہے کہ اب تمہارے ساتھ وہ سلوک جو تم کہتے ہو جیسا دشمن کرتے ہیں وہ کیا جائے۔اس میں ہوسکتا ہے کہ میرے ذاتی انتقام کے جذبات بھی آجائیں اور یہ چیز اصولِ قرآنی کے خلاف ہوگی۔لہٰذا لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ (12:92) آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔کہاں لے جاتا ہے قرآن انسان کو۔

خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کا اعلان جسے اذان کہا جاتا ہے جسے ہم آج بانگ کہتے ہیں

عزیزانِ من!۔ذاتی انتقام کا سوال نہیں تھا جو ان سے کہا جارہا تھا کہ چار مہینے تک تم چل پھر لو فیصلہ کرلو اپنے متعلق۔یہ مملکت کی بات تھی۔اور وہ جو کہا ہے کہ یہ تمہارے ذہن میں خناس سمایا ہوا ہے کہ مقابلہ کے بعد تمہیں مغلوب کردیں گے تو دماغ سے یہ بات نکال دو' اب یہ نہیں ہوسکے گا۔اور پھر یہ اعلان ہی کے الفاظ ہیں وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖۤ اِلَی النَّاسِ یَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَکۡبَرِ اَنَّ اللّٰہَ بَرِیۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ وَ رَسُوۡلُہٗ (9:3) اذان۔۔دیکھتے ہیں یہ کیا اذان مل رہی ہے یہاں آیا ہے یہ لفظ اذان کا۔اعلان کردو اس چیز کا۔۔ اور یہ جو اعلان ہے یہ ذاتی طور پر یہ کرنے والا نہیں کرتا۔لفظ اعلان کے اندر یہ چیز موجود ہے یہ تو کسی کے اذن سے کی جاتی ہے۔مملکت اُسے کہتی ہے کہ تمہیں ہم اجازت دیتے ہیں کہ تم یہ Proclaim کردو اور اس لیے اس کو اذان کہا جاتا ہے کہ یہ اذن کے ساتھ کی جاتی ہے۔کہاں سے بات کہاں چل نکلتی ہے عزیزانِ من! لیکن جب وہ اذان ہی بانگ ہو کے رہ جائے''تے فیر او ہدے بعد کی کہنا''۔

قرآن حکیم کے نزدیک لفظ حج اکبر کا مقام لیکن ہمارے ہاں اس کے متعلق پایا جانے والا تصور

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖۤ اِلَی النَّاسِ یَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَکۡبَرِ (9:3) یہاں قرآنِ کریم نے اسے حج الاکبر کہا ہے۔۔مملکت کے سب سے پہلے اجتماع کو حج اکبر کہا ہے۔اب آپ کو معلوم ہے کہ جمعہ کونسا ہوتا ہے۔اتفاق نال جیہڑا ہو جائے حج اکبر ہوندا اے جی' سبحان اللہ جی اللہ نے بڑی رحمت کتی حج وی نصیب کرایا تے حج وی حج اکبر ہوگیا''۔چلیے جی۔اَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖۤ (9:3) آپ دیکھیے اس میں مملکت کی پوری شان جلالت کی ٹپک رہی ہے۔اس حجِ اکبر کے دن اس اجتماعِ اکبر کے دن کہ مملکت کی Establishment

کے بعد پہلا اجتماع ہمارا ہے۔۔اس امر کا اعلان کیا جاتا ہے کہ خدا اور اس کا رسول یعنی مملکتِ خداوندی ان مشرکین سے کہ جنہوں نے اس طرح سے معاہدوں کی مخالفت کی ہے' خیانت کی ہے' پاسداری نہیں کی۔۔اعلان کیا جاتا ہے کہ ان سے بری الذمہ ہیں۔سن رکھو۔ لیکن وہ جو مہلت دی گئی ہے اس میں بھی یہ کہا **فَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ** (9:3) اگر تم اس روش کو چھوڑ دو' لوٹ آ ؤ شرافت کی طرف **فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ** (9:3) تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔

باہمی تعلقات کو توڑتے وقت بھی حسن کارانہ انداز اختیار کرنا ہوگا

آپ دیکھتے ہیں کہ کسی کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے میں تو ہر شخص حسنِ سلوک کو رواداری کو' کشادہ ظرفی کو ملحوظ رکھتا ہے کیونکہ تعلقات وابستہ کرنے ہوتے ہیں' اس کا یہ تقاضا ہوتا ہے۔تعلقات توڑتے وقت تو ایسا نہیں ہوتا وہ تو توڑے ہی اس وقت جاتے ہیں کہ جب یہ تمام چیزیں ختم کی جائیں۔لیکن قرآن کی تعلیم تو یہ تھی کہ **وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيۡلًا** (73:10) ان سے تعلقات توڑو تو وہ بھی حسن کارانہ انداز سے توڑو۔قائم کرنا تو ایک طرف رہے' یہاں تو تعلقات توڑنے میں بھی کہا جاتا ہے کہ انسانیت کی شرافت کو ملحوظ رکھ کے توڑو۔ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم اپنی روش کو چھوڑ دو گے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ان کو نصیحت کی جارہی ہے کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔**وَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ** (9:3) اور اگر تم سرکشی پہ اتر آئے اور اسی طرح سے پھر پلٹ گئے اپنی روش کے اوپر تو پھر کہا کہ یاد رکھو یہ نہ کہو کہ ہم جو کہہ رہے ہیں کہ ہماری شرافت' ہماری رواداری اور اعلیٰ ظرفی کو ہماری کمزوری مت سمجھنا۔مصیبت یہی ہے کہ دنیا میں شرافت کو کمزوری سمجھ لیا جاتا ہے اور یہ انتہائی کمینگی ہے جو اس طرح سے دوسرے کی شرافت کو کمزوری سمجھ کے Exploit کرے۔کہا کہ یہ کمزوری نہیں ہے جو ہم تمہیں بار بار کہہ رہے ہیں' یہ ذہن سے بات نکال دو۔یہ ہماری وسعتِ ظرف ہے' انسانیت کے ساتھ ہم اسی قسم کے معاملات کرتے ہیں۔اگر ایسا تم نہیں کرو گے **وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ** (9:3) تو پھر ان سے کہہ دو کہ پھر اس کی سخت سزا تم کو دی جائے گی۔

معاہدے نہ توڑنے والوں کے لیے استثناء کا پہلو

اب وہ جو پہلا اعلان ہوا ہے کہ ہم بری الذمہ ہیں۔۔فوراً اس کا استثنا آ گیا۔**اِلَّا الَّذِيۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ثُمَّ لَمۡ يَنۡقُصُوۡكُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَمۡ يُظَاهِرُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَحَدًا فَاَتِمُّوۡۤا اِلَيۡهِمۡ عَهۡدَهُمۡ اِلٰى مُدَّتِهِمۡ** (9:4) لیکن دیکھیے جنہوں نے عہد شکنی نہیں کی' جنہوں نے کوئی خیانت نہیں کی' اپنے معاہدات میں کسی قسم کی کمی نہیں کی' تمہارے خلاف تمہارے دشمنوں کو مدد نہیں دی ان کے معاہدے نہیں ٹوٹتے' وہ ان کی مدت تک قائم رہیں گے۔تو اب دیکھ لیا کہ یہ کن کے لئے اعلان کیا گیا تھا کہ معاہدے ٹوٹ گئے۔۔وہ

جنھوں نے معاہدوں میں خیانت کی تھی خرابیاں پیدا کی تھیں معاہدے توڑے تھے۔فوراً یہ کہہ دیا کہ یہ اعلان ہر ایک کے لیے نہیں ہے۔۔ جنھوں نے ایسا نہیں کیا تھا ان کے ساتھ جو ہمارے معاہدے معاہدوں کی مدت تک وہ قائم رہیں گے۔اِنَّ اللّٰـــہَ یُـحِـبُّ الْمُتَّقِیْنَ (9:4) دیکھیے کہاں متقین کا لفظ آ رہا ہے۔خدا پسند کرتا ہے۔۔یہ کیوں ہم کہہ رہے ہیں کہ ان سے معاہدات نہیں ٹوٹیں گے۔۔ اس لیے کہ خدا متقین کو پسند کرتا ہے۔متقین کے کیا معنی ہوئے یہاں۔۔معاہدوں کی پاسداری کرنے والے قانون کی نگہداشت کرنے والے۔۔انہیں خدا پسند کرتا ہے۔اور یہ تو مشرکین ہیں عزیزانِ من! جنھیں یہاں متقین کہا جا رہا ہے۔لیکن جب متقین، متقی پرہیز گار ہو جاتا ہے تو اس کے معنی کچھ اور ہو جاتے ہیں''ڈنگوری پھڑی ہوئی ہوندی ہیگی اے نیویں پائی ہوئی ہوندی ہیگی اے تے پانچے ٹنگے ہوئے ہوندے نیں تے ٹریا اون ڈیا ہیگا اے'' بڑا متقی پرہیز گار ہے۔

قرآنِ حکیم نے معاہدات کی پاسداری کرنے والے غیر مسلم کو بھی متقی کہا ہے جب کہ اس چیز کے خلاف جانے والوں کے ساتھ جنگ کا حکم ہے

مشرکین میں سے بھی معاہدات کی پاسداری کرنے والے قانون کی نگہداشت کرنے والے۔۔وہ ہیں متقین۔تو جب مؤمنین میں سے متقین ہونگے تو سوچیے کہ وہ کیا ہونگے۔تو کہا کہ فَـاِذَا انْسَـلَـخَ الْاَشْھُـرُ الْـحُـرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَ جَدْتُّمُوْھُمْ وَخُـذُوْھُـمْ وَ احْـصُـرُوْھُـمْ وَ اقْـعُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ (9:5) چار مہینے گذرنے کے بعد جو لوگ نہ تو اسلام میں داخل ہوں، نہ پرامن رعایا کی حیثیت سے رہنا چاہیں، نہ ملک چھوڑ کے ہی جائیں۔یہیں رہیں اور اسی طرح سے مخالفت کرتے رہیں، سازشیں کرتے رہیں، سرکشیاں کرتے رہیں تو پھر تو ان کے خلاف جنگ کرنی ہی ہوگی۔تب ان کے خلاف جنگ کرو۔اور جہاں بھی جنگ کا قرآن نے حکم دیا ہے۔۔آخری انتہا تک وہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے کہ جنگ کی نوبت نہ آنے پائے۔لیکن جب نوبت آتی ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ اِنَّ بَـطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (85:12) پھر گرفت آہنی ہاتھوں سے کرو۔جب یہ وقت آ جائے تو پھر ان کے ساتھ جنگ کرو، ان کو گرفتار کرو، ان کو روکے ہوئے رکھو، ان کی گھات میں رہو۔ ہر چیز جو ملٹری سٹرٹیجی کی ہوتی ہے وہ ساری چیزیں کرو۔۔بھرپور طریق سے پھر ان کے ساتھ جنگ کرو۔مقصد تو حق اور صداقت کی مخالفت کی قوت کو توڑنا ہوتا ہے۔جب بھی وہ قوت ٹوٹ جائے اس کے بعد پھر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جنگ کا۔لیکن قوت کا توڑنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔اتنی بڑی اتمام حجت کے بعد۔۔معاہدوں کی خیانت انہوں نے کی ہے، یہ توڑ رہے ہیں پھر بھی چار مہینے کی مہلت دی جا رہی ہے۔اس مہلت میں ان کو نظر بندی نہیں ہے، اجازت دی جا رہی ہے چلنے پھرنے کی۔اس کے بعد بھی اگر ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ پرامن شہری کی حیثیت سے نہیں رہنا چاہتے تو پھر جنگ کرنی ہوگی۔کرنی ہوگی تو بھرپور کرنی

پڑے گی۔

امن کے ساتھ رہنے والے غیر مسلموں کے متعلق قرآن کے احکام

فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوۡا سَبِیۡلَہُمۡ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (9:5) لیکن اگر یہ اپنی روش سے باز آ گئے۔ یہاں بھی اور اگلی دو آیتوں کے بعد بھی یہ بات آئی ہے' قرآن نے یہاں ایمان لانا' اسلام لانا' امت میں داخل ہونا' یہ الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں۔ اصل میں تو یہی ہے کہ یہ سب کچھ چھوڑ کے اس امت کے فرد بن جائیں' اس مملکت کے فرد بن جائیں۔ لیکن اُسے تعبیر کیا ہے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے۔ آپ غور کیجیے کہ یہ دو چیزیں پھر کیا تھیں۔ جب دین مذہب بن کے رہ گیا اسلام تو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ دونوں کی دونوں غیر مسلموں کی حکومت کے تابع محکوم زندگی بسر کرتے ہوئے بھی' یہ دو چیزیں جو تھیں یہ وہ ادا ہو جاتی ہیں۔۔

غیروں کی مملکت میں قرآنی نظام حکومت چہ معنی

نماز پڑھنا زکوٰۃ دینا۔ انگریزوں کی حکومت میں بھی اس کی اجازت تھی' آج ہندوؤں کی حکومت میں بھی اجازت ہے۔ حتیٰ کہ رشیا جو سوشلسٹ ممالک خدا کو بھی نہیں مانتے' وہاں بھی مسلمانوں کو بڑی مذہبی آزادی ہے۔ جاتے ہیں یہ لوگ تو آ کے فخر سے کہتے ہیں کہ وہ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں ہم نے دیکھا ہے مسجدیں بھری ہوئی تھیں۔ اور زکوٰۃ تو خیرات کی چیز ہے وہ تو جب جی چاہے دیتے چلے جایئے۔ اس کا نام اسلام کی آزادی رکھا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی رسوم کی آزادی اسے آپ کہہ سکتے ہیں۔ اسلام کی آزادی اور غیروں کی مملکت دو متضاد چیزیں ہیں عزیزانِ من!۔ اسلام کی آزادی تو اس کی Sovereignty ہے۔ ایک سٹیٹ کے اندر دوسری Sovereign State ہو ہی نہیں سکتی۔ کوئی بھی غیر مسلم مملکت اپنی مملکت کے اندر اسلام الدین کی آزادی دے ہی نہیں سکتا۔ اور آپ اس مملکت کے شہری اس مملکت کے مملوک رہتے ہوئے صحیح آزاد اسلام کی زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے۔

اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ مملکت اسلامیہ کی دو بنیادی خصوصیات ہیں

یہ جو دو چیزیں ہیں۔۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ۔ قرآنِ کریم نے الدین یا مملکتِ اسلامیہ کی یہ دو بنیادی خصوصیات یا یہ مقصد بتائے ہیں۔ سورۃ حج میں ہے مؤمنین کے متعلق اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (22:41) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کی حکومت قائم ہو جائے گی تو یہ اقامت صلوٰۃ بھی کریں گے اور ایتائے زکوٰۃ بھی کریں گے۔ یہ حکومت کا فریضہ ہے۔

صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا بنیادی اور عملی مفہوم معاشرے کا ایک مربوط نظام ہے جو باہمی مشاورت سے عملی شکل اختیار کرتا ہے

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ۔ شرط ہے اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ (22:41) اگر انہیں حکومت ملے گی تو یہ کرسکیں گے۔ یعنی جب حکومت نہیں ہوگی تو یہ دو چیزیں ہو نہیں سکتیں۔ یہاں بھی کہا ہے کہ یہ لوگ اگر اس کے بعد اپنی روش سے باز آجائیں اور دو ہی چیزیں کہی ہیں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے فریضہ میں تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں تو آگے جا کے کہا ہے کہ پھر وہ تمہارے بھائی ہو جائیں گے۔ گویا یہ صحیح بات ہے جسے آپ کہتے ہیں ایمان لانا اسلام لانا۔ لیکن وہ لانا ہے کیا عملاً۔۔ عملاً اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ اور قرآن نے بتا دیا ہے اپنی آزاد مملکت کے بغیر یہ دو چیزیں ہو نہیں سکتیں۔ تو آپ سوچ لیجیے کہ یہ کتنی اہم چیزیں ہیں دونوں۔ سارا اسلامی نظام سارا مملکت کا نظام ان دونوں میں ہو جاتا ہے۔ الصلوٰۃ اس نظام کا نام ہے، نظامِ معاشرہ کا نام ہے جس میں افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتے رہیں۔ صلوٰۃ کے معنی ہی یہ ہیں۔ یہ اجتماعِ صلوٰۃ جسے ہم اب نماز کہتے ہیں، یہ اس کا ایک عملی طریقہ ہے کیونکہ یہ چیز باہمی مشاورت سے ہونی ہے۔

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے نظام کو عملی شکل دینے کا طریقِ کار

سورۃ شوریٰ میں ہے کہ ان کے معاملات جتنے بھی ہیں وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38) وہاں ہے وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (42:38) ان کے معاملے باہمی مشاورت سے طے ہونگے کیونکہ یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے۔ یہ تو ایک تنظیمی چیز تھی مملکت کی، Organizational چیز تھی چھوٹے چھوٹے یونٹ بنائے تھے کہ ان یونٹ کے اندر یہ چیز ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جب کبھی اسلامی حکومت کہیں قائم ہوئی تو یہ ہمارے ہاں کے جو انتظامی یونٹس بنے ہوئے ہیں نا۔۔ چھوٹے چھوٹے تھانے پھر تحصیلیں پھر ضلع پھر کمشنریاں یہی قائم رکھے جاسکیں گے۔ لیکن آپ دیکھیں گے اسلام کی تاریخ، جس شکل میں بھی مسلمانوں کی تاریخ صدرِ اول کی ہے ہمارے پاس۔۔ اس میں کیپٹل کے اندر نماز کی امامت جسے آپ کہتے ہیں وہ ہیڈ آف دی سٹیٹ کرتا تھا اور Provinces کے اندر گورنر کرتے تھے چھوٹے شہروں کے اندر آفیسرز جو تھے وہ کرتے تھے۔ مملکت کا فریضہ ہے اور ایتائے زکوٰۃ کا تو فریضہ ہے جس کے لیے یہ مملکت وجود میں آتی ہے۔ پوری انسانیت کو نشو و نما کا سامان بہم پہنچانا۔ ابتداء اپنے معاشرے سے ہوتی ہے اور اس کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں تو پھر وہ رب العلمین کی لی ہوئی ذمہ داری کو پوری کرتی ہے مملکتِ خداوندی۔۔ ربوبیتِ عالمینی۔ یہ ہے مقصد ''الدین'' کا اس

مملکت کا۔اسی لیے بجائے اس کے یہ کہا جائے کہ پھر یہ اسلام لائیں ایمان لائیں۔۔یہ بھی کہنے کی بات ہے یہ بھی کہا گیا ہے۔۔اتنی سی بات کہہ دینے سے بھی مقصد یہ ہے کہ اگر یہ اپنی روش سے باز آ جائیں اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ میں تمہارے ساتھ شریک ہو جائیں تو پھر ٹھیک ہے فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (9:5) پھر ان کو کوئی روک نہیں ہے پھر خدا ان کو سامانِ حفاظت بھی دے گا سامانِ نشو ونما بھی دے گا جیسا تمہیں دیا ہوا ہے۔اب آگے چلیے۔

اپنے ہاں کے مصلحین کا فتویٰ کہ اسلام شمشیر سے پھیلا تھا

دیکھیے اس وسعتِ ظرف کو اس کشادگیٔ نگاہ کو۔مخالفین بھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور پہ پھیلا' اب آپ کے ہاں مصلحین کی بھی یہ کیفیت ہے۔۔وہ بھی یہ چیز کہتے ہیں کہ ہاں صاحب اسلام قوت کے زور سے پھیلایا جائے گا۔میں نے پچھلی مرتبہ عرض کیا تھا کہ انہوں نے اعلان کر رکھا ہے کہ جب کبھی یہاں اسلامی نظام قائم ہوا تو ایک سال کی مہلت صرف نوٹس دیا جائے گا۔جس طرح انہیں مشرکین کو مہلت چار مہینے کی ملی ہے' یہ غنیمت ہے ایک سال کی مہلت دے رہے ہیں۔ایک سال کی مہلت ملے گی اس کے بعد پھر ان کے دیے ہوئے اسلام کے معیار پہ جو پورا نہیں اترے گا' ان سب کو قتل کر دیا جائے گا۔یہاں کیا کیفیت ہے۔میں نے عرض کیا تھا کہ صاحب اسلام میں قرآن میں تو لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2:256) ہے کہ دین میں کسی قسم کی جبر و اکراہ نہیں ہے' جبر نہیں ہے۔تو کہا ٹھیک ہے دین میں داخل ہونے کے لیے جبر نہیں ہے لیکن اس میں سے واپس نہیں جا سکتا۔وہ کہے گا کہ نہیں میرا نہیں جی ٹھکتا' تو کہا جائے گا تم نے کیوں اسلام قبول کیا تھا اب تمہیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔وہی چھوٹے پیمانے پہ جو نکاح کے مسئلہ میں ان کے ہاں آ جاتا ہے۔۔عورت کی مرضی کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا اس کی پوری رضامندی کی ضرورت ہے۔کہتے ہیں ٹھیک ہے وہاں تو جبر نہیں ہے۔اور جب ایک دفعہ وہ پھیرے لے کے پھنس جاتی ہے''تے ہن کتھے جائیں گی''۔اس کے بعد یہ انکے ہاں کا مسئلہ ہے کہ طلاق کا کلی حق اور اختیار خاوند کے ہاتھ میں ہے۔

جنگ کے دوران دشمن کے قیدیوں سے یا پناہ مانگنے والوں سے حسن سلوک کرنے کا انداز

سنیے یہ کہاں کہا جا رہا ہے۔۔مملکت قائم ہوگئی صاحب' ان مشرکین کو اس چیز کی اجازت بھی دی کہ اپنے متعلق فیصلہ کر لیں۔پھر بھی ان میں سے بعض نے مخالفت کی' جنگ کی۔جنگ چھڑی ہوئی ہو۔۔ایک تو وہ ہے نا کہ آپ کسی کو مغلوب کر کے اسے قیدی بنا لیں۔کہا وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ (9:6) ان میں سے اگر کوئی سفید جھنڈی دکھا کے پناہ لینے کے لیے تمہارے پاس آئے اُسے پناہ دو۔اب دیکھیے کس حالت میں یہ آ گیا ہے۔۔آپ کا غلبہ ہے آپ کا اقتدار ہے وہ پناہ لینے کے لیے آپ کے پاس آ گیا

ہے پناہ دواس کو۔ پھر حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ (9:6) وہاں اُسے تم قرآن کی صداقتیں سمجھاؤ' اس کے سامنے یہ حقیقتیں پیش کرو اُسے بتاؤ کہ ہم کیا کہتے ہیں' سناؤ اُسے یہ چیز۔ اس کے بعد۔۔اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ صاحب میں اب جانا چاہتا ہوں۔ تمہاری پناہ میں آیا تھا وہ مسلمان نہیں ہوتا وہ کہتا ہے میں جانا چاہتا ہوں۔ دنیا کی مملکت بھی ہوگی عزیزانِ من! زیادہ سے زیادہ اس کو بنیادی حق یہ دے گی کہ اُسے کہے گی کہ جاؤ۔ دیکھیے قرآن کہاں تک جاتا ہے۔ کہتا ہے ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ (9:6) یہی نہیں کہ وہاں کہہ دو کہ جاؤ' وہاں تک حفاظت سے پہنچا کے آؤ جہاں یہ کہہ دے کہ ہاں اب میں امن میں آگیا۔ میرے اللہ!!!۔ اسے تم نے خود نہیں پکڑا تھا' وہ کسی خطرے سے ڈر کے تمہارے پاس پناہ کے لیے آگیا تھا' تم نے پناہ دی' اس کی حفاظت کی۔ صرف یہ ہے کہ اس تک قرآن کی بات پہنچائی۔ اب وہ یہاں سے جانا چاہتا ہے۔ بھئی تمہارے ذمے کیا ہے یہ Headache' تھوڑا ہے وہ کسی خطرے سے ڈر کے آیا تھا' تم نے حفاظت کی اس کی حفاظت کا سامان بہم پہنچایا اچھی طرح سے رکھا' جانا چاہتا ہے سلام علیکم۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اس کو باہر خطرے محسوس ہونگے اس کو اُس کے مامن تک پہنچا کے آؤ۔ سنیے کیوں یہ بات ہے۔ کہا ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ (9:6) اس لیے جاہل ہیں ناواقف۔ اف!!!۔ پہنچا کے آؤ ان کے مامن تک۔ یہ ہے اسلام کی جنگ یہ ہے فاتح قوم جس نے ابھی ابھی اپنی مملکت قائم کی ہے۔ ان کے ساتھ جنگ چھیڑنے والوں میں سے ایک شخص جو پناہ لینے آرہا ہے اس کے متعلق یہ چیز ہے۔ رکھو تو یہ کیفیت' جانے کے لیے وہ کہے کہ میں جاتا ہوں تو وہاں تک پہنچا کے آؤ اس کو مامن تک' جہاں کہے کہ ہاں اب مجھے امن ہے۔ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ (9:6) کس قدر خوشی سے بات کی کہ اس واسطے کہ جاہل ہیں۔ اگر یہ اس وقت یہ قوم یہ جاہل نہ ہوتے تو قرآن انہیں سنایا تھا اس کے بعد وہ جانے کا نام ہی نہ لیتے۔ اس قسم کی فردوس بداماں زندگی کو چھوڑ کے کون دوسری جگہ جائے گا' وہی جائے گا نا جو ابھی جاہل ہے' بات سمجھا نہیں ہے۔ بات سمجھتا نہیں ہے ورنہ یہ جاتا ہی کیوں۔ کہا یہ تھا جن کے ساتھ تم نے اعلان کیا ہے کہ اب معاہدات تمہارے ساتھ نہیں رہے۔ کَیْفَ یَکُوْنُ لِلْمُشْرِکِیْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (9:7) کہا کہ جو لوگ معاہدہ کرنے کے بعد اس پر قائم رہیں' تم بھی معاہدے کے اوپر قائم رہو۔ لیکن جو لوگ اس طرح سے خیانتیں کرتے چلے جائیں' اس کے بعد ایک طویل پیریڈ کے لیے تو یہ صورتِ حالات قابلِ برداشت نہیں ہوسکتی' اسے تو یکسو کرنا ہوگا۔ اور یکسو کرنے کی بات یہی ہے کہ انہیں اتنی سی مدت دے کے اس کا اعلان کردو کہ بھئی اس کے بعد پھر معاہدہ تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ لیکن جو قائم رہیں ان کے ساتھ معاہدے کے اوپر قائم رہو۔ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (9:7) یہاں پھر وہی لفظ آیا ہے۔ یہ دونوں طرف کے ہیں اُنہوں نے بھی قانون کی نگہداشت کی وہ بھی متقی ہوگئے تم نے بھی قانون کی نگہداشت کی تم بھی

وہی ہو گئے۔

سورۃ بقرہ کی پہلی آیت کے لفظ للمتقین پر اُٹھنے والے اعتراض کی وضاحت

اب یہاں سے وہ بات سمجھ میں آتی ہے جو پہلی آیت ہے سورۃ بقرہ کی ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ هُدًى لِّلۡمُتَّقِیۡنَ (2:2) اعتراض اس پہ یہ کیا جاتا ہے اور مذہب کی رو سے دیکھیے تو اعتراض ان کا صحیح بھی ہے۔ کہتے ہیں قرآن نے کہا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو ہدایت دیتی ہے متقین کو۔ تو اس کے خلاف اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جو پہلے سے ہی متقی ہے یعنی اس کو پھر ہدایت کی کیا ضرورت ہے وہ تو متقی ہے۔ تو جو نہیں متقی اس کے لیے ہدایت نہیں۔ یعنی جو پہلے ہی متقی ہو یا ہوا ہے اس کے لیے تو ہدایت ہے۔ ''اوہنوں کیا اوگھوڑے تے کاٹھی پادے کہن لگا جی پائی ہوئی اے کہن لگا ہور پا دے''۔ متقی کو تو ہدایت دیتی ہے جو متقی نہیں ہے اس کو تو یہ ہدایت نہیں دیتی۔ آپ دیکھیے دین کو مذہب پہ لانے سے کہاں پہنچتا ہے۔ دیکھیے قرآن کہاں لے آ رہا ہے وہ کہتا ہے کہ وہ لوگ جو قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کے آرزومند ہیں ان کے لیے یہ راہنمائی دے گی۔ جو کسی ضابطے قاعدے کے مطابق زندگی نہیں بسر کرنا چاہتے' ان کے لیے یہ راہنمائی نہیں دے سکتی۔ جو کسی منزل پہ پہنچنا چاہتا ہے اس کے لیے ہے کہ چوراہے پہ کھڑا ہو کے یا دوراہے پہ جہاں پتہ نہیں ہے راستے کا' وہاں بتائے کہ ادھر کو فلاں راستہ جاتا ہے۔ او جس نے آوارگی اختیار کرنی ہے سفر کی بجائے' اس کے لیے سائن پوسٹ کی ضرورت کیا ہے ۔ متقین کے معنی ہیں کہ جو سفرِ زندگی میں آوارگی نہیں چاہتے' سفر چاہتے ہیں۔ اور سفر اور آوارگی میں فرق یہ ہوتا ہے۔۔ مسافر منزل پہ پہنچنا چاہتا ہے جو پہلے سے متعین کی ہوئی ہوتی ہے۔ آوارہ سارا دن چلتا رہنا چاہتا ہے اس کے سامنے منزل نہیں ہوتی۔ تو یہ سائن پوسٹ جو اس کتاب میں ہم نے دیے ہیں اس سے وہ لوگ راہنمائی حاصل کریں گے جو کسی متعین منزل پہ پہنچنا چاہتے ہیں' جو زندگی کو قاعدے ضابطے کے مطابق بسر کرنا چاہتے ہیں۔ میں عرض کر رہا تھا کہ اب دیکھیے کہاں کہاں متقین کا لفظ نظر آتا ہے۔ معاہدوں کی پابندی کرنے والے غیر مسلم متقی ہیں۔ کَیۡفَ وَ اِنۡ یَّظۡهَرُوۡا عَلَیۡکُمۡ لَا یَرۡقُبُوۡا فِیۡکُمۡ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً (9:8) کہا ان کی کیفیت تو یہ ہے کہ معاہدوں کی پابندی تو ایک طرف رہی' عام معاشرے کے جو آداب ہیں یہ تو ان کو بھی ملحوظ نہیں رکھتے۔ ان پہ اگر یہ غلبہ پالیں تو عام آدابِ معاشرت و اخلاق کو بھی یہ پورا نہ کریں' اس کی بھی پابندی نہ کریں۔۔ یہ یہاں تک گر چکے ہیں۔ روز آپ اس چیز کا واسطہ دلاتے ہیں کہ جنیوا کنونشن کی رو سے اخلاقی طور پر تمہارے ذمے۔ ارے کسے اخلاق سمجھا رہے ہیں آپ' یہ کسے اخلاق کی دعوت دی جا رہی ہے۔

جنیوا کنونشن کے سلسلہ میں ڈان کے ایڈیٹر مظہر علی خاں کی طرف سے پیش کی جانے والی رپورٹ کی روداد

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے دو جرنلسٹوں کو انہوں نے دعوت دی تھی' ڈان کے ایڈیٹر مظہر علی خان صاحب اس کے ساتھ گئے تھے۔ وہ ابھی ابھی وہاں سے انڈیا سے ہوکے آئے ہیں۔ انڈیا کی وزیرِاعظم محترمہ مسز اندرا گاندھی نے بھی ان کو شرف ملاقات بخشا۔ انہوں نے کہا کہ انٹرویو جو ہونا ہے۔۔تو جرنلسٹ تو عام طور پہ اپنی کاپیوں میں شارٹ ہینڈ میں لکھتے چلے جاتے ہیں سارے کا سارا۔ اُنہوں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں' ٹیپ ریکارڈر رکھ لیتے ہیں تمہیں وہ ٹیپ مل جائے گا۔ تو یہ تو بہت ہی اچھی چیز ہوتی ہے پوری کی پوری چیز سارے کا سارا انٹرویو ریکارڈ ہو جائے اس سے زیادہ مستقلاً کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مظہر علی خاں نے آ کر اپنی رپورٹ دی ہے اس کے اندر اس نے یہ لکھا ہے کہ ہم بہت خوش تھے' ہم چلے گئے ٹیپ ریکارڈر رکھا گیا' ملاقات ہوگئی۔ اس کے بعد ہم نے کہا ان سے جو ہمارے ساتھ اٹیچ کے ہوئے تھے کہ صاحب وہ ٹیپ ہمیں دیدیجئے' اُنہوں نے کہا کہ صاحب وہ کیا کیا جائے اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ ٹیپ تو Blank کا Blank ہی رہ گیا۔ چھاپتے پھرو۔ انہیں یہ اخلاق کا واسطہ دے رہے ہیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ تم ان سے شرافت کی توقع کر رہے ہو جن کی کیفیت یہ ہے کہ تم پہ اگر غلبہ پالیں تو عام آدابِ معاشرہ کو بھی ملحوظ نہ رکھیں۔ یہ انتہا ہے کمینگی کی۔ یُرۡضُوۡنَكُمۡ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَ تَاۡبٰى قُلُوۡبُهُمۡ (9:8) دیکھیے عزیزانِ من! کس طرح سے ایک ایک کر کے اس میں ہر دور کی میکاؤلی سیاست کا بتا دیا اور آج تو بھارت کا رویہ ہمارے سامنے ہے۔ کہا ان کی کیفیت یہ ہے کہ باتیں ایسی عمدہ کریں گے کہ تم سمجھو گے کہ بالکل دل کے صاف اور قول کے سچے بات کے پکے' ان کے ساتھ تو معاہدہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے' خوب راضی رکھیں گے تمہیں باتیں کر کر کے۔ اور جب باتیں کر رہے ہونگے تو اس وقت بھی ان کا دل اندر سے بغاوت کر رہا ہوگا۔ یہ ان کی کیفیت ہے۔

لفظ فاسق کا لغوی مفہوم

وَاَكۡثَرُهُمۡ فٰسِقُوۡنَ (9:8) دیکھیے یہ لفظ فاسقون کہاں آیا ہے۔ یہ فسق و فجور بھی آپ کے ہاں ہے نا ایک چیز۔ فاسق کہتے ہیں جو صحیح راستے کو چھوڑ کے پگڈنڈیوں کی طرف یوں نکل جائے۔ ان کی یہ کیفیت ہے۔ ہر وقت ان کی کوشش یہ ہوتی ہے راستہ چلتے ہوئے کہ نکلنے کا راستہ کونسا ہے۔ اسے کہتے ہیں فاسق۔ اِشۡتَرَوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِهٖ (9:9)

انڈرٹیکنگ کے باوجود عملی طور پر انڈیا کے کردار کی ایک جھلک

یہ جو معاہدے کیے یہاں قرآن نے اس کو بھی آیات اللہ کہا ہے۔ معاہدوں کی جو شقیں انہوں نے بڑے تھوڑے مفاد کے

عوض ان کی خلاف ورزی کی' آئے دن ہم یہ کہتے ہیں مسئلہ کشمیر پہ وہاں یواین او کے اندر یہ ایگریمنٹ ہوئے ہیں ان لوگوں کے ساتھ' انہوں نے انڈرٹیکنگ دی ہوئی ہے ان تمام چیزوں کی کہ وہاں Decide ہوگا اور اس کے بعد اہلِ کشمیر کو یہ حق دیا جائے گا کہ اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کریں۔ یہ بھی کہے جارہے ہیں' وہ یواین او والے بھی کہے چلے جارہے ہیں' پکارتے چلے جارہے ہیں' سب کچھ ہوتا چلا جارہا ہے۔ پچیس سال ہوگئے صاحب۔ اس سطح کے اوپر جب انسان اتر آئے۔ میں نے پچھلی دفعہ یا غالباً اس سے پہلے کہا تھا کہ حیوان اور انسان میں جو مختلف خطوطِ امتیاز ہیں' ان میں ایک خط یہ بھی ہے حیوان وعدہ نہیں کرتا انسان وعدہ کرتا ہے۔ حیوان میں تو اس کی مقدرت ہی نہیں تھی کہ وہ وعدہ کرسکتا' انسان میں اس کی مقدرت ہے' وعدہ کرسکتا ہے۔ وعدہ توڑتا ہے جس وقت وہ انسان' انسان نہیں رہتا حیوان سے بدتر درجے پہ جا پہنچتا ہے۔

قرآن حکیم میں وعدے کی اہمیت۔ خدا خود پوچھے گا کہ تم نے اسے پورا کیوں نہیں کیا

عزیزانِ من!۔ اور معاہدے سے مراد دو قوموں کے درمیان صرف Treaty نہیں ہے' یہ دو فرد بھی آپس میں کہتے ہیں جب آپ کسی سے کہتے ہیں کہ میں چار بجے آؤنگا' یہ بات ہوجائے گی۔ اسی لیے قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ وعدہ کرتے ہو تو نبھاؤ' جس کے ساتھ وعدہ کیا ہے وہ تو تمہیں بعد میں پوچھے گا' ہم تم سے پوچھیں گے اس کے متعلق۔ سمجھ لو کہ اس وعدے میں دوسرا فریق ہم ہیں۔ یہ ہے وعدے کی حیثیت۔ اِشۡتَرَوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (9:9) کتنی بری حرکتیں ہیں یہ جو لوگ کررہے ہیں۔ اس کے بعد پھر اگلی بات ہوگی کہ ان کے ساتھ جنگ کیوں ہوئی۔ لَا یَرۡقُبُوۡنَ فِیۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّۃً وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُعۡتَدُوۡنَ (9:10) پھر کہا کہ یہ اپنے مخالفین کے ساتھ جماعتِ مؤمنین کے معاملے میں عام معاشرتی رواداریوں کو بھی ملحوظ نہیں رکھتے۔

عام معاشرتی آداب کے متعلق اہم ہدایات

اور یہاں سے ہمیں ایک ہدایت ملی۔ کسی کے ساتھ تمہاری کتنی مخالفت بلکہ عداوت بھی کیوں نہ ہوجائے' عام معاشرتی آداب اور رواداریاں جو ہیں' ان کو اس وقت بھی نہیں توڑنا چاہیے۔ اور یہاں یہ صورت ہے کہ ذرا سی بات پہ ناراضگی ہو تو پھر پشتوں تک ناراضگی چلی جاتی ہے۔ ہر قسم کی مخالفت' کسی قسم کے حق اور انصاف کی بھی کوئی پاسداری نہیں ہے۔ قرآن ان کے ساتھ بھی رواداریوں کہتا ہے کہ معاشرتی رواداریاں جو ہیں ان کو قائم رکھو۔ یہ ان کے خلاف الزام عائد کرتا ہے کہ یہ اس پست سطح پر اتر آئے ہیں کہ معاشرتی آداب اور رواداریاں تک بھی ملحوظ نہیں رکھتے۔ اور پھر یہ کہا کہ فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ (9:11)

پھر وہی بات کہی۔ ہاں اگر یہ اپنی پرانی روش کو چھوڑ کے' اس نظام کے استحکام میں تمہارے ساتھ شریک ہوں تو پھر یہ دین میں تمہارے بھائی ہیں۔ تو نظر آ گیا نا کہ یہ ایمان لے آنے والے ہیں' اسلام لانے کے بعد یہ صورت ہوتی ہے ورنہ غیر مسلم تو دین میں بھائی نہیں ہوسکتا نا۔ وَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (9:11) دیکھیے ہم کیسے نکھار کر ابھار کر باتیں بیان کرتے ہیں لیکن انہیں کے لیے کہ جو ذرا علم و بصیرت سے کام لے کے ان کو سمجھیں۔ جو علم و بصیرت سے کام نہیں لیتا سوال ہی نہیں کہ غیر مسلم ہے یا مسلم ہے اس کے لیے یہ آیات کیا کام دے سکتی ہیں۔

باہمی اختلافات کی بنا پر طعن و تشنیع سے کام نہ لو

وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ (9:12) کہا کہ جو معاہدات کے بعد بھی اپنی قسموں کو توڑ دیں اور پھر کیفیت ان کی یہ ہو۔ وَ طَعَنُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ (9:12) دین کے معاملے میں طعن و تشنیع سے کام لیں۔ اسے بھی قرآن نے انسانیت کی صف کے منافی قرار دیا ہے کہ دین کے معاملے میں کسی سے طعن و تشنیع سے کام لیا جائے۔ اختلاف کرنا کسی سے اور بات ہے کسی کے ساتھ اس کے دین کے معاملے میں' اس کے مذہب کے معاملے میں گفتگو کرنا اور بات ہے' بحث و نظر بھی اور بات ہے۔ لیکن طعن و تشنیع نہیں کر سکتے تم۔ اصول یاد رکھیے کہ جس چیز کو قرآن نے غیروں کے متعلق کہا ہے کہ وہ اگر کرتے ہیں تو کہا ہے کہ یہ بڑی بری بات کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تم بھی ایسی بات نہیں کر سکتے۔ غیر مذاہب کے متعلق یہ بات تو پہلے آ گئی کہ کسی قسم کا جبر نہیں ہے۔ پھر اگلی بات ان کے ساتھ یہ ہے کہ ان کے معبودوں کو گالی نہ دو (6:108)۔ قرآن کا حکم ہے۔ پھر یہ چیز بھی ہے کہ دین کے معاملے میں طعن و تشنیع سے بھی کام نہ لو۔ ان کی غلطیاں واضح کرو۔ جس چیز سے تمہیں اختلاف ہے' اس سے بحث کرو۔ ٹھیک ہے تعلیم دو انہیں' اپنی بات وضاحت سے بیان کرو' طعن و تشنیع کی کوئی بات نہیں ہے صاحب۔ اور یہاں جو آپ کے ہاں مختلف فرقوں کے اندر مباحثے مناظرے ہوتے ہیں' ذرا کبھی ان کو سنا کیجیے کہاں تک وہ پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔۔ لعنت تو تکیہ کلام ہوتا ہے ان کا۔

عہد شکنی کی عادی قوموں پر کبھی اعتبار نہ کرو

اِنَّهُمْ لَاۤ اَیْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَنْتَهُوْنَ (9:12) تو کہا ایسے لوگوں کی بات کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہے۔ اور جن کی بات کا اعتبار نہیں ہے' وہ باتوں سے رک کیسے سکتے ہیں' ان کا علاج اس سے آگے جا کے ہوگا۔ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (9:13) کہا کہ ایسی قومیں جو

ہمیشہ عہد شکنی کریں ان کی کسی بات کا اعتبار نہ ہو انسانیت کی صف سے بھی نیچے گر جائیں۔ مہلت پہ مہلت دیے چلے جاؤ اس کے باوجود باز نہ آئیں پھر کونسی بات باقی رہ جاتی ہے کہ ان کے ساتھ آپ جنگ نہ کریں۔ تو پھر ان کے خلاف تو جنگ کرنی پڑے گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسول کو بغیر کسی جرم کے بغیر کسی الزام کے اس کے گھر سے نکالا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے میدانِ جنگ میں آ کر جنگ کی ابتداء کی تمہارے ساتھ۔ جنگ کی ابتداء بھی انہوں نے کی تمہارے ساتھ۔ ان کے ساتھ جنگ کیوں نہیں۔ کہا کہ کیا پھر تم ڈر گئے ان سے‘ ان سے تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

انسان کے لیے خوف وحزن کی اصل وجہ خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ قانون کی نافرمانی ہوتی ہے

ڈرنے کی بات تو صرف یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی تم نہ کرو۔ اور کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے دنیا میں مومن کے دل میں‘ ایک ہی بات ہے جس سے ڈرنا چاہیے۔ جیسے آگ میں انگلی ڈالنے سے ڈرنا چاہیے‘ اسی طرح سے یہ جسے کہتے ہیں خدا سے ڈرنا۔۔ یاد رکھیے کہ خدا کی نسبت ڈر یا خوف کی تعلیم قطعاً نہیں ہے‘ خدا کا بھی ڈر یا خوف نہیں ہے۔ ڈر یا خوف تو بہت بڑی سائیکولوجیکل Defect چیز ہے اس سے انسانی ذات کچلی جاتی ہے۔ یہاں خوف کے معنی احتیاط کے ہوتے ہیں۔ بچے کو ہم روکتے ہیں کہ آگ میں ہاتھ نہ ڈالو‘ وہ زہریلی دوائی کی شیشی نہ کھالے‘ سانپ کے متعلق اُسے ہم بتاتے ہیں۔ یہ جو چیز ہوتی ہے کسی کام کے نقصان رساں نتیجے سے متنبہ کرنا۔ اُسے اس سے ڈرانا کہ آگ میں انگلی ڈالوگے تو جل جائے گی‘ پھر اتنا درد ہوگا۔ اُس درد کی اذیت و کرب کو آپ ڈر کہہ لیجیے۔ ہم سانپ سے ڈرتے ہیں۔ اس ڈر میں اور مستبد حاکم کے ڈر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اِس ڈر کے معنی ہوتا ہے احتیاط برتنا کہ ایسا نہ کیا جائے‘ اُس ڈر کے معنی ہوتا ہے کہ حق کی بات زبان کے اوپر نہ آئے‘ کچلا جائے انسان۔

خوف کے سلسلہ میں خواجہ فریدالدین گنج شکر کا فرمان

تو ڈر کے معنی وہ نہیں ہوتا جو مستبد حاکم سے ڈرنا ہوتا ہے۔ وہ تو اس کی سکھا شاہی سے ڈرتا ہے آدمی اور خدا کے ہاں تو یہ چیز ہوتی نہیں ہے۔ ڈر تو ظالم کا ہوتا ہے اور قرآن تو بار بار خدا کے متعلق کہتا ہے کہ ہم کبھی اپنے بندوں پہ ظلم نہیں کرتے۔ جو بار بار اپنا تعارف رحمٰن و رحیم سے کرائے‘ اس سے ڈر کا ہے کا۔ اس لیے جہاں بھی ڈر کی بات یا قرآن کی آیات میں یہ لفظ آئیں اس کے معنی سمجھ لیجیے۔ اور پھر ہمارے ہاں تو چلانا‘ یہ ڈر جناب‘ ابھی ابھی عرس ہو رہا ہے خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کا۔ فرمایا ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے ایک دفعہ قرآن کی یہ آیت پڑھی خدا کا خوف ایسا کہ میں‘ بیس سال تک کھڑا خدا کے حضور روتا رہا صاحب۔ لے گئے آپ کو ان چیزوں کی طرف۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ خدا کی محبت ہمارے رگ و پے میں رچی ہوئی ہے۔ ارے جس سے تم ڈرتے ہو اس سے محبت کیسے کر سکتے ہو۔

خدا تعالیٰ کے رحیم و کریم ہونے کے باوجود بڑھنے والے ظلم کے سلسلہ میں پیدا ہونے والا سوال اور اس کا حل

جب بھی قرآنِ کریم میں خدا کے متعلق خوف یا ڈر کے الفاظ آئیں تو اس کا مفہوم سمجھ رکھو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے نقصان رساں نتائج سے احتیاط برتو۔ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ (9:14) یہ ہے وہ بات۔ وہ جو ذہنوں کے اندر ہے کہ صاحب اتنا ظلم ہو رہا ہے۔۔ خدا اگر بندوں کے ساتھ رحم کرتا ہے' وہ اگر انصاف چاہتا ہے اور وہ صاحبِ اقتدار بھی ہے اور وہ انصاف بھی چاہتا ہے' مظلوم کی مدد بھی کرنا چاہتا ہے۔ تو دو شرطیں پوری ہو گئیں۔۔ مدد کرنے کی قوت بھی حاصل ہے' مدد کرنا بھی چاہتا ہے اور اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں ظلم بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مظلوم' مظلوم کا مظلوم ہی رہتا ہے بیچارہ۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا اس ظالم کی کلائی کیوں نہیں توڑ دیتا۔ اور یہ بات اس سے پہلے تفصیلاً بتا چکا ہوں کہ انسانوں کی دنیا کے اندر جتنی چیزیں خدا اپنے ذمے لیتا ہے وہ ساری ذمہ داریاں اس مملکت کے ذریعے سے پوری ہوتی ہیں جو خدا کے نام پہ قائم ہوتی ہے۔ وہاں خدا کہتا ہے۔ وہ جو میں سورۃ النسآء کی آیت پڑھتا ہوں۔ مدینہ کی مملکت کے لشکروں سے کہا جا رہا ہے کہ سن نہیں رہے کہ مکہ کے مظلوم بیچارے کس طرح سے مجھے ''خدا کو'' پکار رہے ہیں کہ ہماری مدد کو پہنچو ہمیں ان ظالموں کی بستی سے نکالو۔ خدا انہیں کہہ رہا ہے کہ سن نہیں رہے وہ مجھے کس طرح پکار رہے ہیں' تم جا کے ان کی مدد کیوں نہیں کرتے (4:75)۔ یہ جو پہلا تصور ہے اس تصور کے ماتحت ''تے جواب ہونا چاہیدا ہیگا سی پئی تیرے ہتھ ٹٹے ہوئے ہیگے نیں' توں کُن کہہ کے تے کائنات نوں وجود اچ لے آیا ہیگا ایں' تے مکے والے جیہڑے نیں اوناں دا ہتھ نئیں روکیا جاندا ہیگا او تھے سانوں بھیجن ڈیاں ایں' کھان پین نو بھاگ بھری تھون بھنان نوں جمعہ''۔

خدا ظلم کو ختم کرنے کی ذمہ داری میدان بدر میں انسانوں کے ہاتھوں پوری کراتا ہے ایک اجر عظیم کے ساتھ

سوچیے عزیزانِ من! یہ مذہب کہاں لے جاتا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے یہ جب اٹھے تھے تو بدر کے میدان میں گئے تھے پھر وہاں جا کے ان کی شمشیروں نے کام کیا' ان کے تیروں نے کام کیا۔ اب دیکھیے یہاں پھر آپ کہیں گے کریڈٹ لے جاتا ہے وہ۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو یہ ٹھیک ہے تیر نکل تو رہے تھے تمہاری کمانوں سے' لیکن یہ ہم چلا رہے تھے۔ مومن کی کمان سے نکلنے والے تیر کو وہ کہتا ہے ہم چلاتے تھے۔ اف!!! یہ ہے رفاقت۔۔ مومن اور خدا کا تعلق باہمی رفاقت کا تعلق ہے اور رفاقت کی بھی یہ صورت ہے کہ اپنی ذمہ

داریاں اس نے لے لی تھیں۔ اب اس کی بارگاہ میں ہزار ہزار معافی کے ساتھ یہ باتیں کہنی پڑتی ہیں کہ وہ ذمہ داریاں لے لیں تھیں وہ ہم سے پوچھا نہیں تھا "لے تے لیاں آپے سانوں کینداا ے نبھاؤ جاکے"۔ لیکن عزیزانِ من! اس کے بدلے میں بھی پھر جو کچھ دیتا ہے وہ اپنے سے نیچے درجے کے اوپر عزیزانِ من! خدا بنا دیتا ہے۔ یونہی نہیں ہم سے ذمہ داریاں پوری کراتا۔ یہ سارا کچھ چلا آرہا ہے کہ یہ لوگ دینِ خداوندی کی کتنی مخالفت کررہے ہیں۔ کہتا ہے قَاتِلُوْهُمْ (9:14) جنگ کروان سے۔۔ کیوں؟ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ (9:14) خدا تمہارے ہاتھوں سے انہیں سزادلائے گا۔ خود براہِ راست نہیں۔ یہ ہے نظام۔ وَ يُخْزِهِمْ (9:14) اور تمہارے ہاتھوں سے ان کو رسوا کرے گا۔

خدا کی طرف سے اس کی مدد اس کے قانون کی مدد کرنے سے حاصل ہوتی ہے

اب سمجھ لیا وہ جو کہا کرتے ہیں کہ خدا خود ہی ظالم کا ہاتھ کیوں نہیں روک دیتا۔ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ (9:14) یہ ٹھیک ہے ان کے مقابلے کے لیے تم اٹھو گے مدد تمہاری ہوگی۔ کن کی مدد ہوگی؟ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (47:7) اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ ہوتا ہے نا پیدا سوال کہ خدا کی مدد کرو گے کیا' کیا معنی ہیں خدا کی مدد کرو گے۔ یہی چیزیں جو ہم نے کہی ہیں کرنے کے لیے یہ کرو گے تو خدا کا قانون تمہاری مدد کرے گا پھر تم میں سے ایک ایک دس دس پر بھاری ہوجائے گا۔ سن لیجیے مدد کیسے ہوتی ہے۔ ہمارے ذہن میں تو مدد کے وہی افسانے جو افسانے گھڑے گئے تھے' وہ سبز عماموں والے اور سفید گھوڑیوں والے' اوپر سے بم گرتا تھا وہ یوں کردیتے تھے۔ پوچھو ان سے کہ ڈھاکہ میں وہ کہاں گئے تھے۔ مدد کس طرح سے ہوتی ہے خدا کی۔

قرآنِ حکیم نے نفسیاتی تبدیلی کو شفاءِ قلب سے تعبیر کیا ہے جسے اطمینان اور یقین محکم کہا گیا ہے

عزیزانِ من! قرآن ہے پتہ نہیں زندگی میں دوبارہ یہ باتیں کہنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ قرآن کے ایک ایک لفظ کو سوچ کے پڑھا کرو۔ عظیم کتاب ہے۔ مدد کرے گا تمہاری کیا ہوگا وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ (9:14) تمہارے دلوں کو ایسی شفاء بخشے گا' اتنے بلند ہوجائیں گے۔ دلوں میں تبدیلیاں پیدا کردے گا۔ اور آپ نے قرآن کا وہ اعلان سن رکھا ہے کہ خدا کسی قوم کو دی ہوئی نعمت چھینتا نہیں ہے تاوقتیکہ وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہیں پیدا کرلیتی (13:11)۔ اسے شفاءِ قلوب سے یہاں تعبیر کیا ہے دل کے اندر کسی قسم کی بیماری اور روگ باقی نہیں رہتا۔ یہ ہے خدا کی نصرت جس قوم کو حاصل ہوجاتی ہے۔ دل تندرست ہوجاتے ہیں۔ کیا لفظ استعمال کرگیا ہے قرآن یہاں۔ یوں نصرت ملتی ہے۔ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ (9:15) یہ جو دلوں میں ابھرنے والے اس قسم کے خیالات ہیں جو اضطراب پیدا کرتے ہیں' کرب پیدا کرتے ہیں' بے اطمینانی پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہے شفاء۔۔ خود ہی اس کی تفصیل بھی بتادی یہ کرتا ہے

وہ۔اور اگر دل کو اتنا بڑا اطمینان نصیب ہو جائے وہ اطمینان جو یقین کا نتیجہ ہوتا ہے۔فریب کا نتیجہ اطمینان نہیں عزیزانِ من!۔وہ نیند جو صحت کے بعد آیا کرتی ہے،ورزش کے بعد آیا کرتی ہے، وہ نیند نہیں جو افیون کھانے کے بعد آیا کرتی ہے۔یہ اطمینان جو یقین کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اس سے وہ جو اطمینان حاصل ہوتا ہے اس کو کہا یہ ہے شفاءِ قلوب کی۔۔یہ حاصل ہو جاتی ہے۔

توبہ کے لغوی معنی پلٹ جانے یا لوٹ آنے کے ہوتے ہیں

وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (9:15) توبہ کا لفظ بار بار آتا ہے کہ توبہ تو بندے کی طرف سے ہوتی ہے۔ہم تو یہی جانتے ہیں کہ یا اللہ میری توبہ۔وہ کہتا ہے کہ خدا بھی ہوتا تائب بلکہ انسانوں کے متعلق تو وہ کہتا ہے کہ انسان تائب ہوتا ہے۔اس کے معنی ہی ہیں لوٹ آنے والا پلٹ آنے والا۔روٹھ کر چل دیے تم، تم ادھر کو چل دیے، ہم ادھر کو چل دیے۔لیکن اِدھر کا چلنے والا خدا ہے مڑ مڑ کے دیکھتا جا رہا ہے کہ روٹھے ہی چلا جا رہا ہے کہ مڑتا بھی ہے۔کہتا ہے اور روٹھنے والے تو مڑ کے ادھر آ تو ایک قدم میری طرف آئے گا تو تائب ہوگا، ''تواب'' کے معنی ہیں اس کے مقابلے میں دو قدم اس کی طرف جانے والا۔عزیزانِ من! وہ یاس و نا امیدیاں جو عیسائیت نے ہندو دھرم نے یہودیت نے پیدا کی تھیں انسان کے اندر، وہ تو ایک دفعہ کی غلطی کو کہتے ہیں نا قابلِ معافی ہے، ختم ہے ہمیشہ کے لیے، کس قدر مایوسی کے جہنم میں وہ انسان کو ڈال دیتی ہے۔اور بدترین نفسیاتی بیماری یاس سے پیدا ہوتی ہے۔

مایوسی تو انسان میں بغاوت کے جذبات پیدا کر دیتی ہے

عزیزانِ من! مایوسی سے بغاوت پیدا ہوتی ہے۔وقت تھوڑا ہے ورنہ میں بتاتا کہ مایوسیاں کس طرح قوموں کو بغاوت پہ آمادہ کرتی ہیں۔بغاوت کا لفظ بھی سن لیجیے Revolution اور Rebellion میں بڑا فرق ہوتا ہے۔لوگ اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے۔Revolution ہوتی ہے کسی غلط نظام کو الٹ کے صحیح نظام لے آنا۔Rebellion ہوتی ہے جو نظام ہے اس کو الٹ دینا۔یاس کا آخری نتیجہ جو ہے Rebellion ہوتی ہے جو کچھ ہے اسے الٹ کے رکھ دیا جائے، توڑ پھوڑ کے رکھ دیا جائے۔ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔یہ ہوتی ہے Rebellion جسے فریب سے Revolution کہہ دیا جاتا ہے۔

انسانیت پر قرآن حکیم کا احسانِ عظیم یہ ہے کہ وہ اسے مایوس نہیں ہونے دیتا بلکہ بڑی حکمت سے اس کی راہنمائی کرتا ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے انسانیت کو یاس کے اندھیروں سے نکال دیا۔کتنی بڑی چیز ہے کہ غلطی کر گئے ہو ٹھیک ہے انسان سے

غلطی ہوجاتی ہے' وہ دیکھتا ہے کہ اور روٹھنے والے او جانے والے' منہ موڑ کے ہم دیکھ رہے ہیں کہ تو واپس آتا ہے۔ وہ واپس آتا ہے ایک قدم اٹھاتا ہے کہتا ہے ہم تو دو قدم اٹھا کے تمہاری طرف آجاتے ہیں۔ وَ يَتُوبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (9:15) جانتے بھی ہیں' حکمت بھی ہے ہمارے پاس۔ جو کچھ بھی ہوگا یاد رکھیے اس کے ساتھ جہاں بھی حکمت قرآن کا لفظ آتا ہے' حکیم آتا ہے Rationally اس کے معنی ہوتے ہیں۔ اور میں نے ایک درس میں آپ کو بتایا تھا کہ Rational Faith اور Irrational Faith میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ خدا کے جتنے کاروبار ہیں اس میں عزیز تو ہے' وہ قوت تو ہے اس میں' قوت کا استعمال ہمیشہ Rationally کرتا ہے۔ اس لیے ساتھ وہ حکیم ہوتا ہے۔ یہاں علیم بھی ہے حکیم بھی ہے۔ یہاں تک جو بات اسنے کہی وہ ٹھیک ہے۔ سوال یہ تھا کہ جسے آپ کہتے ہیں توبہ۔۔ یا اللہ میری توبہ' یا اللہ میری توبہ اور اس کے بعد پھر اگلی توبہ یہ کہ صبح کے وقت اٹھ کے ہزار دانے کی تسبیح استغفر اللہ من کل ذنب و اتوب الیہ لے کے وہ استغفار ہو رہا ہے۔ توبہ کا یہاں لفظ آ گیا ہے۔ بات چلی آ رہی ہے' قریش مشرکینِ مکہ کے ساتھ جنگ و جدل کی۔ درمیان میں آ گئی بات روٹھ کے جانے والے مڑ کے واپس آنے والے کی۔

توبہ کے بعد ایک دوسری منزل یعنی جہدِ مسلسل کی نشاندہی

توبہ کی بات آئی تو فوراً یہ چیز آ گئی کہ توبہ کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ اس کے بعد گوشے میں بیٹھ کے' مصلے پہ تسبیح کرنے لگ جائیں۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوْلِهٖ وَ لَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً (9:16) وہ کہنے لگے کہیں یہ نہ ذہن میں سمجھ لینا کہ جناب کام بن گیا توبہ کر لی بس ٹھیک ہے۔ کیا تم یہ سمجھے ہوئے ہو کہ تمہیں اس طرح چھوڑ دیا جائے گا۔ درآں حالیکہ تم پھر خدا کے راستے' اس مملکت کے راستے میں مسلسل جہاد نہیں کرو گے' قتال نہیں کرو گے۔ اور پھر دوسری چیز یہ کہ ہر وہ جس نے خدا اور رسول کی اس مملکت کی مخالفت کی ہے' اس سے قطع تعلق نہ کر لو گے' ان کو دوست داری کے تعلقات سے الگ نہ کر دو گے۔

ایک ایسی صبر آزما زندگی کہ پاؤں کے نیچے زلزلہ آ جائے

کیا تم سمجھتے ہو کہ محض اس بات سے کہ تم مؤمن ہو گئے یا یوں اپنے ذہن میں تم نے کہا کہ ہم نے توبہ کر لی' بس تم چھوڑ دیے جاؤ گے۔۔ ان تترکوا بس ہم تمہیں چھوڑ دیں گے کہ ٹھیک ہے۔ قطعاً غلط ہے اگر تم ایسا سمجھے ہوئے ہو تو۔ تمہیں ان تمام وادیوں میں سے گذرنا پڑے گا۔۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے کہ جن میں سے اس سے پہلے وہ قومیں گذری ہیں۔ بڑے صبر آزما مراحل تھے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ صبر آزما کہ جس میں رسول اور اس کے ساتھی پکار اٹھے تھے کہ (متیٰ نصر اللہ) یا اللہ کب آئے گی وہ مدد تیری (حتیٰ زلزلوا)

پاؤں کے نیچے زلزلہ آ گیا تھا ان کے صاحب۔ کہا اس قسم کے مراحل آنے ہیں ابھی تو تمہارے سامنے (2:214)۔ ان میں سے گذرنے کے بعد پھر کہیں جاؤ گے اس جنت کے اندر۔ یوں نہ سمجھ لو کہ تم نے کہہ دیا توبہ اور اس کے بعد داخلِ جنت ہو گئے۔۔ یہ غلط ہے۔ ان تمام مراحل میں سے گذرنا ہوگا پھر اس کے بعد جا کر کہیں یہ چیزیں تمہیں میسر آئیں گی۔

توبہ کی قبولیت کے لیے اب کہیں زیادہ ہمواریاں پیدا کرنی ہوں گی

وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌ ۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (9:16) یہ تمہاری یا اللہ توبہ کرنا جو ہے اس سے بات نہیں ہے' ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ تم کرتے کیا ہو ۔بِمَا تَعْمَلُوْنَ توبہ کا مطلب اپنے مقام پر واپس آنا ہے' کچھ کر کے واپس آیا جاتا ہے وہاں کھڑے رہ کے جہاں تم نے غلط راستہ اختیار کیا غلط راستے پہ چلے گئے وہاں پہ تمہیں جب معلوم ہوا کہ غلط راستہ تھا' مجھے صحیح راستہ پہ جانا چاہیے۔ وہاں کھڑے ہو جایئے بیس سال تک کھڑے رہیے اور کہتے رہیے کہ یا اللہ میری توبہ میں غلط راستہ اختیار کر گیا' آ جائیں گے آپ صحیح راستے پہ؟؟؟۔ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (9:16) وہ کہتا ہے اس کے بعد ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ تمہارے قدم بھی اٹھتے ہیں یا نہیں' تم اس کے بعد کرتے کیا ہو؟ اور کرنے کا بتایا کہ کفارہ تو کچھ دینا پڑے گا۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) یاد رکھو جتنا ناہمواریوں کا کام کیا اس سے بڑا ہمواریاں پیدا کرنے والا کام کرو گے تو پھر اس کا نقش یا نقصان جو ہے وہ مٹے گا۔ یہ طریقہ ہے توبہ کا۔ اسی لیے کہا کہ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (9:16) اس کے بعد ہم جانتے ہیں دیکھیں گے کہ تم کرتے کیا ہو۔ سورۃ التوبہ کی آیت 16 تک ہم آ گئے برادرانِ عزیز! آیت 17 سے آئندہ درس میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

دوسرا باب: **سورۂ توبة** (آیات 17 تا 28)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من ! آج فروری 1973ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 17 سے ہوتا ہے۔ (9:17)

فتح مکہ کا اصل مقصد کشور کشائی کے بجائے احکامات خداوندی کو عملی شکل میں متشکل کرنا تھا

سورۃ توبہ میں جیسے سابقہ دو درسوں میں آپ نے سن لیا ہے فتح مکہ کے بعد یہ نظامِ خداوندی کا مرکزِ محسوس جسے کعبہ کہا جاتا ہے وہ اس مملکت کی تولیت میں آ گیا۔اس سے اس مملکت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔اسلامی مملکت مقصود بالذات تو ہوتی نہیں یہ احکام واصول واقدارِ خداوندی کے نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس میں صرف خدا کے قوانین کی حکمرانی ہوگی۔۔اسے توحید کہا جاتا ہے۔وہ جو ہے نا ایک خدا کا ماننا۔۔وہ ٹھیک ہے الفاظ تو یونہی ہوتے ہیں لیکن ان الفاظ کے معنی متعین ہونے چاہئیں۔

خدا کو ماننے کے علاوہ لفظ شرک اور سیکولر سٹیٹ کا عملی مفہوم

ایک خدا کو ماننے والے تو دنیا میں کروڑ ہا کروڑ پھرتے ہیں انہیں کیوں اپنا سمجھا جاتا۔لفظ ''ماننا'' بڑا مبہم لفظ ہے۔اور یہی وہ الفاظ ہیں جن سے ساری غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔یہ مذہب کے الفاظ ہیں۔ایک خدا کا ماننا۔۔یہ سوال ہی نہیں ہے۔صرف خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا۔۔یہ ہے توحید۔شرک کے معنی بھی یہ بت پرستی نہیں ہے۔۔وہ تو ان چیزوں کے محسوس مظاہر ہیں۔شرک کے معنی ہیں قوانینِ خداوندی کے ساتھ دیگر قوانین کو بھی شامل کر لینا۔کفر یہ ہے کہ یکسر سیکولر سٹیٹ بنا لینا۔۔اس اصول ہی کو نہ ماننا کہ مملکت میں کوئی حصہ خدا کا بھی ہوتا ہے۔خدا کے حصے کے کیا معنی ہیں۔۔اس کے قوانین کا بھی کوئی حصہ ہوتا ہے' کوئی عمل دخل ہوتا ہے۔مملکت ہماری ہے ہم اپنی صوابدید کے مطابق جس قسم کے قوانین سوسائٹی کے لیئے' معاشرے کے لیے بہتر سمجھیں بنا سکتے ہیں اس پہ کوئی پابندی عائد نہیں ہوسکتی۔سٹیٹ Sovereign ہے۔اسی کو آج کی اصطلاح میں سیکولر کہتے ہیں' یہ کفر ہے۔

آج ہمارے ہاں مذہب کی طرف سے پیش کردہ قانون سازی کے فارمولے کی بنیاد اور پھر دنیا بھر کی قوموں کے نزدیک ضوابط اخلاق کی نوعیت

اور یہ کہ کچھ مذہب کے قوانین اور کچھ اپنی صوابدید کے مطابق اس میں بنا لیئے' جو Personal Laws ہیں وہ کتاب وسنت کے مطابق ہونگے اور پبلک لاز حکومت کے ہونگے۔۔یہ شرک ہے کہ جو Atheist ہیں خدا کو مانتے ہی نہیں ہیں وہ تو Purely Secular چیز ہے۔لیکن جو مذہب پرست طبقہ ہوتا ہے وہ مشرکین کا ہوتا ہے۔۔اس میں نماز روزہ حج زکوٰۃ تو مذہب کی ہوتی ہیں جب کہ مملکت کے قوانین پارلیمان کے ہوتے ہیں اپنی صوابدید کے مطابق۔عربوں میں بھی خدا کا یہی تصور تھا۔اور دنیا کی ہر قوم میں یہ جنہیں آپ Universal Ethics کہتے ہیں عالمگیر اخلاق۔۔ان کی ابتداء بھی تو کسی نہ کسی رسول کی وحی سے ہی ہوئی ہوگی نا۔قرآن نے

تو کہا ہے کہ ہر زمانے میں ہر قوم کے اندر رسول آتے رہے۔ تو وہ یہ بنیادی اصول بھی تو دیتے تھے۔ ان کی بچی کھچی ہوئی کچھ مخلوط سی شکلیں قوموں کے اندر باقی رہتی ہیں وہ ان کے ضوابط اخلاق ہوتے ہیں۔ ان کو قائم رکھتے ہیں اور باقی معاملات اپنی صوابدید کے مطابق کرتے ہیں۔۔ یہ شرک ہے۔

توحید پرستی کے متعلق سورۃ توبہ کے شروع میں واضح تر آیات کا مفہوم

قرآن نے سورۃ توبہ کے شروع میں ہی کہا کہ اب اس مرکزِ مملکتِ نظامِ خداوندی کی تولیت ان توحید پرستوں کے پاس آ گئی کہ جو صرف خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کریں گے۔ اس لیے مشرکینِ عرب کا یہ حق نہیں رہا کہ اس مرکز کے قریب آ سکیں۔ قریب آنے کے معنی یہ نہیں کہ جسمانی طور پر یہ اس کے قریب نہ آئیں۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ جب ان کا عمل دخل کوئی نہیں ہوسکتا، یہ قطعاً مداخلت نہیں کر سکتے ان کا کوئی اختیار نہیں رہا۔ اس سے پیشتر کعبہ اس کی تولیت اس کے جملہ اختیارات ان لوگوں کے ہاتھ میں تھے۔ کہا کہ اب ان کے اختیارات باقی نہیں رہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ **مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ** (9:17) مشرکین کے لیے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ مساجد اللہ کی۔۔ اب یہ الفاظ آئے جن کے معنی عام طور پہ کیے جاتے ہیں کہ یہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔

مشرکین کو تو مساجد میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں

مشرکین کو اس کا حق ہی نہیں دیا جا سکتا۔ بات سامنے آتی ہے کہ کوئی مشرک آپ کی مسجدوں میں نماز پڑھنے کو تو آتا ہی نہیں ہے۔۔ اب اس ممانعت کے معنی کیا ہیں کہ مشرکین کو حق ہی نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ کبھی آپ نے دیکھا سنا کہ کوئی مشرک آپ کی مسجدوں کو آباد کریں۔۔ وہ تو نہیں آتے۔ تو یہ ہوا کیا۔ پہلی چیز کہ مسجد کے معنی ہو گئے آپ کی وہ عمارت جس میں پانچ وقت کی نماز پڑھی جاتی ہے۔۔ بس۔ اب پڑھنے کے معنی زیادہ سے زیادہ یہ لیے گئے اس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ تو جیسا میں نے عرض کیا کہ ان معنی کی رو سے بات کچھ بنتی نہیں ہے مشرک تو مسجد میں آتا ہی نہیں نماز پڑھنے کے لیے۔ یہ ممانعت کیا ہے۔ ممانعت یہ ہے کہ نہ مسجد کا یہ مفہوم ہے سمٹا ہوا نہ اس کی آبادی کا یہ مفہوم ہے۔ مسجد: وہ مقامات عربی قاعدے کی رو سے، مقامات بھی یا اس قسم کا کام بھی، قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنا ہے معنی تو یہ ہو جائیں گے اس کے۔ اور جتنی بھی مملکتِ اسلامیہ ہے وہ ساری کی ساری مسجد ہوتی ہے۔ یا اس میں جو اس کے لیے مثلاً پارلیمان مقرر کیے ہوئے ہوں، وہ مقامات ہوں جیسے حج کی تقریب ہوتی تھی جس میں قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے کا عملی پروگرام طے کیا جاتا تھا۔ جیسے مسجدِ نبوی ﷺ آج کہا جاتا ہے۔ تاریخ بھی یہ بتاتی ہے کہ آپ کی مملکت آپ کے دارالخلافہ کا سیکرٹیریٹ

اس میں تھا پارلیمان اس میں تھی تمام معاملات کے فیصلے اس میں ہوا کرتے تھے (۱)۔

اور وہی رہی حضرت عمرؓ کے وقت تک بھی۔ حضرتِ عثمانؓ کے وقت میں تو خیر خلفشار شروع ہو گیا تھا۔ مسجد وہی رہی تھی اس کی توسیع ہوتی رہی تھی۔ یہ مملکتِ اسلامیہ کی جسے بھی آپ Central Place کہہ سکیں' پارلیمان کہیے سیکرٹیریٹ کہیے۔۔ وہ مسجد تھی۔ وہ مسجد دین میں تو اس مقصد کے لیے تھی' مذہب میں آ کے یہ صرف نماز پڑھنے کی جگہ رہ گئی ہے۔ اور پھر یہ کہا گیا کہ مسجد میں دنیا کی بات کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ یعنی وہ تھی ہی ساری دنیا کے معاملات کو خدا کے قوانین کے تابع حل کرنے کا مقام۔

دین خداوندی کو دنیا سے الگ کرنے کا نتیجہ اور پھر دوقومی نظریہ کی شدید بے حرمتی کا وہ عمل جو جاری و ساری ہے

اب دیکھا مذہب میں آ کے دنیا اور دین کس طرح سے الگ الگ ہو گئے۔ مسجد۔۔ وہ نظام اس نظام کے مقامات اس کا پورا پروگرام جس میں صرف خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے کے پروگرام متعین کیے جائیں۔۔ یہ ہوئی مسجد سے مراد۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ جہاں صرف خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے کے پروگرام طے ہونے ہوں' وہاں مشرکین کا کام کیا ہے۔ اور یہ وجہ ہے کہ جسے جو دوقومی نظریہ کہتے ہیں اس نظریہ کی رو سے غیر مسلم اسلامی مملکت کی قوانین سازی کے عمل میں کسی طرح شریک ہی نہیں ہو سکتا۔ جو اس بنیاد ہی کو نہیں مانتا کہ مملکت کے قوانین' قوانینِ خداوندی پر مبنی ہونگے۔۔ جو اس اصول کو نہیں مانتا وہ آپ کی قوانین سازی کے کام میں اندر دخل کیسے دے سکتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ دین کی بنیاد پر جب ایک قوم کا روپ دھاتی ہے اور اس کی مملکت بنتی ہے اس میں غیر مسلم ان چیزوں میں شریک ہو نہیں سکتا۔ اور بات بالکل صاف ہے جو اس اصول کو نہیں مانتا وہ اس میں شریک کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ہے اس کے معنی۔

---

۱) لہٰذا مفہوم القرآن کے مطابق یہ بھی سن رکھو کہ تمہارا نظام خالص قوانین خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اس لیے جو لوگ ایک خدا کے قوانین واحکام کے اطاعت گزار نہ ہوں، بلکہ مختلف نظریاتِ زندگی کے حامل ہوں۔ تمہارے نظام کا قیام ان کے ہاتھوں سے نہیں ہوگا۔ یہ تمہاری مساجد (یعنی نظام خداوندی کے قیام ونفاذ کے مراکز کی آبادی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ یہ ان کی بربادی کا باعث بنیں گے۔ نہ ہی اس نظام کا قیام ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہو سکے گا جو تمہاری جماعت میں تفرقہ پیدا کریں۔ یہ بھی درحقیقت مشرک ہی ہوتے ہیں۔ ان کا تو وجود ہی اس حقیقت کی شہادت ہے کہ یہ اس نظام کے خلاف ہیں۔ (بحوالہ مفہوم القرآن صفحہ ۴۱۹، از پرویزؒ)

مشرکین کا کعبے کے قریب نہ آنے کا حقیقی مفہوم دین میں دخل انداز ہونے کے ہیں

اب مشرکین اس کعبے کے قریب نہیں آ سکتے اس کے معنی یہ تھے کہ یہ لوگ اب اس مملکتِ خداوندی کے نظام اور پروگرام میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ جو کہا گیا ہے اَنۡ یَّعۡمُرُوۡا (9:17) جس کے معنی ہوگئے آباد کرنا۔ یہ ٹھیک ہے۔ آج آپ بھی تو تعمیری کام کہتے ہیں کیا معنی اس کے ہوتے ہیں' Constructive Work جب آپ کہتے ہیں تو اس کے معنی کسی بلڈنگ کا کھڑا کرنا نہیں ہوتا۔ وہ Destruction کے مقابلے ضد کی ایک چیز ہے جسے آپ Constructive کہتے ہیں۔ تو کہا ہے کہ مملکتِ خداوندی کے Constructive کام ہیں جو اب اس نظام نے سرانجام دینے ہیں۔ مشرکین کا کیا کام کہ اس کے اندر وہ دخل دیں' وہ دخل ہی نہیں دے سکتے۔ اب جو یہ سمٹ کے بات رہ گئی کہ صاحب یہ مشرکین غیر مسلم جو ہیں وہ کعبے کے قریب نہیں آ سکتے یا مکے میں نہیں آ سکتے۔۔ یہ چیز غلط ہے۔ یہی تاریخ بتاتی ہے کم از کم حضرت عمرؓ کے زمانے تک یہ سارا آنا جانا اس مکے میں تھا غیر مسلموں کا۔ آنے جانے کی ممانعت کے معنی کچھ نہیں۔ ممانعت تو یہ ہے کہ مملکتِ خداوندی کے نظام اور کاروبار میں امورِ مملکت میں یہ لوگ شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ تھا مفہوم دین میں مسجد کی تعمیر میں دخل نہ دے سکنے کا۔ اور بنیادی طور پہ تو عربوں کے ہاں جو ''ع م ر مادہ'' ہے اس تعمیر کا۔۔ اس کے معنی ہیں کسی معاملے کو طول میں بھی بڑھاتے چلے جانا اور بلندی میں بھی اونچا کرتے چلے جانا۔ مملکت کا دوام بھی اور مملکت کی ترقی بھی دونوں معنی اس لفظ کے اندر آ جاتے ہیں۔ قرآن تو معنی سے الفاظ کے انتخاب میں اعجاز رکھتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ قریش کی جنگ وجدل کی وجہ ان کے اپنے معاشرتی نظام کا تحفظ تھا

مشرک بنیادی طور پہ اس مملکت کے اصول کو ہی نہیں مانتا۔ وہ اس کے زمانی دوام اور مکانی ترفع کے اندر کس طرح سے شریک ہو سکتا ہے۔ وہ اسے ڈھا دینے کی فکر کرے گا اور ڈھا دینے کے معنی مسجد کی عمارت کا ڈھا دینا نہیں اس مملکت کو تباہ کر دینا۔ اور جتنی جنگیں قریش کے ساتھ ہوئی تھیں یہ رسول اللہ ﷺ کی۔۔ وہ مذہب کا معاملہ نہیں تھا۔۔ وہ معاملہ ہی یہ تھا کہ قرآن یہ انقلاب لاتا تھا کہ قریش کا جتنا بھی معاشی معاشرتی نظامِ زندگی تھا' وہ اس کو تہ و بالا کر دیتا تھا۔ کعبہ کے پروہت تھے اور اس کی وجہ سے آپ سوچئے اتنی بڑی عبادت گاہ' پرستش گاہ' اس کے جو پجاری یا پروہت تھے' سارے عرب میں ان کی بے حد تعظیم تھی۔ اور اس کی وجہ سے ان کے تجارت کے مال بالکل محفوظ رہتے تھے' یہ آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا' وجہ توقیر و تعظیم تھا یہ مکہ ان کے لیے۔ پھر ان کے ہاں کا نظام جو تھا معاشی نظام میں' غلامی ان کی معاشرت کا جزوِ اعظم تھی اسلئے سارے کام غلام کیا کرتے تھے۔ قرآن کا پیغام ان تمام چیزوں کو ختم کر رہا تھا۔ یہ تھیں جنگ کی وجوہات۔

اسلامی مملکت کے بنیادی اصولوں کے نفاذ کے لیے غیر مسلم کی شرکت قرآن حکیم کے ہی منافی ہے

جب یہ نظام قائم ہو گیا مملکت کا مرکزِ محسوس بھی ان کی تولیت میں آ گیا یعنی Establish ہو گئی جب یہ مملکت Establish ہو گئی تو ان لوگوں کا اس مملکت کے امورِ میں دخیل ہونے کے معنی کیا ہیں۔ یہ اس کے معنی کہ یہ دخیل نہیں ہو سکتے۔ اور اسی لیے یہ چیز آپ کے ہاں ہے کہ اگر اسلامی مملکت ہے جو نظامِ خداوندی کو رائج کرنے کے لیے قائم ہوئی ہے تو وہ جو اس اصول میں Believe نہیں کرتے جنہیں آپ غیر مسلم کہتے ہیں وہ اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ ہے جو کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں مسجد کا لفظ کہا ہے وہاں یہ چیز کہی ہے۔ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (72:18) مساجد صرف اللہ کے لیے مخصوص ہیں اس کے ساتھ کسی اور کو نہیں پکارا جائے گا۔ یہ پکارنا کیا معنی ہیں، اللہ کے لیے مخصوص ہونے کے معنی کیا ہیں۔ مساجد کا تصور یا مسجد کے لفظ کا صحیح قرآنی مفہوم ذہن میں آ جائے تو بات ساری سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس کے معنی ہی اسلامی مملکت لیجیے، اسلامی نظام لیجیے۔ اسلامی نظام صرف خدا کے قوانین کے لیے ہوتا ہے اس کے ساتھ کسی اور کے قانون کو مت ملاؤ یہ شرک ہو جائے گا۔

قرآنی قوانین کے تابع ایک سنٹرل اتھارٹی امتِ واحدہ کی تشکیل کا باعث بنتی ہے

آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ کیوں شرک قرار دیا ہے؟؟ خدائے واحد کے تابع جب بھی کوئی قوم ہو گی تو اس قوم میں وحدت ہو گی، قوم میں تفریق ہو ہی نہیں سکتی۔ چھوٹے سے پیمانے پہ آپ دیکھیے ایک مملکت کے اندر مرکزی اختیارات کی اتھارٹی کے قانون جب نافذ ہوتے ہیں آپ دیکھیں گے کہ قوم کے اندر ان قوانین کے اتباع میں تفریق نہیں ہوتی۔ مرکز نے قانون پاس کر دیا کہ "Keep to the Left" بائیں طرف چلو، ساری مملکت میں آپ دیکھتے ہیں کہ اس بات کے اوپر دو فرقے بنے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ایک فرقہ کہے کہ نہیں صاحب ہم دائیں طرف چلیں گے دوسرا کہے کہ بائیں طرف چلیں گے۔ اجازت ہی نہیں ہو سکتی۔ ایک مملکت کا ایک قانون جب پوری مملکت کے اوپر لاگو ہوتا ہے تو اس میں تفریق ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں تفریق کرنے والا اگر تفریق کرتا ہے تو مجرم قرار پائے گا، سزا ہوتی ہے۔ اور اگر وہ کہتا ہے کہ میں اس کو مانتا ہی نہیں ہوں، تو بغاوت ہوتی ہے، اس کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ کہیے یہ ہے نا۔ یہ اتنا چھوٹے سے چھوٹا قانون ہے جس کی میں مثال دیا کرتا ہوں "Keep to the Left" وحدت پیدا کی ہوئی ہے نا اس قانون نے۔ دو فرقے ہیں آپ کے ہاں یا دو پارٹیاں ہیں آپ کے ہاں اس مملکت کے اندر یا کسی مملکت میں اس ایشو کے اوپر؟؟؟۔ قانون کی تعمیل میں وحدت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی لغزش کسی سے ہو جائے اُسے جرم کہتے ہیں، اس کی سزا ہو گی۔ اور جیسا میں نے کہا ہے اگر اس سے انکار کوئی کرتا ہے تو بغاوت ہو گی۔

فرقہ بندی کا وجود مختلف فقہ کی بنیاد پر ہے

قانون کی بناء پہ وحدت قائم ہوتی ہے۔ فرقہ بنتا اس وقت ہے جب آپ ایک قانون کے تابع زندگی بسر نہ کریں، مختلف قوانین آپ کے ہاں ہوں۔۔ فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ مالکی، اہلحدیث، اہلِ فقہ، سنی شیعہ۔۔ یہ کیوں بنے ہوئے ہیں۔ فقہ حنفی یا مالکی کے معنی کیا ہیں۔ فقہ کے معنی ہیں قوانین۔ حنفی قوانین کے تابع، مالکی قوانین کے تابع، اہلحدیث کی فقہ کے تابع، سنیوں کی فقہ، شیعوں کی فقہ۔ ان کے قوانین کے ضابطے الگ الگ ہیں۔ ایک ضابطۂ خداوندی ہے، ہی نہیں مسلمانوں کے اندر۔ کہیں ضابطۂ خداوندی کے تابع بھی یہ چیزیں آئیں گی پھر کہ فلاں کا ضابطہ، فلاں کا قانون، فلاں کا قانون؟؟؟۔ کہیے تو سہی مملکتِ پاکستان کے اندر کسی اور مملکت کا قانون ۔۔ بغاوت ہو جاتی ہے۔

فرقوں کی موجودگی میں نظام صلوٰۃ قائم ہی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی امت واحدہ کی تشکیل ہو سکتی ہے

آپ نے غور کیا قرآن نے فرقہ بندی کو شرک کیوں کہا ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ اب یہاں سے پتہ چلا کہ صلوٰۃ کیا چیز ہے، مسجد کے کیا معنی ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرو اُسی طرف رخ کیے ہوئے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (30:31) مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيَعًا (30:32) اور یاد رکھو مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیے اور خود بھی ایک گروہ بن کے بیٹھ گئے۔ پھر کیفیت یہ ہوگئی کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32) ہر فرقہ مگن ہے اس بات میں کہ جس پہ میں ہوں، وہی سچا ہے۔ یاد رکھیے امت کے اندر جب فرقہ ہوتا ہے، کوئی فرقہ بھی سچا نہیں ہوتا۔ سچی امت کی وحدت ہوتی ہے۔ دین کا تقاضا ہی توحید ہے۔ توحید کے معنی ہی ملت کی وحدت ہے۔۔ کس بناء پر؟ قانون کے تابع زندگی بسر کرنا، ایک قانون۔ ایک قانون کس کا ہوگا پھر؟ وہ خدا کا قانون۔ پچیس برس سے آپ لگے ہوئے ہیں نا اس میں، اسلامیہ اوپر لکھا ہوا ہے اور نیچے کوئی قانون بنتا ہی نہیں۔ اس لیے کہ ہر فرقہ یہ چاہتا ہے کہ ہمارے فرقے کا قانون اس مملکت کا قانون بن جائے۔ فرقے کا قانون اسلامی قانون مملکت کیسے بن سکتا ہے۔ اسلامی تو اس وقت ہوگی جب خدا کے قوانین وہاں نافذ کیے جائیں گے اور خدا کے قانون میں تو کسی قسم کا اختلاف نہیں۔

کوئی فرقہ بھی ہو اس کی آخری سند کسی انسان پر ہی جا کر رکتی ہے

قرآن نے خود کہا ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر

کرنے سے امت میں فرقہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ فرقے میں آپ دیکھیں گے کہ آخری سند کوئی نہ کوئی انسان ہوتا ہے' خدا کا قانون نہیں ہوتا۔ اس لیے دین میں فرقہ بندی کرنے والوں کو مشرک اس لیے کہا ہے کہ جب ایک ضابطۂ قانون نافذ ہوگا تو مملکت کے اندر قانون کے اتباع کے معاملے میں دورائے نہیں ہوسکتیں دو پارٹیز ہونا تو ایک طرف رہا' دو فرقے بننے تو ایک طرف رہا۔ لیکن جب شرک اس قسم کا آجاتا ہے جسے فرقہ بندی کہتے ہیں تو وہاں پھر ہوتا کیا ہے؟؟ قرآنِ کریم نے بڑے حسین انداز میں کہا ہے۔ کہ کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ وَاِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَحۡدَهُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ (39:45) یہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ فرقہ بندی اور شرک میں بتایا ہے کہ یہ آخرت پہ ایمان نہیں رکھنے والے ہوتے۔ جو لوگ آخرت پہ ایمان نہیں رکھتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ صرف خدائے واحد کا ذکر کیا جائے' دوسرا کوئی اس کے ساتھ نہ ملایا جائے۔۔ اسی کے قوانین اسی کے دین یا خدا کا صرف ذکر کیا جائے تو وہ کہتا ہے کہ وہ منہ بسور کے رہ جاتے ہیں' دل میں کبیدگی پیدا ہوجاتی ہے۔۔ او یہ اکیلے خدائے واحد کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ وَاِذَا ذُكِرَ الَّـذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِذَا هُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ (39:45) اور جب اس کے ساتھ اوروں کا بھی ذکر کیا جاتا ہے تو باچھیں کھل جاتی ہیں ۔۔ سبحان اللہ صاحب!! بات ہوئی نا اب' ٹھیک کیا آپ نے' ہیں!! خالص خدا کی توحید صاحب یہ چل سکتی ہے کہیں؟؟۔ آپ دیکھیں گے شرک میں یہ چیز ہوجاتی ہے۔

آج تو کسی مسلمان کی تعریف فرقہ بندی کی نسبت کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی

فرقہ بندی میں ہوتا ہی یہ ہے۔ کوئی پوچھے آپ سے کہ کون ہوتے ہیں' آپ کہیۓ مسلمان ہوتے ہیں تو اطمینان نہیں ہوتا' وہ پوچھتے ہیں کون مسلمان۔ یعنی صرف مسلمان ہونا وہ تو صرف خدا سے نسبت ہوئی۔ مطمئن نہیں ہوتے' کون مسلمان صاحب' بتانا پڑتا ہے' جی سنی مسلمان' کونسے سنی مسلمان الرائے یا اہل حدیث یا اہل فقہ' کونسے اہلِ فقہ' اس کے بعد' کہ حنفی ہوئے صاحب' حنفی تو ہوئے میں نے سمجھ لیا' کونسے حنفی دیوبندی یا بریلوی'' چلے چل اگاں''۔ شرک کی تو انتہا نہیں ہے عزیزانِ من! توحید ایک نقطہ ہے جس میں دو کی گنجائش نہیں ہے ۔ جب شرک پہ آجائیں گے تو بتیس کروڑ دیوتا آپ کے بن جائیں گے۔ یہ سب دیوتا ہیں جن کے نام لیے جارہے ہیں اور ان کی انتہا نہیں ہوتی۔ چلتے جایئے دیوبندی اور بریلوی اور ابھی میں نقشبندی اور سہروردی پہ تو آیا ہی نہیں ہوں۔ دین میں مملکتِ خداوندی میں خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے کے اندر عزیزانِ من! فرقے کا نام ہی نہیں ہوتا۔

فرقہ بندی کی بنیاد پر مدینہ منورہ میں تعمیر ہونے والی مسجدِ ضرار کا ذکر

فرقہ انسان پرستی ہے' شخصیت پرستی ہے۔ اسی لیے اس نے کہہ یا ذرا سا فرقہ کا پہلو آنے لگا تھا' وہیں ایک دوسرا نظام یا اس نظام کی

ایک محسوس علامت جسے مسجد ہی کہا گیا ہے مدینے میں ہی بنانے کی کوشش کی تھی' جو ملت کے اندر تفریق یا شرک پیدا کرنا چاہتے تھے' جنہیں مشرکین کہا ہے۔اسی سورۃ توبہ میں آگے چل کے دیکھیے جسے مسجد ِضرار کہا گیا ہے۔مسلمان ان آیتوں کو بھی پڑھتا ہے' پڑھنے کے بعد سمجھتا ہے کہ ثواب مجھے ہو رہا ہے۔عذاب بدترین اس میں لکھا ہوا ہے خدا نے۔۔کس وجہ سے؟ ایک مسجد کے ساتھ دوسری مسجد بنانے لگے تھے۔مسجد بنانے کے لیے ان سے کہا جاتا ہے کہ جو اس میں حصہ لیتا ہے' جنت میں گھر بن جاتا ہے اس کا۔یہاں ایک مسجد بن رہی ہے اور وہاں کہا جا رہا ہے کہ یہ جہنم کے کنارے پہ بنا ہوا ہے سب۔دیکھیے کیا مسجد بن رہی ہے۔وَ الَّـذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا (9:107) اف!! مسجد بنا رہے ہیں۔۔مضرت رساں۔مسجد کہا ہے کفرًا ۔۔مسجد نہیں ہے کفر گھر بنایا جا رہا ہے۔یا اللہ کیا بات ہوگئی اس مسجد کے اندر۔۔مندر کی اینٹیں لگا دی ہیں یا کفرؑ ہو رہا ہے۔اُنہوں نے کہا یہاں اینٹیں اور چونے کا سوال نہیں ہے۔یہ ضرارؑ کفر کیوں ہے۔عزیزانِ من! سنیے اور پوچھیے جو ان آیتوں کو ثواب کی خاطر پڑھ جاتے ہیں۔کہا کفراًاس لیےوَّ تَـفْرِيْـقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (9:107) عزیزانِ من! اور چیزیں تو ایک طرف رہیں مسجد بھی اگر وجہ ٔتفریق بنتی ہے بین المؤمنین۔۔قرآن کفر کہہ رہا ہے۔

قرآن حکیم کے متعلق مشرکین کا نبی اکرم ﷺ سے مطالبے کے علاوہ ہماری صورت حال

احساسِ ناگواری میں مبتلا مشرکین کے متعلق قرآن حکیم میں ہے کہ رسول سے کہتے تھے کہ ہم تم سے مفاہمت کر لیں گے لیکن صاحب آپ اتنی بھی شدت Extreme تک نہ چلے جائیے کہ دو چار بتوں کی بھی اجازت نہیں دے رہے۔ایسا تو نہ کیجیے' کچھ مفاہمت کیجیے۔ اور اس کے لیے کہا تھا کہ یا تو اس قرآن کی جگہ دوسرا قرآن لے آؤ یا کم از کم اس میں کچھ تبدیلیاں ہمارے مطلب کی کر دو۔ یہ Compromise کی شرط تھی۔قرآن کی جگہ دوسرا قرآن آ نہیں سکتا' اس لیے اقدار تبدیلی بھی نہیں کر سکتے کہ خدا نے حفاظت کا ذمہ لیا۔کیا کیا؟ قرآن کو تو رکھا ثواب حاصل کرنے کے لیے اور مذہب کے اندر اپنی عملی زندگی کے لیے آ گئے یہ سارے فقہا اور آئمہ اور مفسرین مامور من اللہ۔خدا کو بیچ میں سے نکال ہی دیا' چلو ٹنٹا ختم کرو جی۔مصیبت تھی اگر قرآن کو اج اپنی بنیاد رکھتے تو اس میں Compromise ہی نہیں ہو سکتا تھا۔قیامت ہے۔

فرقہ بندی کا وجود قرآن حکیم کے خلاف ہی نہیں بلکہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اعلان جنگ ہے

عزیزانِ من! قرآن سامنے ہو اور اس کے بعد یہ حنفی اور شیعہ اور بریلوی اور اہلحدیث یہ سب۔بغاوت ہے۔کسی مملکت میں دو

قانون چلتے ہوئے آپ نے سنے بھی ہیں؟؟؟۔ مسجد بن رہی ہے اور کہا کفر ہے وَّ تَفۡرِیۡقًا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اتنا ہی نہیں کہا مسجد ہے عزیزانِ من! وَ اِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ مِنۡ قَبۡلُ (9:107) مسجد ہے کہا یہ پناہ گاہ ہے ان لوگوں کے لیے جو جنگ کا اعلان کرتے ہیں خدا اور رسول کے خلاف۔ جس مسجد سے مسلمانوں میں دو فرقے ہو جائیں' وہ کفر ہے وہ اعلانِ جنگ ہے خدا اور رسول کے ساتھ۔ یہ جو جنگ کرنے والے ہیں خدا اور رسول کے ساتھ کہا اس کے لیے کمیں گاہ ہے۔ یہ مسجد۔

قرآن حکیم کے خلاف فرقہ بندی کے وجود کو نیک نیتی تو نہیں کہا جا سکتا

آج کی زبان میں بات یوں ہی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ایک مملکت میں دو قانون چلایئے پھر پوچھیے۔ پھر ان قوانین کے چلانے والوں کو باغی قرار دیا جائے گا۔ وہ جہاں جا کے چھپیں گے اس کو آپ پناہ گاہ کہیں گے یا نہیں۔ یہ تھی یہ چیز۔ یہاں تو معاملہ Extreme تک پہنچ گیا ہوا ہے۔ مملکتِ خداوندی کے اندر حنفی فقہ اور شافعی فقہ یہ چیزیں کیا معنی ہیں۔ تَفۡرِیۡقًا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ اِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَیَحۡلِفُنَّ اِنۡ اَرَدۡنَاۤ اِلَّا الۡحُسۡنٰی (9:107) کہو گے تو قسمیں کھا کھا کے کہیں گے کہ نہیں صاحب ہمارا مطلب تو بڑا نیک ہے' ہم تو نیک نیتی سے ایسا کر رہے ہیں۔ مملکت کے خلاف بغاوت کو نیک نیتی سے کیا کام صاحب۔ بغاوت ہے یہ۔ وہ کہتا ہے یہ قسم کھائیں گے۔ اور وَ اللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ (9:107) یہ قسمیں کھا کے کہتے ہیں کہ ہماری نیت بخیر ہے اور خدا شہادت دیدیتا ہے ان کے خلاف کہ بکتے ہیں یہ لوگ۔۔ مسجد بنانے والے۔ اس لیے کہ تَفۡرِیۡقًا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ تھی۔ ٹھیک ہے مجھے معلوم ہے کہ ناگوار گذریں گی چیزیں۔ ناگوار گذریں تو پرویز کو گالیاں دیتے چلے جایئے اس قرآن کو کہاں لے جائیں گے۔ اگر مسجد کے یہی معنی بھی لے لیے جائیں جو آپ کے ہاں کی مسجدیں ہیں تو باہر ان کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے حنفیوں کی مسجد ہے پھر اس کے بعد قادریہ مسجد ہے وہ رضویہ مسجد صاحب شیعہ کی مسجد سنی کی مسجد اہلحدیث کی مسجد۔ او خدا کی مسجد تو کہیں ہے ہی نہیں۔ تَفۡرِیۡقًا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۔(9:107)

اذان کی آواز پر ہر فرقہ اپنی اپنی مساجد کی طرف چل پڑتا ہے

جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ شام کے وقت انار کلی میں دیکھیے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان وہاں موجود ہونگے۔ ایک اور دوسرے میں کوئی تفریق نہیں ہوگی۔ ایک دوکان سے سودا خرید رہے ہیں' ایک بازار میں چل رہے ہیں' ایک جگہ کھاتے پیتے ہیں سب کچھ ہے۔ بدقسمتی سے آواز آجاتی ہے خدا کی طرف سے جسے کہتے ہیں اذان ہو جاتی ہے صاحب۔ ان میں سے جو اس آواز پہ نہیں جانے والے ان میں اسی طرح سے وحدت رہتی ہے۔ اور جو اسلام کے متبع ہیں ایک اِس طرف' ایک اُس طرف' ایک اُس طرف' ایک اِس طرف۔ ایک جانے

لگتا ہے وہ کہتا ہے ''اونہیں اے بانگ وہابیاں دی ہیگی اے' اودھر نہ جائیں ہجے' اے سنیاں حنفیاں دی ہیگی اے ہجے نئیں وقت ہو یا ہیگا' شیعاں دی نماز ہجے بہت دیر نال ہونی ہیگی اے'' ۔ ان نمازیوں کو آپ دیکھیں گے ان میں تفریق تو ہو جائے گی ''بے نمازیاں اچ فیروی تفریق نئیں ہوندی ہیگی'' ۔ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (9:107) عزیزانِ من! یہ مسجدوں کی موجودگی ہے جو تفریق بین المؤمنین کر رہی ہے۔

دنیا بھر میں ہر سطح پر مسلمانوں میں انتشار کی بنیادی وجہ فرقہ واریت کا پیدا کردہ ذہنی اضطراب ہے

قرآن نے کہا تھا کفر ہے یہ' خدا شہادت دے رہا ہے کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا (9:108) رسول سے کہا اس مسجد میں پاؤں تک نہ رکھو۔ آگے چل کے یہ چیز ہے یہ مسجد اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ (9:109) یہ مسجد ہے' ٹھیک ہے عمارت نظر آئے گی بڑی مستحکم ۔۔ اس کی بنیاد اس کھوکھلی ریت کے اوپر ہے جو جہنم کے کنارے کے اوپر بنی ہوئی ہے یہ مسجد بمعہ اپنے سارے نمازیوں کو لے کے' جہنم میں جائے گی۔ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ (9:110) کہا کہ جنہوں نے یہ عمارت بنائی اس کی بنیاد رکھی یہ ان کے دلوں کے اندر اضطراب اور بے چینی کا جہنم پیدا کر دے گی اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے گی ان کو۔

نماز میں پیدا ہونے والا فرق صرف فروعات کا ہی نہیں بلکہ اصول کا ہے جس کا نتیجہ تفریق بین المؤمنین ہے

یہ ہے عزیزانِ من!۔ آج میں نے کہا ہے کہ جب مذہب میں مسجد نماز رکعتیں یہ کچھ ہو جائیں تو بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر چہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کے لیے ہی سب نماز پڑھتے ہیں اس میں فرق کیا پڑتا ہے کسی نے ہاتھ نیچے رکھ لئے کسی نے ہاتھ اوپر رکھ لئے۔ جب اعتراض کیجیے تو اس پہ کہتے ہیں کہ صاحب فروعات کے اندر یہ اختلاف ہے' اصول کے اندر اختلاف نہیں ہے۔ اصول کے معنی صرف نماز ہو گئے' فروعات کے معنی ہو گئے اونچے نیچے ہاتھ۔ اصول کے معنی تھے ایک خدا کے حکم کے تابع زندگی بسر کرنا' ملتِ واحد کے طریقے پہ۔۔ یہ تھا اصول جواب نہیں ہے۔ پوچھئے کہ اگر یہ فرق فروعات ہی کا ہے تو کفر کے فتوے کیوں لگ رہے ہیں اسی فرق کے اوپر' فروعات کا فرق ہے تو ایک ہی مسجد کے اندر جمع ہو کے یہ کیوں نہیں پڑھ لیتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کسی حنفی کی مسجد کے اندر کوئی وہابی نماز پڑھ جائے یا وہابیوں کی مسجد میں حنفی نماز پڑھ جائے اور پتہ چل جائے بعد میں اس امام کو تو فرش دھوتے ہیں اور بعض تشدد اکھیڑ دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! کیا کہا جائے ان لوگوں کو۔ یہ ہے جو قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ کفر اور تفریق بین المؤمنین ہے۔

توحید خداوندی کی خاطر قائم ہونے والے مراکز میں مشرک کا دخل یا/ عمل دخل

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ مشرک کو حق نہیں پہنچتا کہ جو مراکز ہیں توحیدِ خداوندی کے' قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کے نظام قائم کرنے کے' کسی مشرک کو حق نہیں پہنچتا کہ اس میں دخل بھی دے۔

اُن میں کوئی مشرک شریک ہی نہ ہو

اور آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں پچیس سال سے قانون کیوں نہیں بن رہا۔ یہ سارے فرقے والے بیٹھ کے قانون بنا رہے ہیں۔ بنا ہی نہیں سکتے۔ وہ کہتا ہے انہیں حق ہی نہیں پہنچتا۔ وہ اس لیے نہیں پہنچتا کہ یہ واحد ضابطۂ حیات پوری امت کے لیے بنا ہی نہیں سکتے۔ پچیس برس پیشتر جس کے اوپر ہزار علماء نے کفر کا فتویٰ لگایا[1] پرویز نے یہ بات کہی تھی کہ یہ نہیں بن سکے گا کوئی ایک ایسا ضابطۂ قوانین اس طرح سے نہیں بن سکے گا جسے پاکستان کے مسلمان متفقہ طور پہ اسلامی تسلیم کرلیں۔۔ نہیں بنا سکو گے فرقہ بندی کے تابع۔ لگا دو فتوے' بہت اچھا جی لگا دیجیے فتوے۔ ہم نے کہا اگر فتوے لگنے سے یہ ضابطہ بن جائے تو دو دفعہ لگا دیجیے' بنے گا نہیں۔ پچیس برس تک یہ کوشش کرتے رہے۔ پچیس برس بعد خود تسلیم کیا مودودی صاحبؒ نے کہ نہیں بن سکتا۔ تسلیم کیا اور اس کے بعد ریزولیشن پاس کیا کہ حکومت سے کہا جائے کہ بناؤ ایک ضابطۂ حیات۔۔ اگر یہ نہ بنایا تو ہم کراچی سے لے کر خیبر تک ایک تحریک چلا دیں گے۔ خود ہی کہہ رہے ہیں نہیں بن سکتا' حکومت سے کہتے ہیں بناؤ' نہ بناؤ گے تو ایک تحریک چلا دیں گے۔ تماشا ہو رہا ہے اس قوم کے اندر۔ اسی لیے اس نے کہا تھا کہ مشرکین یہ کر ہی نہیں سکیں گے۔

کیا کتاب وسنت کے تحت کوئی متفقہ علیہ آئین بن سکتا ہے؟

اب پھر دل میں یہ چیز پیدا ہوگئی کہ یہ سارے مسلمانوں کو مشرک قرار دے رہا ہے۔ او میں تو نہیں قرار دے رہا ہوں وہ تو قرآن کہتا ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے۔ کہتے ہیں جی! یہ فرقہ بندی نہیں ہے یہ مکاتبِ فکر ہے۔ لو!!۔ فرقہ بندی کو مکتبِ فکر کہنے سے پھر فرقہ نہیں رہتا۔ جب بھی حنفی فتویٰ لینے کے لیے جاتا ہے حنفی مفتی کے پاس جاتا ہے' اہلحدیث کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا' شیعہ کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا اگر یہ مکتبِ فکر ہی ہے تو۔ اپنے آپ کو فریب دینے کی بات ہے۔ بڑی جرأت کی ضرورت ہے عزیزانِ من! قرآن کی طرف آنے کے لیے اور یہ کہنے کے لیے کہ ہاں ہماری زندگی اسلامی نہیں ہے' ہماری زندگی توحید کی نہیں

---

(۱) یہ اشارہ پرویز صاحب کا اپنی طرف ہے۔

ہے، ہماری زندگی شرک کی ہے، کفر کی ہے۔اس اقرار واعتراف کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔اور جب تک یہ جرأت پیدا نہیں ہوتی آپ اسلام کے اوپر آ نہیں سکتے۔اسلام تو توحید خالص ہے خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے کا نام۔کوئی کسی کی فقہ نہیں ہوگی کوئی مسلک نہیں ہوگا۔اسلامی مملکت کا قانون جو خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے بنائے گئے ہونگے یہ اسلامی قانون، یہ ہوگی اسلامی فقہ۔۔اس کا نام ہوگا مسجد۔اس میں کوئی مشرک خواہ وہ غیر مسلم ہو یا مسلمانوں میں فرقہ پرست وہ کبھی دخل نہیں دے سکے گا۔جونہی یہ آئے اور یہ عمارت گری۔

آج کے اس غیر قرآنی معاشرے میں پیدا ہونے والے سوال کے مطابق کیا فرقہ بندی اور مکاتب فکر میں کوئی فرق ہے؟

اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ وَ لَمۡ یَخۡشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰۤی اُولٰٓئِکَ اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُہۡتَدِیۡنَ (9:18) نظامِ خداوندی کے مراکز کی تعمیر کا کام' ان کے آباد کرنے کا کام وہی کر سکیں گے جو خدا پہ ایمان لانے والے ہیں' آخرت پہ ایمان لانے والے ہیں۔۔اقامتِ صلوٰۃ کریں گے' ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔جن کے دو بنیادی ستون جو قرآن قرار دیے جا رہا ہے۔اور سب سے بڑی چیز یہ کہ پھر یہی جو الفاظ ہوتے ہیں خدا کے سوا کسی کی خشیت ان کے اندر نہ ہو۔

فرقہ بندی کے خلاف کسی قسم کی بات کرنا بھی گوارا نہیں کی جاتی

فرقوں کے اندر عزیزانِ من! دیکھیے اس فرقے کے بانی کے متعلق یہ کبھی کہہ دیجیے کہ انہوں نے فلاں جگہ غلطی کی یا فلاں بات ٹھیک نہیں کی۔آپ دیکھیے کس طرح کپکپا اٹھتے ہیں' یہ ڈرتے ہیں کانپتے ہیں۔۔حضرت صاحب کی شان میں یہ توبہ توبہ ایسی گستاخی۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر ان تمام چیزوں کو ہٹا کے صرف خدا کے قانون کے تابع آپ آ جائیں گے تو آپ پھر کسی سے خوف نہیں کھائیں گے۔ایک مملکت کے قانون کا اتباع کرنے والا وہ مملکت خالصتاً قانون کی ہے تو پھر اس کو ڈر کس کا ہوتا ہے۔کسی اور کا خوف تمہارے دل میں نہیں ہوگا۔یہی لوگ ہیں کہ جو ہدایت پانے والے ہیں۔

مذہب اور دین خداوندی میں ایک بنیادی فرق ہے

اب آگے دیکھیے کیا بات آتی ہے قرآن دین اور مذہب میں کس طرح سے نکھار کر فرق بتا دیتا ہے۔مذہب کس چیز کا نام ہے۔۔ نیکی کرو جی۔نیکی کیا کرو جی' ٹھیک ہے نماز پڑھو' روزے رکھو' خیرات دو' بھوکوں کو روٹی کھلا دو' سبیلیں لگا دو۔یہی ہیں نا نیکی کے کام آپ

کے ہاں۔ مذہب میں یہ ہوتا ہے۔ دین کے اندر قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لیے ایک مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے جس کا انجام میدانِ جنگ بھی ہوتا ہے۔ جو اس کے راستے میں مزاحمت کے لیے کھڑا ہو اس مزاحمت کو روک دینا یہ دین ہوتا ہے۔ دین مملکتِ خداوندی کے قیام کا نام ہے۔ مملکت جب بیچ میں سے چلی جاتی ہے' دین کی مملکت۔۔ تو وہ دین مذہب ہو جاتا ہے۔ پھر مذہب میں ہوتا کیا ہے؟ یہ نیکی کے کام سارے باقی رہ جاتے ہیں۔

مذہب دین کی بلندیوں کو چھو بھی نہیں سکتا

قرآن کہتا ہے کیا سمجھ رہے ہو تم اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (9:19) کیا سمجھے ہو تم۔۔ حاجیوں کے لیے سبیلیں لگا دینا' مسجدوں میں قمقمے لٹکا دینا' قالین بچھا دینا یہ تمام چیزیں اس قسم کے مذہب کی رسوم ادا کر لینا۔ کیا یہ چیز اس کے برابر ہو سکتی ہے کہ خدا کے راستے کے اندر جہاد کرنے کے لیے انسان کھڑا ہو جائے۔ کیا سمجھتے ہو تم۔ جواب دیا ہے کہ تم اپنے ذہن میں جو جی چاہے فیصلے کر لو لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ (9:19) خدا کے ہاں تو یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ خدا کے ہاں مذہب اور دین برابر نہیں ہے۔ خدا کے ہاں مذہب کی نیکیاں دین کی نیکیاں نہیں بن سکتیں۔ یہاں سکھایا یہ گیا کہ صاحب حکومت کسی کی بھی ہو کفار کی ہو' مشرکین کی ہو' عیسائیوں کی ہو' برطانیوں کی ہو' اس کے تابع زندگی بسر کرنا ٹھیک ہے' عین اسلام ہے۔ اس میں تم اپنے نماز روزہ پڑھتے جایا کرو' خیرات حج کیے جایا کرو بس یہ ٹھیک ہے۔ سچے پکے مسلمان تم بن جاؤ گے' اس سے زیادہ ضرورت ہی نہیں ہے۔ پانی پینے کے لیے سبیلیں لگا دیں' یتیم خانے بنا دیے کوئی نیکی کے کام کر دیے' خیرات دیدی صدقہ دیدیا' نمازیں پڑھ لیں' مساجد کی تعمیر کر دی۔ کہا کیا یہ چیزیں جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہو جائیں گی تم سمجھتے ہو۔ اب یہاں پھر جب مذہب آتا ہے تو پھر جہاد کے معنی چلے گئے۔ خدا کی راہ کے اندر جان دینے کے لیے میدانِ جنگ میں چلے جانا جہادِ اصغر' انہوں نے اس کا نام رکھ دیا۔ ارے بھئی جہادِ اکبر کیا ہے' کہ جی وہ قلمی جہاد ہے' تبلیغ کرنا ہے جناب' کتابیں لکھنا ہے۔ اب دیکھ رہے ہیں یہ مجاہدِ اعظم آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ساری عمر یہی کچھ کرتا رہا۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ بہکانا ہے امت کو' فریب دینا ہے۔ قرآن میں ایک ہی جہاد ہے۔۔ نظامِ اسلامی کے تمکن کے لیے مسلسل جدوجہد اور اس کے راستے میں مزاحمت آتی ہے تو اس کے دور کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں جا کے جانیں دیدینا اور کوئی دوسرا جہاد نہیں ہے۔ اصغر اور اکبر جہاد نہیں ہے۔ فریب ہے۔

مذہب کے چند ایک عقائد و رسومات نے دین کے چہرے کو مسخ کر دیا ہے

کہا کہ ان چیزوں کو تم اس کے برابر سمجھتے ہو' سمجھتے رہو۔ کیا الفاظ ہیں قرآن کے!!! یہ اگلی چیز اتنا بڑا طمانچہ ہے لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ

اللّٰهِ (9:19) خدا کے نزدیک تو یہ برابر نہیں ہوسکتے۔وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (9:19) ایسا سمجھنے والے قوم ظالمین ہیں۔ ظلم کے تو معنی یہ ہوتے ہیں نا کہ جس شے کو جہاں ہونا چاہیے اُسے وہاں نہ رکھنا۔الٹا کے رکھ دیا نا انہوں نے۔مملکت دنیا کی چیز ہوگئی اور یہ اعتقادات اور یہ رسومات اور یہ عبادات یہ دین کی چیز ہوگئی۔الٹا کے رکھ دیا۔۔یہی تو ظلم ہے۔کہتا ہے ان پر کشاد کی راہ کیسے کھل سکے گی۔سنیے کیا ہے جو کہا ہے کہ برابر نہیں ہوسکتے۔اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ ھَاجَرُوْا وَ جٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ (9:20) وہ لوگ کہ جن کو اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لیے جس چیز کے چھوڑنے کی ضرورت پیش آئی اُسے چھوڑ دیا۔یہ ہے ہجرت۔ حتیٰ کہ گھر بار چھوڑنے کی بھی ضرورت پیش آئی تو چھوڑ دیا۔وَ جٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اور اس راستے میں مسلسل جدوجہد کرتے یہ میدانِ جنگ تک پہنچ گئے۔بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ (9:20) جب ابھی جان دینے کی ضرورت نہیں ہے تو یہی جدوجہد جو ہے مال و دولت کے ذریعے سے کی جائے گی۔مال کے بھی تو بنیادی معنی محبت کے ہوتے ہیں ہر وہ چیز جس کے ساتھ میلان ہے آپ کو، مرغوب ہیں جو آپ کی چیزیں۔جان آخری چیز ہوتی ہے جو مرغوب ہوتی ہے اس سے نیچے کی چیزیں بھی مرغوب ہوتی ہیں۔اور آخری چیز ہے اَنْفُسِھِمْ (9:20) جہاد کا آخری درجہ یہ ہے جہادِ اکبر۔قرآن تو واضح کر دیتا ہے جانیں دینے کا جہاد۔

مذہب میں ثواب کے معنی صرف ثواب ہی ہوتا ہے جبکہ قرآن حکیم نے فائزون کے الفاظ استعمال کیے ہیں

اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ (9:20) تم نے ان چیزوں کو برابر سمجھ لیا تھا۔اللہ کے ہاں ان کا درجہ ہے سب سے اعظم۔ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ (9:20) یہ لوگ ہیں جو کچھ Achieve کرتے ہیں باقی جو کچھ ہوتا ہے ''او تے صرف ثواب حاصل ہونداہیگا''۔ ''اے ہوندا کی اے' کہندے نیں ثواب ہونداا ے' او میاں مینوں پنجابی اچ سمجھا دے کی ہونداہیگا اے' کہن لگا اینوں اے وی نئیں جے پتہ ثواب ہونداہیگا''۔قرآن فائزون کہتا ہے Some thing Achieved کچھ حاصل کیا ہے انہوں نے۔یہ ہے وہ لوگ۔ یُبَشِّرُھُمْ رَبُّھُمْ بِرَحْمَۃٍ مِّنْہُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّھُمْ فِیْھَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ (9:21) بشارت دیدوان کو خدا کی طرف سے سامان مرحمت کی۔

خدا کا انسانوں سے راضی ہونے کا حقیقی مفہوم قوانین خداوندی سے ہم آہنگی کا ہے

رضـــوان: یہ عجیب لفظ ہے جو قرآن کی طرف سے آتا ہے رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔۔ترجمہ اس کا اللہ ان سے راضی ہوگیا' یہ اللہ

سے راضی ہو گئے''جس طراں لڑائی ہوگئی ہوئی سی' تے صلح ہوگئی کہ جی اوراضی ہو گئے نیں آپس اچ' رضامندی ہوگئی آپس اچ''۔اس کے معنی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ وہ لوگ خدا کے قوانین سے اس کے بتائے ہوئے زندگی کے ضابطے سے ہم آہنگ ہو گئے اور اس کے نتائج ان کی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے۔نتیجہ اس کا وہ خوشحالیوں اور خوشگواریوں کی جنت کی زندگی نَعِیۡمٌ مُّقِیۡمٌ (9:21) اس دنیا میں بھی اس کے بعد کی دنیا میں بھی۔۔آسائشیں نعمتیں۔۔چھن جانے والی نہیں باقی رہنے والی۔ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا (9:22) جب تک وہ اس نظام پہ قائم رہیں گے یہ چیزیں ساری حاصل ہونگی۔۔نہیں چھن سکتیں ان سے۔اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ (9:22) یہ ہے اجرِ عظیم جو خدا کے ہاں سے ملتا ہے۔لیکن اس میں دو چار ذرا سخت مقام آتے ہیں اور دو چار کیوں' یہ تو راستہ ہی سخت مقام کا ہے

انسانی زندگی میں ہجرت کا مفہوم صرف کسی مقام کو چھوڑنے کا ہی نہیں ہے

عزیزانِ من!۔ہجرت کو بھی محدود کر کے رکھ دیا صرف مکے سے مدینے جانے کے لیے اور وہ ہوگئی چودہ سو سال پہلے کی بات۔۔ بس۔اتنی سی بات نہیں' خدا نے کہا ہے کہ ہر وہ شے جو بڑی محبوب ہو تمہیں۔۔اگر اسے بھی چھوڑنا پڑتا ہے تو اسے چھوڑنا ہوگا۔ابتداء کہاں سے ہوتی ہے دیکھیے کیا کہتا ہے قرآن۔

ہجرت کے ایمان اور اسلام کے معیار کو ملحوظ خاطر رکھنے کی اہمیت

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰبَآءَ كُمۡ وَ اِخۡوَانَكُمۡ اَوۡلِیَآءَ اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡكُفۡرَ عَلَی الۡاِیۡمَا نِ (9:23) آئیے ہجرت کا پہلا مرحلہ۔۔تمہاری اولاد تمہارے ماں باپ' تمہارے بھائی بہن۔۔آگے آتی ہے بات کون کون۔۔اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں تو انہیں بھی تم اپنا دوست نہ بناؤ۔اپنے اور بیگانے کا معیار ہی ایمان اور کفر ہو گیا۔ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہوں۔اتنے عزیز تو سب سے پہلے تو ماں باپ کی بات ہی آتی ہے پھر بھائیوں کی بات آتی ہے۔بھائی بند ماں باپ۔۔ اگر وہ کفر کو عزیز زیادہ رکھتے ہیں ایمان کے مقابلے میں۔۔انہیں بھی تم دوست نہیں بنا سکتے۔وَمَنۡ یَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (9:23) جو انہیں دوست بنائے گا پھر اس کا شمار بھی ظالمین میں سے ہو جائے گا صاحب۔اور اگلی آیت میں عزیزانِ من! دیکھیے کہ ایمان کا اور اسلام کا قرآن نے معیار کیا قرار دیا ہے۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

گنتے جایئے عزیزانِ من!۔قُلۡ (9:24) ان سے کہہ و برملا اِنۡ كَانَ اٰبَآؤُكُمۡ وَ اَبۡنَآؤُكُمۡ وَ اِخۡوَانُكُمۡ وَ اَزۡوَاجُكُمۡ وَ

عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ (9:24) عظیم آیت ہے عزیزانِ من! کپکپی آ جاتی ہے اس کے پڑھنے کے بعد تو' سوچا جاتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔ کہا کہ ان سے کہہ دو اعلان کر دو کہ اگر تمہارے ماں باپ' اگر تمہاری اولاد' تمہارے بھائی بہن' تمہاری بیویاں' بیویوں سے کہا تمہارے خاوند ۔۔ ازواج کے دونوں معنے ہوتے ہیں ۔۔ خاوند سے کہا جائے گا تو بیوی مراد ہوگی' بیوی سے کہا جائے گا تو خاوند مراد ہو جائے گا ازواج عربی زبان میں دونوں کے لیے آتا ہے ۔ اگر تمہارے ماں باپ تمہاری اولاد تمہارے بہن بھائی تمہاری بیویاں تمہارے خاوند وَعَشِيْرَتُكُمْ (9:24) اہلِ خاندان' وہ مال کہ جو تم اس محنت سے حاصل کرتے ہو' وہ تجارت کہ جس کے مندا پڑ جانے سے تم اس قدر غمگین ہو جاتے ہو' وہ محلات کہ جو تم نے اتنی محنت سے بنائے اور جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو ۔۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اگر اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ (9:24) اگر یہ زیادہ محبوب ہو گئی ان میں سے کوئی چیز بھی خدا اور رسول اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے' کوئی چیز بھی ان میں سے زیادہ محبوب ہو گئی فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (9:24) تو پھر انتظار کرو خدا کے فیصلے کا ۔ عزیزانِ من! رکھیے تو ذرا چھاتی پہ ہاتھ' سوچئے تو سہی کہاں ہیں ہم' کیا ہے یہ مقام ۔ کوئی شے بھی دنیا کی ۔ خدا اور رسول کے الفاظ بہر حال پھر وہی اسلامی نظام اور اسلامی حکومت ہے جس میں خدا کے قوانین رائج ہوں وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ (9:24) اس کے راستے میں یہ جہاد جو ہے ۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی زیادہ محبوب ہو گئی ۔

قرآن حکیم کے الفاظ میں اَحَبَّ اِلَيْكُمْ کا مقام اور دنیائے تصوف

یہاں ایک نقطہ سامنے آتا ہے بڑا ہی عجیب ہے عزیزانِ من! یہاں لفظ قرآن نے اَحَبَّ اِلَيْكُمْ (9:24) کہا ہے احب کے معنی ہیں زیادہ محبوب ہو جائے ۔ یعنی یہ ساری چیزیں قابلِ نفرت نہیں ہیں' یہ محبوب چیزیں ہیں ان کو پسند کرنا' ان سے محبت کرنا' معیوب نہیں ہے ۔ یہ تو مذہب کی دنیا ہے اس سے بھی آگے بڑھیے تو تصوف کی دنیا ہے جو ان سب چیزوں کو قابلِ نفرت قرار دیتی ہے ۔ قرآن کا لفظ دیکھیے کہ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ (9:24) ہے کہ محبوب تو یہ رہیں گی اپنے اپنے مقام پہ ۔ لیکن جب Tie پڑ جائے گی ان میں اور خدا کے راستے میں جہاد کرنے میں تو اس وقت اگر یہ اس سے زیادہ عزیز ہو جائیں گی تمہیں ۔ یہ ہیں عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ ۔ جہاں ٹائی پڑے وہاں اگر یہ تمہارے راستے میں حائل ہو جائیں ۔ تو کتنا دل ہلا دینے والا اگلا اعلان ہے ۔ یعنی اس کے اندر ظاہر کہا نہیں کہ کیا ہوگا ۔ کہا کہ پھر خدا کے فیصلے کا انتظار کرو کہ کیا ہوگا ۔ پتہ نہیں دیگر قوموں کو تو انتظار کرنا ہوگا' ہمیں تو انتظار کی بھی اب ضرورت نہیں' ۔ اس سے بھی زیادہ ذلیل زندگی دنیا میں سانس لینے والے انسانوں کی ہو سکتی ہے جس میں سے ہم گذر رہے ہیں ۔ کچھ نہیں اور کہنا چاہتا ۔

لفظ فسق کا مفہوم یعنی وہ پھل جو اپنے پیڑن سے باہر نکل جائے

وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (9:24) کہا یہ لوگ۔۔میں نے کہا ہے نا کہ فسق کے معنی کیا ہوتے ہیں وہ پیڑن جس کے اندر رہ کر پھل پکتا ہے نشوونما پاتا ہے۔ یہ جو اوپر کا خول ہوتا ہے اُسے اس کا پیڑن کہتے ہیں' جو اس میں سے نکل جاتا ہے وہ سڑ جاتا ہے گل جاتا ہے۔۔ یہ فسق کہلاتا ہے عربی زبان میں۔ اگر اس کے پیڑن کے اندر زندگی نہیں بسر کرنا چاہتے تو پھر تم کامیابیوں کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے پھر تمہارے پھل پک نہیں سکتے۔ پہلی علامت مومن کی یہ بتادی عزیزانِ من! ۔ جہاد کے مقابلے میں کوئی چیز بھی زیادہ عزیز اگر ہوگئی تو سوال ہی نہیں ہے پھر مومن ہونے کا۔ یہ بتانے کے بعد پھر آ گیا میدانِ جنگ کی طرف۔

عرب قبائل میں بنی ثقیف کی ثقافت کافی مشہور تھی' ہمارے ہاں یہ ثقافت کئی رنگوں میں بدل گئی

فتح مکہ کے بعد جب یہ واپس آئے تھے تو مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی ہے' حنین اُسے کہتے ہیں۔ وہاں کچھ قبیلے تھے اُنہوں نے سرکشی اختیار کی۔ مکے میں تو سارے قریش نے سرنڈر کر دیا تھا' امن ہوگیا تھا۔ لیکن عرب ایک مملکت نہیں تھا اس زمانے میں ۔۔مملکت کے اندر آپ کیپٹل یا سنٹرل اتھارٹی کو فتح کر لیتے ہیں تو پوری مملکت فتح ہو جاتی ہے۔۔اس میں مملکت نہیں تھی قبائل بستے تھے۔ اسی لیے وہاں قدم قدم کے اوپر اتنی لڑائیاں کرنی پڑیں تھیں۔ تو یہ جو قبائل حنین کے مقام پر بستے تھے یہ دو قبیلے تھے ہوازن اور بنی ثقیف۔ یہ ثقیف سے بات ثقافت کی آ گئی ہمارے ہاں' وہاں سے یہ لفظ نکلا ہے۔ اور ثقافت کے معنی تو اب آپ کو معلوم ہے نا کلچر کا اور کلچر ہوا آپ کے ہاں کی یہ سٹیج' سٹیج سے ہوا ڈرامہ' ڈرامے میں ہوا ناچ' ناچ میں ہوا تھرکنا' وہاں لگا طبلہ' اسلامی کلچر ہوگیا جی۔ یہ لفظ اس قبیلے سے بنا ہے یا اس لفظ میں ث ق ف جو تھا اس سے وہ قبیلہ تھا۔ تو قبیلے کے معنی تھے وہ قبیلہ جو ماہر تھا جس فن میں جس کے لیے اس قبیلے کی ثقافت مشہور تھی' وہ یہ تھا کہ وہ نہایت اعلیٰ درجے کے تیر بناتے تھے' تلواروں کو ایسا صیقل کرتے تھے کہ بڑی مشہوری تھی۔ اس کو ثقافت کہتے تھے عربی زبان میں۔

ہماری رنگ برنگی ثقافت

عزیزانِ من! ۔شمشیر وسنا اول طاؤس ورباب آخر۔ بنی ثقیف سے ثقافت تھی' یہ وہ ثقافت تھی جو آپ کے ہاں اس دور میں تھی۔ اجی اسلام تو بعد میں آیا ہے عربوں کی ثقافت بھی وہ تھی۔ یہ مذہب ان کم بختوں کو بھی لے ڈوبا۔ یعنی وہ قبل از اسلام کے عربوں کی کم از کم ثقافت تھی۔ ہم انہیں بھی لے ڈوبے۔ بات تھی وہاں دو قبیلے ہوتے تھے ہوازن اور ثقیف کے۔۔ اُنہوں نے سرکشی کی تھی۔ یہ واپس آ

رہے تھے مکے سے۔

میدانِ بدر میں نبی اکرم ﷺ کی اپنی حامل صفات شخصیت کا کردار

بدر کے میدان سے بات شروع ہوئی تھی۔۔کل کائنات تین سو کی تھی مقابلے میں کم از کم ایک ہزار ساز وسامان سے مسلح ایک ایک کے مقابلے میں تین گنا تھے۔اور کیفیت یہ کہ انہوں نے اتنی بڑی شکست ان کو دی' کمر توڑ کے رکھ دی۔ یہاں یہ بارہ ہزار کے قریب مسلمان' مقابلے میں صرف چار ہزار تھے۔ پہلے حملے میں اتنی بڑی شکست ہوئی مسلمانوں کو۔آگے دوسرے مقام پہ قرآن نے بتایا ہے کہ کیا کیفیت ہوگئی تھی۔اور یہ وہ مقام تھا جس میں نبی اکرم ﷺ کھڑے ہوئے آواز دیتے تھے ان جانے والوں کو کہ کیا ہوا تمہیں میدانِ جنگ چھوڑ کے چلے گئے۔روشنی کے مینار کی طرح رسول کھڑا ہے میدانِ جنگ میں۔اب تو ہمارے ذہن میں کچھ ایسا ہی ہے نا کہ یہ رسول بھی جو یہ نبی بھی ہوتے تھے''مولوی صاحب ہوندے سن ذرا وڈے مولوی صاحب ہوندے سن وعظاں کیندے رہندے ہیگے سن' تبلیغاں کردے رہندے سن''۔میدانِ جنگ میں کھڑا ہے رسول۔اور کھڑا بھی اس انداز سے ہے کہ جو دوسرے سپاہی ہیں وہ شکست سے بھاگ بھی گئے ہیں اور یہ اپنے مقام کے اوپر استقامت سے کھڑا ہے' روشنی کے مینار کی طرح۔۔انہیں آوازیں دے رہا ہے۔اور یہ رسول کی آواز تھی جس نے پھر ان کو واپس کھینچ لیا۔دیکھیے قرآن کیا بتاتا ہے کہ یہاں کیوں شکست ہوئی تمہیں۔جذبات یہ تھے کہ یہ ایک مشن ہے جس کی کامیابی کے لیے ہمیں یہ کچھ کرنا ہے' اس کی صداقت پر یقینِ کامل تھا جس کی بناء پہ یہ ایک ایک تین تین کے اوپر بھاری ہوگیا تھا اور لڑ گیا تھا۔کہا یہاں کیا ہوا۔لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ (9:25) کہا یہاں ہم نے تمہیں کئی مواقع پر بڑی مدد پہنچائی تھی۔

میدان جنگ میں خدا کی طرف سے مدد کے حصول کی نوعیت اور اس کا طریق

اور یاد رکھو حنین کے میدان میں بھی تمہیں ہم نے مدد دی تھی۔وہاں ہوا کیا تھا؟ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا (9:25) ہوا یہ تھا کہ تمہیں زعم ہوگیا کہ بڑی فوج ہمارے ساتھ ہے۔تو تم نے جو ایک سپاہی کی ڈسپلن کی چیز ہوتی ہے اس زعم میں کہ ان کو مار لینا کونسا مشکل ہے' چار ہزار ہیں جب کہ ہم بارہ ہزار کی تعداد میں ہیں۔سپاہی اگر ایسے مقام میں صرف اپنی کثرت کے اوپر زعم کرتا ہے اور سپاہیانہ خوبیاں بھلا دیتا ہے' کہتا ہے شکست کھا جاتا ہے۔یوں تمہیں شکست ہوگئی اس میدان میں۔کتنی بڑی چیز دو دو لفظوں میں قرآن کہہ جاتا ہے۔یہ واقعات کوئی سوانح نگاری نہیں ہیں' تاریخ کے مرقع نہیں ہیں کہ وہ ہسٹری بیان کر رہا ہے۔اس نے تو ایک چیز اصول کی کہنی ہوتی ہے اس کے لیے ایک واقعہ کو دہراتا ہے۔کہتا ہے کہ اگر کبھی زعم آ جائے ذہن کے اندر کہ ہماری کثرت ہے' ہماری تعداد بڑی

ہے۔صرف تعداد کے اوپر تم نے بھروسہ کرلیا شکست کھاجاؤ گے یادرکھو۔

زندگی کے میدان میں اگرسکون قلب میسر نہ ہوتو پھرافرادی قوت بھی کوئی تعمیری نتیجہ پیدانہیں کرتی

یہاں یہ بات کہی۔فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا (9:25) نتیجہ یہ ہوا کہ محض زعم بھی تمہیں وہاں فائدہ نہ دے سکا۔وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (9:25) کیاالفاظ ہیں!!! زمین اتنی وسعتوں کے باوجود تم پرتنگ ہوگئی۔چار ہزار کے مقابلے میں بارہ ہزار بھاگ کھڑے ہوئے۔ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (9:26) وہ مدد جو ہم نے دی تھی وہ یہ تھی کہ پھر تمہارے دلوں کے اندر سکون پیدا ہوگیا۔اور یہی ہے سب سے بڑا ہتھیار جو سپاہی کے پاس ہے وہ دل کا سکون اور اطمینان ہے عزیزانِ من! اس میں اگر اضطراب پیدا ہوجائے' بے اطمینانی پیدا ہوجائے تو پھر کھڑا نہیں رہ سکتا آدمی۔میدانِ جنگ تو ایک طرف رہا' امن کے میدان میں بھی انسان نہیں کھڑا رہ سکتا اگر دل کا سکون اٹھ جائے تو۔

قوانین خداوندی پر یقین محکم کے سہارے سکون قلب کا پیدا ہونا ہی تو ملائکہ کا نزول ہے جو نظر نہیں آتا

اسی سکون دینے والے یقین کا نام تو ایمان ہوتا ہے۔خدا نے سکینت پیدا کردی تمہارے دلوں کے اندر۔اور سنیے وہ الفاظ پھر آگئے جو پہلے بھی کئی دفعہ آئے تھے۔ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا (9:26) ہم نے لشکر اتارے۔تو میں نے کہا تھا کہ لشکر اتارنے کا ہمارے ہاں تو وہ ہے سفید گھوڑیوں والے اور سبز عماموں والے کہ جی ہم نے آپ دیکھا ہے' وہاں راوی کے پل پہ تھے۔۔گولہ آتا تھا اس کو ادھر کردیتے تھے' ہم نے دیکھا ہے برکی کے اوپر گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلے آرہے تھے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔۔قرآن کہتا ہے کہ ہم نے لشکر اتارے تھے۔الفاظ ہیں لَّمْ تَرَوْهَا (9:26) تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔وہ لشکر ایسے نہیں تھے جو آنکھوں سے دیکھے جاسکتے ہوں۔وہ ہم نے تمہارے قلوب کی دنیا کے اندر اتارے تھے اور انہوں نے آکے تمہیں اطمینانِ کامل دیدیا تھا۔یہ ہے وہ جو خدا کا لشکر آیا کرتا ہے عزیزانِ من! وہ دلوں کی بستیوں کو آباد کیا کرتا ہے۔وہ نازل ہوتا ہے دلوں کے اندر۔۔سکینت پیدا ہوجاتی ہے ایک نفسیاتی تغیر پیدا ہوتا ہے۔رسول کی آواز نے یہ چیز پیدا کردی جب اُنہوں نے کہا تھا۔ایک سکون پیدا کیا۔وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (9:26) اور اس کے بعد پھر سزا دی اس نے ان کو جو کافر تھے۔وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (9:26) سرکشی برتنے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (9:27) اسکے بعد ان قبائل نے بھی سرنڈر کیا' کیا یہ بھی ایمان لے آئے۔کہا کہ اس واسطے پھر اس کے بعد اللہ لوٹ آیا اپنی مشیت کے مطابق ان کے اوپر بھی۔یادرکھیے۔وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (9:27) خدا کے ہاں سامانِ حفاظت بھی ہے سامانِ مرحمت بھی ہے۔۔سابقہ لغزشوں کے جو

نقصانات ہوتے ہیں وہ ان کو بھی پورا کرتا ہے اور اس کے بعد پھر نشو ونما کا سامان بھی دیا کرتا ہے۔

توبہ کی اس قبولیت کے بعد پھر مشرکین کا تذکرہ اور لفظ نجس یا نجاست کا قرآنی اور لغوی مفہوم

پھر وہی اعلان جو پہلے ہوا تھا یَـٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَـا الْـمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰـــذَا (9:28) پھر اعلان کیا جا رہا ہے کہ یاد رکھو مشرک نجس ہیں وہ اب اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے قریب' کعبہ کے قریب نہیں آ سکتے۔ پھر وہی بات جو میں نے عرض کی تھی کہ اس سے ان کے جسم اور بدن کا سوال نہیں ہے۔ نجس کے معنی تو پلید کر دیے پھر کہا کہ کافر اور مشرک میں نجاست ہوتی ہے ناپاک ہوتے ہیں ان کے جسم' اس لیے یہ یہاں نہ آئیں۔ مگر ان سے یہ کہا گیا کہ دیکھیے یہ ہم تو نہاتے دھوتے ہیں پاکیزہ ہوتے ہیں' کپڑے پاک اور صاف ہوتے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں یہ مسلمان دیکھیے ان کی کیفیت یہ ہے ان میں سے بیشتر بے حد غلیظ ہوتے ہیں' کپڑے بھی غیر موزوں ہوتے ہیں۔ تو وہ ناپاک' نجس سے نجاست' نجاست سے پلیدی' پلید کے معنی ناپاکی' ناپاکی کے معنی غلاظت' غلاظت کے معنی یہ بول براز وغیرہ۔ یہ سارا کچھ وہاں آیا اور پھر اس پہ اعتراض۔ اعتراض ہوا تو اس کا جواب ہمارے ہاں وہ دیا کرتے تھے۔ کہنے لگے جی یہ ہندو روز صبح غسل کرتے تھے نہاتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں صبح تارے' تاروں کی چھاؤں میں۔۔ باہر کے رہنے والے احباب ان کی شہادت دیں گے۔۔ ان کی عورتیں اور یہ لوگ کچھ زیادہ بڑے بڑے کپڑے نہیں پہنا کرتے تھے کہ گرم کپڑے بھی ہوں' ان کے ہاں Economically تھوڑا سا کپڑا ہوتا تھا۔ وہ عورتیں ان کی صبح سردی کے زمانے میں دسمبر جنوری کے زمانے میں گھروں سے نکلتی تھیں ایک ایک دھوتی پہنے ہوئے اور وہ چلی جا رہی ہیں راوی پہ دریا پہ نہانے کے لیے۔ سورج نکلنے سے پہلے پہلے وہ نہا کے بھی آ جاتی تھیں۔ مسلمان سو کے نہیں اٹھتا تھا ''او سمجھدے ہیگے سن اے کدی نہاندے ای نئیں ہیگے''۔ ''او کیندے ہوندے سن ایناں کافراں دا ستیاناس بالکل نجس اور پلید جناب' آ جیہڑا سویرنوں نہاتے نیں نا' ایناں نے دوپہرنوں نئیں نہانا' ایناں نے شام نوں نئیں نہانا' ایناں نے رات نوں نئیں نہانا' فیر جا کے کل سویرے کتھے نہانا' تے مسلمان روز جمعہ جمعہ''۔

قرآن حکیم نے شرک کو نجس کے مفہوم میں بھی پیش کیا ہے، نجاست تو کہتے ہی گدلے پن کو ہیں

میں نے کہا ہے کہ جب بنیادی نقطہ نکل جائے ذہن سے تو یہ سب چیزیں آ جاتی ہیں۔ نجس کے معنی یہ ہوئے۔ شرک کو قرآنِ کریم نے نجس کہا ہے۔ اور شرک کا تعلق تو جسم کی پاکی پلیدی سے نہیں ہے عزیزانِ من! اِنَّمَـا الْـمُشْرِكُوْنَ وہی مشرک جو اس وقت توحید کا قائل ہو جاتا ہے تو وہ پھر نجس نہیں رہتا۔ تو نجس یہ چیز نہیں بلکہ نجس یہ ہے کہ قلب کے اندر ایک خدا کے علاوہ اور خداؤں کے بھی قوانین کا احترام کرنا اور ان کی عبودیت اختیار کرنا' ان کو بھی اس قسم کا الٰہ تصور کرنا' یہ نجس ہے' یہ قلب کا ایک مرض ہے۔ نجاست تو ہوتا ہی گدلا پن

ہے۔توحید شفاف چیز ہے۔ گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس میں ذرا سا بھی ریشہ آ جاتا ہے اُسے نجس کہتے ہیں۔ نجاست ہوتی ہے ایک شفافی کے اندر کسی قسم کی اور دھاری کا آ جانا۔ یہ شرک کہلاتا ہے اسی لیے اِنَّمَا الۡمُشۡرِکُوۡنَ نَجَسٌ (9:28) کہا ہے۔ اس لیے یہ جو اپنے ذہن کے اندر خدا کے قوانین کے علاوہ کسی اور کے قوانین کی حکمرانی کو بھی تسلیم کر رہے ہیں' یہ نہیں آ سکتے یہاں۔ یہ ہیں جن کو جسمانی طور پہ وہاں سے ہٹا دیا۔

قوانین خداوندی کے ساتھ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو شامل کرنا شرک ہے

آپ کی سیاست کا کبھی تقاضا ہو کہ کسی قوم کو' کسی گروہ کو آپ اپنے ہاں نہ آنے دیں۔ لیکن قرآن کی اس آیت کے ماتحت یہ نہیں ہے۔ یہاں تو مشرک کے متعلق کہا ہے۔۔ خدا کے قوانین کے ساتھ اور قوانین کو بھی ملانے والا۔ وہ یہاں نہیں آ سکتے۔ اس لیے کہ اب یہ نظامِ مملکت جس کا مرکز کعبہ ہے' یہ ان لوگوں کی تولیت میں آ گیا' تحویل میں آ گیا جو خالص قوانینِ خداوندی کے تابع نظام قائم کرنے والے ہیں۔ اب کعبہ میں یہ سارے لوگ آتے تھے' تو بڑی تجارت ہوتی تھی' بڑا کاروبار ہوتا تھا۔ پھر یہ اس کے پجاری بھی تھے اس مندر کے' بہت سا نذرانہ وہاں چڑھتا تھا' بھینٹ چڑھتی تھی' چڑھاوے چڑھتے تھے۔ کہا گھبراؤ نہیں!

کسی مشرک کی غیر موجودگی کے باعث اقتصادی لحاظ سے کسی قسم کا نقصان ہو جانے کا تصور غلط ہوگا

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ عَيۡلَةً فَسَوۡفَ يُغۡنِيۡكُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖۤ اِنۡ شَآءَ (9:28) یہ خیال نہ گذرے کہ یہ یہاں نہیں آئیں تو ہم پر اقتصادی طور پہ اس کا بڑا اثر پڑے گا' Economically اس واسطے یہ تو بڑی بری بات ہوگئی۔ کہا کہ یہ سوال نہیں ہے۔ اگر ایسی صورت ہوگئی۔ اگر تم اس سے گھبراتے ہو تو گھبراؤ نہیں۔ تمہارا نظام اس قسم کا ہے کہ اس سے تمہیں کسی کی محتاجی نہیں رہے گی' مستغنی کر دے گا خدا تمہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ (9:28) جو وہ کہہ رہا ہے علم پہ مبنی ہے' علم بھی ایسا ہے Rationally یہ باتیں وہ کہہ رہا ہے' یونہی اعتقاداً یہ چیزیں تم سے نہیں منوا رہا۔ Irrational Faith تو قرآن کی رو سے Faith ہی نہیں کہلا سکتا' ایمان ہی نہیں کہلا سکتا۔ علم ہے اس کے ساتھ حکمت ہے اس لیے اس سے نہ گھبرایئے کہ ان لوگوں کے ساتھ قطع تعلق کرنے سے اقتصادی طور پر تمہیں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ آج اس دور میں ہمارے ہاں عزیزانِ من! چونکہ وہ نقطۂ ماسکہ وہ توحید کی۔۔ بنیاد تو رہی نہیں ہے۔۔ ہر مسئلے میں ہمارے ہاں پہلے اکنامکس آ جاتی ہے۔ یعنی دلیل ہی اب یہ دی جاتی ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات ضرور وابستہ کرنے چاہئیں۔ وہ کاہے کے لیے کرنے چاہئیں؟ کہ صاحب دیکھیے نا اس کے ساتھ تجارت کے راستے کھل جائیں گے۔ دوسری قوموں کے ساتھ معاہدے ہوتے ہیں جن کے متعلق معلوم و مشہود ہے کہ وہ کس طرح سے ہماری اصل و بنیاد کو اکھیڑنے کے درپے ہیں۔ ان کے ساتھ ٹریڈ کے معاہدے

ہو جاتے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ یہ Considerations ان چیزوں کے اوپر حاوی نہ ہو جائیں صرف یہ دیکھو کہ تمہارے نظام کی تائید کون کرتا ہے۔اگر یہ خیال ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے سے اقتصادی طور پر بڑا مضراثر پڑے گا تو گھبراؤ نہیں' یہ نظام جو تمہیں ہم دے رہے ہیں ذرا اس کو قائم کر کے دیکھو۔اور پھر دیکھو کہ کس طرح سے مستغنی کرتا ہے خدا تمہیں اس سے۔اس نظام کے تثبیت میں کتنی خوشحالیاں حاصل ہوئی تھیں' اس کی تفصیل تو چھوڑ دیجیے۔محض اس مملکت کے خراج کی صورت یہ تھی کہ ایک علاقے کا خراج لے کے حضرت ابو ہریرۃؓ جب حضرت عمرؓ کے پاس آئے ہیں تو انہوںؓ نے پوچھا کہ کتنا لائے ہو' پانچ لاکھ۔آپ کو معلوم ہے کہ لاکھ کے لیے تو عربی زبان میں لفظ ہی نہیں ہے''ایناں دا گھوڑا ای مک جاندا سی ہزارتوں اگے''۔وہ الف انہوں نے ہزار کہا اور اس کے الفاالفاً پھر کہتے تھے ہزار پھر ایک اور ہزار پھر ایک اور ہزار۔میں کہہ رہا ہوں کہ ان کی کیفیت کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ابھی ابھی اسلام سے پیشتر اسی معاشرے کے افراد تھے۔یہ لائے ہیں تو انہوںؓ نے کہا ہے کہ کتنا لائے ہو تو اُنہوںؓ نے کہا کہ پانچ لاکھ۔کہنے لگے ابو ہریرۃؓ کیا کہہ رہے ہو' کہنےؓ لگے جی پانچ لاکھ۔آپ حیران ہونگے تاریخ کہہ رہی ہے حضرتِ عمرؓ نے ان سے کہا کہ خراج لے کر سیدھے آ رہے ہو نا میرے پاس' کہنے لگے ہاں' کہنے لگے تکان کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے نیند آ رہی ہے' جاؤ سو جاؤ کل صبح آنا۔یعنی Unbelievable تھا۔اور پھر وہ آئے تو ان سے کہا اب کہو' تو انہوں نے کہا جی جو ہزار میں سے ہزار ان کے ہاں الفاظ ہوتے تھے یونہی سمجھایا۔یعنی یہ تھی وہ قوم اور یہ تھا جو قرآن کہتا ہے کہ مت گھبراؤ کہ اس طرح سے اقتصادیات پہ اثر پڑ جائے ان کے ساتھ تعلق منقطع کرنے سے۔اتنا کچھ دے گا وہ کہ جیسے اب میں کہوں کہ تمہارے لیے Unbelievable ہوگا۔اور یہ لوٹ کھسوٹ نہیں تھی۔لوٹ کھسوٹ تو ان کے ہاں جائز ہی نہیں۔یہ وہ جو معاشی نظام قرآن نے دیا تھا سیاسی نظام۔ارے صاحب وہ قلوب کا ایک نظام تھا میں کیوں اس کو معاشی اور سیاسی نظام کہوں۔

فتح ایران کے بعد حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کی نوعیت اور وہاں کے تاثرات

سوچیے تو سہی ایران جیسی سلطنت کو فتح کرنے کے بعد قرنہا قرن کے جمع شدہ نوادرات اور جواہرات اتنا کچھ ان کے حصے میں آیا تھا۔واقعی ابن ابی وقاص پہنچے ہیں تو وہ Believe ہی نہیں کرتے تھے کہ میں اس دنیا میں کھڑا ہوں۔تو جب یہ چیزیں آئی ہیں مدینے میں ۔۔حضرت عمرؓ صحابہ کے ساتھ تھے' صحابہؓ سے کہا کہ ہم سارے ہی وہ ہیں جو کھجوروں پہ بھی نہیں کھجوروں کی گٹھلیوں کے ستو پہ گذارہ کیا کرتے تھے۔آج یہ سب کچھ جو ہے آپؓ نے کہا تم اور میں وہی ہیں نا' کہا بتاؤ کہ کیا چیز ہم میں ایک نئی آئی ہے۔کہا صرف اسلام آیا ہے۔یہ صدقہ ہے اس چیز کا۔اس کے بعد انہوں نے حضرت سعد ابن ابی وقاص کا خط پڑھا۔اس خط میں انہوں نے لکھا ہوا تھا کہ امیر المؤمنین اس مال متاع کو دیکھ کے آپ کو بہت حیرت ہوگی اور تعجب ہوگا کہ واقعی یہ امر باعثِ تعجب ہے۔لیکن میں جو لکھ رہا ہوں وہ اس

سے زیادہ وجہ تعجب ہے اور وہ یہ کہ یہ کسی ایک جگہ سے میں نے اکٹھا نہیں کیا' ساری مملکت میں بکھرا پڑا تھا۔ یہ سپاہ مختلف مقامات کے اوپر گئی تھی۔ یہ تمام سپاہی تھے جن کے سامنے یہ چیز آئی تھی اور وہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ وجۂ تعجب یہ ہے آپؓ کے لیے یا باعثِ مسرت یہ چیز ہونی چاہیے کہ ان سپاہیوں میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی' سارا یہاں لا کے رکھ دیا۔

مالِ غنیمت کی موجودگی میں صحابہ کبار کے کردار پر حضرت عمر فاروق کی نفسیاتی کیفیت

یہ سپاہی وہی عرب تھے جو لڑتے اس لیے تھے میدانِ جنگ میں جا کے کہ غنیمت کا مال میرے حصے میں آئے گا۔ وہاں تو جو لوٹ لیتا' اس کے حصے میں آتا تھا۔ کہا کہ امیر المؤمنینؓ اس مالِ دولت سے زیادہ وجۂ مسرت اور باعثِ حیرت یہ امر ہے کہ یہ سپاہی ہیں جو محض لوٹ کی خاطر لڑا کرتے تھے۔ تو انہوں نے اس میں سے ایک سوئی بھی اپنے لیے نہیں چنی۔ اور حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور تاریخ بتاتی ہے حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے کہنے لگے عمرؓ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے سپاہی اتنے دیانتدار کیوں ہیں۔ کہنے لگے کہ بھائی تم ہی بتا دو۔ کہنے لگے اس لیے کہ تم دیانتدار ہو' جس مملکت کا سربراہ دیانتدار ہوتا ہے اس کا سپاہی بھی دیانتدار ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ کچھ دیا تھا اس تغیر نے' مملکت اور سلطنتوں کی شکل وصورت فتح کے ثمرات۔

1947ء میں تقسیم کے دوران ہمارے ہاں مالِ غنیمت کو حاصل کرنے کی نوعیت

محض فتح کرنے کی بات ہوتی تو ہمیں سن 1947ء میں کچھ کم نہیں ملا تھا۔۔ ایک Established Government , اور پھر اتنا کچھ اس ملک کے اندر تھا۔ ہمیں بھی کم نہیں ملا تھا A Running Concern۔ اس کے بعد کیفیت ہماری یہ ہوگئی کہ دی گلیمر آف انڈیا جس پنجاب کو کہا کرتے تھے اناج کی کوٹھیاں بھری ہوئیں جس پنجاب کی جس ملک کی۔۔ وہ گیہوں کے لیے محتاج ہو گیا غیروں کا اور روٹی مانگنے لگ گیا عزیزانِ من!۔ یہ تو سارا کچھ وہی تھا' کیا چیز نہیں تھی؟ وہ چیز جو حضرتِ علیؓ نے حضرتِ عمرؓ سے کہی تھی وہ نہیں تھی۔ اور یہ ساری خوشحالیاں خوشگواریاں یہ مکینکلی نہیں ہوتیں' یہ نتیجہ ہوتی ہیں اس چیز کا جو قلوب کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا نام ہے اسلامی مملکت کی بنیاد۔ یہ صرف ضوابط وقوانین اور Geographical Territory کا نام نہیں ہے۔ یہ دلوں کی بستیوں کے اندر ہوتی ہیں اور دلوں کی بستیاں تو صرف توحید بسا سکتی ہے عزیزانِ من! شرک اور کفر نہیں بسا سکتا۔ ہم سورۃ التوبہ کی آیت 28 تک آ گئے 29 سے ایک اور جنگ کی بات شروع ہوتی ہے اُسے ہم آئندہ اتوار پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

تیسرا باب: **سورۂ توبۃ** (آیات 29 تا 31)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من ! آج فروری 1973ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ توبہ کی 29 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (9:29)

سورۃ الانفال اور سورۂ توبہ میں جنگ ہو یا امن ہر دور کے لیے ابدی اصولوں کی مکمل نشاندہی کر دی گئی ہے

سابقہ درسوں میں آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی سورۃ الانفال اور یہ سورۃ توبہ۔۔ یہ ان معرکوں کی داستان پر مشتمل ہے جو مدینے میں آمد کے بعد اسلام کے مخالفین کے ساتھ ہوئے۔ یہ ان جنگوں کی وقائع نگاری ہی نہیں بلکہ ان میں ایسی اصولی ہدایات دی گئی ہیں کہ جو ہمیشہ کے لیے انسانیت کے لیے منفعت بخش ہیں۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ جنگ ناگزیر ہو تو اس میں بھی کون کون سے وہ اصول ہیں جنہیں مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ قرآن تو زندگی کے ہر شعبے کے لیے ابدی اصول دیتا ہے۔ اور ان اصولوں کی Illustration کے لیے' یہ بتانے کے لیے کہ وہ عمل میں کس طرح سے آسکتے ہیں' ان واقعات کا تذکرہ کرتا ہے۔ مقصد اس تذکرے سے یہ بتانا ہے کہ ان اصولوں پر جب عمل کیا گیا تھا تو اس کی شکل کیا ہوئی تھی اور اس کے نتائج کیا پیدا ہوئے تھے۔ میں اسے پھر ضمناً دہرا دوں کہ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ جنگ کوئی انسانی زندگی کا معمول کا واقعہ نہیں' یہ تو استثنائی صورتیں جسے آپ کہتے ہیں' ناگزیر حالات جب پیدا ہو جاتے ہیں تو اس وقت یہ صورت لاینفک ہوتی ہے۔ ان حالات میں اس نے بتایا تھا کہ پہلی صورت تو یہ ہے کہ کوئی مخالف قوت

اسلامی مملکت کے خلاف حملہ آور ہو۔ اُسے وہ تباہ کرنے کی فکر کرے اس کے خلاف نبرد آزما ہو سازشیں کرے تو اپنی مملکت کی حفاظت کے لیے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔

ہر وہ مظلوم جس پر کوئی دوسرا ظلم کر رہا ہو اس کی حفاظت کرنا قرآنی حکومت کا فریضہ ہے

جیسا کہ جنگ کرنے کے لیے سب سے پہلی اجازت جو سورۃ حج میں دی گئی اس میں یہ کہا گیا تھا کہ پہلی تاکید جو سورۃ انفال میں ہے کہ اپنی سرحدوں کو ہمیشہ مضبوط رکھو تاکہ کسی کو اس کی جرأت نہ ہو کہ وہ تمہاری مملکت پر حملہ آور ہو سکے۔ دوسری چیز اس نے یہ بتائی تھی کہ مظلوموں کی آواز کہیں سے بھی اٹھے اور وہ مدد کے لیے بلائیں تو ان مظلوموں کی مدد کے لیے تمہیں اٹھنا ہوگا۔ پہلے تو اس ظالم کو سمجھانا ہوگا کہ وہ اس ظلم و ستم اور استبداد و استحصال اور انحطاط سے باز آ جائے۔ لیکن اگر شکل ایسی نہ ہو اور وہ کسی صورت میں بھی مظلوموں کو ستانے سے باز نہ آئے تو تم اپنی قوت سے اس ظالم کا ہاتھ جا کر روک دو۔ یہ دوسری صورت ہے۔ اور اس میں یہ نہیں ہے کہ وہ مظلوم کہاں کے رہنے والے ہیں، کس مذہب سے ان کا تعلق ہے، کونسی قوم سے وہ متعلق ہیں۔ مظلوم ہونا ملت اسلامیہ کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ ان کی حفاظت کے لیے اٹھیں۔ اور اسی ضمن میں تیسری چیز جو آتی ہے اُسے بھی اس کی شق سمجھ لیجیے کہ دنیا میں مذہبی آزادی قائم رکھنے کے لیے بھی جنگ ناگزیر ہوتی ہے۔ اپنے مذہب کی آزادی نہیں بلکہ جیسا کہ اسی سورۃ الحج میں بتایا گیا تھا کوئی بھی مذہب دنیا میں ہو کوئی زبردست قوت اگر اس مذہب کو تباہ کرنے کے لیے اٹھتی ہے، اس کی پرستش گاہوں پر حملہ کرنے کے لیے اٹھتی ہے، ان کی آزادی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ تو اس صورت میں بھی مملکتِ اسلامیہ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس مذہب کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں اتر آئے۔ یعنی اپنی جان دے کر وہ دوسرے مذاہب کے معبد اور پرستش گاہوں کو۔۔ معبد اور پرستش گاہیں تو قرآن نے سمجھانے کے لیے کہا ہے درحقیقت مقصد تو وہ مذہبی آزادی ہے۔

دوسرے مذاہب کی آزادی کو تحفظ فراہم کرنا تو اسلامی مملکت کا فریضہ ہے

آپ نے دیکھا کہ یہ تیسری ضرورت یا شق یا تقاضا جو ہے جنگ کرنے کا، یہ کتنی عجیب و غریب چیز ہے۔ مذہب کی آزادی کی خاطر وہ یہ کہتا ہے۔ اور وہ مذاہب جن کو وہ باطل قرار دیتا ہے جن کے ماننے والوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اسلام قبول کریں۔ ان مذاہب کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے وہ مملکتِ اسلامیہ کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ جانا پڑے تو وہ میدانِ جنگ میں بھی اٹھ کے چلے جائیں۔ یہ تیسری چیز جو تھی، اس لیے اس پہ میں نے زور دے کے سمجھایا۔

تلوار سے دوسروں کو ہم خیال بنانا تو بذات خود ظلم ہے ہمارے ہاں کے تراجم اور تفاسیر کی پھیلائی ہوئی گمراہی کا نتیجہ نیز جزیہ وصول کرنے کی نوعیت

آگے جو آیت آتی ہے جہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے اس کے ایک غلط مفہوم اور اس غلط ترجموں نے اس قسم کی سوچ کا ایک نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ واقعی ساری دنیا یہ سمجھتی ہے اسلام کی تو کیفیت یہ ہے' مسلمانوں کی تو حالت یہ ہے کہ جب انہیں قوت نصیب ہو تو ان کے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے' دوسرے میں قرآن ہوتا ہے۔ ہر غیر مسلم کے سر پہ تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ یا اسلام لاؤ اگر ایسی صورت نہیں ہے تو تمہارا سر کاٹ دیا جائے گا۔ اور اگر وہ اہلِ کتاب ہوں تو ان سے رعایت برتی جاتی ہے کہ وہ جزیہ دے کر ان کی حفاظت میں رہ سکیں' یا اسلام لیں یا جزیہ دیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ صرف اہلِ کتاب کے لیے ہے۔ یعنی اسلام لاؤ والی بات جو ہے وہ تو بزورِ شمشیر انہوں نے اپنے ہاں پہلے ہی رکھی۔ تو آپ یہ دیکھیے کہ یہ دو چیزیں کس قدر ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ وہ یہ کہتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ' مملکتِ اسلامیہ کا فریضہ یہ ہے کہ کسی اہلِ مذہب کی آزادی کے راستے میں کوئی شخص کوئی قوم سنگِ گراں بن کے کھڑی ہو جائے تو تمہارا فریضہ ہے کہ تم وہاں جا کر ان کے مذہب کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے میدانِ جنگ میں اتر آؤ۔ اور دوسری طرف ان کے متعلق یہی تصور دیا جاتا ہے کہ یہ تلوار لے کے کھڑے ہو جاتے تھے کہ مسلمان بنو۔ اگر وہ غیر اہلِ کتاب ہیں اور مسلمان نہ ہوں تو ان کا سر اڑا دیا جاتا تھا اور اگر اہلِ کتاب ہیں تو کہا جاتا تھا کہ جزیہ دو۔ اور پھر اس جزیہ کے متعلق جو حاشیہ آرائیاں آپ کی کتبِ احادیث اور کتبِ تاریخ اور کتبِ تفاسیر میں ہوئی ہیں اور پھر فقہ کے مسائل اس کے اوپر جو متفرع ہوئے ہیں۔ ان سے تو واقعی وہ جتنے اعتراضات مستشرقین یا غیر مسلم کرتے ہیں ان کی بنیاد ان کا اپنا تعصب نہیں ہوتا۔۔ یہ ٹھیک ہے تعصب تو ہوتا ہے لیکن ان کے اعتراضات کی بنیاد اب آپ کے یہ مسائل ہیں جو آپ نے اس ضمن میں اپنی کتابوں کے اندر رکھے ہوئے ہیں۔ جزیہ کا لفظ یوں ذہن میں آتا ہے جیسے بس وہ تلوار لے کے کھڑے ہو جاتے تھے اور کہتے تھے کہ مسلمان نہیں ہونا چاہتے تو جزیہ دو۔ گویا یہ ان کے غیر مسلم ہونے کی سزا تھی جو انہیں دی جاتی تھی۔ یہ ہے تصور۔ جتنی کتابیں آپ دیکھیں گے مستشرقین کی' اُنہوں نے جزیہ کے اس حصے کو ابھارا اور آپ کے تفاسیر اور تاریخ کی رو سے انہوں نے اس چیز کو پیش کیا کہ یہ تھا ان لوگوں کا اسلام کہ یا مسلمان بنو اگر غیر اہلِ کتاب ہے' تو قتل کر دیے جاؤ گے' اہلِ کتاب ہو اور مسلمان نہیں ہوتے تو جزیہ دو اور جزیہ ایک تاوان تھا جو ان کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

قرآن حکیم کا دعویٰ کہ اس میں ایک بات بھی اختلافی یا متضاد نہیں

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی بات اختلافی نہیں یعنی کوئی چیز ایسی نہیں کہ ایک جگہ کہی گئی ہو اور دوسری جگہ اس پہ اختلاف اور تضاد ہو۔ قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مقام پہ جو کچھ اس نے کہا ہے دیگر مقامات میں ساتھ ملا کے دیکھیے کہ اس نے کیا کہا ہے۔ یہ دو آیتیں اگر سامنے رکھ لی جائیں۔۔ایک وہ آیت جو سورۃ حج میں اس نے کہی ہے کہ اگر ہم ایسا انتظام نہ کرتے کہ ایسی قوم یا ملت یا امت یا مملکت نہ قائم ہوتی تو جو دوسروں کی تعدی اور ظلم وستم اور حد سے بڑھنے کی' تجاوز کرنے کی' قوتوں کو نہ روکے تو دنیا میں نہ یہودیوں کے صومعے قائم رہتے' نہ عیسائیوں کے گرجے باقی رہتے' نہ مجوسیوں کے آتش کدے ہوتے' نہ ہندوؤں کے مندر ہوتے' نہ مسلمانوں کی مسجدیں باقی رہتیں' سب ڈھ جاتے۔ اور دوسری طرف اگر یہ رکھا جائے کہ یا تو مسلمان ہو' اگر مسلمان نہیں ہوتے تو اپنے غیر مسلم رہنے کا جرمانہ ادا کرو' جسے جزیہ کہا گیا ہے۔ ہے دو باتیں متضاد نا ایک دوسرے کے۔ یہ کیا چیز تھی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک مشرکین کے ساتھ ہونے والے سلوک کی وضاحت

سورۃ توبہ کی آیت 29 سے درس شروع ہوتا ہے اور پہلی آیت ہی یہ ہے۔ گذشتہ آیتوں میں یہ بتایا گیا تھا مشرکین سے جنگ۔ اب ہم نے مشرکین سے مراد لے لی دنیا کے تمام مشرک جہاں جہاں بھی ہیں۔ اور وہ جتنے بھی غیرِ مذاہب غیرِ اسلام والے ہیں' وہ سارے ہی مشرک ہو چکے ہیں۔ ابھی قرآن کی آیتیں آتی ہیں کہ وہ بھی شرک کرتے تھے' خدا کے ساتھ دوسروں کو ملاتے تھے۔ تو جب یہ کہا گیا کہ دنیا میں جہاں جہاں مشرکین کو پاؤ وہاں ان سے جنگ کرو اور جنگ کر کے یا ان کو قتل کر دو یا ان کو کہو کہ اسلام لائیں۔ تو مشرکین کے متعلق تو بات ہوگئی۔ حالانکہ قرآن نے صرف اس زمانے کے وہ قریش' وہ عرب جو مشرکین کہلاتے تھے ان کو بھی' ان کے شرک کی وجہ سے ان کے خلاف جنگ نہیں کی ہے' غیر مسلم ہونے کی وجہ سے جنگ نہیں کی ہے۔ بلکہ قرآن کہتا ہے کہ تم مدینے میں آگئے ہجرت کر کے مکہ چھوڑ بھی آئے ہو' پھر بھی وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتے' ہزار کا لشکر جرار لے کر تمہارے اوپر حملہ آور ہونے کے لیے آگئے۔ یہ ان مشرکین کا ذکر ہے۔ اس سے مراد ہی اسلام کے مخالفین ہیں جو اس زمانے میں سامنے تھے۔ تو ان کی دو شقیں تھیں یا تو وہ یہود و نصاریٰ تھے ان کو اہلِ کتاب کہتے تھے یا یہ غیر اہلِ کتاب تھے جن کو مشرکین کہا جاتا تھا۔ تو جنگ کی پہلی شکل تو ان کے ساتھ رہی۔

مکہ کے مشرکین کی طرف سے مخالفت کی وجہ' نظام کی مخالفت تھی

میں نے بتایا تھا کہ سن 2 ہجری میں بدر کی جنگ ہوئی اور اسکے بعد آٹھ ہجری تک انہی مشرکینِ عرب سے' انہی مخالفین سے مسلسل

متواتر یہ جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ سن 8 ہجری میں مکہ فتح ہو گیا۔ تو اسی جہت سے مکہ کے فتح ہونے کے ساتھ جنہیں مشرکین کہا گیا ہے' یعنی عرب کے مخالفین جو اس پہ بھی راضی نہیں تھے کہ یہ لوگ مکے سے ہجرت کر کے جو مدینے چلے گئے' وہاں بھی امن سے رہیں۔ وہ درحقیقت اس نئے نظام کے مخالف تھے' وہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ یہ نیا نظام متشکل ہو جائے کسی طرح سے۔ تو انہوں نے وہاں بھی چڑھائی کی۔ تو یہ فتح مکہ کے بعد ان کی مخالفت اور مخاصمت ختم ہو گئی تھی۔ لیکن مدینے میں اور دوسرے علاقوں کے اندر یہودی بستے تھے' عیسائی بھی بستے تھے۔ عیسائیوں کی سب سے بڑی سلطنت تو اس زمانے کی رومن امپائر کا وہ حصہ جو ایک طرف مشرق کی طرف تھا' جسے بازنطینی حکومت کہتے ہیں' وہ ان علاقوں کے ساتھ ملتی تھی۔ ایک طرف ایران کی مملکت کی سرحدیں تھی دوسری طرف رومن امپائر یا بازنطینی امپائر کی سرحدیں ان کے ساتھ ملتی تھیں۔ یہ دونوں مملکتیں۔۔ جب انہوں نے دیکھا کہ عرب میں ایک نئی مملکت قائم ہو گئی ہے۔

ایران اور بازنطینی مملکتوں کے نظام زندگی کی کیفیت اور نبی اکرم ﷺ کی طرف سے قیصر و کسریٰ اور مقوقش کو لکھے جانے والے خطوط کا نتیجہ

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں نے بتایا تھا کہ عرب میں اس سے پیشتر کوئی مملکت تھی ہی نہیں' یہ قبائلی زندگی بسر کرتے تھے' انہیں ایک منظم مملکت کی شکل میں پہلے پہل اسلام لایا ہے۔ تو ایک مملکت قائم ہوئی عرب کے اندر اور بڑی طاقتور مملکت تھی۔ مملکت کی طاقت تو انہیں اتنا زیادہ خائف نہ کرتی۔۔ یہ مملکت جس قسم کا انسانیت ساز نظام قائم کر رہی تھی انہیں اس سے خطرہ پیدا ہوا۔ یوں تو ان کا نظام تو خالصتاً ملوکیت اور سرمایہ داری کے نظام پر متفرع تھا۔ دونوں مملکتیں ایران اور بازنطینی مملکت۔۔ بڑی پرانی تہذیبیں ان کے ہاں تھیں۔ لیکن وہ تہذیبیں ملوکیت بادشاہت پر اور نظام سرمایہ داری پر تھیں۔ غلامی ان کے ہاں عام تھی۔ استبداد کی کیفیت کہ حقوق کسی انسان کے تسلیم نہیں کیے جاتے تھے۔ وہ بادشاہ خدا کی طرف سے اپنے حقوق لے کر آتا تھا' گویا اس کی پرستش کی جاتی تھی۔ باقی رعایا کی کیفیت ان تمام کی زندگی اس کے رحم و کرم پر ہوتی تھی۔ یہ کیفیت تھی ان دونوں مملکتوں کی۔ چنانچہ آپ کو یاد ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ نے جو خطوط لکھے تھے قیصر اور کسریٰ اور مقوقش کو۔۔ تو اس میں ان کے مذہب کے متعلق بات نہیں کی تھی کہ اگر تم اپنا مذہب نہ چھوڑو تو یاد رکھو کہ ہم یہ کریں گے اور وہ کریں گے۔ ان سے کہا یہ تھا کہ تمہارے کاشتکاروں اور کسانوں کے اوپر جو اس وقت مظالم ہو رہے ہیں' وہ ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ چکے ہوئے ہیں۔ ان غریبوں مظلوموں اور کمزوروں کا کوئی حامی اور مددگار نہیں ہے۔ تم ان مظالم کو روکو۔ اور اگر تم نے ان کے مظالم کو نہ روکا تو پھر اس کا کفارہ تمہیں ادا کرنے پڑے گا۔ چار سطروں کی یہ چٹھی ہے جو آج بھی موجود ہے۔ یعنی اس میں آپ دیکھتے ہیں مذہب کی کوئی بات نہیں۔ یہ ٹھیک ہے اسلام کی دعوت تو عام دی جاتی تھی لیکن ان سے یہ نہیں کہا گیا تھا کہ اگر تم مسلمان نہ ہو گے تو ہم تمہاری مملکت

پہ حملہ کر دیں گے۔ کہا یہ تھا کہ تمہارے کاشتکاروں کسانوں غریبوں مظلوموں کے اوپر جو ظلم اور استبداد ہو رہا ہے اگر اس سے تم باز نہ آئے تو پھر بہر حال ان کی مدد کے لیے ہمیں پہنچنا پڑے گا۔ تو یہ دو مملکتیں اتنی عظیم الشان اور اپنی طاقت میں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ انہوں نے اس چیز کو بالکل مذاق سمجھا کہ یہ مٹھی بھر عرب' جنہیں وہ کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے وہ آج ان کو یہ چیلنج کر رہے ہیں۔ یا آج کی اصطلاح میں کہیے کہ ہمارے Internal معاملات میں یہ دخل اندازی کر رہے ہیں۔ یہاں تو Internal اور External کا سوال نہیں ہے۔ یہاں تو پوری انسانیت ایک برادری تھی اور اس برادری میں کسی فرد پر کسی جگہ بھی اگر ظلم ہوتا تھا تو یہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے کہ مظلوم کی مدافعت کے لیے اٹھیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ مملکت بھی قائم ہوئی اور ان کا نظام بھی قائم ہو رہا ہے۔ جس نظام کے اندر پہلی چیز تو یہ ہوئی کہ غلامی ختم کر دی گئی۔ ان مملکتوں کے لیے جن کا سارا نظام غلاموں کے سر پہ چلتا تھا۔ اور تاریخ جنہوں نے پڑھی ہے انہیں تو معلوم ہوگا ورنہ کم از کم یہ جو سینما میں فلمز آیا کرتی ہیں رومن کے زمانوں کی۔۔ اس میں تو آپ نے دیکھا ہوگا غلاموں کے ساتھ کیا ہوتا تھا۔ اب ایک نیا نظام قائم ہوتا ہے جو غلامی کو ختم کر دیتا ہے۔

ہمسایہ حکومتوں پر مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی قرآنی حکومت کے اثرات

آپ سمجھتے ہیں کہ اس کا اثر ان دو ہمسایہ مملکتوں پر کیا پڑنا تھا جہاں غلاموں کی وہی حالت تھی اور غلام اس طرح سے ان کے معاشی اور معاشرتی نظام کا جزو بنے ہوئے تھے۔ یقیناً وہاں کے لوگ جب دیکھتے کہ ساتھ ہی دوسری مملکت ہے جہاں پوری آزادی حاصل ہو رہی ہے ان لوگوں کو۔۔ وہ یا تو Revolt کر دیتے یا سرکشی اختیار کرتے یا وہاں سے بھاگ کے یہاں آ جاتے۔ اس زمانے میں تو غلام بھاگ کے دوسری جگہ جا نہیں سکتا تھا کہ جہاں بھی جائیں گے' وہاں غلامی موجود ہے۔ اس لیے وہ وہی زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن اگر اُسے یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ہمسائیہ میں ہی ایک ایسا نظام ہے اور نظام بھی مملکت کا ہے' جہاں غلامی کو ختم کیا جا رہا ہے اور غلاموں کو پورا درجہ انسانیت کا دیا جاتا ہے۔ یقیناً وہ لوگ اگر وہاں سرکشی نہ بھی کریں گے تو یہاں آ جائیں گے۔ جن مملکتوں کو یہ معلوم ہو' وہاں کے کاشتکاروں کو اور کسانوں کو جاگیرداری کا نظام ختم کیا جاتا ہے وہاں کوئی کسی دوسرے کی محنت کو اچک کر لے جا نہیں سکتا۔ تو یا تو وہ یہ چیز دیکھ کے کہ یہ نیا نظام اس سے پیشتر وہ ان کی سمجھ میں نہیں آنے دیتے تھے کہ کوئی اور نظام بھی ہو سکتا ہے دنیا میں۔ وہ مطمئن چلے آتے تھے کہ ہر جگہ یہی نظام ہے اس لیے اپنی قسمت پر شاکر رہتے۔ لیکن اگر یہ ان کو معلوم ہو جائے کہ ایک نیا نظام ایسا ہے جس میں کوئی کسی دوسرے کی محنت کو غصب نہیں کر سکتا اور وہ نظام ایک مملکت کا ہے جو ایسے مظلوموں کو پناہ دینے کے لیے تیار ہے۔ تو اگر وہ اپنے ہاں سرکشی اختیار نہ کرتے تو وہاں سے ادھر چلے آتے۔ جن غلاموں کو یہ معلوم ہو کہ ملوکیت محض ایک افسانہ تھی۔ بادشاہ ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہوتا ہے اُسے کوئی

خدائی حقوق حاصل نہیں ہوتے بلکہ بادشاہ ہوتا ہی کوئی نہیں ہے' ہم اپنے معاشرے کے انتظام کے لیے اپنی مشاورت سے جس شخص کو اپنا سربراہ کرلیں جیسے قافلے کا قافلہ سالار رہوتا ہے' اُسی کے ہاتھ میں نظم ونسق ہوتا ہے اور وہ نظم ونسق ایک غیر متبدل قاعدہ اور قانون کے تابع سرانجام دیتا ہے۔جنہیں یہ معلوم ہوجائے یقیناً اپنے ہاں وہ Revolt کریں گے۔Revolt نہیں کریں گے تو بہر حال ادھر آجائیں گے۔

ایران' بازنطین امپائر' شام اور عراق' مصر اور فلسطین وغیرہ کو تسخیر کرنے کی بنیادی وجہ قرآن حکیم کا نظام تھا

اگر ان حقائق کو سامنے رکھا جائے تو پھر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اب اس مملکت کا ٹکراؤ کن مملکتوں کے ساتھ ہورہا تھا اور وہ ٹکراؤ کیوں ہورہا تھا۔ یہاں تو ذہن میں یہی ہے کہ عرب میں انہوں نے مملکت قائم کی اور پھر ہوسِ جوع الارضی جسے کہتے ہیں۔۔دوسروں کی مملکتوں اور زمینوں کو اپنی مملکت میں داخل کرنا۔۔اس کے لیے ایک طرف انہوں نے ایران کو فتح کرلیا دوسری طرف بازنطینی امپائر کے شام اور عراق اور فلسطین وغیرہ کے علاقے تھے اور مصر کے علاقے تھے۔۔ان کو فتح کرلیا۔گویا یہ علاقے فتح کرنا جو تھا یہی بتایا جارہا ہے اور۔۔اسی کو یہ بڑے فخر اور ناز سے بیان کرتے ہیں دنیا کے سامنے کہ اتنے سے عرصے میں انہوں نے اتنی بڑی سلطنتوں کو فتح کرکے اُسے اپنی مملکت کا حصہ بنالیا۔بات یہ نہیں تھی عزیزانِ من!۔۔وہ تو نظام تھے جس نظام کے ساتھ دوسرا نظام ٹکراتا تھا۔دعوت ان کو یہ دی جاتی تھی کہ اپنے غلط نظام کو تم بدل لو۔۔انسانیت کے اوپر جو مظالم تمہارے ہاں ہورہے ہیں ان کو ختم کردو۔تمہارے اندرونی معاملات میں دخل دیناہی مقصود نہیں ہے۔

قرآن حکیم کی رو سے دوسروں کے مذہب کی حفاظت تو فریضہ ہے

یہ قرآن کے احکام کی رو سے ان کا فریضہ یہ تھا کہ دنیا کے ہر مذہب کی حفاظت کریں۔اسے ذہن میں رکھیے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔اور ہم نے جو غلط نظام کہا ہے وہ یہ نہیں کہ اپنی Administration مشینری تم ایسے کیوں چلاتے ہو' ایسے کیوں نہیں چلاتے جیسے ہم کہتے ہیں۔۔تمہارا سیکرٹریٹ اس قسم کا کیوں ہے ہماری طرح کا کیوں نہیں ہے۔سوال تو اس اصول کا تھا' ان بنیادوں کا تھا۔اور بنیادیں وہ تھیں کہ۔۔جہاں ہر انسان کو انسانیت کا مقام ملتا تھا۔وہاں کسی کو انسانیت کا مقام ملتا نہیں تھا۔اور فتح مکہ کے بعد کیفیت یہ ہوگئی کہ عرب کے اندر جتنے مخالفین تھے بجز چند قبائل کے جنہوں نے اس کے بعد تھوڑی سی بغاوت اور سرکشی اختیار کی تھی۔۔اس نظام کے متعلق عرب کی اندرونی مخالفت ختم ہوگئی۔کسی کو زبردستی اس نظام میں شامل نہیں کیا گیا۔۔یہ تو اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔یہ مخالفت ختم ہوئی تو۔۔اب یہ لوگ۔۔جن میں یہودی بستے تھے' عیسائی بھی بستے تھے۔یہ اندرونِ ملک جو عیسائی بستے تھے' ان کی کوئی خاص

قوت نہیں تھی۔

یروشلم کے بعد یہودیوں کی اپنی کوئی مملکت نہ تھی جبکہ نسل پرستی کی بنیاد پر مالی نظام پر ان کا ہمیشہ قبضہ رہا

عیسائیوں کی قوت تو بازنطینی امپائر میں تھی۔ البتہ یہودیوں کی تو کوئی اپنی مملکت تھی نہیں۔۔ ان کی تو کوئی سلطنت قائم ہی نہیں ہوئی۔۔ وہ جب سے یروشلم سے نکلے اس کے بعد Wandering Jew تھے۔ پہلی مرتبہ آپ کی ذلت اور نکبت کے تصدق میں ان کو ایک مملکت ملی ہے۔ یہودیوں کی مملکت تو تھی نہیں لیکن۔۔ ان کا انداز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جس جس ملک میں بھی یہ رہے وہاں خود ایک منظم طریقے سے رہے اور ان کی تنظیم نسل کے اوپر تھی۔ مذہب یہودیت تبلیغ کا مذہب نہیں۔۔ غیر بنی اسرائیلی یہودی مذہب میں آ ہی نہیں سکتا اور۔۔ بنی اسرائیل کی ایک نسل ہے۔ نسلی اعتبار سے ان کی تنظیم ہوتی تھی کہ غیر بنی اسرائیل اس میں شامل نہیں ہوتا تھا اور بنی اسرائیل جب تک، وہ بنی اسرائیل رہتا ہے، ان سے الگ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے ان کی تنظیم کی شکل ہوتی تھی اور شروع سے ہی ان کا انداز رہا ہے کہ یہ ہمیشہ جہاں بھی رہے، وہاں کے مالی نظام کے اوپر ان کا قبضہ رہا ہے، وہاں کے فنانسز کو ہمیشہ یہ کنٹرول کرتے تھے۔ مدینے میں بھی سارا مالی نظام ان کے قبضے میں تھا۔ اس زمانے میں کم از کم ہتھیار تو ہر ایک کے پاس ہوتے تھے، یہ بھی رکھتے تھے۔ وہاں عام طور پر لوٹ مار ہوتی رہتی تھی۔۔ اس کی حفاظت کے لیے ان کو چھوٹے چھوٹے قلعہ بھی بنانے پڑتے تھے۔ اب دیکھیے کہ یہ جو مملکت قائم ہوئی ہے۔۔ یہ یہودی سرمایہ داری کے نظام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کے رکھ دیتی تھی۔ اور جب یہ اتنی اتنی دور، ان مملکتوں کو لکھتی تھی کہ تمہارے ہاں یہ نظام نہیں رہے گا تو مدینے میں بسنے والے یہودیوں کے اس نظام کو یہ کیسے باقی رہنے دیتے۔ اسلامی مملکت کے اندر بسنے والے جو ہیں وہ اسلامی قوانین کے تابع زندگی بسر کرسکتے ہیں۔۔ مذہب کی آزادی تو ان کو پوری پوری حاصل ہوتی ہے لیکن۔۔ کوئی نظام جو اس سلطنت کے اس مملکت کے نظام کے علی الرغم ہو، اس کے متصادم ہو، اسے تو بہر حال وہاں نہیں رہنے دیا جاسکتا تھا۔۔ یہ تو مملکت کے اندر ایک دوسری مملکت قائم کرنے کے مترادف ہوجاتا ہے۔ لہٰذا یہ یہودیوں سے کہا گیا جو اپنے اس نظام کو چھوڑنے والے نہیں تھے۔۔

مدینے سے نکالے گئے یہودی، بازنطینی امپائر اور ایرانی امپائر کی، مملکت اسلامیہ کے خلاف سازشوں کا جال اور ہماری اپنی تاریخ

انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس مخالفت میں پہلی چیز تو یہ کی گئی کہ ان کو مدینے سے نکال دیا گیا۔۔ یہ وہاں سے خیبر میں چلے گئے۔ وہاں جا کر ان لوگوں نے۔۔ اور یہ ہمیشہ ہوتا ہے کمزور جو۔۔ قوتوں کے زور پر سلطنتیں نہیں بناتے، وہ ہمیشہ سازشیں کرتے رہتے

ہیں۔انہوں نے دیکھا کہ بازنطینی امپائراورایرانین امپائر یہ دونوں اس نئے نظام کے خلاف ہیں تو۔۔انہوں نے ان کے ساتھ ساز باز شروع کی، سازشیں شروع کیں۔اسلامی مملکت اسے تو نہیں برداشت کرسکتی تھی۔لہٰذا اب خطاب ان کی طرف آتا ہے۔اس تمہید کی ضرورت اس لیئے تھی کہ یہ اس آیت کے متعلق جس میں جزیہ کا ذکر آیا ہے، اس کے متعلق خود ہماری تاریخ اور تفاسیر میں ایک ایسی دہشت ناک شکل سامنے کردی ہے اور۔۔اس کے اوپر مغرب کے مستشرقین نے ایسی ایسی عمارتیں قائم کی ہیں کہ یہ اسلام ایک عجیب قسم کا وحشی ۔۔۔بربرانہ۔۔۔ظلم والا۔۔۔استبداد کا مذہب بن کے دکھائی دیتا ہے۔تو کیفیت یہ تھی کہ ادھر اندرونِ ملک یہ یہودیوں کی سازش تھی جنہیں قرآن کی اصطلاح میں اہلِ کتاب کہا جاتا ہے۔مملکت کی سرحدوں کے اوپر بازنطینی امپائر تھی۔۔وہ عیسائیوں کی سلطنت تھی۔۔انہیں بھی اہلِ کتاب کہا جاتا ہے۔اب جو اہلِ کتاب کا ذکر آئے گا قرآن میں تو۔۔اس سے یہ مراد ہونگے۔اور یہ صرف اس لیئے نہیں کہ ان کا مذہب عیسائی یا یہودیت تھا بلکہ یہ خود اس نظام کی، اس مملکت کی مخالفت کررہے تھے۔اب یہ گروہ دوسرا سامنے آتا ہے۔۔اس میں یہودی بھی شامل تھے بازنطینی امپائر کے عیسائی بھی شامل تھے۔انہیں پہلے سمجھایا گیا۔۔یہ باز نہیں آئے، سازشیں کرتے رہے۔لہٰذا ان کے متعلق اب پھر یہ فیصلہ کیا گیا۔

ہمارے ہاں کے مروجہ غلط تراجم اور تفاسیر سے پیدا ہونے والا تاثر

قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ (9:29) یہ وہ لوگ۔۔اب دیکھیے عام ترجمہ جس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں کہ۔۔یہ لوگ جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور پچھلے دن پر اور۔۔وَ لَا يُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗ وَ لَا يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ (9:29) اہل کتاب میں سے یہ لوگ کہ جو نہ اللہ پہ ایمان رکھتے ہیں، نہ آخرت پہ ایمان رکھتے ہیں، نہ ان چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کا رسول حرام قرار دیتا ہے اور نہ سچے دین کو اختیار کرتے ہیں۔۔ان لوگوں سے جنگ کرو۔۔ حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ (9:29) تآنکہ وہ جزیہ دیں۔عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ (9:29) اور وہ پست ہوجائیں تمہارے سامنے۔آپ دیکھتے ہیں اس ترجمے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جو اس دین کو قبول نہیں کررہے ان کے خلاف جنگ کرو تآنکہ۔۔وہ جزیہ دیں۔گویا ان کے خلاف جنگ کرنے کی وجہ بنیاد اس ترجمے کی رو سے اور۔۔اس ترجمے پر یا تفاسیر کی رو سے یہ ترجمہ ہوا ہے ان تفاسیر میں۔۔بنیاد یہ سمجھ میں آئی کہ یہ اس دین کو اختیار نہیں کرتے؟ اس لیے ان کے خلاف جنگ کرو۔۔رعایت ان کے ساتھ اتنی برتو کہ ان سے جزیہ لے کے ان کو رہنے دو۔۔دین اختیار نہیں کرتے تو جنگ کرو اور جنگ کرنے کے بعد صرف پیسے لو ان سے۔یعنی پھر بھی دین کی بات نہیں کی ۔۔!! یا تو سیدھی یہ کرو کہ دین اختیار نہیں کرتے جنگ کرو تاوقتیکہ یہ تمہارا دین اختیار نہ کرلیں۔نہ۔۔!! سمجھ میں یہ آیا کہ ان سے تو کچھ

پیسے لینے مقصد تھے۔۔تمہارے دین کو اختیار نہیں کرتے' ان کے خلاف جنگ کرواور۔۔اگر یہ پیسے دیدیں تو پھر ان کو وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ (9:29) میں بتاؤ نگا تفسیر میں کہا کہ ان کو پانچ سات جوتے مار کے جانے دیا کرو'' اور کہیا کروسٹو پیسے''۔

قرآن حکیم کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے تصورات Concepts پیش کرتا ہے

دیکھ رہے ہیں عزیزانِ من!۔۔وہ دین جو انسانیت کی اقدارِ کبریٰ کو لے کے دنیا میں آیا ہے۔۔ان آیتوں کے اندر ان چیزوں سے ان تراجم سے یہ چیز سامنے آ رہی ہے۔اس لیے میں نے عرض کیا ہے اور میں ہمیشہ یہ کہا کرتا ہوں قرآنِ کریم کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔۔یہ الفاظ نہیں ہیں یہ Concepts ہیں یہ تصورات ہیں جو اس نے دیے ہیں اور۔۔انہیں سمجھنے کے لیے وہی محاورۂ عرب۔۔اس زمانے کی عربی جو ہے اور۔۔قرآنِ کریم کے اوپر، سارے قرآنِ کریم کے اوپر، بیک وقت نگاہ۔۔کہاں اس نے کیا کہا ہے۔یہ جو چیز ہے کہ یہ ایمان نہیں رکھتے خدا اور آخرت کے اوپر۔۔وہ فوراً اس کی تردید کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔۔اہلِ کتاب دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جو خدا کو نہ مانے یا آخرت پہ ایمان نہ رکھے۔ Continuity of Life جسے آپ کہتے ہیں تسلسلِ حیات۔۔مرنے کے بعد کی زندگی اور۔۔یہاں تو اہلِ کتاب سے مراد اولاً یہودی اور نصرانی ہیں۔۔یہ دونوں خدا پہ ایمان پہ تھے آخرت پہ بھی ایمان رکھتے تھے۔یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ نہ خدا پہ ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پہ ایمان رکھتے ہیں۔تو پہلی چیز تو یہی ایسی ہوگئی جس کے خلاف چیلنج ہوا جاتا ہے کہ کیسے کہہ رہے ہیں آپ یہ۔

اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا اور آخرت کو ماننا کوئی معنی نہیں رکھتا

اس کے متعلق قرآنِ کریم نے خود واضح کر دیا۔۔اُس نے کہا ہے کہ یہ خدا پر ایمان یا آخرت پر ایمان یہ نہیں ہے کہ اپنے اپنے تصور اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق جس طرح سے جی چاہے کوئی خدا کو مان لے تو اس کو خدا پہ ایمان کہا جائے گا۔کہا یہ سوال ہی نہیں ہے۔خدا پر وہ ایمان کہ جیسا وہ ہے۔۔آخرت پر وہ ایمان کہ جس اصول کے لیے وہ تصور دیا گیا ہے اس اصول پہ ایمان۔یہودیوں کا ایمان اگلی آیت میں تو بتا دیا۔یعنی عجیب وغریب چیز ہے قرآن کی کہ ذہنوں میں جو بات اٹھتی تھی۔۔وہ تو قرآن دینے والا علام الغیوب ہے اُسے تو ہمارے ذہنوں کا پتہ تھا۔اگلی ہی آیت میں یہ کہہ دیا وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (9:30)۔

قرآن حکیم کی ہر آیت باہمی ربط پر مبنی حقائق کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے

آپ دیکھتے ہیں اس اعتراض کا جواب کیسے آ گیا ساتھ ہی۔ حالانکہ آیت بے ربط سی نظر آتی ہے کہ سوال جنگ کا پیدا ہو رہا ہے۔۔ بات آگے آ رہی ہے کہ یہود کہتے ہیں عزیرؑ ابن اللہ ہے۔۔ عیسائی کہتے ہیں مسیحؑ ابن اللہ ہے۔ جنگ کا مسئلہ بیچ میں ان کے عقیدے کی بات کیسے آ گئی۔۔ آ اس لیے گئی کہ چیلنج یہ کیا تھا کہ یہ نہ خدا پہ ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پہ ایمان رکھتے ہیں۔ دو لفظوں میں بات سمجھائی کہ بتایئے جن کے یہ عقائد ہوں وہ عزیر کو خدا کو بیٹا مانیں یا مسیح کو خدا کا بیٹا مانیں اور اس کے بعد کہیں ہم خدا پہ ایمان رکھتے ہیں۔۔ کیا خدا پہ اسی کو ایمان کہا جائے گا۔۔؟؟ دنیا میں سوائے چند دہریوں کے خدا کو تو ہر ایک مانتا ہے اور۔۔ قرآن تمام خدا کو ماننے والوں کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ خدا کو مانو اور۔۔ اہلِ کتاب کو تو خاص طور پہ۔ ان کے متعلق تو یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کو نہیں مانتے۔۔ اہلِ کتاب کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ خدا کو مانو۔ تو کیا بات ہے؟ اس نے خود واضح کر دیا ہے نا۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137) اگر یہ اس انداز کے مطابق خدا کو مانیں جس اندازِ تصور کو خود خدا نے اپنی کتاب میں بتایا ہے اور تم اس کے مطابق خدا کو مانتے ہو۔۔ تب سمجھا جائے گا کہ یہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کے متعلق انسان کا محدود ذہن اس لامحدود ہستی کا صحیح ادراک کر ہی نہیں سکتا

اپنے اپنے ذہن کے مطابق تو ساری دنیا خدا کو مان رہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ایسے نہیں کہ جس طرح سے ہم کہتے ہیں بلکہ خدا کے متعلق جو تصور ہے وہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو تصور خود خدا اپنے متعلق دے۔ ذہنِ انسانی خدا کے متعلق صحیح تصور پیدا کر ہی نہیں سکتا۔۔ کوئی محدود کسی لامحدود کے متعلق صحیح Concept لے ہی نہیں سکتا۔

قرآن حکیم کے علاوہ آج کوئی آسمانی کتاب ایسی نہیں جس میں خدا کا صحیح تصور پیش کیا گیا ہو

انبیائے کرامؑ نے آ کے خدا کا صحیح تصور دیا لیکن۔۔ ان کی کوئی کتاب جو خدا نے ان کو دی تھی دنیا میں اپنی اصل شکل میں موجود نہیں رہی۔ اور یہ جو محرف کتابیں ہیں سب سے پہلے ان کے اندر جو تحریف ہوئی ہے وہ خدا کے تصور کے متعلق ہوئی ہے۔ آپ دیکھیے میری کتاب ''مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں''۔۔ اس میں آپ دیکھیے میں نے تمام دنیا کے اہلِ مذاہب کی جتنی بھی کتابیں ہیں ان کی۔۔ اس میں تحریف دی ہے۔ اس میں پہلی چیز جس کے اوپر وہاں زد پڑتی ہے خدا کے تصور کے اوپر پڑتی ہے۔۔ عجیب و غریب قسم کا تصور خدا کا ملتا ہے اس میں۔ تو گویا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے پاس وہ کتابیں ہیں جو خدا کی طرف سے ملی تھیں اور ہم اس کے مطابق ایمان رکھتے

ہیں خدا پہ۔۔ان کی کتابوں کے اندر جو خدا کا تصور ملتا ہے وہ بھی خدا کا تصور نہیں ہے۔؟؟ قرآنِ کریم کے اندر خدا نے خود اپنا تصور دیا ہے اور قرآن محفوظ ہے' حرف بہ حرف' لفظ بہ لفظ' اور اگلی بات یہ کی کہ اس آسمان کے نیچے اب خدا کی کتاب صرف قرآن ہے' جو محفوظ ہے۔۔ کوئی دوسری کتاب محفوظ نہیں۔ لہٰذا خدا کا وہی تصور صحیح تصور ہو سکتا ہے جو قرآن نے دیا ہے۔ یہ کوئی دھاندلی کی بات نہیں ہے۔۔ یہ تاریخی حقیقت ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔ان مذاہب کو ماننے والے خود اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری کتابیں وہ نہیں ہیں۔۔ یہ تحریف شدہ ہیں۔۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ میری اس کتاب میں یہ چیز ملے گی آپ کو۔ یہ وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ اگر یہ ایمان لائیں اس طرح جیسے۔۔تم ایمان لاتے ہو۔۔تم ایمان لانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلمان بلکہ۔۔وہ جس طرح کہ قرآن نے بتایا ہے۔ اب تو خود مسلمانوں کا ایمان جو ہے خدا کے متعلق وہ۔۔ان سے بدتر ہو چکا ہوا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے۔اور ایمان بالآخرت۔۔ٹھیک ہے مرنے کے بعد کی زندگی پر تو ایمان ان کا ہے۔ ایمان کیا ہے؟ یہودیوں کا ایمان یہ ہے کہ جنت میں سوائے بنی اسرائیل کے دوسرا جا ہی نہیں سکتا۔ یعنی زندگی کے تسلسل پہ تو ایمان ہے۔

آخرت کی زندگی کے متعلق عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف سے پیش کردہ عجیب وغریب تصور اور اس کے برعکس اصل حقائق کی وضاحت

عیسائیوں کا ایمان یہ ہے کہ جو حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پر ایمان نہیں رکھتا' وہ جنت میں جا ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے ان کا تصور۔ باقی مذاہب کی بات میں نہیں کر رہا۔۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی ورنہ۔۔ میں بتا تا کہ جو مانتے ہیں تسلسلِ حیات کو وہ آخرت کے متعلق کیا تصور رکھتے ہیں۔ یہ دو تو ہمارے سامنے ہیں۔قرآنِ کریم نے آ کے یہ بات بتائی کہ سوال ہی نہیں ہے۔۔نہ یہود کا نہ نصاریٰ کا۔۔نہ بنی اسرائیل کا نہ غیرِ بنی اسرائیل کا۔سوال یہاں مکافاتِ عمل کا ہے۔۔انسانی اعمال اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتے ہیں۔۔صحیح اعمال اپنا خوشگوار نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔۔غلط اعمال تخریبی نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ان اعمال کے نتائج اس زندگی کے اندر بھی برآمد ہو جاتے ہیں اور۔۔بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ جو یہاں برآمد نہیں ہوتے۔۔مرتب تو وہ ہو چکے ہوتے ہیں انسان کے قلب پر۔۔وہ محسوس شکل کے اندر یہاں اگر سامنے نہیں آتے تو۔۔زندگی یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ سامنے نہیں آتے یا انسان یہاں کسی نہ کسی طرح سے تدبیر کر کے سوسائٹی کی گرفت میں نہیں آتا' قانون کی زد میں نہیں آتا۔۔نہ آئے۔۔زندگی یہاں ختم تو نہیں ہو جاتی۔ یہ اشتہاری ملزم یہاں کا بھاگ کے کہیں جا ہی نہیں سکتا۔۔زیادہ سے زیادہ یہ کہے گا نا کہ ہم مر جائیں گے۔وہ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی کہاں سے چھوٹ جاؤ گے۔۔ مملکت ہماری خدا کی ہے' اس میں تم رہو گے' پکڑے جاؤ گے۔تمہارے ہر عمل کا نتیجہ تمہارے سامنے آ کر رہے گا۔۔ یہاں کی زندگی میں

وہ اگر نہیں آیا تو اس کے بعد آ کر رہے گا۔۔اس میں نہ کسی مسلمان کی شرط ہے نہ یہودی یا نصاریٰ کی۔۔سوال ہی نہیں ہے صاحب۔!! یہ ہے ایمان بالآخرت' قرآن کی رو سے اور۔۔ایمان بالآخرت پر یقین' دنیا میں کوئی مذہب بھی نہیں ہے جو رکھتا ہو۔ وہاں کچھ نہ کچھ دے کے چھوٹ جانا کسی نہ کسی سفارش سے چھوٹ جانا۔۔ ہر مذہب میں یہ ہے۔اور یہ اس بنیاد کے خلاف ہے۔اس لیے ان مذاہب کا جو ایمان بالآخرت ہے' وہ اُسے ایمان بالآخرت مانتا نہیں ہے۔

خدا تعالیٰ کے متعلق عقلِ انسانی کا خود ساختہ تصور وحی کے عطا کردہ تصور سے بالکل مختلف ہے

اس لیے اس نے کہا ہے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (2:137) اس سے پیشتر یہود نصاریٰ وغیرہ تمام کا ذکر آ رہا ہے انبیائے سابقہ کا ذکر آ رہا ہے اور اس کے بعد یہ کہا گیا کہ اگر یہ لوگ اس طرح خدا پر اور آخرت پر یقین رکھیں جیسے کہ تم رکھتے ہو یعنی قرآن کے مطابق تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح ایمان ہے۔لہٰذا جب ان کے متعلق کہا گیا کہ یہ نہ خدا پہ ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پہ تو یہ معنی اس کے تھے۔ایسا نہیں کہ تم ان سے ایمان بذریعۂ شمشیر منواؤ۔۔ایمان تو زبردستی لایا ہی نہیں جاسکتا۔۔یہ متضاد چیز ہے۔اور اگر اسے بنیادی معنی میں بھی جایئے ''ا م ن'' پہ تو آئیں گے امن پہ۔۔یہ تو حالتِ امن میں ہی لایا جاسکتا ہے۔۔پہلی بات تو یہی ہے اور۔۔اگر شمشیر پہ ہو تو اُسے کیا آپ حالتِ امن کہیں گے۔یہ تو دل اور دماغ کے پورے سکون اور رضامندی سے لایا جاسکتا ہے۔۔ایمان کے معنی Conviction کے ہیں۔۔وہ شمشیر کی زبردستی تو ایک طرف رہا آپ زبردستی دلائل کی رو سے بھی کسی کو قائل نہیں کرسکتے۔۔آپ تقلیداً بھی کسی کو نہیں منوا سکتے۔وہ تو خود دلیل و برہان کی رو سے' جس کے دل اور دماغ میں بات جھکے گی' اس کا نام ایمان ہوگا۔بات وہ یہ بتا رہا ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں جو اگرچہ ایمانِ آخرت اور ایمان باللہ کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن۔۔یہ چیز بھی نہیں ہے۔یعنی یہ بات ان کے متعلق کہی گئی ہے کہ ان کا ایمان بھی ایمان نہیں ہے۔

اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق اور ان کی ذمہ داری

وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْ ُ (9:29) اب اگلی بات آ گئی کہ جو اللہ اور لفول نے حرا اردیا یہ اُسے حرام نہیں قرار دیتے۔یہ تو پھر مذہب کے اندر خل اندازی ہوگئی۔۔م لاا اگر ۸ یسائی سور لھاتے ہْں' تمہارٹ ہاں+ ہ حرامنہے تو کیا یہ ن ڈ خلش حرم ہوجائے گا دیکھو یی بدا یے اس کو حرا قرار دیا ہے اور یہ کھائے چلے جارہے ہیں۔ ھائے چلے جارہے ہیں'' نی ہا انکی کھادے جئے نیں''۔وہی چیز۔۔غلط مفہوم غرل ہوتا یے وپچپ قرارد+ نا کسی چیص عا۔ٹی ظمملکتِ اسلامیہ کس ندرر تے ثیں اور نمملعت کے اندر رہنے والے شہریوں کے ذمہ جو عجے واجب قرار دیتی ہے یہ مملکت۔۔وہ بھی ادا نہیں کرتے۔مملکت کے اندر پر امن شہری رہنے کی دو

شرطیں ہیں۔۔ایک تو یہ ہے کہ اس کے قانون کی اطاعت کی جائے اور۔۔دوسری یہ ہے کہ جو واجبات اس کے ذمہ ہوں' ان کو ادا کیا جائے۔ایک تو اس میں جو تساہل اور تغافل ہے دوسری یہ کہ علی الرغم کہا جائے کہ ہم مانتے ہی نہیں ہیں کہ واجب ہے۔حضرتِ صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں بعض قبائل نے یہ کہا تھا۔۔۔وہ جو کہتے ہیں کہ زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف انہوں نے جنگ کی تھی اور پھر ان کو مرتد قرار دیا مرتد کی سزا قتل ہوئی پھر مودودی صاحب نے کہا کہ سال بھر کا ہم نوٹس دیں گے اس کے بعد سب کو قتل کر دیں گے۔تماشہ بنا ہوا ہے عجیب۔وہ بات یہ تھی۔۔مملکت کے جو واجبات تھے آج کی اصطلاح میں جسے ٹیکس کہتے ہیں حالانکہ وہ ٹیکس نہیں ہے۔۔مملکت کے واجبات کے متعلق یہ کہ ہم مانتے ہی نہیں کہ یہ واجب ہے۔۔یہ سرکشی بغاوت ہو جاتی ہے۔وَ لَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ (9:29) یہ معنی نہیں ہیں کہ دینِ حق کو قبول نہیں کرتے۔یَدِیۡنُوۡنَ(9:29) کے معنی اطاعت قبول کرنا ہے۔یہ نظام جو ہے فی الحقیقت قائم ہو چکا ہوا ہے وہ اس کی اطاعت نہیں کرتے ہیں۔۔مملکت کے اندر رہتے ہیں لیکن۔۔مملکت کے قوانین کی اطاعت نہیں کرتے' سرکشی برتتے ہیں۔یہ لوگ یہ کرتے ہیں۔تو ایک مملکت کے اندر اس قسم کی آبادی۔

ہمارے ہاں زکوٰۃ کا مفہوم اور اس کو ادا کرنے کا طریق

یہاں سوال ان کے مذہب کا نہیں ہے۔۔میں ابھی بات کرونگا۔۔مملکت کے رہنے والی آبادی خواہ وہ مسلمانوں ہی کی کیوں نہ ہو' اگر وہ مملکت کے واجبات کے خلاف سرکشی اختیار کرتی ہے کہ نہیں ہم تو دیں گے نہیں۔تو یہ تو یہود و نصارٰی تھے۔۔ابھی ابھی بات آ گئی سامنے کہ حضرتِ صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں مسلمانوں کے ان قبائل نے جو ان کے اندر تھے انہیں کہا کہ وہ سنٹر کا Due ہے۔۔یاد رکھیے یہ جو کہتے ہیں نا' زکوٰۃ نہیں دی تھی انہوں نے۔۔یہ زکوٰۃ اگر آپ کے ہاں والی ہو تو کوئی سوال ہی نہیں ہے کہ کوئی مملکت اس میں Interfere کرے۔۔یعنی اپنے طور پہ آپ اڑھائی پرسنٹ اس کو کر لیجیے ''فیر اوناں فقیراں نوں تے اوہ نوں ونڈ دیو تے مملکت دا ایہدے وچ کی ہیگا''۔یہ تو آپ انگریزوں کے زمانے میں بھی دیتے تھے' ہندوؤں کے زمانے میں اب وہاں بھی دے رہے ہیں' یہاں بھی دے رہے ہیں۔

حضرت ابوبکر کے دور میں کفار نے مملکت کے Dues دینے سے انکار کر دیا تھا

اس کا یہ مطلب نہیں۔۔اس کے معنی ہیں مملکت کے Dues۔۔مملکت کے واجبات۔انہوں نے واجبات سے بھی انکار نہیں کیا تھا۔بڑی عجیب بات ہے۔۔یہ کوئی لاتا نہیں ہے اور کوئی مملکت نے کہا تھا کہ جو Dues ہیں یہ مرکزی ڈگر سے ہیں۔یہ مختلف علاقوں میں جو بھی نظم و نسق ہو رہا تھا اس کی ذمہ داری مرکز کی تھی۔وہ آج کی طرح Procincial Autonomy اور خود مختاریاں جس پہ یہ

ساری مصیبتیں پڑی ہوئی ہیں۔۔نہ یہ اسلامی، نہ نظام ہے۔اس وقت یہ تھا کہ جو سنٹر نے Provision کی ہے کہ یہ Due سنٹر میں آنے چاہئیں وہ سنٹر کے بیت المال میں جمع ہونگے۔۔یہاں بھیجے جائیں گے۔اُنہوں نے کہا یہ تھا یا تو سنٹر ہمارے لیے بھیجے یا ہمیں اسکا اختیار دے کہ یہ ہم پر ہی صرف ہونگے وہ کہتے تھے ہم اپنے آپ ہی اس کو صرف کرلیں گے۔یہ تھی ساری بات۔انہوں نے کہا کہ غلط ہے۔۔یہ سنٹر کی Sovereignty کے خلاف ہے جو کچھ تم کہتے ہو۔ہم نہیں Sanction کریں گے، Sanction سنٹر کرے گا۔۔سنٹر کا Due سنٹر میں آنا چاہیے۔تو یہ تو مسلمان تھے۔اور اگر اس مملکت میں رہتے ہوئے غیر مسلم ایسا Attitude اختیار کرلیں کہ نہیں صاحب ہم مملکت کے Dues بھی نہیں دیں گے۔اس کے قوانین میں سے جس قانون کو جی چاہے گا مانیں گے، جس قانون کو جی چاہے گا، نہیں مانیں گے۔کہا انہیں سمجھایئے کہ مملکت کے اندر رہنا ہے تو یہ حیثیت تمہاری اُس کو قابلِ قبول نہیں ہے۔۔اب یہاں یا تو Dues ان کو ادا کرو اور جو قوانین پبلک لاز ہیں جو سب پہ منطبق ہوتے ہیں ان کی اطاعت کرو۔تو ٹھیک ہے پرامن شہریوں کی حیثیت سے رہو۔۔مذہب میں تو ہم تمہارے دخل نہیں دیتے۔اگر وہ اس چیز کے اوپر نہیں آتے ہیں تو پھر ان کے خلاف اگر یہ جنگ پہ اترتے ہیں تو جنگ بھی کرو اس مسئلے کے اوپر۔مملکت کے اندر اس قسم کی آبادی کو رہنے نہیں دیا جاسکتا۔۔مملکت کی بنیادیں کھوکھلی ہوجاتی ہیں۔جنگ کرنے کی ضرورت ہو، تو جنگ بھی کروان سے۔

مملکت کے اندر سرکشی کرنے والے اگر خود کو سرنڈر کردیں تو ان کی حفاظت مملکت پر فرض ہے

جنگ کرنے کے بعد اب وہ آ گئی آیت حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ (9:29) یہ جزیہ کیا ہوگیا؟؟ اب یہاں بات آئی کہ یہ کیا تھا؟؟؟ جنگ کرو هُمْ صٰغِرُوْنَ (9:29) یہ سرنڈر کریں۔یہ جو ہے نا کہ یہ پست اور ذلیل ہوجائیں۔۔عزیزانِ من! کسی انسان کے متعلق یہ لفظ استعمال کرنا کہ وہ ذلیل ہوجائے۔۔انسانیت کی ذلت ہے۔اسلام اسی تصور کو مٹانے کے لیے آیا تھا۔هُمْ صٰغِرُوْنَ (9:29) کے یہ معنی نہیں ہوتے۔وہ تو کبر کے مقابلے ص غ ر آیا ہے نا اُس کے معنی ہوتا ہے سرکشی اختیار کرنا۔انہوں نے سرکشی اختیار کی تھی۔۔یہ اس کو چھوڑ کے سرنڈر کردیں۔۔ٹھیک ہے جنگ ختم۔اب اس کے بعد کیا صورت ہو۔۔ایک اور نقشہ اس نے دیا ہے۔ہماری مملکت کے اندر رہیں ہم ان کی جان مال عزت آبرو مذہب کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔آپ کو پتہ ہے اہلِ الذمہ یا ذمی کہا جاتا ہے۔

کسی ذمی کو مملکت اسلامیہ کی فوج میں بھرتی نہیں کیا جاسکتا

اب ذمی کا لفظ آیا نہیں تو صاحب یہ یہاں رہنے والے جو غیر مسلموں کو مار مار کے ذمی بنا لیتے تھے۔اور ذمی کے معنی ہیں جن کا ذمہ لیا

ہوا ہو۔تمہاری ان تمام چیزوں کا ذمہ ہے ہمارے اوپر۔تم یہی کہتے ہو کہ ہمیں قلعوں میں رہنا چاہیے ہمیں ہتھیار رکھنے چاہئیں کہ ہم اپنی حفاظت کر سکیں۔کہا کہ تمہاری حفاظت ہم کریں گے ان تمام چیزوں کی حفاظت ہمارے ذمہ ہوگی۔مملکت کے اندر جو مسلم آبادی ہے ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ جتنا کسی کی ضرورت سے زائد ہے' سارے کا سارا مملکت کی تحویل میں آ جاتا ہے۔پھر ان لوگوں کو جنگ میں نہیں جانا پڑتا۔اگر کوئی تم پہ حملہ کرے گا تو اسلامی عساکر اور فوجیں تمہاری حفاظت کریں گی۔تمہاری کیفیت یہ ہے کہ ہم تمہیں فوج میں بھی بھرتی نہیں کریں گے۔یہ چیز کہ کسی کے پاس اس کی ضرورت سے زائد نہیں رہے گا' یہ لاء تم پر بھی نہیں لاگو ہوگا۔حفاظت تمہاری ہم کریں گے۔۔اس حفاظت کے بدلے میں جیسے چوکیدار کو تنخواہ دی جاتی ہے اس حفاظت کے بدلے میں ہم تم سے یہ لیں گے۔اور یہ بھی حقیقت میں کوئی اتنا مال نہیں جو ہم تم سے لیتے ہیں یہ تو Symbol ہے اس چیز کا کہ تم واقعی ہماری حفاظت میں ہو اور تم اپنی اس پوزیشن کو قبول کرتے ہو۔جزیہ کا لفظ ہی جز آء سے ہے جس کے معنی بدلے کے ہیں۔تو یہ اس کے بدلے میں ہے یہ لفظ خود بتا رہا ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔چلی ہماری تحقیق کہ صاحب ایران کے اندر جو ایک لفظ تھا اس سے ایک معرب بنایا گیا۔۔یہ بالکل غلط ہے۔اس کا روٹ موجود ہے عربی زبان میں۔۔بدلے میں کوئی چیز لینا۔ہم نے جو ذمہ لیا ہے تمہاری حفاظت کا ہر شے کی حفاظت کا۔۔اس کے بدلے میں ہم تم سے تھوڑی سی رقم لیں گے۔رقم کیا لیتے تھے زیادہ سے زیادہ یہ لیتے تھے سال کے۔بچے مستثنیٰ۔۔عورتیں۔۔بوڑھے۔۔بیمار۔۔اپاہج۔۔معذور۔۔بیکار۔۔یہ ان کے مذہبی پیشواء وغیرہ یہ سارے اس میں سے مستثنیٰ تھے۔تو گویا قریباً وہ آبادی کہ جسے آپ سمجھیں کہ وہ جو فوج میں جانے کے قابل ہوتے ہیں۔۔کیونکہ فوج کی حفاظت ان کے اوپر لازمی نہیں تھی۔۔میں کہتا ہوں اس کے بدلے میں صرف ہو سکتا ہے۔زیادہ سے زیادہ بارہ روپے۔ Minimum تین روپے تک بھی تھا سال کا۔مملکت ان کی حفاظت کی ذمہ دار ہے ان سے یہ لیتی ہے۔(عَنْ يَّدٍ) (9:29) قرآن ہے عزیزانِ من! کیا بات ہے!! سوال یہ ہے کہ جو کہا کہ اپنے ہاتھ سے دیں۔۔یہ اپنے ہاتھ سے کیوں دیں۔۔ آپ کو معلوم ہے ہمارے ہاں بھی یہ چیز ہوتی ہے وہ کہتا ہے اس میں سے کچھ دیجیے "او کینداا ے جنا مرضی لے لے ایہدے وچوں' او کینداا ے جی نئیں! اپنے ہتھ نال دے"۔آپ دیکھئے اس میں کتنا فرق پڑتا ہے۔۔!! اس میں رضامندی شامل ہو جاتی ہے۔یعنی وہ اتنا استبداد اتنی زیادتی کو بھی قرآن نے گوارا نہیں کیا ہے کہ یہ چیز تم سے زبردستی لی جائے گی۔اس چیز کے اوپر بھی رضامند اگر تم ہو تو پھر ٹھیک ہے' اگر یہ صورت بھی تمہیں گوارا نہیں ہے۔۔اس کے بعد ہم تمہیں جہاں بھی تم سمجھتے ہو' حفاظت میں رہ سکتے ہو' ہم اپنی حفاظت میں تمہیں وہاں پہنچا دیں گے۔اپنی رضامندی سے یہ دے۔

جزیہ کے بارے ہماری پیدا کردہ سوچ غیر قرآنی ہے

یہ ہے جزیہ عزیزانِ من۔۔!! یہ ہے ان اہلِ کتاب کے خلاف جنگ کی اجازت۔۔ جسے یہ بڑا بنایا گیا کہ شمشیر سر پہ ہوتی ہے یا تو مسلمان ہو یا جزیہ قبول کرو۔لیکن میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ یہ ان کا قصور نہیں۔۔ٹھیک ہے ان کے ہاں بعض متعصب بھی ہیں لیکن۔۔ جو متعصب نہیں بھی ہیں جب وہ آپکی تفاسیر اور روایات میں وہ چیزیں دیکھیں گے اور پھر مسائل دیکھیں گے جزیہ کے متعلق تو پھر اس کے بعد یہ کچھ وہ کہیں گے۔اب ہماری حالت یہ ہے کہ جب وہاں سے کسی کتاب میں لکھا ہوا آ جاتا ہے تو اس کے خلاف ایک شور بلند ہو جاتا ہے کہ دیکھیے اسلام کے خلاف کیا کہتا ہے اور۔۔جن کتابوں کے اندر وہ سب کچھ ہوتا ہے جہاں سے لے کے وہ سب کچھ کرتے ہیں اس کے ختم شریف آپ کے ہاں ہوتے ہیں' اس کا تقدس آپ کے ہاں ہوتا ہے' وہ آپ کے درسوں میں شامل ہوتی ہے۔یہ کیفیت ہے آپ لوگوں کی۔۔!! یہ ہے وہ جزیہ۔

یہودیوں کے نزدیک عزیر جو کچھ بھی تھے وہ اسے خدا کا بیٹا تصور کرتے ہیں

یہ دوسری صورت ہے جسے اہلِ کتاب کے خلاف جنگ کی بات کہی جاتی ہے۔آگے وہ بات آ گئی جو میں نے ابھی عرض کی ہے کہ نہ خدا پہ ان کا ایمان ہے نہ آخرت پر ایمان ہے۔وَ قَالَتِ الۡیَهُوۡدُ عُزَیۡرُ ۨ ابۡنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَی الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ اللّٰهِ (9:30) کہا ان کی خدا پہ ایمان کی یہ کیفیت ہے کہ یہودی جو ہیں وہ عزیر کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ہمارے ہاں یہ چیز محلِ نظر رہی اور موضوع بھی رہی بحثِ نظر کا۔ہم نے کہہ دیا کہ عزیرؑ بنی اسرائیل کے ایک نبی تھے ان کو یہودی خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔عزیر تو آپ نے نام سنا ہی ہوگا۔۔ حضرتِ عزیر پھر اس کو کہا جاتا ہے۔یہ بات تو لمبی ہو جائے گی کہ ان کے ہاں عزیر کی شخصیت کیا آتی ہے۔۔وہ ایک عجیب وغریب شخصیت ہے اور۔۔معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی افسانوی سی شخصیت ہے۔

مختصر الفاظ میں یہودیوں کی سرگزشت اور اولڈ ٹسٹامنٹ کا ذکر

بابل کی اسیری کے یعنی بعد قریب اسی سال کے بعد جب یہ وہاں سے آئے تو بخت نصر نے تو یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی ان سب کو غلام بنا کے لے گیا تھا اور۔۔ان کی ساری کتابوں کو اس نے تلف کر دیا تھا۔بابل کی اسیری کے زمانے میں یہودیوں کے پاس کتبِ تورات۔۔تورات کسی ایک کتاب کا نام نہیں ہے جسے یہ اولڈ تمام انبیائے بنی اسرائیل کی کتابوں کا مجموعہ۔۔اُسے تورات کہتے ہیں یاد رکھیے۔تو تورات کا کوئی مجموعہ ان کے پاس باقی نہیں رہا تھا۔۔اس نے سب تلف کر دیا۔وہاں یہ گئے سو سال تک قریباً وہاں رہے ان کی

زبان بھی بدل گئی تھی۔اس کے بعد جب ذوالقرنین نے ان کو وہاں سے رہائی دلائی پھر یہ واپس آئے جب۔۔یہی کیخسرو جسے کہتے ہیں ۔۔تو ان کے پاس زبان ہی کوئی نہیں تھی تو۔

تورات کے مدون ہونے کی روئداد

ان کے ہاں لکھا ہے کہ پھر یہ تورات کس طرح سے مرتب اور مدون ہوئی ہے۔انہوں نے کہا کہ ایک مامور من اللہ آیا اُس نے آ کے کہا کہ میرے گرد بیٹھ گئے لکھنے لکھنے والے۔۔پتہ نہیں چالیس یا کتنے لکھنے والے اس نے بٹھا لیے اور۔۔وہ ایک پیالہ پئے جاتا تھا اور اس میں مدہوش ہو جاتا تھا اور اس مدہوشی کے عالم میں وہ بولتا جاتا تھا اور یہ لکھتے جاتے تھے۔۔کسی نے تین دن میں کسی نے سات دن میں کسی نے چالیس دن میں بہر حال اس کیفیت میں وہ بولتا چلا گیا اور وہ لکھتے چلے گئے اور از سرِ نو تورات مرتب ہوئی۔ہمیں بہر حال اس سے واسطہ نہیں ہے۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ عزیر اس کا نام ہے ان کے ہاں۔یہودی کہتے تھے کہ ہم تو مانتے ہی نہیں ہم تو اس کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے۔بات کسی اور طرف چلی جائے گی۔

عزیر نامی مصریوں کے ہاں ایک دیوتا کا نام تھا جسے وہ خدا کا بیٹا تصور کرتے تھے

عزیر حقیقت میں مصریوں کا ایک دیوتا تھا Osiris عزیرس جس کو کہتے تھے اس کی وہ پرستش کرتے تھے۔یہ عزیرس وہاں کا وہی عربی زبان میں آ کے عزیر ہوا۔مصر کے یہودی بھی اس عزیرس کی پرستش کرتے تھے۔آپ کو یاد ہے کہ قرآنِ کریم میں ہے کہ جب حضرتِ موسیٰؑ ان کو آزاد کرا کے سینا میں لے آئے۔۔ان وادیوں میں سے گزر رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں ایک قبیلہ ایک بت کی پرستش کر رہا ہے۔تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ کو پکڑ کے کہا تھا کہ ہمیں بھی بنا دو تم اس قسم کا۔تو گویا بت پرستی ان کے رگ و پے میں حلول کر چکی تھی ۔۔یہ بت پرستی وہی بت تھا جو مصریوں کا معبود عزیرس تھا۔۔یہ یہودی اس کی پرستش کرتے تھے اور عزیرس کے متعلق مصریوں کا عقیدہ تھا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔۔یہی عقیدہ ان یہودیوں کا بھی تھا۔اس کے بعد یہ یہودی متبع بھی ان کے ہوگئے۔۔یہ ٹھیک ہے لیکن۔۔رام جاندا ای جاندا اے رحیم وڑ واہی وڑ دا اے۔جس وقت یہ اپنے پرانے عقائد پہ آئے ہیں تو یہی عقیدے تھے وہی بت پرستی کے عقیدئے وہ سارے ان کے اندر عود کر آئے تھے۔ان کے ہاں ایک طبقہ تھا جو۔۔اسی طرح عزیرس کو کہتا تھا کہ ہم اس کی عبادت تو پرستش تو نہیں کرتے لیکن بہر حال وہ خدا کا بیٹا تو تھا۔یہ تصور ان کے ہاں موجود تھا۔۔تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔نظر آتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت ان کے اندر وہ چیز موجود تھی اور۔۔اسی لیے اس زمانے کے یہودیوں نے اس پہ اعتراض ہی نہیں کیا کہ یہ آپ ہمارے متعلق کیا کہہ رہے ہیں۔

عیسائیوں کے نزدیک مسیح کو خدا کا بیٹا مانا جاتا ہے

عیسائیوں کے متعلق کہ وہ مسیح کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں اس میں تو کوئی دورائے نہیں ہیں۔۔ان کے ہاں ہیں ایسے فرقے جونہیں مانتے لیکن۔۔عیسائیت کا پوپ اعظم جو ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتا ہے۔تو کہاان کے خدا ماننے کی تو کیفیت یہ ہے کہ وہ انہیں بیٹا مان رہے ہیں خدا کا۔

قلب و دماغ کی بجائے صرف زبان سے کہی ہوئی باتوں میں فرق کی نوعیت ہے حضرت مسیحؑ کے سلسلہ میں عیسائیت عقیدے کی وضاحت

ذٰلِكَ قَوۡلُهُمۡ بِـاَفۡوَاهِهِمۡ (9:30) ترجمے میں تو یہی ہے کہ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔بات تو ہر ایک منہ سے ہی ہوتی ہے۔۔یہ منہ کی بات کیا بات ہوگئی۔۔؟؟؟ اگلے چار لفظوں میں بات صاف کردی۔ایک بات تو وہ ہے کہ جو آپ خود اپنے قلب و دماغ کی رضامندی سکون سے' خود دلائل و براہین کی رو سے' کسی نتیجے پہ پہنچے ہیں اور پھر وہ بات کریں تو۔۔وہ آپ کے قلب و دماغ کی بات ہوگی جس کا اظہار صرف آپ کی زبان سے ہوگا۔اور ایک وہ باتیں ہونگی جو آپ تقلیداً دوسروں سے سنیں اور ان کو دہرا دیں۔۔اس میں آپ کے اپنے دماغ کی دلیل و برہان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔سنی ہوئی بات کو زبان سے دہراتے ہیں۔قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ ایک لفظ میں۔۔یہ جتنی باتیں بھی کرتے ہیں یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں اس لیے کہ یُضَاهِئُوۡنَ قَوۡلَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ (9:30) اس سے پیشتر جو لوگ کفر کے متبع تھے ان کے ہاں کے یہ عقیدے تھے اور انہی عقیدوں کو تقلیداً لے کے اور باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔۔غور کبھی کیا ہی نہیں انہوں نے۔یہ دیکھیے من قبل کی بات نے واضح کر دیا کہ یہ یہودیوں کا عزیر ان کا کوئی عزیر نہیں ہے۔ان سے پہلے مصریوں کے ہاں اور مصری تو ان سے بہت پہلے اس کو مانتے تھے۔۔ان کا ہے۔یہ جو عیسائی مانتے ہیں حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا۔۔یہ بھی ان کے ہاں کا عقیدہ نہیں ہے۔عجیب بات ہے عزیزانِ من! قرآن کی۔۔میں نے کہا ہے کہ اس کے کسی لفظ سے بھی یوں نہ آگے گذر جایئے۔یہ الَّـذِيۡـنَ كَـفَـرُوۡا مِـنۡ قَبۡـلُ (9:30) قرآن نے بہت بڑا دعویٰ کیا ہے اور۔۔ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔تو یہ ان کے اپنے ہاں کا عقیدہ نہیں ہے مستعار لیا ہوا ہے دوسروں سے اور۔۔مستعار ان سے لیا ہے جو اس سے پہلے یہ عقیدہ رکھتے تھے۔عقیدۂ جدید اب یہ ہے کہ عیسائیت کا عقیدہ کہ بن باپ کے پیدا ہونا' کنواری کے بطن سے اور خدا کا بیٹا ہونا' آسمان پہ چلے جانا۔

مجوسیت میں مشرا کے عقیدے کی وضاحت کے علاوہ پھر قربِ قیامت ان کا آسمانوں سے زمین پر آنے کا تصور اور اس ہنگامہ آرائی پر تبصرہ

مجوسیت میں مشرا کے متعلق یہ چیزیں عقیدے میں موجود ہیں۔ زرتشت مذہب میں۔۔ ویسے تو وہ حضرت زرتشت کو پہلا پیغمبر مانتے ہیں لیکن۔۔ یہ جو عظیم شخصیت ان کے ذہن میں ہے زرتشتیوں کی وہ۔۔ مشرا ہے۔ اور مجوسی اس کے متعلق یہ مانتے تھے۔۔ بن باپ کے پیدا ہوا۔ خدا کا بیٹا تھا۔۔ آسمان پہ چلا گیا۔۔ آخرت میں آئے گا۔ جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ تو ہر ایک مانتا ہے نا کہ ایک آئے گا۔۔ ہر مذہب مانتا ہے اور پھر۔۔ یہ موجودہ مسلمان بھی مانتے ہیں۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ ہر مذہب والا کہتا ہے وہ' وہ آ کے ہمارے مذہب کو ساری دنیا پہ غالب کرے گا۔ اور سب کہتے ہیں قربِ قیامت میں وہ آئے گا۔ آپ سوچئے کہ یہودیوں کا آنے والا بھی آ جائے' عیسائیوں کا آنے والا بھی آ جائے' مجوسیوں کا آ جائے' بدھوں کا آ جائے۔۔ یہ سارے آ جائیں ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے مذہب کو غالب کرنا ہو تو۔ اتنے سارے آخری آ جائیں اور ہر ایک اپنے اپنے مذہب کو غالب کرنے کے لیے ہے" تے قیامت تے آ گئی فیر' ایہڈی وڈی قیامت ہور کیہڑی ہونی ہیگی اے"۔ وہ جو ہے آخری قوت والا کہے کہ میرا مذہب غالب آ جائے" تے ہون اے پنج دس کٹھے رلے ہوئے"۔

اس قسم کے باطل عقائد کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

تو میں کہہ رہا تھا کہ یُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ (9:30) کتنی عظیم چیز قرآن کہہ گیا ہے کہ یہ ان کے اپنے عقائد نہیں ہیں اس سے پیشتر جو کفر کرنے والے تھے' ان کے ہاں کے عقائد تھے۔۔ ان کم بختوں کی کیفیت یہ ہے کہ طوطے کی طرح دہرائے چلے جاتے ہیں' کہے چلے جاتے ہیں۔۔ کبھی کھڑے ہو کے سوچتے نہیں ہیں کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں۔ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (9:30) وہ عربی زبان میں کہا کرتے ہیں کہ او خدا انہیں غارت کرے۔ مخالفت بھی قرآن کرتا ہے تو آپ دیکھیے گالی نہیں دیتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہوتی ہے' او اللہ تہانوں غارت کرے"۔ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ (9:30) اس سے پیشتر ان لوگوں کے یہ عقائدِ باطلہ ان کے اندر موجود تھے۔۔ تم بغیر سمجھے سوچے ہوئے اپنے پیغمبروں کے متعلق یہ باتیں کہنا شروع کر دیتے ہو۔۔

قرآن حکیم نے صاحبانِ شریعت ارباب طریقت کی طرف سے پیش کردہ نظریہ حیات کی حالت زار پر تنقید کی ہے

او خدا تمہیں غارت کرے، تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے، کہاں چلے جا رہے ہو، کہاں بہکے چلے جا رہے ہو۔ عوام میں ہماری کہی ہوئی باتیں کیسے آ گئیں۔ کہنے لگے عوام بیچاروں کا کیا ہے ان کی تو اپنی بات ہوتی نہیں۔ اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَ رُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ الۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ (9:31) کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ اپنے مذہب کے پروہت یہ احبار اور رہبان دونوں قرآن اس میں لے آیا عزیزانِ من۔۔! احبار علماء کو رھبان مشائخ کو کہتے ہیں۔۔ صاحبانِ شریعت اور اربابِ طریقت دونوں آ گئے۔۔ صوفیوں میں آپ کے ہاں کے یہ پیر آ گئے اور ادھر مولوی صاحب آ گئے۔ کہتا ہے عوام بیچارے جو کہتے رہتے ہیں یہ ان کا دوش نہیں ہے۔۔ گویا ان کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے خدا کے بجائے ان پیروں اور مولویوں کو ہی اپنا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (9:30)۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس میں خدا تک پہنچتے۔۔ انہوں نے خدا سے ورے ہی ان کو کھڑا کر رکھا ہے اور وہ انہی کو اپنا خدا مان رہے ہیں اور۔۔ جو یہ کہتے ہیں، وہی ان کا عقیدہ ہو جاتا ہے۔ وہ جو ارباب ان کے علماء و احبار ہیں، وہ اپنی بات یا خدا کی بات نہیں کہتے۔۔ پہلے سے غیر مذاہب اور کفار کے عقائد جو چلے آ رہے ہیں، انہیں اپنی کتابوں میں شامل کر دیا۔ وہ تو یوں ان کی تقلید کر رہے ہیں اور ان کے عوام ان مولویوں اور پیروں کی تقلید کر رہے ہیں۔ کہتا ہے یہ ان کا مسلک ہو گیا۔ اس کے اوپر تو ایک روایت آتی ہے ایک حدیث ہے اور وہ صحیح نظر آ رہی ہے، بات بڑی عمدہ ہے وہ یہ کہ۔۔ اس کے اوپر یہودیوں اور نصاریٰ نے بھی اعتراض کیا تھا کہ ہم تو اپنے احبار و رہبان کو خدا نہیں مانتے یہ۔۔ کیسے کہہ دیا آپ نے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا تھا ایک حدیث میں یہ آتا ہے۔۔ صحیح حدیث جو ہے وہ چمک کے خود بتا دیتی ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک نظریاتی لحاظ سے ذہنوں کی آبیاری سب سے زیادہ مقدم عمل ہے

آپ ﷺ نے کہا تھا کہ کیا یہ کیفیت نہیں ہے کہ جس چیز کو یہ لوگ حرام کہہ دیتے ہیں، تم حرام مان لیتے ہو۔ جسے یہ حلال کہہ دیتے ہیں، تم حلال مان لیتے ہو۔ کہنے لگے ہے تو یہ بات۔ کہنے ﷺ لگے یہی تو خدا بنا لینا ہے۔ کیا بات ہے۔۔!!! اس جھوٹے ٹکڑے میں عزیزانِ من! خدا اور بندے کا تعلق اسلام کی رو سے۔۔ نکھار کے رکھ دیا۔ ہمارا اس کا تعلق کچھ پرائیویٹ تعلق نہیں ہے، ذہنی تعلق نہیں ہے، نظری تعلق نہیں ہے کہ۔۔ اپنے ذہن میں سمجھ لیا کہ ہاں ہم خدا کی پرستش کر رہے ہیں۔ تعلق اس کا اور ہمارا یہ ہے کہ خدا کے احکام اور قوانین، ان کے تابع زندگی بسر کی جائے، ان کو حقیقت تسلیم کیا جائے تو خدا کا ماننا ہے۔

قرآنی تعلیم کے برعکس ارباب شریعت اور طریقت کی جانب سے پائے جانے والے اختلاف کی وضاحت

اس کے ماوراء کسی اور کے احکام وقوانین کو تسلیم کیا جائے' یہ شرک ہے۔۔لاقانونیت کی زندگی بسر کی جائے تو یہ کفر ہے۔اور یہ چیز جب انہوں نے کہی کہ ہم تو ان کو خدا نہیں مانتے تو۔۔حضورﷺ نے یہ فرمایا کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تم یہ نہیں کہتے کہ خدا نے کس چیز کو حرام اور حلال قرار دیا ہے۔۔جسے یہ حرام کہتے ہیں' تم اسے حرام تصور کر لیتے ہو' جسے یہ حلال کہتے ہیں' تم اس کو حلال کہتے ہو۔کیا یہ بات نہیں ہے؟؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو ہے۔آپﷺ نے کہا کہ اسی چیز کو تو خدا بنالینا کہتے ہیں۔ہمارے ہاں جو اربابِ مذہب و شریعت اور اصحابِ طریقت دونوں۔۔اس قسم کی آیتیں بھی پڑھتے ہیں ان حدیثوں کو بھی بیان کرتے ہیں اور۔۔کیفیت آپ کے ہاں یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا وہ تو یہی چار چیزیں تھیں اور۔۔ان کے ہاں فقہ میں آپ دیکھئے تو فہرستوں پہ فہرستیں چلی آتی ہیں حرام کی کہ۔۔یہ بھی حرام یہ بھی حرام۔اور وہ سب حرام تسلیم کی جاتی ہیں۔کیا یہ وہی نہیں ہے جو رسول اللہﷺ نے فرمایا تھا۔

کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان چیزوں کو حرام کر دے جن کو قرآن حکیم نے حلال قرار دیا ہے

عزیزانِ من! بنیادی چیز جو ہے دین کی وہ تو۔۔انسان کی آزادی کو محفوظ رکھتا ہے۔صرف اتنی سی پابندی وہ عائد کرتا ہے جتنی سی پابندی ایک بچے پہ ہم عائد کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچالے۔اور وہ پابندیاں جو ہیں وہ ابدی پابندیاں ہیں۔۔بس اتنی ہی پابندی ہے۔لیکن کسی چیز کے متعلق کسی ایک انسان کا یہ کہہ دینا کہ یہ تمہارے اوپر قیامت تک کے لیے حرام ہے۔۔کروڑوں انسانوں کی آزادی کو سلب کر لیا اس نے۔یہ اتھارٹی صرف خدا کو حاصل ہے۔۔کسی انسان کو حاصل نہیں ہے۔۔اسی کا نام تو آزادی ہے۔کسی مملکت کو حاصل نہیں۔۔کسی قانون ساز ادارے کو حاصل نہیں۔۔کسی فرد کو حاصل نہیں۔۔کسی پیر کو حاصل نہیں۔۔نبی کو حاصل نہیں۔۔عالم کو حاصل نہیں اور۔۔ختمِ نبوت ہوگئی نبی تو آنا نہیں اور کسی نبی کو بھی حاصل نہیں۔کتنی بڑی آزادی کی ضمانت دی تھی اس نے اور۔۔کس طرح سے ہم ان تمام زنجیروں کو جس کے ٹکڑے ٹکڑے اس نے کر دیے تھے۔۔عقیدت سے ان ٹکڑوں کو پھر اکٹھا کیا اور اس کے بعد اپنے ہاتھوں سے دوبارہ پہن لیا۔جکڑے ہوئے ہیں ان کے اندر اور۔۔رو بھی رہے ہیں اور ان کی گرہوں کو اور مضبوط کرتے چلے جا رہے ہیں۔فہرستیں حرام اور حلال کی آپ کے ہاں ہیں۔وہ بات تو یونہی مذاق کی ہے لیکن ہے بڑی گہری۔مہاراجہ کرشن پرساد۔۔اچھا عالم آدمی تھا اور۔۔وہ نظام کی ریاست جو تھی ہندوستان کے بڑے بڑے علما اور ادبا یہ لوگ یہاں اکٹھے ہوتے تھے' ان کے ہاں سے وظائف ملتے

تھے ان کو۔ تو عام طور پہ بیک وقت وہاں ان کا جمگھٹا رہتا تھا۔ تو جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے مہاراجہ کرشن پرساد کے محل کے ایک کمرے میں۔۔ان کے ہاں تو بحثیں اس چیز پہ ہوتی ہیں۔۔ مسائل حیات سے تو ان کو تعلق ہی نہیں ہوتا۔۔ بحثیں ان کے ہاں چھڑ چلیں یہ حرام اور حلال ہے یہ چیز حرام ہے' یہ چیز حرام ہے۔ دوسرے کمرے میں وہ سنتا رہا۔۔ آدھی رات تک یہ گناتے رہے فہرستیں بناتے رہے۔۔ اس کے بعد وہ آیا اس نے دروازہ کھول کے جھانک کے کہا۔۔ کہنے لگا او حرام ہی ہے تمہارے ہاں' کچھ حلال بھی ہے۔ وہ آدھی رات تک حرام ہی کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔

رسول ﷺ کی شخصیت کا خلاف طبع کسی شے کے استعمال نہ کرنے پر انسانی آزادی کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی راہنمائی

عزیزانِ من! قرآن میں آپ دیکھئے۔۔ یہ علماء اور مشائخ تو ایک طرف رہے' نبی اکرم ﷺ کو کوئی ایک چیز ناگوار گذری ہوگی آپ ﷺ کی طبع کے اوپر' آپ ﷺ نے کہہ دیا ہوگا کہ میں نہیں یہ کھاتا۔ لوگوں نے اس سے تصور یہ لے لیا کہ جو چیز حضور ﷺ نے اپنے اوپر ممانعت کر لی ہے' یہ یقیناً حرام ہوگی۔ اتنی سی بات تھی اس سے ہی آپ دیکھیے' اس عالم الغیب کے اندر کسی رسول کا اتنا سا فعل آنے والوں کے لیے ایک قانون بن جایا کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے تو اپنی ذاتی ناپسندیدگی کی وجہ سے ایسا کیا ہے لیکن جب آنے والے یہ دیکھیں گے کہ حضور ﷺ نے ساری عمر ایک چیز نہیں کھائی تو۔۔ وہ سمجھ لیں گے کہ یہ چیز حرام ہے۔ اس امکانی وجہ کی بناء پہ قرآنِ کریم میں اس سورۃ کی ابتداء ہوئی یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ (66:1) رسول! جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے تم اسے حرام کیسے قرار دیتے ہو۔ یہ ہے انسانی آزادی کی ضمانت کی کیفیت عزیزانِ من۔۔!

وحی کی وارننگ کے باوجود خود ساختہ حرام اور حلال کی فہرستوں کی جرأت کیوں

لیکن اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (9:31) جب یہ احبار و رہبان آئے تو انہوں نے فہرستیں مقرر کر دیں! علمائے آئے تو انہوں نے تو فہرستیں ہی مقرر کیں کچھ تو چھوڑا۔۔ آپ کے اربابِ طریقت آئے اُنہوں نے کہا کہ۔۔ یہ ساری دنیا ہی قابل نفرت ہے۔ چل بھئی سیاپا ای مکا۔ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا (9:31) خدا نے تو صرف اتنا سا ہی حکم دیا تھا۔ اب یہ دیکھیے یعبدوا آیا یہاں۔ وہاں تھا اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ (9:31) انہوں نے خدا سے ماوراء ان کو پکڑ لیا۔ کہا کہ خدا نے تو صرف یہ حکم دیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا۔۔ اب یہ لِیَعْبُدُوْٓا (9:31) بات جس کا ترجمہ ہوگا کہ پرستش نہ کرو خدا کے سوا کسی کی

پرستش نہ کرو۔ مسلمان مطمئن ہیں کہ ہم تو نہ ان احبار ور ہبان کی پرستش کرتے ہیں۔ اور جب کہا جائے کہ آپ قبروں پہ جا کر کیا کرتے ہیں ۔۔ کہتے ہیں ہم ان کی بھی پرستش نہیں کرتے' ان کو تو مقربینِ بارگاہِ الٰہی کہتے ہیں۔ ایک ترجمہ یَعۡبُدُوۡۤا (9:31) کا کیا انہوں نے اپنے مطلب کا ۔۔ بات کہیں سے کہیں بگاڑ دی۔ رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا تھا کہ ان کے حرام کیے ہوئے کو حرام' ان کے حلال کیے ہوئے کو حلال۔ یَعۡبُدُوۡۤا (9:31) عبد کے معنی ہیں کسی کی محکومی اختیار کر لینا' کسی کے حکم کو مان لینا' کسی کے قانون کو مان لینا' کسی کو حکمران تصور کرنا۔ کہا خدا نے تو اس چیز کا حکم دیا تھا کہ ایک الٰہ واحد ایک ہی Sovereign Authority ہو سکتی ہے کائنات کے اندر اور ۔۔ وہ خدا ہے ۔۔ اس کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار ہی نہ کرو۔ اس نے تو یہ تم سے کہا تھا' تم نے یہ کچھ کر لیا۔ لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ (9:31) پہلے کہا الٰہ واحد ۔۔ Sovereign Authority دو ہو ہی نہیں سکتی۔ اس نے کہا ہے کسی مملکت میں دو Sovereign Authorities مان لیجیے اور اس کے بعد دیکھیے اس مملکت کا حال کیا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے لَوۡ کَانَ فِیۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (21:22) ۔تو کائنات میں اگر تم ایک کے علاوہ دو Sovereign Authorities مان لو تو دیکھو کائنات میں ہوتا کیا ہے۔

ایک مملکت میں دو مختلف قسم کی متضاد Authorities کا وجود شرک ہے

آپ نے غور کیا کہ جب اس کا ترجمہ پرستش اور الٰہ کا ترجمہ معبود ہو گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس نے کہا تھا کہ دو الٰہ اگر کائنات میں ہو جائیں تو تہس نہس ہو جائے یہ سارا سلسلہ۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ بتیس کروڑ دیوتا تو آپ کا یہ ہمسایہ مانتا ہے' بت پوجنے والا۔ بتیس کروڑ نہ بھی مانے بہر حال ۔۔ خدا کے علاوہ اتنے زیادہ خدا اور ان کے معبود اور پرستش کرنے والے تو لوگ مانتے ہیں ان سب کو؟ اس کائنات کا کچھ بھی بگڑتا ہے اس سے۔ آپ دیکھئے وہ دعویٰ خدا کا کہ کائنات میں اگر دو الٰہ ہو جائیں تو کائنات کا سلسلہ تہس نہس ہو جائے۔ اگر الٰہ کے معنی اس قسم کا پرستش پوجا اور بت ہو یا کوئی انسان ہو' پرستش کی جائے جس کی تو ۔۔ کائنات کا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ الٰہ کے معنی لیجئے جو بنیادی معنی ہیں عربی قاعدے سے قرآن کی رو سے ۔۔ Sovereign Authority اقتدارِ اعلیٰ جس کو حاصل ہے جس کا قانون چلتا ہے۔ خارجی کائنات کے اندر جو قانونِ فطرت اس نے بنا دیے ہیں' اس کے علاوہ کوئی دوسرا قانون اگر اس کے ساتھ ہوتا تو ۔۔ ہوتی نا کائنات تہس نہس۔ اس کا قانون یہ کہتا کہ آگ جلائے گی' کوئی دوسرا قانون کہتا کہ نہیں جی یہ ٹھنڈک پہنچائے گی ''پکا لو روٹیاں تسی جناب''۔ عزیزانِ من! خارجی کائنات کا فساد تو ہم محسوس کر سکتے ہیں ۔۔ انسانی دنیا کے اندر بھی اسی طرح سے فساد پیدا ہوتا ہے۔ ایک خدا کے قوانین کے علاوہ جب بھی آپ اس کے ساتھ کسی دوسرے انسان کا قانون ملائیں گے' انسانی معاشرے کے اندر فساد برپا ہو جائے گا۔ یہ ٹکراؤ جو ہو رہے ہیں یہ اسی لیے ہو رہے ہیں۔ کہا کہ ہم نے کہا تھا لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (9:31)۔ اور یہ جو میں نے ابھی ابھی

کہا ہے کہ یہ عبادت یا الٰہ جو ہے اس کے معنی ہی حکم کے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کوئی ایک لفظ بھی میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔۔ یہ سب قرآنِ کریم کے اندر ہے۔ فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا (18:110) کہتا ہے کہ یہ مسلک' یہ قانون تمہارے ہاں ہونا چاہیے کہ خدا کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ میں نے لفظ وہی رہنے دیا ہے۔

عبادت کا قرآنی مفہوم کوئی پوجا پاٹ نہیں بلکہ اس کے معنی خدا کا حکم ماننے کے ہیں

اسی سورۃ کہف میں اس سے پہلے 26 ویں آیت ہے۔ پھر ان لفظوں کو دہرا دیجیے وَّ لَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا (18:110) اور 26 میں خدا نے کہا ہے کہ خدا وَّ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا (18:26) عبادت کا ترجمہ قرآن نے خود کر دیا ہے۔ عبادت کے معنی ہی محکومیت کے ہیں' عبادت کے معنی ہی حکم ماننا ہے۔۔ قرآن کی دو آیتیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک جگہ وہ لفظ عبادت لاتا ہے دوسری جگہ وہ لفظِ حکم لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے تو یہ کہا تھا کہ خدا کے سوا کسی اور کو حق حاصل نہیں ہے کہ اپنا حکم اور قانون تم سے منوائے۔ سُبۡحٰنَہٗ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ (9:31) جس کو بھی اس کے حکم کے ساتھ' اس کے قانون کے ساتھ' وہ شریک کرتے ہیں وہ اس سے بہت بلند ہے. بہت اونچا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ہم 31 تک آ گئے عزیزانِ من! وقت ہو گیا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

چوتھا باب: **سورۂ توبة** (آیات 32 تا 35)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1973ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی 32 ویں آیت سے ہوتا ہے۔ (9:32)

عرب قبائل کی طرف سے انقلاب نو کی مخالفت کی اصل وجہ نظام کہن کا تحفظ تھا

آپ کو یاد ہوگا کہ اس سے پہلی سورۃ انفال میں بھی اور سورۃ توبہ میں بھی جنگ کے متعلق بڑا تفصیلی ذکر آ رہا ہے۔ پہلے عرب کے ان قبائل سے تصادم اور تزاحم کا ذکر تھا جو اس انقلاب آفریں تاریخ کی مخالفت کرتے تھے۔ اور میں نے یہ بتایا تھا کہ ان کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اگر یہ نظامِ نو وہاں متشکل ہو جائے تو نظر آتا تھا کہ انہوں نے اپنے غلط نظام میں جو اس قدر مفادات حاصل کر رکھے ہیں، وہ ختم ہو جاتے ہیں۔۔ قریش کی قیادت ختم ہو جاتی ہے، ان کی تجارت ختم ہو جاتی ہے، ان کے غلام باقی نہیں رہتے، ان کا نسبی تفاخر باقی نہیں رہتا۔ اس لیے انہوں نے انتہا تک مخالفت کی۔۔ یہ جماعت مکے کو چھوڑ کر مدینے بھی آ گئی تو انہوں نے اس پر بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔۔

مسلسل سات آٹھ برس تک ان کے ساتھ لڑائیاں لڑتے رہے تا نکہ۔۔ فتح مکہ اور اس کے بعد بھی حنین وغیرہ کی لڑائیوں میں ان کو آخری شکستیں ہوئیں اور اس طرح سے ان کا زور ٹوٹ گیا۔

مدنی قبائل کے علاوہ بازنطینی حکومت کی طرف سے مخالفت

اس کے بعد مدینہ اور اس کے اردگرد رہنے والے یہودی اُدھر سے رومن امپائر (بازنطینی حکومت جسے کہتے ہیں) نے بھی اس بڑھتی ہوئی رَو کو روکنے کے لیے ہر قسم کی کوششیں شروع کر دیں۔۔ یہ اہلِ کتاب کہلاتے تھے۔ یہ مکے کے اعراب یا قبائل یا قریش۔۔ انہیں تو اس زمانے کے اعتبار سے قرآنِ کریم نے مشرکین کہہ کے پکارا ہے۔ اُنہیں اہلِ کتاب کہہ کے تعبیر کیا ہے۔ مقصد ان سب کا ایک ہی تھا ۔۔ جو اس آیت میں اب شروع ہوتا ہے کہ کیوں ان کے ساتھ جنگیں ہو رہی تھیں' کیوں لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ یہ ان کی مملکتیں چھیننے کا سوال نہیں تھا یہ جوع الارض نہیں تھی۔ ایک آیت میں قرآن نے بتا دیا کہ ان کی کوشش اور سازش کیا تھی اور۔

وحی کا چراغ مٹی کے دیئے کی مانند پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا

اسکے مقابلے میں یہ ٹکراؤ کیوں تھا اور قرآن کا مقصد کیا تھا۔ کہا ہے کہ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (9:32) کہ ان کے ارادے یہ ہیں کہ خدا کے اس نور کو پھونکیں مار کے بجھا دیں۔ یہ تو ان کے ارادے بتا دیے۔ دو لفظوں میں ساری بات کہہ دی کہ ان کی وجہ مخالفت کیا ہے۔ وہ اس آسمانی قندیل کو جگمگاتا نہیں دیکھ سکتے۔۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسے بجھا دیا جائے۔ لیکن ایک ہی لفظ میں بتا دیا کہ ان کی کوشش کس قدر حماقت پر مبنی ہے۔۔ کوئی شخص بھی پھونکیں مار کے سورج کے چراغ کو بجھا نہیں سکتا۔ یہ دائمی طور پر روشنی دینے کے لیے آیا تھا اس لیے ان کے ہزار مذموم ارادے کیوں نہ ہوں' یہ ان میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگلے فقرہ میں Positively بات کو کہہ دیا کہ خدا اس نور کو مکمل کر کے رہے گا خواہ اس سے انکار کرنے والے اور سرکشی برتنے والوں پر یہ بات کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے لیکن۔ ان کے علی الرغم یہ مکمل ہو کر رہے گا۔

ظلمات کے مقابلے میں قرآن حکیم کو کتاب نور کہا گیا ہے

اگلی آیت میں بھی اسی کی وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن میں یہاں پہلے اس لفظ نور کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کا یہ نور کیا ہے جس کے خلاف اتنی سازشیں ہو رہی تھیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ کسی طرح بھی جلتا رہے' اس کی روشنی آگے پھیلے۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نور سے تشبیہ دی ہے' نور کہہ کر پکارا ہے اور۔۔ اس قسم کی تعلیم' ایسا نظام' اس قسم کی رہنمائی۔۔ اُسے نور سے

خدا نے تشبیہ دی ہے۔خدا کی راہنمائی یہ تعلیم نہ ہوتو اُسے اس نے کہا ہے' ظلمات ہیں تاریکیاں ہیں۔

اس کتاب نور کو نازل کرنے اور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد

جہاں جہاں بھی قرآن میں یہ لفظ آیا ہے تاریکی کے لیے تو۔۔تاریکیاں آیا ہے ظلمات آیا ہے اور روشنی کے لیے یہ واحد کا صیغہ نور ہی آیا ہے جس سے مفہوم قرآن ہے۔اگر اس قسم کی تعلیم جو دلائل و براہین پر مبنی ہے' علم و بصیرت کی رو سے دی گئی ہے' فکرِ انسانی کو اپیل کرتی ہے' غور و تدبر سے اس کو سمجھنے کے لیے تاکید کی جارہی ہے۔اس قسم کی تعلیم اگر نہ ہوتو دنیا میں تو ہم پرستیاں اور قیاس آرائیاں ہی رہ جاتی ہیں۔روشنی تو ایک ہی ہوتی ہے جب کہ تاریکیوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔صحیح روشنی نہ ہوتو اسکے بعد یہ کہا کہ انسانیت تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی پھر رہی تھی۔سورۃ ابراہیم میں ابتدائی الفاظ ہی یہ ہیں الٓرٰ قف کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡکَ (14:1) ہم نے یہ کتاب تیری طرف بھیجی ہے اے رسول!۔لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ (14:1) تاکہ تو نوعِ انسانی کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے۔بڑی ہی جامع چیز ہے۔۔دولفظوں میں جو بات کہہ دی گئی ہے۔آپ دیکھیے کہ تاریکیوں کے اندر سب سے بڑی چیز ۔۔سب سے بڑا نقصان تاریکی کا یہ ہوتا ہے کہ اس میں کوئی شے اپنی اصلی حالت میں سامنے نظر ہی نہیں آتی' معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہاں کیا رکھا ہے' اس کی ہیئت کیا ہے کس مقام پہ کوئی چیز ہے اور اس کی شکلیں کس قسم کی ہیں۔۔

روشنی کے مقابلے میں توہم پرستی کی کیفیت

تاریکی میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔کوئی شے اپنی اصلی ہیئت میں نظر نہیں آتی' قیاسات ہی ہوتے ہیں توہمات ہی ہوتے ہیں اور۔۔وہ توہمات ایسے ہیں کہ جو رسی کو سانپ بنا کر دکھا سکتے ہیں اور سانپ کو رسی بھی بنا کر دکھا سکتے ہیں۔تو ہم پرستی کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔روشنی کا سب سے بنیادی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ رسی کو رسی اور سانپ کو سانپ دکھا دیتی ہے یعنی۔۔ہر شے اپنی اصلی ہیئت میں سامنے آجاتی ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے نظام۔۔اس کی مختلف شکلیں۔۔ان کی دی ہوئی مختلف اقدار۔۔مختلف قوانین۔۔دساطیر۔۔آئین۔۔ رسوم۔۔رواج۔۔مؤقف۔۔مسالک۔۔اس روشنی میں ان کے تمام کے تمام مقام صحیح صحیح متعین ہوجاتا ہے اور یہ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ درحقیقت ہیں کیا۔۔وہ بن کے کیا دکھاتے ہیں اپنے آپ کو اور ہیں کیا۔۔روشنی یہ کردیتی ہے۔وہ ہر چیز کی صحیح حقیقت متعین کردیتی ہے اور واضح کرکے بتادیتی ہے۔کہا کہ یہ کتاب تمہاری طرف ہم نے نازل کی اے رسول! تاکہ تو نوعِ انسانی کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے۔اور یہ بڑی چیز ہے۔روشنی کا مل جانا انتہائی خوش بختی ہے انسانیت کی اور یہاں الناس کہا ہے۔اور اس کے لیے تاریخ سے پھر مثال دی کہ اس تاریکی سے مفہوم کیا تھا اور وہ روشنی کیا تھی۔

حضرت موسیٰ کوقوم موسیٰ کی طرف بھیجنے کا مقصداورقرآنی حقائق کو بیان کرنے کا انداز

اسی سورۃ کی پانچویں آیت میں یہ کہا کہ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (14:5) موسیٰؑ کو ہم نے اپنے قوانین دے کر بھیجا تا کہ وہ اپنی قوم کوتاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔اب دیکھئے پہلے بات جوکہی گئی تھی وہ نظری تھی Abstract تھی۔۔دوآیتوں کے بعداُسے تاریخی شہادت سے عملی چیز بنا کر سامنے رکھ دیا۔یہی قرآن کا انداز ہے کہ وہ جتنے نظری حقائق بیان کرتا ہے ان کی تشریح اور توضیح اور وضاحت عملی مثالوں سے' تاریخی شہادات سے پیش کرتا ہے تا کہ Concrete شکل میں بات سامنے آجائے کہ وہ کہتا کیا ہے۔قومِ بنی اسرائیل کی حالت مصر کی غلامی کے زمانے میں۔۔اُسے تاریکیوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تاریکیوں میں سے تین بڑی تاریکیوں کا ذکراوران کی وضاحت

قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ جزوی اعتبار سے تو تاریکیاں سینکڑوں قسم کی ہوسکتی ہیں۔۔اصولی طور پہ دیکھا جائے تو سب سے بڑی تاریکیاں انسانیت کے اوپر جومسلط ہوتی ہیں' ان کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔۔ایک ملوکیت کا عذاب کہ جس کا نمائندہ فرعون تھا۔۔دوسرے مذہبی پیشوائیت کہ جس کا نقیب ہامان تھا اور۔۔تیسرے نظامِ سرمایہ داری کہ جس کا داعی قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے خودقومِ موسیٰؑ میں سے ہی تھا قارون جسے کہا جاتا ہے۔تین ہی چیزیں گنائی ہیں اس نے اور یہ دیکھیے۔۔باقی ساری تاریکیاں ان ہی کی پھیلائی ہوئی ہوتی ہیں۔۔اصل اور بنیادی طور پہ تاریکیاں یہی ہیں جو چاہتی ہیں کہ انسانیت کبھی اس روشنی میں نہ آسکے۔ملوکیت کا استبداد۔۔انتہائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ انسان کو اصل حقیقت معلوم نہ ہوسکے بادشاہت کی اور ملوکیت کی۔۔وہ ظل اللہ علی الارض بن کے بیٹھتا ہے۔اور اس کے لیے سب سے بڑی کوشش مذہبی پیشوائیت کرتی ہے کہ جواس بادشاہ کو خدا کا سایہ ہی نہیں بلکہ اس کا اوتار بنا کے لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔اورلوگ ماننے پر مجبوراس لیے کردیے جاتے ہیں کہ انہیں روٹی سے محتاج کردیا جاتا ہے۔۔یہ ہے قارونیت جسے خدا نے تعبیر کیا ہے۔

حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کے گلے سے تین طوق اترواکرا سے آزادی سے ہم کنار کیا

یہ ظلمات تھیں جن کے اندر مصر کی غلامی کے دوران بنی اسرائیل گھری ہوئی تھی۔کہا یہ کہ ہم نے موسیٰؑ کو وحی کی راہنمائی دی تا کہ وہ اپنی قوم کوان تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔اور سینا کی وادیوں میں جہاں ان کو لایا گیا ہے ان تینوں بلاؤں میں سے

کوئی ایک بلا بھی نہیں تھی۔ملوکیت۔۔پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری تینوں کی زنجیریں توڑ کر وہ یہاں آزادی کی فضا میں سانس لینے کے لیے لائی گئی۔ یہ تھا جسے قرآن نے النور کہا ہے وہ روشنی کے اندر لے آئے حضرتِ موسیٰؑ اس قوم کو۔۔غلامی سے نکالا آزادی میں لے آئے۔ملوکیت کے استبداد سے بھی آزادی مذہبی پیشوائیت کی توہم پرستیوں سے بھی آزادی اور نظامِ سرمایہ داری کی انسانیت کش احتیاجات سے بھی آزادی۔ یہ تھی وہ آزادی کہ جسے روشنی سے تعبیر کیا قرآنِ کریم نے۔اب دیکھیے کہ ان تین گوشوں میں کس طرح سے ساری دنیا کی تاریکیاں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ یہاں یہی کہا کہ ان کی کوشش یہ ہے ارادے ان کے یہ ہیں کہ وہ خدا کی اس روشنی کو بجھا دیں تا کہ انسانیت تاریکیوں کے اندر ہی رہے۔

نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہٴ کرامؓ کا یہودیوں کے سرمایہ داری نظام اور عیسائیت کے احبار و رہبان سے مقابلہ تھا

اب آپ نے دیکھا کہ یہ اصل میں جو ٹکراو ہو رہا تھا سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ اور جماعتِ صحابہؓ ایک طرف اور۔۔ یہ ساری قوتیں یہ دوسری طرف۔خواہ وہ قریش کے جیوش اور عساکر ہوں خواہ وہ یہودیوں کی سرمایہ داری کا نظام ہو اور خواہ وہ عیسائیت کے احبار و رہبان ہوں۔ان تمام کی متحدہ کوشش یہ تھی ان کے ارادے یہ تھے کہ قرآن کا نور پھیلنے نہ پائے۔

انسانی دنیا میں مذہب کی حفاظت اور قرآن حکیم کی مخالفت ہمیشہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہ کوششیں اور یہ سازشیں چودہ سو سال سے جاری ہیں۔ایک چیز ہے! جس کی مخالفت ہوتی ہے ان تمام نظاموں کی طرف سے۔۔اور وہ ہے قرآن کی روشنی۔ یاد رکھیے! مذہب کی مخالفت کوئی بھی ان میں سے نہیں کرتا۔۔اس کی تو آزادی دیتے ہیں۔ بڑی سے بڑی مستبد حکومت کے اندر بھی مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے۔۔مذہبی پیشواؤں کو بھی آزادی ہوتی ہے کہ وہ جب جی چاہے وعظ اور نصیحت کریں' منبروں پہ کھڑے ہو کے خواہ گھنٹہ گھنٹہ' ساری ساری رات وعظ کرتے رہیں۔کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی ان کے اوپر۔ نظامِ سرمایہ داری کو تو اور زیادہ فروغ دیا جاتا ہے اس کے اندر۔ان چیزوں کی مخالفت کوئی نہیں کرتا۔۔مذہب کی مخالفت کوئی نہیں کرتا۔ مخالفت ہوتی ہے تو قرآن کے لائے ہوئے نظام کی۔اور اس مخالفت کی۔۔ابھی ہم ذکر کر رہے تھے کہ غیر مسلموں کی طرف سے یہ مخالفت تھی مشرکینِ عرب کی طرف سے' یہود و نصاریٰ کی طرف سے یہ مخالفت' ایران کی طرف سے' بازنطینی حکومتوں کی طرف سے مخالفت۔انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ براہِ راست اس کی مخالفت کرنے سے یہ دیا بجھ نہیں سکتا تو پھر اس کے لیے سازش کی گئی کہ خود مسلمانوں

کے اندر یہ تحریکیں چلائی گئیں کہ وہ اس دیے کو بجھا دیں۔ اور اس سازش کا سب سے پہلے ظہور اس نظریہ کے ماتحت ہوا۔۔قرآن ایک منفرد حقیقت ہے Unique چیز ہے لاشریک ہے اس کی کوئی مثل و نظیر نہیں ہے یا وہ قرآن ہے یا وہ غیرِ قرآن ہے۔

قرآنی نظامِ حیات کی مخالفت کے سلسلہ میں ایک گہری سازش کا آغاز مثلہ ومعہ کا تصور اور اس کی حقیقت

مسلمانوں کے اندر پہلے یہ عقیدہ پیدا کیا گیا مثلہ ومعہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ کچھ اور۔بس یہ تھا وہ پہلا تخم جو بویا گیا اس دیے کو بجھانے کی سازشوں میں۔۔قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ۔اور پھر قرآن تو اتنی چھوٹی سی کتاب۔۔اور اس کے ساتھ جو ہے پوچھو ہی نہیں کہ ضخیم در ضخیم کتابوں کا انبار جو اس کی مثل اس کے ساتھ کہا گیا۔عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔۔ایک وحی قرآن کے اندر آ گئی۔۔اُسی کی مثل اس کے ساتھ دوسری وحی روایات کی کتابوں میں آ گئی جنہیں احادیث کی کتابیں کہتے ہیں۔جنہیں نہ رسول اللہ ﷺ نے مرتب فرمایا، نہ صحابہ کرامؓ نے مدون کیا، نہ انہوں نے جمع کیا۔وہ پہلے دور میں کہیں سامنے ہی نہیں آتیں۔اڑھائی تین سو سال بعد جا کر وہ کتابیں مرتب کی گئیں اور اس طرح سے جمع کی گئیں روایتیں۔۔اس لیے ان کو روایات کہا جاتا ہے کہ وہ زبانی کلامی سنی سنائی باتیں تھیں۔کوئی لکھا ہوا ریکارڈ پہلے موجود نہیں تھا۔۔انہیں اکٹھا کیا گیا اور انکے متعلق عقیدہ یہ دیا گیا کہ یہ وحی ہے خدا کی طرف سے اور قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ ہے۔پہلا یہ عقیدہ دیا اور۔۔پھر اس کے ساتھ متوازی چلتا تھا قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل۔۔اگلا عقیدہ یہ دیا کہ قرآن کی ہر آیت کی تفسیر ان کے ذریعے سے ہوگی۔اس کے بعد عقیدہ یہ دیا گیا کہ قرآن میں اور ان میں جہاں کہیں تضاد واقع ہوگا قرآن کا وہ مطلب سمجھا جائے گا جو ان میں بیان کیا گیا ہو۔اور آگے بڑھے تو پھر یہ عقیدہ آ گیا کہ یہ قرآن کی آیتوں کو منسوخ بھی کر سکتی ہیں۔

مروجہ اسلام جو قرآن حکیم کے خلاف ہے صدیوں سے ہم پر مسلط ہے

غور فرمایا آپ نے کہ یہ دیا جو خدا کے نور کو بجھانے کے لیے کوشاں تھا۔۔باہر کی کوششوں کو تو چھوڑ دیجیے، وہ تو نمایاں ہو کے نظر آ جاتی ہیں کہ یہ مخالفین ہیں، ان کی کوششیں ہیں۔۔یہ کوششیں اندر سے کس طرح سے کی گئیں۔نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج دنیا میں جو آپ کا مروج اسلام ہے اس میں قرآن کا کوئی حصہ نہیں ہے۔۔وہ بیشتر علی الرغم، قرآن کے خلاف ہے۔یوں یہ اس نور کو بجھانے کے لیے ارادے کیے گئے۔لیکن اس نے کہا تھا کہ بہرحال ان کی پھونکوں سے یہ آسمانی قندیل نہیں بجھائی جا سکتی۔پہلی چیز تو اس کی یہ ہے اور یہ واقعی اعجاز ہے اور قرآن کے خدا کے اس دعوے کی مشہود دلیل ہے کہ قرآنِ کریم محفوظ چلا آ رہا ہے اُسی طرح سے اپنے الفاظ اور حروف میں جس طرح رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو دیا تھا۔اور اسی لیے سورۃ نور میں جو قرآن نے یہ کہا ہے کہ اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (24:35)۔

خدا تعالیٰ کی ذات کو نور سے تشبیہ دینے کا تصور غلط ہے نور السمٰوٰت والارض کے الفاظ وحی کے متعلق ہیں

یہ بھی مغالطہ ہے لوگوں کو کہا گیا ہے کہ خدا نے اپنے آپ کو خود نور سے تشبیہ دی ہے۔ اُس نے تو خود قرآن میں کہا ہے لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ (42:11) اس کی مثال بھی نہیں بیان کی جا سکتی' اس کی تشبیہ بھی نہیں بیان کی جا سکتی۔ تو یہ خدا کی ذات کی تشبیہ یا مثال نہیں ہے کہ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (24:35) ہے۔۔ یہ وحی ہے خدا کی دی ہوئی یہ وحی یہ راہنمائی ہے۔ خارجی کائنات میں بھی اسی کے دیے ہوئے قوانین ہیں جن سے روشنی ہوتی ہے اور انسانوں کی زندگی میں بھی اس کے دیے ہوئے قوانین ہیں جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں جن سے روشنی ہوتی ہے۔ اور اس چراغ کے متعلق آگے اس نے یہ کہا کہ اس کی محفوظیت کی یہ کیفیت ہے کہ جیسے ایک طاق ہو پیچھے سے بند سامنے سے کھلا دائیں بائیں سے بھی بند۔ طاق کے اندر ایک دیا ہو دیا وہ ایک شیشے کے بلوری فانوس کے اندر ہوتا کہ اس کی روشنی کے راستے میں کوئی روک اور آڑ نہ ہو۔ محفوظ ہو وہ ہر طرف سے اور روشنی اس کی بلا کسی حجاب اور پردے کے براہِ راست باہر آتی چلی جائے۔ وہ نہ شرقی ہو نہ غربی ہو۔۔ پوری نوعِ انسانی کے لیے وہ روشنی دینے والا ہو۔ قرآن کے متعلق اس نے یہ بتایا ہے کہ یہ ہے وہ نور خدا کا کہ جو ان کے بجھانے کی کوششوں سے بجھے گا نہیں۔۔ یہ مکمل ہو کر رہے گا۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ پہلی چیز تو اس کی یہ ہے کہ قرآن محفوظ چلا آ رہا ہے باوجودیکہ اتنی کوششیں اس کے ہٹانے کے لیے کی گئیں۔۔ غیروں نے بھی کیں اور اپنوں کے ہاتھوں سے بھی کوششیں ہوتی چلی گئیں لیکن۔۔ قرآن محفوظ چلا آیا۔ اگلی بات اگلی آیت میں ہے میں وہ عرض کرونگا کہ قرآن نے پھر دعویٰ یہ کیا ہے۔۔ یہ دونوں آیتیں اکٹھی ہیں کہ یہ ارادہ کرتے ہیں کہ اس نور کو بجھا دیں۔۔ دوسرے مقام پہ بھی آئی ہے حوالہ لکھ لیجیے (61:8)۔ ایک اور مقام پہ وہ آیت آئی ہے (48:28)۔ اور وہ آیت ہے ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ (9:33) یہ عظیم آیۂ جلیلہ ہے۔ کہا کہ خدا نے اپنے رسول کو یہ راہنمائی اور ایک حقیقت پر مبنی نظام دے کر بھیجا اور۔۔ بھیجا اس لیے کہ وہ دنیا کے تمام باطل نظاموں پر غالب آ کر رہے خواہ مشرکین کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔ قوانینِ خداوندی کے ساتھ اور قوانین ملانے والے اس قسم کے نظام جو دنیا کے اندر چاہتے ہیں کہ رائج ہوں' انہیں یہ بات کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے۔۔ خدا اپنے اس نظام کو جو اس نے اس رسول کی وساطت سے بھیجا ہے' وہ باقی نظامہائے باطل کے اوپر غالب کر کے رہے گا۔ یہ ہے جو میں نے کہا ہے کہ عظیم آیت ہے قرآنِ کریم کی۔

دنیا بھر میں تمام مسلمانوں کی ذلت اور رسوائی کی وجہِ جواز ہمارا خود ساختہ مذہب ہے' دینِ خداوندی نہیں

ہم جو دیکھ یہ رہے ہیں کہ ساری دنیا میں مسلمان غیر مسلموں کے مقابلے میں ذلیل اور خوار ہیں تو۔۔ یہ غالب کیا آیا۔ یہ تو مغلوب

ہو کے رہا یہ تو مفتوح ہو کر رہا اور دعویٰ یہ تھا کہ یہ تمام نظامہائے حیات پر' جو باطل کے نظام ہیں' ان کے اوپر یہ غالب آ کر رہے گا۔ ذہن میں یہ اعتراض اٹھتا ہے۔ مخالفت کی غرض سے نہ بھی اٹھے' دیانتداری سے بھی اٹھ سکتا ہے یہ۔ خود ایک دیانتداری سے غور کرنے والا مسلمان بھی جب سوچے اور حقیقت اس کے سامنے واضح نہ ہو تو اس کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوگا کہ صاحب یہ دعویٰ پھر کیا ہے کہ یہ باقی نظاموں پر غالب آ کر رہے گا۔ تو مسلمان تو ساری دنیا کے اندر ذلیل ہے' باطل کے نظام غالب آ رہے ہیں۔ یہ بات سمجھنے کی ہے۔ کیونکہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اگر مخالفت کی نیت سے یہ اعتراض نہ بھی ہو' جزلی بھی یہ بات ذہن میں پیدا ہو سکتی ہے حقیقت کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جو قرآن کی رو سے آنے والے نظام یعنی دین اور مذہب میں فرق نہیں کیا۔۔ وہ مذہب کی شکل اختیار کر گیا۔ قرآن نے تو مذہب کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔ پہلی سازش اسلام کے خلاف یہ تھی کہ یہ دین نہ رہے' یہ ایک نظامِ زندگی نہ رہے بلکہ مذہب میں تبدیل ہو جائے۔ تو خدا نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اگر تم اسلام کو ایک مذہب بنا لو گے تو یہ مذہبِ اسلام باقی مذاہب کے اوپر غالب آ کر رہے گا۔

مذہبی ماحول میں پرورش پانے والی شخصیت پرویز کی اوائل عمری کے بعد کے دور کی کہانی خود ان کی اپنی زبانی

یہ آپ کے ہاں جو مناظرے اور مباحثے ہوتے چلے آئے۔ آج کل تو وہ

چناں قحط سالے شود اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

وہ اس قسم کی اقتصادی بدحالیاں ہوئی ہیں کہ اس قسم کی چیزیں جو پہلے آتی تھیں یہ بس ایک قسم کی شاعری تھی جو پیٹ بھر جاتا تھا تو شروع ہو جاتی تھیں یہ چیزیں۔۔ اب یہ نہیں ہو رہیں آج کل۔ لیکن اس سے ذرا پہلے ہمارے اپنے دور میں یعنی بچپن میں ہی نہیں' اس کے بعد کے دور تک۔۔ ہم خود ان میں بڑے زور وشور سے حصہ لیتے تھے' بڑے زور سے مباحثے ہوتے تھے۔ اور ذاتی بات آ جاتی ہے میں تو بٹالہ کا رہنے والا تھا۔ بڑا ہی مذہبی شہر تھا۔ شدت کے ساتھ ہر فرقے کے لوگ وہاں موجود تھے اور قادیان کا تو وہ باب القادیان تھا' ریلوے سٹیشن ہی بٹالہ تھا قادیاں کا۔ اور یہ ایک چیز مسلسل چلتی تھی وہ جیسے دریا کے کنارے کے گاؤں میں رہنے والے بچے'' جماندرو تیرا کی ہوندے نیں نا' ایہہ بٹالے دے بچے جماندرو مناظر ہوندے سن' ہر جگہ ایناں دا اِٹ کھڑ کا لگا رہندا سی' سکولوں چھٹی ہونی تے ٹیشن چلے جانا''۔ ایک آدھ گاڑی آیا کرتی تھی اس زمانے میں اور وہیں اترنا ہوتا تھا ان مرزائیوں نے' قادیانیوں نے۔۔ وہاں جانے کے لیے کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا۔ تو سٹیشن سے لے کے وہ جو اڈا تھا جہاں سے قادیان کے لیے یکے چلا کرتے تھے' اچھا خاصا فاصلہ تھا۔۔ اب ان کو وہ

میل بھر نظر آتا ہے اُس زمانے میں تو وہ بڑا المبا نظر آیا کرتا تھا۔

مختلف نظریات سے بھر پور پورے جوش وجذبے کے ساتھ مناظروں کے شور وشغب کے اجتماعات کی شکل وصورت

تو سٹیشن سے انہوں نے اترنا اور اڈے تک پیدل چلنا ہوتا تھا۔اور کیفیت یہ ہے کہ بیچارے اتر رہے ہیں چل رہے ہیں۔۔دائیں بائیں جھرمٹ ان کے ساتھ بحث چل رہی ہے' مناظرہ ہو رہا ہے۔ان کی بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ چپ نہیں کرتے۔چلا جا رہا ہے۔ یعنی یہ ایک مسلسل چیز ہوتی ہے۔پھر شہر کے اندر اہلِ حدیث اور حنفی۔۔گڑھ ہوتا تھا ان کا۔۔شیعہ حضرات کا بھی ایک محلّہ بڑا خاصا ہوتا تھا۔۔آریا سماج وہاں بڑے زور کا ہوتا تھا۔۔عیسائیوں کے سکول بھی تھے عیسائیوں کے مرکز بھی تھے وہاں تبلیغ کے۔۔وہ عجیب وغریب قسم کی ایک بستی تھی صاحب۔۔شدید قسم کی مذہبی۔تو آپ سوچیے کہ جہاں اتنے مذہب شدت سے اکٹھے ہو جائیں اور روٹی مل جائے آسانی سے۔۔تو پھر مناظروں کے سوا اور کام کیا تھا اور یہ بڑا کارِثواب سمجھا جاتا تھا۔جب مناظرہ فتح کر کے ہم آتے تھے اور دونوں فریق ہی اپنے آپ کو فاتح سمجھا کرتے تھے۔۔اُن کا بھی جلوس نکلا کرتا تھا ہمارا بھی جلوس نکلا کرتا تھا۔مذہب میں تو قولِ فیصل ہو ہی نہیں سکتا۔

مذہب اور دین میں پائے جانے والے فرق کو نمایاں کرنے کی سعادت علامہ پرویزؒ کو حاصل ہوئی

میں کہہ یہ رہا تھا کہ مذہب کا ٹکراؤ مذہب سے مسلمان کرتے تھے اور دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ خدا نے کہا ہوا ہے کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) اس لیے ہمارا مذہب باقی مذاہب کے اوپر ضرور غالب آ کے رہے گا کوئی نہیں سوچتا تھا کہ اس نے دین کہا ہے مذہب تو نہیں کہا۔لیکن یہ چیز تو ان کے ذہن میں تھی نہیں۔اگر اس کو ذاتی مدح سرائی نہ کہی جائے تو میں عرض کرونگا کہ اللہ کا احسان ہے اس دور میں یہ چیز کہ یہ دین ہے مذہب نہیں ہے۔۔دین اور مذہب میں فرق اتنا نمایاں طور پر یہ اس عاجز کی طرف سے ہی بات آئی ہے اور۔۔آج اللہ کا شکر ہے کہ بڑی عام ہو رہی ہے۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ محراب ومسجد سے بھی صورت یہ ہے کہ پہلے دو گالیاں پرویز کو آخر میں دو گالیاں پرویز کو درمیان میں ساری چیز کہ اسلام مذہب نہیں ہے' دین ہے۔اللہ کا شکر ہے ان گالیوں کے صدقے ہی میں بات کہیں چل پڑی۔قرآن میں دین کو قرآن دین کے مقابل میں لایا ہے۔۔یہ نہ مذہب ہے نہ اس کو مذہب کے مقابلے میں لایا ہے۔دوسری چیز جو ہماری غلطی ہے وہ یہ کہ ہم نے مسلمانوں کو اور اسلام کو ایک دوسرے کے مرادف سمجھ لیا ہے۔ادھر سے قرآن کی یہ آیت آتی ہے کہ یہ تمام نظامہائے باطل پر غالب آ کر رہے گا۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ مسلمان قرآنی اسلام کے ترازو میں پورے اترتے ہیں

ہم دیکھتے ہیں کہ ساری دنیا میں مسلمان ذلیل ہے۔تو ہم اس نتیجے پہ پہنچ جاتے ہیں کہ پھر اسلام غالب کیسے ہے۔یعنی مسلمانوں کا ذلیل ہونا' ہم اسلام کی ذلت سمجھتے ہیں۔اب یہ بات بھی ساری دنیا کو سمجھانے کی ہے۔سمجھانے کے لیے تو پہلے یہ بات ماننی پڑے گی نا کہ بابا ہم جو مسلمان ہیں' ہم اسلام والے نہیں ہیں۔۔اس کی جرأت نہیں کرتے مسلمان' کہنے کی۔ورنہ اگر یہ بات دنیا کو سمجھادی جائے کہ بات اسلام اور دین کی ہوگی' مسلمانوں کی نہیں ہوگی' مروجہ مذہب اسلام کی نہیں ہوگی۔۔پھر بات واضح ہو جاتی ہے۔اس کی جرأت کسی میں نہیں ہے کہ وہ یہ اعتراف کرے اس بات کا۔نتیجہ یہ کہ یہ اعتراضات پڑتے ہیں۔۔انہیں تو برداشت کرتے چلے جاتے ہیں اور۔۔پھر توجیہات جو ہیں Justificatory Reasons جسے کہتے ہیں وہ تو ہر شخص دیدیتا ہے۔بت پرست اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے چند دلیلیں دے کر۔۔گائے کا پوجنے والا بھی اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے۔۔سانپ کی پرستش کرنے والا بھی اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے۔یہ فریبِ نفس کا کیا ہے۔ہم بھی مطمئن کر لیتے ہیں اپنے آپ کو یہ کہہ کے کر کہ ہاں صاحب ہمارے جیسا مذہب دنیا میں نہیں ہے۔۔ذلیل وخوار ہیں تو کوئی بات نہیں ہے یہ عارضی چیز ہے۔۔یہ اس دنیا کی عزت نہیں کہا گیا تھا' آخرت کی عزت کہا گیا تھا صاحب۔۔یہاں ٹھیک ہے ذلیل وخوار ہیں۔۔وہاں دیکھیے گا کہ ہر قسم کی عزت اور سرفرازیاں ہمارے ہی حصہ میں ہونگی۔نہ کوئی وہاں سے دیکھ کے آئے' نہ کوئی جھٹلائے۔

مروجہ خودساختہ اسلام کی اصلیت کو سمجھنے اور تسلیم کیے بغیر قرآنی تعلیم ذہن نشین ہو ہی نہیں سکتی

یعنی میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیز جرأت کی چیز تھی یہ کہنے کی کہ ہمارا مروجہ اسلام' قرآن کا اسلام نہیں ہے۔۔مذہب ہے۔۔ہم مسلمان اسلام کے پابند نہیں۔اور آگے پھر بات چلتی کہ ہاں آ ؤاب گفتگو ہم کریں کہ یہ جو قرآن نے کہا تھا کہ یہ نظام تمام نظامہائے باطل پر غالب آ کر رہے گا۔۔تم جو جی میں آئے کرلو یہ غالب آ کر رہے گا۔اس نقطے کے اوپر اگر بات ہوتی تو پھر ہم بتا سکتے دنیا کو کہ غالب آتا ہے یہ۔یہ الدین ہے کیا جو قرآن نے دیا ہے؟ یہ زندگی کے نظام کا ایک ضابطہ ہے کچھ اصول ہیں کچھ قوانین ہیں کچھ اقدار ہیں کچھ Values ہیں جو وحی کی رو سے دی گئی ہیں' قرآن کے اندر منضبط ہیں۔ان کا نام عملی شکل میں جب آتا ہے تو یہ الدین کہلاتا ہے۔قرآن کا کوئی اصول' کوئی قانون' کوئی قدر جب انسانی معاشرے میں اس کے اوپر عمل شروع ہوتا ہے تو وہ حصہ' وہ دین کا حصہ بن جاتا ہے۔

زندگی کے میدان میں خودساختہ مذہبی اقداراوروحی کی عطا کردہ اقدار میں بنیادی فرق ہے

یہ پھر سن لیجیے! یہ کچھ اصول ہیں' اقدار ہیں' قوانین ہیں جو قرآن نے دیے ہیں۔۔غیر متبدل ہیں' مکمل ہیں اور اس کے ساتھ کہا کہ یہ غالب آ کر رہیں گے ہر اس نظام پر ہر اس اصول اور قدر پر کہ جو وحی کی نہیں ہوگی انسانوں کے ذہن کی تراشیدہ ہوگی۔اب دو باتیں آ گئیں،انسانی ذہن کے وضع کردہ وہ اصول اقدار قوانین جن کے مطابق یہ انسان اپنا معاشرہ متشکل کرتا چلا آ رہا ہے' اس کے مقابلے میں وحی کے عطا کردہ اصول اقدار قوانین جو عملاً کسی معاشرے کے اندر جب داخل ہو جائیں تو یہ جس طرح کا ایک نظام قائم کرتا ہے اور دوسری طرف اب جسے اسلام کہا جائے گا' جسے الدین کہا جائے گا قرآن کا۔دین وہ بھی قرآن نے کہا ہے **لِیُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّیۡنِ كُلِّهٖ** (9:33) جتنے بھی اور ادیان ہیں ان کے اوپر یہ غالب آئے گا۔ان کو قرآن نے دین کہہ کے پکارا ہے۔۔نظامِ زندگی۔انسانی ذہن کے تراشیدہ وضع کردہ جتنے اصول ہیں جب انسانی معاشرہ ان کے مطابق متشکل ہوگا تو وہ ایک الدین بنے گا۔اِدھر سے قرآنی اصول و اقدار کے مطابق جب ایک معاشرہ متشکل ہوگا تو یہ دین بنے گا۔کہا کہ یہ جو دین ہے' یہ غالب آ کے رہے گا ان کے اوپر۔

انسانی اقدار کے سلسلہ میں صدیوں سے عقلِ انسانی کا طریق اوراس کا ماحصل

اب آپ یہ دیکھئے کہ ان چودہ سو برس میں تاریخ ہمیں بتاتی کیا ہے۔؟؟ ظہورِ قرآن کے زمانے میں جتنے نظام زندگی یہاں قائم تھے' دنیا کے کسی حصے میں بھی وہ کیوں نہ ہوں۔انسانی ذہن کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق ہیں۔موٹے موٹے اصول لے لیجئے۔بادشاہت کو اس زمانے میں ابدی دائمی قائم رہنے والا نظام قرار دیا جاتا تھا کہ حکمرانی یا حکومت کا نظام ہی بادشاہت ہے۔۔ساری دنیا میں بلا استثنٰی۔پھر بادشاہ کو ہندوستان میں خدا کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔۔ایران میں اسے ظل اللہ خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔۔عیسائیوں کی مملکت میں اسے Divine Rights کا حامل سمجھا جاتا تھا' خدائی اختیارات کا حامل۔۔چین اور جاپان کے جو علاقے ہیں ان کی کنفیوژش ازم وغیرہ جو مذاہب تھے ان کے' ان میں یہ بادشاہ کی پرستش ہوتی تھی اس کو خود معبود سمجھا جاتا تھا۔مصر کی بھی یہی کیفیت تھی۔اس زمانے میں یہی دنیا تھی جنہیں متمدن یا مہذب دنیا کہا جاتا ہے۔

ارشادِ خداوندی کے مطابق کسی انسان کوانسانوں پرحکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے

ان سب میں بادشاہت تھی۔ایک شخص کو حق حاصل تھا کہ وہ باقی تمام انسانوں پر حکومت کرے اور اس کے حق حکومت کو خدائی اختیار کہا جاتا تھا۔یعنی اس نے خود یہ اختیار نہیں سنبھالے۔خدا نے یہ اختیار اس کو دیے ہیں۔اس لیے ان سے انکار خدائی اختیار سے انکار

ہوگا‘اسی لیے اس کی سزا موت تھی۔

بادشاہت۔ایک اصول نظام قائم کرنے کا‘ اس اصول کے مطابق دنیا کے اندر جتنے نظام تھے وہ سارے بادشاہت کے نظام تھے۔ اسے آپ دین کہیں گے ناں۔قرآن نے آ کر کہا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کسی دوسرے انسان کے اوپر حکومت کرے۔اس نے کہا کہ زندگی کا جو تمہارا اجتماعی نظام ہے‘اس کے لیے چند اصولوں کی ضرورت ہے‘ چند ضوابط کی ضرورت ہے‘ کچھ پابندیوں کی ضرورت ہے۔کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ پابندیاں اور اصول وضع کرے۔وہ خدا کی طرف سے ملے ہیں اور وہ قرآن کے اندر ہیں۔

معاملات زندگی کے حل کے لیے باہمی مشاورت قرآن حکیم کا بنیادی اصول

ان اصولوں کے مطابق ایک نظام متشکل ہوگا اور اس میں تمہارے معاملات **وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38)** باہمی مشورے سے طے ہوجائیں گے۔ یہ اس نے دوسرا اصول دیا کہ اسے اگر تم عملاً متشکل کرو گے تو یہ الدین ہوگا ان ادیان کے مقابلے میں جو اس زمانے میں ساری دنیا میں رائج تھے۔اب آپ کے ذہن میں آ گئی بات کہ دین کا مقابلہ دین کے ساتھ کس طرح سے ہوا۔قرآن نے یہ کیا۔سب سے پہلے تو اپنے ہاں اس کو قائم کر کے دکھایا‘ بادشاہت ختم کی‘ باہمی مشاورت سے ایک نظام قائم کیا۔یہ دنیا کا پہلا تجربہ تھا۔ پہلا میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انبیائے کرامؑ نے تو اپنے اپنے مقام میں یہ تجربے اپنی جگہ کیے ہونگے۔ٹھیک ہے۔وہ یہی پیغام لے کے آئے تھے۔اُس زمانے میں جب قرآن نازل ہوا تو اس دنیا میں کہیں بھی یہ نظام نہیں تھا۔قرآن نے نظری طور پہ یہ اصول دیا اور نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہؓ کے ساتھ اس نظام کو متشکل کیا۔

بازنطین حکومت کی طرف سے اس مشاورتی نظام کی مخالفت، بادشاہی نظام کا تحفظ ہی تو تھا

یہ تھا الدین کا ایک گوشہ۔ساری دنیا کو اس کی مخالفت کرنی چاہیے تھی کیونکہ وہاں تو بادشاہت تھی۔ بادشاہت اس کو کس طرح برداشت کر لیتی ایسے نظام کو جس میں بادشاہت کا وجود نہ رہے۔اب آپ نے دیکھا کہ ایران نے کیوں مخالفت کی تھی‘ بازنطین حکومت نے کیوں مخالفت کی تھی۔اس نظام کے تابع بادشاہت کا وجود ہی باقی نہیں رہتا تھا۔یہ کر کے بتا دیا۔کچھ عرصے کے بعد مسلمان کا دین بھی مذہب میں بدل گیا اور اس میں پھر بادشاہت آ گئی۔

وحی کے مقابلے میں عقل انسانی کا دوسرا نام تجربہ گاہ ہے

اس چودہ سو سال میں جو انسان چلے ہیں تو اب وہ طریق رہ گیا جس کو عقل کا تجرباتی طریق کہتے ہیں Trial & Error۔انسانی

عقل کرتی یہ ہے کہ ایک نظام وضع کرتی ہے' اس پہ عمل کرتی ہے پھر اس کے تباہ کن' ہلاکت آفریں' نتائج اس کے سامنے آتے ہیں۔ ٹھوکریں کھاتی ہوئی' ہڈیاں تڑواتی ہوئی' اس نظام کو چھوڑتی ہے۔ پھر اس کی جگہ ایک اور اصول وضع کرتی ہے پھر اس کے مطابق ایک نظام قائم کرتی ہے پھر اس نظام کے ہلاکت آفریں نتائج سامنے آتے ہیں' پھر اس کو چھوڑتی ہے۔ عقل کا یہ تجرباتی طریقہ ہے۔ عقل یہ کرتی چلی جائے اور اس کے مطابق ٹکراؤ بھی ہوتے چلے جائیں گے۔ آپ فرمائیے کہ اس چودہ سو سال کے عرصے کے بعد آج جبکہ ہم گفتگو کر رہے ہیں' وہ قرآن کا دیا ہوا نظریہ کہ بادشاہت کا نظام غلط ہے' باہمی مشاورت سے معاملات طے ہونے چاہئیں' یہ اصول غالب آیا ہے یا وہ اصول غالب رہا ہے جو اس زمانے میں تھا کہ بادشاہت ہی صحیح نظام ہے؟ کونسا اصول غالب آیا ہے؟

عقل وفکر سے کام نہ لینے والی قوم دین خداوندی کو اپنانے میں سب سے پیچھے ہوتی ہے

ساری دنیا آج جمہوریت پہ پہنچی ہوئی ہے۔ بادشاہتیں' تو ایک ابھی انگلستان کی ہے لیکن اسے وہ کہتے ہیں کہ وہ تاش کے پتے کا بادشاہ ہوتا ہے' وہاں کی بادشاہت نہیں ہے وہ ایک Tradition ہے۔ اگر کہیں ہے تو خیر سے مسلمانوں کے ہاں ہی ہیں یہ چیزیں۔ آپ حیران ہونگے کہ الدین کی طرف عقل وفکر کی رو سے باقی غیر مسلم قومیں جلدی آتی ہیں اور ہم سب سے پیچھے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں تو عقل وفکر سے کام لینا حرام ہے۔ یہ تو مقلد ہیں۔ کچھ اپنے مذہبی پیشواؤں کے مقلد' کچھ باقی قومیں جو دنیا میں ترقی کرتے ہیں ان کے مقلد۔ تو مقلد تو ہمیشہ پیچھے رہتا ہے۔ اور قرآن نے تو ان کے لیے کہا تھا اماما للمتقين ان کا مقام بتایا تھا کہ جو سب سے آگے چلنے والا ہو۔ بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ مسلمان ان چیزوں کے قبول کرنے میں پیچھے اس لیے ہوتے ہیں کہ یہ اپنی عقل وفکر سے کام نہیں لیتے' دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

عقل وفکر کو خیرباد کہنے کے بعد مقلدین کے سہارے زندگی بسر کرنے والی قوم ہمیشہ چشم شاہین سے محروم رہتی ہے

مسجد میں گئے تو ''جو نیت امام دی او نیت میری' پیچھے امام دے اللہ اکبر' جو اوہدی نیت او میری نیت یعنی آپ اے وی فیصلہ نئیں کرنا پئی میری نیت کی ہے''۔ تو جو نیتوں تک میں مقلد ہو وہ زندگی کے عملی شاہراہِ حیات پہ مقلد کیوں نہ ہوگی۔ وہاں یہ تقلید' باہر آ کے دیکھا کہ اچھا! اور یورپ میں یہ چیز ہو رہی ہے' لوگ بہت اونچے چلے گئے'' ایناں نے کہیا اللہ اکبر' جو نیت اوس امام دی او میری' اللہ اکبر۔ اوہناں نے دھکے کھادے' ایناں نے دھکے کھادے' فیر کوئی ہور امام لے آندا' اے کون ہے؟ اے شافعی مذہب دا امام ہیگا اے

یعنی ہُن رشیا ول تکن لگ پئے'' مقلد کا مقلدر ہا ہے۔

عالم میں جمہوریت کے باوجود ان میں باہمی ٹکراؤ کی بنیادی وجہ وحی کے غیر متبدل اصولوں سے بے اعتنائی ہے

ہم میں تبدیلی ہوئی ہے تو یہ بغیر مزاحمت کے نہیں ہوئی۔ پوچھیے نہیں صاحب! بادشاہت کو اڑانے میں اور جمہوریت تک پہنچنے میں کتنی مزاحمت ہوئی ہے۔قرآن کے دیے ہوئے اصول کو باہر لانے کے لیے' خواہ مسلم قوم ہے یا غیر مسلم قوم ہے' جو قوم بھی اس کو عملاً متشکل کرنا چاہے گی' اس اصول کی مخالفت ضرور ہوگی۔ جمہوریت یہاں تک ابھی تو پہنچی ہے لیکن یہ بھی قرآنی جمہوریت نہیں ہوئی۔ اُس جمہوریت میں یہ تھا کہ یہ فریم ورک ہے' حدود ہیں' جن کے اندر تم باہمی مشاورت سے کام کر سکتے ہو۔ وہ حدود غیر متبدل ہیں اور خدا کی طرف سے دی ہوئی حدود ہیں۔ یہ جو ابھی تک جمہوریت کے باوجود انسانوں میں' باہمی اقوام میں ٹکراؤ ہو رہا ہے' اسی لیے ہے کہ وہ حدود ان کے پاس ابھی نہیں ہیں۔ انسانیت ابھی یہاں نہیں پہنچی لیکن اس کے بعد پہنچے گی۔ اس جمہوریت کے ہاتھوں بھی یہ تنگ آ رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ اقوامِ عالم میں کوئی چیزیں ایسی ہونی چاہئیں کہ جنہیں سب قومیں تسلیم کریں اور کوئی قوم بدل نہ سکے۔

آج عقل انسانی انہی حدود اللہ کی تلاش میں سرگرداں ہے

عزیزانِ من! سنیے کہاں پہنچ رہے ہیں۔ یہ Discussions آج ہوتی ہیں ان اقوام کے اندر۔ یہ جو کوششیں ہو رہی ہیں' League of Nation کی پہلے ہوئی اور اب United Nations وغیرہ کی ہوئیں' یہ کیا کوششیں ہیں؟ کوششیں یہ ہیں کہ اقوامِ عالم بیٹھ کے کوئی ایسی حدیں تجویز کر لیں کہ جو غیر متبدل ہوں اور کوئی قوم ان حدوں کو توڑ نہ سکے۔ اس کا احساس ان کے دل میں آ گیا ہے کہ جمہوریت اس کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اب وہ پابندیاں اور حدیں ہیں وہ نہیں مل رہیں۔ ہر قوم جو پابندی اور حد تجویز کرتی ہے اس میں اپنی قوم کا مفاد اس کو پیشِ نظر ہوتا ہے۔ باقی قوموں کے وہ خلاف جاتی ہے' دوسری قومیں اسے مانتی نہیں ہیں۔ اگر کہیں لفظی طور پر ایک چارٹر پہ دستخط بھی کر دیتی ہیں تو جب گھروں میں جاتی ہیں تو عمل اس کے خلاف کرتی ہیں۔ آ جائے گی' انسانیت کو یہاں بہر حال آنا ہی ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت دنیائے اقوام کی حالتِ زار

اُس دور میں جب قرآن نازل ہوا ہے' ساری دنیا میں غلامی ایک مسلمہ تھا۔ ان کے فلاسفرز اس کے حق میں دلائل دیا کرتے تھے'

مذہبی پیشوائیت اسے خدا کی طرف سے مقرر کردہ کہتی تھی کہ خدا کی تقدیر بعض انسانوں کی ہوتی ہے کہ وہ غلام بن کے رہیں۔اور مستبد قوتیں بہرحال غلاموں کو جکڑ کے رکھتی تھیں۔اس زمانے میں غلامی کے خلاف کہیں آواز نہیں اٹھتی تھی' خود عرب کی ساری معاشرت اور معیشت جو تھی غلاموں پہ منحصر تھی۔قرآن نے آ کے یہ اعلان کیا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (17:70) ہم نے ہر انسانی بچے کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ (3:79) کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے خواہ اس کو Logislation کے اختیارات ہوں یا Executive کے اختیارات ہوں خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو کہ وہ کسی انسان سے یہ کہے کہ تم میرے غلام ہو۔کس قدر انقلاب آفریں تھا یہ پیغام۔قرآنِ کریم نے یہ اصول دیا انسانی معاشرے کے متشکل کرنے کے لیے۔ساری دنیا نے اس کی مخالفت کی۔آپ کہیے کہ اس چودہ سو سال میں انسانی عقل نے تجرباتی طریق سے جو راستہ اختیار کیا اور جس نتیجے پہ پہنچی' وہ قرآن کے اس اصول کی فتح ہے یا وہ اس کے خلاف گئی ہے۔اس کے خلاف مسلمان گیا۔ United Nation میں جب چارٹر بن رہا تھا تو اس میں ایک شق تھی: غلامی کی تنسیخ۔اس میں یہ ہے کہ غلامی منسوخ کی جاتی ہے۔وہاں جتنے بھی ممبر تھے اقوام کے انہوں نے اس پہ دستخط کر دیے لیکن آپ کے ہاں کی سب سے بڑی اسلامی مملکت سعودی عربیہ جو تھی انہوں نے انکار کر دیا یہ کہہ کے کہ یہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔

1973ء میں مرکزی مجلس آئین ساز کے اجلاس میں مولانا نعمت اللہ نے کہا کہ غلامی کو منسوخ قرار دینا کتاب وسنت کے خلاف ہے

عزیزانِ من! بات تو پرانی ہے' یہ آپ نے یکم مارچ کا پرچہ دیکھا ہے' مملکتِ اسلامیہ پاکستان کی مرکزی مجلسِ آئین ساز کا اجلاس ہوا۔ Constitution میں سرِفہرست لکھا گیا ہے کہ یہ اسلامی مملکت ہے' اس کا Religion اسلام ہوگا' کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔کتاب وسنت کے علم کے ایک اجارہ دار مولانا نعمت اللہ نے وہاں اٹھ کے تقریر کی۔یہ مارچ کے پرچے میں آیا ہے۔انہوں نے کہا کہ دعویٰ اس Constitution کا یہ ہے کہ اسلام کے مطابق ہوگا اور کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا' خود اس کے اندر سب سے بڑی شق جو ہے کتاب وسنت کے خلاف ہے' کہا کونسی شق؟ کہا اس میں غلامی کو منسوخ کیا گیا ہے۔یہ چیز اسلام کے خلاف ہے' کتاب وسنت کے خلاف ہے جو غلامی کو منسوخ قرار دیا گیا ہے۔

مولانا نعمت اللہ کی طرف سے ایک ایک لونڈی رکھنے کی اجازت بھی طلب کی گئی

اوراس میں انہوں نے لکھا ہے (میری بیٹیاں معاف رکھیں بات کہنی پڑتی ہے) کہ اس کے اندر یہ Provision ہونی چاہیئے عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے کی بات نہیں کرتا آپ کے ہاں کی مجلسِ آئین ساز میں تین دن پہلے یہ تقریر ہوئی ہے۔ کہا کہ اس میں یہ Provision ہونی چاہیے کہ جو شخص ایک سے زیادہ آزاد شادیاں کرسکنے کی استطاعت نہ رکھ سکتا ہو' اسے ایک لونڈی مہیا کی جائے' کہتا ہے آئین میں یہ شق ہونی چاہیے۔ عزیزانِ من! کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ ساری دنیا میں براڈ کاسٹ ہوئی ہے یہ تقریر۔ ایک اسلامی مملکت وجود میں آئی' انڈیا سے الگ ہونے کا ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ وہاں ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر نہیں کرسکتے تھے' ہم اپنی مملکت بنائیں گے جہاں ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر کریں۔ ثبوت اس دعوے کا یہ ہے کہ ہندوستان نے اپنے ہاں غلامی منسوخ کردی ہوئی ہے۔ وہاں ہم رہتے تھے تو یہ کہتے تھے کہ ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر نہیں کرسکتے تو یہاں بھی اسلام کے مطابق زندگی ہونی چاہیئے' آئین میں یہ شق ہونی چاہیے کہ غلامی منسوخ نہیں کی جائے گی اور یہ چیز ہونی چاہیے کہ جو ایک سے زائد شادیاں کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو' اسے ایک لونڈیا مہیا کی جانی چاہیے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ زمانہ' انسان' خالص عقل کی دلیل سے بھی ان چیزوں کے اوپر پہنچ رہا ہے جو قرآن کے مطابق ہیں۔ اوراس میں سب سے آخر میں جو لوگ آتے ہیں' وہ خود مسلمان ہیں۔ لیکن بات تو یہ تھی کہ قرآن نے دعویٰ کیا تھا کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) کیا اس دعوے کا ثبوت تاریخی شہادات دے رہی ہیں یا نہیں؟

14 سو سال پہلے نظام سرمایہ داری کے خلاف قرآن حکیم کی آواز

نزولِ قرآن کے زمانے میں نظامِ سرمایہ داری ساری دنیا کا مسلمہ نظام تھا' کہیں اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی تھی۔ قرآنِ کریم نے آکر یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذرائع پیداوار انسانوں کو مفت دیے ہیں' کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ ان پر ذاتی ملکیت رکھے۔ اور ایک جماعتِ مومنین جو ہم پیدا کررہے ہیں' جو اس دین کی حامل ہوگی' اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ محنت کرے گا' کم از کم اپنی ضروریات کے مطابق لے گا اور اس سے فاضل جو کچھ ہوگا' وہ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے دیدے گا۔ مال کا جمع کرنا یہاں حرام قرار دیدیا۔ چودہ سو سال پہلے کی بات ہے۔ اب آپ نے سوچا کہ اس کی مخالفت کیوں ہوئی تھی' کیوں بیاسی جنگیں لڑنی پڑی تھیں۔ ساری دنیا نے مخالفت کی تھی۔ مومنین نے یہ نظام قائم کرکے بھی دکھا دیا۔ اس کے بعد پھر یہ دین' مذہب میں بدل گیا' نظامِ سرمایہ ان کے ہاں Promote ہوگیا۔ چودہ سو سال تک انسانی عقل نے مختلف تجرباتی طریق اختیار کیے۔ اوراس کے بعد ہم پھر آج کے دور کی بات کرسکتے ہیں' آنے والے کی تو ہم نہیں کرسکتے' غیب کا علم نہیں ہے۔ آج کے دور تک انسان اس نتیجے پہ پہنچا ہے۔

مسلم ممالک کی طرف سے سرمایہ داری نظام کے خلاف اُٹھنے والی آواز کی مخالفت

آپ سوچیے کہ قرآن کا دیا ہوا جو نظام یا اس کی شق ہے' وہاں پہنچا ہے یا جو اس زمانے میں باطل نظام مسلط تھے' ان تک پہنچا ہے۔ دنیا کے آج Capitalist Countries بھی یہ کہنے پہ مجبور ہو گئے ہیں کہ Welfare State ہونی چاہیے۔ اپنے مقام سے چھوٹی سطحیں' آ رہی ہے یہ چیز' ساری دنیا میں آ رہی ہے۔ یہاں بھی جو سب سے پیچھے ہیں آپ کے مسلمانوں کے ممالک ہیں' خود آپ کے ہاں مخالفت ہو رہی ہے' مخالفت دلیل و برہان کی رو سے نہیں ہو رہی' کہتے ہیں اسلام کے خلاف ہے۔

زمین پر حق ملکیت' خدا کا شریک بنانے کے مترادف ہے جب کہ عقلِ انسانی وحی کے معیار پر پوری اتر ہی نہیں سکتی

Divine Rights of Private Property ذاتی ملکیت کے خدائی اختیارات۔ اور خدا نے یہ کہا تھا کہ جو تم زمین کو ذاتی اختیارات اور ملکیت میں لے لیتے ہو فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا (2:22) خدا سے ورے تم ان کو خدا بنا لیتے ہو۔ اب یہ حقِ ملکیت کو خدائی اختیارات دے رہے ہیں' بات تو ٹھیک ہے وہ تو تھی ہی خدا کی۔ عزیزانِ من! میں پوچھ رہا ہوں۔ یہ تین شقیں میں نے دی ہیں آگے چلوں گا تو اور شقیں بھی آ جائیں گی۔ قرآنِ کریم نے نسلی امتیازات' نسلی افتخارات' ان کو جڑ سے کاٹ کے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ ہر انسان پیدائش کے اعتبار سے' انسان ہونے کی جہت سے' یکساں واجب التکریم ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں آخری بات یہ فرمائی تھی کہ یاد رکھو! تمہارا خدا بھی ایک ہے' اصل کے اعتبار سے انسانیت بھی ایک ہے' نہ کالے کو گورے پہ فوقیت ہے' نہ گورے کو کالے پہ' نہ عربی کو عجمی پر فوقیت ہے' نہ عجمی کو عربی پر فوقیت ہے' تمام انسان برابر ہیں۔ اور عملاً یہ کر کے دکھا دیا کہ حبش کے غلام بلالؓ کو قریش کا سب سے عزیز عمرؓ' سیدنا بلالؓ کہہ کے پکارتا تھا۔ پھر پٹڑی دوسری جگہ جا پڑی' پھر آپ کے ہاں نسلی امتیازات آ گئے' پھر آپ کے ہاں قومیں بنیں نسل کے اعتبار سے۔ پھر عقل نے اپنے تجرباتی طریقے سے دیکھا کہ یہ چیز بڑی باطل ہے' پیدائش کے اعتبار سے تو ہر بچہ یکساں پیدا ہوتا ہے۔ اور تو اور آپ کا ہمسایہ' دنیا میں سب سے آخر میں یہ عقل اور فکر اور علم اور تدبر اور روشنی کے اعتبار سے' آج تک وہ قوم گائے کو اپنا معبود مانتی ہے۔

ہندو قوم کے اندر ذاتوں اور گوتوں کی تمیز تو ختم ہوگئی لیکن مسلمانوں کے ہاں پنجابی سندھی بلوچی بنگالی کا غیر قرآنی تصور بدرجہا اُتم باقی ہے

ہندو قوم نے بھی ذاتوں اور گوتوں کی تمیز' ورنوں کی تمیز مٹا دی۔ ساری دنیا مٹاتی چلی جا رہی ہے' جبکہ مسلمان سب سے آخر میں اور مسلمانوں میں بھی یہ آپ کے ہاں کی ملتِ اسلامیۂ پاکستانیہ' جن کے ہاں لکھا ہوا ہے کہ سٹیٹ کا Religion بھی اسلام ہوگا' یہ آج بھی سب سے آخر میں ہے۔ یہ آج بھی پنجابی سندھی بلوچی کی Term میں گفتگو کر رہی ہے۔ یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کسی جنگ میں دو سپاہی آپس میں لڑ پڑے تو ان میں سے ایک سپاہی نے غیر شعوری طور پر' نادانستہ آواز دی پرانے تصور کے مطابق' اپنے خاندانوں کو کہ آنا میری مدد کو' دوسرے نے سنا تو اس نے اپنے قبیلے والے کو آواز دی کہ آنا میری مدد کو۔ حضور ﷺ کے گوشِ مبارک میں یہ بات پڑی باہر آ گئے' سخت برافروختہ تھے اور انہوں ﷺ نے کہا کہ تم میری زندگی میں ہی جاہلیت کے طرزِ عمل کی طرف چلے جا رہے ہو۔ مدد کے لیے آواز دینی ہے' سربراہِ مملکت کو دو' اپنے اولی الامر کو دو' اپنے کسی بھائی کو آواز دو' یہ قبیلوں کو آواز دے رہے ہو۔ آج ان نسلوں کی بنا پر کہ جن کے تعین کا بھی کچھ ہمیں علم نہیں ہے۔

افسوس کہ ہم تحریک پاکستان کے ثمرات سے لطف اندوز ہونے کے لیے' خود کو چار قوموں میں تقسیم نہ کرتے

عزیزانِ من! خدا خدا کر کے ایک تصور تھا جو تحریکِ پاکستان کے دوران دیا گیا کہ تمام مسلمان اسلام کی جہت سے ایک قوم ہیں۔ یہ ایک اسلامی چیز تھی جو وہاں دی گئی۔ اس کے علی الرغم کہا جا رہا ہے کہ اب یہاں چار قومیتیں بستی ہیں۔ آج کے غیر مسلم کا فرومشرک بھی کم از کم وطن کی حدود تو بنا رہے ہیں۔ یہاں نسلی Basis بنایا جا رہا ہے' دنیا میں یہ ذات پات کی چیز جو ہے' اسرائیل کے ہاں تو ہونا چاہیے تھا' ان کا مذہب ہی قومی ہے' باقی جگہ یہ نسلی تشخص ختم ہوگیا ہے۔ اس کے اوپر محققین نے کتابیں لکھی ہیں کہ نسلی امتیاز کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ دنیا یہاں آ گئی ہوئی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جس زمانے میں ساری دنیا نسلی افتخار کے اندر جکڑی ہوئی تھی اس زمانے میں قرآن نے ایک زندگی کا اصول دیا' نظام کی ایک بنیاد دی کہ تمام انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں۔ کسی کو کسی پہ فخر حاصل نہیں ہے۔ کہو کہ یہ چودہ سو سال کے اندر عقلِ انسانی یا انسان اس اصول کے اوپر آیا ہے یا اُس اصول کے اوپر جمے ہوئے بیٹھا ہے جو اس زمانے میں ساری دنیا کے اوپر مسلط تھا۔ کہیے یہ کونسے اصول کی فتح ہے' کونسے اصول کا غلبہ ہے' دین الحق کا غلبہ ہے یا دینِ باطل کا غلبہ

ہے؟ یہ ہے وہ حقیقت جو قرآن نے کہی تھی هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَ لَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ (9:33) یہ تھی حقیقت جو اس نے کہی تھی کہ خدا نے راہنمائی کا ایک ضابطہ بھیجا' ایک نظامِ زندگی بھیجا جو حقیقت پر مبنی ہے اور تم دیکھو گے کہ یہ نظام ساری دنیا کے باطل نظاموں کے اوپر ایک دن غالب آ کے رہے گا خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ ملوکیت کا نخلِ تمنا' مذہبی پیشوائیت کی آبیاری کا رہن منت ہوتا ہے

عزیزانِ من! آگے سنیے اور پھر داد دیجیے فرعون کے ضبط کی۔ بنیادی چیزیں دو ہی تھیں۔ اصل میں ملوکیت بھی خود قائم نہیں ہوتی۔ ایک شخص ایک فرد میں قوت ہی کیا ہوتی ہے۔ ملوکیت قائم ہوتی ہے مذہبی پیشوائیت کے سہارے اور نظامِ سرمایہ داری کے سہارے۔ رزق کے جتنے ذرائع ہوتے ہیں' وہ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور مذہبی پیشوائیت کہتی ہے کہ یہ خدا کی طرف سے اختیارات ہیں جو اسے دیئے ہیں۔

ملوکیت خواہ بادشاہت کی شکل میں یا بے لگام مغربی جمہوریت کی شکل میں' اس کی نظر ہمیشہ غیر کی کھیتی پر ہی ہوتی ہے

شقیں اصل میں سمٹ کے دو ہی رہ جاتی ہیں: مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ملوکیت بھی ایک بادشاہ کا نام نہیں تھا' ملوکیت کے معنی ہیں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے تابع نظام متشکل کرنا' خواہ وہ ایک شخص کی موروثی چیز ہو خواہ جمہوریت ہو' یہ بھی ملوکیت ہوتی ہے۔ اور ملوکیت کا سارا مدار ہوتا ہے رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لینا۔ وہ جو اقبالؒ نے کہا ہے کہ

بادشاہت جو ہے وہ چنگیز اور وہ پرویز پہ نہیں

ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

یہ شخص عجیب چیز کہہ جاتا تھا۔ ''غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر'' یہ ہے نظامِ سرمایہ داری۔ تو چیزیں دو ہی رہ جاتی ہیں: مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری۔ بات چلی آ رہی تھی کہ خدا نے یہ الدین دیا ہے کہ جو دنیا کے نظام ہائے باطل پر غالب آ کر رہے گا۔ یہ بات یہاں کہی' سنیے آگے کیا کہتا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَ الرُّهۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (9:34) یاد رکھو! سب سے پہلے اس کے راستے میں مذہبی پیشوائیت کھڑی ہو گی۔ یہ احبار و رہبان' دونوں ہی لے آیا: اہلِ شریعت اور اربابِ طریقت' مولوی اور پیر' احبار رہبان ہیں' دونوں کو لے آیا۔ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (9:34) یہ ہیں

جو انسانیت کوخدا کے راستے کی طرف نہیں آنے دیتے۔ کہاان میں سے تم اکثریت کی یہ کیفیت دیکھو گے کہ لوگوں کی کمائی کے اوپر زندگی بسر کرتے ہیں۔ خود سرمایہ داری یہاں سے شروع ہوگئی۔ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف نہیں آنے دیتے۔ تو خدا کا راستہ یہ ہوا کہ جس میں نہ اس قسم کی ملوکیت ہو' سرمایہ داری کا نظام ہو' اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں' احبار و رہبان یہ کرتے ہیں۔ تو میں نے کہا تھا کہ ملوکیت ہو یا نظامِ سرمایہ داری وہ صرف مذہبی پیشوائیت کے سر پہ قائم رہتی ہے۔ پہلے قرآن نے کہا کہ لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں بالباطل' بغیر کوئی تعمیری نتیجہ مرتب کیے ہوئے۔ باطل کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کوئی تعمیری نتیجہ یہ مرتب نہیں کرتے اور کھا جاتے ہیں دوسروں کی کمائی' خود محنت نہیں کرتے' ان میں سے کما کے کوئی نہیں کھاتا' آپ دیکھ لیجیے گا۔ اور خدا کے راستے کی طرف انسانیت کو نہیں آنے دیتے کہ اس میں ان کا وجود ختم ہوتا ہے' ان کے آقائے نعمت کا وجود ختم ہوتا ہے۔ خواہ وہ موروثی بادشاہت ہو یا جمہوریت کا وہ نظام ہو جو خدا کے اٹل قوانین کے اوپر مبنی نہ ہو' وہ ختم ہو جاتا ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کا ماحصل صرف ایک آیت میں

عزیزانِ من! ایک ہی آیت ہے وَ الَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَ الۡفِضَّۃَ وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ (9:34) اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو ادھر اُدھر سے دولت اکٹھی کرتے چلے جاتے ہیں' سمیٹتے چلے جاتے ہیں اور اسے انسانیت کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کھلا نہیں رکھتے۔ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ (9:34) اے رسول! ان کو دردناک عذاب کی بشارت دیدے یا اعلان کردے۔ حالانکہ مال و دولت والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی قسم کے عذاب میں مبتلا ہی نہیں ہو سکتا۔ ان کو یہ بشارت دیدو۔ پہلے کہا تھا یہ ہمارا دیا ہوا نظام غالب آ کے رہے گا باقی ادیان کے اوپر۔ جب یہ غالب آئے گا تو باقی نظاموں کے مدعی اور حامل یا اس پہ عمل کرنے والے ایک الم ناک عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

نظامِ سرمایہ داری ایک عذاب ہے

یَّوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡہَا فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ فَتُکۡوٰی بِہَا جِبَاہُہُمۡ وَ جُنُوۡبُہُمۡ وَ ظُہُوۡرُہُمۡ ؕ ہٰذَا مَا کَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡنِزُوۡنَ (9:35) کیا الفاظ ہیں! یہ ان کا مال و دولت' اس زمانے میں چاندی سونے کے سکے ہوتے تھے' نوٹ تو ہوتے نہیں تھے جو جلائے جا سکیں' کہا ان کو تپایا جائے گا' بیان کرنے کا ایک تمثیلی انداز ہے' ان کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے داغا جائے گا ان کی پیشانیوں کو' ان کی کمر کو' ان کے پہلوؤں کو۔ اور کہا جائے گا کہ یہ مال ہے جو جمع کر کے رکھا تھا لِاَنۡفُسِکُمۡ (9:35) اپنی ذات تک کے لیے۔ فَذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡنِزُوۡنَ (9:35) جو کچھ تم نے جمع کر کے رکھا تھا اس کے انجام کا یہ مزہ چکھو۔ عزیزانِ من!

کہیے قرآن نے جوایک دین الحق کی شق دی تھی نظام' معیشت کے متعلق' دنیا اپنے تجرباتی طریق کے بعد اس شق کی طرف آ رہی ہے یا اس کے خلاف جارہی ہے؟ ابھی وہ دنیا وہاں تک پہنچی نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا رخ کس سمت کو ہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے راستے میں حائل ہونے والے کون ہیں؟

اور یہ جو اس نے کہا کہ یاد رکھو! یہ دو گروہ ہیں جو اس نظام کے راستے میں سب سے بڑے سنگِ گراں بن کے حائل ہونگے: مذہبی پیشوائیت کا گروہ اور نظامِ سرمایہ داری کے حاملوں کا گروہ۔ یہ آگ جس کو اس نے کہا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مقام پہ جو بات کہی گئی ہو دوسرے مقامات میں اس کی وضاحت دیکھیے۔ یہ آگ کہیں فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ o وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ o نَارٌ حَامِيَةٌ (101:9-11) کی بھٹی لگی ہوئی نہیں ہے کہ جس کے اندر سچ مچ یہ روپے اور یہ پاونڈ اور یہ اشرفیاں تپائی جائیں گی اور لگایا جائے گا۔ یہ کونسی آگ ہے؟ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ نِ o الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (104:1-2) پہلے دو لفظوں کا ترجمہ' تفسیر کسی دوسرے وقت میں' وہ بھی بڑی تفصیل طلب چیز ہے۔ کہ جو مال کو جمع کرتا ہے اور پھر ننانوے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے۔ کیا بات کہی ہے!

ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے کی ترغیب انسان کو نناوے کے پھیر میں الجھائے رکھتی ہے

عزیزانِ من! جو محض اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے مال رکھتا ہے' وہ ننانوے کے پھیر میں پڑتا ہی نہیں ہے۔ جب جمع کرتا ہے تو پھر آگے بات چلتی ہے کہ ہاں! اتنا اور اس میں ہو جائے تو پھر یہ اتنا بن جاتا ہے۔ اس کے لیے آپ کو پتہ ہے کیا کیا ترغیبیں اور تحریصیں کی ہوئی ہوتی ہیں۔ سیونگ بینک میں اکاونٹ کھلتا ہے تو اس اُمید کے ساتھ کہ سات برس کے بعد دوگنا ہو جائے گا۔ اس میں شرط یہ ہے کہ سو روپے یا اس کے بعد سو دو سو تین سو یعنی یہ جمع کرایا جاسکتا ہے نوے پچانوے نہیں' سو پھر اس کے بعد سو۔ جب آتا ہے اسی نوے پہ تو پھر پوچھو نہ کہ سو بنانے کے لیے وہ کیا کیا کرتا ہے ''اک ٹائم دی روٹی وی چھڈ دیندا اے'' (ایک وقت کی روٹی بھی چھوڑ دیتا ہے)۔ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ o يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ (104:2-3) اس زعمِ باطل میں ہے کہ زندگی کا دوام مال کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ كَلَّا (104:4) خدا توفیق دے عربی سمجھنے کی تو جہاں قرآن كَلَّا کہتا ہے' سمجھا کیجیے۔ كَلَّا (104:4) کس فریبِ باطل میں مبتلا ہو۔

غیر قرآنی سوچ کے ہاتھوں انسانی زندگی ہمیشہ اذیت ناکی میں مبتلا رہتی ہے

سن رکھو! یہ جس مال کے متعلق کہتے ہو کہ تمہیں حیاتِ دوام دے گا اس کی اپنی کیفیت یہ ہوگی کہ اسے ایک ایسی جہنم کی آگ کے

اندر ڈالا جائے گا وَمَآ اَدْرٰکَ مَاالْحُطَمَةُ (104:5) یعنی ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی۔مَآ اَدْرٰکَ (104:5) خدا کے سوا تمہیں کون بتا سکتا ہے کہ وہ کون ہے۔نَارُ اللّٰہِ (104:6) اب محسوسات کی خوگر نگاہیں دیکھنے کے لیے چلیں کہ بھٹی یہ کہاں بھڑک رہی ہے' کہاں شعلے اٹھ رہے ہیں؟ کہا: کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے' یہیں بیٹھے ہو۔نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ (104:6-7) یہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے' یہ دلوں کو اپنی لپیٹ میں لیا کرتی ہے' باہر نہیں کہیں بھڑک رہی ہوتی۔اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَةٌ o فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (104:8-9) اور کہیں یہ نہیں کہ بھٹیاں بنی ہوئی ہیں' اسی کے ستون ہوتے ہیں جس کے اندر یہ ہوتی ہے۔آ ہاہاہا! اسی آگ کے ستون ہوتے ہیں بڑے بڑے جس کے اندر یہ خود بھڑک رہی ہوتی ہے۔یعنی خود سرمایہ داری اپنی آگ آپ ہے۔یہ اس کی کیفیت ہوتی ہے۔تو کہا جس وقت بھی وہ دین آیا' یا اس کا شعلہ آیا جو ہم نے دیا ہے تو اس کے بعد دیکھو کیسے وہ آگ بھڑک اٹھتی ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔کہیں سے آواز آجائے اس قسم کی کہ وہ نظام آرہا ہے جس میں یہ زمین چھین لی جائے گی' زائد سرمایہ چھین لیا جائے گا' دھمکی میں مرجاتے ہیں' کئی سرمایہ دار ہارٹ فیل ہونے سے مرجاتے ہیں۔اور جو مرتے نہیں ہیں ان کی زندگی اس سے بھی زیادہ اجیرن ہوتی ہے ایک آگ ہوتی ہے جو اس کو لپیٹے ہوئے ہوتی ہے۔یہاں عـددہ ہے دوسری جگہ ایک اور لفظ آیا ہے۔

زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے والوں کے برعکس ان میں گریز کی راہیں نکالنے والوں کا ذکر

نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی (70:16) اس جہنم کا پیچھے سے ذکر آرہا ہے عجیب وغریب الفاظ ہیں! ٹھاٹھیں مارتا ہوا' گرجتا ہوا' شعلے برساتا' ہوا چلا آرہا ہے۔اور کر کیا رہا ہے؟ تَدْعُوْا (70:17) آوازیں دے دے کے بلا رہا ہے' کسے؟ مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی (70:17) جس نے خدا کے صحیح نظام سے منہ موڑا تھا' جس نے گریز کی راہیں نکالی تھیں۔آ ہاہاہا! دو گروہ گنا دیئے: ایک تو وہ ہے جو اس سے منہ موڑ کے چلا جائے' ہم مانتے ہی نہیں ہیں' خدا کو بھی نہیں مانتے' اس کی وحی کو بھی نہیں مانتے۔ایک وہ ہے جو ان کو مانتا تو ہے' گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ابھی عرض کروں گا گریز کی راہیں کیسی نکلتی ہیں۔کہا یہ جہنم آوازیں دے کے بلا رہا ہے۔کیا انداز ہوتا ہے قرآن کا۔پیٹھ موڑ کے جانے والا' گریز کی راہیں نکالنے والا ''ایووں نکل جان والا''۔قرآن بھلا کسی کو جانے دیتا ہے! کہتا ہے آوازیں دے دے کے بلا رہا ہے۔ہیں کون؟ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (70:18) جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جمع کرتا ہے پھر اس کے بعد گرہ دے کر رکھ لیتا ہے۔فَاَوْعٰی کے معنی ہوتا ہے اس کے اوپر گرہ دیدینا' جس برتن میں کچھ رکھنا اس پہ ڈھکن دیدینا۔ اَوْعٰی جمع کرتا ہے' اگر تھیلی ہے تو اس کے اوپر (70:18) سے منہ بند کرنے کے لیے یہ لفظ آئے گا' برتن ہے ڈھکنا دینے کے لیے یہ لفظ آئے گا۔نیچے سے

پہلے بند ہے کہ وہاں سے نکل نہیں سکتا' اوپر سے یوں بند اور اندر اس کے یہ رکھ لیا۔ کہا یہی وہ ستون ہیں کہ جو اس کو بھی جلا دیں گے اس کے دل کو بھی شعلے لپیٹ کے لے جائیں گے۔

مال جمع کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی ایک آیت کے نازل ہونے پر بخاری کی ایک وضعی روایت

عزیزانِ من! اَدۡبَرَ (70:18) تو وہ ہیں کہ جنہوں نے علی الرغم انکار کر دیا کہ ہم نہیں مانتے' ہم قرآن کو نہیں مانتے' ہم وحی کو نہیں مانتے' ہم اس نظام کو ہی نہیں مانتے۔ یہ تَوَلّٰی (70:18) کیا ہے؟ گریز کی راہیں نکالنے والے۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اس کے لیے ایک ہی عقیدہ وضع کیا اور سارا کچھ اس کے اندر آ گیا۔ اور وہ تھا مثلہ معہ: قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ' قرآن کی آیتوں کی تشریح و تفسیر روایات کے مطابق۔ عزیزانِ من! سن لیجیے یہ بخاری کی حدیث ہے' یہ صحاحِ ستہ جن میں صحیحین سب سے زیادہ بخاری اور مسلم ان کی معتبر ترین حدیث کی کتابیں ہیں۔ حدیث ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ میں اس سے بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ ''او بائیس خاندان سن او زمانے دے!!'' (جیسے وہ اس زمانے کے بائیس خاندان ہوں!!)۔ عزیزانِ من! سنتے ہیں کہ صحابہٴ کبارؓ کے دل میں اس سے اضطراب پیدا ہوا کہ یہ Ordinance کیا آنے لگ گیا' اب کیا ہوگا۔ بیٹھ کے انہوں نے مشورہ کیا کہ کریں کیا۔ ان میں سے حضرتِ عمرؓ کو چنا گیا' انہوںؓ نے کہا کہ کوئی بات نہیں! میں یہ بات جا کے رسول اللہ ﷺ سے کرتا ہوں۔ عزیزانِ من! قدم قدم پہ سوچتے جایئے صحابہٴ کبارؓ قرآن پہ ایمان لانے والوں میں اس آیت پر اضطراب ہوا' یعنی انہیں معلوم ہے کہ خدا کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ یہ ایمان لانے والے جن کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ اور تو اور' یہ وہ قوم ہے جب جنگ کے متعلق بھی کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔ ان کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی' ان میں اضطراب پیدا ہوا۔ اب اس کے بعد کوشش یہ ہے کہ یہ آیت کسی طرح سے نہ رہے یا اس کی کچھ اور شکل نکل آئے' صحابہؓ یہ سوچتے ہیں۔ اور ان سب میں سے چنتے کس کو ہیں؟ حضرتِ عمرؓ کا انتخاب کر رہے ہیں۔ یعنی وضع کرنے والے کو یہ کچھ ذہن میں نہیں آتا کہ کسی مالدار کو تو چنیں' جسؓ کے تہمد کے اوپر بارہ بارہ پیوند لگے ہوئے تھے' اسے چنا جاتا ہے۔ لیکن بہرحال ''اوہناں تے اک وکیل کرنا ہیگا سی' بھاویں سرمایہ دار آپ نہ وی ہووے'' (انہوں نے تو ایک وکیل کرنا تھا چاہے وہ خود سرمایہ دار نہ ہی ہو)۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! (معاذ اللہ معاذ اللہ) کر کے بیان کرتا ہوں' یہ روایت ہے' یہ بخاری کی حدیث بیان کر رہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے ان سے جا کے کہا کہ یہ آپ ﷺ نے کیا کہہ دیا۔ ''آپ ﷺ نے کیا کہہ دیا'' (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ کہا کیا ہوا؟ کہنے لگے اس سے تو صحابہؓ کے اندر بڑی تشویش پیدا ہوئی' اضطراب ہے کہ مال ہی نہیں جمع کیا جا سکتا۔ آپ ﷺ نے کہا کہ ان سے جا کے کہو کہ نہیں! انہیں یہ معلوم

نہیں ہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ میں تجویز بتا رہا ہوں کوئی چیز وجۂ تشویش اس میں نہیں ہوگی۔ کہا فرمایئے۔ کہا ان سے جا کے کہیے کہ مال جتنا جی چاہے جمع کرو سال کے بعد اگر اس میں سے اڑھائی فیصد دیدیا کرو تو باقی سارا مال حلال وطیب ہو جائے گا۔ کہ اس کے بعد حضرتِ عمرؓ وہاں سے خوش خوش آئے' صحابہؓ سے آ کے جب کہا تو انہوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا'' او مارا اللہ میاں نوں' ہور آیت نازل کر'' (ہرادیا اللہ میاں کو' اور کرو آیت نازل) معاذ اللہ معاذ اللہ۔ آپ نے دیکھا کہ ادبر اور تولٰی کی تفسیر کیا ہو رہی ہے۔ ایک تو وہ تھے جنہوں نے علی الرغم کہا کہ نہیں ہم مانتے ہی نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے نہ ماننے والا ہے۔ ایک وہ ہے جو گریز کی راہیں نکالتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی جو نوع انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ تھی ان ﷺ کی زندگی کی آخری جھلک

عزیزانِ من! گریز کی راہیں پھر کسی اجتہادی مسئلے کی رو سے نہیں نکالتے' یہ چیز صحابۂ کبارؓ کی طرف' نبی اکرم ﷺ کی طرف کہ جن کی اپنی زندگی' اسی بخاری میں آ کے چل کے لکھا ہوا ہے کہ جب حضور ﷺ مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو کبھی کبھی بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی' ہوش آیا تو بیوی حضرت عائشہ سے کہا کہ گھر میں کوئی سکہ تو نہیں ہے' کوئی روپیہ پیسہ تو نہیں ہے؟ انہوںؓ نے کہا کہ آج صبح سات دینار آئے ہیں وہ رکھے ہیں۔ آپ ﷺ نے کہا کہ انہیں جلدی سے بیت المال میں بھیجو قبل اس کے کہ میں جاؤں تا کہ یہ نہ ہو کہ میں قیامت میں خدا کے حضور جا کے حاضر ہوں تو وہاں مجھے بتایا جائے کہ تم اس حالت میں دنیا سے آئے کہ تمہارے گھر کے اندر یہ دولت جمع تھی۔ عزیزانِ من! اس کے بعد سنتِ رسول اللہ ﷺ کے اوپر اس شدت سے زور دینے والے کہ اگر کسی کی داڑھی ایک مٹھی سے کم ہوگئی ہے تو اس کے متعلق یہ بات کہ یہ تارکِ سنت ہے۔ اگر کسی کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے آ گیا ہے تو تارکِ سنت ہے۔ یہ سارے سنتِ رسول اللہ ﷺ کے اوپر اتنی تاکید کرنے والے' رسول اللہ ﷺ کی یہ سنت کبھی ان کے ذہن میں نہیں آئی کہ انہوں ﷺ نے مرنے سے پیشتر یہ کہہ دیا تھا کہ اگر سات روپے بھی گھر کے اندر ہیں تو ان کو جلدی سے بیت المال میں بھیجو' گھر کے اندر کہیں فاضلہ دولت نہ رہ جائے۔ اس سنت کا ذکر کہیں نہیں آئے گا۔ اڑھائی پرسنٹ زکوٰۃ آپ کے ہاں دین کا ستون بن گیا ہوا ہے۔ آپ کو پتہ ہے ارکانِ اسلام میں ایک زکوٰۃ بھی ہے۔ اور خبر ہے وہ دین کا ستون کیسے بنا ہوا ہے؟ کہ جتنا جی چاہے مال جمع کرو' اڑھائی پرسنٹ دیدو۔ یہ مذہب کا تو ستون ہے' دین کے مگر ستون کو غارت کرنے والی چیز ہے۔ جہنم آوازیں دے دے کر بلا رہا ہے مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی o وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (70:16-17) ان کو بھی جو پیٹھ موڑ کے چلے گئے ان کو بھی کہ جنہوں نے ان کا اقرار تو کیا لیکن گریز کی راہیں نکالیں اور پھر وہ لوگ جو جمع کرتے رہے اپنی ذات کے لیئے' گرہ دے کے بیٹھے رہے۔ کہا کہ اے رسول! ان کو عذابِ الیم کی بشارت دیدو۔

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ نظام کے متعلق اس کا اپنا دعوٰی

عزیزانِ من! دعوٰی یہ تھا هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ (9:33) خدا نے یہ نظام بھیجا اس دنیا میں اور تم دیکھو گے کہ یہ تمام باطل نظاموں کے اوپر غالب آ کے رہے گا' خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ یہ اعتراضات بھی اس لیے پڑتے ہیں اور Genuinely وسوسے بھی اس لیے بیدار ہوتے ہیں کہ ہم نے الدین کی جگہ تو مذہب کو لے لیا اور اسلام کی جگہ مسلمان کو لے لیا۔ مذہب بھی کسی دوسرے مذاہب پہ غالب نہیں آ رہا اور مسلمان تو ساری دنیا کے اندر ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ اور اس کے بعد پھر دعوٰی یہ ہے جو قرآن نے دیا' اس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی' مسلمانوں کی سرفرازی تو قیامت تک اٹھا رکھتے ہیں۔ مذہب کے غلبے کو اپنے ذہن میں مناظرے میں جوان کو فتح حاصل ہوتی تھی' اس بنا پہ اپنے آپ کو یہ فریب دے لیتے ہیں۔ اس نے الدین کہا ہے اور آپ پھر دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے یہ ایک ایک شق جو قرآن نے دی تھی' آہستہ آہستہ' رفتہ رفتہ' عقل کے تجرباتی طریق سے کیسے غالب آتی ہے۔ اس طریق سے بھی قرآن نے کہا تھا کہ خدا کا ایک ایک دن' ہزار ہزار سال کا ہوا کرتا ہے۔ اور اس نے کہا تھا کہ اگر کوئی جماعت اس کو لے کے اٹھے تو پھر یہ تمہارے حساب وشمار سے قائم ہو جاتا ہے۔ یہ مملکت اس لیے لی گئی تھی کہ الدین یہاں انسانوں کے حساب وشمار سے قائم ہوگا۔ لیکن مسلمان کی یہاں بھی کیفیت: وہی مذہبی پیشوائیت' وہی نظامِ سرمایہ داری۔ اس راستے کے اندر کھڑا ہونے والا' تَوَلّٰی کی راہیں نکالی ہوئیں' ان کو انہوں نے اسلام قرار دیا ہوا ہے۔ ان کی حفاظت ان دونوں کی ذمہ داری ہے' اسے پورا کر رہے ہیں۔ باقی دنیا کی قومیں آ رہی ہیں اس نظام کی طرف' یہ سب سے پیچھے کھڑے ہیں۔ لیکن عزیزانِ من! اگر اُن کے پاس یہ نہیں رہ سکتا تو کیا ان کے ہاں یہ رہے گا اس لیے کہ انہوں نے اپنا نام مسلمان رکھا ہوا ہے؟ قرآن نے دین کے غلبے کا کہا تھا۔ سنیے! قرآن کی دوسری چیز میرے ذہن میں آ گئی۔ دین کے متعلق اس نے کہا تھا کہ باقی تمام ادیان پہ غالب آ جائے گا۔ جہاں تک اس قوم کا تعلق ہے' مسلمان ساری دنیا میں ذلیل ہیں اور اس نے قرآن میں کہا تھا کہ یہ غالب آ کے رہے گا۔ میں نے کہا تھا کہ دین غالب آ کے رہے گا' کسی قوم کا اس میں ذکر نہیں ہے۔ وہ قوم جو اس دین کی حامل ہوگی اس کو یقیناً یہ سرفرازیاں نصیب ہونگی۔ جو قوم اس دین کی حامل نہیں ہوگی اس کے متعلق سنیے قرآن کیا کہتا ہے هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (47:38) کہا کیا تم یہ لوگ ہو (ہمیں مخاطب کیا گیا ہے) کہ تمہیں کہا جاتا ہے کہ اپنی محنت کی کمائی کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کھلا رکھو۔ یہی ہے قرآن کا نظام' جمع کرنے کے خلاف فَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ (47:38) اور تم میں سے وہ لوگ ہیں کہ جو ایسا نہیں کرتے' بخیلی کرتے ہیں' اپنے آپ کے لیے اسے سمیٹ کے رکھتے ہیں۔ وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ (47:38) جو

اس کو اس طرح سے محروم رکھتا ہے۔ یَبۡخَلُ کے معنی ہوتا ہے کسی کو اس سے محروم رکھنا۔ کہتا ہے کہ جو اس طرح جمع کر کے دوسروں کو اس سے محروم رکھتا ہے یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ (47:38) وہ اپنے آپ کو اس سے محروم رکھتا ہے۔ تم دیکھو گے کہ وہ خود اس سے محروم رہے گا۔ وَاللّٰہُ الۡغَنِیُّ وَاَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ (47:38) مت سمجھو کہ خدا کے راستے میں چار ٹکے خیرات کے دیدیئے اللہ کے نام پہ دیا' اللہ کو تمہاری کیا پرواہ پڑی ہوئی ہے' محتاج تو تم ہو۔ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا (47:38) وہاں یہ تھا اَدۡبَرَ وَتَوَلّٰی (70:17) وہی لفظ یہاں آیا ہے۔ اگر تم اس سے گریز کی راہیں نکالو گے یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (47:38) تو وہ تمہاری جگہ ایک اور قوم کو لے آئے گا۔ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ (47:38) وہ تمہارے جیسی قوم نہیں ہوگی۔ وہ ایسی قوم ہوگی جو خدا کے دین کو قائم کرے گی۔ تو قوم کے متعلق تو اس نے یہ کہہ دیا۔ یہ تو نہیں کہ تم مسلمان نام رکھ کر جونسا جی چاہے اپنے ہاں نظامِ زندگی رائج کرو اور تم غالب آ ؤ گے باقی اقوام کے اوپر۔ وہ کہتا ہے تمہاری جگہ دوسری قوم آ جائے گی' یہ ہے وہ چیز۔ یہ ہے قوموں کے استبدال اور استخلاف کا قانون' ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کے آ جانے کا قانون' اور یہی معاشی نظام کے سلسلے میں کہا ہے کہ اگر وہ معاشی نظام جو قرآن نے دیا ہے' نہ قائم کرو گے تو یاد رکھو! تمہاری جگہ پھر دوسری قوم لے لے گی اور وہ تمہاری مثال نہیں ہوگی' وہ اس نظام کو قائم کرے گی۔

قرآن حکیم کے نظام کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا

اس لیے عزیزانِ من! یہ نہ کہیے کہ مسلمان ذلیل ہیں' ان کا کیا یہ تو مٹی ہوئی قوم ہیں' اس قوم کی جگہ کوئی قوم لے گی جو قرآن کے اس نظام کو عملاً نافذ کرے گی۔ لیکن یاد رکھیے! یہ نظام اس کے الگ الگ جزو یا ٹکڑے یا حصے نہیں کیے جاسکتے' نظام کُلی ہوتا ہے۔ آ گے آتا ہے اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً (2:208) نظام میں پورے کے پورے داخل ہونے والی بات ہے۔ اس طریقے سے نوعِ انسانی اس کے ایک ایک ٹکڑے کو' حصے کو' جزو کو لیے آ رہی ہے۔ اس سے وہ قرآنی نظام کے حامل نہیں ہو جاتے۔ اس نظام کے مختلف گوشوں کو اپناتے ہیں۔ اس طرح سے ہی عقلِ انسانی جب ان تمام گوشوں کو لے گی اور اس بنیاد کو لے لے گی جس کے اوپر یہ نظام قائم ہے' : خدا پہ ایمان کہ یہ اقدار اور یہ اصول غیر متبدل' مکافاتِ عمل پہ ایمان کہ ہمارے ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔ یہاں جب آ جائے گی تو وہ دوسری قوم ہوگی جو اس قوم کی جگہ لے لے گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

پانچواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 36 تا 41)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1973ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی 36 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔(9:36)

مختصر طور پر سابقہ درس کی یاد دہانی

آپ کو معلوم ہے کہ اس سورۃ میں اور اس سے ماقبل سورۃ انفال میں جنگ کے متعلق کچھ ہدایات اور احکام وقوانین بیان کیے جا

رہے ہیں۔ درمیان میں آیا تھا کہ یہ اس جدوجہد یا جہاد کی آخری شکل ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسانیت کی فلاح اور بہبود اور ارتقاء کے راستے میں جتنی قوتیں مزاحمت کرتی ہیں' انہیں پہلے واضح نصیحت سے سمجھایا جائے' دلائل و براہین سے قائل کیا جائے۔ لیکن اگر وہ ظلم اور استبداد سے باز نہ آئیں تو پھر انسانیت کو ان کے دستِ تظلم سے بچانے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کی دست درازیوں کو قوت کے ذریعے سے روکا جائے۔ اور اسے کہا جاتا ہے قتال فی سبیل اللہ' خدا کی راہ میں جنگ کرنا۔ پچھلے درس میں جو دو آیتیں سامنے آئیں تھیں ان میں ضمناً قرآنِ کریم نے بتایا تھا کہ یہ راستہ روکنے والے' انسانیت کو صحیح منزلِ مقصود تک نہ پہنچنے دینے والے' نمایاں طور پر دو گروہ گنائے گئے تھے۔ ایک تو احبار و رہبان مذہبی پیشوائیت' اربابِ طریقت اور اربابِ شریعت جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کوئی تعمیری کام نہیں کرتے اور دوسروں کی محنت کی کمائی پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ جو مال و دولت کو جمع کرتے رہتے ہیں اور انہیں فلاح اور بہبودِ انسانیت کی خاطر کھلا نہیں چھوڑتے۔ گویا مذہبی پیشوائیت کا نظام اور کیپٹل اور سرمایہ داری کا نظام ان دو کو قرآنِ کریم نے پچھلی آیات میں نمایاں طور پر گنایا تھا کہ یہ درحقیقت اس راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہا یہ تھا کہ اگر یہ چیز تاریخ میں چلی آ رہی ہے اور ظہورِ اسلام کے زمانے میں بھی دنیا کا یہ عام دستور تھا تو قرآن نے کہا ہے کہ کوئی بات نہیں' ہم جو نظامِ زندگی دے رہے ہیں' جس میں کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے فرد کو اپنا محکوم یا محتاج بنائے۔ تم دیکھو گے کہ یہ نظامِ زندگی تمام نظامہائے حیات پر غالب آ کر رہے گا۔ اگر کوئی جماعت اس کے لیے اٹھ کے کھڑی ہوگی تو یہ تمہارے حساب و شمار سے جلدی وجود میں آ جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر کائناتی قوتوں کی جو رفتار ہے' جسے زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے' زمانے کے تقاضے انسانوں کو اس طرف لے کے آئیں گے۔ یعنی انسان عقل کے تجرباتی طریق کی بناء پر مجبور ہو جائے گا کہ وہ اس نظام کو اپنائے۔ یہ کہنے کے بعد پھر قرآن اسی تسلسل کی طرف چلا آیا یعنی جنگ کے متعلق احکام کہ اسی مقصد کے لیے جب جنگ ناگزیر ہو جائے تو اس میں کیا احکام ہونے چاہئیں۔ من جملہ دیگر ہدایات کے ایک ہدایت قرآن نے یہ دی کہ جنگ اگر کہیں ناگزیر ہو جائے اور چھڑ جائے تو جنگ کو مسلسل جاری نہیں رہنا چاہیے۔ یہ ایک بڑی نفسیاتی چیز قرآن نے بتائی ہے۔ کہا یہ ہے کہ اس قسم کے بین الاقوامی کنونشن تمہارے ہاں ہونے چاہئیں کہ جن کی رو سے یہ طے کر لیا جائے کہ جنگ کہیں بھی ہو' کسی مقام پہ ہو' کسی قوم کے ساتھ ہو' سال میں کچھ مہینے ایسے رکھ لینے چاہئیں کہ جن میں جنگ ممنوع قرار دیجئے اس میں جنگ ہونے ہی نہ پائے۔ یعنی قرآنِ کریم نے ایک ابدی ہدایت کے طور پر یہ اصول بیان کر دیا کہ اگر ایسی شکل پیدا کر لی جائے کہ جنگ مسلسل جاری نہ رہے درمیان میں کسی وقت سیز فائر ہو جائے' جنگ بند کر دی جائے تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ جنگ پھر اسی تیزی شدت کے ساتھ جاری نہ رہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ایک بڑی نفسیاتی چیز ہے۔ لڑائی اگر مسلسل ہوتی رہے' آپ انفرادی طور پر دیکھئے' دو

شخصوں میں دوگروہوں میں اگر جنگ لڑائی فساد ہو رہا ہو تو غصہ اپنی شدت پہ ہوتا ہے۔ اگر ان میں تھوڑے وقت کے لیے بھی جنگ بند کرا دی جائے' لڑائی کو چھڑا دیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ غصہ فرو ہو جاتا ہے اور دوبارہ وہ اس شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں الجھتے۔ وقفہ درمیان میں آ جاتا ہے اس کے لیے۔ یہ ایک بڑی Psychological حقیقت ہے کہ اگر درمیان میں وقفہ آ جائے تو پھر غصے اور انتقام کی وہ شدت باقی نہیں رہتی۔ تو قرآنِ کریم نے کہا یہ کہ جنگ بھی ناگزیر ہو جائے تو سال میں کچھ مہینے' چار مہینے قرآن نے بیان کیا ہے' یہ عربوں کے ہاں چیز چلی بھی آ رہی تھی۔ کہا یہ ہے کہ یہ چیز بحیثیت ایک ابدی قانون کے اپنے ہاں رکھو کہ ایسے مہینے آ جانے چاہئیں کہ جن میں جنگ ممنوع قرار دی جائے۔

تین ماہ کے لیے جنگ بندی کو ممنوع قرار دینا بین الاقوامی سطح پر ہی ممکن ہے

اب یہ چیز ظاہر ہے شروع میں میں عرض کر دوں کہ جیسا میں نے عرض کیا ہے' یہ ایک بین الاقوامی کنونشن کے ذریعے سے ممکن ہے۔ عرب میں اس لیے ممکن تھا کہ ان تمام قبائل نے اسے تسلیم کر لیا ہوا تھا۔ ایک کنونشن کے ذریعے اس قوم میں ایک روایت قائم ہو گئی تھی اور اس پر وہ رضامند تھے اور وہ ایسا کر لیتے تھے۔ ابھی میں عرض کرونگا کہ اس میں پھر مذہبی پیشوائیت آ کے کس طرح سے ڈنڈی مارتی تھی۔ لیکن پہلے یہ چیز دیکھئے کہ ان کے ہاں Accepted تھی اور اس کے لیے تین مہینے تو تھے جس میں وہ حج کے اجتماع کے لیے جمع ہوتے تھے۔ کیونکہ ایک زمانے میں مواصلات کا طریقہ ایسا تیز رفتار نہیں تھا جیسا آج ہے اس لیے یہ تین مہینے تھے یہ ذیقعد اور ذی الحج اور اس کے بعد محرم۔ حج کے مہینے سے ایک مہینہ پہلے ایک مہینہ بعد اور ایک مہینہ حج کا۔ یہ پورے عرب کا بہت عظیم اجتماع ہوتا تھا جس میں بڑے اہم معاملات طے ہوتے تھے' کاروبار بھی ہوتا تھا اور کعبہ ہی اس کا مرکز تھا۔ تو ضروری تھا کہ ان تین مہینوں میں ملک میں ایسا امن رہے کہ یہ آنے جانے والے قافلے پورے اطمینان کے ساتھ سفر کر سکیں اور پھر حج کے دوران میں بھی کسی قسم کی لڑائی ہو' نہ جنگ ہو' نہ جھگڑا ہو' نہ فساد ہو۔ اور ایک مہینہ درمیان میں رکھا ہوا تھا یہ ان کے ہاں حجِ اصغر ہوتا تھا۔ درمیان میں بھی ایک اجتماع ہوتا تھا اور وہ اجتماع اتنا بڑا تو نہیں ہوتا تھا جتنا حج کا ہے لیکن اس چھوٹے اجتماع کے لیے بھی اتنا وقفہ انہوں نے رکھ چھوڑا تھا۔ یہ بڑی مفید چیز تھی قرآن نے اسے بھی اپنے ہاں جاری کیا اور اپنی طرف سے بطور ایک ابدی اصول کے بیان کر دیا کہ ایسا ہونا اچھا ہے' ضروری ہے۔ اور جب یہ چیز خدا کی طرف سے مسلمانوں کے لیے آ جائے تو پھر تو یہ ہو جاتا ہے۔ تو اس اصول کو ایک فریضے کی حیثیت سے رکھ لیا گیا کہ چار مہینے ایسے ہونے چاہئیں۔

سورج اور چاند کے کیلنڈر میں پائے جانے والے فرق کی نوعیت

اب جو میں نے کہا تھا کہ مذہبی پیشوائیت اس میں کیا کرتی تھی' ڈنڈی مارتی تھی تو وہ ایک عجیب چیز تھی۔ ان کا کیلنڈر چاند کے حساب

سے رکھا جاتا تھا۔ چاند کے حساب سے جب کیلنڈر رکھا جائے تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ سال میں شمسی کیلنڈر سے دس دن چھوٹا رہتا ہے۔ سورج کے حساب سے سال کو پورے بارہ مہینوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اس میں صرف چند منٹوں کا کچھ فرق پڑا کرتا ہے یا چند گھنٹوں کا۔ اُسے وہ پورا کر لیتے ہیں ہر چوتھے سال فروری میں ایک دن بڑھا کر۔ مقصد یہ ہے کہ زمین سورج کے گرد جو اپنا چکر پورا کرتی ہے تو وہ تین سو پینسٹھ اعشاریہ کچھ دنوں میں پورا کرتی ہے۔ سمجھنے کے لیے تین سو پینسٹھ دن سمجھ لیجئے' اتنے دنوں میں وہ سورج کے گرد پورا چکر کر لیتی ہے اور اسے ایک سال کہا جاتا ہے۔ موسموں کے لحاظ سے اس ایک سال کو بارہ پہ تقسیم کیا جاتا ہے اسے بارہ مہینے کہتے ہیں۔ چاند کے حساب سے اگر کیلنڈر رکھا جائے تو نئے چاند کے چڑھنے پہ مہینہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے بارہ مہینے تین سو پینسٹھ دن میں ختم نہیں ہوتے' قریباً تین سو پچپن دن میں ختم ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چاند کے حساب سے کیلنڈر میں شمسی کلینڈر سے ہر سال دس دن کم رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں جسے مذہبی کیلنڈر کہا جاتا ہے وہ قمری یا چاند کے حساب سے رکھا جاتا ہے۔ تو اس میں جو دوسرا کیلنڈر ہے سورج کے حساب سے جو رکھا جا رہا ہے اس میں ہر سال دس دن کم ہو جاتے ہیں۔ موسموں کا تعین اس طرح سے نہیں ہو سکتا۔

چاند کے برعکس سورج کے مطابق بنائے گئے کیلنڈر میں آسانی کا ذکر

موسموں کا تعین سورج کے حساب سے رکھے جانے والا کیلنڈر رکھا جاتا ہے' اُسی کے حساب سے ٹھیک رہتا ہے۔ اب اگر کسانوں سے پوچھئے' کاشتکاروں سے پوچھئے' ان کے ہاں بوائی کا پانی دینے کا کٹائی کا خاص موسم ہے' خاص دن ہیں۔ اور وہ یہ دن موسموں کے اعتبار سے متعین کرتے ہیں اور سورج کے حساب سے موسموں کی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ متعین طور پر یہ جانتے ہیں کہ فلاں مہینے میں فلاں فصل کی بوائی ہوگی' فلاں فصل کی کٹائی ہوگی' فلاں موسم میں ہوائیں چلیں گی اس لیے وہ گندم وغیرہ کی اڑائی ہوگی۔ یہ ساری چیزیں وہ موسموں کے حساب سے رکھتے ہیں اور موسم سورج کے حساب سے بدلتے ہیں۔ اس لیے جو بارہ مہینے رکھے ہوئے ہیں' اس اعتبار سے بھی وہ نہایت مفید رہتے ہیں اور ویسے بھی زمین اپنی گردش پوری کر لیتی ہے سال کے بعد۔ چاند کی رو سے جو کیلنڈر رکھا جاتا ہے میں نے جیسا عرض کیا ہے اس میں یہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے یہ بات ہے کہ ہمارے ہاں روزے کبھی سردی میں آ جاتے ہیں کبھی انتہائی گرمیوں میں آ جاتے ہیں کبھی موسمِ بہار میں آتے ہیں۔ لیکن مئی اور جون کا مہینہ یا جتنے بھی ایسے مہینے ہیں وہ انہی موسموں میں آتے ہیں ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔

چاند کے کیلنڈر میں لوند کے مہینے کا تذکرہ

اب جو جو چاند کے حساب سے کیلنڈر رکھتے تھے' دس دن کا فرق پڑ جاتا تھا ہر سال۔ موسموں کے تعین میں ان کو مشکل پیش آتی تھی۔

اس مشکل کوحل کرنے کے لیے اُنہوں نے طے یہ کیا تھا کہ ہر تیسرے سال وہ ایک مہینہ درمیان میں ویسا ہی رکھ لیتے تھے' لوند کا مہینہ جسے کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں بھی یہ چاند کے حساب سے رکھا جاتا تھا' وہ بھی اس طرح سے تیسرے سال یہ کرتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں بھی یہی طریقہ تھا Semitic Races بھی چاند کے حساب سے جب وہ رکھتے تھے تو ہر تیسرے سال ایک مہینے کا اضافہ' اضافے کے معنی یہ تھے کہ وہ سال کے تیرہ مہینے گنتے تھے۔ بارہ مہینوں کے تو نام ہوتے تھے تیرواں مہینہ یہ نامی چلتا تھا اضافے کا ایک مہینہ۔ یعنی اُسے وہ اضافہ کرجاتے تھے تاکہ سال موسموں کے اعتبار سے ٹھیک ہوجائے۔ یعنی وہ Adjust کر لیتے تھے اپنی اس کمی کو ایک مہینہ بڑھا کرتا کہ پھر موسموں کے ساتھ چلے۔ سال کے بعد پھر دس دن پیچھے رہ جاتے تھے پھر تین سال کے بعد ایک مہینہ پیچھے رہ جاتے تھے اور پھر تیسرے سال ایک مہینہ بڑھا لیتے تھے' تیرہ مہینے رکھتے تھے۔

جنگ وجدل سے باز رکھنے کے طریق کے خلاف مہنتوں کی طرف سے ایک مصلحت آمیز چال کی وضاحت

اگر تو سوال صرف حساب کتاب رکھنے کا ہوتا' موسموں کے اعتبار سے کاشت کا' تو ٹھیک ہے ایک بڑھا لیا اس میں کیا فرق تھا۔ یہ چیز بڑی غور طلب ہے۔ جب طے یہ پایا جائے کہ سال میں چار مہینے ایسے ہیں جس میں جنگ نہیں ہوگی' قافلے نہیں لوٹے جائیں گے' راستے پر امن رہیں گے' کسی سے فساد نہیں کیا جائے گا۔ تو ہر ایک کو اطمینان ہوتا تھا آنے جانے والوں کو کہ وہ مہینہ آ گیا ہے مثلاً ذیقعدکا' تو اس میں وہ کہتے تھے کہ امن سے اب سفر کرسکتے ہیں' قافلے چلا سکتے ہیں اس میں کوئی کسی دوسرے کو تنگ نہیں کرے گا' فساد نہیں کرے گا۔ تو یہ مہینے متعین ہوتے تھے۔ جس سال تیرہ مہینے ہو جاتے تھے اس سال ان میں گڑبڑ ہوتی تھی۔ اب آ گئے اس میں مذہبی پیشوا۔ کعبہ کے جو مہانت تھے ان میں سے ایک قبیلہ ایسا تھا جس کے ذمہ یہ متعین کرنا تھا کہ یہ چار مہینے جس میں یہ جنگ اور فساد منع کیا گیا ہے' یہ کونسے مہینے ہونگے۔ اگر تو مہینے طے ہوں تو سیدھی سی بات ہے کہ صاحب مئی جون اور جولائی اور اکتوبر کا مہینہ۔ ساری دنیا جانتی ہے اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی' ہر شخص کو معلوم ہے کہ جون کا مہینہ آ گیا۔ اور اگر صورت یہ ہو کہ وہ تیرہ مہینے ہوں ان تیرہ مہینوں کے اندر کہ پھر یہ کونسا مہینہ ہوگا۔ تو یہ مذہبی فریضہ ان کے ذمہ تھا کہ وہ متعین کرکے بتائیں کہ کونسے مہینے اس سال میں یا اگلے سال میں ایسے رکھے جائیں گے جن میں جنگ فساد منع ہوگا۔ تو وہ کرتے یہ تھے۔ اب یہاں آ گئی مذہبی پیشوائیت کی اور کیپٹل ازم کی مفاد پرستی۔ ایسے قافلے والے جو سمجھ لیتے تھے کہ ہمارا سفر ایسا ہے کہ وہ فلاں فلاں مہینے میں ضروری ہوگا اور فلاں میں ضروری نہیں ہوگا وہ ان کے ساتھ آ کے مل جاتے تھے اور کہتے تھے کہ صاحب اس سال یہ مہینے رکھ لیجیے۔ یہ رہی آپ کی نذرانے کی رقم اور یوں بدل لیا مہینوں کو۔ تو یہ ان کے لیے مہینے بدل دیتے

تھے۔اب دوسرے لوگ جن کے ذہن میں یہ تھا کہ صاحب فلاں مہینے امن کے ہیں وہ اس اعتبار سے چلتے تھے اور یہ فتویٰ دیدیتے تھے کہ اس دفعہ یہ نہیں' یہ مہینے رہیں گے۔نتیجہ یہ کہ وہ لٹ جاتے تھے اور ان کے ساتھی اور ساجھی جو تھے' یہ بچ جاتے تھے۔اسی طرح جنگ کی صورت تھی۔قبیلے اپنے پچھلے سال کے حساب سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے کہ اس مہینے میں تو جنگ نہیں ہوگی اور یہ فتویٰ دیدیتے تھے کہ نہیں اس کی بجائے اس دفعہ ہم نے جون کی بجائے اگست کا مہینہ رکھ دیا جس میں جنگ نہیں ہوگی' جون میں ہو جائے گی۔تو جن کو یہ فتویٰ دیتے تھے وہ جا کے' اس پہ حملہ کر دیتے تھے۔وہ کہتے تھے اس میں تو جنگ حرام ہے' وہ جواباً کہتے تھے حضرت صاحب نے فتویٰ دیدیا ہے کہ جنگ اِس میں حلال ہے' اُس میں جا کے حرام ہوگی۔یعنی یہ؟؟ یہ بھی ان کو لگا دیجیے تو یہ وہاں بھی کمائی کا اپنی کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کر لیتے ہیں' مہینہ مقرر کرنے میں گھپلا یعنی یہ بات جوتھی مہینے کی۔بھلا پوچھئے تو مذہبی پیشوائیت کو ٹانگ اڑانے کی کونسی ضرورت ہے۔لیکن اس میں بھی آپ دیکھئے کہ وہ گنجائش نکال لیتے ہیں۔

ہندوؤں میں شادی کے لیے تاریخ کا تعین برہمنوں کے رحم وکرم پر تھا

یہاں تو آپ کو معلوم نہیں ہے' انڈیا میں یہ چیز ہوتی تھی شادی بیاہ کے لیے وہ برہمن کے پاس جاتے تھے۔وہ تو ہر چیز کے لیے برہمن کے پاس جاتے تھے کہ کونسی تاریخیں رکھی جائیں۔اب ان تاریخوں کے رکھنے میں کمائی ہوتی تھی۔ایک فریق کو بعض تاریخیں سوٹ کرتی تھیں دوسرے کو نہیں کرتی تھیں' وہ آتا تھا کہ یہ دیکھئے یہ نہ رکھئے' اُس نے کہا کہ یہ تھوڑا ہے' برہمن کی کمائی ہونی چاہئے۔ہم خود تو بدلتے نہیں ہیں' ہم تو دیوتاؤں سے پوچھ کے بدلتے ہیں اور دیوتا تو مفت میں نہیں دیتے' ہم تو مفت میں دیدیتے ہیں۔یعنی ہر چیز کے لیے انہوں نے اپنی کمائی کا ذریعہ رکھا ہوا تھا۔جو شخص خود کمائی کر کے روٹی نہ کھا سکے' اس کو اس قسم کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں' بڑی مجبوری ہوتی ہے۔وہاں یہ کچھ ہوتا تھا۔اُنہوں نے بھی کئی مہینے رکھے تھے جس میں شادیاں نہیں ہو سکتی تھیں۔آپ کے ہاں بھی تو ہیں نا ایسے۔یعنی یہ جو ہے مذہبی پیشوائیت' جہاں عام انسانی کاروبار سے انکا کوئی تعلق نہیں' انہوں نے ان کو بھی کس طرح اپنے ہاتھ میں رکھا ہوتا ہے۔تو اِنہوں نے یہ چیز کر رکھی تھی۔یہاں تو صرف یہی ہے کہ شادی بیاہ کے معاملے میں ہی کچھ دن متعین کرنے ہوتے تھے' وہاں یہ معاملہ بڑا اہم ہو جاتا تھا کہ پورا ایک مہینہ یا کچھ مہینے جن کے اندر وہ سمجھتے تھے دوسرے لوگ کہ وہ امن کے مہینے میں ہیں' اس میں کوئی جنگ نہیں ہوگی' فساد نہیں ہوگا' قافلے نہیں لٹیں گے۔وہ اطمینان سے نکل پڑتے تھے۔یہ ایک فریق کو فتویٰ دیدیتے تھے' لوٹ لیتے تھے۔کنونشن ہوتی تھی وہ کہتے تھے کہ نہیں صاحب دیکھئے ہمارے ہاں تو یہ چیز موجود ہے۔اور یہ کہتے تھے کہ صاحب ٹھیک ہے ہم نے اعلان کر دیا تھا' اگلوں نے نہیں سنا تو ہم کیا کریں۔یہ عجیب چیز وہاں چلی آتی تھی پیچھے ہٹانا' آگے کرنا۔قرآنِ کریم جب دنیا میں قانون دے گا تو وہ تو پھر اس قسم کی

گنجائش نہیں رکھ سکتا قانون کے اندر۔

چاند کے مطابق کیلنڈر رکھنے کی بنیادی وجہ صحرا نورد قوم کی تمدنی اور معاشرتی زندگی تھی

سوال یہ ہوا یہ جو چاند کی وجہ سے کیلنڈر رکھا جاتا تھا یہ کیوں رکھا جاتا تھا (ضمناً میں عرض کردوں)۔ جن قوموں میں تحریری حساب کتاب ابھی نہیں ہوتا تھا' وہ قومیں بہت پیچھے تھیں۔ آج بھی ایسی قومیں موجود ہیں' دور دراز علاقوں میں رہنے والے' سورج کے حساب سے کیلنڈر جو ہے اس کی گنتی ان سے نہیں ہوسکتی۔ سورج کے حساب سے ہر دن اُسی قسم کا چڑھتا ہے' ہر رات اُسی قسم کی آتی ہے' نہ مہینہ پورا ہونے کا کچھ پتہ چل سکتا ہے۔ چاند کے لحاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے' نیا چاند چڑھا' نیا مہینہ شروع ہوگیا۔ اور پھر وہ چونکہ مدار رکھتے تھے اپنی تاریخوں کا چاند پہ' اُنہیں اس حساب سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا اس چاند کو دیکھ کے بتادیتے تھے کہ آج کونسی تاریخ ہے۔ چودہ تک تو یہ بڑھتا چلا جاتا ہے اس سے معلوم ہوجاتا تھا' پھر گھٹنا شروع ہوجاتا تھا' اُس سے معلوم ہوجاتا تھا۔ پھر جب یہ گُرم ہونے کے بعد نکلتا تھا' نیا مہینہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ اُن قوموں میں جو اس طرح سے حساب رکھنا نہ جانتی ہوں' ان کے ہاں آسان بڑا ہوتا تھا یہ چاند کی رو سے کیلنڈر رکھنا۔ عرب جیسی قومیں لکھنا پڑھنا ہی نہیں جانتی تھیں ان کے ہاں حساب کہاں تھا۔ یعنی جس زمانے کا یہ ذکر آرہا ہے دنیا کی قومیں رومن امپائر وغیرہ ان کے ہاں شمسی کیلنڈر موجود تھے۔ لیکن وہ لکھنے پڑھنے میں ان سے آگے تھیں۔ یہ قومیں جو لکھنے پڑھنے میں پیچھے تھیں اور ویسے بھی صحرا نورد قومیں' خانہ بدوش قومیں' ایک قبیلہ دس گھر کا یہاں' دوسرا قبیلہ دس میل کے فاصلے پہ وہاں' Means of Communications کوئی نہیں۔ تو کچھ حساب کتاب وہ چاند کے ذریعے سے رکھتے تھے۔ جیسے یہ اپنے راستوں کا تعین ستاروں کے ذریعے سے کرتے تھے۔ ورنہ صحرا میں جہاں کوئی سڑک نہیں بنی ہوئی کوئی نشاناتِ راہ نہیں تھے' کوئی پڑیاں نہیں تھیں۔ اگر کوئی نشان رکھا بھی جاتا کہ یہاں ایک ٹیلہ ہے یہاں کچھ جھاڑ اُگے ہوئے ہیں' ایک آندھی آتی تھی وہ ٹیلہ کھڈے میں بدل جاتا تھا' جھاڑ ریت میں گم ہوجاتے تھے۔ کوئی نشان ہی صحرا میں نہیں ہوتے تھے۔ تو یہ قافلے دن کی بجائے راتوں کو سفر کرتے تھے اور راتوں کو یہ ستاروں کے ذریعے سے راستے متعین کرتے تھے۔ اب بھی آپ کے جہاز راں جو ہیں' ان کو علم آتا ہے ستاروں کے ذریعے سے اپنے راستے متعین کرنا۔ سمندر میں بھی تو کوئی جی ٹی روڈ نہیں بنی ہوئی ہوتی۔ وہ جو سورۃ والنجم ہے' میں کبھی آؤنگا تو وہاں آپ دیکھیں گے کتنی اہم باتیں قرآن کہہ گیا ہے۔

انگریزی دور میں وقت کے اندر تغیر و تبدل پر ہمارے ہاں کے مذہبی تصورات

میں کہہ رہا تھا کہ ان قوموں میں جو ابھی لکھنا پڑھنا زیادہ نہ جانتی ہوں' چاند سے حساب رکھنا آسان ہوتا ہے۔ ہمارے گاؤں

والے ابھی کل تک' آج تو یہ ریڈیو عام ہو گیا ہے اس کی وجہ سے اب تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کسی کو معلوم نہ ہو۔لیکن اس سے ذرا پہلے ہمارے بچپن کے زمانے میں ہمارے گاؤں والے جتنے بھی تھے' وہ سارے چاند کے ذریعے سے حساب رکھتے تھے اپنا۔شادی بیاہ کا سارا کچھ چاند کے ذریعے ہوتا تھا۔''اونے کیا سی پئی کدوں پیسے واپس دیں گا' اوکہن لگا کہ چڑھے چن دی ست نوں' کہن لگا نہ بھائی حساب تو پکا دس چن دا کی اے چڑھے چڑھے نہ چڑھے' میں کتھے پیسے لین آ جانگا تیرے کول''۔یہی آسان تھا ان کے لیے وہ تاریخیں ہی ایسے مقرر کرتے تھے۔قرآنِ کریم میں دیکھئے کیا عجیب چیز آئی ہے۔اب تو یہ چاند کے ذریعے سے قمری مہینہ کچھ مقدس سی بات ہو گئی ہے' اسے تو اسلامی سمجھا جاتا ہے۔اورسورج کے ذریعے سے عام کیلنڈر ہمارے ہاں ہے' اُسے گنا جاتا ہے مغربی یا دنیاوی آپ کے ہاں۔دنیا کیلنڈر اور دینی کیلنڈر الگ ہے۔آپ کو شاید معلوم نہیں' جنگ کے زمانے میں انگریزوں نے ایک مصلحت کے حساب سے آدھا گھنٹہ وقت پیچھے کیا تھا۔تو ہمیں معلوم ہے اُس زمانے میں ہم دلی میں ہوتے تھے' مذہب پرست طبقہ کے ہاں جو گھڑیاں رکھی تھیں انہوں نے مسجدوں کے اندر لگی گھڑیوں کو پیچھے نہیں کیا تھا۔کہتے تھے کہ یہ بدعت ہے''یعنی گھڑیاں لانیاں جیہڑ یاں سن او تے بالکل عین قرآن ہے'' اُنہیں آدھا گھنٹہ پیچھے کرنا یہ وہاں فتویٰ تھا' اُنہوں نے نہیں کیا تھا۔اب اکثر یہ ہوتا تھا کہ چلے جاتے ہیں راستے میں' کسی کو دیکھا بولتی لٹک رہی ہے اُس نے پوچھا کہ بھائی صاحب وقت ذرا بتا دیجئے گا' تو وہ کہتے تھے کہ تم نے میاں دنیاوی وقت پوچھنا ہے یا دینی وقت پوچھنا ہے۔یعنی وہ گھڑی دیکھ کے بتاتے تھے کہ''جی مذہبی تے بجے ہیگے نا بارہ تے انگریز دے بجے ہیگے ساڈھے بارہ''۔

قرآنی حقائق کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں ہماری سوچ کا معیار

آپ کو پتہ ہے آپ کے ہاں تقدس کس چیز کو حاصل ہوتا ہے' جو چیز پرانی ہو جائے وہ آپ کے ہاں مذہبی بھی ہو جاتی ہے' مقدس بھی ہو جاتی ہے۔یہ جو قمری آپ کے ہاں چاند کے حساب سے لا رہے ہیں اب آپ کے ہاں یہ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ اگر سورج کے حساب سے کیلنڈر رد دیا جائے تو اس سے تو اسلام کی جڑ بنیاد اکھڑ جاتی ہے۔قرآنِ کریم میں ہے **وَ جَعَلَ الَّیۡلَ سَکَنًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ حُسۡبَانًا** (6:96) خدا نے سورج اور چاند دونوں کو حساب کے لیے پیدا کیا ہے۔کیا بات ہے اس کتاب کی!!! جب ابھی حساب کتاب اُس طرح سے نہ ہو تو ان قوموں میں ان قبائل میں' تمہارے ہاں چاند سے حساب رکھنے کی آسانی رہے تو قمر بھی ہم نے اس کے لیے رکھا ہے اور اگر یہ صورت ہو کہ تم نے ساری دنیا کے ساتھ چلنا ہے تو شمس کو بھی ہم نے رکھا ہے۔تو اس میں یہ بتایا ہے یہاں کہ شمس ہو یا قمر ہو یہ تو آسمان کے کرے ہیں' گردشیں کرتے ہیں **کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ** (36:40) اپنے اپنے مدار میں یہ تیرتے پھر رہے ہیں۔ان کے اعتبار سے حساب تم نے جناب رکھنا ہو تو جو Convenient تمہارے لیے ہو۔ہم نے شمس اور قمر دونوں کو اس کے لیے رکھا ہے۔

اب اس کے بعد آگے آیئے۔ اتنا ہی نہیں قرآن نے تو ایسی چیز بھی کہی ہے جس سے یہ نظر آتا ہے کہ جب انسانیت نے عالمگیر ہونا ہے تو بہتر ہے کہ حساب سورج کے ہی مطابق ہو۔ یہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے۔

زیرِ نظر درس کے لیے اتنی زیادہ تمہید کی ضرورت کیوں؟

اتنی لمبی تمہید کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس کے بغیر یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (9:36) کتنی عظیم چیز کہہ گیا ہے قرآن کہ یہ یاد رکھئے جب سے خدا نے یہ ارض وسماوات کی تخلیق کی تو اس کی رو سے سال کے بارہ ہی مہینے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہ بارہ مہینے کیسے پورے ہوتے ہیں۔ جس عرصے میں زمین چاند کے گرد ایک گردش پوری کر لیتی ہے اس عرصہ کو بارہ کے اندر تقسیم کر دیا جائے تو سال کے پورے بارہ مہینے ہو جاتے ہیں اور اگر سورج کی رو سے یہ کیا جائے تو بارہ مہینے میں وہ گردش پوری نہیں ہوتی۔ یہاں یہ کہا ہے يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (9:36) یعنی تخلیقِ ارض وسما کے اعتبار سے تم اگر دیکھو تو پھر سال کے تین سو پینسٹھ دن وہی ہوتے ہیں۔ اب انہیں تقسیم کیا جاتا ہے، عام طور پہ بارہ پہ تقسیم کیا جاتا ہے تو یہ ایک سال بنتا ہے تین سو پینسٹھ دن کا۔ کیونکہ دن تو ایک ایسی چیز ہے کہ جسے کوئی بھی بدل نہیں سکتا، پورا دن اور اس کے بعد پوری رات یہ چوبیس گھنٹے متعین ہیں ارض وسما کی تخلیق کے اعتبار سے۔ جتنے وقت میں زمین اپنے مدار کے گرد پورا چکر کر لیتی ہے، وہ متعین وقت ہے جسے آپ ایک دن کہتے ہیں، دن سے مراد ہے چوبیس گھنٹے۔ اور اس قسم کے چوبیس گھنٹے کہ تین سو پینسٹھ دنوں میں زمین سورج کے گرد چکر لگا لیتی ہے پورا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (9:36) کی رو سے یہ دن اتنا ہی ہے یہ تین سو پینسٹھ دن بنتے ہیں اور ان کو تقسیم کر لیا جاتا ہے تو بارہ مہینے بنتے ہیں۔ اس میں ایک چیز ہے اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (9:36) آپ کو معلوم ہے میں شروع سے آپ کو بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ کتاب کے معنی ہی قانون ہیں۔ یہاں دیکھئے کتنا واضح کہا ہے فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (9:36) قانونِ خداوندی کی رو سے یہ تین سو پینسٹھ دن کا سال جو بارہ پہ تقسیم کر رکھا ہے ایسا تخلیقِ ارض وسما کی رو سے ہوتا ہے فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (9:36)۔ ذرا بتایئے تو سہی کہ خدا کا جسے قانون کہا گیا ہے یہ کونسا قانون ہے۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ تو اب وہ بات سامنے آ گئی جو میں ہمیشہ دہرایا کرتا ہوں کہ یہ قوانینِ فطرت بھی، قوانینِ خداوندی ہیں۔ ایسا نہیں کہ مذہب یا دین کے قوانین تو خدا کے قوانین ہیں اور جسے قوانینِ فطرت آپ کہتے ہیں یہ کہیں مادہ پرست دہری مغربی یورپین قوموں کے بنائے ہوئے ہیں۔ قرآن اسے کتاب اللہ کہتا ہے۔ یعنی یہ دنوں، مہینوں کی، سال کی گنتی کا حساب وشمار کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اور فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (9:36) کہا جا رہا ہے، قانونِ خداوندی کی رو سے۔ اسے قانون کہہ کے پکارا

ہے اللہ نے۔اس لیے یہ Laws of Nature جسے آپ کہتے ہیں یہ قوانینِ فطرت جنہیں کہتے ہیں' یہ خود قوانینِ خداوندی ہیں۔

دینِ خداوندی کا آدھا حصہ انسان کی تمدنی زندگی کے متعلق ہے جب کہ اس کا آدھا حصہ قوانینِ فطرت کے متعلق ہے

تو جس طرح سے قوانینِ خداوندی کا اتباع مومن کے لیے ضروری ہے۔ اُس کا آدھا حصہ آپ کی تمدنی زندگی سے متعلق ہے جسے آپ وحی کی رو سے دیے گئے اصول راہنمائی بتاتے ہیں اور آدھا حصہ وہ ہے جو قوانینِ فطرت ہیں۔ ان کی پابندی بھی اسی طرح فریضہ ہے جماعتِ مؤمنین اور مردِ مؤمن کے اوپر' جس طرح سے ان قوانین کی پابندی اور اطاعت فریضہ ہے جو اس کی ذاتی اور تمدنی زندگی سے متعلق ہیں۔ جسے کہا جاتا ہے مذہب یا دین۔ یہ دین کا آدھا حصہ ہے دین کا باقی آدھا حصہ یہ ہیں جنہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔لیکن یہاں تو فطرت یا دنیا کو ہی قابلِ نفرت قرار دیا جاتا ہے تو اس کے قوانین کے اتباع کا سوال ہی نہیں آتا۔

سرسید کی مخالفت کرتے ہوئے مذہبی پیشوائیت نے اسے نیچری کہتے ہوئے کافر جانا مرتد جانا اور اسے بے دین جانا

اُس بیچارے سرسیدؒ نے کہیں یہ کہہ دیا کہ بابا یہ نیچر بھی خدا کی بنائی ہوئی ہے' نیچر کا علم حاصل کرنا بھی خدا کی رو سے ضروری ہے۔ اُس کا نام نیچری رکھ دیا اور نیچری کے معنی ہوئے کافر۔ آپ نے اس زمانے کی چیزیں شاید نہ دیکھی ہوں' جن حضرات نے دیکھی ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ یہ سرسیدؒ کو نیچری کیوں کہتے تھے اور پھر ہر نیچری مرتد تھا۔ وہ یہاں سے نہیں' مکے سے جا کے فتویٰ لائے تھے سر سیدؒ کے خلاف کہ یہ نیچری ہے۔ یعنی اب نیچری ہونا ان کے نزدیک ارتداد تھا' کفر تھا' الحاد تھا' بے دینی تھا۔ اور قرآن اس چیز کو اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ (9:36) یعنی مہینوں کی گنتی آپ بتایئے تو سہی کہ اس چیز کا مذہب سے کیا تعلق ہے' وہ کہتا ہے کہ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ (9:36) اللہ کے قانون کی رو سے اللہ کی کتاب میں یہ چیز لکھی ہے کہ یہ بارہ مہینے ہیں۔ کونسی کتاب ہے جس میں یہ لکھا ہے۔

صحیفہ کائنات اور صحیفہ قرآنی کے مجموعے کا نام دینِ فطرت ہے اور اس سے انکار کا نتیجہ جہنم

یہ کتابِ فطرت ہے صحیفۂ کائنات ہے۔ اس لیے یہ دو صحیفے ہیں حقیقت میں' جن دونوں کے مجموعے کا نام قوانینِ خداوندی ہے۔ صحیفۂ فطرت جو باہر کائنات میں لکھا ہوا ہے اور یہ صحیفۂ قرآنی جو قرآن کی دفتین کے اندر ہے۔ ان دونوں کو اکٹھا کریں گے تو پھر دین ہوگا۔ اور اگر ان دونوں میں سے ایک کو بھی چھوڑ دیا تو آپ کو معلوم ہے سورۃ بقرہ میں ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ

بِبَعْضٍ (2:85) کیا یہ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ خدا کی کتاب کے ایک حصے کو تو مانتے ہیں اور دوسرے سے انکار کرتے ہیں فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) جو بھی ایسا کرے گا تم میں سے' یعنی اس کے ایک حصے کو مانے گا اور دوسرے حصے سے انکار کرے گا' یاد رکھو اس کا نتیجہ ذلت اور خواری ہو گا اس دنیا میں اور آخرت کی دنیا میں بھی۔قوانینِ فطرت کو تم چھوڑ دو گے تو یہ کیفیت ہو جائے گی جو مسلمانوں کی ہو گئی ہے۔یہ قوانینِ تمدنی جو وحی کی رو سے ملے ہیں' قرآن میں ہیں۔ان کو چھوڑ دو گے تو کیفیت جہنم کی وہ ہو جائے گی اقوامِ یورپ جس کے اندر ہیں۔اور جو دونوں کو چھوڑ دے گی ''اوناں نوں پاکستانی مسلمان کہیا جائے گا''۔

آج یورپ کی خستہ حالی اور پھر ہماری اپنی تباہی دینِ فطرت سے بغاوت کا نتیجہ ہے

کتاب اللہ کا لفظ کہاں آیا ہے۔آپ اس کی اہمیت دیکھئے عزیزانِ من! میں پھر اس پہ زور دے رہا ہوں کہ بات تو صرف اتنی ہی تھی کہ سال کے بارہ مہینے رکھو۔وہ کہتا ہے فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ (9:36)۔تو یاد رکھئے فطرت کے قوانین بھی قوانینِ خداوندی ہیں وہ کتابِ فطرت کے اندر مندرج ہیں۔اور کسی مغربی مفکر نے بڑی عجیب چیز کہی ہے' "The Limitations of Science" اس کی کتاب ہے ایک فقرہ اس کا بڑا عجیب ہے۔اس کے آخر میں لکھتا ہے کہ اصل چیز یہ ہے کہ

"The Scientist only reads the book of nature, we don't write it."

سائنٹسٹ صرف صحیفۂ فطرت کو پڑھتا ہے' اس کو تصنیف نہیں کرتا۔

جو قوم بھی صحیفہ فطرت کا مطالعہ نہیں کرتی وہ ہمیشہ تباہ ہو جاتی ہے

اسی لیے Discovery کا لفظ انہوں نے رکھا ہوا ہے' اس کے اوپر جو پردہ پڑا ہوا ہے' صرف اس کو اٹھاتا ہے وہ۔یہ لکھا ہوا موجود ہے' اسے تو قلمِ خداوندی نے لکھا ہوا ہے۔اور یہ بھی کتاب اللہ ہے یاد رکھئے اسی طرح سے اس کی پیروی فرض ہے قرآن کے ماننے والوں پہ جس طرح سے قرآن کے ان قوانین کی پاسداری فرض ہے جس کا زندگی کے ساتھ تعلق ہے۔دونوں کو اکٹھا کریں گے تو پھر بنے گا الدین۔دیکھئے کہا ہے الدین۔میں نے عرض کیا تھا قرآنِ کریم کی آیات سے یونہی نہ گذر جایئے۔اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اثْنَا عَشَرَ شَھْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (9:36) ایک بات یہ ہو گئی فطرت کے قانون کی رو سے جو تخلیقِ ارض و سما کے وقت سے عمل میں آئی ہوئی ہے وہ گردش تو اس زمانے سے شروع ہو گئی ہے نا' یہ بارہ مہینے رکھتی ہے۔ایک بات ہو گئی۔اب اگلی بات آئی تمہاری تمدنی زندگی سے مِنْھَآ اَرْبَعَۃٌ حُرُمٌ (9:36) ان میں سے چار وہ ہیں کہ جن میں جنگ اور قتال حرام قرار دیدیا ہے۔

اس کا تعلق فطرت سے نہیں ہے۔ فطرت کے مہینے اور سال جو فطرت کی طرف سے کہیں نہیں آیا کہ اس مہینے میں جنگ کرنی ہے اس میں نہیں کرنی۔

قرآنِ حکیم نے کائنات کے فطرتی قوانین اور انسانی زندگی کے تمدنی معاشی سیاسی اور عائلی قوانین کے غیر متبدل اصولوں کو الدین القیّم کہا ہے

آپ نے دیکھا اب یہ دوسرا حکم آ رہا ہے۔ تمہاری زندگی کے اندر ہم نے ایک دوسرا حکم تمہیں دیا ہے۔ پہلا فطرت کے اندر موجود ہے یہ دوسرا حکم وحی کے ذریعے سے تمہیں دیا جا رہا ہے۔ دونوں چیزیں اکٹھی ہو گئیں۔ کہا ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (9:36) ان کو ملانے سے دینِ قیم بنتا ہے۔ فطرت کے قوانین کو آپ چھوڑ دیجئے' پھر بھی آدھا حصہ رہا۔ اگلی بات جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے اُسے حرام نہ سمجھو' یہ دوسرا حصہ ہے دین کا۔ ان دونوں کو اکٹھا کرو تو دین القیم بنتا ہے ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (9:36)۔ واہ واہ واہ!!! قرآن ہے عزیزانِ من!! غور کیجئے اب اپنی حالت کے اوپر جس میں ہم چلے آ رہے ہیں کہ وہ کسے الدین القیم کہہ رہا ہے۔ ساری دنیا اس وقت جس عذاب کے اندر گرفتار ہے وہ اسی لیے ہے کہ دونوں کے امتزاج سے جو الدین القیم بنتا تھا یہ کہیں بھی نہیں ہے' نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری'۔ وہاں یہ چیز نہیں ہے کہ ان مہینوں کے اندر جنگ حرام ہے۔ یہاں فطرت کے قوانین سے نہ صرف یہ کہ اغماز برتا ہے بلکہ ساری دنیا کو قابلِ نفرت قرار دیا ہوا ہے۔ جب بھی کسی کے متعلق کہا جائے کہ یہ دنیا دار ہے۔

ہمارے ہاں الدین القیم کی شکل وصورت کو ہی مسخ کر دیا گیا

دیکھا آپ نے دین کے اندر فوراً بات آتی ہے کہ جی مذہبی آدمی نہیں ہے۔ متقی کے معنی پرہیز گار ہیں یعنی جو دنیا سے پرہیز کرنے والا ہو' الگ بیٹھنے والا ہو۔ تو انہوں نے قوانینِ فطرت کا کہاں مطالعہ کرنا تھا اور ان کی تکمیل کیسے کرنی تھی اس قوم نے۔ دنیا ان کے لیے لاش' اس کے چاہنے والے کتے۔ فطرت کو تو یوں چھڑا دیا انہوں نے۔ ادھر آنے سے قرآن یوں چھوڑ دیا کہ مثلہ معہ اس کی مثل اس کے ساتھ اور آیا ہوا ہے نازل ہوا ہوا ہے' چلئے بخاری اور مسلم کے پاس' وہاں چلے گئے۔ نہ وہ کتاب اللہ رہی نہ یہ کتاب اللہ ان کے پاس رہی۔ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (9:36) یوں دینِ قیم بنتا ہے Laws of Nature کو ساتھ رکھئے اور وحی کی رو سے جو تمہیں تمدنی زندگی کے متعلق قوانین دیے ہوئے ہیں ان کو ساتھ ملائیے۔ بارہ مہینے وہاں رکھئے وہ تو ہو گیا Law of Nature' چار کو حرام قرار دیجئے یہ ہو گیا وحی کی رو سے تمہارے لیے حکم۔ دونوں کو اکٹھا کیجئے ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِیۡهِنَّ اَنۡفُسَکُمۡ (9:36) ان

مہینوں کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ پہ زیادتی نہ کرو۔ اب دیکھا کہ اتنی سی چیز بھی سے قرآن نے حرام قرار دیا ہے' پابندی جس میں قرار دی ہے' اس پابندی کو توڑنے کے معنی یہ کہا ہے اپنے آپ پر زیادتی کرنا۔ یہ زیادتیاں انسانوں کی اپنے ہی آپ پہ ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کا تو کچھ نہیں بگڑتا اس میں سے۔

قرآن حکیم کے نزدیک جنگ کرنے کا بنیادی مقصد

وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً (9:36) پھر وہی بات چلی آ رہی ہے کہ وہ لوگ جو انسانیت کو خدا کی متعین کردہ منزل کی طرف آنے نہیں دیتے' ان کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور برسوں کی نصیحت' برسوں کی تبلیغ کے باوجود یہ راستے سے نہیں ہٹتے' انسانیت کو ان کے مظالم سے بچانے کے لیے ضروری ہو جائے گا کہ انہیں راستے سے ہٹایا جائے۔ اسے کہا گیا ہے مشرکین کے ساتھ پھر جنگ کرو' یہ نہیں کہ ساری دنیا میں جہاں جہاں کوئی مشرک بیٹھا ہے جا کے اسکے اوپر ہلہ بول دو۔ یہ تو میں نے پہلے بتایا ہے کہ قرآن نے کن کے ساتھ جنگ کرنے کو کہا ہے۔ لیکن جب کرنے کو کہا ہے كَآفَّةً کا ایک لفظ آیا ہے۔ عام طور پر اس کے معنی کیے جاتے ہیں کہ تم سب مل کر ان کے خلاف جنگ کرو۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ لفظ بڑا جامع ہے عربی زبان کا۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ایسی صورت پیدا کر دو کہ دوسرا رک جائے۔ كَآفَّةً کے معنی کہ مقصد صرف ان کی دست درازیوں اور استبداد سے انسانیت کو بچانا ہے۔ جس مقام پہ بھی یہ رک جائیں ایسا کرنے سے وہاں جنگ کا مقصد ختم ہو گیا۔ كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً (9:36) جس طرح یہ تمہیں اس نظام کے قائم کرنے سے روک رہے ہیں تم انہیں ان کی دست درازیوں سے روکنے کے لیے جنگ کرو۔ یہ ہے مقصد جنگ کا' كَآفَّةً (9:36) کے یہ معنی ہوتے ہیں۔

لفظ متقین کا مفہوم

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (9:36) اور یاد رکھو خدا کی نصرت ان کے ساتھ ہے جو قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہیں۔ اب متقین کے یہ معنی ہو گئے کہ سفرِ زندگی میں وہ قدم قدم پر یہ دیکھتے ہیں کہ ہم کبھی اُس کے بتائے ہوئے راستے سے اِدھر اُدھر تو نہیں ہو رہے۔ اب یہ بارہ مہینے کا یہاں ذکر آیا' جس مقصد کے لیے یہ ذکر آیا وہ اب آگے بات آئی۔ اور میں نے وہ تمہید میں تفصیل سے بیان کر دی تھی کہ جب انکے ہاں تیرہ مہینے آتے تھے تیسرے سال کے بعد ایک مہینے کا جب اضافہ کرتے تھے تو وہاں یہ مہینے بناتے تھے تیرہ' اُس کے لیے کہا یہ غلط ہے مہینے بارہ ہی رکھنے چاہئیں۔ قرآن کی ان آیتوں کے مطابق اور جس میں اس نے کہا ہے کہ شمس کو بھی سورج کو بھی ہم نے حساب ہی کے لیے رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب اس قدر علم عام ہو گیا ہے' مواصلات عام ہو گئے تو یہ جو کیلنڈر سورج کے

حساب سے ہے یہ زیادہ Convenient آسان کیلنڈر رہے۔

عید کے چاند پر سال ہا سال سے سر پھٹول ہونے کی بنیادی وجہ اور اس کا علاج

اگر مسلمان بھی شمسی کیلنڈر رکھنا چاہئیں تو یاد رکھو یہ بات نہ مذہب کے خلاف ہوگی نہ قرآن حکیم کے خلاف' ایسا کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ اس کی منشاء کے مطابق ہوگی جو وہ کہتا ہے کہ تیرہ نہ بناؤ۔ چاند کے حساب سے رکھنے کے لیے تو یہی شکل آپ کے ہاں ہوگی کہ اس حساب سے موسموں کا تعین نہیں ہو سکے گا۔ او جی موسموں کا تعین تو ایک طرف رہا ''او عید دا تعین نہیں تہاڈے کول ہوندا'' ہر سال سر پھٹول اس کے اوپر ہوتی ہے صاحب کہ عید کس دن ہوگی۔ اور دنیا کے مسلمانوں نے تو ایک دن کوئی تقریب مقرر کرنا ایک طرف رہا ایک ملک میں ایک شہر میں نہیں متعین ہوتا۔ ہر سال اس کے لیے ایک مصیبت بنتی ہے۔

مفاد پرستی کے پیش نظر مذہبی پیشوائیت کے پروگرام کی اس نوعیت کو کفر کہا گیا ہے

بہر حال قرآن نے کہا ہے اور کہنے کی ضرورت پیش آئی ہے اس مقصد کے لیے۔ اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُحِلُّوۡنَہٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوۡنَہٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوۡا عِدَّۃَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ (9:37) کہتا ہے یہ ہے جو مذہبی پیشوائیت کرتی ہے کہ وہ ایک سال کوئی مہینے مقرر کر دیتی ہے دوسرے سال ان کو الٹ کے کوئی اور مقرر کر دیتی ہے۔ کہتا ہے فریب وہ یہ کہہ کر دیدیتے ہیں کہ صاحب چار تو پورے ہم نے رکھ دیے نا۔ کہا چار تو پورے رکھ دیتے ہیں لیکن یہ جو الٹ پھیر اس میں کرتے رہتے ہیں اس کو گھٹایا' اُس کو بڑھایا۔ کبھی اس کو کر دیا' کبھی اس کو کر دیا۔ قرآن نے کہا ہے اس کو زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ (9:37) یہ تو ان کے کفر کو زیادہ کرتا ہے۔ اسے کفر کہا گیا ہے۔ ایک سال میں ایک مہینے کو حرام قرار دینا اُسی کو دوسرے سال حلال قرار دیدینا۔ یعنی اس طرح قرآن حکیم نے جو چیزیں غیر متبدل قرار دی ہیں' ان میں یہ کیفیتیں پیدا کرنا غلط ہے۔ اور یہ ہو رہا ہے اس لیے کہ تیرہواں مہینہ' جو مہینے کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر مہینے بارہ کے بارہ ہی رکھے جائیں اور متعین کر دیا جائے ان مہینوں کو تو پھر ان کے لیے گنجائش نہیں رہتی۔ یہ اس لیے چاہتے یہی ہیں کہ تیرہ مہینے ہی رہیں تیسرے سال۔ قرآن نے اسے کفر قرار دیا ہے۔ زُیِّنَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ اَعۡمَالِہِمۡ (9:37) مذہبی پیشوائیت اس قسم کے تخریبی کام کرتے ہیں ناہمواریاں پیدا کرنے والے فساد برپا کرنے والے۔ اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم بڑے ثواب کا کام کر رہے ہیں' شریعتِ حقہ کے قائم کرنے والے ہم ہی ہیں۔

ہر سال عید کے چاند پر مذہبی پیشوائیت کا کردار قوم کے شیرازے کو پارہ پارہ کرنے کے مترادف ہے

چاند کو دیکھنے کے متعلق کس قدر ان میں شدت ہوتی ہے صاحب' اس طرح سے جمے ہوتے ہیں کہ ذرا سا ادھر اُدھر اگر ہو جائے تو کہرام مچا دیا جاتا ہے سارے ملک کے اندر کہ صاحب شریعتِ حقہ تباہ کر دی گئی ہے' احترام اٹھ گیا۔ یعنی کیا بدبختی سے کسی حکومت نے وہ کمیٹیاں اپنی بنالی تھیں۔ یعنی اپنی بنالی کا کیا مطلب تھا۔ یہ طے کیا ہوا تھا کہ ہر سال جو ملت میں' امت میں جو انتشار واقع ہوتا ہے' ایک دن آتا ہے' جسے آپ خوشی کا دن کہتے ہیں وہ بھی عزیزانِ من! صرف نام کا ہی خوشی کا دن رکھا ہوا ہے وہ تو سب سے بڑا ماتم کا دن ہوتا ہے۔ لیکن بہرحال حکومت نے یہ طے کیا کہ بابا اس کو کسی طرح ایک منظم طریقے پہ' ڈسپلن کے طریقے پہ' طے کیا جائے تو کہرام مچ گیا۔ کیوں کہرام مچ گیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ یہ دسمبر کے مہینے میں آپ کی عید لے جاتے تھے' بلکہ یہ تھا کہ اس نے مذہبی پیشوائیت کا اقتدار کیوں چھین لیا۔ بات ساری یہ تھی۔ انہی کی رویت ہلال کمیٹی ہونی چاہئے۔ اب وہ بیٹھے ہوئے ہیں شہادتیں لی جارہی ہیں۔ بہرحال اس قصے میں کیا جانا ہے' وقت ضائع ہوتا ہے۔ آپ کو بھی معلوم ہے' مجھے بھی معلوم ہے جو کچھ ہوتا ہے۔ ملت کا انتشار ان کے نزدیک ایسی بری بات نہیں ہے۔

چاند دیکھنے والے فوجی وفد پر اُٹھایا جانے والا اعتراض اور پھر اس کا حل

آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے ایک شخص کی چاند دیکھنے کی شہادت فقط اس لئے مسترد کر ڈالی کہ وہ ایک فوجی تھا۔ یہ بری فوج سے تھے، چونکہ وہ باریش نہ تھے اس لیے ان کی شہادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ ''او داڑھی ہے کہ دوربین ہیگی اے''۔ تو وہ کیا کرتے بیچارے' وہ گئے اور انہوں نے جا کے وہاں سے نیوی کے دو کیڈٹ لے آئے' نیوی والے داڑھی رکھتے ہیں' بس قبول ہوگئی صاحب شہادت۔ عزیزانِ من! کیا ہنسنا ہے' رونے کی باتیں ہیں۔ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ (9:37) انتشار اور فساد پیدا کرتے ہیں اور پھر اس کو دین کی بات بنا کے بڑے خوش ہوتے ہیں کہ کارِ نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد۔ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (9:37) جو قوم اس طرح سے انکار کرے قوانینِ خداوندی کا' بھلا اس پر کشادگی راہ کس طرح سے کھل سکتی ہے' یہ نہیں ہو سکتا۔

مکے میں گھرے ہوئے صحابہ کرامؓ کی مشکلات اور قرآن حکیم کی طرف سے اس کا حل

درمیان میں یہ ہدایات دیں اور اس کے بعد پھر وہی چیز قرآن لے آیا۔ آپ کو یاد ہے یہ جنگ کے لیے کہاں کہا گیا تھا۔ کہا یہ گیا تھا مدینے میں مملکت چھوٹے پیمانے پہ سہی' قائم ہوگئی تھی' ان کے پاس قوت تھی۔ مکے میں جو گھرے ہوئے تھے مسلمان ان کے اوپر سخت

مظالم ہورہے تھے ان کے پاس قوت نہیں تھی۔ تو قرآن نے مدینے کے مسلمانوں سے کہا تم سنتے نہیں ہو کہ مکے کے مظلوم کس طرح سے فریاد کر کے ہمیں پکار رہے ہیں کہ یا اللہ ہماری مدد کر۔ خدا سے وہ کہہ رہے تھے ہماری مدد کر اور خدا ان سے کہہ رہا تھا کہ تم سنتے نہیں ہو؛ وہ ہمیں پکار رہے ہیں اور تم پھر اٹھتے کیوں نہیں ہو جنگ کے لیے۔ پکار رہے تھے وہ خدا کو اور خدا ان سے کہہ رہا تھا کہ تم اٹھتے کیوں نہیں مظلوم کی حمایت کے لیے' جو گھر چکے ہیں۔ یہ تھا جنگ کا تقاضا جس کے لیے کہا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (9:38) جماعتِ مؤمنین! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم سے جب کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ ضروری ہوگئی ہے اس وقت' ان مظلوموں کو ان کے دستِ تظلم سے بچانے کے لیے ضروری ہوگئی ہے۔

مفادِ عاجلہ کے مقابلے میں جہانِ فردا کے مفادات کی اہمیت

کیا ہوگیا ہے کہ تمہارے پاؤں بھاری ہورہے ہیں' کیا ہوگیا ہے کہ تم اتنی تیزی سے اٹھ کے نہیں جارہے' زمین کے ساتھ چمٹے چلے جارہے ہو۔ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ (9:38) کیا یہ دنیا کی محبت اور یہاں کی جاذبیتیں غالب آرہی ہیں مستقبل کی فلاح و بہبود کے مقابلے میں' یہ بات ہوگئی ہے۔ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ (9:38) یاد رکھو یہ قریبی جاذبیتیں مستقبل کے مفاد کے مقابلے میں' جو اسی دنیا میں ہو یا اس کے بعد کی آنے والی زندگی تک چلے' اس کے مقابلے میں یہ قریبی مفاد کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ بڑی عجیب چیز یہاں کہی ہے۔ ان عربوں کی یہ کیفیت تھی کہ ان کا پیشہ ہی مالِ غنیمت کے اوپر زندگی بسر کرنے کا تھا ان کی معیشت ہی اس کے اوپر تھی' انکے لیے یہ سارا سال لڑتے رہتے تھے یہ۔ یہ تھی دنیاوی غرض۔ اور یہاں ہے فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (9:38) اٹھنا' اپنی جان دیدینا دوسرے کو ظلم سے بچانے کے لیے۔ اور لوٹ کے مال میں سے ایک پائی بھی خود نہ لینا۔ یہ تھا فی سبیل اللہ جنگ۔ کہا اس جنگ کے لیے تو بھاگ بھاگ کے تم جاتے تھے اور جنگ جب اس بلند مقصد کے لیے تمہارے لیے ہوئی تو اس وقت نظر آتا ہے کہ تمہارے پاؤں بوجھل ہورہے ہیں۔ تم نے ان مفادات اور جاذبیتوں کو زیادہ عزیز رکھا' اس اعلیٰ مقصد کے مقابلے میں۔

الم انگیز سزا کی نوعیت تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی

کہا یہ عزیزانِ من! اِلَّا تَنْفِرُوْا (9:39) یاد رکھو ایسے مواقع پہ کہ جہاں جنگ ناگزیر ہوجائے' جہاں مظلوم گھر جائیں کہیں' ان کے لیے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی کیفیت ہو' وہاں رہ رہے ہوں تو ظلم و ستم کا نشانہ' اُدھر سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ نہ ہو۔ ایسے وقت میں جب تم سے کہا جائے تو تم جنگ کے لیے نہ اٹھو' تو کیا ہوگا؟؟ یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (9:39) تو اس کا نتیجہ تمہارے لیے الم انگیز سزا ہوگا یاد رکھو۔ اب الم انگیز سزا' یہ ایک نظری سی چیز ہے محسوس طور پہ پتہ نہیں' وہ دردناک اور الم انگیز کیا سزا ہوگی۔ ایسے وقت میں جب

ظلم وستم کرنے والوں کی دست درازیاں اس حد تک آگے آگئی ہوں اور تم ان کی مدافعت کے لیے نہ اٹھو تو اس کا نتیجہ تمہارے لیے بھی سخت دردناک سزائیں ہوگی۔ دردناک سزا کیا بتائی قوم کے لیے عزیزانِ من! میں نہیں تفسیر کر رہا اگلے الفاظ بیان کر رہا ہوں۔ وَّیَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (9:39) نتیجہ اسکا یہ ہوگا کہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم آ کے تمہاری مملکت سنبھال لے گی۔ اللہ اکبر۔ یہ ہے عذابِ الیم۔ ہمارے ہاں جب بھی عذاب کی بات ہوگی وہ وہاں اٹھا رکھا ہوگا جہنم کا عذاب۔ وہ کہتا ہے کہ ایک قوم کے لیے اس سے زیادہ الم انگیز اور دردناک عذاب اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس سے حکومت اور سطوت اور مملکت چھین کے کسی دوسری قوم کو دیدی جائے اور دوسری اس کی جگہ آ کے مسلط ہو جائے۔

بنگلہ دیش میں محبوس پاکستانیوں کی حالت زار اور اسکا علاج

یہ اتنا بڑا عذاب جو دردانگیز ذلت آمیز ہے یہ کس جرم کی پاداش میں ہے؟؟ اس جرم کی پاداش میں کہ جب ایسا موقعہ آ جائے، مظلوم گھرے ہوئے ہوں، وہاں سے نکل نہ سکیں، ایک لاکھ کے قریب آپ کا مظلوم عزیزانِ من! گھرا ہوا ہے وہاں، چیخ رہے ہیں پکار رہے ہیں، آنے والے بتا رہے ہیں جوان کی وہاں حالت ہو رہی ہے۔ اونوے ہزار جتنے آپ کہتے ہیں وہ تو پھر بھی سپاہی تھے، سپاہی تو پھر بھی یہ زندگی بسر کرنا جانتا ہے، اس کا عادی ہوتا ہے۔ بیس تیس ہزار کے قریب آپ کی وہاں سول آبادی ہے جن کی عورتیں بچے ان کے ہاں محبوس ہیں۔ ہندو جیسے تنگ نظر کے شکنجے کے اندر ہیں۔ فریادیں اٹھ رہی ہیں، سب کچھ ہو رہا ہے۔ کیا ہوگیا ہمیں؟؟ قرآن کہتا ہے تمہارے کانوں میں ان کی دردناک آوازیں نہیں آ رہیں، تم کیوں نہیں اٹھتے ہو اس ظلم کو روکنے کے لیے۔ عزیزانِ من! اگلی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں کہ تم نہیں اٹھو گے تو یہی نہیں کہ وہ مظلوم وہاں کچلے جائیں گے، نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ظالم کے حوصلے اتنے بڑھ جائیں گے کہ وہ اگلا جھپٹا تمہاری اپنی مملکت کے اوپر آ کے مارے گا۔ وَّ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (9:39) تمہاری جگہ دوسری قوم آ جائے گی۔ اللہ اکبر۔ قرآن کی شہادتیں تو عزیزانِ من! آپ دیکھئے زندہ واقعات بہم پہنچا رہے ہیں۔ کوئی علاج اس کا نہیں ہے! کوئی معاہدے اس کا علاج نہیں ہے، کسی قسم کی گفت وشنید اور مذاکرے اس کا علاج نہیں ہیں، کسی قسم کا دوسری قوموں سے مدد مانگنا، اس کا علاج نہیں ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ یہ قوم اس طرح سے اٹھ کے کھڑی ہو جائے کہ یا تو ہم نے عزت کی زندگی جینا ہے یا اس کے بعد جان دیدینی ہے۔ وہ کہتا ہے اگر یہ کیفیت تمہاری نہ پیدا ہوئی تو یہی نہیں کہ تمہارے مظلوم وہاں ختم ہو جائیں گے، تمہاری اپنی مملکت ختم ہو جائے گی۔ دوسری قوم جگہ لے لے گی۔ کون دوسری قوم ہوگی یہ تو وہ آپس میں فیصلہ کریں گے۔ کئی قومیں ہیں جو گھات میں بیٹھی ہوئیں ہیں۔

عقاب اپنے پنجے میں لی ہوئی چڑیا کب چھوڑتا ہے

ایک ہی طریقہ قرآن نے بتایا ہے عزیزانِ من! بچنے کا۔ تم رحم کی اپیلیں کر رہے ہو‘ تم شرافت کے واسطے دے رہے ہو ان کو‘ تم معاہدات کے تقاضوں کی طرف توجہ کر رہے ہو۔ کیا ایک مصرعہ میں کہہ گیا ہے اقبالؒ ‘ کہتا ہے ؎

دلِ شاہیں نمی لرزد بآں مرغ کہ در چنگ است

کہتا ہے کیا کہہ رہے ہو‘ عقاب یا باز کے پنجے کے اندر جب چڑیا آ جاتی ہے تو وہ چڑیا رحم کی درخواستیں کرتی ہے تو اس کا دل پسیج جاتا ہے اس سے کیا؟ کبھی نہیں پسیجا کرتا۔ مستبد اور ظالم قوموں سے‘ درندوں سے جن کے پنجوں کے اندر مظلوم آ چکے ہوئے ہیں‘ ان سے رحم کی درخواستیں کرتے ہو اور درندوں کو انسانی شرافت کے واسطے دے رہے ہو۔ معاہدوں کی بات کر رہے ہو جن معاہدوں کے متعلق ان کا ایمان یہ ہے کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہوتا ہے۔ اپنے سے کمزور کو تو پھانس لیتا ہے‘ اپنے سے زبردست کے مقابلے میں ذرے جتنی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک ہی علاج ہے عزیزانِ من! کوئی دوسرا علاج نہیں۔ پوری کی پوری قوم اس کے لیے اٹھ کے کھڑی ہو جائے۔ اور پھر اگلی چیز کہ اگر ایسا نہ کرو گے عزیزانِ من! میں تو جب ان آیات پہ آتا ہوں‘ دل لرز جاتا ہے وَّ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (9:39)۔ یہ جو استبدالِ قومی ہے ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے جسے قرآن نے عذاب الیم بتایا ہے‘ اس سے بڑا عذابِ الیم اور کیا ہوگا اس قوم پہ۔ دو جرائم اس کے لیے گنائے ہیں قرآن نے جس کی بناء پہ وہ کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہو جاتا ہے۔

ظالم قوم کے استبداد سے بچنے کا طریق نظام سرمایہ داری کی جگہ نظام ربوبیت کو اپنانے میں ہے

سورۃ محمد کی آیت 38 میں کہا یہ ہے ھٰۤاَنۡتُمۡ ھٰۤؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ فَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ (47:38) کہا کہ یہ نظامِ سرمایہ داری جس میں ہر شخص یہ کہتا ہے کہ جتنا کچھ میں اپنی ذات کے لیے سمیٹ سکوں‘ سمیٹ کے رکھ لوں۔ کہتا ہے اگر یہ نظام تمہارا رہا اور تم اسے انسانیت کی فلاح اور بہبود کے لیے اپنی محنت کی کمائیوں میں سے عام نہ کرو یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ (47:38) اور اس کو سمٹا کے فقط اپنی ذات کے لیے رکھو۔ وَاللّٰهُ الۡغَنِیُّ وَاَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ (47:38) یہ جو کہا گیا ہے فی سبیل اللہ دو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا جھولی پھیلائے ہوئے تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ وہ تو غنی عن العلمین ہے‘ محتاج تو تم ہو۔ میں کہہ رہا تھا‘ قرآن نے جو دو چیزیں بتائی ہیں استبدالِ قومی کی کہ اگر ایسا کرو گے تو پھر دوسری قوم تمہاری جگہ لے لے گی۔ کہا اگر یہ کرو گے کہ اپنی دولت کو اس طرح سے اپنی ذات کے لیے سنبھال کے رکھو گے‘ اس راستے کے اندر کھلا نہیں رکھو گے۔ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا (47:38) اگر تم نے یہ راستہ اختیار کیا‘ صحیح راستے سے اگر تم نے منہ موڑ لیا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (47:38) تو تمہاری جگہ

ایک اور قوم آ جائے گی اور ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (47:38) وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ یعنی انہی جیسی وہ قوم ہو تو پھر تو استبدال کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دوسرے مقام پہ یہ کہا ہوا ہے۔ یہاں تو کہا ہے تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ دوسرا مقام ہے اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ o عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْھُمْ (41-70:40) یادرکھو اگر ایسا کرو گے تو ہم اس پہ بھی قادر ہیں کہ پھر ایک ایسی قوم کو لے آئیں جو تم سے بہتر ہوگی۔

قوموں کے جرائم کو تولنے کا ترازو اور اس سے بچنے کا طریق

اب یہ جو جرائم گنائے گئے ہیں' ان میں ہی اگر وہ بہتر ہوگی تب بھی وہ جگہ لے لے گی۔ یہ نہیں ہے کہ تم اپنے معیار متقی پرہیزگار ہونے کو ان کے اوپر تولتے پھرو۔ یہ جو دو جرم گنائے گئے ہیں ایک تو یہ کہ اس دولت کو تم اپنے ہی ہاں سمیٹ کے رکھ لو گے' انسانیت کی فلاح کے لیے عام نہ کرو گے۔ یہ جرم ہے جس کی پاداش میں یادرکھو یہ چھن جائے گا' دوسری قوم لے لے گی۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ اگر ایسے وقت میں تم جنگ کے لیے نہیں اٹھو گے ظلم کو روکنے کے لیے تو یادرکھیے پھر وہ قوم کہ جو اس اعتبار سے بھی تم سے بہتر ہوگی۔ یعنی جنگ کے اعتبار سے بھی تم سے اگر وہ بہتر ہوئی تو یادرکھیے وہ تمہاری جگہ لے لے گی۔ اور یہ عذاب الیم ہے۔ قَوْمًا غَیْرَکُمْ وَ لَا تَضُرُّوْہُ شَیْئًا (9:39) اور تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ نہ تمہاری نمازوں سے اس کا کچھ سنورتا ہے' نہ تمہارے انکار سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ یہ تمہارا ہی سب کچھ بگڑتا ہے' تمہارا ہی سنورتا ہے جس کے لیے یہ کہا جا رہا ہے۔ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (9:39)

جنگ بدر کے صرف ڈیڑھ سال کے بعد مسلمانوں کی تمدنی زندگی کا سابقہ دور کے ساتھ موازنہ

ہم نے تو ہر چیز کے لیے قوانین اور پیمانے مقرر کر دیے ہوئے ہیں اس کے مطابق نتائج نکلتے چلے جاتے ہیں' ہمارا تو اس میں کچھ بگڑتا ہی نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی ٹھیک ہے مدینے کی مملکت اتنی طاقتور نہیں ہوگئی۔ کہا یہ جو موجودہ تمہاری حالت ہے ذرا اس سے پہلے کی حالت پہ غور تو کیجئے۔ بدر کی جنگ سے ڈیڑھ ہی سال پہلے کی حالت پہ غور کیجیے اس کے مقابلے میں پھر آج کی حالت جب تمہارے سامنے آئے گی تو نظر آئے گا کہ یہ تمہارا عذر قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کہ ہماری حالت کمزور ہے۔ کہتا ہے تمہیں بتاؤں تمہاری حالت پہلے کیا تھی۔ اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (9:40) ابھی تو دو سال پہلے کی بات ہے تمہیں اور تمہارے رسول کو ان مکے والوں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ سن 1947ء میں جس طرح سے ہمیں نکالا تھا ان لوگوں نے ہمارے سامنے ہے۔ کہتا ہے تمہیں اُنہوں نے گھر بار سے نکال دیا تھا' یہ کیفیت تھی تمہاری بیچارگی اور بے بسی کی۔ اور اس کے بعد حالت یہ تھی کہ رسول اور اس کا ایک ساتھی صاحبِ غار اور صاحبِ سفر ابوبکر صدیقؓ۔ ثَانِیَ اثْنَیْنِ (9:40) اندازہ لگائیے جو نقشہ کھینچ رہا ہے قرآنِ کریم اس حالت کے مقابلے میں صرف دو برس پہلے کی حالت کا' کتنا کلائمکس پہ پہنچاتا ہے اپنے محاکات میں کہ تمہیں انہوں نے گھر بار سے نکال دیا تھا۔

ہجرت کے دوران نبی اکرم ﷺ کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حزن کی کیفیت

وہ دو تھے جو اپنی حفاظت کے لیے غار میں اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ (9:40) چھپے ہوئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ اور کلائمکس کی صورت نہیں ہوسکتی۔ گھر بار سے نکالے جائیں، صرف دو ہوں، وہ بھی اپنی حفاظت کے لیے غار میں چھپے ہوئے ہوں۔ کہتا ہے یاد ہے تمہیں۔ اور پھر وہاں کیفیت یہ تھی اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (9:40) کہ اس حالت میں جب تمہارے رسول نے اپنے ساتھی کی پیشانی پہ نگاہ ڈالی اور اندازہ لگایا کہ اس خیال سے کہ اس مقدس ہستی کو کچھ گزند نہ پہنچ جائے، اس میں کچھ حزن پیدا ہوا۔ عزیزانِ من! عجیب چیز ہے قرآن کا لفظ۔

لفظ حزن کی محسوس شکل کے لیے ایک زندہ مثال

یہاں حزن کہا ہے خوف نہیں کہا۔ بڑی چیز ہے یہ۔ خوف تو وہ تھا جب اپنی جان کے متعلق کوئی خطرہ نظر آ رہا ہو، حزن وہ ہوتا ہے جو کسی کے غم کے احساس سے دل کے اندر ایک دلبرداشتگی سی پیدا ہو جائے۔ یہ ایسی کیفیت کہ دل میں آزردگی پیدا ہو جائے۔ عرب حزن کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے کہ جب ایک مزدور مزدوری کے لیے جائے، مزدوری اُسے نہ ملے، دن بھر بیچارہ اِدھر اُدھر بے کار پھر کر گھر کی طرف آ رہا ہو اور گھر میں بچے بھوکے بیٹھے ہوئے ہوں تو جس انداز سے وہ گھر کی طرف قدم اٹھاتا ہے اسے وہ حزن کہا کرتے تھے۔ یہ خوف نہیں ہوتا یہ کچھ اور چیز ہوتی ہے۔ خود لفظِ حزن نے یہ بات بتا دی کہ جس طرح سے یہ بات ان بچوں کی اس تکلیف کی وجہ سے دل میں آزردگی اور افسردگی آ رہی ہے، اس طرح سے اس ساتھی کے دل میں ایک کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔

حساس ترین حالات کے اندر بھی مقام نبوت کی طرف سے یقین محکم کا اظہار استقامت، یہ مقام عظمت کا اظہار ہے

نظر آ رہا ہے کہ اس ساتھی کی وجہ سے تھی، اس کے مشن کی وجہ سے تھی۔ ایسی حالت میں جب اس نے اندازہ لگایا کہ یہ ساتھی ان چیزوں کے متعلق سوچ رہا ہے۔ یقین اتنا بڑا تھا اپنے مشن کی صداقت کے اوپر کہ کہا لَاتَحْزَنْ (9:40) مت حزن کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (9:40)۔ دیکھو بے کسی اور بے بسی کی انتہا کے اندر یہ چیز کہی گئی ہے کہ اس زمانے میں بھی اس کو اتنا یقین تھا تو آج تو اس کے مقابلے میں، کہیں حالت بہتر ہوگئی ہے۔

قیام پاکستان کے وقت ہماری عسکری اور مالی ناگفتہ بہ حالت

عزیزانِ من!۔جس حالت میں ہم تقسیم کے زمانے میں یہاں آئے ہیں' آپ احباب اگر یہاں کے رہنے والے تھے تو خدا آپ کو نہ دکھائے وہ دلدر جو ہم نے دیکھے تھے جو وہاں سے آئے تھے۔یقیناً اس کے بعد آج اس بگڑی ہوئی حالت میں بھی عزیزانِ من! ہم اس حالت کے مقابلے میں کہیں بہتر ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ ایک سپاہی بھی آپ کو نہیں ملا تھا ایک گولی بھی آپ کو نہیں ملی تھی بندوق کی۔ ساری فوجیں وہاں تھیں سارا اسلحہ ان کے پاس تھا۔اور آپ حیران ہونگے کہ ہم جب آئے ہیں کراچی میں' میں تو دفتر میں تھا' ہوم ڈیپارٹمنٹ میں تھا' تقسیم کرا کے لایا تھا اپنا اثاثہ۔جب یہاں آئے تو پہلے مہینے کی تنخواہیں دینے کے لیے پیسہ نہیں تھا ہمارے پاس۔وہاں سے کچھ ریلیز ہوا تھا روپیہ اور وہ بھی ایسے جیسے خیرات کی چیز۔وہ گاندھی جی مرنے والے نے یہ چیز کہی تھی۔وہ اتنا روپیہ کروڑوں روپیہ حساب کی رو سے ان کے پاس' ہندو ہے' دیا ہی نہیں تھا اس نے۔ہم آ کے کراچی میں بیٹھے تھے ہم درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے ہمارے پاس میز کرسی نہیں تھی' کاغذ نہیں ہمیں مل رہا تھا۔عزیزانِ من! اس حالت کے اندر۔آج تو کہیں بہتر ہے آپ کی حالت۔صرف ایک چیز تھی اس زمانے میں کہ ایک ندائے جمال تھی جو ہم میں سے ہر ایک کے کان میں یہ کہہ رہی تھی کہ لَاتَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (9:40)۔آج یہ بات نہیں ہے اور سب کچھ مل گیا ہے یہ بات نہیں رہی اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (9:40)۔کہا کہ فَاَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلَیۡہِ (9:40) اس حالت میں خدا نے سکون پیدا کیا اس کے دل میں۔

جنگ بدر میں غیبی مدد کی وہ نوعیت جسے انسان دیکھ نہیں سکتا

وَ اَیَّدَہٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡهَا (9:40) اور پھر ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی۔پھر وہ لفظ آ گیا۔جہاں خدا نے یہ کہا ہے کہ جسے غیبی مدد آپ کہتے ہیں وہ ان کے ذریعے سے ہوئی جنہیں دیکھ نہیں سکتے تھے تم۔یہ جو مدد ہوتی ہے یہ دلوں کی مدد ہوتی ہے' تم ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔وہ سفید گھوڑیوں والے اور سبز عماموں والوں نہیں تھے جو تمہیں نظر آ رہے تھے۔تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔اور اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ ہے جی مقصد سارا جنگ کا۔

کلمہ تو انسانی زندگی کے حقائق کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنے کا نام ہے

وَ جَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا السُّفۡلٰی وَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ هِیَ الۡعُلۡیَا (9:40) ہوا یہ اس کے بعد' یہ دیکھئے کلمہ کا لفظ کہاں آ رہا ہے۔ہمارے ہاں تو کلمہ اب پتہ ہے ''جس کم لئی ہوندا ہیگا'' اب تو میں سمجھتا ہوں کلمے کا وہ مصرف بھی چلا گیا۔ہمارے ذرا پہلے بڑھی

بوڑھیوں کے ہاں ہوتا تھا' کوئی چیز برتن پلید ہوجاتا تھا ''کلمہ پڑھ کے تین واری دھولو''۔ بہرحال ایک چیز کے لیے تو تھا۔ ہماری اگلی نسل کو شائد یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کلمہ کس کو کہتے ہیں عزیزانِ من!۔ لیکن آپ لفظ دیکھئے قرآن کا یہ جامع لفظ کلمہ جو ہے' وہ کسی بنیادی اصول کو کہتے ہیں۔ جب وہ نظری حیثیت رکھتا ہے صرف تو اسے کلمہ کہا جاتا ہے جب وہ عمل میں آجاتا ہے تو اسے سنت اللہ کہا جاتا ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) قرآن حکیم میں جو اصول بیان کیے جاتے ہیں ان کو بھی نہیں کوئی تبدیل کر سکتا۔ اور اُدھر یہ کہا گیا ہے وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا (33:62) جب یہی اصولِ خداوندی عمل میں آتے ہیں' کنکریٹ شکل اختیار کر لیتے ہیں ان میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یاد رکھو' نتائج کے اعتبار سے سامنے آتے ہیں۔

دنیا بھر میں انسانی زندگی کے خودساختہ نظامِ حیات پر فتح حاصل کرنے کے لیے خدا کے کلمے کو بلند کرنا ہوگا

بات آگئی کلمہ کی کہ ان کفار کے کلمہ کو شکست ہو' خدا کا کلمہ بلند ہوجائے۔ تو یہ کلمہ صرف یہ الفاظ نہیں تھے کہ کسی اونچی جگہ جا کر اپنا کلمہ اور نیچے اُن کا کلمہ لکھ دیا جائے۔ ان معنوں میں تو ان کا کلمہ ہی کوئی نہیں تھا۔ یہ الفاظ کی بات نہیں ہے دین کے اصول ہیں نظریہ حیات کا نام ہے۔ تاکہ خدا کا دیا ہوا نظریۂ حیات بلند ہوجائے اور اس کے مقابلے میں انسانوں کے خودساختہ نظریاتِ حیات پست ہوجائیں۔ یہ ہوا مقصد اسلام کی جنگ کا۔ اسی کو کہا تھا یہ جو دو آیتیں پہلے آگئی تھیں هُوَ الَّذِيۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَ دِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ (9:33) یہاں عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ (9:33) کہا مقصد اس کا یہ ہے کہ جتنے دوسرے انسانوں کے خودساختہ نظامہائے حیات ہیں ان سب پہ یہ نظامِ زندگی غالب آئے۔ یہ ہے مقصد اور اسی کو یہاں کہا ہے کہ کلمۃ الکفر جو ہے وہ مغلوب ہوجائے اور خدا کا جو کلمہ ہے (ھی العلیا)۔

خدا کے کلمے کی دو بنیادی خصوصیات وہ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی ہے

وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ (9:40) اور اس کے دو طریقے ہونگے ایک تو یہ ہے عزیز' قوت ہونی چاہئے۔ قوت چنگیزی نہیں ہونی چاہئے' ہلاکو کی نہیں ہونی چاہئے۔ وہ بھی قوت ہوتی ہے۔ حَكِيۡمٌ (9:40) Reason پر مبنی ہونی چاہئے۔ دونوں چیزیں اکٹھی ہونی چاہئیں اس سے یہ ہوگا کہ خدا کا کلمہ بلند ہوگا اور انسانوں کا خودساختہ کلمہ جو نیچے ہوگا۔ اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ وَ اَنۡفُسِكُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ (9:41) کہا کوئی بات نہیں ہے' تمہاری کچھ بات نہیں ہے جو اصولِ زندگی لے کے تم چلے ہو' وہ بڑے بلند ہیں ان کے اندر بھی تو بہت بڑی قوت ہے۔ عزیزانِ من! اور اصولِ زندگی جو بیلنس کر دیتا ہے بلکہ غالب کر دیتا ہے جماعتِ مؤمنین کو ان کے مقابلے میں۔

قوانین قرآنی پر یقین محکم اور جہاں فردا پر ایمان نصرتِ خداوندی کے حصول کا ذریعہ ہیں

قرآن نے کہا تھا کہ ایک ایک تم میں سے دس دس پر بھاری ہوگا اور دو دو پر تو یقیناً بھاری ہوگا۔ اور باقی ماندہ یہ کونسی چیز پوری کرتی ہے ان کی۔ اس کو خدا کی نصرت کہتے ہیں جس سے دل کے اندر ایک یقین پیدا ہوتا ہے۔ دو چیزیں ہیں جو قرآن نے اس کے متعلق گنائی ہیں۔ میدانِ جنگ کا سپاہی اور فوج کے احباب اس چیز کو Appreciate کریں گے۔ میدانِ جنگ کے اندر سپاہی کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ اُسے یہ یقین ہو کہ میں اگر یہاں جان دیدونگا تو میرے پیچھے جو میرے بچے ہیں وہ بھوکے نہیں مریں گے۔ ایک چیز۔ قرآن کے نظام میں یہ چیز کہی گئی ہے کہ کہدوان سب سے کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَ اِیَّاکُمۡ (17:31) تمہارے روٹی رزق کے بھی ہم ذمہ دار ہیں ان کے رزق کی بھی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ یہ یقین ہو۔ اور دوسرا یقین یہ کہ میرے جسم کو اس میدان میں موت آجائے گی اس سے میں مرونگا نہیں بلکہ میری زندگی مسلسل آگے چلے گی۔ اگر کسی سپاہی کو دونوں چیزوں کا یقین ہو جائے اور یہ ہے کلمت اللہ کہ میں نے تو مرنا ہی نہیں ہے، سوال ہی نہیں ہے۔ موت تو جسم کو آتی ہے، جسم کی موت سے میرا تو کچھ نہیں بگڑتا۔

جسم و جاں کا فرق موت و حیات کے فرق کو واضح کر دیتا ہے جس سے نہ خوف باقی رہتا ہے، نہ ہی حزن

جسم کس چیز کا نام ہے؟؟ یہ جتنے اعضاء ہیں ان اعضاء کے مجموعے کا نام جسم ہے۔ اگر آپ کا بازو کٹ کے الگ ہو جاتا ہے تو آپ کی میں میں کوئی کمی آجاتی ہے؟؟۔ ایک ذریعہ تھا کام کرنے کا بہر حال وہ نہیں رہا۔ اب تو وہ مصنوعی بھی لگا دیتے ہیں اس کی جگہ۔ دوسرا بازو بھی کٹ جاتا ہے آپ کی زندگی یا حیات میں تو فرق نہیں آجاتا۔ اور اگر ایک ایک عضوء کے کٹ جانے سے نہیں آتا تو سارا جسم اگر کٹ جائے تو پھر کیا فرق آجائے گا۔ یہ یقین کہ اس سے میں نہیں مرونگا زندگی آگے چلے گی تو موت کا ڈر ختم ہو گیا۔ یہ تو تھا خوف۔ اور حزن کی بات یہ کہ وہ پیچھے رہ جائیں گے بھوکے، وہ پہلے یقین کے ساتھ بات ختم ہو گئی۔ اب بتایئے کہ اس سپاہی کا کوئی مقابلہ کر سکتا ہے، کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا۔ یوں وہ کمی پوری ہوتی ہے۔ اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا (9:41) کوئی بات نہیں کسی معاملے کے اندر تم ان سے بھاری ہو اگر کسی معاملے کے اندر ان سے کم بھی ہو تو تم مت گھبراؤ۔

حیات بے شرف اور حیات مرگِ باشرف کے لوازمات اور مقامات میں ایک بنیادی فرق ہے

اس یقین کے ساتھ وَّ جَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (9:41) اس راہ کے اندر تم پھر جہاد کے لیے اٹھو۔ دولت کی ضرورت ہے وہ دیدو، جان کی ضرورت ہے وہ ہتھیلیوں پہ لے کے میدانِ جنگ میں آجاؤ۔ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ

تَعْلَمُوْنَ (9:41) اگر تم ذرا بھی علم وحقیقت کو سامنے رکھ کے غور کرو گے تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہوگا۔ یہ جو حیاتِ بے شرف ہے عزیزانِ من! اس سے تو وہ مرگِ باشرف ہزار درجے اچھی ہوگی اگر تم ذرا علم وحقیقت کو سامنے رکھ کے دیکھو۔ کہا یہ ہے جو زندگی تمہیں دی ہے۔ اور اگر تم نے یہ نہ کیا' اگر تم اس قتال کے لیۓ جنگ کے لیے جہاد کے لیۓ نہ نکلے تو پھر یاد رکھئے وہ جو کہا ہے الم ناک عذاب کہ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری قوم تمہارے اوپر حاکم بن کے آ جائے گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ وہ آ کے تمہیں قتل کر دیں گے یا تمہیں زمین میں دھنسا دیا جائے گا بلکہ تم زندہ رہو گے' سانس لینے والے۔ یہی چیز ہے اگر تم سب کے سب ختم ہو گئے تو وہ ذلت آمیز عذاب کیا ہوا۔ ذلت آمیز عذاب تو یہ ہے کہ ان جیسوں کی محکومیت کے اندر آ جاؤ تم۔

جہاد کے خلاف سطح ہموار کرنے کی خاطر انگریز کی سازش اور سید احمدؒ بریلوی اور مولانا اسماعیلؒ شہید کی سعی وکاوش کا ذکر

یہ تھی عزیزانِ من! قرآن کی رو سے جہاد یا جنگ کی اہمیت کہ اگر اس میں تم نے کمی کی تو پھر تم باقی نہیں رہ سکتے۔ اور یہ تھی وہ سب سے بڑی سازش یہاں آنے کے بعد جو انگریز نے کی تھی۔ وہ جنگِ آزادی جسے غدر کہا جاتا ہے' عام طور پہ اس کے بعد اس نے محسوس کیا تھا۔ یہاں ہمارے ہاں ایک ایسی جماعت تھی جنہوں نے یہ کہا تھا کہ مسلمانوں کے اوپر جہاد فرض ہو چکا ہوا ہے اور انگریز کو اس سے بڑا خطرہ پیدا ہوا تھا۔ اگر یہ جذبہ ان کے اندر بیدار ہو گیا تو یہ کسی کے پاؤں نہیں ٹکنے دیں گے۔ یہ آیتیں تھیں اس زمانے میں جنہیں ہمارے ہاں سید احمدؒ بریلوی اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی جماعت نے پیش کی تھیں کہ اگر تم نہ نکلے تو یاد رکھئے عذابِ الیم میں گرفتار ہو جاؤ گے' تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔ یہ تھا خطرہ جو انگریز کو پیدا ہوا تھا اور جس کے لیے اس نے یہ سازش اتنی زیادہ پھیلائی کہ ایک مامور من اللہ انہوں نے بنا کے نازل ہمارے سروں پہ کر دیا اس نے کہا کہ میں ایک ہی بات لے کے آیا ہوں خدا کی طرف سے اور وہ یہ ہے کہ اب جہاد حرام ہو گیا ہوا ہے۔ کیا کہہ گیا وہ اقبالؒ کہ

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے یہ صورتِ چنگیز

آہمسہ کی آواز کو بلند کرنے کی خاطر گاندھی کی طرف سے شعبہ تعلیم کا سہارا

چنگیز کی بات بھی خوب کہہ گیا ہے یہ شخص۔ یہ مغل تھے۔ بڑی دور جاتا تھا یہ شخص اور بڑے فخر سے یہ کہتا تھا۔ محکوم کے الہام سے اللہ

بچائے۔ یہ چیز ہمیں پڑھائی گئی یہی چیز تھی جس کا اعادہ اس کے بعد آ کے تحریکِ پاکستان کے زمانے میں گاندھی نے جو آہمسہ کی تعلیم آپ کو دی تھی۔ یہ ساری وہی سازش چلی آ رہی تھی۔ اُنہیں پتہ تھا کہ ہندو کے مقابلے میں اگر مسلمان کے دل میں یہ جذبہ بیدار ہو گیا تو بڑی سخت جان قوم ہے۔ جوں لگا ہے وہ آہمسہ' آہمسہ' آہمسہ وہی آہمسہ کی آواز یہاں آتے ہوئے آپ نے سنی تھی نا' کابل سے آتے ہی باچا خان صاحب نے یہ کہا تھا آہمسہ کا پرچار کرنے کے لیے کہا تھا۔ گاندھی نے بھی یہ چیز کہی تھی جب منزل گاہ سندھ کا معاملہ آیا ہے' میں کیا عرض کروں اس زمانے کی تاریخ' کبھی وقت ہو تو سن لیجئے گا مجھ سے میں تو اس کے اندر تھا۔ ہمیں وہ آہمسہ کا سبق دیتا چلا جا رہا تھا۔ سندھ میں منزل گاہ کی مسجد جو شہید کی گئی تو اس زمانے میں وہاں کے مسلمان ذرا اٹھے اُس نے یہ پیغام دیا تھا ہندوؤں کو کہ مرد ہی نہیں عورتوں کو بھی پستول چلانا سکھاؤ کہ ضرورت پڑنے پہ اس کو استعمال کیا جائے۔ وہاں یہ کیفیت تھی۔ جو ہمارے ہاں چلی آ رہی تھی۔ آج بھی جتنا زور لگایا جا رہا ہے معاہدات کے اوپر' اقتصادیات کے اوپر' معیشت کے اوپر' روٹی کے اوپر' توجہ اُدھر بانٹی جا رہی ہے قوم کی۔ ٹھیک ہے ضروری چیز ہے۔

امت مسلمہ کا ہر فرد ٹکنیکی طور پر مجاہدانہ صفات کا حامل ہونا چاہیے

سوال یہ ہے کہ پہلی چیز پہلے ہونی چاہئے۔ قرآن کی رو سے پوری کی پوری امت' پوری کی پوری قوم' سپاہیوں کی قوم ہونی چاہئے۔ قرآن نے کوئی آپ کے ہاں الگ آرمی کا تصور نہیں دیا۔ ٹھیک ہے ٹکنیکی طور پہ آپ کے ہاں ایسا ہونے چاہیے جو ان چیزوں کو سیکھیں۔ لیکن قرآن حکیم کی رو سے ہر مسلمان سپاہی ہونا چاہئے عزیزانِ من! ۔ اور یہی ہے جواب دنیا میں ان قوموں کے استبداد کا کہ جن کے پنجے میں اگر چڑیا آ جاتی ہے تو ان کے دل میں رحم نہیں آتا۔ یہی قرآن نے کہا تھا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (9:41) یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم ذرا علم و حقیقت کو سامنے رکھو۔ وقت ہو گیا عزیزانِ من! ہم سورۃ توبہ کی آیت 41 تک آج آ گئے 42 سے آئندہ ہم شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

چھٹا باب: **سورۂ توبة** (آیات 42 تا 51)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جہاد کی اہمیت کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کی بشری حیثیت سے آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی وضاحت

عزیزانِ من! آج مارچ 1973ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی 42 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔

(9:42)

جہاد ایک ایسا عظیم ترین احسنِ عمل ہے کہ جس سے پہلو تہی کا نتیجہ جہنم بتایا گیا ہے

آپ کو یاد ہے کہ بات چلی آ رہی ہے جہاد کی، جہاد کی آخری شکل قتال ہے۔ جیسا میں نے کہا تھا اس کے لیے جہاد کا لفظ بھی آتا

ہے اور اس کی آخری شکل کے طور پر قتال کا لفظ بھی آتا ہے۔ اس کی اہمیت کے متعلق تو پچھلی دفعہ یہ آیت سامنے آ گئی تھی۔ اِلَّا تَنۡفِرُوۡا یُعَذِّبۡکُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا وَّ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (9:39) یاد رکھو اگر تم اپنے آپ کو ہر وقت جہاد کے لیے تیار نہیں رکھو گے اور جب اس کی ضرورت پیش آئے تو میدانِ جنگ میں نہیں نکل جاؤ گے' تو ایک الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے اور وہ الم انگیز عذاب یہ ہوگا کہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی۔ یعنی جیسا کہ اسلامی نظام میں جہاد عظیم ترین احسنِ عمل ہے' اس سے بڑا کوئی اور عمل ہے نہیں' اس میں فاتح منصور ہونا یا اس میں جان دے کر حیاتِ جاوداں حاصل کر لینا۔ تو جہاں اس کی اہمیت اور عظمت کا یہ عالم ہے اُسی نسبت سے اس سے اگر گریز کی راہیں تلاش کی جائیں یا اسے اپنی زندگی کا مسلک و معمول نہ بنایا' نصب العین نہ رکھا جائے تو اُسی نسبت سے اس کا جو نتیجہ بتایا ہے وہ یہ کہ تم پر دوسری قوم مسلط کر دی جائے گی۔

جہاد فی سبیل اللہ ایک ایسی جست ہے جس سے انسان اپنی ہر منزل کو با آسانی عبور کر لیتا ہے

جہاں دوسری طرف جان دیدینے سے حیاتِ جاوداں اور سیدھا جنت میں پہنچنے کی نوید ہے' اس سے جی چرانے کا نتیجہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔ یعنی کوئی بین بین کی شکل ہے نہیں کہ تمہیں شکست ہو جائے گی' کمزوری ہو جائے گی' ذلت ہو جائے گی اور پھر کچھ عرصے کے بعد یہ کمزوریاں دور ہو جائیں گی تو کوئی بات نہیں۔ نہیں!! درمیان کی راہ ہی نہیں ہے۔ جہاں تو یہ کیفیت ہے کہ عشق کی اک جست نے طے کر دیے قصے تمام' میدانِ جنگ میں گئے اور وہاں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے اگر جان دیدی تو جتنے قصے ہیں حساب کتاب کے وہ تمام پاک ہو جائیں گے' عشق کی اک جست' ان کو طے کر دیتی ہے اور زندگی کے بلند تریں مقام کے اوپر یہ شخص پہنچ جاتا ہے۔ اسی نسبت سے اس عمل سے اگر جی چرایا جائے اور گریز کی راہیں نکالی جائیں تو جو گرتا ہے تو وہ بھی راستے کے کسی مقام میں اٹکتا نہیں ہے۔ وہاں بھی قوم کی کیفیت یہ ہے کہ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (9:39) تو تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔

صدرِ اول میں جماعت مومنین کا تو ہر فرد مجاہدانہ صلاحیتوں کا حامل تھا

یہ ہے جہاد کا مقام دین کے نظام میں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو نبی اکرم ﷺ کی اس جوہرِ تابدار حدیث میں جو آئی ہے' پوچھا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب جہاد نہ ہو رہا ہو تو جہاد کے لیے تیاری کرے اور جو جب ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو۔ مومن کی زندگی یہ ہے جدوجہد پیہم' اسی کا نام جہاد ہے' اس میں تو ایک سانس بھی ایسا نہیں جس میں مومن اس Struggle یا اس جہد سے یا اس جہاد سے فارغ ہو جائے۔ یہاں تو قدم قدم کے اوپر ٹکراؤ ہوتا چلا جائے گا آپ کا تخریبی قوتوں کے ساتھ۔ اور اس ٹکراؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کو ہر وقت تیار رہنا ہوگا۔ یہاں صورت ہی یہ ہوگی کہ جہاں باز وسمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا

ہے کہ جہاں اس کا صلہ اتنا بڑا ہے، صلہ کیا جہاں اس کا فطری نتیجہ اتنا عظیم ہے کہ جان دیدینے سے یہ راستے کے تمام مرحلے طے ہو جاتے ہیں اُسی طرح اس سے گریز کی راہیں نکالنے سے، اس سے جی چرانے سے جو پستی کی طرف آتی ہے قوم تو کیفیت پھر یہ ہوتی ہے کہ راستے میں نہیں پھر یہ اٹکتی، پھر استبدالِ قومی ہے تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔ یہ ہے جہاد۔ اور یوں یہ نہیں کہ کوئی سٹینڈنگ آرمی الگ ہے جس کو ریکروٹ کر کے وہاں لے جاتے ہیں کہ ان پہ تو جہاد فرض ہے اور باقی قوم لوٹ مار کرتی پھرے یہ تو سارے مومنین کا فریضہ ہے، یہ پوری کی پوری جماعت مومنین کی، مجاہدین کی جماعت ہے، ان میں سے ہر ایک سپاہی ہے۔ آپ کے صدرِ اول میں کوئی خاص الگ سٹینڈنگ آرمی نہیں ہوتی تھی، ہر مومن اس کے لیے تیار ہوتا تھا۔ اور پھر یہ ذہنیت کہ وہ ہر وقت اس کے لیے آمادہ رہے اس کی خاطر جان دینے کے لیے، یہ وہ چیز تھی جس نے چند سال کے عرصے میں اس قوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ لیکن اس کے بعد ایک ہی چیز ہے استبدالِ قومی۔

جہاد کے تصور سے دوری اور نظام سرمایہ داری کا نتیجہ صرف جہنم ہے

دو نمایاں چیزیں قرآن نے بیان کی ہیں سورۃ محمدؐ کی آخری آیت میں یہ کہا تھا کہ اگر تم نے سرمایہ داری کا نظام اپنے ہاں رکھا کہ ہر فرد اپنی ذات کے لیے سمیٹتا چلا جائے تو اس کا نتیجہ بھی یہ ہوگا کہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔ یہاں یہ آیا ہے کہ اگر تم نے جہاد سے جی چرایا تو پھر بھی استبدالِ قومی ہو جائے گا۔ یہ جسے Capital Punishment کہتے ہیں کہ یہ جرم وہ ہے جس کی سزا موت ہے۔ یہ وہ جرائم ہیں جن کی سزا استبدالِ قومی ہے۔ سب کچھ چھن جاتا ہے۔

خوف وحزن کے اس جہنمی نظام سے بچنے کا طریق

اور اس کا علاج پیوند سازی نہیں ہے۔ ان دونوں مقامات پر اکنامک سسٹم یا اقتصادی نظام، اسی قسم کا انقلاب لانا ہوگا۔ اور دوسری جگہ جہاد کی جو صورت ہے، میں پوری قوم کو مجاہد یا سپاہی بننا ہوگا ورنہ استبدالِ قومی معلوم ہے۔ اور پھر اس سے پہلی آیت کے اندر اس کی غایت بھی بتائی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ اس زمانے میں تو جنگ صرف مالِ غنیمت کے لیے ہوتی تھی۔ میدان میں ہر سپاہی جو کچھ لوٹ لے وہ اس کا۔ اور وہاں کی معیشت چونکہ کوئی مستقل تھی نہیں اس لیے ان کا گذارہ اسی پہ ہوتا تھا۔ اس کے لیے تو وہ ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔

وحی کی طرف سے پیش کردہ جنگی جذبہ محرکہ

اب یہ بالکل ایک نئی چیز آئی ان کے سامنے اور وہ نئی چیز یہ تھی کہ یہ جنگ لُوٹ کے لیے نہیں ہوگی اور دوسری چیز ان کے ہاں جنگ میں قید ہونے والے مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاتا تھا۔ کہا یہ بھی قطعاً حرام ہے۔ تو آپ سوچیے کہ پھر جذبہ کیا رہا جنگ کا۔

مالِ غنیمت یوں لوٹ میں نہیں لے سکتے' غلام اور لونڈیوں کی ایک جنسی تحریک اور ترغیب تھی' وہ نہیں ہوسکتی۔ مملکت کی حیثیت سے جنگ اگر ہوتی ہے تو یہ بہرحال جو زمینیں فتح ہوتی ہیں' وہ تو مملکت کی ہوجاتی ہیں۔ سٹینڈنگ آرمی ہے نہیں کہ تنخواہ کی خاطر لڑتی ہو۔ تو پھر کیا جذبہ ہے جس کی خاطر یہ کیفیت ہے کہ وہ یوں سر بکف میدانِ جنگ میں جائیں کہ جیسے کسی عروس اور دلہن سے ملنے کے لیے جایا جاتا ہے۔ کیا تھا وہ جذبہ؟؟ یہ بہت عظیم انقلاب ہے جو قرآن نے پیدا کیا ہے۔ گزشتہ آیت میں یہ کہا ہے کہ یاد رکھو یہ جنگ اس لیے ہے **جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا** (9:40) صرف اس سے مقصد یہ ہے کہ خدا کا نظام' اس کی بات' اس کا نظریۂ زندگی اس کا مقرر کیا ہوا نظامِ حیات' غالب آجائے اور انسانوں کا خود ساختہ نظام مغلوب ہوجائے' حق غالب آجائے اور باطل مغلوب ہوجائے۔ یہ ہے مقصد۔ اب دیکھا کہ یہ جتنے بھی بظاہر پیش پا افتادہ مفاد یا دنیاوی تحریصات اور ترغیبات تھیں' وہ ساری ختم کردی ہیں' ان میں کوئی مقصد نہیں رہا' مقصد یہ ہے اس کے سامنے۔ تو آپ دیکھتے ہیں کتنا بڑا انقلاب پیدا کرتا ہے قرآن انسان کی اندر کی دنیا میں کہ کوئی جاذبہ کوئی کشش باقی نہ رہے جس کی خاطر جنگ کرتے آئے تھے اور ساری دنیا جنگ کرتی ہے جس کی خاطر۔ جی نہیں صاحب۔ حق اور صداقت کا غلبہ ہو اس کی خاطر جان دیدینا جس میں اپنا ذاتی جذبہ کوئی نہ ہو۔ تو یہ تھا اسلام۔ اور اس کے بعد کہا کہ اگر اس کے لیے نہیں' اس مقصد کے لیے تم تیار نہیں رہتے اور جنگ میں نہیں جاتے تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی۔ اور ایک جگہ تو یہ کہا ہے **ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ** (47:38) تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ دوسری جگہ کہا تھا کہ **خَيْرٌ لَّكُمْ** (9:41) تم سے بہتر ہوگی۔

غیر قرآنی معاشرے میں انسانی زندگی انسانیت کے ثمرات سے محروم ہوجاتی ہے

جگہ لینے کے معنی یہ نہیں ہوتا کہ ان کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک دیا جاتا ہے کہیں اور وہ باڑہ خالی ہوجاتا ہے' اس میں وہ آکے بیٹھ جاتے ہیں۔ بلکہ ہر وہ چیز جس سے قوم انسانوں کی صف میں شامل ہونے کے قابل ہوتی ہے' ان سے چھین لی جاتی ہے اور پھر وہ سانس لینے کے لیے مردے اپنی لاشیں اپنے کندھوں پہ اٹھائے باقی رہتے ہیں۔ یوں استبدالِ قومی ہوتا ہے۔ قومیں اس طرح سے مٹا نہیں کرتیں Physically۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کی پستیوں اور ذلت کی حالت میں پھر ایک عرصے کے بعد اس قوم کی قرآن کہتا ہے کہ **جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ** (34:19) پھر ان کی داستانیں باقی رہ جاتی ہیں اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ پھر بعد میں وہ آرکیالوجی والے کھنڈرات میں سے ان کے نشانات پڑھتے ہیں۔ یوں قومیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اتنا بلند مقصد دیا ہے اس کے لیے کہ یہ ذاتی جذبہ جسے کہتے ہیں' وہ باقی نہ رہے۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے بعد جماعت مومنین کے اندر مختلف غیر مہذب قبائل کی شمولیت کا نتیجہ

اب یہ مملکت قائم ہونے کے ساتھ جنگ ہوگئی تھی۔ ایک تو وہ جماعت جو رسول اللہ ﷺ نے تیار کی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی

مختلف قبائل بھی راتوں رات ان میں شامل ہو گئے تھے ان کی تو تربیت ابھی ایسی نہیں ہوئی تھی۔ یاد رکھئے کہ وہ جماعت جنہیں ہم صحابہ کبارؓ کہتے ہیں مہاجرین اور انصار جو ہیں یہ گروہ نہیں' یہ تو تربیت یافتہ گروہ تھا یہ تو اسی مقصد کی خاطر جیتا تھا' اسی مقصد کی خاطر مرتا تھا' جان دیتا تھا۔ وہ جنہیں قرآن نے خود اعراب کہا ہے جو آپ کو یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' بلکہ یہ کہیں کہ ہم نے Submit کر دیا ہے۔ یہ لوگ بھی تو ساتھ شامل تھے ان میں ابھی یہ جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا کہ جان دیں اور اس کی قیمت بھی کچھ وصول نہ کریں۔ وہ یہ چیز دیکھتے تھے کہ جس جنگ کے لیے تیاری ہو رہی ہے اس میں ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ یہاں سے ان کا ذکر آ رہا ہے۔ کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَ لٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَ سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ (9:42) اگر کوئی فائدہ ان کو نظر آتا' جلدی سے مل جانے والا یا مسافتیں لمبی نہ ہوتیں۔ تاریخ میں یہ چیز ہے کہ یہ جنگِ تبوک کا ذکر ہے نبی اکرم ﷺ کے آخری دور کی بات ہے۔

ایمان کی ناپختگی کے باعث جماعت مومنین میں شامل ہونے والی اخلاقی پسماندگی کا ذکر

میں نے تاریخ میں سب کچھ آپ کو بتا دیا تھا کہ کونسی یہ قوتیں تھی جن کے ساتھ ٹکراؤ ہو رہا تھا اسلام کا۔ رومن امپائر جو مشرقی حصے میں تھی جسے بازنطینی امپائر کہا جاتا ہے' ان کے متعلق یہ اطلاع آئی تھی کہ وہ تیاریاں کر رہے ہیں حملہ کرنے کی اس نوزائیدہ مملکت کے اوپر۔ تو سٹریٹجی کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی وہاں جا کے روک تھام کر دی جائے۔ چنانچہ اس کے لیے حضور ﷺ نے ایک لشکر تیار کیا۔ تو وہ یہاں سے دور بھی تھا' گرمی بھی تھی اور پھر یہ لوگ ایسے تھے کہ جن کے متعلق خود قرآن نے یہ کہا کہ ابھی ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا ہوا۔ وہ اس میں کچھ ہچکچاتے تھے۔ کہا ان کی صورت یہ ہے کہ اگر ان کا پیش پا افتادہ جلدی سے ملنے والا کوئی مفاد ان کے سامنے ہوتا جیسے کہ ان کا انداز ہوا کرتا تھا یا کوئی مشقت طلب مسافت نہ ہوتی' یہ چیز بھی ان کو زیادہ دکھتی ہے تو یہ پھر یہ چل نکلتے۔ لیکن یہ کہ بیچ میں ذاتی جذبہ کوئی نہ ہو اور مشقتیں بھی ہوں ان کی اور اس کے باوجود پھر کیفیت یہ ہو کہ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا' یہ بات ابھی ان کے ہاں پیدا ہوئی تھی۔ تو کہا ویسے ان کی کیفیت یہ ہے کہ خدا کی قسمیں کھا کھا کے یہ بات کہیں گے کہ نہیں اگر ہم میں واقعی استطاعت ہوتی تو ہم تمہارے ساتھ جاتے۔ دو لفظوں میں بات ختم کی۔ يُهْلِكُونَ اَنْفُسَهُمْ (9:42) یہ اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔

میدانِ جنگ سے کنارہ کشی اختیار کرنے والوں کی ہلاکت کی شکل وصورت

یہاں یہ جو ہلاکت ہے یہ طبعی ہلاکت تو ہے نہیں کیونکہ جنگ میں جانے والے تو طبعی موت جسے آپ کہتے ہیں' وہاں مرجاتے ہیں نہ جانے والوں کی تو یہ صورت نہیں ہوتی۔ کوئی نقصان ایسا نہیں ہو رہا۔ یہ ہلاکت کس چیز کی ہو رہی ہے؟؟ کہ قسمیں کھا کھا کے کہتے ہیں کہ

اگر استطاعت ہوتی تو ساتھ جاتے اور دل میں بات یہ نہیں ہے۔ یہ غلط ہے جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں یہ منافقت ہے' جو یہ برت رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا؟؟ ہلاکتِ ذات۔ یہ ہے وہ اصل چیز جس پہ قرآن آتا ہے۔ طبعی مفاد بھی انہوں نے اپنے محفوظ کر لیے' یہ بھی دیکھ لیا کہ ہمیں کوئی طبعی نقصان بھی نہ ہو۔ جان و مال کی حفاظت بھی رہے' مشقتیں بھی نہ اٹھانی پڑیں۔ اس اعتبار سے تو ہلاکت کا سوال ہی نہیں تھا۔ کونسی چیز ہے جس کی ہلاکت ہوگئی۔ کہتا ہے یہ چیزیں تو انہوں نے بچالیں۔ اپنی ذات کی جو ہلاکت اس سے ہو رہی ہے' وہ ان کے سامنے نہ آئی۔

کذب کا بنیادی مفہوم اور پھر منافقت کو ظاہر کیے بغیر نبی اکرم ﷺ سے جہاد میں شامل نہ ہونے کے لیے اجازت کا ماجرا

جرم کیا ہے؟؟ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اِنَّھُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ (9:42) یہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان کی ذات کی ہلاکت ہوتی ہے' جھوٹے ہیں اس بات میں۔ جہاں بھی آپ کا قلب اور زبان ہم آہنگ نہ رہے' وہ کذب ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ انسانی ذات کی ہلاکت ہوتا ہے۔ زندگی کا مقصود تو انسانی ذات کی نشوونما اور ارتقاء ہے۔ تو یہاں یہ ایک جرم بتایا۔ پہلی چیز تو یہ کہ وہ ہچکچاتے ہیں اس طرح جنگ میں جانے سے اور اگلی چیز یہ کہ پھر اس کے بعد منافقت برتتے ہیں' بات صاف صاف نہیں کہتے' دل میں کچھ اور ہوتا ہے زبان پہ کچھ اور لاتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ہے ہلاکتِ ذات۔ کہا یہ جو یہ اپنا نقصان کر رہے ہیں کہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے آکے طرح طرح کی بہانہ سازیوں سے پیچھے رہ جانے کی اجازت طلب کی اور حضور ﷺ نے ان کی ان عذرداریوں کے پیشِ نظر انہیں اجازت دیدی کہ اچھی بات ہے رہ جایئے۔ اب یہ اجازت سے پیچھے رہے خواہ کسی طریق سے بھی حاصل کی لیکن بہرحال اجازت تو حاصل کر لی سربراہ سے۔ اجازت سے پیچھے رہنے میں یہ جرم نہ رہا۔ جنگ سے گریز کا یا اس میں سے فرار کا یا Escape ہونے کا جرم نہ رہا جب اجازت سے یہ بات ہوئی۔ لیکن یہ جو اجازت دی گئی وہ تو ان کی منافقت پر مبنی تھی۔ یہاں چیز آتی ہے عَفَا اللّٰہُ عَنۡکَ ۚ لِمَ اَذِنۡتَ لَھُمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ تَعۡلَمَ الۡکٰذِبِیۡنَ (9:43) عَفَا اللّٰہُ عَنۡکَ (9:43) کا عام معنی تو یہی کیا جاتا ہے اللہ تجھے معاف کرے۔ لیکن عربی محاورے کی رو سے جہاں کسی کو نہایت شفقت اور محبت سے کسی بات کی تنبیہ کرنا مقصود ہو' وہاں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں معاندانہ نظرِ تحدّی کا انداز نہیں ہوتا' بڑی محبت سے یہ بات ہوتی ہے۔ تنبیہ اس انداز سے کی اور کہا یہ کہ تم نے انہیں کیوں اجازت دیدی جلدی سے' تھوڑا سا توقف کرتے تو خود بات نکھر کے سامنے آجاتی کہ یہ جو عذرداریاں پیش کر رہے ہیں' یہ ساری بناوٹی ہیں' یہ جھوٹے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جنگ سے جی چرانا چاہتے ہیں کہ اس میں ذاتی مفاد نظر نہیں آتا۔ کہا کہ خدا کی شفقت تیرے ساتھ ہو' تو نے کیوں اجازت دیدی ان کو اس سے قبل کہ جھوٹ اور سچ نکھر کر سامنے آجاتا۔

وحی کی دو قسموں کے تصور کی وضاحت

یہاں سے ایک بڑی اہم اصولی بحث شروع ہوتی ہے اور اس کا سمجھ لینا بڑا ہی ضروری ہے۔ ہمارے ہاں متقدمین میں ایک عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ قرآن کے اندر جو کچھ آیا ہے یہی وحی نہیں تھی بلکہ وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی (53:3) اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (53:4) کہ رسول اللہ ﷺ نے ساری زندگی میں جو بھی بات کی وہ خدا کی طرف سے وحی تھی۔ اب وحی کے دو حصے کر دیتے ہیں وہ۔ ایک وحی جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہو گئی اور دوسری وحی جو قرآن سے باہر رہی اور اس کے لیے کہتے ہیں کہ وہ حدیثوں کے اندر آ گئی۔ بہر حال اس کے اندراج یا حفاظت کی دو شکلیں یا دو الگ الگ گوشے وہ بتاتے ہیں کہ کچھ قرآن میں آئیں، کچھ ان میں آئیں۔ دونوں میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا جاتا، دونوں کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح سے جبریلِ امین قرآن کی آیتیں لے کے نازل ہوتے تھے اسی طرح سے وہ باقی باتیں بھی آتی تھیں۔

نبی اکرم ﷺ کے بارے میں مروجہ عقائد کا جائزہ قرآن حکیم کی روشنی میں

پھر سمجھ لیجیے کہ عقیدہ یہ ہے وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی (53:3) کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بات بھی کی، جو کام بھی کیا، جو فیصلہ بھی کیا، وہ سب خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے آپ کو دیا گیا۔ اس پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں یہاں ہی نہیں اور کئی مقام بھی آئے ہیں جہاں یہ کہا ہے کہ اے رسول تو نے یہ کیوں کیا لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ (66:1) جس چیز کو خدا نے جائز قرار دیا ہوا ہے، تو نے اپنے اوپر اُسے حرام کیوں قرار دے لیا ہے۔ یہاں یہ چیز ہے کہ تو نے ان کو اجازت کیوں دیدی (9:9/43)۔ تو اب ان مقامات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر یہ چیزیں خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے تھیں کہ آپ ﷺ نے ان کو اجازت دی تھی یعنی وہ پہلا مسلمہ مان لیا جائے کہ آپ ﷺ نے جو کچھ کہا، جو کچھ کیا، جو فیصلہ کیا، جو قدم اٹھایا یعنی آپ ﷺ کا قول اور عمل سارے کا سارا وحی پر مبنی تھا تو یہ جو مقامات ہیں جہاں خدا نے ان کے خلاف Exception لی ہے خواہ وہ کتنی محبت آمیز انداز میں کیوں نہ، اس کو تنبیہ کی گئی ہو لیکن بہر حال اختلاف تو کیا ہے نا خدا نے اس سے۔ تو قرآن کی ایک وحی تو یہ کہہ رہی ہے اگر یہ مانا جائے کہ وہ دوسری جگہ جو ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اجازت دی تھی (9/43:43) اس عقیدے کے مطابق وہ بھی وحی کی رو سے تھی۔ تو اجازت بھی وحی کی رو سے ملی اور اُسی دوسرے ہی سانس میں وحی نے آ کے کہدیا تو نے اجازت کیوں دی تھی۔ آپ نے غور فرمایا؟ میں نے اس لیے کہا ہے کہ بڑے غور سے سننے کی بات ہے۔ یعنی یہی آپ دیکھیے کہ ایک طرف وحی یہ کہتی ہے کہ اجازت دیدو ان کو تو دوسرے ہی سانس میں ایک وحی آ جاتی ہے کہ تم نے اجازت کیوں دی اس کو۔ (معاذ اللہ) یہی بات تھی کہ حضور ﷺ کہتے ہونگے کہ اب بتائیے کیا جواب دیا جائے، صاحب ٹھیک ہے عدل کا

تقاضا یہی ہے کہ حافظ کہتا ہے کہ بر طریقِ ادب باش؟؟ گناہ من است' عدل کا تقاضا یہ ہے کہ تسلیم کرلو اس بات کو کہ اچھا جی غلطی ہوگئی۔ لیکن آپ سوچیے اس بات کو صاف کرنے کے لیے کہ اگر حضور ﷺ کا ہر قول' ہر عمل' ہر فیصلہ وحی کی رو سے ہوتا تھا تو یہ فیصلہ کہ ان لوگوں کو اجازت دی جائے یہ وحی کی رو سے تھا' تو وحی نے یہ آپ کے کہا کہ اجازت دیدو اور دوسرے ہی سانس میں وحی نے آپ کے کہہ دیا (لِمَ اَذِنۡتَ) تم نے کیوں اجازت دی (9:43)۔

کہی ہوئی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے مختلف تاویلوں کے برعکس وحی کی حقیقت' رسول اکرم ﷺ کی عظمت اور فریضۂ نبوت کی عظمت

یہ چیزیں سامنے آتی ہیں۔ اب ان کی اگر تاویلیں اور جوابات دیکھیے تو بڑے رقیق سے تھے کہ اس میں کوئی بات ایسی مضائقہ کی ہے نہیں اور یونہی محبت کی بات کبھی کبھی ہو جاتی ہے کبھی ایسے کہہ دیا اگر۔ کبھی کہا کیوں' کہ جی اصل میں حضور ﷺ کا کوئی امتحان لینے کے لیے ایسا کیا کرتے تھے۔ معاذ اللہ۔ دیکھا ایک ذرا سی غلطی سے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ بات آگے آتی ہے اور وہ یہ کہ یہ جو وحی کا ایک حصہ قرآنِ کریم میں آیا ہے اس میں تو یہ ٹھیک ہے حضور ﷺ کی اپنی ذاتی خصوصیت یا صلاحیت کا کوئی دخل نہیں وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی (53:3) حضور ﷺ نے اپنی فکر سے اس کی تخلیق نہیں کی۔ یہ ہیں اس آیت کے معنی۔ اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (53:4) خدا کی طرف سے یہ اسی طرح سے براہِ راست خارج سے اوپر سے آئی ہوئی ایک حقیقت ہے۔ قرآن کے اندر جو وحی ہے یہی ہے وحی۔ وحی میں صاحبِ وحی کے اپنے ذاتی خیالات اور فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ ایک Objective Reality ہوتی ہے' خارج کی ایک حقیقت ہوتی ہے جو اس رسول تک پہنچا دی جاتی ہے اور رسول اسے دوسروں تک پہنچا دیتا ہے' اس میں رسول کی اپنی ذات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اتنے حصے تک کہا جائے گا کہ وہ صرف ایک پہنچانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ بَلِّغۡ مَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ (5:67) وہ ابلاغ کا ایک ذریعہ ہوتا ہے کہ تجھ پر جو نازل کیا جاتا ہے اسے پہنچا دے دوسروں تک۔

نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس کا بطور بشر اسوۂ حسنہ

اگر یہ مان لیا جائے کہ حضور ﷺ نے ساری زندگی میں جو کچھ بھی کہا' جو کچھ کیا' جو فیصلے کیے سارے ہی وحی کی رو سے تھے تو اس میں حضور ﷺ کی اپنی ذات تو پھر کہیں نہیں آئی' حضور ﷺ کی عظمت کس بات کی ہوئی پھر؟ ذرا سوچیے کہ ایک طرف ہم نبی اکرم ﷺ کو حضور ﷺ کی سیرت و کردار کے اعتبار سے بلند ترین مقامات کے اوپر پیش کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حضور ﷺ نے جتنا

عظیم انقلاب برپا کیا ہے' دنیا کی کسی ہستی کو ان کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اگر مانا یہ جائے کہ وہ سارے کا سارا وحی کے ذریعے سے ہوا تھا تو حضورﷺ کی اپنی ذات' اپنی سیرت' اپنے کردار' اپنے فیصلے' اپنے صلاحیتوں کا اس میں دخل ہی کوئی نہیں۔ اتنا سا امتیاز تو مان لیجئے کہ حضورﷺ کو وحی ملتی تھی لیکن اس کے بعد' اپنی شخصیت' اپنی زندگی' اپنی سیرت کا کوئی مقام ہی نہیں سامنے آتا۔ اس عقیدے سے بظاہر وہ اپنے ذہن میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے حضورﷺ کا مقام بڑا بلند کر دیا کہ ہر بات وحی کی ہوتی تھی۔ یہ کبھی نہ سوچا کہ ساری زندگی میں ہر فیصلہ وحی کی رو سے اگر ہوتا تھا' ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی' تو پھر آپﷺ کی ذاتی خصوصیت تو اس میں کوئی نہ ہوئی' ذاتی سیرت و کردار کیا رہا۔ کسی مقام کے اوپر حضورﷺ کی طرف سے ایک بڑا عظیم کارنامہ سرزد ہو کے ہمارے سامنے آتا ہے جس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ بلاشبہ بے مثال عمل ہے حضورﷺ کا۔ لیکن اگر کہا جائے کہ وہ تو حضورﷺ کا عمل نہیں تھا تو یہ دین کا کمال تھا آپﷺ نے اس طرح سے کر کے دیدیا۔ جب قرآن یہ کہتا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) رسول کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ تو بن کیسے سکتی ہے ہم پہ تو وحی نہیں آتی۔ حضورﷺ نے تو ایسا اس لیے کر کے دکھا دیا کہ وحی آتی تھی۔ مثلاً ایک نازک ترین مقام آتا ہے جس کے اندر دیکھنا یہ ہے کہ فیصلہ بڑا مشکل ہے وہاں حضورﷺ نے ایک فیصلہ کیا ہے جسے سننے کے بعد آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے۔ کیا فیصلہ کیا ہے حضورﷺ نے ایسے مقام پہ!!!۔ ہمارے لیے اسوہ یہ بنا کہ اگر ایسے مقامات آ جائیں تو تم بھی اسی قسم کے فیصلے کرو۔ لیکن جب یہ کہا جائے کہ وہ فیصلہ حضورﷺ نے تو وحی کے ذریعے کیا تھا آپﷺ کا فیصلہ ہی نہیں تھا' خدا کا فیصلہ جبریل نے آ کے Communicate کر دیا آپﷺ نے باہر اس کا اظہار کر دیا۔ تو یہ چیز ہمارے لیے اسوہ کیسے بنے گی۔ ہم تک تو جبریل نہیں آئے گا کچھ کہنے کے لیے۔ حضورﷺ کی سیرت ہمارے لیے اسی انداز سے اسی صورت میں اسوہ بن سکتی ہے کہ ہم یہ مانیں جو قرآن نے بار بار کہا ہے کہ ان سے کہدو اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (18:110) اس وحی کو اگر الگ کر دو تو باقی میں تمہارے جیسا انسان ہوں۔ جو کچھ میں اس کے بعد کر رہا ہوں' انسان کی حیثیت سے کر رہا ہوں بشر کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔ اور جو چیز ایک بشر نے کی ہے وہ ہر بشر کر سکتا ہے اگر اس کا اتباع کرتا چلا جائے تو۔ یوں اسوہ بن سکتی ہے حضورﷺ کی سیرت ہمارے لیے۔ یہ بنیادی غلطی یہاں ہوئی۔

قرآن حکیم کے متعلق فرقہ اہل قرآن کی سوچ اور اہل حدیث میں فرق کی نوعیت

آپ کو معلوم ہے یہاں ایک ٹکراؤ چلا آتا ہے ان میں جو حدیث کو وحی کی طرح مانتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایک فرقہ ہے اہلِ قرآن کا بھی ہے وہ یہ چیزیں قرآن حکیم کے اندر سے لائے ہیں۔ ان کے ہاں بحثیں مثلاً ایسی ہوا کرتی ہیں کہ اگر ہم حدیث کو نہ مانیں تو

بتائیے قرآن میں تو صلوٰۃ کا ذکر ہے، کیسے یہ متعین کریں کہ یہ سارا کچھ قرآن کے اندر ہے۔ دین سارا قرآن کے اندر موجود ہے، یہ جزئیات بھی موجود ہیں، یہ سب چیزیں اس میں موجود ہیں، وحی کے ذریعے سے متعین ہوگئی ہوئی ہیں۔ عزیزانِ من! ذرا غور کیجئے کہ یہ آپس میں جھگڑتے کس بات پہ ہیں۔ بنیادی طور پہ تو دونوں ہی ایک جگہ ہیں وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ وحی کے ذریعے سب کچھ یہ آیا ہے رسول کا اپنا کوئی دخل نہیں، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ وحی کے ذریعے آیا ہے رسول کا اپنا دخل نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ صرف اس قرآن کے اندر ہے، وہ کہتے ہیں قرآن کے ساتھ حدیثوں کے بھی اندر ہے۔ رسول کی جو شخصیت ہے وہ دونوں جگہ ہو جاتی ہے۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ گذشتہ پچاس برس سے یہ آپس میں، یہ سر پھٹول کس بات پہ ہو رہی ہے ان دونوں میں۔ اتنی سی بات ہی ہے نا کہ وہ اس چیز کو اس کے اندر محفوظ سمجھتے ہیں، وہ اس کے علاوہ دو چار اور کتابوں کے اندر ساتھ لے آتے ہیں۔ اصولی طور پہ تو دونوں جگہ ایک ہی بات ہے نا کہ رسول اللہ ﷺ کی اپنی ذات کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا خواہ وہ قرآن میں محفوظ تھا آپ ﷺ نے تو اس طرح سے کیا خواہ وہ قرآن کے ساتھ حدیثوں میں محفوظ تھا تو حضور ﷺ نے اس طرح سے کیا۔ یعنی اپنی طرف سے تو رسول نے کچھ بھی نہیں کیا نا اپنی ساری زندگی میں۔ دیکھا آپ نے کہ بظاہر ان کی آپس میں رستم وسہراب کی یوں جنگ ہو رہی ہے اور بنیادی طور پہ دونوں ہی ایک ہیں۔ کبھی ان میں سے کسی نے کھڑے ہو کے سوچا نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے اوپر طعن کس بات کا کر رہے ہیں۔ رسول کی حیثیت دونوں حیثیتوں میں کچھ نہیں رہتی، حضور ﷺ کی سیرت اسوہ بنتی نہیں ہے نہ اہلِ قرآن کے مسلک کی رو سے، نہ اہلِ حدیث کے مسلک کی رو سے، اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ (18:110) کہیں رہتے ہی نہیں ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی طرف سے جہانِ نو کی نمود کے سلسلہ میں سعی کاوش کا ذکر

صحیح حیثیت یہ ہے کہ وحی کے ذریعے سے جو قرآن کے اندر محفوظ ہے، انسانی زندگی اور دین کے نظام کے اصول دیے گئے ہیں، حدود مقرر کیے گئے ہیں وہ غیر متبدل اقدار اصول۔ اور نبی اکرم ﷺ نے پھر سب سے پہلے ان اصولوں کے مطابق اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بناء کے اوپر جو ایک بشر کی حیثیت سے تھیں ایک ایسا انقلاب برپا کیا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اور اس طرح حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ دنیا کے اندر بے مثال ہو جاتی ہے۔ ذاتی کردار کی بناء کے اوپر سارا جتنا کریڈٹ ہے حضور ﷺ کی اپنی ذات کو جاتا ہے، اس میں وحی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اور یہ چیز ہے کہ جہاں کہیں کوئی تدبیری غلطی ہو جاتی تھی، کچھ سقم رہ جاتا تھا اس کے اوپر کبھی وحی کے ذریعے سے ٹوک بھی ہو جاتی تھی کہ یہ تم نے کیوں کیا۔ یہ کرنے والا وحی کی رو سے نہیں کر رہا تھا۔ عَفَا اللّٰہُ عَنۡکَ لِمَ اَذِنۡتَ لَہُمۡ (9:43) ورنہ اگر وحی کے ذریعے ہوتا تو خدا یہ کہتا کہ لِمَ اَذِنۡتَ (9:43) تو نے کیوں اجازت دی؟ وہ کہتا میں نے کہاں اجازت دی، اجازت تو تم نے دی۔

یاد رکھئے اور اسی معنی میں، اسی مفہوم میں حضورﷺ کی سیرتِ اقدس اسوہ بنتی ہے تمام دنیا کے انسانوں کے لیے کہ ایسے مقام کے اوپر اس قسم کے عمل کا مظاہرہ کرنا بڑی بات ہے۔

فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ کا مخالفین کے ساتھ کیے گئے حسنِ سلوک کی ایک روشن مثال

سوچئے تو سہی عزیزانِ من! تیئیس سال تک جو مخالفین اتنی بڑی اذیتیں دیتے رہے کہ ان کے ساتھ تیرہ سال ان کی اذیتوں میں گذرے۔ اتنی سخت اذیتیں کہ گھر بار سے نکلنا پڑا حضورﷺ کے عزیزوں تک ان کے ہاتھوں سے اذیتوں میں بعض وفات ہی پا گئے۔ اس کے بعد یہاں آ گئے مدینے میں، سات آٹھ برس تک انہوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ کم از کم اسی بیاسی جنگیں جھڑپیں جو ان کے ساتھ ہوتی رہیں۔ اس کے بعد مکہ فتح ہوا یہ پابجولاں ساری عمر کے اتنے بڑے دشمن جو تھے، یہ پابجولاں قیدیوں کی حیثیت سے سامنے کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ عرب قوم تھی انہیں پتہ تھا کہ اتنی بڑی مخالفتوں کے بعد پھر کیا سلوک ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ٹھیک ہے جیسے دشمن کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے ٹھیک ہے تمہارے نظریۂ زندگی کے مطابق وہی بات ہے لیکن میرا نظریۂ حیات اور ہے لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:92) میں کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا کرتا، سب کی بیڑیاں کھول دو۔ یہ ہے وہ چیز جسے ہم دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں کہ یہ ہیں سیرت و کردار کی بلندیاں، اتنی وسعتِ قلب اتنی کشاد۔ اور یہ اسوہ بن سکتا ہے کہ ایسے مقام کے اوپر تمہیں بھی ایسی کشاد کا ثبوت دینا چاہئے۔ لیکن اگر یہ کہیں کہ صاحب یہ تو خدا نے ان سے کہا تھا کہ نہیں، چھوڑ دو اور آپ ﷺ نے ان کو چھوڑ دیا، آپ ﷺ کو کیا کریڈٹ اس کا گیا۔ خواہ یہ چھوڑ دو کی بات اہلحدیث کے مطابق حدیث کی کسی کتاب میں ہو، یا اہلِ قرآن کے مطابق قرآن ہی کے اندر ہو۔ میں اس میں نہیں جاتا ابھی تفصیل میں، کہیں بھی ہو اگر یہ بات ہو کہ یہ چیز جو تھی، یہ فیصلہ حضورﷺ کا اپنا نہیں تھا اس سے حضورﷺ کے کردار کی بلندی نہیں سامنے آتی، وہ تو خدا کے ایک فیصلے کو Communicate کیا آپ ﷺ نے۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں کہ حضور نبی اکرمﷺ کی سیرت اقدس، اسوہ بھی بنتی ہے اور دنیا کے اندر بے نظیر بھی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ قرآنِ کریم کے ان اصولوں اور اقدار کے مطابق حضورﷺ نے خود ایک انقلاب برپا کیا، ایک جماعت تیار کی تعلیم سے تربیت سے تزکیہ سے۔ پھر اس جماعت کے ساتھ دنیا کے اتنے اتنے بڑے باطل کے نظاموں سے ٹکر لی۔ اتنی کامیابی سے ان باطل کے نظاموں کو شکست دی، حق کے نظام کو اس طرح سے قائم کیا۔ اور قدم قدم کے اوپر اس قسم کی مثال پیش کی کہ دنیا کی بلندترین شخصیتیں بھی وہ مثال پیش نہ کر سکیں۔ یہ ساری چیز حضورﷺ کے کریکٹر کی اور کردار کی بلندی کی درخشاں مثال ہے۔ حضورﷺ نے یہ چیز اپنی بشری حیثیت سے کی اور اتنی بلندیوں پہ پہنچ کے کی۔ یہ ہے عزیزانِ من! کہ جو کچھ میں کہتا ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کی ذات سے علامہ پرویزؒ کی اس قدر عقیدت کے باوجود ان پر کفر کے فتویٰ چہ معنی

آپ سوچئے کہ اُس کہنے میں اور 'اِس' کہنے میں حضور ﷺ کی حقیقی عزت عظمت حرمت تقدیس 'اِس' نظریے میں ہے یا اُس نظریے کے اندر ہے۔لیکن 'جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے'۔ایک پروپیگنڈہ چلا آرہا ہے 'منکرِ شانِ رسالت ﷺ' ہونے کا۔سوچئے تو سہی جس کی ساری عمر عزیزانِ من! حضور ﷺ کی تقدیس اور عظمت کے گن گاتے ہوئے گزر گئی۔اس کے نام کے صدقے میں میں انسانوں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل ہوا۔زبانی بات کہنے کی نہیں ہے عزیزانِ من! الماری بھری ہوئی ہے کم از کم پچیس ضخیم کتابیں موجود ہیں۔کوئی کتاب اٹھا کے دیکھئے اور اس میں دیکھئے کہ حضور ﷺ کی عظمت اور عزت کس طرح درخشندہ طور پہ آپ کو نظر آئے گی۔ساری عمر اس میں گذر گئی میری۔اور یہ ہے وہ سیرت جو میں نے پیش کی ہے حضور ﷺ کی کہ واقعی دنیا میں جہاں جہاں وہ گئی ہے وہ پکار اٹھے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 'بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'۔اتنی عظیم شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔شخصیت آتی ہے حضور ﷺ کی ورنہ اگر وہ بنیادی عقیدہ رکھ لیا جائے کہ ہر عمل ہر فیصلہ ہر قدم جو تھا پیچھے سے ایک حکم ہوتا تھا اس کے مطابق آپ عمل کرتے۔ تو آپ سوچئے تو سہی اس میں حضور ﷺ کی اپنی زندگی کی عظمت کیا رہتی ہے۔عظمت یہ ہے کہ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ نہ تو تم اصولی تعلیم قرآن کے مقابل میں پیش کر سکتے ہو کہ اس کا دعویٰ جو ہے قرآن نے خود کیا ہے کہ یہ وحی کی صورت ہے۔اور اس کے نیچے اتر کے ہم یہ کہیں گے کہ عالمِ بشریت میں بھی آپ اس قسم کی سیرت و کردار کی مثال کہیں پیش نہیں کر سکتے۔

تخلیق آدم کے متعلق فرشتوں کے اعتراض پر خدا کا جواب جو بڑا معنی خیز ہے

یہ تھے وہ مقام حضور ﷺ کی سیرت و کردار کے درخشندہ' تحیر انگیز تعجب انگیز کہ جس کے اوپر حضور ﷺ نے ادھر سے ایک فیصلہ کیا اور اُدھر سے بے ساختہ ندائے جمال نے کہا کہ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) ''او آفریں صدقے او تیرے کڈا سوہناں فیصلہ کیتا ای ایس ویلھے' اللہ تے اوہدے فرشتے پھُل برسان لگ پئے اوسدی ذات اتے''۔اگر اس کے فیصلے پہ ہی یہ عمل کیا تھا ''میں تینوں کہندا ایوں کر دے'' تو پھر اس کے بعد یہ پھول برسانے کی نوبت کہاں آتی۔یہ بے ساختہ پھول کیوں برسائے جارہے ہیں' کیوں یہ فرشتوں سے بھی ساتھ کہا جارہا ہے؟ کہا اس لیے جا رہا ہے کہ جب تخلیقِ آدم کا قرآن نے بیان کیا ہے تو فرشتوں نے اعتراض کیا تھا کہ ہمیں چھوڑ کے ایک ایسا بھیجا جا رہا ہے اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ (2:30) خون ریزیاں کرے گا فساد انگیزیاں کرے گا۔اور واقعی انسانوں کی تاریخ یہی بتا رہی تھی اس معنی میں کہ فرشتے اس باب میں سچے ہی تھے۔اس کی ساری تاریخ اسی میں گذری۔استعارۃً عرض کرونگا کہ اگر یہ چیز آپس میں کہیں دو کی بات ہو تو اس میں تو واقعی کچھ نگاہ جھکتی نظر آئے گی فرشتوں کے

سامنے۔ معاذ اللہ۔ میں کہہ رہا ہوں استعارۃً۔ لیکن پھر کچھ مقام ایسے آتے تھے ان انسانوں کے اندر کہ جہاں ایک انسان کا درخشندہ عمل جب سامنے آتا تھا تو پھر اللہ میاں سینے پہ ہاتھ رکھ کے فرشتوں سے کہتا تھا کہ دیکھا تم نے؟ میں نے کیوں آدم کی تخلیق کی تھی۔ اور یہ وہ مقام تھے جس کے اوپر وہ بھی بے ساختہ پکار اٹھتے تھے کہ ہاں سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ (2:32)۔ ٹھیک کہا تھا تم نے۔ اب وہ مقام ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) خدا اپنے اس کارنامے کے اوپر فخر کر رہا تھا کہ میں نے تخلیقِ آدم اس لیے کی تھی کہ یہ بھی آدم پیدا ہونا تھا اس کے اندر۔ اور فرشتے اس لیے پھول برساتے تھے کہ انہیں احساس ہو گیا کہ ہم نے غلط اعتراض کیا تھا' واقعی بات یہی تھی جو تم کہتے تھے۔ یوں اللہ اور اس کے فرشتے پھول برساتے تھے حضور ﷺ کے اوپر عزیزانِ من! اگر ان کارناموں کے متعلق کہا جائے' آپ یہ کہیں کہ آپ ﷺ کی ذات کا کوئی دخل ہی نہیں تھا فیصلہ آتا تھا' ایسے مقام پر کہ یہ کر دو تو پھر خدا اگر کہتا بھی فرشتوں سے کہ دیکھا تم نے؟ تو وہ جواباً کہتے کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس میں آدم کا کیا دخل ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس پہ فرشتے جنہیں ملائکہ کہا جاتا' ہے قرآن نے بتایا یہ ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے جیسا اُنہوں نے کہا تھا نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ (2:30) ہم تو جس طرح تو کہتا ہے وَ نُقَدِّسُ لَکَ کہ جو کچھ تو حکم دیتا ہے ہم کیے چلے جاتے ہیں۔ یہ کہنے والوں کی خدا نے تردید نہیں کی تھی کہ غلط ہے جو ہم کہتے ہیں تم کرتے چلے جاتے ہو' غلط ہے تم نہیں کرتے' اس لیے ہم ایک ایسی مخلوق پیدا کر رہے ہیں جو ہم کہیں گے وہ کرے گی۔ بالکل نہیں۔ تسلیم کیا تھا خدا نے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں' تم کرتے چلے جاتے ہو۔ کہا تھا کہ اس میں تمہارا کریڈٹ پھر کیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں' تم کرتے چلے جاتے ہو۔ یہ تو ایک مکینکل چیز ہے اس میں سیرت و کردار تو تمہارا کچھ نہیں۔ خدا نے کسی فرشتے کی سیرت کے متعلق نہیں کہا کہ تمہارے لیے اسوۂ حسنہ بنے گی۔ وہ بن ہی نہیں سکتی' وہاں تو ایکشن ہی سارا مکینکل ہوتا ہے۔ تو اس کے علی الرغم کسی ایسی مخلوق کی تخلیق کی ضرورت تھی جس کا ایکشن اس طرح فرشتوں کی طرح مکینکل نہ ہو کہ جو کہا جائے وہ کرتے چلے جائیں کہ اُوپر سے حکم آیا اور عمل کیا' جب کوئی حکم نہ آیا تو چپکے سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ رسول کے متعلق اگر آپ یہ عقیدہ رکھتے ہیں تو یہ مقام تو وہ آ جاتا ہے جس کو آپ فرشتوں کا مقام کہتے ہیں کہ خدا نے جو کہا وہ کر دیا۔ اس نہج زندگی کے علی الرغم ایک اور نہجِ زندگی تھی۔

قصہ آدم کے تمثیلی تعارف کے بعد نبی اکرم ﷺ کے فریضہ حیات کی تکمیل کے متعلق آپ ؐ کے اسوۂ حسنہ کا ذکر

اور یہ وجہ ہے کہ اس پورے ڈرامے کے بعد جب خدا نے یہ تمثیلی تعارف کرایا ہے تو بتایا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ یہ مخلوق کیا ہوگی۔ اور ہم نے آدم کو احکامات دیئے لیکن اس نے عمل درآمد نہ کیا جس سے اُسے منع کیا گیا تھا اور خدا نے کہا دیکھا تم اور ان میں فرق کیا ہے۔ فرق

یہ ہے کہ تم اپنے اختیار وارادے سے کچھ نہیں کر سکتے' یہ اپنے اختیار وارادے سے کرتا ہے۔ معصیت سہی' اختیار وارادے سے کرتا ہے۔ تو انسان کے لیے باعثِ شرف ہے کہ یہ اپنے اختیار وارادے سے ایسا کرتا ہے۔ اور آپ ہیں کہ جسے دنیا کا بلند ترین انسان قرار دیا گیا' اس کا اختیار وارادہ سارا ہی سلب کر لیتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ حضورﷺ نے اپنی زندگی میں اپنے اختیار وارادے سے کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح سے ہزاروں برس سے بھیڑ چال چلی آتی ہے اس کے اوپر سر دھنتے ہیں کہ یہ مقام آیا اور وحی آ گئی آپﷺ کی طرف اور آپﷺ نے یہ کر دیا' سبحان اللہ صاحب۔ ارے یہ سبحان اللہ تو فرشتوں نے کہا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ (2:30) جو کہتا ہے اس کے مطابق ہم کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے مقام حضورﷺ کا۔ قرآنِ کریم نے زندگی کے جو اصول اور حدود دیے ہیں' وہ دینے کے بعد یہ فریضہ عائد ہو گیا رسول کے اوپر کہ سب سے پہلے اپنی ذاتی صلاحیتوں' اپنی ذاتی بلندیٔ کردار اور سیرت کے اعتبار سے ایک مثالی معاشرہ قائم کرو۔ اور وہ معاشرہ ایسا ہو کہ جو آنے والوں کے لیے دلیلِ راہ اور اسوہ اور نمونہ بن سکے۔ جو یہ کہہ سکیں کہ ان اصولوں کے اوپر ایک انسان نے اس طرح عمل کر کے دکھایا تھا لہٰذا قیامت تک کے لیے ان کے اوپر عمل ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں قرآن کے مطابق' آئیڈیل ازم کا یہ لفظ آتا ہے کہ جی کبھی ایسا ہوا ہے' کہا کہ ہاں صاحب ہوا تھا تاریخ بتا رہی ہے کہ ایک دور میں ہوا تھا۔ تو کہتے ہیں کہ صاحب وہ چیز تھی تو وحی کے ذریعے سے ہو گئی تھی' وہ تو رسول تھے انہوں نے جنہوں نے ایسا کر دیا بتائیے انسانوں نے بھی کیا ہے؟ دیکھا آپ نے یہ اعتراض۔ یعنی اس کے بعد یہ ناممکن العمل ہو گیا قامت تک کے لیے۔ یہ کا ہے کے لیے رکھا ہوا ہے قیامت تک کے لیے محفوظ خدا نے۔

آسمانوں سے مامور من اللہ کے آنے کا تصور جو حقیقت پر مبنی نہیں

جب یہاں پہنچے تو اعتراض یہ ہوا' تو پھر کیا اب کیا جائے۔ تو پھر خدا کی طرف سے ہی ایک مامور لائے اتار کے کہ واقعی یہ انسانوں کے بس کی تو بات نہیں ہے یہ تو وہی کر سکتا ہے کہ جسے خدا کی طرف سے یہ امر ملے۔ تو پھر آسمان سے یہ مامور لائے۔ کوئی سو سو سال کے بعد لے کے آ گیا کسی نے کہا کہ آخر میں آئے گا۔ کچھ بھی ہوا اصولاً یہی مانا گیا کہ یہ انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے یہ کچھ کریں یہ تو رسول نے ایسا کیا تھا کیونکہ وہ مامور من اللہ تھا۔ کہا نبوت تو ختم ہو گئی۔ کہنے لگے' نہیں نبی نہیں' ہم مامور من اللہ ہی کہتے ہیں۔ یعنی نام بدل دیا۔ کہا کہ دونوں میں کیا فرق کیا ہے؟ تم تو کہتے ہو کہ خدا کے امر کے مطابق سب کچھ کرتا تھا' یہ بھی کہتے ہو کہ وہی کر کے دوبارہ دکھائے گا جو خدا کے امر کے مطابق کرے گا تو دونوں میں فرق کیا ہے۔ اتنی سی بات زبان پہ لانے والے کے پیچھے ڈگڈگی بجائی جا رہی ہے کہ صاحب کافر ہے ملحد ہے مرتد ہے۔ یہ ٹھیک ہے جی کرتے چلے جائیے۔

کیا بشری حیثیت سے نبی اکرم ﷺ کے کسی قول، کسی عمل یا کسی قدم میں کوئی تدبیری غلطی ہونے کا امکان نہ تھا؟

یہ ہے عزیزانِ من! جو میں نے کہا تھا کہ بات تو چھوٹی سی ہی سامنے آئی ہے لیکن اصولی چیز اس میں بڑی اہم ہے۔ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے کہ حضور ﷺ کا ہر فیصلہ ہر عمل ہر قول خدا کی وحی کی رو سے نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو یہ کیوں کہا جاتا عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (9:43) اللہ تجھے معاف کرے تو نے کیوں اجازت دیدی ان کو۔ ٹھیک ہے اس قسم کی تدبیری سہو اس قسم کی تدبیری غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (9:43) ذرا سا رک جاتے تو چند قدم کے اوپر ہی بات ساری صاف ہو جاتی تھی۔ یہ منافقت تو زیادہ دیر چل نہیں سکتی ایک تاؤ دیا جائے تو وہ جیسے کہتے ہیں نا، منافق ہو جاتا ہے۔ تھوڑا سا انتظار کرتے۔

نبی اکرمؐ کے لیے منافقین کے فیصلے کرنا بڑا مشکل مرحلہ تھا جسے آپ نے اپنی فراست سے ہی حل کرنا تھا

منافقوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ اپنے ذاتی فیصلے قرآنی شہادتوں کی رُو سے کیا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ مشکل مرحلہ ان منافقین کا تھا جو کسی طریقے سے جماعت کے اندر گھس آتے تھے۔ یہ تو اتنی تعداد میں تھے' عزیزانِ من! ایک ذرا سی پھانس کہیں چبھ جائے نا ''آ چھلد لگی جنوں کیندے آ'' وہ اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ وہ نظر بھی نہیں آتی کم بخت، لیکن سونے نہیں دیتی ساری رات۔ یہ منافقت اور منافقین اس پھانس کی طرح چھپے ہوئے ہوتے ہیں، وہ نظر بھی نہیں آتے لیکن کیفیت یہ ہے کہ نہ دن کو چین نہ رات کو نیند، قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر بات وحی کی رو سے تھی۔ آج یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو نکال باہر کیوں نہ کیا۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ اے رسول ہم نہیں تمہیں بتائیں گے کہ فلاں فلاں ان میں سے منافق ہے۔ اس میں تمہاری فراست اس کا اندازہ لگائے گی۔ تم کو ان کے چلن، ان کے کرتوتوں، ان کے کردار سے پہچاننا ہوگا کہ ان میں سے کون کونسے ایسے ہیں۔ ہم نہیں بتائیں گے۔ دیکھا آپ نے۔ اور حضور ﷺ کا کمال ہی یہ ہے کہ حضور ﷺ نے پہچانا ان کو۔ اور قرآن نے یہ بتایا ہے کہ حضور ﷺ کی زندگی میں ہی خبیث اور طیب الگ ہو گئے تھے۔

آپ ﷺ کی زندگی میں ہی تمام خبیث الگ ہو گئے تھے

یہ جو کہا جاتا ہے کہ جی ٹھیک ہے حضور ﷺ کی زندگی تک تو یہ تھے اُدھر آپ ﷺ نے آنکھ بند کی اور اُدھر یہ سارے کے سارے مرتد ہو گئے۔ قرآن کی شہادت کے خلاف ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہم مؤمنین کو اس حالت میں نہیں چھوڑیں گے کہ خبیث اور طیب میں

امتیاز نہ ہوجائے۔امتیاز کردیا جائے گا۔حضورﷺ کی وفات کے وقت انصاراور مہاجرین یہ جماعتِ مؤمنین جو تھی ان کے اندر کوئی ایک بھی منافق نہیں تھا' یہ سب مومن حقا تھے جس گروہ کے متعلق کہا کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا' وہ متمیز طور پر الگ گروہ تھا۔ ان تمام چیزوں کے متعلق حضورﷺ کی بصیرت سے تھا' حضورﷺ کی فراست تھی' حضورﷺ کی ذاتی خصوصیات تھیں' سیرت کی بلندی تھی' کردار کی پاکیزگی تھی جس کی بناء پر آپﷺ نے اس قسم کا ایک معاشرہ متشکل کر کے بتایا۔اور یہی چیز اسوہ بن سکتی ہے۔

انسانی زندگی کا ایک اور پہلو جہانِ فردا کا تصور اور ایمان

کہا کہ کیوں تم نے یہ کہالَا یَسۡتَاۡذِنُکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ اَنۡ یُّجَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَ اَنۡفُسِهِمۡ وَ اللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِیۡنَ (9:44)اور یہاں بڑی عجیب چیز سامنے آ گئی۔کہا کہ جولوگ اللہ اور آخرت پہ ایمان رکھنے والے ہیں وہ ایسے مقام پہ اجازت مانگا کرتے ہیں پیچھے رہنے کی؟ یہاں دو ہی چیزوں کی خصوصیت بتائی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے۔کبھی غور فرمایا آپ نے۔ ویسے تو ایمان کے پانچ اجزاء قرآن نے گنائے ہوئے ہیں: اللہ پر اس کے ملائکہ پر کتابوں پر انبیاء پر اور آخرت پر ایمان۔لیکن اس کا انداز یہ ہے کہ جس مقام پہ کوئی گفتگو ہو رہی ہو' ان میں سے جس کی اہمیت وہاں زیادہ ہو اس کو ابھار کے وہاں لاتا ہے۔آپ نے غور فرمایا کہ مقام کیا ہے۔مقام یہ ہے کہ جانیں ہتھیلی پہ رکھ کے میدانِ جنگ میں چلے جا رہے ہیں شاداں وفرحاں۔کونسا جذبہ ہے جو اس طرح سے لے جاتا ہے انسان کو وہاں۔اگر ایمان یہ ہو یا زندگی کا اصول یہ سمجھ لیا جائے کہ زندگی تو یہ طبعی زندگی جسم کی ہے' موت کے بعد خاتمہ ہو جاتا ہے' کس کا جی چاہتا ہے پھر اس طرح سے مرنے کے لیے۔اُس کے بعد تو کوشش کی جائے گی کہ زیادہ سے زیادہ زندہ رہے کیونکہ زندگی تو یہی ہے۔پھر یہ چیز کہ صاحب مجھے کیا پڑی ہے دوسروں کی خاطر اپنی جان دیدوں۔

حصولِ رزق کے لیے نظامِ ربوبیت مومن کو تو غم زدہ ہونے ہی نہیں دیتا

یہ جو لیے پھرتے ہیں کہ صاحب کلمۃ اللہ کو بلند کرنا ہی سب کچھ کرنا ہے۔یہ کلمۃ اللہ کیا ہوتا ہے جس کو بلند کرنا ہے؟؟ وہ اس کو مانتا ہی نہیں ہے اس لیے کہ طبعی زندگی کو زندگی ماننے والا ان چیزوں کو مانتا ہی نہیں ہے۔اور یہ وجہ ہے کہ اس کے لیے کسی Cause کی خاطر جان دینا ناممکن ہوتا ہے۔وہ کوئی اور کشش ڈھونڈے گا اس کے لیے۔جان دیدینا کسی بات کے لیے کوئی آسان بات ہے؟؟ لیکن جو یہ ایمان رکھتا ہے کہ خدا کی طرف سے دی ہوئی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا' انسانی زندگی ہے۔اور اس کے لیے اگر جان دیدی جائے تو میرا کچھ نہیں بگڑتا' میں نے تو مرنا ہی نہیں ہے۔میدانِ جنگ میں جس سپاہی کا یہ ایمان ہو کہ جسے مقابل والے کہیں گے کہ ہم نے اسے مار دیا' یہ ان کی فریبِ نگاہ ہے' میں تو مر ہی نہیں سکتا' میں نے تو مرنا ہی نہیں ہے' زندگی تو مسلسل آگے چلنے والی چیز ہے۔یہ تو جوئے رواں ہے'

باہر سے چلی آئی ہے، ایک پُل کے نیچے سے گذر کے صحنِ گلستاں میں داخل ہوجائے گی۔ کبھی ندی کو یہ ڈر آتا ہے کہ میں کیوں رواں ہو کے آگے چلی جارہی ہوں۔ یہ جو میدانِ جنگ میں ہنستے کھیلتے ہوئے جان دیدینے والے تھے، جن کو شہید کہا جاتا ہے، کونسی چیز ہے جو ان کو اس کے اوپر آمادہ کردیتی ہے۔ اس قرآنی نظام نے ہر ایک کو یہ ضمانت دے رکھی تھی کہ تمہارے اور تمہارے بال بچوں کے رزق کے ہم ذمہ دار ہیں۔ تو پہلی چیز تو اس سپاہی کے لیے یہ تھی کہ جان بھی اگر چلی گئی تو کوئی حرج نہیں، پیچھے بھوکے نہیں مریں گے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ اس مرنے والے کو دیکھئے جسے نظر آرہا ہو کہ میرا دم گیا اور ابھی یہ چھوٹے چھوٹے بچے، کل ہی یتیم ہو کے گلیوں میں رُل جائیں گے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ جسے اتنا سکون ہوتا ہے کہ نہیں کوئی بات نہیں، کچھ بگڑتا نہیں ہے اس پہ یہ چیز ایسے نہیں گذرتی۔ یہ اللہ پہ ایمان ہے اس کے نظام پہ ایمان کہ میں یہاں ہوں یا نہ ہوں، میرے پس ماندہ جو ہیں ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، وہ محروم نہیں ہوجاتے۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے آخرت پہ ایمان کہ یہاں زندگی ختم نہیں ہوجاتی مجھے زندہ رہنا ہے۔ جسے دونوں یقین ہوں آپ سوچئے تو سہی وہ کس طرح سے میدانِ جنگ میں لڑے گا، وہ اجازتیں طلب کرے گا؟؟ یہ ہیں دو چیزیں جسے کہا ہے کہ جن کو اللہ اور آخرت پر ایمان ہوتا ہے۔ اللہ پہ ایمان اس دنیا میں۔ کیونکہ وہاں جو ہے نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ (6:151) خدا کہتا ہے ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔

نظامِ ربوبیت کی عملی شکل انسانوں کے ہاتھوں ہی پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے

اُس نے ہماری اتنی عزت رکھ لی ہے، اتنا شرف دیا ہے کہ ملے گا تو انسانوں کے ہاتھوں سے لیکن لینے والے کو کہا ہے کہ تم ان کے رہینِ کرم نہیں ہو، ہم دیتے ہیں، یہ کون ہیں دینے والے۔ آہاہاہا۔ ''او صدقے تیرے رب بَنن دے''۔ انسان کی شرف عزت کا اتنا پاس۔ یہ نہیں کہا کہ ہم دیں گے۔ یہ جو ہے ہم دیں گے یہ ہے ایمان باللہ۔ یہ ایمان آتا کس طرح سے ہے؟ اگر وہ نظام قائم ہو کہ جس میں یہ خدا نے وعدہ کیا ہے، وہ پورا ہورہا ہو۔ یہ چیز بھی تو قرآن نے خود ہی واضح کردی کہ اس سے یہ مراد نہ لے لیجئے گا کہ ہم آسمان سے روٹیاں دیتے جائیں گے۔ سورۃ یٰسین میں کفار کے متعلق ہے کہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر خدا نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے کہ ہم دیں گے ان سب کو تو یہ لوگ بھوکے کیوں مرتے ہیں۔ کہا ان کم بختوں سے کہو کہ خدا آ کے خود نہیں دیا کرتا، ایک نظام قائم ہوتا ہے جس کے ذریعے سے ملا کرتا ہے۔ اس نظام کی رو سے یہ ایمان کی بات ہوتی ہے۔ اور آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ تسلسلِ حیات پر ایمان کہ میں نہیں مرتا مجھے آگے جانا ہے بڑے کام ابھی اور کرنے ہیں۔ جن کا اس پہ ایمان ہوتا ہے وہ کبھی اجازتیں نہیں مانگا کرتے پیچھے رہنے کی۔ اِنَّمَا يَسۡتَاۡذِنُكَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ (9:45) یہ ہے وہ بات۔ عذرداریاں وہ پیش کیا کرتے ہیں اجازتیں وہ مانگا

کرتے ہیں جن کو ان پہ ایمان نہیں ہوتا۔ ایمان اگر اسی کا ہی نام ہے جو ہم کہہ رہے ہیں تو پھر ان سب کا تو اس طرح ایمان موجود تھا۔ یعنی ان کے مسلمان ہونے کی شہادت تو قرآن دے رہا ہے کہ یہ کہیں کہ ہم مسلمان ہو گئے ہوئے ہیں۔

لفظ ''ریب'' اور ''شک'' میں فرق کی نوعیت

کہا گریز کی راہیں وہ نکالتے ہیں جن کا ایمان نہیں ہوتا۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہے؟ دیکھیے یہ ہے نتیجہ۔ **وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ** (9:45) نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ شکوک پیدا ہو جاتے ہیں ان کے دل میں۔ اور ریب میں اور شک میں فرق ہے عربی زبان میں۔ شک تو Abstract چیز ہوتی ہے جس کے متعلق ابھی یقین نہ ہو کہ سامنے جو بیٹھا ہے درخت کے اوپر' وہ طوطا ہے یا مینا ہے۔ ریب ہوتا ہے اس قسم کا شک جس سے دل میں اضطراب پیدا ہو جائے' پتہ نہیں روٹی ملے گی یا نہیں ملے گی' پتہ نہیں بچے پیچھے بھوکے مریں گے یا ان کو کوئی دے گا یا نہیں' اسے ریب کہتے ہیں۔ اور یہ وہ ریب ہے جس کو ختم کرنے کے لیے قرآن آیا ہے۔ **ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ** [2:2]۔ اس کے مطابق عمل کیا جائے گا تو یہ ریب کی کیفیت باقی نہیں رہے گی۔ کہا جو ان چیزوں کے اوپر ایمان نہیں رکھتے' ان کے دلوں میں ایک اضطرابی کیفیت لیے ہوئے شک پیدا ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ تردد میں رہتے ہیں' جائیں یا نہ جائیں پتہ نہیں کیا ہو۔ یہ ہے وہ ریب۔ ارادے باندھتا ہوں باندھ کر پھر توڑ دیتا ہوں۔ کیوں توڑ دیتے ہو؟ کہیں ایسا نہ ہو جائے' کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ **فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ** (9:45) یقینِ محکم والا ہے وہ تو کبھی سوال ہی نہیں ہے۔ کہا یہ بھی اچھا ہوا کہ ایسے لوگ تمہارے ساتھ نہ چلے۔ اس قسم کے ساتھیوں سے نقصان کے علاوہ اور فائدہ کیا ہوگا۔ **وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰکِنْ کَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِیْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ o لَوْ خَرَجُوْا فِیْکُمْ مَّا زَادُوْکُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَااَوْضَعُوْا خِلٰلَکُمْ یَبْغُوْنَکُمُ الْفِتْنَةَ**(9:46-47) کہا اگر یہ جاتے تو تمہارے لیے مصیبت کا موجب بنے رہتے۔

منافق کی پہچان اس کی اپنی غداریوں سے ظاہر ہو جاتی ہے

پہلی آیت میں ہے کہ اگر واقعی ان کی نیت ہوتی جانے کی اور بعد میں ہی کوئی کسی قسم کا کوئی ایسا سبب بن جاتا جس سے کہ یہ معذور ہو جاتے' نہ جا سکتے۔ تو تم یہ دیکھتے کچھ نہ کچھ تو یہ تیاریاں کرتے جانے کی۔ اتنے بڑے جہاد کے لیے نکلنا تھا' اتنا لمبا سفر تھا' کچھ تیاریاں تو کرتے۔ تم نے دیکھا کہ انہوں نے شروع سے تیاریاں ہی نہیں کی تھیں۔ خدا یونہی نہیں کہہ دیتا کہ ہمیں تو معلوم تھا منافق ہیں۔ کہا یہ دیکھئے علامت کہ یہ Genuine نہیں ہیں اپنی عذر داری کے اندر۔ اگر یہ جانے کے لیے Genuinely دل سے تیار ہوتے تو کچھ تیاریاں کرتے پہلے سے۔ دیکھا یہ دلیل انسانی سطح کے اوپر دی جا رہی ہے۔ خدا تو دلوں کی کیفیت جانتا ہے نا وہ کہہ دیتا کہ ہم ان کے دلوں

سے واقف تھے کہ یہ ایسے ہی ہیں بے ایمان۔ یہ بات نہیں کہی' بات وہ کہی ہے کہ جو ہر انسان کے ساتھ پیش آ سکتی ہے کہ ذرا سوچو تو سہی اگر واقعی یہ Genunie ہوتے جانے میں یہ نیک نیت ہوتے تو کچھ نہ کچھ تیاریاں کرتے نا۔

ہمارے ہاں کے تراجم کی پیدا کردہ غلط سوچ کا نتیجہ

رسول کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ دیکھا ان چیزوں پہ تمہاری نگاہ گئی تم نے ان کی زبان کو At the face of it مان لیا ورنہ بات بڑی صاف سی تھی کہ بالکل انہوں نے تیاری نہیں کی۔ یہاں پھر وہ الفاظ آئے ہیں جن کا ترجمہ کیا جائے تو پھر وہی مشکل آ جاتی ہے۔ وَّلٰـكِـنۡ كَـرِهَ اللّٰهُ انۡۢبِعَاثَهُمۡ (9:46) کہ خدا نے ہی ان کا یہ جانا اور اٹھنا پسند نہیں کیا تھا۔ فَثَبَّطَهُمۡ (9:46)۔ یہ ترجمہ ان لفظوں کا ہر قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ خدا نے ان کو روک دیا وَ قِيۡلَ اقۡعُدُوۡا مَعَ الۡقٰعِدِيۡنَ (9:46) اور ان سے کہہ دیا کہ تم پیچھے بیٹھے رہنے والوں میں بیٹھے رہو۔ خدا نے روک لیا ان سے کہہ دیا کہ مت جانا' رک جاؤ۔ اور اس کے بعد پھر یہ کیفیت کہ ان پہ عذابِ عظیم آئے گا اور یہ مرتد ہیں یہ منافق ہیں۔ یہ سب کچھ بھی قرار دے رہے ہیں' وہ خود ہی کہہ رہا ہے کہ اس نے ان کو روک دیا۔ وہی جبر و اختیار کا سوال۔ وہی چیز کہ قرآن کے اندازِ بیان پہ نگاہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

علامہ پرویزؒ کی طرف سے پیش کردہ تصنیف کتاب التقدیر

میری طرف سے شائع کردہ ''کتاب التقدیر'' میں یہ تمام آیتیں جو میں نے دی ہیں۔ یہ خدا کا روک دینا نہیں ہوتا یہ تو وہ چیز ہے کہ خدا نے چونکہ انسانوں کو صاحبِ اختیار پیدا کیا ہے وہ وہاں لے جاتا ہے کہ ہم نے انسانوں کو اس طرح سے کیا پیدا ہے جس کی بناء پر یہ لوگ ان کاموں سے رک جاتے ہیں' اٹھتے نہیں ہیں۔ ذمے دار یہ خود ہوتے ہیں اس کے۔ اسی لیے تو آگے کہا جاتا ہے کہ ان کو اس کی سزا ملے گی جو یہ کچھ کرتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خدا ہی کسی کو روک دیتا ہے' کسی کو آمادہ کر دیتا ہے۔ نہ رکنے والے کا جرم' نہ جانے والے کا کوئی کریڈٹ تو پھر وہی بات آ گئی جو پہلے تھی۔ ان آیات کے یہ مفہوم نہیں ہیں۔ لَوۡ خَرَجُوۡا فِيۡكُمۡ مَّا زَادُوۡكُمۡ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَا۟اَوۡضَعُوۡا خِلٰلَكُمۡ (9:47) اگر یہ جاتے تمہارے ساتھ تو مصیبت کا موجب ہی بنے رہتے' تمہاری جماعت کے اندر انتشار پیدا کرتے' خلفشار پیدا کرتے۔

لفظ لَهُمۡ کا قرآنی مفہوم یعنی کسی کی بات کو اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے سننا مقصود ہو

وَ فِيۡكُمۡ سَمّٰعُوۡنَ لَهُمۡ (9:47) اور تمہارے اندر وہ لوگ بھی تو ہیں کہ جو اس قسم کی باتوں پہ کان رکھ کے جاسوسیاں کرتے ہیں۔

سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ (9:47) یہ خاص چیز ہے عربی زبان کے قاعدے کی رو سے یہ ہوگا کہ جو باتیں سنے یہاں سے کسی دوسرے کی خاطر۔ بڑا عجیب لفظ ہے یہ لھم کا۔ آن ڈیوٹی ہو‘ خود نہ سننے کے لیے بلکہ کسی کی طرف سے بھیجا ہوا۔ کنسٹرکشن کتنی خوبصورت ہے۔ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ یعنی انسان سنتا تو خود ہے‘ وہ کہتا ہے یہ اپنے لیے نہیں سنتے‘ کسی اور کی خاطر سنتے ہیں۔ ویسے تمہاری مجلس میں آ کے بیٹھے ہیں۔ تمہارے ذہن میں ہوگا کہ صاحب بڑے اچھے لوگ ہیں قرآن سننے کے لیے آئے ہوئے ہیں بڑے التزام سے آتے ہیں‘ بڑی پابندی سے آتے ہیں‘ بڑی جاذبیت سے سنتے ہیں‘ واہ واہ بھئی کیا بات ہے ان کی۔ وہ کہتا ہے سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ یہ کسی اور کے فائدے کی خاطر سنتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں قدم قدم پر پیدا کردہ مشکلات کی نوعیت اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! بڑا لطف آتا ہے اگر قرآن کے ان اندازوں کا پتہ ہو۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ (9:47) دیکھئے لفظ کیا آیا ہے۔ ہم جانتے ہیں۔ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ (9:48) کہتا ہے یہ اس قسم کی تدبیریں نئی نہیں ہیں‘ یہ کرتے ہی چلے آ رہے ہیں۔ مختلف مقامات کے اوپر انہوں نے یہ کچھ کیا۔ تدبیریں الٹ دیں‘ تمہاری سکیم کو فیل کرنے کے لیے انہوں نے بہت کچھ بنایا‘ سازش بنائی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ (9:48) خدا کی بات غالب آتی رہی‘ حق ظاہر ہوتا رہا خواہ ان کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرتا رہا‘ یہ ہوتا رہا۔ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (9:49) ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں جیسے کہتے ہیں کہ Officially اس کے لیے ہمیں Permission دیدیجئے کہ ہم اپنے پاس ریکارڈ میں رکھ لیں اور بعد میں ہمارے خلاف کسی قسم کا کوئی مقدمہ نہ چلایا جائے‘ جرم نہ عائد کیا جائے۔ ایسی ایسی پیش بندی کرنے والے لوگ بھی ہیں کہ ہمیں اس کی کوئی سزا نہ ملے۔ بڑے عجیب لفظ ہیں۔ کہتا ہے کہ انہیں کون بتائے کہ سزا تو انہیں اس وقت بھی مل رہی ہے۔ ارے تم بعد کی پیش بندی کرنا چاہتے ہو کہ کوئی اس قسم کی سند ان کے ہاتھ میں ہو کہ بعد میں ان کو کوئی سزا نہ دے۔ نہیں جانتے ہو کہ سزا تو اس وقت بھی مل رہی ہے۔ دو لفظوں میں ایک بات کہدی۔

جنت اور جہنم تو انسان کے ایک ایک نس کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے

عزیزانِ من! بڑی عظیم حقیقت ہے۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ جہنم تو ان کو اس وقت بھی گھیرے ہوئے ہے۔ وہ جہنم جس کے متعلق ہمیشہ ہمارے ذہن میں آیا ہے کہ وہ مرنے کے بعد ’’اوکتھے تندور گڈے ہوئے ہیگے نیں‘‘ یہاں نہیں اس کا کوئی واسطہ‘ یہاں کوئی بات نہیں ہے۔ دوسرے مقام پہ یہ ہے کہ اتنا ہی فرق ہے کہ جہنم تو انہیں اب بھی دیکھ رہا ہے‘ ان اندھوں کو وہ نظر نہیں آتا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ

بہر حال ان سے خوشا بخت ہے کہ وہ جسے یہاں جہنم نظر آ جائے۔یہیں سے عزیزانِ من! جنت اور جہنم شروع ہوتا ہے۔وَ اللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ (2:202) کہتا ہے،ہم تو بڑی جلدی حساب کر لیتے ہیں' کھٹا کھٹ فٹا فٹ۔انسان کی ہر سانس سے جہنم کے شعلے بھی بھڑکتے ہیں اور اس کی جنت کی نسیمِ بہار بھی چلتی ہے کہ اسی کے دم کی آمد و شد سے یہ دونوں چیزیں بنتی چلی جاتی ہیں۔اس کا ہر خیال' اس کا ہر فیصلہ' اس کا ہر عمل یا جہنم کا ایندھن بنتا ہے یا بہشت کے محل کی اینٹ بنتا چلا جاتا ہے۔اتنی بڑی چیز ہے کہ کہتے یہ ہیں کہ ہمیں اس قسم کی Permission دیدیجئے تاکہ ہمیں بعد میں سزا نہ ملے۔کتنی غلط نگہی ہے کہ یہ بعد کی سزا کا ذہن میں ان کے ہے۔اقبالؒ کہتا ہے کہ

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

بڑی لمبی وعظ تم نے کی کہ قیامت ہوگی' وہاں ایسا میدان ہوگا' حشر کا دیہاڑا ہوگا' تانبے کی زمین ہوگی سوا نیزے پہ سورج ہوگا اور پھر وہ میزانیں کھڑی ہو جائیں گی' اعمال تلیں گے' اس کے بعد پھر وہ جہنم کے اندر بھیجے جائیں گے۔

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی
ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

قیامتِ موجود تمہیں نہ نظر آئی۔

زندگی کے حالات کو بدلنے کے لیے اپنے تصورات کو بدلنا ہوگا

یہ تصورات جب تک نہیں بدلتے عزیزانِ من! کہ جہنم انسانوں کی زندگی میں یہیں سے شروع ہوتا ہے۔اِنَّ جَهَـنَّـمَ لَمُحِيۡطَةٌ ۢ بِالۡـكٰفِرِيۡنَ (9:49) عربی جاننے والے جانیں گے اس کو کہ ''ان'' اور ''ل'' کیا ہے۔بڑے ہی یقین کے لیے یہ آتا ہے۔خود ''ان'' ہی کچھ کم نہیں ہوتا اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌ ۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ (9:49) او یہ ایک حقیقت ہے اور ''محیط'' چاروں طرف سے جو چیز کسی کو احاطہ کیے ہوئے ہو۔جہنم کی تو یہ کیفیت ہے ان کی لیکن انہیں ہی نظر نہیں آتی۔اس لیے جو چیز وہ کہہ رہے ہیں۔اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡكَ مُصِيۡبَةٌ يَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ يَتَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ فَرِحُوۡنَ (9:50) ذہنیت ان کی یہ ہے' بظاہر آ کے کہتے ہیں ہم تم میں سے ہی ہیں' تمہارے ساتھ ہیں۔حالت یہ ہے کہ اگر تمہیں کوئی خوشگواری نصیب ہوتی ہے تو ان کو بڑا دکھ ہوتا ہے۔تم پہ کوئی مصیبت آتی ہے تو بڑے خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں صاحب' شکر ہے کہ ہم ان کے ساتھ نہیں تھے' ہم نے تو پہلے ہی اپنا انتظام کر لیا تھا۔ہمیں پتہ تھا کہ یہ ہونا ہے ان کے ساتھ۔یہ کیفیت ہے ان کی۔بڑی خوشی مناتے ہیں اس وقت۔

غلط تراجم کی بھرمار نے قرآنی حقائق کو مسخ کر رکھا ہے

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ھُوَ مَوْلٰنَا وَ عَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (9:51) یہاں پھر ترجمے کی غلطی لے جاتی ہے انسان کو۔ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ان سے کہدو کہ کوئی مصیبت نہیں ہم پہ پڑ سکتی بجز اس کے جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دی ہو۔ 'بس لکھ دی ہو' آپ نے کئے معنی اور آ ئے اس مجوسی چکر میں تقدیر کے۔ قانون کی بات ان کے ذہن میں نہیں آتی۔ میں نے یا اس سے ایک درس پہلے بتایا تھا کہ قرآنِ کریم نے تو قانونِ فطرت کو بھی کتاب اللہ کہا ہے۔

قرآن حکیم درحقیقت قانون فطرت کی ترجمانی کا ہی دوسرا نام ہے

یہاں ہی تھا وہ 36 ویں آیت میں اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اثْنَا عَشَرَ شَھْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (9:36) زمین کا سورج کے گرد ایک سال میں چکر پورا کر لینا اور اس کا تمہارا اُسے بارہ مہینے میں تقسیم کرنا' کہا یہ کتاب اللہ کے اندر ہم نے درج کر دیا تھا جس دن ارض وسما کی تخلیق کی تھی۔ تو یہ کتاب اللہ کونسی ہے۔ لیکن یہاں تو ان کو نہ یہ کتاب نظر آتی ہے۔ وہ یورپ کے ملحدین اور مادین کے لیۓ' یہ اس لیے کہ 'ازلیین او آ ساں بمیری' ''کہ جان نہیں نکلدی تے لیین سناؤ''۔ ورنہ قرآن تو یہاں اس کو کہہ رہا ہے کتاب اللہ۔ لَنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا (9:51) کوئی واقعہ نہیں گذر سکتا۔ مصیبت کے لیے بھی ہمارے ہاں صرف مصیبت کا لفظ آتا ہے' عربی زبان میں ہر واقعہ Every Event جو کسی کے اوپر گذرتا ہے اس کو یہ کہا جاتا ہے۔ کہا ہمارا تو ایمان ہے کہ ہر واقعہ ہر حادثہ جو کچھ بھی ہوتا ہے' وہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے اُس میں سوال ہی نہیں ہے کہ تم اس پہ خوشیاں مناؤ کہ ہم نہیں تھے ہماری وجہ سے یہ ہوا۔ قانونِ خداوندی کے سمجھنے میں یا اس کے مطابق عمل نہ کرنے میں کوئی نقصان بھی ہوتا ہے تو ہم جانتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہوا۔ اور پھر ہمیں اس پہ بھی بھروسہ ہے کہ اس کا ازالہ ہو سکتا ہے اگر ہم پھر اس کے قانون کی طرف لوٹ کے چلے جائیں۔ بھروسہ اس پہ یقین ہے کہ ہر بات اس کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ کہا وَ عَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (9:51) یہی وہ یقینِ کامل ہے جس کی بناء ہم یہ کچھ کر کے دکھا رہے ہیں تمہیں۔ بھروسہ ہے قانون کی پختگی پر کہ اس کے مطابق کیا جائے گا تو یقیناً اس کے مطابق نتیجہ نکلے گا۔ غلطی کا غلط نتیجہ' صحیح کا صحیح نتیجہ۔ سورۃ التوبہ کی آیت 51 تک ہم آ گئے 52 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

ساتواں باب: سورۂ توبة (آیات 52 تا 59)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1973ء کی پہلی تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 52 سے ہوتا ہے۔ (9:52)

قرآن حکیم فلسفۂ تاریخ اور غیر متبدل اصول وقوانین کی کتاب ہے

آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ توبہ میں جنگ کے متعلق اصولی ہدایات دی گئیں۔ پھر ان جماعتوں کا ذکر کیا جو عام حالات میں جب جماعت کو کسی قسم کی مصیبت یا تکلیف کا سامنا نہ ہو تب تو وہ جماعت کا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی ایسا وقت آئے کہ جماعت کو کوئی مقابلہ کرنا پڑے اس میں تکالیف اٹھانی پڑیں تو ایسے مقام پہ وہ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن منافقت برتتے ہیں' بات صاف نہیں کرتے دل میں کچھ اور ہوتا ہے' عذر کوئی اور پیش کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے قرآنِ کریم میں ایک خاص ذہنیت کا تذکرہ بار بار آتا ہے بڑا تفصیلی

آ تا ہے۔اُسے مفاد کہا جاتا ہے۔ہم نے تو قرآن کے متعلق یہ طے کر رکھا ہے کہ اس میں کچھ باتیں یہودیوں کے متعلق ہیں' کچھ عیسائیوں کے متعلق ہیں' کچھ مشرکینِ مکہ کے سلسلہ میں ہیں' کچھ منافقین کے متعلق ہیں۔تو گویا یہ سب اس زمانے ہی کے لوگ تھے جن کے متعلق یہ باتیں تھیں' ہمارے متعلق اس میں کچھ نہیں ہے۔ہم جب قرآن کی ان آیات کو سنتے ہیں تو ذہن میں فوراً یہ تصور آ جاتا ہے کہ یہ اس زمانے کے کسی گروہ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔گویا ہمارا تذکرہ نہیں ہے۔تو قرآن تو تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ وہ ماضی کے قصے دہراتا چلا جائے۔وہ تو اگر ماضی کا کوئی قصہ بھی بیان کرتا ہے تو اس لیے کہ اس سے ہر زمانے کی مخاطب قوم جو ہے' وہ اس سے عبرت آموز ہو۔واقعات تو وہ پرانے ہی خواہ دہرائے لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ یہاں تو ہر نتیجہ ایک قانون کے تابع نکلتا ہے' قانون اٹل ہوتا ہے۔واقعات خواہ پانچ ہزار سال پہلے ہوں' ظہورِ قرآن کے زمانے میں ہوں' آنے والے زمانے میں قیامت تک کے لیے وہ واقعات کبھی بھی ظہور میں آئیں۔وہی جو غیر متبدل اور اٹل قوانین ہیں انہی کے تابع ان کے نتائج مرتب ہونگے۔اس لیے قیامت تک کے لیے پوری نوعِ انسان کے لیے یہ ضابطۂ راہنمائی بنتا ہے اس میں جو اصولی ہدایات دی گئی ہیں وہ مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ان کے محسوس پیکر ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں روح ان کے اندر وہی رہتی ہے۔یہ ہے جس انداز سے قرآن نے تاریخ کو پیش کیا ہے۔تاریخ کا یہ انداز اس سے پہلے کسی کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔کہا یہ جاتا ہے کہ ایک تاریخ ہوتی ہے' ایک فلسفۂ تاریخ ہوتا ہے۔عام طور پہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے دور میں ایک فلسفۂ تاریخ سامنے آیا۔اور عام طور پہ جرمن مفکر ہیگل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کی ابتداء کی۔ان کی نگاہ اگر قرآن پہ ہوتی تو وہ دیکھتے کہ قرآن نے تاریخ بیان نہیں کی بلکہ تاریخ کا فلسفہ بیان کیا ہے۔اور اس فلسفے کو واضح کرنے کے لیے تاریخی واقعات بھی اپنے دامن میں اس نے محفوظ رکھے ہیں۔مقصد اس کا وہی ہے جسے آپ فلسفۂ تاریخ کہتے ہیں کہ اگر کسی قوم میں فلاں قسم کی ذہنیت پیدا ہو جائے گی' اس کا فطری نتیجہ فلاں قسم کا مرتب ہوگا۔یہ ہے وہ اٹل چیز جو قرآن بتاتا ہے۔اسی ضمن میں قرآنِ کریم کی اولیں مخاطب اقوام جو تھیں یہ ان کے تذکروں کو بھی سامنے لاتا ہے۔مقصد اس سے بھی یہی ہے کہ ہر دور کے انسان یہ دیکھ لیں کہ جہاں جہاں یہ ذہنیت ہوگی' وہاں نتیجہ یہ مرتب ہوگا۔

قرآن حکیم کے آئینہ میں ہماری موجودہ حالت

اب میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میری تو سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم اپنے آپ کو کس زمرے میں شریک کریں قرآنِ کریم کے مطابق۔بہرحال وہ جماعتِ مؤمنین جن کا وہ ذکر کرتا ہے ان میں تو ہم کبھی آ ہی نہیں سکتے' سوال ہی نہیں ہے۔اہم خصوصیات جو وہ بیان کرتا ہے' وہ ساری ان منافقین سے ہی ہماری ملتی جلتی ہیں۔زبان سے ہمارا اقرار ہوتا ہے مسلمان ہونے کا اور ان چیزوں پہ ایمان لانے کا

بھی۔ یہ اقرار کبھی ہم دل کی گہرائیوں میں تو محسوس نہیں کرتے اور نہ ہی ہمارے عمل میں اس کا کبھی اظہار ہوتا ہے۔ کوئی ایمان کوئی عقیدہ کہ جس کا اظہار عمل میں نہیں ہوتا وہ صرف یہی نہیں کہ مردہ آں ایماں کہ نیاید در عمل' وہ مردہ ہوتا ہے۔ وہ مردہ ہی نہیں ہوتا وہ تو ایک متعفن لاش ہوتی ہے کہ جس کے انفیکشن کے اثرات دور دور تک جاتے ہیں۔ کھلا ہوا کافر ہزار درجے بہتر ہوتا ہے اس قسم کے نقاب پوش مومن سے جسے منافق کہتا ہے قرآن۔ اُس کے متعلق یہ معلوم ہے کہ جو کہتا ہے وہ Mean کرتا ہے' دشمن ہے تو کھلا ہوا دشمن ہے' دوستی ہے تو کھلی ہوئی دوستی ہے جو زبان سے کہتا ہے وہی دل کے اندر ہے۔ آپ سے اختلاف کرتا ہے اتنی سی بات ہی اس میں صرف ہوتی ہے' باقی اس کی Personality کے متعلق آپ کو علم ہوتا ہے کہ وہ کیا کہتا ہے اور کیا مقصد ہے اس کا۔ اس کے برعکس یہ ایک جماعت کا ذکر ہے جسے ہم سمجھتے ہیں کہ اس زمانے کے منافقین کا ذکر ہے جن کے متعلق کبھی اعتبار و یقین ہی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کہتے کیا ہیں' ان کے دل میں کیا ہے' کب تک یہ ساتھ دیں گے' کس مقام پہ جا کے ساتھ چھوڑیں گے۔ اور جب ساتھ چھوڑیں گے تو یہ نہیں ہوگا کہ وہاں جا کے یہ کہیں کہ صاحب ہم میں یہ کمزوری تھی اس لیے ہم ان کے ساتھ نہیں چل سکے۔ بلکہ وہ ان کے اندر ہزار عیب گنائیں گے کہ میں نے دیکھا ہے اندر رہ کے اتنا عرصہ ان کے باہر دعاوی عجیب قسم کے کرتے ہیں۔ اندر رہ کے دیکھئے ان کے کیا کیا آپ کو کردار نظر آئیں گے کیا کیا چلن نظر آئیں گے۔ اتہامات لگائیں گے طعن دیں گے الزامات عائد کریں گے۔ محض اپنے اس ایکشن کو Justify کرنے کے لیے کہ ہم ان سے الگ ہوگئے یا ہم نے ایسے وقت میں ان کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔ یہ ایک ذہنیت ہے جسے وہ منافقت کہتا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ہمارے ہاں تو قدم قدم پہ یہ چیز نظر آتی ہے۔ اسلام تو بڑی چیز ہے' ہم باہمی معاملات میں ایک دوسرے سے وہ منافقت برتتے ہیں۔ ہماری دوستیاں منافقت کے اوپر ہیں۔ اور اس کا نتیجہ اس نے بتایا تھا وہ ہمارے سامنے آرہا ہے۔ شکست ہی نتیجہ نہیں' ذلت وخواری اس کا نتیجہ وہ بتاتا ہے۔ اسی جماعت کا ذکر ہوتا چلا آرہا تھا۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ط وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ (9:52) یہ وہ لوگ تھے کہ جن کے زمانے میں خوانخوہ کے عذر پیش کر کے چاہتے تھے کہ ساتھ نہ جائیں اور پھر یہ بھی ساتھ کوشش تھی کہ ظاہر کیا جائے کہ ہم تم سے الگ نہیں ہوگئے' تمہارے ساتھ ہی ہیں۔ پھر دوسروں کو بھی ورغلاتے تھے کہ وہ بھی ساتھ چھوڑ دیں۔ کبھی کوئی بہانہ' کبھی کوئی عذر۔

منافق کے مقابل میدان جنگ میں مومن کے کردار کی بلند فکری

کہا یہ کہ ہمارے متعلق تو تم جو کچھ کہو گے' دو ہی باتیں اس میں سے ہونگی۔ جنگ میں ہم جارہے ہیں یا تو ہم فاتح ومنصور واپس لوٹیں

گے یا وہاں جان دیدیں گے۔ ہمارے لیے تو یہ دونوں چیزیں خوشگوار ہیں۔ مومن اور مجاہد جو ہے وہ تو میدانِ جنگ میں شہادت کو زیادہ خوشگواری سے قبول کرتا ہے واپس آنے کی نسبت۔ اور کہا کہ جو تمہارے ذہن میں ہے' وہاں جاؤ گے' جانیں ضائع ہو جائیں گی یہ تمہارا نقطۂ نگاہ ہے جسے تم جان کا ضائع ہو جانا کہتے ہو۔ مومن کے نزدیک جان ضائع نہیں ہوتی یہ تو اس سے بھی بلند مقام میں پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے ہمارے لیے تو میدانِ جنگ میں جانا نتیجہ اس کا کوئی بھی ہو' وہاں جان دیدینی پڑے یا فاتح و منصور واپس آنا ہو' دونوں چیزیں ہمارے لیے وجۂ خوشگواری ہیں۔ لیکن اپنے متعلق تم سوچو کہ تمہارا انجام کیا ہوگا۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ منافقت کا یہ طرزِ عمل ہمیشہ کے لیے تو نہیں رہ سکتا' یہ تو باہر آ کر رہے گا۔ اس صورت میں جماعت کا ساتھ چھوڑ رہے ہو تو ہو سکتا ہے کہ باہر سے کوئی خطرہ تمہارے اوپر آ جائے۔ جماعت کے ساتھ غداری کر رہے ہو تو خود جماعت کے ہاتھوں سے بھی تمہیں سزا مل جائے۔ تم تو محفوظ ہی نہیں رہ سکتے کسی جگہ بھی۔ یہ تو اس وقت تک ہے جب تک تم فریب دے سکو دوسروں کو۔ اور مستقل طور پہ ہمیشہ کے لیے تو سب کو فریب نہیں دیا جا سکتا۔ فریب کھلے گا تو جماعت کے اندر سے' تمہیں سزا ملے گا۔ باہر جب لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ وہاں بھی تم دھوکہ کر رہے تھے' ان لوگوں کے ہاتھوں سے بھی تمہیں سزا ملے گی۔ اس لیے انتظار ہی اگر تم نے کرنا ہے تو پھر انتظار کرو۔ ہمارے متعلق تو جو کچھ تم کہتے ہو ہمارے لیے تو وہ خوشگوار ہوگا۔ اپنے متعلق سوچو کہ تمہارا انجام کیا ہونے والا ہے۔ کیفیت یہ تھی میدانِ جنگ میں جانے کے لیے بلاوا آیا ہے۔ قرآن نے جہاد کے متعلق کہا ہے کہ دونوں چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس جدوجہد کے اندر مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے' جان دینے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مومن دونوں چیزیں دیدیتا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس مال نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے کہ ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کے پاس سواری تک بھی نہیں تھی۔ تو وہ اپنی محنت کو پیش کر دیتے ہیں اور پھر جان کو ہتھیلی پہ سر کو ہتھیلی پہ رکھ کر میدانِ جنگ میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اس خیال سے کہ اگر یہ فاتح و منصور واپس لوٹیں تو اس غنیمت میں اور اس فتح کے نتائج میں ہمارا بھی حصہ ہونا چاہئے۔ جماعت سے الگ بھی نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اور یہ چیز کہ انہیں جان بہت زیادہ پیاری ہے' ساتھ جانا بھی نہیں چاہتے۔

بدنیتی سے خرچ کیا ہوا مال قابل قبول نہیں ہوگا

تو اپنی منافقت کو وہ اس پردے میں چھپاتے ہیں کہ صاحب مال کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔ لیجئے ہم آپ کو عطیہ دیتے ہیں ہم اس فنڈ میں اپنا حصہ دے کر جماعت کے ساتھی تو ہو گئے۔ کہا سوال یہ نہیں ہے۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ Fund Create کر کے دولت جمع کرنی چاہیے' وہ کہیں سے آئے۔ مقصد تو صحیح مومن کو ساتھ رکھنا ہے۔ منافقت کی رو سے جان تو تم نے چھڑالی منافقت کا پردہ قائم رکھنے کے لیے چاہتے یہ ہو کہ کچھ پیسے دے کے ثابت کر دیں کہ جماعت کے ساتھ ہو۔ ایسے لوگوں کے تو پیسے بھی قبول نہیں کیے جا سکتے۔

منافقت میں دیا ہوا مال بھی قرآن قبول نہیں کرتا۔ کہا کہ ان سے کہو کہ (قُلۡ اَنۡفِقُوۡا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا لَّنۡ يُّتَقَبَّلَ مِنۡكُمۡ) (9:53) تمہارا پیسہ تو ہم قبول نہیں کریں گے۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ ہم نے کسی نہ کسی طرح سے فنڈ اکٹھا کرنا ہے' کہیں سے آ جائے' کسی شکل میں وہ مل جائے۔ اور یہ ہے فرق دورِ حاضرہ کی سیاست میں اور قرآن کی سیاست میں کہ جو مبنی ہی دل کے خلوص کے اوپر ہوتی ہے۔ یہاں کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ وہ دینے والا منافقت برت رہا ہے یا مصالحت برت رہا ہے' اس کی اپنی حکمتیں ہیں اس کے اندر۔ ان کے پاس جواز یہ ہوتا ہے کہ صاحب پارٹی کے لیے فنڈ ہونا چاہیے' روپیہ ہونا چاہیے بس روپے کے زور پر ہم سب کچھ کر لیں گے۔

مال و دولت کے سلسلہ میں حاکم وقت کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کا قولِ زریں

قرآن میں سوال یہ نہیں ہے کہ کس طریقے سے آپ کے پاس مال آتا ہے۔ یہ کس طریقے سے آنے کے متعلق حضرت عمرؓ کا کلمہ اتنا جامع ہے' یہ بڑی جامع Definition ہے۔ جب اُنؓ سے پوچھا گیا کہ خلافت کیا ہے' یہ حکمرانی کی ذمہ داری کیا ہے۔ آپؓ نے کہا کہ میں تو اسی نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ اس چیز کی باز پرس کہ لیا کہاں سے تھا اور دیا کہاں تھا۔ بڑی عجیب چیز ہے یہ۔ سمٹ کے بات یہاں آ جاتی ہے۔ تو یہ جو پہلا سوال ہے کہ لیا کہاں سے تھا اس کی اہمیت کبھی نگاہوں میں نہیں ہوتی۔ جسے بہت زیادہ امین بہت زیادہ دیانتدار کہتے ہیں وہ ہم دوسرے حصے پہ ہی ہوتے ہیں کہ اس مال کو اس نے خرچ کیسے کیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں وہ واقعی دیانتدار ہو۔ یہ پہلا حصہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ تو یہ دو چیزیں اکٹھی ہونگی تو پھر خلافت کی ذمہ داریاں سمجھ لیجئے کہ پوری ہوئیں۔ لیا کہاں سے تھا اور دیا کہاں تھا۔ تو یہ لیے جانے والی چیز بڑی بنیادی ہے۔ اور اس پر یہ تمام مصلحت کوشیاں قربان ہوجاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جو دل کے خلوص سے ہمارے ساتھ شامل نہیں ہے اس کا پیسہ بھی لینے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں' ان کے ساتھ واسطہ ہم کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے۔ تم چاہتے ہو کہ ان تکالیف سے ان مصائب سے بچ کے' کچھ تھوڑا سا مالی طور پہ Contribute کر دو چندا کچھ۔ اور اس چندہ دینے کے بعد سمجھ لو کہ ہم اس جماعت کے ساتھ ہیں۔ سراسر غلط ہے۔ جو دل سے ہمارے ساتھ نہیں ہے' اس کا چندہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا' قطعاً ہم اسے قبول نہیں کریں گے۔ (اِنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ) (9:53) اس لیے کہ تم وہ لوگ ہو کہ جو صحیح راستے کو چھوڑ کر کہ جس کے اندر کسی کی نشوونما ہوتی ہے' دوسرے راستوں کے اوپر چل نکلے ہو۔ اور جن کی یہ کیفیت ہو وہ خواہ رجسٹر کے اعتبار سے ہمارے ساتھ شامل کیوں نہ ہوں' اپنا نام وہ ہماری جماعت کے اندر کیوں نہ لکھاتے چلے جائیں' وہ ہم میں سے نہیں ہوتے۔ اس لیے ہم ان کا دیا ہوا چندہ بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وَ مَا مَنَعَهُمۡ اَنۡ تُقۡبَلَ مِنۡهُمۡ نَفَقٰتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوۡلِهٖ (9:54) کہا وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم کیوں نہیں یہ چندہ قبول کرتے۔ وہ اس واسطے کہ وہ اس نظامِ خداوندی پر دل سے یقین نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے ہم ان کا مال بھی قبول نہیں

کرسکتے۔ یہاں ایک بات کہی ہے عزیزانِ من! پہلے بھی آچکی ہیں یہ چیزیں لیکن قرآن بار باراس کا ذکر کرتا ہےاوراس سے ہم اپنی حالت کوبھی ماپ سکتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔نظرآتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو نام کے اعتبار سے مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ تھے۔حتیٰ کہ اس صلوٰۃ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔صلوٰۃ یہاں خواہ وہ نماز کہہ لیجئے جو ہنگامی اجتماع ہوتے ہیں مؤمنین سے مشاورت کے لیے' یا وہ پورا نظام کہہ لیجیے جسے دین کا نظام کہا جاتا ہے۔بہرحال کیفیت یہ ہے۔کہا کہ **وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى** (9:54) عام ترجمہ اس کا کیا جاتا ہے کہ یہ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں اس حالت میں کہ بڑے ہی سست سے ہوتے ہیں۔ قرآن اتنی عظیم چیز کہتا ہے اور ہمارے ہاں سمٹا کے اس کو رکھ دیا اتنا کہ نماز میں ذرا ڈھیلا ڈھالا سا کھڑا ہونا جو ہے یہ بری بات ہے ذرا' چست طریقے پہ کھڑا ہونا چاہیے۔یعنی منافق اگر یوں کھڑا ہو جائے تو منافقت ختم ہوگئی اور اگر ذرا سست ہو جائے تو پھر کہا کہ نہیں صاحب منافق ہے۔یعنی اتنی سی ہی بات ابدی طور پر قرآن نے دینی تھی کہ نماز میں یوں ڈھیلے ڈھالے نہ کھڑے ہوا کرو بلکہ چست کھڑے ہوا کرو' ڈھیلا کھڑے ہونے والا منافق ہوتا ہے۔

جہنم میں پست ترین مقام منافق کے لیے ہوگا

اس منافق کی کیفیت یہ ہے کہ اس کا عطیہ بھی قبول نہیں کیا جاتا' ساتھ نہیں ان کو رکھا جاتا ان کو' جہنم کے مقام اسفل میں کہا گیا ہے قرآن میں۔یعنی یہ مخالفت کرنے والے نہ ماننے والے بھی جہنم میں ہیں۔لیکن وہ جو پست تریں درجہ ہے جہنم کا' اس میں منافق کو کہا ہے قرآن نے۔اور اس کے لیے نشانی یہ بتائی کہ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو ذرا ڈھیلے ڈھیلے سے کھڑے ہوتے ہیں' چست کھڑے ہو جائیں تو پھر جنت میں۔یہ ہیں وہ چیزیں جو ہمیں حقائق تک نہیں آنے دیتیں۔قرآن کا اعجاز ہے کہ ایک لفظ استعمال کرتا ہے اور اتنی جامع چیز اس میں بیان کر کے رکھ جاتا ہے۔

دین میں ثواب کا وہ مفہوم جو آپ کے ہاں اہمیت کا حامل ہے

دین کی بنیاد یہ سمجھئے کہ اس میں کوئی چیز محض ذہنی اور نظری نہیں ہے۔ذہنی اور نظری کا میں کئی دفعہ بتایا کرتا ہوں جسے کہتے ہیں کہ اس طرح سے کھڑے ہو جایئے نماز میں تو' بھئی اس سے کیا ہوتا ہے' کہتے ہیں ثواب ہوتا ہے' بھئی وہ کیا ہوتا ہے' کہتے ہیں ثواب ہوتا ہے۔ مجھے بتایئے تو سہی کہ کیسے پتہ چلے کہ ثواب ہوگیا ہے اور ثواب نہیں ہوا' کوئی جواب نہیں اس کا۔زیادہ زور دیجئے' تو کہتے ہیں صاحب یہ معاملہ قیامت میں جا کے پتہ چلے گا۔یعنی یہاں کوئی پیمانہ ہی نہیں جس سے ماپا جاسکے کہ ثواب ہوا ہے یا نہیں ہوا' ملا ہے یا نہیں ملا۔یوں ہوسکتا ہے کہ اپنے ذہن سے آپ سمجھ لیں کہ ثواب ہوگیا ہے اور قیامت میں جا کے پتہ چلے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔تو پھر کیا کیا جائے۔وہاں

اس کے بعد تو ایسا وقت ہی نہیں ہوگا کہ آپ کہیں کہ اچھی بات اب تو نہیں' دوسرے سال امتحان میں بیٹھ جائیں گے۔او یہاں پتہ چلنا چاہیے کہ کچھ ہوا ہے۔یہ ہے بنیاد۔

مذہب کی دنیا میں کوئی بات بھی مفہوم کے اعتبار سے واضح نہیں ہوتی جب کہ دین میں ایسا نہیں ہوتا

مذہب میں کسی شے کے متعلق پتہ نہیں چلتا کہ کچھ ہوا ہے یا نہیں ہوا۔آپ کو عقیدتاً ماننا پڑتا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب والا اپنے اپنے مذہب پہ مطمئن ہوتا ہے کہ اس کو ماپنے کا پیمانہ کوئی نہیں ہوتا۔آپ کا مسجد میں جا کے سجدہ دینا' برہمن کا بت کے سامنے سجدہ دینا' آپ اُسے برا کہیے وہ آپ کو برا کہتا چلا جائے گا۔کوئی پیمانہ جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ غلط کر رہا ہے' آپ صحیح کر رہے ہیں۔آپ اپنے عقیدے کے مطابق صحیح کر رہے ہیں' وہ اپنے عقیدے کے مطابق صحیح کر رہا ہے۔کوئی خارجی پیمانہ ہونا چاہیے جس سے معلوم ہو کہ جو میں کر رہا ہوں اس کا کچھ حاصل ہو رہا ہے۔اسے کہتے ہیں ثواب۔یہ تو اس صورت میں بنتا ہے۔ثواب ہی سے توثوب ہے جسے کپڑا کہتے ہیں۔ایک جگہ کہا ہے کہ ایسی ایسی صورتیں بھی ہیں کہ تانا ہی تانا ہوتا ہے اس سے تو کپڑا نہیں بنتا۔کہیں بانا ہی بانا ہوتا ہے تو اس سے بھی نہیں بنتا چنانچہ تانا اور بانا اکٹھے ہونگے ایک خاص صورت میں تو پھر کیفیت پیدا ہوگی جسے آپ ثواب کہتے ہیں۔کپڑا تو اس صورت میں بنتا ہے کہ دونوں چیزیں موجود ہوں آپ کے پاس تانا بھی ہو بانا بھی ورنہ کپڑا نہیں بنتا۔ضروری چیزوں کا مہیا ہونا ان کو ایک خاص طریقے کے اندر آپس میں جوڑنا' اس میں ارتباط پیدا کرنا اور اس کے بعد محسوس طور پہ معلوم ہونا کہ کچھ بن گیا ہے۔یوں کپڑے بنانے والوں کے لیے کہیں ایک تاگا ٹوٹ جاتا ہے تو کھڈی بننے والا' وہیں کھڑا ہو جاتا ہے وہ۔کیوں کھڑا ہوا ہے؟ وہ کہتا ہے ثواب نہیں ہو رہا۔گرہ لگا کے پھر آگے چلتا ہے۔اور پھر ٹوٹی ہوئی گرہ والا بھی جو ثواب ہوتا ہے' وہ مارکیٹ میں آ کے کم دام پہ بکتا ہے عزیزانِ من! ثواب میں کچھ کمی ہوگئی ہوئی ہوتی ہے۔روز آپ کہتے ہیں۔میں کہتا ہوں ایک عمل میں پتہ چل جاتا ہے' ثواب ہوا ہے یا نہیں ہوا ہے۔

مذہبی دنیا ہمیشہ نظری تصورات اور عقائد میں الجھی رہتی ہے

یہ ہے فرق۔یہ تھی وہ چیز جس کے لیے انہوں نے چیلنج دیا تھا کہ باقی ساری دنیا کی قومیں اپنے اپنے راستے کے اوپر چلی جا رہی ہیں۔ **قُلۡ يٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ‌ ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ** (6:135) ہم نظری بحثیں تم سے نہیں کرتے' مباحثے نہیں کرتے' مناظرے نہیں کرتے۔تم اپنے طریقے پہ کھڈی بنتے چلے جاؤ جس طرح سے تم چاہتے ہو' ہم اپنے طریقے پہ بنتے چلے جائیں گے۔شام کو پتہ چل جائے گا کہ کس کا طریقہ صحیح تھا۔بات ختم ہوئی صاحب۔بحث نہیں کوئی جھگڑا نہیں۔ **اِعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ** (6:135) بات سیدھی سی ہے تم اپنے طریقے پہ کام کرو۔تم یہی کہتے ہو نا ہمارا طریقہ بڑا صحیح' اس کی آؤٹ ٹرن نہایت عمدہ نکلے

گی ۔ٹھیک ہے۔عقیدے کی بات نہیں وہاں کی جارہی ہے اِعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ(6:135) عربی جاننے والے جانتے ہیں یہ سوف کیوں آتا ہے؟ 'یوں پتہ چلے گا' جسے کہتے ہیں نا'ابھی معلوم ہوجائے گا۔یہ نہیں کہا کہ تم اپنے طریقے پہ بھگتی ایشور کی کرتے چلے جاؤ ہم اپنے طریقے کے اوپر نماز پڑھتے جاتے ہیں تو قیامت میں جا کے معلوم ہوجائے گا۔سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ (6:135) ابھی ابھی پتہ چل جائے گا۔اِعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ (6:135)۔میں بھی بحث نہیں کرتا' میں اپنی جگہ کرتا ہوں کام تم اپنی جگہ کام کرو' معلوم ہوجائے گا نتیجہ بتادے گا کس کا عمل صحیح ہے۔

دراصل دین و دنیا میں کامیابی کے لیے ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے کو ہی ثواب کہا گیا ہے

اب معلوم ہوا آپ کو کہ کیا فرق ہے مذہب اور دین میں۔یونہی کوئی ذہنی یا اعتقادی چیز نہیں ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ اصولوں کو اپنی جگہ رکھنا ہوتا ہے۔اس کی پرکھ ہمیشہ عمل سے ہوتی ہے' کام کرنے سے ہوتی ہے۔اس کام کا نتیجہ سوف تعلمون۔آپ کو جو دعا سکھائی گئی ہے اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً (2:201) پہلے ہے فِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201) بعد میں جا کے آتا ہے۔یہیں پہ نتائج۔وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (24:55) ایمان اور اعمالِ صالح کا نتیجہ اس زمین کے اوپر مملکت اور حکومت اور اقتدار کا ملنا ہے۔یہ ہے جو کچھ قرآن نے کہا ہے۔اور وہ اس طریقے پہ ملنا ہے کہ تم غالب رہو گے جب تک تم مومن رہو گے۔

قدم قدم پر رسوائی محکومی اور مسکینی' ثواب نہ ہونے کا بین ثبوت ہے

دوسری جگہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ کفار تم پہ کامیابی اور فتح مندی حاصل کرلیں۔کیا یہ ایسی آیتیں ہیں جن کے متعلق قیامت میں جا کے پتہ چلے گا۔اس کے برعکس کہا کہ یہ چیز نہیں اگر اس انداز سے نہیں چلو گے تو (ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡکَنَةُ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ) (2:61) ذلت کی مار' غضب خدا کا' لعنت' محکومی مسکینی مغلوبی ہر قسم کی ذلت رسوائی یہ ساری کی ساری مسلط ہوجائے گی تم پہ۔کیا یہاں اس کے متعلق معلوم ہوگا یا وہاں جا کے پتہ چلے گا؟؟ ان کے تو پیمانے ہی عجیب ہیں۔پیمانہ یہ ہے کہ جو یہاں سب سے زیادہ ذلیل ہوگا وہ وہاں سب سے زیادہ مقرب ہوگا۔کیا بات ہے اللہ میاں کے تقرب کی۔''جنیاں زیادہ جوتیاں پین گیاں' ہر جوتی دے وچ ایک ایک فرشتہ ملے گا اوہنوں''۔

ثواب حاصل کرنے کا قرآنی فارمولہ اور اس کی اہمیت

صحیح قانون کے مطابق صحیح فارمولے کے مطابق ایک کام جب کیا جائے تو اسکا جو محسوس نتیجہ سامنے آتا ہے' اُسے ثواب کہتے ہیں عزیزانِ من!۔ اوراس کے لیے طریقہ اس نے بتادیا۔ فارمولا صحیح ہونا چاہیے' پہلی چیز۔ بنیاد ہے یہ۔ کوئی کام اپنا صحیح نتیجہ نکال ہی نہیں سکتا اگر وہ فارمولا صحیح نہیں ہے جس کے مطابق آپ کر رہے ہیں۔ یہ جسے آپ فارمولا کہتے ہیں' وہ ایمان ہے ایمان' Basic Formula۔ وہ بڑا صحیح ہونا چاہیے۔ اُس میں اگر ذرا سی غلطی ہے تو پھر آگے جتنا جی چاہے آپ کام کیجئے' اس کا نتیجہ صحیح نہیں نکلے گا۔ لیکن یہ بات کہ فارمولا صحیح ہے یا غلط اس کی پرکھ اعمال کے نتیجے سے ہوگی۔ پھر اگر فارمولا صحیح ہو پھر اس کے مطابق جتنی چیزوں کی ضرورت ہے' میٹریل کی ضرورت ہے' وہ مہیا ہو فارمولے کے مطابق ان کو آپس میں جوڑا جائے۔ ورنہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کو الگ الگ رکھ چھوڑ یئے ایک قطرہ پانی کا نہیں بنتا۔ وہ تو فارمولا ہے H_2O یقینی چیز ہے پھر دونوں گیسوں کا ہونا بھی ضروری ہے پھر ان دونوں کا اس طریقے سے ملانا۔ یہ ان گیسوں کے ملاپ سے پانی کی شکل میں سامنے آجائیں گی۔ یہ ہے ثواب۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب اس طرح سے نہیں پانی بنتا' ہم کہتے ہیں بنتا ہے۔ جھگڑتے رہیے قیامت تک کے لیے۔ طریقہ کیا ہے' سیدھی سی بات ہے یہ لیجئے ٹیوب' یہ ہیں گیسز' میں بھی بناتا ہوں تم بھی یہ کرو' ابھی پتہ چل جائے گا کہ کس کا فارمولا صحیح ہے' کس کا عمل درست ہے۔ اور اگر انہیں الگ الگ رکھا ہوا ہے تو کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوسکتا۔

قرآن حکیم کے نزدیک کسی بات کو سمجھانے کا طریق قلب اور زبان کی رفاقت پر مبنی ہے

آج تو ہم نے یہ بات کی۔ فارمولا بھی میں نے کہا' لیبارٹری بھی کہا' ہائیڈروجن اور آکسیجن بھی' کہیں ٹیوب بھی کہی۔ یہ ساری چیزیں آج کی اصطلاح میں قرآن گفتگو کر رہا ہے پہلے ان لوگوں سے جن کی سطح وہی بادیہ نشین صحرائی بدو' عام زمیندار دیہاتی' ان سے گفتگو کر رہا ہے۔ اعجاز ہے عزیزانِ من!۔ بات وہ کرے گا کہ جو ان کی سمجھ میں اُسی وقت آجائے اور وہ اصول وہ بیان کرے گا جو آج بھی اُسی طرح سے غیر متبدل ہے۔ ان سے کہا کہ بظاہر جو تم کہتے ہو کہ یہ روپیہ پیہ بھی ہمارا ٹھیک ہے ہم تمہارے ساتھ بھی ہیں' فارم پہ دستخط بھی کر دیئے' یہ سب چیزیں ہیں۔ اصل شے جو ان کے اندر ہے جس طریقے سے اندر ایک ارتباط کرنا چاہیے' انہیں ملنا چاہیے اور اس کے بعد نتیجہ نکلے۔ منافقت میں یہ بات نہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ زبان اور قلب آپس میں نہیں ملے' الگ الگ رکھے ہوئے ہیں۔ عمل اور ایمان اکٹھے نہیں ہیں' الگ الگ رکھے ہوئے ہیں۔ نیت اس میں سے بچنے کی ہے۔ بظاہر آ کے کہتے ہو پیسے چار لے لیجئے اور زمرہ مؤمنین میں نام لکھا جائے گا۔ یہی کچھ ہے نا جو کر رہے ہو۔ کہا کہ بھئی بات اتنی سی ہے ذرا سوچو تو سہی کچھ ہوتا ہے ایسے؟ یہ جو دُھنیا آتا ہے دُھننے والا'

روئی دھنتا ہے۔اس کے پاس ایک تو وہ لکڑی کی کمان ہوتی ہے ایک اس کے اندر تانت ہوتی ہے۔اور پھر اس تانت سے وہ دھنتا ہے نا۔ (کُسَالٰی)(9:54) کہا کہ یہ بتاؤ تانت بھی ہو کمان بھی ہو دونوں کو اس میں الگ الگ رکھا ہو قیامت تک کوئی دھن سکے گا کُسَالٰی (9/54) اسے کہتے ہیں عزیزانِ من!۔دونوں چیزیں موجود ہوتی ہیں۔

قرآن حکیم میں جو الفاظ جہاں جہاں استعمال ہوئے وہاں عربی کا دوسرا لفظ مناسب ہی نہیں ہوسکتا

آپ سوچئے عزیزانِ من! قرآن کا اعجاز ہے یہ۔کہتے ہیں اس زمانے کے بدو کس طرح سے سمجھ گئے۔اس کے لیے کسی افلاطون کی ضرورت نہیں ہے بات تو اس کی بنیاد کو سمجھ لینے کی ہے کہ کیا کہتا ہے۔اس کے بعد کہ یہ الفاظ اس زمانے میں معنی کیا دیتے تھے۔اب یہ جو چیز ہے کہ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں اور بڑے سست ہوتے ہیں۔بس یہ ترجمہ آپ نے کیا اور بات ختم ہوگئی۔اب یہ اردو میں ترجمہ ہو فارسی میں ترجمہ ہو انگریزی میں ترجمہ ہو۔خود عربی زبان میں بھی ان الفاظ کی جگہ جو عربی کے دوسرے لفظ رکھے جاتے ہیں وہ بھی نہیں یہ معنی دیتے۔

بڑی بڑی تفسیروں کے علاوہ جلالین کی تفسیر میں جگہ جگہ مرادفات کی کمی کا سوال

ویسے تو تفسیریں بڑی ہیں عربی زبان میں ہی تفسیریں سب سے پہلے بڑی بڑی آئیں' سو سو والیم کی تفسیریں بھی پڑی ہوئی ہیں۔تفسیروں کو چھوڑ دیجئے' ایک چھوٹی سی ہے تفسیر' جلالین' اُسے کہتے ہیں وہ جلال الدین باپ بیٹا تھے اس لیے ان کو جلالین کہتے ہیں۔اُنہوں نے صرف تفسیر نہیں لکھی' بلکہ قرآن کے الفاظ کے آگے بریکٹ کے اندر عربی زبان کا دوسرا لفظ لکھ دیا۔مشکل لفظ کی جگہ آسان لفظ لے آئے جیسے کہتے ہیں موٹے لفظ کی جگہ آسان لفظ ہو وہ آسان لفظ اس کی جگہ لکھ دیا انہوں نے۔آپ قرآن کے الفاظ کو ہٹا دیجئے اور ان کے لکھے ہوئے مرادفات کو اکٹھا کر کے دیکھئے اور دیکھئے کوئی بات بنتی ہے یا نہیں؟؟ اس کا کوئی لفظ اپنی جگہ سے اٹھا دیجئے' اس کا مرادف ہی نہیں ملتا۔اور اس لفظ کو دیکھئے یہ کہ اس زمانے کا وہ بادیہ نشین عرب جو تھا جو نہ رازی کا فلسفہ جانتا تھا' نہ غزالی کا تصوف جانتا تھا وہ بات کیسے سمجھ گیا۔

قرآن حکیم تو اپنے مفہوم کو بیان کرنے میں ایک پرسنٹ کے ہزارویں حصے کی کمی بھی محسوس نہیں ہونے دیتا

بات تو بڑی آسان تھی۔ان سے کہا یہ جا رہا ہے کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے آپس میں ربط ہوتا ہے ہر شے کا' کیا وہ تمہارے ہاں موجود ہے؟ اگر وہ موجود نہیں ہے تو چیزوں کا موجود ہونا نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔کہا دیکھا ہے نا تم نے دھنیئے کو' اگر اس کی تانت الگ رکھی

جائے اور اس کی کمان الگ رکھی جائے کوئی نتیجہ پیدا ہوتا ہے؟؟ یہ ہے کُسَالٰی ۔اب سوچیے تو سہی کہ یہ ہماری نمازیں جن کو آپ کہتے ہیں،ان میں ڈھیلا ڈھالا کھڑا ہونا یا چست کھڑا ہونا کیا بات اس میں پیدا ہو جائے گی۔ وہ تو کُسَالٰی کہتا ہے۔اسی لیے اس نے دوسری جگہ یہ کہا اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اس میں کسی حصے کو تو لے لیا اور کسی دوسرے حصے کو چھوڑ دیا اور اس کے بعد سمجھ یہ لیا کہ کوئی بات نہیں صاحب دس سوال دیے تھے انہوں نے ان میں سے پانچ میں کر آیا ہوں اور ان کے نمبر میں گن رہا ہوں تو وہ ٹھیک ہے وہ 33% بن جاتے ہیں اپنے' جناب سے تم ایسا کر سکتے ہو کہ دس میں سے پانچ کیے کوئی پانچ کر لیے نمبر ان کے گن لیے 33% ۔لیکن سائنٹفک فارمولے میں قطعاً یہ بات نہیں ہوتی اس میں Percentage کا سوال ہی نہیں ہوتا اس میں یا تو سینٹ پرسنٹ ہونا چاہیے اگر 99% بھی ہے تو کوئی نتیجہ نہیں۔اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (2:208) یہاں تو پورا فارمولا لے کے آنا ہوگا۔

فکر قرآنی کے ایک حصے کو تسلیم کرنے اور دوسرے سے انکار کرنے کا نتیجہ شدید عذاب کی شکل لیے ہوتا ہے

وہ جو آیت میں ہے کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس میں سے کچھ حصے کے اوپر ایمان لے آئے' کچھ حصے کو چھوڑ دیا۔ یہ نہیں کہا کہ اس میں سے پھر اتنا سا ہی تمہیں ملے گا جتنے پہ ایمان لائے۔ کہتے ہیں لوگ ''سارے قرآن تے کیہڑا عمل کرداا ے جناں ہو سکے کسے کولوں کر لیا جائے۔ایناں ای نا اک چنگا اوہدا جولا ہے دا'' وہ کمان اٹھائے پھرے' وہ باپ جو ہے وہ تانت اٹھائے پھرے ''تیسرا ڈنڈا لئی پھرے' شام نوں آ گئے نا گھر دھن دھنا کے فیر''۔کیا وہ تیسرا حصہ ان میں مل جائے گا ان کو' یا تانت والے کو آدھا پرسنٹ 50% مارکس مل جائیں گے ان کو۔کیا ہوگا سارا دن یہ پھر پھرا کے جو شام کو آئیں گے؟ ذلت اور رسوائیاں ہونگی نا۔اسی لیے کہا(فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ) (2:85) جو یوں کرتا ہے کہ اس میں سے کچھ لیتا ہے کچھ چھوڑ دیتا ہے' 50% تو ایک طرف ذلت اور رسوائیاں اس دنیا میں بھی اس کے پیچھے ہوتی ہیں اور قیامت کا عذاب تو اس سے بھی شدید ہوتا ہے۔مقصد کو الگ رکھا صرف شکل کو قائم رکھا ہے' یہ تانت اور کمان کو الگ رکھنے والی بات۔

دین کو جھٹلانے والے نمازیوں کے متعلق ارشاد خداوندی

یہ جو چیز ہے(وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى) (9:54) آتے ہیں نماز کے اجتماع کے لیے لیکن کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مقصد اور شکل کو الگ الگ رکھا ہوا ہوتا ہے۔کچھ نہیں مل سکتا۔اتنا ہی نہیں بلکہ جو قرآن کریم کی دوسری آیت ہے' وہ ماعون جسے کہتے ہیں اس میں تو بہت وضاحت ہے(اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ) (107:1) آؤ ان نمازیوں کی طرف۔تم نے اس کو بھی دیکھا ہے کہ

جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ کبھی ذہن میں یہ آتا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھنے کے لیے آئے اور کہا جائے کہ یہ دین کو جھٹلا رہا ہے۔ کہے گا کہ اگر میرا دین پہ ایمان ہی نہیں ہے تو میں نماز پڑھنے کے لیے کاہے کے لیے آؤنگا۔ لیکن کہنے والا تو خدا ہے ہم آپ تو نہیں کہہ رہے۔(اَرَءَ یْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ o فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ o وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ) (107:1-2) دین کو جھٹلانے والا۔ نام کے اعتبار سے شکل کے اعتبار سے دیکھو تو مؤمن۔ کیفیت یہ ہے کہ جو معاشرے میں تنہا رہ جاتا ہے' اس کو دھکے دیتا ہے۔ جو اپنی روٹی محنت سے کھانے کے قابل نہیں رہتا' کبھی اس کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔(فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ) (107:4-5) اور نمازیں پڑھتا ہے اس کے بعد جا کے۔ کہا پھٹکار تیری نماز کے اوپر۔ فویل تباہی ہے اس نمازی کے لیے۔ کہہ سکتا تھا کہ سرکار نہ دیجئے اس نماز کا مجھے کوئی بدلا' بے نمازی جتنا تو رہنے دیجئے۔ اُس نے کہا کہ بے نمازی سے بدتر حالت تیری ہوگئی۔ دنیا کی نگاہوں میں بھی۔ اپنے آپ کو تو نے سمجھا کہ یہ دین دار ہے خود اپنے آپ کو بھی دھوکہ تو نے دے لیا۔ اس لیے تیری حالت بدتر ہے۔

صلوٰۃ کے مقصد کو صرف چند ایک جزئیات تک محدود کرنے والوں کا تذکرہ اور اس کا نتیجہ

(فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ) (107:4-5) وہ جو اپنی صلوٰۃ کے مقصد سے غافل ہیں۔(هُمْ یُرَآءُوْنَ) (107:6) صرف یہ حصہ جو نماز کا نظر آتا ہے اس کی تو پابندی کرتے ہیں اور اس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ (وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ) (107:7) رزق کے ان چشموں کو کہ جو بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے تھا' جس میں جس کا جی چاہے اپنی ضرورت کے مطابق لے سکتا سے لے لے' ان کو بند لگا کے اپنی ذات کے لیے مخصوص کرتا ہے اور نمازیں پڑھتا ہے۔ فٹے منہ تیرا۔(فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ) (107:4-5)۔ یہ ہے عزیزانِ من! یہ چیز اسکی تباہی کا باعث تھی۔ وہ دیکھو تو سہی نماز پڑھ رہا ہے(هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ) (107:5) صلوٰۃ کے مقصد کو اس نے یُرَآءُوْنَ (107:6) والی بات سے الگ رکھا ہوا ہے۔ یہ جو محسوس چیز دوسروں کو نظر آ رہی ہے اس کی تو پابندی شدت سے کر رہا ہے۔ اس شدت سے ہوتی ہے' وہاں پڑھنے جایئے نماز تو' او تیرے پاؤں میں فاصلہ اتنا نہیں رہا' اتنا فاصلہ رکھو' شلوار تمہاری جو ہے وہ ٹخنے سے نیچے چلی گئی' ذرا اونچے رکھو' ہاتھ جو ہیں ذرا اوپر چھاتی پہ رکھو' اللہ اکبر کرتے وقت یہاں تک تم پہنچے ہو' یہاں پہنچنے چاہئیں۔ یہ سارا کچھ کیا' الحمدللہ نماز ہوگئی جی۔هُمْ یُرَآءُوْنَ (107:6) وہ کہتا ہے کہ جو چیزیں نظر آتی ہیں لوگوں کو ان میں تو اس قدر احتیاط و شدت اور جو مقصد تھا اس صلوٰۃ کا اس مقصد کو اس طرح سے نظر انداز کرنا۔(فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ)(107:4-5) تباہی ہے اس قسم کے مصلین کے اوپر کہ نماز کی ظاہرہ شکل کی یوں پابندی اور مقصدِ

صلوٰۃ جو تھا۔ مقصدِ صلوٰۃ یہ بتایا گیا ہے کہ رزق کے چشموں کو جو بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے تھا اس کے اندر بند لگا دینے والا۔ یہ تباہی نہیں اس کے لیے تو اور کیا ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! صلوٰۃ کے مقصد اور صلوٰۃ کی شکل کو الگ الگ رکھنے والا (کُسَالٰی) وہ دُھنیا جس کی تانت اس کی کمان سے الگ رکھی ہوئی ہو۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک دل اور دماغ کی ہم آہنگی کے بغیر کوئی عمل قابلِ قبول نہیں ہوتا

دیکھا عزیزانِ من! کیسے سمجھاتا ہے یہ بات۔ وَ لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰی وَ لَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ (9:54) صلوٰۃ کی یہ کیفیت ہے مرتا مرتا ہوا دیتا ہے' دل کی کشادسے نہیں' مصیبت پڑی ہوئی جیسے ہوتی ہے۔ اور اسی لیے کہا کہ جس کا دل خوش نہیں ہے کچھ دینے سے' اس کا پیسہ لینا بھی ناجائز ہے تمہارے اوپر۔ آپ نے دیکھا کہ کتنا تعلق ہوا ظاہرہ عمل کا انسان کے قلب کی کیفیت سے۔ یہ ہے ایمان۔ اسے میں نے Basic Formula کہا ہے وہ آپ کے دل کی کیفیت ہے۔ ان فارمل چیزوں پر یہ ساری کی ساری' آپ اس پیمانے پہ پورا اترتے چلے جایئے' اس کے مطابق کرتے جایئے جو آپ کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ آپ کے دل کی کیفیت شامل نہیں ہے تو وہ وہ نتائج نہیں پیدا کر سکتے۔ اور اسی لیے قرآن نے کہا کہ فریب میں نہ تم رہو نہ یہ فریب میں رہیں۔ ان سے کہہ دیجئے گا کہ یہ قابلِ قبول نہیں ہے ہمارے لیے۔ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ (9:54) اس لیے کہ دل کی کشاد کے ساتھ یہ کچھ تم نہیں کر رہے۔

ہماری تباہی و بربادی ذلت و رسوائی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآنی فلسفہ حیات کو قصوں اور کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی

ہم جو یہ قصے کے طور پر پڑھتے ہیں قرآن کی باتوں کو اور ذہن میں ہوتا ہے کہ اس زمانے میں منافق ہوتے تھے' یہ ان کی باتیں ہیں۔ یہ اُن کی باتیں ہیں عزیزانِ من! یا ہماری باتیں ہیں۔ اور پھر اور کوئی دلیل نہ ہو اگر ہمارے پاس تو اتنی تھوڑی ہے کہ اس کے جو نتائج قرآن نے بتائے ہیں وہ ہم پہ ہی منطبق ہوتے ہیں۔ ساری دنیا کی ذلت اور خواریاں۔ یعنی وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139) اس کا کہا ہوا ہے مومن کے لیے۔ اعلون سے تو اوپر کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو صیغہ ہی Superlative ہے۔ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہو گے۔ ان سے جب پوچھئے پھر مسلمانوں کی یہ حالت کیوں ہے؟ تو جواب ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔ اچھا جی۔ چھوڑ دیا ہے نماز کو' آپ دیکھتے نہیں کہ نمازی کتنے رہ گئے ہیں' مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے' نماز نہیں پڑھتے ہیں' روزے نہیں رکھتے ہیں۔ اور

آ گے چلیں گے تو ٹھیک ہے کلبوں میں جاتے ہیں، شراب پیتے ہیں۔ سب بڑی بری باتیں ہیں جتنی بھی آپ نے کیں لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ بہرحال اس ستر کروڑ کی آبادی میں دو چار کروڑ تو ایسے نکالو گے جو نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، شراب بھی نہیں پیتے، ریس بھی نہیں کرتے، اتنے تو نکل آئیں گے نا۔ کسی ایک ہی شہر کسی ایک ہی جمعہ والی نماز میں آپ دیکھ لیجئے گن کے، شہر کی آبادی کی Percentage نکال لیجئے۔ اتنے تو دنیا کے اندر ہونگے جو تمہارے پیمانے کے مطابق اسلام کے مطابق زندگی بسر کررہے ہیں۔ اس گروہ کے متعلق جو قرآن نے کہا تھا اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139) کہ تم پہ غالب کوئی نہیں ہوگا۔ یہ گروہ تو ہونا چاہیے تھا اسے کیا ہوا پھر۔ کہ جی یہ خدا کے مقرب ہو گئے۔ اچھا جی مقرب ہو گئے پھر کیا ہوا؟ کہ یہاں ذلیل ترین زندگی بسر کریں گے کیونکہ یہ دنیا، یہ کافر کے لیے بنی ہے۔ عاقبت جو ہے وہ مومن کے لیے بنی ہے۔

مذہبی تصورات میں الجھی ہوئی قوم کی ذہنی پسماندگی اور اس کا نتیجہ

اور وہ کہتا ہے وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا (20:124) یاد رکھو یہاں جس کا رزق تنگ ہوتا ہے سمجھ لو کہ ہمارے قانون سے پھر چکا ہے۔ وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی (17:72) اور جو یہاں اندھا ہے، وہاں کا بھی اندھا ہی ہوگا۔ یہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہاں کا ذلیل ہو اور خدا کا مقرب بن جائے۔ وَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ وَ لِرَسُوۡلِہٖ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (63:8) کہتا ہے تم عزت کہہ رہے ہو یہ تو مختص ہوئی ہوئی ہے خدا اور اس کے رسول اور مؤمنین کے لیے۔ ہمیں پڑھایا جاتا ہے کہ یہاں جتنا ذلیل ہوگا وہاں اتنا مقرب ہوگا۔ کہاں لے جاؤ گے یہ آیتیں۔

جو قوم تانت کو الگ اور کمان کو الگ رکھے وہ عزت و تکریم کی کبھی حامل نہیں ہوسکتی

یہ ہے تانت کو الگ رکھا ہوا ہے، کمان کو الگ رکھا ہوا ہے۔ یہ ساری آیتیں الگ ہیں۔ یہ ہے وہ چیز عزیزانِ من! کہ انہیں چھوڑ دیجئے جو صلوٰۃ میں نہیں آتے۔ یہ جو آنے والے ہیں (فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ) (107:4) کہا ہے قرآن نے، بے نمازیوں کی تباہی کو چھوڑ دیجئے۔ یہاں تو کہا ہے کہ تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو صلوٰۃ کے مقصد سے غافل ہیں۔ صلوٰۃ کی فارم کے اوپر تشدد سے پابندی کر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے، تانت الگ رکھی ہے، کمان الگ رکھی ہے۔ کچھ نہیں دھن سکتے تم اس سے۔ دیتے ہیں (کٰرِھُوۡنَ)۔ (فَلَا تُعۡجِبۡکَ اَمۡوَالُہُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ ؕ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ بِہَا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ تَزۡہَقَ اَنۡفُسُہُمۡ وَ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ) (9:55) یہ ٹھیک ہے، جتھہ بھی بڑا ہے دولت بھی بہت کما رکھی ہے۔ کہا کہ یہ چیزیں تمہیں کسی تعجب میں نہ ڈالیں ان کے انجام کے متعلق۔ فیصلہ صرف انہی چیزوں کے اوپر نہیں ہوا کرتا فیصلہ کن باتیں اور بھی ہوتی ہیں۔ کہا یہ کہ تم دیکھو گے لِیُعَذِّبَہُمۡ بِہَا (9:55) یہ جو ان کے

پاس مال و دولت زیادہ ہے' اس زمانے میں تو جتھہ بھی بڑی چیز ہوتی تھی یا پارٹی کہہ لیجئے' آج بھی تو خواہ اس کا انداز جمہوریت ہی کا کیوں نہ ہو جائے' اکثریت کی پارٹی کا تو پھر پوچھو ہی نہیں کیا ہوتی ہے۔ یہ ہے جسے اس زمانے میں جتھہ کہا گیا تھا۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں

غیر قانونی طور پر دولت کی فراوانی ہو یا افرادی قوت کا ہجوم' دونوں سکون قلب مہیا نہیں کر سکتے

اب بھی بڑے جتھے والا بڑا سمجھا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ ایک لفظ ہے **لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا** (9:55) یہی چیزیں ان کے لیے وجہ عذاب بننے والی ہیں۔ اور یہ بڑی چیز ہے۔ دولت کی فراوانی یا جن چیزوں سے قوت مل جاتی ہے' خواہ وہ نفوس کی کثرت ہو یا کسی قوت کی چیزیں ہوں۔ اگر ان کی بنیادیں صحیح فارمولے کے اوپر' صحیح قانون کے اوپر' صحیح ایمان کے اوپر نہ ہوں تو یہ چیزیں جنہیں حاصل ہو جاتی ہیں تو ایک تو وہ احتیاط نہیں برتتا زندگی کے متعلق' غیر محتاط ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے ان چیزوں کی وجہ سے ایک نشہ آتا ہے حکومت کا اس کے ذہن کے اندر جو اسے بدمست کر دیتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ چیزیں تمہیں حیرت میں نہ ڈال دیں کہ یہ چیزیں جو ہیں' ان کی وجہ سے یہ آخر میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہی تو ان کی تباہی کا باعث بننے والی ہیں۔ تو اصل شے یہ ہے کہ قوت اور دولت یا نفوس کی تعداد کا استعمال وہ کس طرح سے کرتا ہے۔ یہ خودکشی اسی چیز سے کی جاتی ہے جس سے دشمن کو مارا جاتا ہے خواہ وہ سنکھیا خواہ وہ خنجر ہو' خواہ وہ بندوق ہو۔ اسی چیز سے دشمن کو مارا جاتا ہے جس چیز سے اپنے آپ کو انسان مارتا ہے۔ جس کے پاس یہ سامان نہ ہو' دوسرے کو مارنا ایک طرف رہا اس کا اپنے آپ کو مارنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ چیزیں زیادہ جس کے پاس ہونگی کہا اگر انکا استعمال غلط ہوگا تو یہی چیزیں اس کے لیے تباہی کا موجب بن جائیں گی۔ اور **لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (9:55) یہاں لکھا ہے۔ اسی دنیا کی زندگی کے اندر تم دیکھو گے کہ ان کو اس کی سزا مل جائے گی۔ (**وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ**) (9:55) اور پھر کیفیت جو ان کی اپنی ذات کی ہوگی جس کی نشوونما اور پرورش مقصد ہے انسانیت کا' وہ تو ضائع ہی چلی جائے گی۔ وہ بھی گئی جسے آپ آخرت کہتے ہیں' جس کو لے کے آگے چلنا ہے اور جہاں تک دنیا کی زندگی کا تعلق ہے' یہاں وہ کہتا ہے کہ انہی چیزوں کی وجہ سے ان کو یہاں عذاب آئے گا **فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (9:55).

امروز و فردا زندگی کے غیر متبدل اصولوں سے لاتعلقی کا نتیجہ اور لفظ **يَحْلِفُوْنَ** کا لغوی اور قرآنی مفہوم

پہلی چیز تو یہاں کی ہے۔ (**وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ**) (9:56) قسمیں کھا کھا کے کہیں گے کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ مصیبت آئی ہوئی ہوتی ہے Floor of the house کے اوپر پارلیمان کے ایوان میں۔ جماعت کے ساتھ ہیں اور شاباش کچھ ہوتا ہے' دوسرے دن دیکھتے ہیں ووٹ دوسری طرف مل رہا ہے۔ اب وہ کہیں پارٹیز ایکٹ پاس ہو رہا ہے اور کسی قسم کی ان پہ پابندیاں

لگائی جا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ وہ دل سے ساتھ نہیں ہیں۔ وہ جو دل سے ساتھ ہے اس کے اوپر پابندی لگانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ وہ ہیں وَ یَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰہِ اِنَّہُمۡ لَمِنۡکُمۡ (9:56) قسمیں کھا کھا کے کہتے ہیں کہ صاحب ہم تمہارے ساتھ ہیں مِّنۡکُمۡ (9:56) تم میں سے ہی ہیں، تمہارے جماعت کے افراد ہیں۔ وَمَا ہُمۡ مِّنۡکُمۡ وَ لٰکِنَّہُمۡ قَوۡمٌ یَّفۡرَقُوۡنَ (9:56) تم میں سے نہیں۔

انسانیت کے سب سے بڑے دشمن کی پہچان ان کا اپنا مقرر کردہ یفرقون کا ترجمان ہوتا ہے

یہاں پھر ایک لفظ آیا یَّفۡـرَقُوۡنَ (9:56)۔ اور پھر دیکھئے ان پڑھ عربوں کی بڑھاوت کی کیا کیفیت تھی۔ یفرقون تو وہی ہے تفرقہ والے الگ ہوئے۔ حقیقت میں یہ تم میں سے نہیں ہیں یہ الگ ہیں۔ اور ان کے ہاں یہ قاعدہ تھا جس طرح سے یہ لفظ استعمال ہوا ہے یفرقون، اس کے معنی ہوتے تھے جو خوف کی وجہ سے، ڈر کی وجہ سے بظاہر ساتھ ہو مگر در حقیقت الگ ہو۔ یہ ہے جو یفرقون کے لفظ نے منافقت کا بتا دیا۔ ڈر بھی ہوتا ہے، خوف بھی ہوتا ہے، اسی لیے جرآت کر کے الگ نہیں ہوتے۔ کہ دل سے الگ ہیں، قسمیں کھا کھا کے کہتے ہیں، تمہارے ساتھ ہیں اور اندر سے ڈرتے ہیں، اس وجہ سے اعلانیہ الگ بھی نہیں ہوتے۔ انہی کے متعلق کہا کہ سب سے زیادہ تمہارے دشمن یہ لوگ ہیں۔ لَوۡ یَجِدُوۡنَ مَلۡجَاً اَوۡ مَغٰرٰتٍ اَوۡ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوۡا اِلَیۡہِ وَ ہُمۡ یَجۡمَحُوۡنَ (9:57) ڈر کی کیفیت یہ ہے جب تک کوئی دوسری جائے پناہ ملتی نہیں نظر آتی، تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر ان کو کہیں کوئی جگہ ایسی نظر آ جائے جہاں یہ سمجھ لیں کہ ہم محفوظ ہیں، خواہ وہ کوئی غار ہی کیوں نہ ہو۔ تو تم دیکھو گے کہ ایسے وہاں بھاگ کے جائیں گے جیسے ایک مویشی رسا تڑا کے بھاگ کے جاتا ہے۔ یہ اس قسم کے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ ہیں۔؟؟

منافقانہ سوچ کے حامل اشخاص کو شریکِ محفل بنائے رکھنے کا نتیجہ نیز ان منافقین کی ذہنیت کی عکاسی

ایک ایک چیز عزیزانِ من! لائے چلا جاتا ہے قرآن۔ خود ساتھ نہیں ہوتے کہا کہ ان کو اپنے اندر رکھنے کا بنیادی نقص یہ ہے کہ یہ تمہاری جماعت کے دلوں کے اندر بھی وسوسے پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ بڑے نیک بنے ہوئے، بڑے اچھے ساتھی بنے ہوئے، بیٹھ گئے آپ کے ساتھ کہ صاحب ہمیں کچھ اس کا فائدہ تو نہیں بات کرنے کا، اپنی اپنی قبر میں جانا ہے ہر ایک نے۔ لیکن پھر بھی ایک بات سامنے ہوتی ہے تو وہ کرنی ہی پڑتی ہے، وہ دیکھئے یہ جو ہو رہا ہے تو ہمیں کیا اس معاملے سے۔ اور دیکھنا یہ بات جو میں نے سنی ہے، اس نے مجھ سے کہا تھا کسی اور سے نہ کرنا تو میں نے تو آپ سے صرف یہ کہا ہے تو آگے نہ بات یہ کرنا۔ یہاں سے اٹھے وہاں جا بیٹھے، سنا ہے آپ نے کچھ صاحب، بات کچھ ایسی سنانے کی نہیں لیکن بہر حال دیکھئے اب ہمیں اس سے کیا واسطہ۔ اسے کہتے ہیں لمز، عجیب چیز ہے۔ ایک تو

الزام ہوتا ہے الزام لگانے والا دھڑلے سے الزام لگاتا ہے' جھوٹا ہی الزام لگائے سامنے تو بات کرتا ہے نا' یہ لزم ہے۔ وہ لمز ہے کہ دھڑلے سے سامنے کھڑے ہو کے الزام لگانے کی بھی جرآت نہیں ہوتی۔ اصل میں اسے کہتے ہیں کہ وہ محفل میں بیٹھے ہوئے بات کر رہے ہیں' آپ کا ساتھی ایک طرف کو ہے۔ اب آپ نے یونہی ذرا سا ہوں کیا آپ اُدھر دیکھ رہے ہیں' باقی لوگ بھی دیکھ رہے ہیں ذرا سا یوں آنکھ سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ بس اتنا ہی اس کے لیے کافی ہوتا ہے کسی اور کو پتہ نہیں چلتا اس چیز کا کہ کیا کر گیا' یہ لمز ہوتی ہے''ایویں جاندیاں جاندیاں ہتھ مار جانا''۔ اب دیکھئے یہ لوگ کہاں تک پہنچے ہوئے تھے۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی سوچئے' بہر حال ان کا ایمان ہے ان کے رسول ہونے پر۔ جماعت کے سربراہ ہیں' مملکت کے سربراہ بھی ہیں۔ یہ تو سن نو ہجری کی بات ہو رہی ہے کہ جی ٹھیک ہے بہت اونچے رسول ہیں' امین ہیں' ہمارا ایمان ہے لیکن دیکھئے پھر بھی انسان ہیں دیکھئے کہ وہ آئی تھی فلاں چیز تو آپ نے جو ڈانٹا ہے تو دیکھا تم نے کہ وہ جو اپنے قریش تھے ان کو کچھ؟؟؟۔ واقعی سارے مسلمان بھائی ہیں' ویسے میں نے کہا ہے دیکھئے کہ پھر بھی انسان کا؟؟؟ قریش تھے نا ذرا سا؟؟ ان کو اُدھر۔ ہمیں کیا بہر حال ہمیں تو ملتا ہی ہے' ہم حسد نہیں کرتے' کسی پہ رشک نہیں کرتے ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ جماعت میں یہ کیا چیز ہو جاتی ہے۔ یہ عربوں کے ہاں لمز کا لفظ میں بتا تا ہوں کہاں استعمال ہوتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے محض شرارت کے لیے بھی آنکھ مارنا ہوتا ہے اور بعض کم نگہی تو محبوبیت کا نشان ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاں صرف اس وقت اس لفظ کو استعمال کرتے تھے جب جماعت میں افتراق پیدا کرنے کے لیے آنکھ ماری جائے۔ عجیب بلا تھی یہ قوم۔ وَیۡلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ نِ الَّذِیۡ (104:1-2) افتراق پیدا کرنے کے لیے وسوسہ انگیزیاں۔ اور پھر اس میں وہ ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر' جن پہ بظاہر ایمان لائے ہوئے ہیں۔

قرآن حکیم کی طرف سے جماعت مومنین کو افتراق سے بچنے کے لیے واضح اور دوٹوک ہدایات

قرآن کہہ رہا ہے کہ تیرے متعلق جو وسوسہ انگیزیاں کرتے ہیں کہ جماعت میں افتراق پیدا ہو جائے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے خاص طور پہ کہا ہوا ہے وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ (49:11) مؤمنین سے' آپس میں ایک دوسرے کے خلاف یہ انداز کبھی اختیار نہ کرو۔ کسی کے خلاف کوئی بات کہنی ہے' دھڑلے سے صاف سیدھے سامنے کہو' مدعی بنو' دعویٰ کرو۔ لیکن جماعت میں یہ کیفیت پیدا نہ کرو۔ کبھی اس قسم کی حرکتیں نہ کرو۔ سننے والوں کے متعلق کہا اِجۡتَنِبُوۡا کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ (49:12) یہ چیز تو محض بدگمانی پیدا کرنے کی ہے' بدگمانی سے ہمیشہ بچو۔ قرآن' جماعت کے اندر اجتماعی خوبیاں جتنی بھی ہیں ان کو قائم رکھتا ہے۔ شرارتی سے یہ کہتا ہے کہ اس قسم کی کبھی حرکتیں نہ کرو۔ دوسروں سے کہتا ہے کہ ظن کے اوپر کبھی اعتماد نہ کرو۔ بلکہ ظَنَّ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتُ بِاَنۡفُسِہِمۡ خَیۡرًا (24:12) ہے کہ جب

تمہیں یقینی طور پر کسی کے متعلق معلوم نہ ہو اس کے متعلق ہمیشہ حسنِ ظن رکھو۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے آگے چل کے سورۃ نور میں ایک واقعہ آتا ہے' افک کا واقعہ جسے کہتے ہیں۔ کسی ایک محترمہ خاتون کے خلاف کوئی الزام لگاتا ہے۔ جو بعد میں ہماری شپرہ بختی سے حضرتِ عائشہ صدیقہؓ کو بیچ میں لے آئے۔ قرآن نے کہیں یہ نام نہیں لیا۔ بہرحال وہ بات وہاں چل کے میں کرونگا کہ کیا بات تھی کیا افسانہ بنا اور پھر حضرتِ صدیقہؓ کیسے اس کے اندر آ گئیں۔ خیر۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ وہ بات پہلی تھی کسی خاتون کے متعلق۔

جماعت مومنین کا دوسروں کے متعلق وہ پہلا ری ایکشن حسن ظن ہی ہونا چاہیے

قرآنِ کریم نے جماعتِ مؤمنین سے کہا کہ جب پہلی دفعہ کسی نے آ کے کسی سے یہ بات کہی تھی اس کا ردِعمل یہ ہونا چاہئے تھا کہ کہتا ھٰذَا اِفۡکٌ مُّبِیۡنٌ (24:12) ھٰذَا بُھۡتَانٌ عَظِیۡمٌ(24:16) نہیں بھئی میں اس کے متعلق نیک گمان رکھتا ہوں' یہ بہتان نظر آتا ہے مجھے۔ تم اگر الزام لگانا چاہتے ہو تو جاؤ عدالت میں جا کے یا جو بھی اس کے لیے ادارے بنے ہیں' وہاں جا کے دعویٰ دائر کرو۔ وہ تحقیق کریں گے' جرم ثابت ہوگا تو میں پھر کوئی رائے قائم کرونگا(4:83)۔ لیکن فرسٹ ری ایکشن جو قرآن کہتا ہے ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ نیکی کی طرف جاؤ۔ ہمارا فرسٹ ری ایکشن بُرائی کی طرف جاتا ہے۔ کسی کے کوئی شخص عیب گننا چاہے' آپ دیکھیں گے گھنٹہ بھر تک کان لگا کے سنتا رہے گا' مزہ لے لے کے' ہوں ٹھیک ہے جی دیکھئے کیسے مومن بنے پھرتے ہیں۔ چار لفظ کسی کی تعریف میں کیجئے' پانچواں سننے کو تیار نہیں ہوتا وہ' ٹھیک ہے جی ایسے کئی نظر آتے ہیں ہمیں' بعد میں جا کے پتہ چلتا ہے کہ کیا نکل آئے۔ روش یہ ہوگئی منافقانہ ہماری۔ کسی کے متعلق حسنِ ظن کی طرف ردِعمل ہمارا نہیں جاتا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ پہلی دفعہ جب کسی کے متعلق بات سنو' ردِعمل پہلا یہ ہو کہ ھٰـــذَا اِفۡکٌ مُّبِیۡـنٌ (24:12) نہیں میں اس کے متعلق ویسے ہی بلاتحقیق یہ بات نہیں کہتا۔ اور ماننے کی بات جو ہے اس کے متعلق تو قرآن کا حکم ہے کہ لَا تَـقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّـمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡئُوۡلًا(17:36) جس بات کے متعلق تم یقینی طور پہ علم حاصل نہ کر لو کبھی اس کے پیچھے نہ لگو۔ یاد رکھو تمہاری سماعت بصارت قلب سب سے اس کے متعلق پوچھا کریں کہ تم نے تحقیق کر لیا تھا پھر مانی تھی یا ویسے ہی مان لیا تھا۔ یہ ہے جو وہ مسلمانوں کے معاشرے کی خصوصیات بتاتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے کی حالت یہ ہے کہ کوئی خارجی معیار ہی باقی نہیں رہا

سوچئے عزیزانِ من! معاشرے میں اگر یہ چیزیں ہوں تو کبھی وہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جو آج ہماری ہے کہ کوئی ساتھ چلنے والا ہو حتیٰ کہ جو شاعر نے کہا ہے کہ اب تو اپنا سایہ بھی ساتھ چل رہا ہوتا ہے' تو ڈر ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں بھی کہیں چاقو تو نہیں ہے۔ کسی ساتھ چلنے والے سے آپ اپنے آپ کو محفوظ نہیں یہاں پاتے۔ نہ کسی کی عزت دوسرے کے ہاتھوں محفوظ' نہ جان محفوظ' نہ مال محفوظ۔

سارے کے سارے مسلمان جن کی کیفیت یہ بتائی ہے۔ کہا کہ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ (9:58) تیرے خلاف بھی وسوسہ اندازیوں سے باز نہیں آتے۔ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا وَ اِنۡ لَّمۡ يُعۡطَوۡا مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ يَسۡخَطُوۡنَ (9:58) اور کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ وجہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر تو ان کو بھیڑیں دیدیتا' پھر ٹھیک تھی تقسیم۔ اور اگر انہیں ان کے اپنے پیمانے یا مرضی سے کم ملا ہے' پھر ہر قسم کی وسوسہ اندازیاں۔ ہوتا ہی یہ ہے۔ کسی کے حق میں فیصلہ ہوجائے تو وہ ہمیشہ عدل پہ مبنی ہوتا ہے' جس کے خلاف فیصلہ ہوجائے نا انصافی ہوتی ہے۔ کہا کیفیت یہ ہے کہ عدل اور نا انصافی کے کوئی خارجی معیار نہیں ہیں۔ معیار یہی ہے کہ انہیں زیادہ دیدیتا تُو تو پھر وہ انصاف کے مطابق ہوتا۔ انہیں اپنے اندازے سے کم ملا ہے تو یہ باتیں شروع کردیں۔

قرآنی معاشرے میں مومن کا انداز زیست اور انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ جو ایک انقلابی پروگرام کے ترجمان ہیں

وَ لَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗ وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَ رَسُوۡلُهٗۤ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوۡنَ (9:59) کہا کہ مومن کے اندر تو اعتماد اتنا ہوتا ہے کہ اس کے بعد جو کچھ اس کو ملتا ہے وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے اتنا ہی ملنا چاہیے۔ اور یہ جو اس کا ردِّعمل ہوتا ہے قرآن کہتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو پھر کہیں زیادہ سے ملتا ہے اس کے بعد۔ ایک اجتماعی خوشگواریاں ہیں جو کسی جماعت کی کسی نظام کی وجہ سے اسی صورت میں ہوتی ہیں کہ اعتماد ہو افراد کو ایک دوسرے کے اوپر۔ اور پھر سربراہ کی شخصیت کے اوپر تو اتنا اعتماد ہونا' بڑا ہی ضروری ہوتا ہے کہ یہ نا انصافی نہیں کرتا ہے۔ کہتا ہے اگر جماعت کے اندر یہ کیفیت پیدا ہوجائے تو پھر دیکھو کہ کتنا زیادہ ملتا ہے اس جماعت کو۔ بہرحال وہ کہتا ہے کہ مومن کا ردِّعمل ہر حالت میں یہ ہوتا ہے اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوۡنَ (9:59) کہ ہر حالت میں ہمارا قدم اس کی طرف اٹھنا ہے ہم نے تو ناراض ہونا ہی نہیں اس کے ساتھ۔ رغبت اس قدم اٹھنے کو کہتے ہیں جو دل کے ارادے سے ہو۔ یہ وہی چیز ہے اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوۡنَ(9:59) جو وہاں آیا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ(2:156) شاید آپ کو یاد ہو جب یہ آیتیں آئی تھیں تو میں نے بتایا تھا کہ اتنا عظیم انقلابی قدم ہے یہ' یہ فقرہ اتنا بڑا انقلابی ہے میں کہتا ہوں کہ اگر یہ چیز کہیں دل سے نکلے کسی قوم کے تو وہ قوم دنیا میں کبھی شکست نہیں کھاتی۔ وہ انقلابی فقرہ جواب ہمارے لیے ہر قسم کی نحوست کا باعث بن گیا۔ مرگیا فلاں اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ(2:156)' بڑی کوشش کی مقدمہ ہار گیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ''یعنی جتھے بیڑا غرق ہوندا ہیگا اے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156)''۔ یہ فقرہ ہی ایسا ہوگیا ہے جہاں کہیں سنو انا للہ'' او کیندا اے کی ہویا بیڑہ غرق کی ہوگیا' انا للہ پڑھدا پیا ہیگا ایں''۔ وَ لَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَـوۡفِ وَالۡجُـوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ(2:155) مقامات ایسے آئیں گے کشمکشِ حیات

کے اندر، مقابلہ ہوگا تمہارا مخالفین کے اندر۔ وہاں تم دیکھو گے قدم قدم کے اوپر آزمائشیں تم اپنی کرو گے۔ کہیں جانیں جائیں گی، کہیں مال جائے گا، کہیں گھر لٹیں گے کہیں، تباہیاں آئیں گی، کہیں ثمرات اجڑیں گے۔ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ (2:155-156) ان حالات کے اندر جو ثابت قدم رہنے والے ہیں ان کو بشارتیں دیدو اس چیز کی، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب بھی کوئی مصیبت ان کے سامنے آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) یہ مصیبت شے کیا ہے ہم نے اپنا سب کچھ خدا کے لیے وقف کر دیا ہے، آتی ہیں مصیبتیں تو آئیں، ہمارا ہر قدم اُس کی طرف جائے گا۔ ان سے ڈر کے ہم اپنا قدم روک نہیں لیں گے، پیچھے نہیں جائیں گے، کسی اور طرف نہیں جائیں گے۔ سمندر اور دریا راستے میں آئیں گے تو تیر کے چلے جائیں گے۔ انا اللہ او ہم نے تو سب کچھ اپنا دیدیا ہے اس کو اس کے لیے وقف کر دیا ہوا ہے، اس لیے ان مصیبتوں سے ڈر کے ہم منہ موڑ لیں گے؟ انا الیہ راجعون لو میرا قدم اٹھا اس کی طرف۔ یہ ہے عزیزانِ من! کتنا عظیم ردِ عمل ہے ایک مومن کا۔ ہم اس کے ہیں، ہمارا اپنا کیا ہے۔ یہ کبھی کر کے دیکھئے، ہم اس کے ہیں، اس کے بعد پھر ان مصیبتوں سے قدم دوسری طرف آپ کا اٹھے گا؟ ہم اس کے ہیں۔ الیہ راجعون بڑا عجیب ہے او دیکھو میں گیا اس کی طرف۔ یہی روکتے راستے میں کہ میں اس کی طرف نہ جاؤں۔ ہم اس کے ہیں، آؤ دیکھو الیہ راجعون دیکھتے ہو میرا قدم کدھر کو جاتا ہے، اُدھر ہی کو جا رہا ہے۔

بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

مومن کا ہر اُٹھنے والا قدم نئی منزل کی نشان دہی کے لیے ہے

یہاں تو کیفیت یہ ہوتی ہے۔ انا اللہ۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:162) یہ ہے ایمان پہلا تو۔ کہہ دو ان سے کہ یہ میری صلوٰۃ، یہ طور و طریق، میری زندگی، میری موت لِلّٰهِ سب ہم نے اس کے لیے وقف کر دی ہے۔ کیا اعلان ہے یہ!!!۔ یہ ٹکراؤ کیا ہوتے ہیں؟ مخالف قوتیں چاہتی ہیں کہ ہم اپنے مقصد کی طرف نہ جائیں، یہی ہے ناٹکراؤ۔ وہ راستے میں دیوار بن کے حائل ہو جاتی ہیں، سیلاب بن کے آ جاتی ہیں، شعلے بن کے بھڑک اٹھتی ہیں کہ ہم وہاں تک نہ جائیں۔ یہ ہے چیز۔ لیکن سوچئے تو سہی وہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں تو اس کو ڈرائیں جس نے یہ چیزیں اپنی تو سنبھال کے رکھنے والی باتیں ہوں۔ یہ تو ہیں اس کی، ہمارا اپنا کچھ ہے ہی نہیں۔ آہاہا وہی شعر پھر آ جاتا ہے۔

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

انا للہ ایک تم ہمارے ہو باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے۔ اور اس کے بعد یہ صورت کہ اس تک جانے کے لیے روک رہے ہو، بڑے پاگل ہو گئے ہو، آ ؤ دیکھو، لاؤ اور اس سے زیادہ مصیبتیں لاؤ اور دیکھو الیہ راجعون۔

مومن کی جان و مال اور زندگی کا ایک ایک لمحہ ملت اسلامیہ کے لیے وقف ہوتا ہے

عجیب چیز ہے عزیزانِ من! اس میں ایک نعرہ ہے آ ؤ دیکھو ہم چلے اس کی طرف۔ اس لیے کہ ہم اس کے ہیں۔ یہاں آیا ہوا ہے انا الیہ راجعون۔ یہاں وہی لفظ آئے ہوئے ہیں کہ اِنَّآ اِلَی اللّٰہِ رٰغِبُوْن (9:59) ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ اور پھر لفظ رٰغِبُوْنَ ہے یہاں، ارادہ ہی نہیں، دل کے ارادوں سے ان کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں۔ اس واسطے یہ چیزیں جو تم آ کے کہہ دیتے ہو کہ صاحب اس کو اتنا ملا، اُس کو کم ملا زیادہ ملا۔ کیا کہہ رہے ہو سوال ہی نہیں ہے اس کے ملنے کا اور اس کے نہ ملنے کا۔

لٹا دو دولتِ کونین اور میرے لیے
بس اک تبسمِ عاجز نواز رہنے دو

ہم تو اتنے پہ مرنے والے ہیں۔ جس نے اپنا وقف کر دیا ہے سب کچھ، میں اور میرا سب کچھ اس کے لیے، پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ مجھے کیا ملا اور اس کو کیا ملا اور اس کو کیوں نہیں ملا؟ وہ تو جب آتا ہے تو کہا گیا تھا یہ کچھ کہ جو زائد از ضرورت ہو وہ لے آ ؤ، لے آئے۔ پتہ ہے کہ جسے صدیقؓ جس مقام پہ کہا تھا ابو بکرؓ کو، کیا کیفیت تھی۔ ایک کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور لے آئے۔ پوچھا کہ ابو بکرؓ کیا رکھا ہے اپنے لیے، کہنے لگےؓ یہ کمبل رکھا ہے اپنے لیے باقی سب کچھ لے آئے۔ کہا گھر والوں کے لیے کیا چیز ہے، کہنے لگےؓ گھر والے بھی اللہ کے ہیں ابو بکرؓ بھی اللہ کا ہے۔ وہ تو یوں لاتے ہیں۔ ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا ہے۔ اِنَّآ اِلَی اللّٰہِ رٰغِبُوْنَ (9:59) اب آگے اس نے یہ بتایا کہ جن چیزوں کے کچھ کم ملنے سے اس قدر یہ غصے پہ اتر آئے ہیں کم بخت، کہ یہ رسول ﷺ جیسی ذات کے خلاف بھی، جرأت نہیں ہے کہ اعلانیہ کہیں کہ یہ کیا ہوا ہے، وسوسے انداز کر رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ جسے صدقت کہتے ہیں یہ کس کے لیے ہیں۔ اس میں تو رسول کی اپنی ذات کے لیے یا ان میں سے کسی کے لیے کوئی حصہ ہی نہیں ہوتا۔ یہ کن کے لیے ہے؟ وقت ہو گیا سورۃ توبہ کی آیت 59 تک ہم آئے ہیں۔ 60 آیت میں اگلی دفعہ عرض کرونگا کہ عام طور پہ مشہور ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف، کس قدر غلط ہے یہ چیز۔ قرآن میں تو صدقات ہیں۔ یہی معلوم نہیں ان کو صدقات اور زکوٰۃ میں فرق کیا ہوتا ہے۔ اور کیا کیا چیز میں عرض کروں کہ کہاں سے کہاں بات چلی گئی ہوئی ہے۔ کروڑوں روپے جتنے جی چاہے جمع کر لیجئے، سال کے بعد اس میں سے اڑھائی فیصد نکال کے فقیروں کی جھولی میں ڈال دیجئے،

صاحبزادہ صاحب کا دروازہ بنا دیجئے' باقی سب مالِ طیب پاک اور صاف۔ کتنے بڑے فریب ہیں جو دیے ہوئے ہیں۔تو یہ میں عرض کرونگا اگلی دفعہ کہ یہ جو آیت جلیلہ آئی ہے اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَ الۡمَسٰکِیۡنِ (9:60) یہ آیت ہے اس کو میں آئندہ لونگا۔آج ہم سورۂ توبہ کی 59 آیت تک پہنچے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

آٹھواں باب: سورۂ توبة (آیت 60)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1973ء کی 8 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 60 سے ہو رہا ہے۔ (9:60) اس آیہ جلیلہ میں بھی ایک اہم نمایاں چیز سامنے آتی ہے اور اس تک پہنچنے سے پہلے کچھ الفاظ تمہیدی تعارف کے لیے ضروری ہیں اس سے بات واضح ہو جائے گی۔

اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا بنیادی مفہوم قرآن حکیم کے آئینہ میں

ہمارے ہاں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ دین کے دو بنیادی اصول بتائے جاتے ہیں اور انہیں اس طرح مسلمات کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا شک وشبہ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ اس میں نہ کسی تفصیل کی ضرورت ہے نہ وضاحت کی ضرورت۔ اقامتِ صلوٰۃ یہ پانچ وقت نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سال بھر کے بعد جمع شدہ مال پر، جس کا نصاب مقرر ہے۔ نصاب کے معنی ہوتے ہیں کہ کم از کم اتنا ہو تو اس پہ زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور شرح اس کی ہوتی ہے کہ کتنی واجب ہوتی ہے۔ تو گویا جمع شدہ مال پر ایک سال گذر جائے اور کم از کم وہ باون روپے کے قریب' تو اس پر چالیس فیصد یعنی ہر سو کے پیچھے اڑھائی روپے۔ ان چیزوں کا نام ہے زکوٰۃ۔ اور ان میں لفظِ زکوٰۃ کے علاوہ جتنی باقی چیزیں میں نے عرض کی ہیں' ان میں سے کوئی بھی قرآنِ کریم میں نہیں ہے۔ نہ جمع شدہ مال نہ اس کا نصاب کہ کم از کم کتنا' نہ ہی اس کی شرح کہ کتنی دی جائے۔ یہ قرآنِ کریم میں کہیں نہیں ہے۔ زکوٰۃ کی تاکید قرآنِ کریم میں بیسیوں مقامات میں آئی ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز اس کے اندر نہیں ہے۔ تو ہے نا یہ ایک سوچنے کا مقام۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے آپ دیکھیں گے دین کس طرح مذہب میں بدل جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق پہلی چیز ہی یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس باون روپے جمع ہوں ایک

سال اس کے اوپر پڑ جائے تو اڑھائی روپے فیصد اس میں سے نکال کے کسی غریب کو خیرات کر دے تو یہ زکوٰۃ کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم میں ایک اور چیز آئی ہے اور وہ بنیادی شرط ہے اس کے لیے۔ قرآن کی رو سے اب میں باتیں کر رہا ہوں۔ یہی سورۃ حج کی آیت جس میں مسلمانوں کی اپنی مملکت کے قیام کا ذکر ہے۔ پہلی بار وہاں ذکر آیا ہے کہ اب انہیں بھی اجازت دی جا رہی ہے کہ جو لوگ ان پہ زیادتیاں کرتے ہیں' ان کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کریں۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ کاہے کے لیے یہ جنگ میں مقابلے کریں' کاہے کے لیے اپنی مملکت قائم کریں اس کی کیا ضرورت ہے۔ تو پہلی آیت میں تو یہ کہا گیا ہے کہ ضرورت اس لیے ہے کہ دنیا میں مذہب کی آزادی لوگ سلب کر لیتے ہیں۔ کوئی قوم ایسی ہونی چاہیے کہ جب دنیا میں عیسائیوں کے گرجے' یہودیوں کے صومعے' راہبوں کی کوٹھڑیاں مسلمانوں کی مسجدیں' ان کے اوپر کوئی حملہ آور ہو اور ان کی آزادی کو چھینے تو کوئی قوم ایسی ہونی چاہیے جو ان کی مدافعت کرے' ان کی حفاظت کرے۔ تو پہلی چیز یہ بتائی کہ اس لیے اس قوم کو اجازت دی جا رہی ہے جنگ کی کہ وہ دنیا میں مذہبی آزادی کو قائم رکھے۔ یہ موضوع میرا نہیں۔ آگے چلیے۔ اور اس کے بعد ہے۔

تمکن حاصل ہونے کے بعد جماعتِ مومنین کے لیے اسلامی مملکت کا پہلا فریضہ

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ (22:41) یہ لوگ جنہیں جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے جماعتِ مؤمنین' ان کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں زمین میں جب تمکن حاصل ہو جائے گا۔ یہ تمکن پاور کو کہتے ہیں' قوت کو کہتے ہیں' اقتدار کو کہتے ہیں۔ تمکن حاصل ہو جانا کہ جب انہیں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو یہ باقی دنیا کی اقوام سے ایک ممتاز اور متمیز قوم ہو گی۔ انہیں جو اقتدار حاصل ہو گا تو اس کی غرض و غایت جو ہے وہ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (22:41) ہے وہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (22:41) اور زکوٰۃ دیں گے جس کا ترجمہ ہوتا ہے ہمارے ہاں' وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (22:41) یہ حکم جاری کریں گے مملکت میں ان چیزوں کا کہ جنہیں خدا کی کتاب معروف Recognize قرار دیتی ہے اور روکیں گے ان چیزوں کو جن کی وہ ممانعت کرتی ہے۔ اب یہ جو دو ٹکڑے آخری ہیں یہ تو صاف ہو جاتے ہیں کہ یہ احکامِ خداوندی کو جاری کرنے کے لیے اور جن چیزوں سے اس نے روکا ہے قانوناً ان سے روکنے کے لیے یہ مملکت وجود میں آئے گی۔

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے مروجہ مفہوم کے تحت کسی تمکن کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی

لیکن اس سے پہلے دو ٹکڑے جو ہیں اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (22:41) کہا یہ ہے کہ جب انہیں تمکن اقتدار میسر آئے گا تو یہ لوگ ایسا کریں گے۔ تو یہ تو شرط قرار دیدی ہے یہاں تمکن کی اقتدار کی۔ اور ہمارے ہاں یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں' نماز پڑھنا زکوٰۃ

دینا اس کے لیے تمکن اقتدار کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ دنیا کی ہر مملکت' جو حاکم ہو' مسلمانوں کی اور اس کی محکومیت میں یہ دن بسر کر رہے ہوں' وہ بھی ان کی اجازت دیدیتے ہیں' کسی نے بھی نہیں روکا کبھی۔ ان کو کون روکتا ہے صاحب کہ وہ اڑھائی روپے خیرات کے نہ دیا کرو فقیروں کو۔ انگریزوں کی بادشاہی میں مسلمانوں کو اس کی اجازت' ہندوؤں کے ہاں آج بھی جہاں اتنی سختی مسلمان پہ ہے' اس سے کوئی بھی نہیں روک رہا۔ یہاں وہ کہتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (22:41) جب انہیں تمکن نصیب ہوگا تو وہ یہ چیز کریں گے۔ تو گویا یہ کوئی ایسی چیز ہے جس کے لیے تمکن فی الارض' استخلاف فی الارض' اپنی مملکت' اپنا اقتدار' اپنی حکومت کا ہونا شرط قرار دیا ہے قرآن نے۔ تو یہ اسی صورت میں ہو سکے گا۔ پھر یہ تمکن جب ان کو ملے گا' ان کی مملکت قائم ہوگی تو یہ (میں اس وقت اقاموا الصلوٰۃ پہ نہیں آ رہا میرے سامنے صرف اٰتوا الزکوٰۃ ہے) ان کی اپنی حکومت قائم ہوگی انہیں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ زکوٰۃ دیں گے یہ مملکت والے' ان کی مملکت ان کی حکومت۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا بھول بھلیاں ہیں۔ مجوزہ Concept یا تصور آپ کے ہاں زکوٰۃ کا یہ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ یہ ایک انفرادی چیز ہے۔ ہر شخص کے پاس سال کے بعد اگر اتنے پیسے جمع رہے ہیں تو اس میں سے وہ اتنے پیسے نکال کے خیرات دیدے۔ یہ حکومت کی طرف سے نہیں ہے۔ اور اگر آج کل یہ قدامت پرست ذرا ماڈرن بنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہاں صاحب حکومت وصول کرے گی یہ زکوٰۃ۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ آئین میں ایک شق ہونی چاہیے اور عام طور پر رکھ دی جاتی ہے شق یہ کہ زکوٰۃ کی وصولی کے لیے حکومت محکمہ قائم کرے گی۔

استخلاف فی الارض کے بعد مملکت زکوٰۃ لوگوں سے وصول نہیں کرتی بلکہ لوگوں کو زکوٰۃ دیتی ہے

یعنی یہ حکومت زکوٰۃ لے گی لوگوں سے۔ یہاں لکھا ہے کہ ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ زکوٰۃ دیں گے۔ سوچئے لیکن جب انسان مذہب کے چکر میں پھنستا ہے تو سوچ کے دیئے پہلے گل ہو جاتے ہیں۔ قرآن موجود ہے یہ آیتیں موجود ہیں اس میں کوئی مغلط چیز نہیں ہے' کوئی دقائق نہیں ہیں کہ اس کے لیے افلاطون کے ذہن کی ضرورت ہو۔ کھلے کھلے الفاظ ہیں کہ ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ زکوٰۃ دیں گے۔ جب کہ ہمارے ہاں تو زکوٰۃ' خیرات ہے انفرادی طور پہ اتنا جمع ہوا تو اللہ واسطے کسی کی جھولی میں ڈال دیا اس کے لیے حکومت کی شرط نہیں ہے۔ اور جب یہ حکومت کی شرط بتاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حکومت زکوٰۃ لے گی۔ مگر قرآن میں ہے کہ دے گی اسی سے آگے سورۃ مؤمنون جو ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ جو جماعت ہم تیار کر رہے ہیں جب یہ مملکت حاصل کرے گی تو ان کی خصوصیات کیا ہونگی۔

زکوٰۃ کا مفہوم بطورِ چیرٹی خیرات یا دان قرآن حکیم کے نزدیک انسانیت کی تذلیل ہے

اس کے لیے ایک فقرہ یہ ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (23:4) وہ زکوٰۃ کے لیے کام کریں گے' یہ ان کا فریضہ ہوگا۔ ارے

یہ کیا ہے لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (23:4) انفرادی چیز ہے تو سیدھی بات ہے کہ یہ زکوٰۃ خیرات کی حیثیت سے بانٹیں گے' پیسے بانٹیں گے۔ان کا Concept یہ ہے وصول کریں گے تو کہیے ان کی حکومت زکوٰۃ لوگوں سے وصول کرے گی۔ وہاں یہ صورت ہے کہ حکومت ہوگی تو زکوٰۃ دیں گے یہاں یہ ہے کہ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (23:4) یہ زکوٰۃ کے لیے کچھ کریں گے۔ جو دنیا میں نہیں ہو رہا یہ کریں گے۔ یہ خیرات اور چیرٹی تو ساری دنیا کے مذاہب کے اندر موجود ہے۔ ہندوؤں کے ہاں دان پن' انگریزی میں تو وہ لفظ ہی Charity ہے۔اور ستیاناس کہ ہم نے اس کا ترجمہ خیرات کر دیا انگریزی میں گیا تو Charity۔ جتنے ترجمے انگریزی کے آپ کے ہاں ہے جہاں زکوٰۃ آیا ہے Charity۔ گویا یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں Poors جو ہیں وہ مستقل طور پر رہیں گے تا کہ انہیں خیرات دی جا سکے۔اور حکومت ایسا انتظام کرے گی کہ وہاں موجود رہیں یہ گداگر اور فقیر اور محتاج تا کہ حکومت اپنا یہ فریضہ ادا کرے۔ان کے Concept کی رو سے حکومت کی تو یہ صورت ہوئی' زکوٰۃ دے گی' وصول نہیں کرے گی۔سوچنے کی چیز ہے کہ یہ قرآن کی آیتیں کیا کہہ رہی ہیں' مقصد کیا ہے ان کا۔

روحانی تصورحیات کے لیے تمکن فی الارض چہ معنی؟

میں نے عرض کیا ہے نا کہ جب دین مذہب میں بدل جاتا ہے' ساتھ ہی یہاں دلچسپ چیز آ گئی۔ٹھیک ہے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (22:41) کہ جب انہیں تمکن حاصل ہوگا تفسیر ان کی ہوتی ہے کہ صاحب یہاں روحانی تمکن سے مقصد ہے۔ ارے فی الارض پھر کیوں ہے؟ یعنی ملک کے اندر تمکن حاصل جو ہونا ہے۔روحانیت کے لیے تو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے' پہاڑ کی غاروں میں چوٹیوں میں جنگلوں میں پہاڑوں میں ندیوں میں خانقاہوں میں قبروں کے اندر وہ تمکن تو نہیں حاصل ہوتا ہے۔فی الارض ہے یہ۔ بہرحال روحانی تمکن ہے جی۔جیسے استخلاف فی الارض کی جو آیت ہے کہ خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے تم میں سے جو بھی عملِ صالح کرے گا ایمان رکھے گا لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْاَرْضِ (24:55) وہ اسے یہاں اس زمین میں' اس ملک میں' استخلاف دے گا' تمکن دے گا۔ کہتے ہیں جی یہ خلافتِ روحانی ہوتی ہے۔

امر بالمعروف نہی عن المنکر کے قرآنی حکم کو ہم نے مساجد میں وعظ کہنے کی شکل میں بدل رکھا ہے

چلیے جناب اس کو تو یوں الگ کیا' اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (22:41) نماز پڑھیں گے اٰتـوا الزكٰوة (22:41) زکوٰۃ دیں گے۔وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (22:41) یہ آپ روز سنتے ہونگے مسجدوں میں یہ واعظ حضرات اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (22:41) کا فریضہ ادا کر رہے ہیں یہ وعظ کہنے سے۔وہاں امر ہے جس کے معنی ہے حکم دینا' وَ نَهَوْا ہے جس کے

معنی ہیں روک دینا کسی کو۔ امر بالمعروف نھی عن المنکر یوں ہوگیا۔ ہوگیا نا پورا مقصد ان آیتوں کا۔ (اٰتـوا الـزکوٰۃ) جب ان کی اپنی مملکت قائم ہوگی تو وہ زکوٰۃ دے گی۔

قرآنی الفاظ کے معنی عربی مبین سے متعین کرنے ہوں گے جس میں زکوٰۃ کے معنی نشوونما کے ہیں

سوچئے عزیزانِ من! قرآن سوچنے کی چیز ہے اور اس سوچ کے لیے جیسا میں نے عرض کیا ہے کسی افلاطون کے دقائق کی ضرورت نہیں ہے' قرآن کے الفاظ کے معنی صرف متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ پوچھئے ان سے یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ جو ان کے دیے ہوئے تصورات ہیں ان سے نکل جائیے۔ زکوٰۃ کا لفظ جو قرآن بار بار کہتا ہے کہ ہم نے اسے عربی مبین میں نازل کیا تو ہے نا کوئی اہمیت اس چیز کی۔ ورنہ میں اردو میں کتابیں لکھتا ہوں اور میں کہوں کہ میں نے یہ کتاب اردو زبان میں لکھی ہے تو ہر کوئی مجھے مذاق کرے گا کہ اردو زبان میں لکھی ہے پتہ ہے۔ اُس نے جو اس پر زور دیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ دیکھو کہ لسانِ عربی مبین کے اندر ان الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ اور اس کے بعد بات صاف ہوجائے گی۔ اس نے کہیں نہیں کہا کہ جا کے کسی فقیہہ سے پوچھو کسی مجتہد سے پوچھو۔ وہ کہتا ہے عربی مبین کی کتاب ہے' عربی مبین سے پوچھئے کہ زکوٰۃ کیا ہے۔ خود ان کے ہاں جو لغات ہیں عربی مبین کے' ان میں یہ معنی دیے ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کے معنی ہوتا ہے سامانِ نشوونما۔ کہا یہ کہ ان کا تمکن ان کی حکومت دنیا میں قائم ہوگی۔

دنیا کی حکومتوں کے برعکس قرآنی حکومت کا فریضہ اور اس کا طریق

دنیا میں باقی حکومتیں تو لوگوں سے چھین لیتی ہیں سامانِ نشوونما' ان کا فریضہ یہ ہوگا کہ یہ پوری نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما مہیا کریں گے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (23:4) وہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے دن رات کام کریں گے۔ یہ کام کریں گے تا کہ دنیا کے افراد کو نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما مہیا ہوجائے۔ اب غور فرمایا کہ یہ شرط کیوں عائد ہوئی ہے تمکن فی الارض کے لیے۔ تمکن فی الارض اگر نہ ہو' رزق کے وسائل اگر ان کی اپنی تحویل میں نہ ہوں تو یہ سامانِ نشوونما کیسے دے گی دوسروں کو۔ اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں نہ ہو تو یہ کیسے سامانِ نشوونما دینے کا فریضہ انجام دے۔ اور یہ وہ فریضہ ہے جس کے متعلق کہا کہ انہیں اعلان کرنا چاہیئے تمام مملکت کے افراد کے لیے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (6:151) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہارے بچوں کے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں۔ رزق تو سامانِ زیست کے لیے آتا ہے' نشوونما اور پرورش دونوں کے سامان کے لیے رزق کا لفظ ہے۔ یہ اعلان کریں گے کہ ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ یہی جو ذمہ داری ہے اُسے اس لفظِ زکوٰۃ جو اس سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس میں ایک باریک فرق ہے۔

قرآنی حکومت صرف طبعی ضروریات کی فراہمی تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذمہ تو انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرنا بھی ہے

رزق پھر بھی محسوسات تک ہوتا ہے Physical چیز' وہ ہو محسوس نشوونما ہوتی ہے۔زکوٰۃ کے لیے پرورش میں ایک لفظ استعمال کرتا ہوں۔زکوٰۃ انسان صلاحیتوں کی پرورش کرتی ہے۔وہ پرورش ہے' زکوٰۃ' نشوونما ہے انسانی صلاحیتوں کی Development , Growth۔اب اس کے لیے طبعی ضروریات سے آگے بڑھ کے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے جس قدر سامان کی ضرورت ہے' یہ مملکت وہ سامان مہیا کرے گی۔یہ مقصد ہے اس مملکت کے قیام کا۔یہ ہے زکوٰۃ کا مفہوم سارے قرآن میں۔جہاں آیا ہے کہ یہ وہ مملکت ہوگی' وہ جماعت ہوگی کہ دنیا میں انہیں تمکن حاصل ہوگا۔تو اب پتہ چلا کہ زکوٰۃ دینے کے کیا معنی ہیں۔نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما مہیا کریں گے یہ ان کا فریضہ تھا۔یہ تو ہے زکوٰۃ۔اب اس کے لیے ظاہر ہے کہ ایک خاص معاشی نظام ہونا چاہیے یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔پورے افرادِ مملکت کو ہی لے لیجیے' شروع میں نوعِ انسانی نہ لیجیے۔افرادِ مملکت میں سے ہر ایک کو پرورش کا سامان بھی دینا ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا بھی انتظام کرنا۔یہ بہت بڑا فریضہ ہے۔یہ خاص معاشی نظام کے اندر ممکن ہو سکے گا' ورنہ اس کا امکان نہ ہوگا۔اب یہ جو مملکت قائم ہو رہی ہے' یہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی جیسے قرآن تئیس سال کے عرصے میں تکمیل تک پہنچا۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے تصریفِ آیات کے فارمولے کو پیش نظر رکھنا لازم ہے

جو نظام اس کی رو سے قائم کیا جا رہا تھا' یہ بھی بتدریج وہاں تک پہنچا۔قرآن کے سمجھنے کی دوسری بنیادی شرط یہ ہے عزیزانِ من! جسے تصریفِ آیات کہا جاتا ہے۔ایک موضوع کے اوپر دیکھئے کہ قرآن میں کہاں کہاں کیا کیا آیا ہے۔ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ صاحب' نزولِ قرآن اس کے متعلق متعین ہونا چاہیے۔اور اب نزول کے متعلق آج بیٹھ کے یا تین سو سال بعد میں بیٹھ کے انہوں نے شروع کیا اسے متعین کرنا کہ یہ آیت جو تھی کس سن میں کس سال میں نازل ہوئی تھی۔کہاں سے متعین کیا یہ؟۔ہمارے تعین کی صورت تو یہ ہے۔

ہمارے ہاں نہ تو حضور ﷺ کی تاریخ وفات ہی یقینی طور پر متعین ہے اور نہ ہی قرآنی آیات کے نزول کا کوئی حتمی مہینہ

یوں تو ہمیں بڑا فخر ہے کہ صاحب مسلمانوں نے بڑے بڑے مؤرخین پیدا کیے۔یہ سب کچھ بعد کی بات ہے۔ہمارے ابتدائی دور کی تاریخ کا یہ عالم ہے نبی اکرم ﷺ کی وفات کی تاریخ متعین نہیں' عمر متعین نہیں۔آپ کو پتہ ہے یہ بارہ ربیع الاول جسے آپ کہتے ہیں

یومِ وفات' یہ بارہ ہے اس بارہ کا تعین نہیں ہے۔ پچھلا مہینہ جو صفر کا گذرا ہے آپ کو پتہ ہے اس میں بھی یہ چیز منائی گئی ہے۔ اور ابھی انیس تاریخ کو آنی ہے آغا خانیوں کے ہاں۔ اور یہ بارہ خود سنیوں کے ہاں بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ تاریخ اور سن کے متعلق حضورﷺ کی عمرِ شریف کے متعلق تو ساٹھ برس' اکسٹھ برس' باسٹھ برس' تریسٹھ برس' پینسٹھ تک بھی ہے۔ میں کوئی تنقیص اس میں نہیں کر رہا' میں کہہ رہا ہوں کہ اس زمانے میں ان لوگوں کے ہاں ابھی یہ علم جسے تاریخ کا کہتے ہیں ایسا پختہ نہیں تھا۔ تین سو سال بعد جا کے پہلی دفعہ کوشش کی گئی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ قرآن کی فلاں آیت کس سال کس مہینے میں نازل ہوئی تھی قرآن نے تو دیا نہیں کہیں۔ دورِ اول میں کہیں یہ چیز لکھی نہیں گئی۔ اب اس کو متعین کرتے ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف یہ دیکھنے کی ضرورت ہے' تدریج دیکھنے کی ضرورت ہے Gradually یہ چیز آخر تک گئی تھی۔ آیات خود بتا دیتی ہیں کہ شروع میں کونسا درجہ تھا پھر اگلا قدم کیا اٹھایا گیا پھر اگلا پروگرام کیا آیا۔ Continuosly آہستہ آہستہ Gradually وہ انتہا تک لے جاتا ہے۔

ہجرت سے پہلے مکے میں جماعت مومنین کو جن جن حالات سے نبرد آزما ہونا پڑا' اس کا ذکر

مکے میں ابتداء ہوئی اس جماعت کی۔ غریبوں کی جماعت جن گھروں میں رہتے تھے' دوسروں نے وہ بھی چھین لیے تھے۔ اس جماعت کے اندر محتاج بھی تھے' غریب بھی تھے' کچھ ایسے بھی تھے کہ جن کے پاس زیادہ تھا۔ اس زمانے میں ابتداء ہوئی اس کی۔ تو ظاہر ہے کہ یہ ابتداء اُسی شکل میں ہوگی کہ Voluntary جتنا کسی سے کچھ ہو سکے' دوسرے کی مدد کے لیے دیدے۔

مملکتِ اسلامیہ کے پہلے دور میں صدقات کی کیفیت اور آیاتِ قرآنی کی ترتیب کے معاملے کی وضاحت

یہ سب سے پہلا مرحلہ ہے۔ یہ اس مرحلے کے اندر اس طرح جو چیز آتی تھی' اُسے صدقات کہتے تھے۔ اپنے دعویٰ ایمان کی تصدیق کے لیے کچھ پیش کر دینا۔ دعویٰ یہ تھا کہ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (23:4) ہمارا منتہا یہ ہوگا کہ ہم انسانیت کی نشوونما کے لیے ایک پروگرام متعین کریں گے اور ہم مہیا کریں گے۔ اور آج جبکہ ہمارے پاس ابھی وہ وسائل و سامان و اسباب نہیں ہیں تو اتنا ہی کافی ہے کہ جتنا کسی سے کچھ ہو سکتا ہے' وہ اپنے اس دعوے کی سچائی کے ثبوت میں اتنا ہی دیدے۔ یہ سب سے پہلا دور ہے جسے آپ صدقات کہتے ہیں۔ یہ کوئی مستقل شے نہیں ہے' ویسے ہی ہے مثال کے طور پر جیسے شراب کی حرمت کے متعلق یا قطعی ممانعت کے متعلق پندرہ سال لگ گئے تھے۔ تیرہ سال مکے کی زندگی کے اور مدینے کی زندگی میں پانچویں ہجری میں آ کے یہ چیز آخر طے یہ ہوئی تھی۔ اور قرآن میں پہلی چیز یہ ہے کہ

حالتِ نشہ میں نماز کے قریب نہ جایا کرو(4:43)۔پھر اگلی چیز یہ کہ اس میں فائدہ بھی ہے لیکن اس کے نقصان زیادہ ہیں' یہ آیت بھی موجود ہے(2:219)۔اس کے بعد اگلی چیز ہے کہ یہ تو ابلیس کا شیطان کا کام ہے' بند کرو اس کو(5:90)۔اب یہ تینوں آیتیں سامنے رکھیے تو خود وہ بتا رہی ہیں کہ پہلے کونسی نازل ہوئی ہوگی دوسری کونسی اور آخر میں کونسی نازل ہوئی ہوگی۔ یہ ہے ترتیبِ آیات۔قرآن حکیم بتدریج ایک چیز کو شروع سے آخر تک لے جاتا ہے' یہی اس کا معاشی نظام ہے۔ابتدائی زندگی کے اندر جب ابھی ان کے پاس وسائل و اسباب نہیں' تمکن بھی حاصل نہیں ہوا تھا' وسائلِ رزق بھی ان کی تحویل میں نہیں تھے۔اس زمانے میں بھی ضرورت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کا کام انفرادی طور پہ ہوتا تھا۔ یہ ہے وہ چیز جن کو صدقات کہا جاتا ہے۔لیکن یہاں بھی آپ دیکھئے ہے یہ انفرادی چیز۔بظاہر ایسا نظر آتا ہے جیسے خیرات کی شکل ہے۔لیکن کیونکہ دین اجتماعی نظام کا نام ہے خواہ وہ ابتدائی پہلے دن کی بات ہو یا آخری دن کی یہ صدقات پہلے دن سے بھی اجتماعی چیز تھی۔اپنے اپنے طور پہ نہیں تھا کہ جس کا جی چاہے جتنا اس کے پاس ہو' کسی محتاج کو دیدے۔صدقات کے متعلق اسی سورۃ توبہ میں ذرا آگے چل کر خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً (9:103) مرکزِ جماعت نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ ان کے صدقات وصول کیا کرو۔تو گویا نظر آیا کہ ابتدائی زندگی میں ہی اگرچہ معاشی نظام کی انتہا ابھی نہیں آئی تھی' ابتداء میں بھی جماعتی نظام ان کے اندر موجود تھا۔دین انفرادی ہے ہی نہیں عزیزانِ من!۔وہ جو ایک درخشندہ سی حدیث ہے نا حضور ﷺ نے فرمایا کہ کہیں جا رہے ہو تو اگر تم تین بھی ہو تو اپنے میں سے ایک امام بنا لیا کرو اور دو مقتدی ہوا کریں۔ یہ ابتدائی دور میں بات صدقات کی ہے جسے ہم عام طور پہ خیرات کہتے ہیں۔اس میں بھی ہے خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً (9:103)۔تُطَهِّرُهُمۡ (9:103)۔

انسانی معاشرے میں استحصالی نظام کی بنیاد مال و دولت کی کشش ہوتی ہے

پہلی چیز جو اس دنیا کے اندر کھینچتی ہے انسان کو اپنی طرف' وہ مال کی محبت ہے۔مال کا لفظ ہی اس سے ہے جسے میلان کہتے ہیں' یہ تو ہے ہی کشش۔ یہ کشش کا جذبہ انفرادی سارے استحصال کی' Exploitation کی' استبداد کی بنیاد ہے۔یہ جو کھینچتا ہے۔کہا کہ ان کو مائل کرو' یہ صدقہ دیں دوسروں کی ضرورت کے لیے جو کچھ بن سکتا ہے دیں۔انفرادی طور پہ نہیں اجتماعی طور پر خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً (9:103) وصول کروان سے۔اور اس طرح سے ہوگا کیا؟ تُطَهِّرُهُمۡ (9:103) یہ جو اس قسم کے غلط جذبات ہیں حیوانی زندگی کے جذبات' جو اپنی طرف ہر چیز کو کھینچے ہیں' ان سے ان کو دور کردو' نکال دو۔کتنی بڑی ابتدائی زندگی کے اندر آ رہی ہے۔صدقہ دینے سے ان کی تطہیر ہو جائے گی۔اس قسم کی جتنی چیزیں ہیں جو انسان کو پستی کی طرف لے جاتی ہیں ان سے دور ہو جائیں گے۔تطہیر کے معنی ہی ہوتا ہے دور لے جانا کسی کو' الگ کر دینا۔وَ تُزَكِّيۡهِمۡ (9:103) اس طرح سے پہلے ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرو۔

ذاتِ انسانی کی نشوونما کا دارومدار بطیبِ خاطر دوسروں کی ضرورت کو پورا کرنے میں ہے

غور فرمایا آپ نے۔ یہ جو چیز ہے نا اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے بطیبِ خاطر دوسرے کی ضرورت کو پورا کرنا' انسانی ذات کی نشوونما کے لیے بنیادی چیز ہے۔ اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (92:18) قرآن نے کہا ہے۔ وہ شخص جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ اس کی نشوونما ہو جائے۔ کیا بات ہے قرآن کی!! حیوانی سطح اور طبعی سطح زندگی کی نشوونما لینے سے ہوتی ہے' جو میں کھاتا ہوں' جو میں لیتا ہوں۔ مگر یہاں یہ چیز ہے کہ یہ دیتا ہے تاکہ اس کی نشوونما ہو جائے۔ مال کی بات کہی۔ پہلی بات کہی کہ ان سے وصول کرو تاکہ یہ جو اس قسم کے جذبات جو انفرادیت کی طرف لے جاتے ہیں انسان کو' اپنے اپنے ذاتی مفاد کی مدافعت کے لیے یا حصول کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ دور ہو جائیں اور یوں ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما شروع ہو جائے۔

دوسروں کی دل جوئی ہمیشہ کشادِ قلب کا باعث بنتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق خدا تعالیٰ کی طرف سے تحسین بھرے الفاظ

اور بڑا خوبصورت ہے یہ لفظ کہ ٹھیک ہے آتے تو ہیں یہ بطیبِ خاطر ہی دینے کے لیے لیکن جذبہ بڑا مستحسن ہے (وَصَلِّ عَلَیۡہِمۡ (9:103) ان کو شاباش بھی دیا کرو۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے عزیزانِ من! دوسروں کی خوبیوں کی Appreciation یہ بڑی چیز ہے۔ دینے والے کے دل کی بڑی کشاد ہوتی ہے۔ اور جب شاباش دینے والا رسول جیسی شخصیت ہو تو اندازہ لگائیے کہ ان کے قلوب کی کیفیت کیا ہوگی'' جیتے رہو بیٹا شاباش' کیا بات ہے تمہاری!!''۔ کسی بچے سے کہیے آپ' جیتے رہو شاباش۔ ہمارے گھروں میں تو تربیت کے طریقے ہی غلط ہو گئے ہوئے ہیں۔ ایسا انہوں نے پہلے دن سے اللہ میاں سے ڈرو اللہ میاں سے ڈرو شروع کیا اور جوں ڈرو شروع کیا ان بچوں کا ستیاناس کیا' ڈرا ڈرا کے ان کا کچومر نکال دیتے ہیں۔ جتنا زیادہ ڈرنے والا بچہ ہوگا اسے اتنا ہی مہذب کہا جائے گا' تہذیب نام اس چیز کا ہے۔ ورنہ یہ جو ہے (وَصَلِّ عَلَیۡہِمۡ (9:103) رسول سے کہا کہ تم (وَصَلِّ عَلَیۡہِمۡ (9:103)۔ رسول بھی تو کچھ کام کرتا تھا' کچھ کیوں صاحب وہ تو ہر کام ایسا کرتا تھا کہ جو وجہِ ستائش ہوتا ہے۔ اب ان سب کے لیے تو رسول شاباش دے' رسول یہ کچھ کرے تو کون شاباش دے۔ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) او صدقے او جنے آ کمال کر وکھایا ای کیا بات ہے تیری۔ اور پھر یہ چیز نہیں کہ یہ مخصوص ہو گئی صرف رسول کی ذات کے لیے۔ جی نہیں!! محمد رسول اللہ والذین معہ قرآن نے کہا ہے۔ محمد ﷺ بھی انفرادی چیز نہیں ہے جماعت کے ساتھ ہے' سربراہ ہی سہی' جماعت کے ساتھ ہے۔ یہ جو پوری جماعت ہے ھُوَ الَّذِیۡ

یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ (33:43) او جماعتِ مؤمنین اللہ اور اس کے فرشتے تم پہ نچھاور کرتے ہیں مدح و ستائش کے پھول۔ یہ ہے صَلِّ علیھم۔ کیا چیزیں کہاں آ گئیں۔ اب یہ اتنا رہ گیا کہ درود شریف کا ورد کرو جی۔ بغیر سمجھے ہوئے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں **الھم صل علٰی محمد و علٰی ال محمد**۔ کبھی اس پہ گفتگو نہیں ہوتی کہ یہ بات کیا ہے صَلِّ عَلَیۡھِمۡ۔ سارا مسئلہ اس میں یہ ہے کہ آلِ محمد جو کہا گیا ہے یہ اس میں کیسے آ گیا۔ ایک طبقہ وہ ہے جو آل کے معنی رسول اللہ ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ کی اولاد قرار دیتا ہے' دوسرے نے کھینچا تو کہا کہ نہیں اس کے معنی پوری قوم ہے' آلِ محمد امت ہے۔ اس پہ بھی جی نہ بھرا انہوں نے زور دیا کہ نہیں اس سے مخصوص ہیں وہی اولاد حضرت علی کرم اللہ وجہہؓ کی حضرت فاطمہؓ کے بطن سے جن کو آپ آل کہتے ہیں یا سید کہتے ہیں۔ تو انہوں نے اتنا رکھا ان کا درود جو ہے وآلہ واصحابہ و ازواجہ' چل بھئی چل ہاں تو کتھے چلنا ایں۔ عزیزانِ من! یہ امت خرافات میں کھو گئی۔ ہزار برس سے اس پہ بحث ہو رہی ہے۔ ہزار برس سے کسی نے نہیں کہا کہ زبان سے صَلِّ علیہ بات کیا ہے صاحب۔ او یہ تو کسی عجیب و غریب کام کو دیکھ کے زبان سے بے ساختہ نکلنے والی بات کہ شاباش کیا کر کے دکھا دیا۔ یہ تھی چیز وہ تو۔ بات میں کہہ رہا تھا کہ (وَ صَلِّ عَلَیۡھِمۡ) (9:103)۔ کیوں یہ چیز کہو کیوں یہ حکم دیا؟ قرآن جو حکم دیتا ہے اس کے ساتھ حکمت بیان کرتا ہے اس کی The why of it کیوں یہ کرو۔ (اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمۡ) (9:103) تیری شاباش سے ان کو بڑا سکون ملتا ہے۔ اور کتنی بڑی قیمت ہے اس چیز کی۔ پتہ نہیں دینے والا تو شاید چند کوڑیاں ساتھ لایا ہوگا اور یہاں سے یہ متاعِ گراں بہا جو لے گیا ہے رسول کی شاباش اور سکینت قلب عزیزانِ من! دنیا میں کسی قیمت پہ یہ حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس دینے والے کی دین تو دیکھو کتنی بڑی چیزیں دیتا ہے۔

میں کہہ رہا تھا کہ صدقات کا لفظ بھی جو آیا ہے یہ اس معاشی نظام کا پہلا دور ہے جس میں ہنوز مملکت کی تشکیل نہیں ہوئی۔ لیکن جماعت کی تشکیل تو پہلے دن سے ہو گئی۔

خدا تعالیٰ اور جماعتِ مومنین کے مابین جو معاہدہ ترتیب پاتا ہے

پہلا اعلان رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا تھا (اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ) (6:163) میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اکیلا ہی نہیں مسلم رہونگا' انفرادی چیز نہیں ہے' یہ مسلمین ایک جماعت ہونی ہے۔ First Crystal اس کا میں بنا ہوں اور اس کے بعد اب جماعت بنے گی۔ جماعتی زندگی صدقات سے ہی شروع ہو گئی۔ اور آگے بڑھے۔ جو آنے والے تھے ان سے کہا کہ ایک معاہدہ اس میں' یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَ اَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ (9:111) یہ لکھ کے دینا ہوگا کہ میں نے اپنا مال اپنی جان بیچ دی تمہارے ہاتھوں۔ آگے بڑھتے گئے مملکت وسیع ہوتی گئی' ضروریات بڑھتی گئیں۔

فکرِ قرآنی کی روشنی میں رزق کے الفاظ جسمانی پرورش کے لیے استعمال کیے گئے ہیں، جب کہ انسانی ذات کے لیے نشوونما کے الفاظ آئے ہیں

عجیب چیز ہے یہاں مملکت وسیع ہوتی ہے تو خزانے بھرتے ہیں، ذمہ داریاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ مملکت وسیع ہوئی تو اتنے ہی صاحبِ احتیاج، اتنے ہی محتاج، نئے ضرورت مند ان کا اضافہ ہوا۔ اور جن کا اضافہ ہوا ان میں سے ہر ایک کی زکوٰۃ نشوونما کا سامان مہیا کرنا رزق مہیا کرنا۔ پھر میں عرض کرونگا دونوں چیزوں میں، رزق پرورش کے معنوں میں بھی آئے گا، زکوٰۃ نشوونما کے معنوں میں آئے گا۔ ان دونوں کا مہیا کرنا اس مملکت کے ذمہ تھا۔ کتنی ذمہ داریاں بڑھتی چلی گئیں۔ ذمہ داریاں بڑھتی چلی گئیں تو کہاں سے یہ پوری ہونگی۔ یہ لوٹنے والے تو تھے نہیں، نہ جوع الارض ان کے ہاں تھی، نہ لوٹنا تھا کہیں جا کے۔ یہ جو اپنے ہاں کی نیشنل ازم ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو لوٹو اور اپنی قوم کی پرورش کرو۔ وہاں وہ رب العلمین ہے اپنی قوم اور غیر قوم ہوتی نہیں ہے۔ انہوں نے تو کسی سے چھیننا نہیں تھا، دینا ہی تھا۔ کیا کرتے؟ یہی جو اپنی جماعت تھی۔

ذات انسانی کی نشوونما کے لیے نسخۂ کیمیا کی آخری سٹیج (قل العفو) ہے

اب اس کے بعد آخری سٹیج اس میں آئی کہ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ (2:219) یہ پوچھتے ہیں کہ صاحب اتنی محنت سے ہم سب جو کچھ کماتے ہیں تو اس میں سے کتنا دیدیں۔ کہا پوچھنے کی بات ہے؟ قُلِ الۡعَفۡوَ (2:219) جتنا ضرورت سے زائد ہے سارے کا سارا، رکھنا تم نے کاہے کے لیے ہے۔ یہ آخری سٹیج آ گئی۔ یہ سٹیج Gradually یہاں تک پہنچتی ہے۔ یہ ہے وہ سٹیج کہ ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام، جنہیں آپ فرائض کہتے ہیں مؤمنین کے۔ یہ اس کی استعداد کے مطابق ہر ایک کو کام سونپا ہوا اور ہر ایک کے رزق کی ذمہ داری ان کے اوپر To each according to his requirment۔ یہ ہے آخری سٹیج۔

تو یہ بہرحال پہلی سٹیج ہے جس میں صدقات کی صورت آتی ہے، قرآن میں جو دیا ہوا ہے۔ اب آپ کے ہاں زکوٰۃ جو ہے اس سلسلے میں اسی سورۃ توبہ کے اندر وہ آیت آئی تھی۔ بات تو وہ بار بار سامنے آتی ہے اُسے دہرانا ضروری ہے عزیزانِ من!۔ وَ الَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَ الۡفِضَّۃَ وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ (9:34) وہ سٹیج آ گئی آخری کہ جو لوگ اس طرح سے مال دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں صرف کرنے کے لیے کھلا نہیں رکھتے، انہیں عذابِ جہنم کی بشارت دیدو جس دن کہ یہ سکے تپائے جائیں گے جہنم کی آگ میں، داغا جائے گا ان کی پیشانیوں کو ان کے پہلوؤں کو ان کی پشت کو۔ اور کہا یہ جائے گا کہ ھٰذَا مَا

كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (9:35) یہ وہ جمع کیا ہوا ہے (صرف جمع کرنا نہیں منع کیا یہاں) وہ ہے کہ جو تم نے صرف اپنی ذات کے لیے مخصوص کر کے جمع کیا تھا۔ اب چکھو مزہ اس کا۔ تو یہاں تو آخری سٹیج ہے کہ جمع ہی نہیں کر سکتے۔ تو جب جمع ہی نہیں ہوتا تو مروجہ زکوٰۃ کی پہلی شق تو یوں ختم ہو گئی۔ وہ سال بھر ہوتا ہی نہیں' سال کی تو شرط تھی۔ میں آگے چل کے بتاؤں گا کہ پھر یہ شرط کیسے پوری ہو جاتی ہے۔ پہلے تو یہ چیز لیجئے پھر میں دہراؤں اس آیت کی تفسیر یعنی اتنی کھلی ہوئی یہ آیتیں ہیں کہ جمع ہی نہیں کر سکتے' دینا پڑتا ہے سب کچھ۔ پھر یہ چیز کہ جمع کیے جاؤ اس میں سے قُلِ الْعَفْوَ (2:219) والی بات نہیں ہے کہ سارا ضرورت سے زائد جو ہے وہ دیدو۔ اس میں سے اڑھائی پرسنٹ دو' تو ہو گا نا یہ کہ یہ کہاں سے آ گیا۔

مال جمع کرنے کے معاملہ میں ایک وضعی حدیث کا سہارا جو قابل صد افسوس ہے

آپ کو یاد ہو گا پھر دہرا دوں اس روایت کو جو احباب پہلی دفعہ آتے ہیں ان کے لیے بھی ضروری ہے' دوسروں کے لیے اعادہ ضروری ہوتا ہے۔ اس آیت کے مطابق جو جمع کرنے والے ہیں ان کو عذابِ جہنم کی بشارت دیدو' اس کی تفسیر میں آپ کے ہاں حدیث ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ میں بڑا اضطراب پیدا ہوا' سوچا کیا کریں۔ تصور سارا نظر آتا ہے کہ ایک ہیڈ آف دی سٹیٹ' ایک مستبد بادشاہ بیٹھا ہے' اس نے حکم بھیج دیا ہے۔ نہایت گراں گذر رہا ہے اور مشورہ ہو رہا ہے کہ کیا کریں اس کے متعلق' بات کہی تو کھا جائے گا حکم اس قسم کا دیدیا۔ وہ حضرتِ عمرؓ ان کو کہتے ہیں' اُنہوں نے کہا کہ میں جاتا ہوں۔ عزیزانِ من! سوچئے ہنسیے نہیں روئیے خون کے آنسو۔ ساری دنیا کے سامنے یہ آپ کی تفسیر جا رہی ہے حدیثوں کی رو سے رسول اللہ ﷺ کی تفسیر صحابہؓ کی تفسیر۔ کہا کہ میں جاتا ہوں' ٹھیک ہے جی جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ سے جا کے کہا کہ آپ نے یہ کیا حکم دیدیا آپ ﷺ کو پتہ ہے صحابہؓ پہ کتنا گراں گذرا ہے۔ یعنی انہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ حکم نہیں دیا کرتے یہ تو قرآن کا حکم ہے' خدا کی طرف سے وحی آتی ہے۔ جا کے پوچھ رہے ہیں۔ معاذ اللہ توبہ توبہ۔ ساری پارٹی چلی جائے گی Majority ٹوٹ جائے گی ووٹ نہیں ملیں گے' کوئی قانون ہی پاس نہیں ہو گا' سوچ تو لیا کرو کچھ حکم دیتے ہوئے۔ توبہ توبہ۔ یہ کیا کر دیا تمہیں پتہ ہے صحابہؓ کا ردِ عمل کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مسکرا کے کہ ان سے جا کے کہو کہ (جھلے او تہانوں پتہ ای نئیں ہیگا'' یہ تو خدا کا حکم ہے نا' اب میں بتاتا ہوں اس میں راستہ۔ خدا کا یہ حکم ہے میں بتاتا ہوں اس میں راستہ' ان سے جا کے کہو کہ سال بھر کے بعد جمع شدہ مال میں سے اگر اڑھائی پرسنٹ دیدیا جائے تو باقی سب شیرِ مادر کی طرح حلال وطیب ہے۔ یہ سنا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر او جشن مناؤ۔ ''رات نوں او ہناں نیں دیوے وی بالے ہون گے''۔ کیا بتایا جائے یہ اڑھائی پرسنٹ یوں ہوا۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں اقاموا الصلوٰۃ کی نوعیت اور ہماری تاریخی روایات کا ذکر

وہ اقاموا الصلوٰۃ کا تو آپ کو پتہ ہے کہ وہ کیسے پانچ ہوئی تھیں' پتہ ہے یا دہرا دوں؟ جی دہرا دیتا ہوں۔ معراج شریف میں حضورﷺ جب تشریف لے گئے تھے' بڑی لمبی چوڑی حدیث ہے۔ ایسی تمام حدیثیں صحاح کی کتابوں میں عام طور پہ ہوتی ہے۔ واپسی پہ یہ چیز ہوئی کہ جا رہے ہو تو کچھ تحفہ لیتے جاؤ۔ ٹھیک ہے محبوب کے ہاں سے آ رہے تھے۔ تحفہ لیتے جاؤ' کہ جی ارشاد' تحفہ تمہاری امت کے لیے ہے' بہت اچھا جی فرمائیے' تحفہ یہ ہے کہ ان سے جا کے کہو کہ پانچ سو نمازیں روز پڑھا کریں۔ معاذ اللہ۔ یہ حدیث شریف آپ کے ہاں کی ہے۔ آپﷺ تشریف لے آئے۔ یہ مختلف آسمانوں پہ بتایا گیا' فلاں آسمان پہ فلاں پیغمبر تھے' فلاں پہ فلاں تھے۔ جب نیچے آئے تو حضرتِ موسیٰؑ نے پوچھا کہ سناؤ آ رہے ہیں خیریت گذری کیا لائے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ تحفہ ملا ہے پانچ سو نمازیں' موسیٰ کہنےؑ لگے کہ آپ چپ کر کے اس کو لے آئے ہیں' کہنے لگے جی ہاں اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ تو حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ جاؤ پھر' آپﷺ پھر چلے گئے اور جا کے کہا جھکی ہوئی نظروں سے کہ یہ تو نہیں ہو سکے گا۔ کہنے لگے اچھا جاؤ آدھی معاف ہو گئیں ڈھائی سو رہ گئیں۔ پانچ سو لے کے آپﷺ آ گئے۔ کہنےؑ لگے او ڈھائی سو بھی نہیں پڑھی جائے گی۔ پھر چلے گئے پھر گئے سوا سو رہ گئیں۔ پھر آ گئے پھر آ کے اُنہوںؑ نے کہا پھر چلے گئے پھر آدھی رہ گئیں۔ پھر اس طرح سے بالآخر پانچ پہ آ گئے اور موسیٰؑ سے کہا کہ کیوں بھئی یہ پانچ انہوں نے کہی ہیں۔ موسیٰ نے جواباً کہا کہ پانچ بھی نہیں پڑھی جائیں گی آپﷺ نے کہا کہ اب تو مجھے شرم آتی ہے۔ اور لے آئے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہودی بیٹھا ہوا' روایت کو گھڑ رہا ہے۔ اس میں آپ دیکھتے ہیں حضرتِ موسیٰؑ کا مقام کیا بتا رہا ہے اور رسول اللہﷺ کا مقام کیا بتا رہا ہے اور قرآن کے خدا کا کیا مقام بتا رہا ہے۔ نظر آ رہا ہے کہ کتنی بڑی سازش ہے جو ہو رہی ہے۔ اور یہودی آج یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرتِ موسیٰؑ نے جو کہا تھا کہ پانچ بھی نہیں پڑھی جائیں گی دیکھتے ہو وہ سچی بات نکلی یہ جو نہیں پڑھ رہے ہیں نا مسلمان نماز۔ ''دو چار پھیرے ہور کر لیندے او اک رہ جاندی''۔ میں کہہ رہا ہوں عزیزانِ من! کہ اب سر پیٹا جائے۔ یہ تو ہوا اقامتِ صلوٰۃ یہ یوں ہوئی پانچ۔ اور اگر کبھی میں نے بتایا کہ ''ایہہ رکعتاں کیوں بنیاں ہیگیاں تے فیر پوچھونا کی ہوئے گا''، لیکن یہ کنونشن کی رات کو بتاؤں گا۔

مال و دولت کے سلسلہ میں حکم خداوندی اور نبی اکرم کی طرف سے پیش کردہ تفسیر میں باہمی تضاد

یہ ہوئی آپ کے ہاں اقامتِ صلوٰۃ اور یہ ہوا ایتائے زکوٰۃ کہ خدا کا وہ حکم کہ مال جمع کرنے والوں کو کہہ دو کہ جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور رسول اللہﷺ کی تفسیر یہ ہو گئی کہ ان سے کہہ دو کہ جتنا جی چاہے جمع کرو بس اڑھائی پرسنٹ اس میں سے نکال دیا کرو سال کے بعد۔ اب شرط اس میں یہ تھی کہ سال بھر وہ مال رہنا چاہیے۔ وہ تھا قرآن' یہ ہوئی حدیث کی رو سے تفسیر۔

جمع شدہ مال کو پاک کرنے کے سلسلہ میں کتاب الحیل کا بیان کردہ طریقہ

آگے آ گئے ہمارے فقہا' ایک بہت بڑے امام کی یہ چیز ہے۔فقہ کی کتابوں کے آخر میں ہوتا ہے ایک کتاب الحیل یعنی جو قانون یا احکام دیے ہوئے ہیں اس سے بچ کے نکلنے کی شکل کیا ہے۔ زکوٰۃ کے مال کے اوپر جو شرط ہے کہ سال بھر رہنا چاہیے تو وہ امام صاحب ہمارے بہت بڑے فقیہہ وہ کرتے یہ تھے کہ گیارہ مہینے تک مال اپنے پاس رکھتے تھے اور گیارہ مہینے کے بعد وہ مال بیوی کے نام ھبہ کر دیتے تھے سال بھرا اپنے پاس بھی نہ رہا اور اس کے پاس تو ابھی ایک ہی مہینہ ہوا ہے۔ وہ گیارہ مہینے اپنے پاس رکھتی تھی اور اس کے بعد خاوند کے نام ھبہ کر دیتی تھی۔''تے ساری عمرا یویں ای جُل دیندے رہے کہ لے لے کی لیناایں''۔(**یستھزء ون باللہ**) بات یہاں سے شروع ہوئی۔ یہ بنی آپ کے ہاں زکوٰۃ۔

زکوٰۃ کے سلسلہ میں مقرر کردہ نصاب کی شکل وصورت

اور وہ جو میں بتایا کرتا ہوں کہ مرے کو مارے شاہ مدار' اُس میں بھی جو نصاب آپ کے ہاں مقرر ہوا تو اس میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ روایت ہے پھر یہ جتنے کیپٹلسٹ ہیں ان کی روایت۔ یعنی چاندی اگر باون تولے ہو تو اس پہ تو زکوٰۃ ہے اور سونا سات تولے ہو اس پہ زکوٰۃ۔ چاندی کے تو عام طور پہ غریبوں کے ہاں زیور وغیرہ ہوتے ہیں۔ باون تولے کے اوپر اگر آج کے حساب سے بھی لے لیا جائے تو یہ غریب کے پاس ڈیڑھ سو روپے کی بھی چاندی ہو تو اس پہ تو زکوٰۃ ہوئی۔ اور امیر آدمی کے پاس سونا سات تولے اگر ہو تو آج غالباً تین سو روپے تولہ کے قریب ہے تو دو ہزار ہو گیا۔ یعنی غریب تو ڈیڑھ سو پہ ہی مارا گیا اور اُس کو دو ہزار تک کی چھوٹ ہے۔ اور جب آگے بڑھے ان کے ہاں تو اونٹ وغیرہ ہوتے تھے' اُن کو اگر آپ دیکھیے تو دس دس ہزار تک چھوٹ ہی چھوٹ چلی جاتی ہے۔ یہ ہے وہ نصاب مقرر کیا ہوا۔ اب آگے بات آئی۔

کیا زکوٰۃ کے مصارف قرآن حکیم میں کہیں موجود بھی ہیں؟ ایک اہم سوال

آپ کے ہاں مصارف الزکوٰۃ مشہور ہیں' وہ کہتے ہیں قرآن شریف میں بھی یہی ہے۔ کوئی بتائے تو سہی کونسے قرآن شریف میں ہے' کہنے لگے یہی جو تمہارے سامنے ہے یہی سورۃ توبہ یہی آیت جو آج تم پڑھ رہے ہو۔ کہاں ہے؟ کہنے لگے لکھا ہوا ہے **اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَالۡعٰمِلِیۡنَ عَلَیۡہَا وَ الۡمُؤَلَّفَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ وَ فِی الرِّقَابِ وَ الۡغٰرِمِیۡنَ وَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ فَرِیۡضَۃً مِّنَ اللّٰہِ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ** (9:60) مصارفِ زکوٰۃ۔ کہا یہاں تو صدقات لکھا ہوا ہے' کہنے لگے ''جی تسی زکوٰۃ ہی

سمجھو'۔ او بابا قرآنِ کریم میں زکوٰۃ کا لفظ الگ ہے وہ بیسیوں مقام پہ آیا ہے' صدقات کے لفظ الگ آئے ہیں' ان صدقات کو کیسے سمجھیں۔ ''اسی جو کینے ہیگے آں سمجھو''۔ ٹھیک ہے۔ یہ مصارفِ زکوٰۃ ہیں۔ زکوٰۃ کو پہلے وہ متعین کیا۔ دیکھئے کہاں سے بات چلتی ہے۔ ایک بنیادی اینٹ غلط رکھئے تو آسمان تک دیوار ٹیڑھی چلی جاتی ہے۔ وہ زکوٰۃ کے معنی لیے پھر سال بھر مال جمع رکھا اس میں سے اڑھائی پرسنٹ نکالا۔ پھر نکالنے کے بعد اس کے لیے کیا کریں' مصارف اس کے متعین کرنے تھے۔ یعنی نصاب مقدار وہ تو قرآن نے نہیں متعین کی' مصارف اس نے متعین کر دیئے' وہ کہاں ہیں' وہ یہ ہیں' صاحب صدقات لکھا ہے' کہتے ہیں زکوٰۃ ہی سمجھو۔ یہ ہے عزیزانِ من! جس طرح سے آپ کے اس قرآن کی تفسیر ہوتی ہے اور اس پہ پھر عمل ہو رہا ہے۔

قبیلہٗ اشعر کی ایک روش کے پیشِ نظر نبی اکرم ﷺ کا ارشاد

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ وہ ابتدائی دور ہے جس میں ہنوز مملکت کی تشکیل نہیں ہوئی' اس جماعت کے ابتدائی دور کی بھی یہ کیفیت تھی' صحیح حدیثیں تو چمکتے ہوئے جواہروں کی طرح سامنے آجاتی ہیں۔ وہ جو ایک حدیث ہے ابو موسیٰ اشعریؓ کی۔ کہ انہوں نے کہا کہ قبیلہٗ اشعر کی یہ روش تھی کہ جب ان کے ہاں جنگ کی وجہ سے یا کسی اور افتاد کی وجہ سے سامانِ خورونوش کی کمی آجاتی تو پھر قبیلے کے سارے افراد اپنے ہاں سے جو کچھ کسی کے پاس ہوتا لا کے اکٹھا کر لیتے ایک دسترخوان پہ اور سارے مل کے کھاتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں بھی اشعریوں میں سے ہوں۔ تو نظر آتا ہے کہ ابتدائی دور کی یہ کیفیت تھی۔ جتنا تھا' مل بانٹ کے کھا لیتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کے دورِ اول میں صدقات کی پوزیشن اور ان کی تقسیم کا طریقۂ کار

یہ صدقات اسی طرح جماعتی زندگی میں مرکز کے پاس آتے تھے اور ان کے متعلق کہا کہ اس طرح سے اپنی ضروریات کو پورا کرو۔ زکوٰۃ تو پوری نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے سامان مہیا کرنا ہے۔ اب یہ جو اتنے سے صدقات آ رہے ہیں ان سے تو وہ بلند و بالا اور وسیع اور طویل فریضہ ادا نہیں ہو سکتا اس سے تو فقط بنیادی ضروریات ہی پوری ہوتی ہیں۔ اب یہ دیکھئے اس کے لیے ضروریات کی چیز بتا دی۔ الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ (9:60) پہلی چیز تو یہ ہے۔

لفظ فقیر کا لغوی اور قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! ایک تو لسانِ عربی مبین اور پھر قرآن کا انتخاب۔ فقیر۔ اب ہمارے ہاں تو فقیر کا لفظ آپ کو پتہ ہی ہے فقیر فقرے۔ عربی زبان تو اتنی وسیع ہے کہ احتیاج کے متعلق بھی اگر آپ لائیں تو سینکڑوں الفاظ اس میں ملیں گے' اس میں اتنی ہے۔ اعجازِ قرآن کا یہ ہے کہ اس میں سے وہ ایک لفظ چنتا ہے۔ پرورش کا سامان ملنا ہے۔ یہ جو درخت بڑے ہو جاتے ہیں' پانی کی ضرورت تو ہر جاندار شے کو

سب سے پہلے ہے' دارومدار اس پہ ہوتا ہے۔ بڑا درخت جو ہو جاتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس بڑے درخت کو پانی نہیں دیا جاتا لیکن وہ سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ یہ کیسے رہتا ہے؟ اس کی جڑیں دور دور تک پھیل جاتی ہیں وہ دور دور سے خود اپنے لیے سامانِ نشو ونما جذب کرتا ہے۔ اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ اگر خوراک اس کے پاؤں کے پاس نہیں دور ہے تو بھی وہاں سے لا سکتا ہے۔ اکتسابِ رزق کی اس میں استطاعت بڑی ہوتی ہے۔ یوں آئی یہ ٹرم پھر' اس کے ہاتھ پاؤں بڑے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں وہ لے آتا ہے۔ مگر ننھا سا پودا آپ لگاتے ہیں آپ کو پتہ ہے اس کو دوسرے چوتھے دن پانی دینا پڑتا ہے۔ ورنہ وہ سوکھ جاتا ہے۔ یہ دونوں میں کیا فرق ہے۔ اس لیے کہ اس میں ابھی اتنی استعداد اور سکت نہیں کہ دور پڑے ہوئے رزق کو کھینچ کے لے آئے۔ اکتسابِ رزق کی اس میں یہ استعداد و صلاحیت نہیں ہے۔ اس کو اس طرح سے دینا پڑتا ہے پانی اور اس پانی دینے کے لیے طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پیڑ کے باہر ایک کھال سا بنا دیتے ہیں چھوٹا سا گڑھا اس میں ڈال دیتے ہیں تاکہ رزق خود اس تک پہنچ جائے کیونکہ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ دور سے اس کو کھینچ کے لے آئے۔ یہ جو چیز ہوتی ہے اسے فقیر کہتے ہیں۔

ہر پیدا ہونے والا بچہ فقیر ہوتا ہے

عربی زبان کے اندر۔ وہ پودا جو اپنی پرورش کے لیے اس قسم کے پانی کا محتاج ہو۔ وہ ہے فقیر۔ ہر نومولود پہلے فقیر ہوتا ہے اس میں ہمت ہی نہیں ہوتی۔ یعنی چار انچ اگر اس کا فیڈر پڑا ہوا ہو وہ بلک بلک کے بھوک سے مر جائے گا' وہاں تک ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔ یہ فقیر ہے۔ وہ فیڈر اس کے ہاتھ تک لانا پڑے گا آپ کو۔ یہ پہلی چیز پودوں کی اس قسم کی احتیاج' کہا پہلا حق ان صدقات کے اوپر ایسے لوگوں کا ہے۔ اب یہ جو احتیاج ہے' یہ احتیاج ٹھیک ہے طبعی زندگی کی احتیاج سب سے مقدم ہوتی ہے۔ ضروری ہے کھانے پینے کی چیزیں بھی مہیا ہوں۔ لیکن انسانیت کی زندگی کے لیے بھی ایک نشو ونما کی ضرورت ہے' جسے راہنمائی کہتے ہیں۔ دیکھئے کن مقام میں یہ چیزیں آتی ہیں۔

نبوت سے پہلے حضرت موسیٰ کی طرف سے مدین کی سرزمین پر پانی کے ایک چشمہ کو استبدادی قوت سے آزاد کرنے کے ایک اہم واقعہ کی تفصیل

حضرتِ موسیٰؑ مصر کے محلات سے بھاگ کر کہ وہاں استبداد تھا' ظلم تھا مدین کے پیاؤ پہ گئے ہیں۔ تھکے ہوئے تھے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے دیکھا کہ ایک چشمہ ہے وہاں گاؤں کے مویشی آ رہے ہیں پانی پینے کے لیے۔ مویشی اور بھیڑیں آتی ہیں آگے بڑھتی ہیں پانی پیتی ہیں چلی جاتی ہیں۔ دو لڑکیاں ہیں ان کی بھیڑوں کی کیفیت' قرآن نے ایسا نقشہ کھینچا ہے عزیزانِ من! کہ بھیڑیں بھاگ کے

پانی کی طرف جانا چاہتی ہیں وہ ان کو روک رہی ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ پانی بھی ہے بھیڑوں کو پیاس بھی اتنی ہے' یہ لائی بھی ان کو پانی پلانے کے لیے ہیں' یہ روک کیوں رہی ہیں۔ ان سے کہا کہ کیا بات ہے تم یہ کیا کرتی ہو۔ کہنے لگیں کہ یہ گاؤں کے طاقتور لوگ ہیں' ہمارے گھر میں کوئی جوان آدمی نہیں ہے جوان کا مقابلہ کرے۔ ایک باپ ہے بوڑھا ہے ہم دو بچیاں ہیں کمزور ہیں اس لیے جب تک ان کے مویشی پی کے نہ چلے جائیں ہمارے مویشی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ آپؑ نے کہا کہ بہر زمین کہ رفتم آسماں پیدا است' وہاں سے بھاگا تھا کہ استبدادِ فرعونی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا یہاں آیا تو یہاں وہی چیز دوسرے رنگ کے اندر نظر آ رہی ہے کہ کمزور اپنی بھیڑوں کو خدا کا پانی نہیں پلا سکتا جب تک زور آور اپنی بھیڑوں کو سیر ہو کے پانی نہ دے جائیں۔ کہاں ان کی ایسی کی تیسی۔ اٹھے' ابھی نبوت نہیں آئی وہ تو بعد میں آنی ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں یہ قرآن نے کہا تھا کہ موسیٰؑ یونہی تمہیں نبوت نہیں مل گئی تھی کہ آگ لینے کو آئیں پیامبری مل جائے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ تمہارے اندر کیا کیا صلاحیتیں موجود ہیں۔ اُٹھے اور اٹھ کے ان سے کہا کہ ہٹ جاؤ ایک طرف' لاؤ ان بھیڑوں کو۔ خود طاقتور اور توانا تھے لائے اور لا کر بھیڑوں کو پورا پانی پلایا۔ ان کو گھر بھیج دیا اور پھر آ کر بیٹھے اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

استبدادی نظام کے خلاف حضرت موسیٰؑ کی حساس خیالی

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ (28:24) انہیں پانی پلایا اور پھر سایے میں آ کے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اب آگے راستہ کیا ہے کیا کیا جائے کہ یہ استبداد مٹے دنیا سے۔ مصر کی طرف نہیں جا سکتا کہ اس زیادہ شدت سے فرعونیت ہے وہاں' ادھر آیا ہوں تو یہاں ایک ایک گاؤں کے اندر استبداد کا نظام ہے۔ یا اللہ کیا کروں۔ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (28:24) میری سمجھ میں تو نہیں کچھ آ رہا میں کیا کروں' میری استعداد کا ہاتھ آگے نہیں اس سے جا سکتا۔ اتنا ہی تھا کہ انفرادی طور پہ ان کی بھیڑوں کو میں نے پانی پلا دیا۔ اس سے زیادہ کیا کروں میں' ان گاؤں والوں کو روک سکتا ہوں نہ فرعون کو روک سکتا ہوں' اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے۔

وحی کی روشنی کے بغیر نوعِ انسانی کا ہر فرد خدا کا فقیر ہے جس کا اظہار حضرت موسیٰؑ نے کیا تھا

یہ ہے وہ چیز۔ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (28:24)۔ اس اعتبار سے یہ جو مقام ہے راہنمائی خداوندی کا اس میں تو جو شکم سیر ہے' وہ بھی محتاج ہے' خالی پیٹ والا بھی محتاج ہے۔ یہ پیٹ سے اگلی منزل آ گئی اور یہی وہ منزل ہے جس کے لیے کہ قرآن نے کہا کہ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ (35:15) تم سب فقیر ہو خدا کے' جو چیز وہاں سے ملنے والی ہے اس کو تم اپنے ہاتھ سے وہاں سے نہیں کھینچ سکتے' فکرِ انسانی کی دسترس سے وہ باہر ہے۔ دیکھا فقیر کہاں آیا ہے یہ۔ موجود ہے وہ سامانِ نشو و نما' تمہاری فکر کی

دسترس سے باہر ہے‘ وہ خدا کی طرف سے جوئے رواں کی طرح ملے گا تمہیں‘ پھر پیاس بجھے گی۔ اصل بات یہ ہے۔ اور وہ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (35:15) پوری نوعِ انسانی انتم الفقرآء وہ بڑے بڑے دولت مند بھی سب‘ اس میں تو دولت کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہاں حضرتِ موسیٰ روٹی نہیں مانگ رہے تھے‘ یہ مانگ رہے تھے کہ اس کا علاج کیا ہوگا‘ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس مقام کے اوپر ہر انسان محتاج ہوتا ہے وحیِ خداوندی کا اس اعتبار سے وہ فقیر ہوتا ہے خدا کا۔ وہ غنی ہوتا ہے۔

ذاتِ خداوندی غنی ہے حمید ہے

لیکن ایک تو غنی ہونا اس قسم کا ہے کہ ساری دنیا آج ان بائیس والوں کو گالیاں دے رہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک اس طرح کا غنی۔ ایک وہ غنی الحمید ایسا غنی کہ سب تعریفیں ہی کریں۔ وہ غنی مال دار نہیں ہوتا‘ وہ غنی مستغنی ہوتا ہے للچائی ہوئی نظریں نہیں اس کی ہوتیں وہ حمید ہوتا ہے۔

مسکین کا لغوی مفہوم

پہلی چیز للفقرآء ہے۔ ان کی ضروریات کے لیے۔ یہ تو وہ ہیں نا کہ جن کی استعداد ہی نہیں ہے‘ پودا ہے بڑھا ہی نہیں ہے۔ وَالْمَسٰكِیْنِ (9:60) مساکین کے لیے۔ عربی لغت میں جس شے میں حرکت نہ ہو اس میں جمود ہوتا ہے‘ وہ جامد ہوتی ہے۔ لیکن جمود میں اور سکون میں ان کے ہاں فرق ہوتا ہے۔ جامد وہ ہوتی ہے جو پہلے حرکت میں نہیں تھی وہ جامد ہی ہوتی ہے‘ ساکن وہ ہوتی ہے جو حرکت میں ہونے کے بعد کہیں کھڑی ہوگئی ہو۔ ایسی صورت پیدا ہوگئی ہو کہ ان کی حرکت دورانی جو ہے وہ مبدل بجمود کر دی جائے۔ ظاہراً طور کے اوپر تو یہی ہے کہ پابندِ سلاسل کر دیا جائے‘ بیڑیاں ڈال دی جائے‘ ہتھکڑیاں ڈال دی جائیں۔ نہیں! اور بہت سے اس کے لیے طریقے ہیں مسکین بنانے کے لیے۔

دروسِ قرآن کا یہ دوسرا دور 5 سال کی طوالت کے بعد ابھی دسویں پارے کی منزل تک ہی پہنچا ہے لیکن اصل بات تو قرآن حکیم کو سمجھنے کی ہے شبینہ کروانے کی نہیں

عزیزانِ من! کیا عرض کروں وقت تھوڑا ہوتا ہے اور ویسے بھی میرا خیال ہے پانچ سال تو ہوگئے یہ دوسرا دور شروع کیے ہوئے‘ دسویں پارے تک ہی ہم پہنچے ہیں۔ لیکن یہ بھی کیا ضروری ہے ہم نے کوئی شبینہ کرنا ہے کہ ”ضروررات رات اچ مکاونا ای ہیگا اوہدے بعد“۔ ٹھیک ہے قرآن کی تو ایک آیت کے اوپر بھی اگر ہمیں سال بھر لگ جائے تو وہ بھی کوئی بات نہیں۔ بات سمجھ میں آنی چاہیے۔

لفظ مسکین کی وضاحت کے علاوہ حضرت موسیٰ اور حضرتِ خضرؑ کے قصہ کی حقیقت

دیکھئے کہ قرآن کیسے سمجھاتا ہے۔ مسکین کس مقام پہ آ کے اس نے کہا۔ حضرتِ موسیٰؑ کا وہ قصہ کہ وہاں جا کے شاعروں سے ملے اصطلاح میں جنہیں حضرتِ خضرؑ کہتے ہیں۔ فریضہ کیا ہے جی' راہنمائی کرتے ہیں۔ پتہ ہے شاعر کیا کہتا ہے' وہ کہتا ہے

یہ سب سے منہ چھپانا کوئی اچھی زندگانی ہے

خضر تم نے تو غارت کر کے عمرِ جاوداں رکھ دی

قرآن میں کہیں خضر نہیں آیا' سب افسانے ہیں۔ درحقیقت یہ جن کے پاس گئے تھے' اس نے یہ کیا تھا کہ اس کشتی میں سوار ہو گئے تھے ان کو دیکھ کے کہ ان کے پاس پیسے نہیں ہیں' ویسے ہی بٹھا لیا تھا اور انہوں نے پھر ان کی کشتی میں ایک تختہ توڑ دیا تھا' عیب دار بنا دی تھی۔ تو اس کے بعد آپ نے پوچھا تھا' بات لمبی ہے سورۃ کہف میں اس کی تفصیل آئے گی' بڑی بصیرت افروز تفصیل آئے گی۔ تو انہوں نے پوچھا کہ وہ کیا بات تھی کہ اس کو تم نے توڑ دیا۔ کہنے لگے بات یہ تھی وَالْمَسٰكِيْنِ (9:60) میں لفظ مسکین کے متعلق آ رہا ہوں' کشتی بان ہیں کشتی تو رواں دواں رہتی ہے' حرکت والے کی حرکت کو مبدل بسکون کر دینا' ایسے انتظام کر دینا رکاوٹیں ڈال دینا کہ وہ متحرک نہ رہے' ساکن ہو جائے۔ بہترین مثال کشتی کی تھی۔ کہا کہ السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ (18:79) کشتی بان تھے وہ سمندر میں کشتی چلاتے تھے۔ میں نے اس میں ایک Defect پیدا کر دیا۔ وہ اس لیے وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ (18:79)۔

لفظ مسکین اور فقیر کے مفہوم میں پائے جانے والے فرق کی نوعیت

مستبد بادشاہ تھا' وہ کشتیوں کو ظلم کے اعتبار سے بیگار میں پکڑ کے لے جانا چاہتا تھا' رواں دواں کشتی والوں کی کشتی پکڑ کر لے جائے تو یہ مسکین ہو جاتے ہیں۔ کیا بات ہے اس زبان کی بھی۔ پھر وہ کشتی مل جائے' ان کو سامان مل جائے یہ مسکین نہیں رہتے۔ اب دیکھا آپ نے فقیر میں اور مسکین میں فرق کیا ہے۔ اس میں تو ہنوز اتنی حرکت ہوتی نہیں کہ وہ چیز کو جا کے پکڑ لے۔ وہ ہے کہ جس کے اندر یہ حرکت وغیرہ تو ہے لیکن ایسے اس قسم کے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ ان کا چلتا ہوا کاروبار بند ہو جائے' ان کی آزادی سلب ہو جائے ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں۔

صدقات تو انفرادی طور پر دینے کی بجائے مرکز میں اکٹھے کیے جاتے تھے

عزیزانِ من! جس نظام میں انسانیت کے راستے کے اندر کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے' ابلیسی نظام ہے اس کو خدا کا نظام نہیں کہہ سکتے۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں نوعِ انسانی اور افراد کو مسکین بنا دیتا ہے۔ کوئی کہیں جا کے مسکین بن جاتا ہے' کوئی کہیں جا کے مسکین بن جاتا ہے۔ مساکین۔ اور پھر میں نے عرض کیا تھا کہ یہ انفرادی چیز نہیں ہے۔ یہ صدقات بھی اکٹھے کرنے تھے۔ وَالْعٰمِلِيْنَ (9:60) یہ لوگ جو اس کام کے اوپر مامور ہیں کہ وہ ان چیزوں کو اکٹھا کریں' کوئی یہ نہ کہدے کہ صاحب یہ دیکھئے اکٹھا کرتے ہیں' آپ ہی کھا جاتے ہیں۔ قرآن نے خود Provision دیدی کہ یہ کہاں سے کھائیں گے۔ یہ کوئی چیز قابلِ طعن اور قابلِ اعتراض نہیں ہے کہ وہ اکٹھا کرنے والے جو اپنا سارا وقت اس کے لیے دیدیتے ہیں' ان کی روٹی کا بھی تو کچھ سامان ہوگا۔ یہ بتا دیا کہ جو اس قسم کے فرائض کو سرانجام دیں گے ان کے لیے اس میں سے اپنے لیے کچھ لے لینا' یہ کوئی اعتراض کے قابل بات نہیں ہے۔

تالیف قلب کے اس بنیادی مفہوم کے برعکس مودودی صاحب اس وقت وہ حیات تھے؟ کے نزدیک طلوع اسلام کے دفتر سے پتے حاصل کرنے کا طریق

وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ (9:60) بڑی عجیب ٹرم ہے تالیفِ قلب جسے کہتے ہیں۔ تالیفِ قلب کے معنی۔ ایک واقعہ سے سمجھ میں آجائیں گے۔ 1958ء کی بات ہے' جماعتِ اسلامی کے کچھ بڑے ہی برگزیدہ لوگ ان سے الگ ہوئے ان میں ایک شخص عبدالرحیم اشرف صاحب حکیم ہیں لائلپور (فیصل آباد) ''المنبر'' ان کا رسالہ نکلتا ہے۔ اُس زمانے میں اس کا نام المنیر تھا۔ وہ ان کی جماعت کے بڑے ہی ممتاز لوگوں میں سے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اور یہ حکیم عبدالرحیم اشرف' اُنہوں نے یہ لکھا تھا کہ ہم اس جماعت سے کیوں الگ ہوئے۔ عبدالرحیم نے اپنے اس اخبار میں واقعہ نقل کیا تھا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ملتان میں اس زمانے میں جیل میں نظر بند تھے۔ وہ کہنے لگے کہ میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو ان سے باتیں کر رہا تھا۔ طلوعِ اسلام ان کے اعصاب پہ سوار تھا۔ اُنہوں نے لکھا کہ میں نے مولانا سے کہا کہ صاحب فرمایئے تو جواباً مولانا نے فرمایا اُنہوں نے کہا کہ کرنے کا کام یہ ہے' یہ الفاظ ہیں اس کے' میں نے اس لیے یہاں کہا کہ مؤلفۃ قلوب کے جو معنی اب لیے جاتے ہیں' واضح ہو جائیں۔ انہوں نے یہ مجھ سے فرمایا کہ جاؤ طلوعِ اسلام کے دفتر میں کسی کلرک کی تالیفِ قلب کر کے اس کے پتے چوری چوری حاصل کرو۔ یہ ہے سب سے بڑا ثواب کا کام اس وقت کرنے کا' طلوعِ اسلام کے دفتر میں کسی کلرک کی تالیفِ قلب۔ قرآن کے الفاظ کے استعمال عزیزانِ من!۔ اب آپ نے سمجھا

تالیفِ قلب کیا ہوئی۔ تو آج تو یہ چیز پھر عام ہوئی نا یہ کہ انہوں نے جا کے حکم دیا تھا کہ جاؤ تالیفِ قلب کرواور وہاں سے پتے چوری چوری حاصل کرو' پھر آگے بتاؤ نگا کہ ان پتوں کے اوپر کیا کیا چیزیں ہم نے بھیجنی ہیں۔ تالیفِ قلب۔ اور اسی لیے اس کے معنی یہ کرتے ہیں یہ لوگ کہ اسلام کی تبلیغ میں ایک بات اور بھی ہے کہ اگر کسی طرح سے نہ مانے تو روپے پیسے کا لالچ دے کے ہی مسلمان کرلو نہیں۔ اس کے یہ معنی لیے جاتے ہیں۔

مکے کے مستبد نظام کی شکل وصورت' پھر تقسیم سے پہلے مہاجنوں کا کردار' پٹھان کے قرضے اور غلاموں کی کٹھن زندگی

مکے کی ابتدائی زندگی جو تھی آپ غور کیجئے کہ کس قدر مستبد وہاں کا نظام قریش کا تھا۔ بہت سے ایسے لوگ تھے اس پر تو آمادہ تھے کہ ان کے نظام سے نکل آئیں لیکن بے شمار قسم کی پابندیاں ان پہ عائد ہوگئی ہوئی تھیں۔ خاص طور پہ یہ غلام مزدور جو تھے ان کو تو جکڑ رکھا تھا اُنہوں نے قرضے دے دے کے ہی۔ ہمارے ہاں گاؤں کا تو مہاجن تو اب چلا گیا ہے' تقسیم سے پہلے گاؤں کے جتنے زمیندار کہلاتے تھے کاشتکار بھی نہیں' یہ مہاجنوں کی رسیوں میں جکڑے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کی بیٹیوں کی شادیوں کے رشتے جو مہاجن کیا کرتے تھے۔ میں ان گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ وہ گاؤں چھوڑ کے نہیں جا سکتے تھے جب جاتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ پہلے قرضہ ادا کرو پھر چھوڑتے ہیں۔ اور یہ پٹھان کے قرضے کا تو آپ کو پتہ ہے وہ جو چوراہے میں کھڑا ہوتا ہے۔ اب یہ جو شخص اتنی مجبوری کے عالم میں ہے' دل سے وہ رضا مند ہے کہ استبداد سے نکل آئے۔ پابندی اس کے اوپر اس قسم کی کوئی عائد ہوئی ہوئی ہے کہ وہ اس سے نکل ہی نہیں سکتا بیچارہ۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ ان کے دل تو تمہارے ساتھ بندھے ہوئے ہیں ان کی عائد کردہ مجبوری کی بناء پہ بیچارے اس قسم کے دن بسر کر رہے ہیں۔ ان کی مدد کرو۔ آگے ہی تو اس کی تشریح کی ہے۔ وَ فِی الرِّقَابِ (9:60) یہ کن کے لیے ہے۔ بڑی اہم چیز یہ آئی۔ اس کا ترجمہ آپ جہاں جی چاہے دیکھ لیجیے یہی کریں گے کہ غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے۔ یعنی ان کے قول کے مطابق زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مصرف قرآن نے یہ بتایا ہے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے۔ ابتدائی دور میں ہے یہ آپ کے ہاں کا جماعتی نظام بھی' وہ پتہ نہیں کس طرح سے ان بیچاروں کو قطرہ قطرہ کر کے چار پیسے صدقات میں سے کہیں ملتے ہیں اور اس میں یہ ایک مصرف بتایا گیا ہے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے۔ اُس زمانے میں غلاموں کے ساتھ بھی یہ ان کی شرط ہوتی تھی کہ اتنے روپے دیدو تو پروانۂ آزادی تمہیں دیدیں گے۔ قرآن نے یہ چیز ابتدائی دور میں جب ابھی اپنے ہاں کھانے کو بھی نہیں ہے کہا کہ غلاموں کی رسیاں ان کے گلے سے اتارنے کے لیے بھی یہ ہے۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ زندگی بخش نظامِ حیات کے خدوخال اوران کا طریق

عزیزانِ من! سارے قرآن میں آپ دیکھیں گے ایک جگہ نہیں ہے' مختلف مقامات پر یہ چیز آئی ہے کہ تم سے اگر کوئی جرم سرزد ہوجائے کوئی ایسی ملامت کی چیز ہوجائے' اس کے فدیہ میں غلام آزاد کرو اس کے معاملے میں غلام آزاد کرو۔ سارے قرآن کے اندر غلام آزاد کرو' غلام آزاد کرو کا حکم ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں ہے غلام بناؤ کسی کو۔ جو بنے ہوئے تھے ان کو آزاد کرنے کے لیے یہاں تک احکام مل رہے ہیں کہ یہ چار پیسے صدقے کے جمع ہو رہے ہیں کہا ہے کہ بابا کسی غلام کو جاکے آزاد کرو۔

غلام اور لونڈیوں کے متعلق ہمارے ہاں اسلام کا پیش کردہ نظام زندگی اور اصول حیات کی ایک جھلک

جس قرآن کی یہ تعلیم ہے اس قرآن کی رو سے اب یہ وہی قرآن کی حامل مسلمان قوم آج تک کہتی ہے کہ اسلام میں غلام اور لونڈیوں کی اجازت ہے۔ غلام بنانے یا جو بنے ہوئے تھے ان کو آزاد کرانے کا قرآن نے کہا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ کس طرح یہ قوم قرآن سے دور ہوئی۔ کس طرح تو ان سے پوچھو۔ میں پوچھتا یہ ہوں سارے قرآن میں کہیں یہ ہے لکھا ہوا؟ ایک ہی شق تھی نا جنگی قیدیوں کی۔ آج بھی یہ آپ کے مفسرِ اعظم مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ جنگ میں دشمن کی جو عورتیں تمہارے قابو میں آئیں ان کو سپاہیوں میں بانٹ دو لونڈیاں بنانے کے لیے' وہ ان سے جنسی تمتع بھی کریں' دوستوں کو تحفہ میں دیدیں' بازار میں کھڑے کر کے نیلام کردیں۔ ستیاناس۔ جتنا نقصان ان لوگوں نے اسلام کو پہنچایا ہے یہ تو کوئی بہت بڑی سازش نظر آرہی ہے مجھے۔ میں نے عرض کیا ہے جس قرآن میں جنگ کے قیدیوں کے متعلق سورۃ محمد میں ہے کہ جنگ کے قیدی اگر آجائیں تو ان کو دیکھو قیدی تمہارے ان کے پاس ہیں یا آدمی تمہارے ان کے پاس ہیں تو ان کے تبادلے میں فدیہ کے طور پہ ان کو لے لو۔ نقصان تمہارا انہوں نے کیا کچھ ان کے ہاں خسارے کے طور پہ فدیہ' جسے کہتے ہیں' یہ لے لو۔ اور آگے یہ ہے کہ اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوں نہ تمہارے آدمی ہوں تو ان کو احساناً چھوڑ دو کہ انسان تو ہیں۔ یہ قرآن میں ایک ہی آیت ہے جنگ کے قیدیوں کے متعلق۔

وہ اگر ہمارے نوے ہزار قیدیوں کے متعلق پیش کردہ شریعتِ اسلامی پر عمل کرتے تو پھر ہمارے پاس کیا جواب تھا

کہا جاتا ہے کہ ان کے مردوں کو غلام بناؤ ان کی عورتوں کو لونڈیاں بناؤ۔ کم بختو پرانی تاریخ کو تو چھوڑو آج یہ جو نوے ہزار ہیں' ان میں کم از کم دس بیس ہزار تو ہماری محترم خواتین اور بہنیں اور بیٹیاں ہیں اگر وہ کہیں یہ کہدیں کہ ہم تو شریعتِ اسلامی کے اوپر عمل کریں گے

تمہارا ستیاناس' کیا بچے گا تمہارے ہاں کا۔شکر کرو کہ ان کافروں نے تمہاری شریعت پہ عمل نہیں کیا۔ میں نے کہا یہ ہے کہ **وَ فِی الرِّقَابِ** ابتدائی سٹیج ہے جماعتی تشکیل کی' چند پیسے جمع ہوئے ہیں اپنی ضرورتوں میں سے بچ کے۔ اس میں سے یہ کہا ہے **وَ فِی الرِّقَابِ**(9:60) رقب۔ رقب گردن کو کہتے ہیں۔ بات میں بات نکل آتی ہے اس زبان کی بھی کیا بات ہے' عجیب لوگ تھے' دو ہزار سال میں زبان ہی تو بناتے رہے تھے۔ رقب' اس کے معنی انتظار کے بھی ہوتے ہیں۔ اب یہ کہا جائے گا کہ اس میں کونسا لغوی ربط ہے کہ جس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہتا ہے انتظار کرنے والا گردن اٹھا اٹھا کے دیکھتا ہے۔ ترقب کہتے ہی انتظار کو ہیں۔ پھر اس کے معنی نگرانی کے ہوتے ہیں۔ کہتا ہے نگران بھی جو کسی چیز کا ہوتا ہے' وہ سر کو یوں نیچے نہیں رکھتا' وہ ہمیشہ یوں دیکھتا ہے اس لیے اس کے معنی یہ بھی ہو گئے۔ اور گردن میں رسی ڈالنے والی چیز جو ہے وہ تو غلامی ہے' یہ بھی معنی ہو گئے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی راہنمائی کے لیے ہر دو راستوں کی نشان دہی کا طریق

میں عرض کر رہا ہوں کہ اس زبان میں یہ لوگ لفظ بناتے کیسے تھے۔ **وَ فِی الرِّقَابِ** (9:60) آیئے دیکھیں قرآن نے یہ رقاب کہاں کہا ہے۔ کہا کہ **وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ** (90:10) انسان کو پیدا کیا دونوں راستے اس کو بتا دیے۔ ایک راستہ سرپٹ دوڑنے کا موٹریں چلانے کا جہاز چلانے کا۔ کہتا ہے ایک دوسرا راستہ بھی ہے وہ ہے **فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ** (90:11) پہاڑ کی گھاٹی چڑھنے کا راستہ' بڑا دشوار گذار ہے۔ اور پھر یہ کہ وہ فٹافٹ بھاگم بھاگ نہیں چڑھا جا سکتا' Gradually چڑھا جا سکتا ہے۔ ایک ایک قدم پہ سانس پھولتی ہے اس سفر میں' کھڑا ہونا پڑتا ہے پھر آگے جانا پڑتا ہے۔ کہا ایک راستہ یہ بھی ہے۔ کونسا راستہ تمہارے لیے تجویز کیا ہے' یہی پہاڑی کی گھاٹی چڑھنے کا راستہ' یہ ہے دین کا راستہ۔ کہا **وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ** (90:12) کہا کہ یہ بات تمہیں خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یہ جو پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے کا راستہ ہے یہ کیا راستہ ہے۔ عزیزانِ من! سنیے اس راستے میں قدمِ اول جو ہے وہ ہے **فَكُّ رَقَبَةٍ**(90:13) غلاموں کو آزاد کرانا۔ آج ہم اس کے معنی نہیں سمجھ سکتے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

نواں باب: سورۂ توبة (آیات 61 تا67)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1973ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی 61ویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (9:61)

قرآن حکیم کے مطابق جنگ کے سلسلہ میں جذبۂ محرکہ کی اہمیت کا ذکر

سابقہ اتوار کو درس کا ناغہ رہا تھا یومِ اقبالؒ کی خصوصی تقریب کی وجہ سے۔ اس لیے تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کردوں کہ سورۃ انفال اور سورۃ توبہ میں جنگ کے متعلق ہدایات اصول وقواعد بیان کیے گئے ہیں۔ جنگ درحقیقت فی سبیل اللہ ہوتی ہے یعنی اس میں شریک ہونے والوں کا کوئی اپنا ذاتی مفاد نہیں ہوتا۔ جن کے ساتھ جنگ ہوتی ہے ان سے بھی کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہوتی' ذاتی انتقام لینا نہیں ہوتا۔ اور جو کچھ جنگ سے حاصل ہوتا ہے' جسے مالِ غنیمت کہا جاتا ہے' وہ بھی ذاتی طور پر ان کے حصے میں نہیں آتا۔ آپ دیکھئے کہ اس جنگ میں شریک ہونا ہی کتنا بڑا مشکل کام ہے۔ انسان ذاتی جذبات کی تسکین کے لیے' ذاتی مفاد کے حصول کے لیے' اس قسم کے

رسک لے لیتا ہے۔لیکن جب یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو اس کے بعد ہتھیلی پہ سر رکھ کے میدانِ جنگ میں چلے جانا اس کا جذبۂ محرکہ کوئی گہرا ایمان ہی ہوسکتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جنگ کی ہدایات کے دوران قرآنِ کریم منافقین کا ذکر بار بار کرتا ہے۔ ہماری قرآن خوانی کی تو کیفیت یہ ہے کہ جیسے وہ ہندوؤں کے ہاں رامائن کی کتھا ہوتی ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے مدھر پردیش میں ایک رام چندر جی مہاراج تھے؟؟ ان کا باپ تھا ان کی سوتیلی ماں نے ان کو دیس نکالا دیا' جنگل میں گئے ان کی بیوی کو راون لے گیا پھر جنگ ہوئی' واپس لے آئے۔کوئی چھ ہزار سال پہلے کے کسی رام چندر کی کوئی بات ہے۔بس زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ رام چندر جی کی ایک عقیدت ان کے دل میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک قصۂ پارینہ ہوتا ہے'ایک ماضی کی داستان ہوتی ہے۔اور یہ ہندوؤں کی رامائن پہ ہی منحصر نہیں۔

قرآنِ حکیم میں بیان کردہ واقعات کا مقصد اور ہماری قرآن خوانی کا انداز

قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے جب بھی یہ واقعات بیان کرو تو وہ کہتے ہیں کہ اساطیر الاولین ہیں۔ یہ پہلے زمانے کے لوگوں کی کچھ داستانیں ہیں جو بیان ہو رہی ہیں۔ان کی دلچسپی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی رات کے وقت بچے کی دلچسپی ہوتی ہے جو نانی اماں سے کہتا ہے ہاں نانی اماں وہ سبز پری کی' وہ کالے دیو کی بات سناؤ نا۔ وہ اس لیے سنتا ہے اور یہ اس لیے سناتی ہے کہ اُسے نیند آ جائے۔ان داستانوں سے قوموں کو نیند آ جاتی ہے۔تو قرآن نے یہ کہا کہ ان لوگوں کی بھی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے یہ واقعات پیش کیے جائیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہاں ہاں یہ پرانے زمانے کی لال پری اور کالے دیو کی کہانیاں ہیں۔اور سنتے اس لیے ہیں کہ انہیں کسی طرح سے اس سے نیند آ جائے۔ ہماری قرآن خوانی کی کیفیت بھی یہ ہے۔ جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو ذہن میں چودہ سو سال پہلے کا ایک نقشہ ہوتا ہے پھر ہم اس زمانے کے لوگوں کو تقسیم کر لیتے ہیں مختلف کیٹگریز میں' مختلف گروہوں میں۔ جماعتِ مؤمنین ہوتی ہے' کفار ہوتے ہیں' مشرکین ہوتے ہیں' پھر منافقین ہوتے ہیں۔اس زمانے کے لوگوں کے یہ مختلف اقسام تھے'ان کی کچھ باتیں ہیں جو قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ تعلق ان کا اس زمانے سے ہے'ان لوگوں سے ہے۔ ہمارے ساتھ تعلق اتنا ہی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہمیں ثواب مل جاتا ہے۔ یہاں تو ملتا کچھ نہیں انہیں۔ وہ سلانے کا کام تو یہ چیزیں دیدیتی ہیں۔لیکن اب تو لاؤڈ سپیکر کی وجہ سے وہ بات بھی نہیں رہی اب تو محلّہ سارا جاگتا ہے۔تو قرآن تو ہم پڑھتے بھی لیکن ہمارا ذہن وہی رامائن مہا بھارت کا ذہن ہوتا ہے کہ کسی زمانے کا کوئی ایک واقعہ ہے جو بیان ہو رہا ہے۔ٹھیک ہے اس میں ہماری عقیدت کے مراکز بھی ہیں رام چندر جی ہوں یا لکشمن جی مہاراج ہوں یا سیتا دیوی ہو'ایسے بھی ہیں مخالفین بھی ہیں' راون ہوں ان کے مدد کرنے والے بھی ہیں' وہ ہنومان جی کیوں نہ ہوں۔

قرآنِ حکیم میں بیان کردہ واقعات تو ہر دور کے لیے قوموں کے مرضِ کہن کی ترجمانی کرتے ہیں

ہمارے ہاں یہی تصور ذہن میں ہوتا ہے کہ پرانے زمانے کی کوئی بات ہو رہی ہے' ہمارے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ جان بوجھ کے ایسا کیا جاتا ہے۔ وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (2:9) قرآن کہتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں یہ سمجھ کے کہ ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہ اگر یہ سمجھا جائے کہ ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے تو پھر وہ قلعی کھل جاتی ہے اور منافق ہو جاتا ہے۔ اس آئینے میں جب ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو یہ مستقل فریب میں ہم نے آپ کو مبتلا کر رکھا ہے کہ بہر حال مسلمان ہیں' تیرے حبیب کی امت ہیں اور پھر شفاعت کے مستحق ہیں۔ باقی دنیا سے بہر حال ہم افضل بھی ہیں۔ اور اس افضلیت کا آپ کو پتہ ہے ہم کرتے کیا ہیں فریب اپنے آپ کو کیسے دیتے ہیں۔ وہ عجیب Psychological چیز ہے۔ اسلام کی جو خوبیاں ہیں دوسروں کے مقابلے میں انہیں ہم اپنے مناظروں میں مباحثوں میں بیان کرتے ہیں۔ اور جب وہ خوبیاں ان کے مذاہب کے مختلف قسم کے طور طریقے اور مناسک اور عادات و اطوار پہ غالب آ جاتے ہیں' ذہنی طور پر تو ہم فاتح و منصور کی حیثیت سے وہاں سے واپس چلے آتے ہیں۔ اور پھر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ہم لوگ ان سے بہت اونچے ہیں۔ وہ جو ہم نے بیان کیے تھے وہ اصول اور وہ اقدار اور وہ حقائق اور ہدایات وہ لوگ نہیں بلکہ ہم لوگ ان سے بہت اونچے ہیں۔

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ راہنمائی سورج کی کرنوں کی طرح نہ تو کسی خاص قوم کے لیے ہے اور نہ ہی کسی خاص دور کے لیے

بہت بڑا گہرا نفسیاتی فریب ہوتا ہے عزیزانِ من! یہ جو ہم خود کو دیدیتے ہیں۔ کہ یہ داستانیں پرانے لوگوں کی بیان ہو رہی ہیں ہمارا اس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس میں جب اس زمانے کے غازیوں کا' شہداء کا' جنگ میں شہید ہونے والوں کا مجاہدین کا' مہاجرین کا ذکر آتا ہے تو وہ تو صحابہ کبارؓ ہو گئے کہ صاحب وہ تو ان کی بات ہوئی۔ وہ تو صحابہؓ تھے نا سبحان اللہ' ان کا تو اپنا مقام تھا۔ ان کے ساتھ تو ہمارا اتنا ہی تعلق ہے کہ نام آئے تو رضی اللہ تعالیٰ عنھم کہہ دیا جائے۔ یہ جو مخالفین تھے یہ مشرکین اور عرب تھے کفار تھے۔ منافقین مدینے میں ایک گروہ تھا وہ اس زمانے میں تھا اس کے بعد ختم ہو گیا۔ آپ سوچیے کہ اس تمام کیٹگری میں ہم کہاں آتے ہیں' ثواب حاصل کرنے والے رامائن سننے والے۔ ورنہ یہ تو داستانیں ہماری بیان ہو رہی ہیں قرآن یہ کہتا ہے لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ (21:10) اور یہ تو تمہارا ذکر ہو رہا ہے۔ کہتے ہیں یہ اس زمانے کے لوگوں سے کہا گیا تھا۔ دعویٰ بھی یہ ہے کہ قرآن ابدی طور پہ ہے' نوعِ انسانی کے لیے

ہے۔بات ٹھیک ہے انسانوں کے لیے ہی تھا بات تو یہ ٹھیک ہے صاحب' ہمارے لیے تو نہیں ہے۔جو وصفِ آدمیت میں بھی ابھی نہیں آیا' وہ قرآن کا مخاطب کیسے ہو سکے گا۔ہم نے ان چیزوں کو بانٹ دیا۔

قرآن حکیم نے انسانوں کی خصوصیات کو کسی دور یا نسل تک محدود نہیں کیا

اگر یہ دیکھیں کہ منافقین کسے کہا گیا ہے' کسی دور کے منافقین نہیں' ہر دور کے انسانوں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔یہ تقسیم ابدی اور ازلی ہے کسی زمانے سے' کسی مقام سے' متعلق و محدود نہیں ہے اس میں ہمارا اور آپ کا ذکر ہے' اس میں انسانوں کا ذکر ہے۔قیامت تک کے لیے انسانوں کا ذکر ہے۔یہ کیٹگریز بھی قیامت تک کے لیے ہیں۔بات تو یہ لمبی ہو جائے گی لیکن قرآنِ کریم نے تو اس شرح و بسط سے ان منافقین کی عادات و خصائل و خصائص بیان کیے ہیں کہ انہیں اگر ہم سامنے رکھیں اور یہ ذہن سے نکال دیں کہ رامائن کی کتھا ہے' ذہن میں یہ لے آئیں کہ یہ آج کے دور کی باتیں ہو رہی ہیں۔

قرآنی احکامات میں قلب و نظر کی ہم آہنگی کے سلسلہ میں منافق اور مومن میں فرق کی نوعیت

عزیزانِ من! اس انداز سے پڑھنے والا تاب نہیں لاسکتا' چیخ کے چپ ہو جائے گا۔اس لیے کہ اس شیشے کے اندر تو اس کو سارے خد و خال اپنے نظر آئیں گے۔ایک ایک چیز جو قرآن ان کی گنائے گا' وہ نظر آئے گا کہ یہ تو میری بات ہو رہی ہے' ہماری بات ہو رہی ہے' ہماری قوم کی بات ہو رہی ہے' مسلمانوں کی بات ہو رہی ہے۔اسلام کے نام سے صاحب یہ ضرور وابستہ رہتے ہیں' اس حد تک رہتے ہیں۔دو چار چیزیں تو میں پیش کر دوں۔اتنا ہی تعلق رکھتے ہیں اسلام کے ساتھ کہ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (24:48) وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (24:49) کوئی معاملہ بھی آئے اگر یہ دیکھیں کہ اسلام کا فیصلہ ان کے حق میں ہونا ہے' تو بڑھ چڑھ کے دوڑ کے جائیں گے اس کی طرف کہ ہاں صاحب اسلام کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیے۔اسلامی مملکت ہوگی' اسلامی قانون ہوگا' اسلامی آئین ہوگا' اسلام کا نظام رائج ہوگا۔اور وہ سارا وہ ہوگا جس میں پہلے یہ دیکھ لیں گے کہ یہ فیصلہ ہمارے حق میں آ رہا ہے۔ہماری مرضی کے مطابق ہمارے حق میں اگر وہ فیصلہ ملتا ہے تو وہ اس کی طرف دوڑے ہوئے آئیں گے۔اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (24:50) دل روگی ہے ان کا صاحب' دل کا مرض ہے یہ۔ورنہ اگر قلب مریض نہ ہو تو اس کی تو صورت یہ ہے کہ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ (24:51) مومن کہ جن کے قلب میں مرض نہیں ہوتا وہ Psychologically Diseased Mind نہیں ہوتا' اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو معاملہ بھی سامنے آئے اس کے لیے وہ دوڑا ہوا جاتا ہے اس بارگاہ سے فیصلہ لینے کے لیے۔اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (24:51) ہم نے سن لیا فیصلہ' ہم سر

جھکاتے ہیں۔

احکاماتِ قرآنی کی اطاعت تو مکمل طور پر کرنا ہوگی

یہ بھی جاتا ہے فیصلہ لینے کے لیے منافق بھی جاتا ہے۔ پہلے اپنے ہاں دیکھ لیتا ہے کہ فیصلہ میرے حق میں ہونا ہے یا میرے خلاف ہونا ہے۔ خلاف ہونا ہوتا ہے تو اس کے بعد کہ ''سارے قرآن تے کنے عمل کرنا جنے جوگا کوئی ہووے کرلوے جناب''۔ وہ کہتا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) کیفیت تمہاری یہ ہے کہ کتاب کے ایک حصے پہ ایمان رکھتے ہو دوسرے سے انکار کرتے ہو۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) تم میں سے جو بھی یہ کرے گا تو یہاں یہ بات نہیں ہے کہ آدھا تم نے مان لیا ہے تو 55% دیدے، چلیے پاس مارکس تو ہو گئے۔ جو یہ انداز رکھے گا اس ضابطۂ ہدایت کے متعلق تو یاد رکھیے اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکلے گا کہ اس دنیا میں بھی ذلت اور خواری اس کے حصے میں آئے گی اور آخرت کا عذاب تو پوچھو نہیں کتنا ہوگا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ بہر حال کچھ تو عمل کیا' نہ کرنے والے سے تو بہتر ہے۔ نہ کرنے والے کے متعلق وہ کہتا ہے کہ کفر بھی اپنے نتائج رکھتا ہے اگر چہ وہ جلدی ختم ہو جانے والے ہوتے ہیں' شعلۂ مستعجل ہوتا ہے' وہ بھی اپنے نتائج رکھتا ہے۔ اور ایمان کا تو پوچھئے نہیں کیا نتائج رکھتا ہے۔ یہ جو کیفیت ہے ان کی کہ جو معاملہ آئے اس کے متعلق پہلے دیکھ لیا جائے کہ ہمارے حق میں فیصلہ ہونا ہے تو اس کی طرف جائے اور اگر نہیں ہونا ہے تو دوسری طرف نکل جائے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ جتنے حصے پر اس نے عمل کیا ہے' اتنے پرسنٹ ہی مارکس اس کو مل جائیں گے۔

تکذیب دین کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا

عزیزانِ من! کوئی دکھ اور بیماری ہو کوئی نسخہ لکھا کے لے آئے اور اس میں آپ یہ کیجئے کہ کچھ ادویات جو آپ کو نظر آئیں کہ کچھ سستے ہیں کچھ میٹھے ہیں' وہ تو اس میں سے لے لیجئے اور باقی حصہ اس میں سے نکال دیں ''دے پتے اپنے گھروں ملالو'' پھر دیکھئے اس کا نتیجہ۔ چاہیے یہ کہ آدھا مرض چلا جائے۔ 55% اگر آپ نے اجزاء لے لیے ہیں اس نسخے کے تو آدھا تو چلا جانا چاہیے نا۔ ڈاکٹر صاحب سے پوچھیے گا شام کو کہ آدھا گیا ہے یا دوگنا ہو گیا ہے۔ عزیزانِ من! مذہب اور دین میں فرق یہ ہوتا ہے۔

اگر عالم گیر سچائیاں تمام مذاہب میں برابر پائی جاتی ہیں تو پھر مذہب اور دین میں فرق کیا ہے؟

بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ آج رونا رویا جاتا ہے کہ صاحب ہم تباہ اور برباد اس لیے ہو گئے کہ ہم مسلمان نہیں رہے دیکھئے تو

سہی ہماری یہ حالت' جھوٹ بولتے ہیں ہم' بددیانتی ہم کرتے ہیں' وعدہ خلافی ہم کرتے ہیں' کسی کی بات کا اعتماد نہیں ہے' آپس میں محبت نہیں ہے۔اور آگے چلے جایئے فسق وفجور میں مبتلا ہیں' زنا کاری بھی یہاں ہوتی ہے' جوابازی بھی ہوتی ہے' حرام کاری بھی ہوتی ہے۔ یہ ساری چیزیں کہی جاتی ہیں نا کہ یہ ہیں جو ہمارے عیوب اور نقائص ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ دنیا کا کونسا مذہب ہے جو یہ کہتا ہے کہ جھوٹ بولا کرو' سچ نہ بولا کرو کونسا مذہب ہے جو یہ کہتا ہے کہ بددیانتی کیا کرو' دیانتدار نہ ہوا کرو۔ یہ جتنی چیزیں آپ گناتے ہیں کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ دیا یہ تو ساری چیزیں دنیا کے ہر مذہب میں ملتی ہیں۔اور مذاہب تو ایک طرف رہے جو لوگ Atheist ہیں خدا کے بھی قائل نہیں ہیں وہ بھی یہ کہیں گے کہ دیانتدار ہونا اچھا ہے۔تو یہ کونسی خصوصیت ہے آپ کی جی جو اسلام کی آپ کہتے ہیں کہ دنیا میں اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (3:19) کہ دین خدا کے نزدیک الاسلام ہے' اس کے سوا جو کوئی بھی دین قبول کرے گا' وہ قبول ہی نہیں کیا جائے گا۔اور جو بتا رہے ہیں تفصیل وہ تمام مذاہبِ عالم میں ملتی ہیں صاحب۔ یہی تو چیز تھی جو ابوالکلام آزاد کو گمراہ کر کے لے گئی۔ گمراہ تو وہ نہیں ہوا تھا وہ تو ایک مصلحت تھی لیکن بہرحال پیش اس نے یہی کیا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پہ پائی جاتی ہیں۔اور یہ گنا دی پھر اس نے' اس کا کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ٹھیک ہے جی۔قرآن نے یہ نہیں کہا ہے کہ یہ مذہب اور مذاہب میں پائی جاتی ہیں وہ کہتا ہے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ(3:19) مذاہب تو سارے ہی یہ ہوتے ہیں' الدین جو ہے وہ صرف الاسلام ہے دوسرا نہیں ہے۔ یہ الدین ہے یہ نظامِ حیات ہے یہ ضابطہ پورا زندگی کا۔اور زندگی کے ضابطے میں یا نظامِ حیات میں یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ آپ کچھ چیزیں اس میں سے لے لیں اور کچھ چیزیں چھوڑ دیں۔اس میں Integration نہایت ضروری ہوتی ہے سارے کا سارا لینا ہوگا یا اسے چھوڑنا ہوگا۔ وہ ایک اجتماعی نظام ہے' اس نظام کے اندر اگر آپ آ جائیں گے اور یہ اگلی بات آ گئی۔

قرآنِ حکیم کا پیش کردہ دین اجتماعی طور پر ایک مستحکم اور ابدی نظامِ حیات کی تصدیق کرتا ہے اور سچ کر دکھاتا ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یا قرآن نے یہ کہا یا خدا نے یہ کہا کہ۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (2:97) جن باتوں کا تم دعویٰ کرتے ہو۔ یہ ہمارے ترجمے' پتہ نہیں ہمیں کہاں لے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن تصدیق کرتا ہے کتبِ سابقہ کی یعنی انجیل کی تورات کی۔قدم قدم پہ وہ کہتا ہے کہ ان میں تحریف ہو چکی ہے' وہ اصلی رہی نہیں ہیں۔ آپ کہتے ہیں جی یہ تصدیق کرتا ہے ان کی۔ اندازہ لگایئے۔انہیں یہ محرف بھی کہہ رہا ہے یہ بھی کہہ رہا ہے کہ وہ اصلی حالت میں کوئی نہیں ہے' اس کے ساتھ یہ ان کی تصدیق بھی کر رہا ہے۔ مصدق کے معنی یہ نہیں ہوتے عزیزانِ من!۔ بڑی عظیم چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ وہ کہہ یہ گیا ہے کہ یہ باتیں تمہارے ہاں بھی ہیں تم

بھی یہی کہتے ہو کہ سچ بولو' جھوٹ نہ بولو' بد دیانتی نہ کرو' دیانتدار بن کے رہو' کسی کو دھوکہ نہ دو' فریب نہ کرو' حرام کاری نہ کرو۔ یہ سب چیزیں تمہارے ہاں ہیں لیکن میں آیا ہوں مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (2:97) جو دعویٰ تم کرتے ہو ان کو سچ کر کے دکھانے کے لیے میں آیا ہوں۔

الدین الحق کا دعویٰ کرنے والوں کے ہاں قرآنی نظام حیات کی بنیاد رکھنی تو فرض ہے

یہ دعاوی سچ ہوتے ہیں نظام کے اندر آ کر' انفرادی طور پر یہ دعوے سچے ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ جو رونا رو رہے ہیں آپ کہ مسلمان' مسلمان نہیں رہا ہم اسلام کے پابند نہیں رہے۔ آپ مذہب کی سطح پہ گفتگو کرتے چلے جاتے ہیں' جھوٹ بولتے ہیں' سچ نہیں بولتے' بد دیانتی کرتے ہیں' وہی انفرادی عالمگیر سچائیاں یا Universal Truth یا Ethics یا اخلاق کا ضابطہ۔ ساری دنیا ان کو مانتی ہے۔ پھر فرق کیا ہوا تمہارا اور اسلام کا' کیوں کہہ دیا خدا نے کہ دین یہی ہے دوسرا دین نہیں ہے' دین یہی ہے۔ اور دین جو ہے وہ مصدق ہوتا ہے ان تمام دعاوی کا جو دنیا کے سارے لوگ کرتے ہیں' یہ سچ کر کے دکھا دیتا ہے' وہ صرف دعوؤں کو Repeat کرتے رہتے ہیں۔ اور جب کوئی چیز دعاوی الدین بنتے ہیں' وہ نظام ہوتا ہے اس میں Integration ہوتی ہے وہ سارے کے سارے لیے جاتے ہیں۔ ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (2:208) یہاں آنا ہے تو پورے کا پورا آنا پڑے گا یہاں Percentage کا حساب نہیں ہے۔ ''جناں جوگا کوئی ہووے گا کر لیا جائے گا'' ٹھیک ہے مذہب کی خود فریبی ہے۔ دین پورے کا پورا یا تو نافذ کرنا ہوگا یا چھوڑنا ہوگا۔ اور اگر بین بین رہنے والی بات آپ کرتے ہیں کہ کچھ چیزیں دین کی کچھ چیزیں باقی اپنی' یا جہاں اپنا فائدہ اس میں سے لے لیا جہاں فائدہ نہ ہوا اپنی مصلحت کوشیوں کی طرف آ گئے۔

حق بات کو ذہنی طور پر تسلیم نہ کرنے کی غرض سے فقہ کی ''کتاب الحیل'' میں مختلف طریقوں کا اندراج

یہ مذہب ہے اور مذہب پرستی کو منافقت کہتے ہیں قرآن کی اصطلاح میں۔ ابھی میں نے آپ کے سامنے یہ آیات (24:48-51) پڑھیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہاں سے فیصلہ لو تو پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ فیصلہ ہمارے حق میں جائے گا یا خلاف جائے گا۔ حق میں جاتا ہے تو بھاگے ہوئے آتے ہیں' خلاف جاتا ہے تو اس کے لیے ہزار قسم کے عذر معذرت۔ اور عذر اور معذرت ہی نہیں وہ جو آپ کے ہاں فقہ کی کتاب کے آخر میں کتاب الحیل ہوتی ہے اس کے اندر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ جو فقہ کے احکام اس میں دیے ہیں نا ان احکام سے بچ کے نکلنے کی شکلیں کیا ہیں' اس کتاب کے آخر میں یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے۔ آپ حیران ہو رہے ہیں۔ جس طرح بچوں کی حساب کی کتاب میں آخر میں جوابات دیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ ان احکام سے بچا کیسے جاتا ہے۔ اور وہ لکھا ہوا تو پرانے زمانے کی بات ہے' ہم صبح سے شام تک یہی لکھتے چلے جاتے ہیں۔ جرأت نہیں ہے یہ کہنے کی کہ اسلام کے مطابق

نہیں ہوسکتا' ہمارے بس کی بات نہیں ہے بابا۔اور منافقت کی پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ منافق' اس میں جرأت نہیں ہوتی ۔کافر میں مشرک میں جرأت ہوتی ہے ۔اس مسلمان سے توAtheist ہزار درجے اچھا ہے ایسی بات کہتا ہے جس کے متعلق پتہ ہے کہ ساری دنیا اس کی مخالفت کرے گی ۔ساری دنیا خدا کو مانتی ہے نا' وہ اس دھڑلے سے کہتا ہے کہ میں اُسے نہیں مانتا۔کتنی بڑی جرأت ہے یہ صاحب ۔اِس کی کیفیت یہ ہے کہ مانتا نہیں ہے' زبان سے کہتا ہے کہ نہیں مانتا۔ایک لفظ ہمارے ہاں ماننا آ گیا' خدا کو مانتا ہے جی ۔یعنی یہ اس قدر منافقت والا لفظ ہے' مانتا ہے'۔اوبھئی کیا کرتا ہے' کہ خدا کو مانتا ہے' اسلام کو مانتا ہے ۔ یہاں ماننے کا سوال ہی نہیں ہے یہاں تو اس کی اطاعت کرنے کا سوال ہے ۔ جہاں الدین کے معنی عربی زبان کے اندر نظام کے ہیں' عجیب زبان ہے الدین کے معنی اطاعتِ کلی کے بھی ہیں ۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ دیکھ لیا کہ اپنے حق میں فیصلہ جائے گا بھاگے ہوئے چلے جا رہے ہیں' خلاف فیصلہ ہے تو دوسری طرف نکل جاتا ہے ۔آ گے چلیے ۔

اصل صورتِ حال خدا کو ماننا نہیں بلکہ اس کے احکامات کی اطاعت کرنا ہے' مختلف عذر پیش کرنا نہیں ہے

قرآن حکیم نے تو عجیب چیزیں پیش کی ہیں ۔ان کی کیفیت یہ ہے ۔کہتا ہے جب تک تو ان کے سامنے سوال صرف نماز پڑھنے کا' زکوٰۃ دینے کا' صدقہ خیرات کرنے کا' رسومات ادا کرنے کا' حج ادا کرآنے کا ہوتا' یہاں تک تو یہ بڑے پکے مومن نظر آتے ہیں ۔اور جونہی ان سے یہ کہا جائے نا کہ صاحب اسلام کے خلاف دشمن چڑھائی کر رہا ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے دعوے کی تصدیق اپنے خون سے ثابت کرو ۔ کہنے لگا کہ اس وقت ان کی کیفیت یہ ہے کہ غاریں ڈھونڈتے ہیں جہاں جا کے پناہ لے لیں ۔نماز روزے تک کا اسلام ۔ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ قِيۡلَ لَهُمۡ كُفُّوۡۤا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (4:77) ان کی طرف بھی دیکھا ہے تم نے کہ جب تک صورت یہ تھی کہ جنگ ونگ کا موقعہ نہیں آیا کبھی ضرورت نہیں تقاضا نہیں' اُس وقت تک ان کی کیفیت صلوٰۃ زکوٰۃ خیرات صدقہ عقیقہ ولیمہ حج سارا مومن کی طرح ۔فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ (4:77) جنگ کی آیت نازل ہوئی کہتا ہے موت پڑ گئی ۔دیکھا۔

وَقَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ كَتَبۡتَ عَلَيۡنَا الۡقِتَالَ ۚ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ (4:77) وہ کہتے ہیں کہ یا اللہ اتنی جلدی کیا پڑی ہوئی تھی کہ آپ نے جنگ کی آیت بھی نازل کر دی' کچھ ٹھہر جاتے تھوڑا عرصہ '' کچھ اسی ہور کھا پی لیندے ''۔کہتا ہے یہ کیفیت ہے ان کی ۔ یہ اسلام ہے صرف نماز روزے تک کا اسلام ہے ۔ دیکھ رہے ہیں آپ مذہب اور دین میں کیا فرق ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ وہ ان تمام چیزوں کو جسے آپ نماز روزہ اور زکوٰۃ کہہ رہے ہیں یہ ساری چیزیں جتنی ہیں' وہ تیاری کے لیے سپاہی کی ٹریننگ اور پی ٹی جو ہر روز صبح ہوتی ہے ۔ جس وقت جایئے ان فوجیوں کو دیکھئے کچھ نہ کچھ کر رہے ہوتے ہیں ۔ یہ سارا کچھ وہ کریں اور جب جنگ کے متعلق آیت نازل ہو یعنی اوپر

سے ہیڈ کوارٹر سے حکم آ جائے تو اس کے بعد یہ اپنے اپنے گھروں کو چلے آئیں کہ یہ کونسا وقت ہے جنگ کرنے کا۔ یہ سارا جو کچھ کیا تھا انہوں نے خواہ کتنے ہی سال لگ گئے ہوں اس میں' روز ٹریننگ ان کی ہوتی ہے' یہ کسی کام آئے گی ٹریننگ ان کی۔ یوں تو مقصود بالذات وہ شے ہے' یہ تو ذرائع ہیں اس کے۔

قرآنِ حکیم کا کوئی حکم مقصود بالذات کے عمل کے بغیر نہیں ہوتا

آپ ایک ترکھان کے ہاں جاتے ہیں اس کو لکڑی لے کے دیتے ہیں کہ دروازہ بنانا ہے۔ آپ کو پتہ ہے وہ شروع کس چیز سے کرتا ہے اتنی سی سِلی نکالتا ہے جو رندے کا پھل ہوتا ہے' پھل پر پانی ڈال کے اس کو وہ گھساتا ہے۔ اگر آپ اس کے پاس دو گھنٹے کے بعد اس کو گھِس رہا ہو' پھر آئیں دو گھنٹے کے بعد عصر کا وقت ہو گیا ہے پھر وہ گھِس رہا ہو۔ شام کے وقت وہ آپ سے کہے کہ جی لائیے نا میری مزدوری۔ آپ کہیں گے کہ تم نے کیا کام کیا' وہ کہے گا کہ آپ نے دیکھا کہ میں بیکار تو رہا نہیں سارا دن۔ کرتے کیا رہے ہو''رندا گھستا رہیا ہیگاں' اوئے رندا تے گھسنا سی ایس واسطے کہ دروازہ بن جاوے۔''اے ساری عمر رندا ای گھسدے رہندے ہیگے' او دروازے کچھ بناؤ جیہڑے ہیگے نیں' او کیندا ای جی اللہ رکھوالا ہیگا ایناں دا' کیندا اے ہیگا کہ جی کسے دن میں نوں ویلا وی ویکھیا تسی جدوں آئے دیکھا کہ میں فجر پڑھی ظہر پڑھی عصر پڑھی مغرب پڑھی او ہدے دے بعد ستا ای سی کہ فجر دی''۔ بڑی مشقت کرتا ہے یہ درکھان''لیکن سارا دن رندا لوندا رہندا ہیگا''۔ کیا کہتا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ (4:77) او تم نے اس درکھان کو بھی دیکھا ہے' کبھی کہ جب تک یہ چیز تھی وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (4:77) اس کے اوپر سب کچھ۔ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ (4:77) تو بہ توبہ جب وہ وقت آیا جس کے لیے یہ ساری تیاری ہو رہی تھی اُس وقت کہتا ہے کہ یا اللہ اتنی جلدی کیا پڑی ہوئی تھی کچھ اور مدت ٹھہر جانا تھا۔ دیکھ رہے ہیں مذہب اور دین میں فرق۔

ہمارے ہاں کا یہ تصور کہ ہم نے اسلام چھوڑ دیا ہے یہ ایک سطحی سا تصور ہے

ٹھیک ہے، ہم پہ یہ ذلت وخواری مسلط ہو رہی ہے۔ یہی کہا جا رہا ہے کہ ہم نے اسلام چھوڑ دیا ہوا ہے۔ اور جو میں نے کہا ہے کہ جب تفصیل پوچھیے تو جواب ہو گا کہ نماز کوئی نہیں پڑھنے آتا' روزے نہیں رکھتے ہیں' زکوٰۃ نہیں دیتے ہیں' حج میں دیکھئے کتنے کم جا رہے ہیں۔ یا یہی چیز ہو گی جھوٹ بولتے ہیں' بددیانتی کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں بددیانتی کرتے ہیں یہ تو دنیا کے سارے مذاہب میں ہے۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہاں تک تو یہ مسلمان رہتے ہیں اور جب ان چیزوں کے مقصد کے حصول کا وقت سامنے آتا ہے' اس وقت یہ میدان چھوڑ جاتے ہیں۔ مذہب کی حد تک یہ پابند رہتے ہیں' دین جب آتا ہے وہاں یہ چھوڑ جاتے ہیں۔ ابھی ابھی تو

آیت گذری ہے کہ آتے ہیں بڑے پکے ہوتے ہیں نمازی وَ لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَ ھُمْ کُسَالٰی (9:54) میں نے بتایا تھا۔

قرآن حکیم کا پیش کردہ تصورِ حیات صرف جذبات تک محدود نہیں رہتا

عزیزانِ من! پھر دہرادوں کہ بات بڑی عجیب کہہ گیا ہے قرآن۔ کیا بات ہے اس کے ایک لفظ کی۔ کہ وہ جو دُھنیا دھنکنے کے لیے آتا ہے' اس کے پاس ایک کمان ہوتی ہے' روئی دھننے والی ایک لکڑی کی ہوتی ہے۔ کمان اور ایک وہ تانت اس کے ساتھ لگتی ہے۔ وہ ان دونوں کو آپس میں جوڑتا ہے اور اس کے بعد دُھنتا ہے تو پرخچے اڑ جاتے ہیں اس روئی کے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ نماز کے لیے آتے ہیں صلوٰۃ کے لیے آتے ہیں' کیفیت ان کی اس دھننے کی طرح ہوتی ہے جس کے پاس وہ لکڑی کی کمان بھی ہوتی ہے' تانت بھی ہوتی ہے لیکن تانت الگ رکھی ہوتی ہے اور کمان الگ رکھی ہوتی ہے ''تے روئی دھنن واسطے آجانداا ے''۔ یااللہ!! اس قرآن کا کیا بتائیں عزیزانِ من! کہ یہ کیا چیز ہے۔ پوچھو اس دُھنیے سے سارا دن بیٹھا رہے اس روئی کے کنارے شام تک کچھ اس کے پلے پڑے گا یا اُس کے پلے پڑے گا جس نے اس کو بلایا تھا روئی دھننے کے لیے۔ وَ ھُمْ کُسَالٰی (9:54)۔ سب چیزیں ٹھیک ہیں پورا وضوٗ ذرا سا حصہ بھی خشک رہ جائے تو کہتے ہیں کہ ہوا نہیں ہے۔ نماز کے اندر تمام ارکان ان کے ساتھ بالکل پاؤں میں اتنا فاصلہ' ہاتھ اتنے بندھے ہوئے اتنا جھکو' اتنا سجدے میں' یہ سارے الفاظ حروف' مخرج جہاں سے نکلے سب ٹھیک ہے۔ تانت بھی ٹھیک' کمان بھی ٹھیک بس اتنی سی چیز ہی ہے اس میں کہ تانت اور کمان کو اکٹھا نہیں کرتے۔ اتنی سی بات ہی ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔

صلوٰۃ کی کیفیت صرف ظاہری حرکات وسکنات تک محدود نہیں ہیں' بلکہ معاشی نظام کے ساتھ اس کا گہرا تعلق بھی ہے

سوچو تو سہی یہ کتنی بڑی بات ہے۔ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِہِمْ سَاھُوْنَ (107:4-5) ہی نہیں کہا ہے کہ ان کا کچھ نہیں بنے گا' تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی صلوٰۃ کی یہ کیفیت رکھتے ہیں کہ اس کے مقصد سے غافل ہیں۔ صلوٰۃ انہوں نے سمجھا ہے ھُمْ یُرَآءُ وْنَ (107:6) جتنی چیزیں لوگوں کو نظر آجاتی ہیں اُسے تو یہ صلوٰۃ سمجھتے ہیں اور جو مقصد ہے وہ تو بڑی غیر محسوس چیز ہوتی ہے' وہ تو دل کی گہرائیوں سے بات نکلتی ہے۔ ھُمْ یُرَآءُ وْنَ (107:6) صلوٰۃ کے معنی وہ حصہ ہیں جو محسوسات تک محدود ہے اس میں ان کی نگاہ جاتی ہے کہ ہوئی ہے صلوٰۃ' نہیں ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ کچھ نکلا ہے یا نہیں نکلا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نتیجے کے متعلق بھی وہ دل کے بھید جاننے والا ہی جانتا ہے۔ اور زیادہ Press کیجیے تو کہتے ہیں جی قیامت میں جا کے نکلے گا۔ قرآن صرف ایک مثال دیتا

ہے ان کی یہ جو اس طرح سے الگ الگ تانت اور کمان کو رکھ کے نمازیں پڑھنے والے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ صلوٰۃ کی اتنی پابندی وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) اور وہ رزق کا چشمہ جسے بہتے پانی کی طرح ہر گھر کے آگے سے پکارتے ہوئے سلسبیل کی طرح جانا چاہیے تھا کتنی ضرورت ہے سلسبیل پوچھتا جاتا ہے راستہ چلتا جاتا ہے کتنا چاہیے لیتے چلے جاؤ جس رزق کو یوں رہنا چاہیے تھا وَیَمۡنَعُوۡنَ (107:7) اس میں بند لگاتے ہیں نمازیں آ کے پڑھتے ہیں۔

خود کوئی تعمیری کام کیے بغیر دوسروں کی نظروں میں قابلِ احترام بننے کی نفسیاتی خواہش

عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں کن کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے متعلق اب آگے آ جائیے۔ جب پھر ان کا ایک نظام بنتا ہے تو ان میں کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے بڑی عجیب جامع آیت ہے کہ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ یُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُوۡا (3:188) یہ بڑی کوشش میں ہیں کہ دل سے کہ لوگ ان کے ان کاموں کی تعریف کریں جنہیں وہ کرتے نہیں ہیں، بیانات دیتے ہیں Resolution Pass کرتے ہیں، قانون بنا لیتے ہیں۔ بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُوۡا (3:188) جو کہتے ہیں اُسے کر کے نہیں دکھاتے۔ اور عجیب بات ہے یُرِیۡدُوۡنَ نہیں کہا یُحِبُّوۡنَ (3:188) چاہتے ہیں ایسا، دل سے اس چیز کی محبت رکھتے ہیں کہ لوگ ان کے شان میں قصیدے پڑھیں، کن چیزوں کے اَنۡ یُّحۡمَدُوۡا (3:188) لوگ ان کی حمد و ستائش کریں۔ اور حمد و ستائش بھی قرآن ہے حمد ہے جو خدا کے لیے مخصوص ہے۔ اس انداز کی ان کی تعریف کریں جو خدا کے لیے مخصوص ہے، کریں کن چیزوں کے لیے بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُوۡا (3:188) جو کرتے نہیں ہیں۔

قرآن حکیم کسی خاص گروہ کا ذکر کرنے کی بجائے انسانوں کے نفسیاتی خدوخال بیان کرتا ہے

عزیزانِ من! سننا چاہتے ہیں کہ منافقین کے متعلق قرآنِ کریم نے کیا کہا ہے، پھر کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس آئینے میں کس کی شکل نظر آ رہی ہے۔ گویا یہ سارے کا سارا ہمارے متعلق نہیں کہا گیا؟ ٹھیک ہے کافر نہیں ہیں، دھڑلے سے ہم یہ کہتے ہیں اور ذہن میں یہ فیصلہ کر لیتے ہیں جو کافر نہیں ہوتا، وہ مومن تو ہوتا ہی ہے جسے Process of elimination کہتے ہیں کہ ہم کافر نہیں ہیں لہٰذا ہم مومن ہیں۔ اور یہ جو درمیان میں ہیں یہ کہاں چلا گیا؟ کہ جی یہ مدینے میں ہوا کرتے تھے ''ہُن نئیں ہوندے ہیگے''۔ وہ چھوڑتا ہے؟ اس نے تو یہ گروہ ہی نہیں کہا ان کے سارے خدوخال بیان کر دیے ہیں عزیزانِ من! تو لیجیے اور دیکھتے چلے جائیے کہ کس کے اوپر یہ فٹ ہوتا ہے۔ کہتا ہے پھر ان کی کیفیت یہ ہے وَمِنۡهُمُ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ النَّبِیَّ (9:61) یہاں تک پھر ان کی کیفیت ہو جاتی ہے کہ جی تو چاہتا نہیں اس قسم کے احکام کو ماننے کو جس میں قربانی دینی پڑے، محنت کرنی پڑے، مشقت اٹھانی پڑے اور اس سے بچنے کا طریقہ۔ کہا کمینگی کی انتہا ہے کہ اتنی بڑی ہستی جس کے خلاف دشمن تک بھی ایک لفظ اپنی زبان پہ نہیں لاتا یہ اس کو بھی اذیت دینے سے نہیں چوکتے۔

پیچھے یہ آیت ابھی گذر چکی ہے وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ (9:58) کیفیت ان کی یہ ہے کہ یہ جو اس نظامِ ربوبیت کی رو سے تقسیم کرتا ہے سامانِ نشو ونما اس میں بھی تمہارے خلاف الزام تراشیاں کرتے ہیں کہ جی ان کو زیادہ دیدیا۔

نبی اکرم ﷺ پر کانوں کا کچا' جیسے حقیر الزامات کی نوعیت اور لفظ اذن کا لغوی مفہوم

قرآن حکیم نے اس الزام تراشی میں یہ نہیں کہا کہ کسی اصول کی بناء پہ یہ کرتے ہیں۔ کہا فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا وَ اِنۡ لَّمۡ يُعۡطَوۡا مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ يَسۡخَطُوۡنَ (9:58) بات ساری یہ ہے کہ اگر ان کو زیادہ دیدیا جاتا تو پھر وہ تقسیم جو تھی وہ منصفانہ ہوتی اور انہیں چونکہ ان کی مرضی کے مطابق نہیں ملا اس لیے یہ غیر منصفانہ ہوگئی۔ الزام یہ ہے۔ اور کیا الزام لگاتے ہیں وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ اُذُنٌ (9:61) عربی زبان میں لفظ اذن کان کو کہتے ہیں عام طور پہ اسے کہا کرتے ہیں وہ کانوں کا کچا ہے۔ پہلی چیز تو کان کے کچے کی یہ ہے کہ ہر ایک کی سن لیتا ہے۔ عزیزانِ من! دو دو لفظوں کی تین باتیں آگے کہی گئی ہیں غور کیجیے قرآن کے کہنے کا انداز جو تھا۔ اس قدر اس میں جامعیت ہے ارتکاز ہے۔ کہا کہ کیا خیال ہے تمہارا ایک شخص وہ ہے جو کسی کو پاس نہیں پھٹکنے نہیں دیتا' کسی کی بات نہیں سننا چاہتا' دفعہ ہو جاؤ دور ہو جاؤ خبردار میرے قریب کوئی نہ آئے۔ ایک وہ شخص ہے جو کچھ کہنا چاہتا ہے' اس کو کہتا ہے کہ ہاں بھئی کیا بات ہے۔ کہا تم ہی بتاؤ کہ ان دونوں میں سے تمہارے نزدیک کون اچھا ہے۔ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّـكُمۡ (9:61) کہا اوکم بختو اگر دل میں تمہارے یہ جذباتِ بغض اور عداوت ہیں ان کو نکال دو تو یہ چیز خود تمہارے حق میں جاتی ہے کہ بات سننے والا ہے یہ شخص۔ پہلی چیز تو یہ ہوگئی۔ اب اس کے بعد سننے والے میں عیب کی بات یہ ہوگی کہ جو کوئی کان میں ڈال گیا اس پہ اعتبار کر لیا اور اس کے مطابق پھوٹ نکلے۔ پھر اس کی یہی چیز غلط ہوگی۔ اور اگر وہ سننے کے بعد اس کی تحقیق کرلے' تفتیش کرلے' تصدیق کرے پھر جو بات صحیح ہو اس کے مطابق عمل کرے تو اس کا یہ بات سن لینا جو ہے تو پھر کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کس قدر معقول بات ہے جو قرآن کہتا ہے۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ (9:61) آگے دیکھئے عزیزانِ من! کس انداز سے بات وہ کرتا ہے يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ (9:61) عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ يُؤۡمِنُ (9:61) کے ساتھ ب آئی ہے باللّٰہ' اگلا يُؤۡمِنُ (9:61) ہے وہ ل آیا ہے لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ (9:61)۔ یہ عربی زبان عجیب وغریب ہے یہ جو اتنی Preposition اس میں آتی ہے اس میں کہیں سے کہیں معنی چلے جاتے ہیں۔

بغیر تحقیق کے کسی بات کو تسلیم کرنا قرآن حکیم کی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے

ویسے تو ہر زبان میں Prepositions ہیں Fight for اور Fight Against میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں تو جو حروفِ جار آتے ہیں یہ کہیں سے کہیں بات پہنچا دیتے ہیں۔ ''حروفِ جار'' اس میں آئے ہیں ان دونوں کے فرق میں بات بالکل

نکھار کر سامنے لے آیا ہے۔ کہنے لگے پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہر ایک کی سن لیتا ہے اور اس کے بعد یہ بھی تو تمہیں معلوم ہے کہ خدا کے دیے ہوئے احکام اصول اقدار ان پہ ایمان رکھتا ہے' ان میں زیادہ نہیں تو دو تین تو تمہیں بھی معلوم ہیں۔ یہ اس پہ ایمان رکھتا ہے کہ **لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا** (17:36) یہ ایمان رکھتا ہے اس چیز پہ کہ خدا نے کہا ہے کہ کوئی بات جو تم تک پہنچے اس کے پیچھے یونہی نہ لگ جایا کرو خود تحقیق کیا کرو۔ یاد رکھو تمہارے کان تمہاری آنکھیں تمہارا قلب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے تحقیق کے بعد یہ بات مانی تھی یا ویسے ہی مان لی تھی۔ کہا جس شخص کا ایمان ہو کہ جو اس کے کان میں کوئی ڈال گیا اس نے اس کو مان لیا اور چل پڑا اس کے اوپر۔ (یؤمن باللہ) تمہیں معلوم ہے کہ یہ تو خدا کے احکام پہ ایمان رکھتا ہے اور اس کا حکم یہ ہے۔ اور پھر اس کا حکم یہ بھی تو ہے **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ** (49:6) یاد رکھو جب بھی کوئی فاسق کوئی خبر تم تک لائے یونہی نہ اس کے اوپر عمل کرنا شروع کر دیا کرو۔ فَتَبَيَّنُوْٓا اچھی طرح تحقیق کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم محض اس کی بات سن کر جو اس نے کسی کے خلاف کہی ہے اس کے مطابق عمل کرو اور چڑھائی کر دو اس کے اوپر' اس کی مخالفت شروع کر دو۔ اور بعد میں تمہیں پتہ چلے کہ وہ بات ہی غلط تھی کہا کس قدر ندامت تمہیں اٹھانی پڑے گی اس وقت۔ کبھی ایسا نہ کرو۔

قرآن حکیم کے احکام اور نبی اکرم ﷺ کی سنت

جن کے متعلق یہ چیز کہی گئی ہو' خدا کے یہ احکام ہوں اور ان پہ وہ شخص ایمان رکھتا ہو۔ اس شخص کی یہ خصلت کہ وہ بات سن لیتا ہے ہر ایک کی' کہا کہ یہ چیز اس کے لیے عیب ہو سکتی ہے؟ عیب تو اس کے لیے ہو سکتی ہے جسے واقعی کانوں کا کچا کہا جائے' سنی بات اور چل پڑے اس کے پیچھے۔ قرآن تو یہ چیز کہتا ہے جس بات کی خود تحقیق نہ کر و اس کے پیچھے مت چلا کرو۔ تو کہا کہ یہ تو یؤمن باللہ والا ہے یہ تو خدا کے احکام و اصول پر ایمان رکھتا ہے اس لیے سوال ہی نہیں ہے کہ کوئی کچھ کہہ دے بغیر تحقیق و تفتیش کے یہ اس کو صحیح مان لے گا اور اس کے اوپر چل نکلے گا۔ یہ مانتا ہے صحیح بات' یہ جو للمؤمنین ایمان جو ہے یؤمن للمؤمنین' اس ''ل'' کے معنی ہوتا ہے اعتماد کرنا' یہ اعتماد کرتا ہے ان پر جو ان احکامات پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ ٹھیک ہے دیکھی ہوئی پرکھی ہوئی جماعت پہ اعتماد کرتا ہے' ہر ایک کی بات پہ اعتبار نہیں کرتا۔ اور ان کی بھی جو بات آتی ہے فرسٹ ری ایکشن اس کا یہ ہوتا ہے کہ یہ صحیح بات ہو سکتی ہے اور اس کے بعد تحقیق کرنا تو اس کے لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ کہا دیکھو تو سہی جو اس قسم کا لیڈر سربراہ قائد ہو' وہ ہر ایک کی بات سن لیتا ہے یہ خوبی کی بات ہے یا عیب کی بات ہے۔ کہا مشکل یہ ہے کہ تمہارے آنکھوں کا چشمہ ایسا رنگین ہے کہ تمہیں اس کی ہر خوبی بھی عیب بن کر دکھائی دیتی ہے۔ اس کی کیفیت یہ

ہےوَ رَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ (9:61)۔

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام انسان کے لیے رزقِ کریم کی شکل میں رحم مادر کی صفات کا حامل ہوگا

عزیزانِ من! نشوونما میں احسان کسی کا اٹھانا پڑ جائے' عزتِ نفس مجروح ہوجائے' اُس رزق سے موت اچھی ہے۔ قرآن کہتا ہے رزق ہی نہیں ملتا' دنیا کے نظاموں میں تمہیں رزق مل جائے گا' ہماری طرف سے رزقِ کریم ملے گا' باعزت روٹی ملے گی۔ اور سب سے بڑی چیز یہ ہے بچے کی ماں جو پرورش کرتی ہے۔ اور ماں کی پرورش کا تو انداز ہی اور ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! رحم کے اندر کی پرورش کا تو آپ پوچھیئے ہی نہیں' پتہ نہیں کہاں کہاں سے وہ سامانِ نشوونما کس کس طریقے سے اس بچے کے قابل بنتا ہے' اندر ہی اندر وہ تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور اس کو خود بخود ملتا رہتا ہے اس کو احساس تک بھی نہیں ہونے پاتا۔ احسان اٹھانا تو ایک طرف رہا یہ کیفیت ہوتی ہے رحم میں لوچ اور لچک اتنی ہوتی ہے کہ اس میں سختی اور کرختگی نہیں ہوتی۔ کوئی نظام اور کوئی قانون جس میں کسی کو رزق ملتا ہے جسے؟؟ کہتے ہیں سختی اور کرختگی اس کے قالب میں اگر ہڈیاں پس رہی ہوں اس کی' ملتا تو ہو کھانے کو' لعنت ہے اس ملنے پہ۔ اس روٹی کی سب سے بڑی ضمانت جس میں یکسانیت بھی ہوتی ہے۔ مساوات کا لفظ ہمارے ہاں چل پڑا ایک۔ مساوات بھی ہوتی ہے۔ اور ضمانت ہوتی ہے روٹی کی' سب سے بڑی ضمانت اس انداز کی' مساوات کے انداز کی' جیل خانے میں ہوتی ہے۔ ہر ایک کی روٹی کپڑا مکان اور جان کی حفاظت کے لیے باہر سپاہی کھڑے ہوتے ہیں۔ کہا سبحان اللہ یہ انداز تو کسی قصرِ شاہی میں ہوگا یا جیل خانے میں ہوگا۔ اس کے باوجود جیل خانے کی زندگی کو بدترین زندگی کیوں کہا جاتا ہے۔ ایک چیز اس میں نہیں ہوتی' عزتِ نفس باقی نہیں رہتی۔

غیر قرآنی معاشرے میں رزق کی دستیابی اور جنتی معاشرے میں رزق کی فراوانی میں ایک بنیادی فرق ہے

بڑے سے بڑا نظام آپ جو قائم کر دیں گے جسے آپ Socialistic نظام بھی کہتے ہیں اس کے لیے یہی کہا جاتا ہے کہ بنیادی ضروریاتِ زندگی روٹی کپڑا اور مکان یہ ہیں' ان کی ضمانت دی جائے گی۔ بہر حال میں تسلیم کرتا ہوں کہ کہیں ایسا ہوگا کہ اس کی ضمانت بھی دیدی جائے۔ ضمانت ہی نہیں میں کہتا ہوں مہیا بھی کر دیا جائے۔ پھر اس پہ مساوات بھی آپ لے آئے ہیں۔ چلیے مساوات کے معنی یکسانیت ہی لے لیجئے حالانکہ Equality اور Uniformity میں بڑا فرق ہوتا ہے لیکن اگر یکسانیت بھی اس کے اندر آ جائے ایک جیسے کپڑے' ایک جیسی روٹی' ایک جیسے مکان' ایک جیسا حفاظت کا سامان۔ تو اس کا سب سے بہتر نقشہ تو جیل خانہ ہے۔ تو اگر یہ اتنی سی چیز ہی ہو تو ملک بڑا سا جیل خانہ تو بن جائے گا' جنت نہیں بن سکتا۔ اس میں یہ چیزیں ہیں نہیں' شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کی بنیادی شرط ہوتی ہے۔ یہ چیز جو دی ہے قرآن نے رَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (9:61) رحمۃ للعٰلمین بڑی غور طلب چیز ہے یہ۔ ہمارے ہاں تو بس

رحمتِ دوعالم ہیں اور پھر وہ رحمت کے بادل امڈ کر آتے ہیں وہ تو پھر قیامت میں ہیں۔ سارے گنہگار حساب کتاب کی رو سے جہنم میں دوزخ میں۔

کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے بغیر نہ رہ جائے

یہ وہ پروسیس ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے دن سے مکافاتِ عمل کا بیان کیا۔ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوگا اس کے مطابق جزا اور سزا ہوگی یہ سب کچھ۔ یعنی اتنی بڑی مشینری اللہ تعالیٰ نے قائم کی۔ مشینری کا پوچھتے ہیں تو قرآنِ کریم میں ہے کہ سلسلۂ ارض وسماء' کائنات کا یہ سلسلۂ یہ گردشِ لیل ونہار' یہ تکویرِ شمس وقمر یہ تمام سلسلۂ کائنات اس لیے ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل بغیر نتیجے کے نہ رہ جائے۔ یا اللہ۔ یعنی اس نے اتنا بڑا سلسلۂ کائنات کھڑا کیا' پتہ نہیں اس کے الفاظ میں یہ ملائکہ کتنے ہیں جو لکھنے پہ ہی مامور ہیں' میزانیں کتنی کتنی بڑی ہیں جو تولنے پہ مامور ہیں' رجسٹر وہاں بنے ہوئے ہیں جن میں اندراجات ہوئے ہوئے ہیں' اتنا بڑا وہ میدانِ قیامت خود اس کے اندر اللہ تعالیٰ کرسی عدالت پہ بیٹھا ہے ایک ایک کا حساب کتاب مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ o وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ(99:7-8) وہ ذروں کے برابر بھی جسے نیکی اور بدی کہتے ہیں اس کا حساب ہو رہا ہے اس کے مطابق یہ بتایا جا رہا ہے کہ کیا فیصلہ ہوا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ یہ سزا کے قابل ہے' سزا میں بھیج دیا۔

اعمالِ انسانی کا نتیجہ روایت کی روشنی میں

دیکھا آپ نے کتنا Elaborate سسٹم ہے۔ یہ سارا کچھ کیا اور اس کے بعد آ گئی یہ روایت رحمتِ دوعالم تشریف لے آئے' اللہ تعالیٰ نے دفتر بند کیا' چھٹی مل گئی آپ بھی جانے لگے اور اس کے بعد دیکھا دھیان مار کے کہ وہ میدان میں کوئی شخص سجدے میں پڑا ہوا ہے۔ یہ حدیث شریف ہے عزیزانِ من!۔ اللہ میاں پھر بیٹھ گئے' کہنے لگے کہ یہ ایک آدمی جو رہ گیا ہے اس کے ساتھ حساب کتاب نہیں ہوا۔ کہا کون ہے اٹھاؤ' تو کہنے لگے وہ تو سجدے سے اٹھتا نہیں ہے۔ اللہ میاں خود چلے گئے' کیا بات ہے اٹھیے' کہنے لگے کہ جناب میں کیسے اٹھ سکتا ہوں' میری امت کو تو جہنم میں بھیج دیا اور مجھے کہا جا رہا ہے کہ میں جنت میں جاؤں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اچھا جی۔ اب محبوب کی ادائیں آ گئیں شاعری میں۔ ہوا حکم کہ نکالوان میں سے ''اورگ بھر کے کڈیاتے فرشتیاں دارگ وی تہانوں پتہ اے''۔ بہرحال یہ سارا کچھ ہوا پھر وہ جہنم خالی ہوا اور اس کے بعد آپ ﷺ اٹھے اور اُمتی اس طرح نعرے لگا رہے تھے جیسے جلوس نکلتا ہے' وہ کہہ رہے تھے کہ ہاں یہ ہے رحمۃ للعلمین۔ یعنی وہ سارا بکھیڑا جو معاذ اللہ اللہ میاں نے کیا تھا مکافاتِ عمل کا' پہلے دن سے انبیاء کو بھیجنا شروع کیا' قیامت کے دن تک خود عدالت لگائی اس مقصد کے لیے کہ ذرہ ذرہ عمل کا حساب میں آئے اور اس کے مطابق یہ کچھ ملے۔ وہ سارا قصہ ایک طرف اور

ایک سیلاب کی لہر جو آئی تو سارا کچھ بہا کے لے گئی۔ وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (21:107)۔ کیا کہنے ہیں صاحب۔

شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کے سلسلہ میں رحمت اللعالمین کا ذکر خیر اور اس کی عملی وضاحت

رحمت۔ سامانِ نشوونما حیوانات کو ملتا ہے صرف طبعی زندگی تک۔ ان کی زندگی اس سے آگے ہوتی نہیں ہے کھانا پینا مکان وغیرہ۔ انسان میں جب زندگی شروع ہوتی ہے تو اس کی ایک زندگی انسانی زندگی بھی ہوتی جہاں Values شروع ہوتی ہیں' اقدار شروع ہوتی ہیں۔ انسان کے لیے سامانِ نشوونما دونوں اقسام میں آئے گا۔ اس کی طبعی زندگی کے لیے بھی یہ ضروریات جسے آپ روٹی کپڑا اور مکان کہتے ہیں اور اس کی انسانیت کی نشوونما کے لیے بھی جسے شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ملیں گی تو انسانوں کی صورت میں اسے رحمت کہا جائے گا۔ وہ رحمت عام اس لیے ہے کہ نہ تو یہودیت کی طرح وہ ایک نسل کے اندر پابند ہے کہ صرف بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا ہونے والے جنت میں جائیں گے' نہ عیسائیت کی طرح اس کفارے پر ایمان رکھنے والوں تک کے لیے محدود ہے۔ یہاں دروازہ کھلا ہے ساری دنیا کے لیے کہ جو بھی ان اقدار اور اصولوں کے اوپر ایمان لے آئے یعنی انہیں صحیح زندگی کا پیمانہ بنا لے' اُسے یہ رحمت ملتی جائے گی۔ تو وہاں کہا یہ گیا ہے کہ وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (21:107)۔

رحمت کا لفظ وحی کے لفظ کے علاوہ' اصول و اقدار کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے

جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ رحمت پھر کیا ہے۔ ہمارے ہاں تو پھر یہ شاعری میں ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ کہتا ہے (قُلۡ اِنَّمَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ) (21:108) ان سے کہہ دو کہ یہ میری وحی ہے' یہ ہے رحمت اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ (21:108) اور کہا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (21:108) کیا جھکتے ہو یا نہیں اس کے سامنے۔ دیکھا رحمت کے ساتھ کیا کہا۔ اور آگے کہا کہ وَ رَحۡمَۃٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ (9:61) یہ رحمت ان کے لیے ہوسکتی ہے جو ان اصول و اقدار کی صداقت پر یقین رکھیں مگر ان کے لیے صرف رحمت ہے۔ جو یہ یقین رکھنے والے اور عمل کی رو سے جنت میں جانے والے ہیں ان کے لیے تو یہ رحمت بناتے نہیں ہیں اور یہ جتنی چیزوں سے اعراض برتتے ہیں' سرکشی برت کے' بغاوت کر کے ان کے خلاف زندگی بسر کر کے جہنم کے مستحق ہوتے ہیں' ان کے لیے یہ رحمت بنا رہے ہیں۔ اور قرآن حکیم کہہ رہا ہے رَحۡمَۃٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ (9:61)۔ میرا خیال ہے آپ نے اس سے پیشتر یہ حصہ آیت کا کبھی سنا ہی نہیں ہوگا۔ وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (21:107) آپ نے ہر وعظ میں ہر میلاد کی مجلس میں سنا ہوتا لیکن یہ ٹکڑا کبھی نہیں سنا ہوگا وَ رَحۡمَۃٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ (9:61)۔ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (9:61) اور جو باعثِ اذیت اس طرح سے بنتے ہیں' ان کے لیے دردانگیز عذاب ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے حضور منافقین کا کردار اور مومنین کا فریضہ

عجیب عجیب فیز آ رہے ہیں ان منافقین کے۔ نظام قائم ہو رہا ہے۔ افراد ہی تو ہوتے ہیں اس میں بھی جن پر وہ مشتمل ہوتا ہے۔ دیکھئے فرق کتنا ہے۔ یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِیُرْضُوْكُمْ (9:62) یہ لوگ تمہارے پاس الگ الگ آئیں گے اور قسمیں کھا کے کہیں گے کہ ہم تمہیں راضی کرتے ہیں آؤ معاملہ کرو ہمارے ساتھ کیا کرتے ہو۔ دیکھا آپ نے منافقت کہاں جا رہی ہے۔ پارٹیوں کے ممبر توڑنے کی چیزیں جو ہیں۔ قسمیں کھا کھا کے تمہیں کہیں گے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں' کہو کن شرطوں پہ راضی ہوتے ہو۔ کہا ان کو بتا دو کہ یہ میکیاوَلی سیاست نہیں ہے' یہ مذہب کی دنیا نہیں ہے' یہاں افراد سے واسطہ نہیں ہے کہ ان کو راضی کر لیا جائے۔ یہاں سوال ہی کچھ اور ہے ۔وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ (9:62) مؤمن ہو تو یاد رکھو' راضی کرنا ہو گا اس نظام کو جو خدا کے احکام کے مطابق رسول نے قائم کیا ہے' اس کو راضی کرو۔ افراد کو راضی کرنے کا یہاں سوال ہی نہیں ہے۔ منافق افراد کو توڑتا ہے اس میں سے۔ مؤمن نظام کو راضی رکھتا ہے۔ کہا یہ ہے فرق۔ آپ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ من!۔ بہر حال آگے منافقت کی بات آئے گی تو میں سمجھتا ہوں ایک آدھ درس کیا' جب اپنی بات کہنی ہو گی تو پھر تو پتہ نہیں کتنے درس اس میں چلیں گے۔ ایک ایک کر کے قرآن نے بتا دیا ہے منافقت کا کہ سب سے زیادہ خطرہ کسی نظام کو منافقین سے ہوتا ہے جو نقاب اوڑھ کر آتے ہیں اسلام کا' اقامتِ دین کا' خدا اور رسول کا نام زبانوں پر ہوتا ہے۔ اور آتے اس لیے ہیں کہ کسی طرح یہاں پر نظام اسلام قائم نہ ہونے پائے۔ ایک ایک جزو قرآن نے بتا دیا کہ کیا کرتے ہیں۔ افراد کے پاس جائیں گے الگ الگ' ان سے سودے بازی کریں گے (لِیُرْضُوْكُمْ (9:62) یہ کریں گے۔ تو کہہ دو کہ یہ نظام وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ (9:62) اس میں افراد کا راضی رکھنا' افراد کا ناخوش ہو جانا' کچھ معنی ہی نہیں رکھتا۔ اس میں تو تم نے جا کے جسے راضی کیا۔ یہ رضوا کے معنی ہیں ہم آہنگ ہو جانا ہے۔ یہ لفظِ راضی ہے' اپنے اللہ کو راضی کر لو' خدا کی خوشنودی جو ہے جیسے خدا بگڑا ہوا بیٹھا ہے اور ساری کوشش انسانوں کی یہ ہو رہی ہے کہ اُسے راضی کر رہے ہیں۔ سب سے بڑی چیز جو آپ کے ہاں کہی جاتی ہے' خوشنودیٔ باری تعالیٰ کے لیے' اللہ کو خوش کرنے کے' بس وہ خوش گیا'' تے موجاں ہو گئی او ناراض ہو گیا تے اوہنے جناب ہل چلوائے''۔ معاف رکھیے گا میں جیسا کہا کرتا ہوں' کہتے تو یہ ہیں کہ جو سلطان یا بادشاہ تھا ان کا وہ ظِلُّ اللّٰهِ علی الارض تھا' خدا کا سایہ تھا زمین پہ۔ یہ غلط ہے۔ ان کے تصور کی رو سے جو آسمان کا خدا تھا وہ سایہ تھا زمین کے بادشاہ کا۔ جس قسم کا ان کے سامنے وہ بادشاہ آتا تھا اور یہ اسے خدا بنا دیتے تھے۔ ہندو کا یہی تصور تھا کہ عام آدمی کا ایک سر ہوتا ہے اور خدا ہوتا' دس سر ہو جاتے ہیں' عام آدمی کے دو ہاتھ ہوتے ہیں' درگا مائی کے چھ ہاتھ ہوتے ہیں۔ یعنی اُسی کو ذرا بڑے پیمانے پہ لے گئے۔ ان کی بھی یہ کیفیت ہے۔

خدا تعالیٰ کا مذہبی سطح پر پایا جانے والا تصور

دنیا میں ملوکیت کی بنیاد اس پہ ہوتی ہے کہ اگر اس فرد کو تم نے کسی طرح سے راضی کر لیا تو راوی عیش لکھتا ہے۔ اگر وہ فرد ناراض ہو گیا تو پھر آپ کہیں کے نہ رہے۔ یعنی صرف اس فرد کی خوشنودی اور ناراضگی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مذہب کی دنیا میں سارا زور اس پہ دیا جا رہا ہے کہ خدا کی ناراضگی مول نہ لو' خدا کو خوش کر لو کسی طرح سے۔ یعنی عمل کے مقصد کی انتہا خوشنودئ باری تعالیٰ ہے۔ عزیزانِ من! یہ خوش ہونا اور ناراض ہونا یہ تو انسانی جذبات ہیں۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (3:97). سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ (23:91) یہ جو تم اس کی صفات بیان کرتے ہو اپنے پیمانے کے مطابق' وہ اس سے بہت بلند ہے۔ خدا تو وہ ہو سکتا ہے جو انسانی جذبات سے مبراء ہو۔ جسے غصہ آ جائے' جو یونہی راضی ہو جائے مہاراج رنجیت سنگھ ہوا ''خدا کا بدا ہویا''۔ وہاں تو اٹل قانون چلتا ہے۔ یہ افراد کو راضی کرنا چاہتے ہیں۔ سوال نہیں ہے۔ اس نظام کو راضی کرنا ہوگا۔ اس میں قطعاً یہ نہیں کہا کہ صرف خدا کو راضی کرنا ہوگا۔ آپ دیکھتے ہیں اس نظام کے متعلق ہے جو خدا کی دی ہوئی وحی کے مطابق رسول نے قائم کیا' اس نظام کو کامیاب کرو۔ اِنْ کَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ (9:62) مومن یہ کرتا ہے۔

افراد کو خوش کرنے کی غرض سے قانونِ خداوندی سے اجتناب کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ (9:63) کہتا ہے یہ افراد کو راضی کر رہے ہیں' انہیں اس کا علم نہیں ہے کہ افراد کو راضی کرنا اور خدا کے دیے ہوئے قوانین سے دشمنی مول لینا' نتیجہ اس کا کیا ہوگا؟ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ (9:63) ذلت اور رسوائی۔ ''عظم'' عربی زبان میں یہ جو ہڈیاں ہوتی ہیں انہیں کہتے ہیں بنیادی طور پہ۔ ہڈیوں کے گودے تک جو جراثیم ذلت اور رسوائی کے چلے جائیں وہ ہے اس کا نتیجہ۔ اوپر اوپر کا مرض نہیں' وہاں تک۔ توبہ توبہ۔ خزیٔ بھی ہے اور خزیٔ کی یہ کیفیت ہے کہ خزیٔ عظیم ہے' عذاب ہے' تو عظیم ہے۔ اور پھر عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ اس باب پہ جو وزن آتا ہے فعیل کے باب کے اوپر' اس کے معنی ہوتا ہے کہ وہ چلا جاتا ہے مسلسل متواتر' ہمیشہ آگے چلا جاتا ہے' ہنگامی طور پہ نہیں آتا۔ ہنگامی طور پہ آنے والا ایک دفعہ آتا ہے شدت اس کی بڑی ہوتی ہے لیکن ایک وقت آتا ہے' ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد۔ یہ تو تپ دق ہے اسی لیے عظیم کہ اس کے جراثیم ہڈیوں کے گودے تک گئے ہوئے ہوتے ہیں۔ مسلسل متواتر بتدریج چمٹا رہتا ہے ساتھ۔ کہتا ہے یہ ذلت اور رسوائی ہنگامی نہیں ہے۔ ہنگامی تو کسی ایک میدانِ جنگ میں شکست کھائی وہاں یہ اس وقت کے لیے ہوگا۔ اور وہ شکست کھانا بھی عزیزانِ من! ذلت نہیں ہوتا۔ قرآن کہتا ہے تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ (3:140) یہ تو گردشِ دولابی ایک کنویں کی ''کدی ٹنڈاں بھریاں ہویاں ہوندیاں کدی خالی تھلے چلیاں جاندیاں ہیگیاں نیں' اج تہاڈی اے ٹنڈ خالی ہیگی اے' ذرا ہور گیڑ دیو

بھر کے اتے آوے گی' کھوہ چلدار ہوے سہی' کوئی حرج نہیں اگر کسے ویلے ٹنڈ خالی وی ہے' بھر کے نکلے گی اے جیہڑی ہیگی اے' لیکن جیہدا کھوہ ای کھلو گیا برادرانِ عزیز! تے ایس نے کتھوں بھرنا ہیگا''۔ یہ خزیٔ عظیم نہیں ہے۔ خزیٔ عظیم ہوتی ہیں مسلسل متواتر' علی التواتر جو چلی آئے۔

ہمارے ہاں گذرے واقعات کو پیش کرنے کا مقصد صرف مناظرے جیتنے کے لیے ہوتا ہے

تو پہلا دور جس کو ہم پیش کر دیتے ہیں ایک درخشندہ دور' اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے دوسروں سے مناظرہ جیتنے کے لیے۔ اتنا ہی اس کا مقصد ہمارے ہاں اس تاریخ کا رہ گیا ہے کہ دیکھئے نا کیا کر کے دکھا دیا ہے۔ چلیے خوش ہو گئے۔ اور اس کے بعد ساری تاریخ گناتے چلے جاتے ہیں عزیزانِ من! خزیٔ عظیم کی تاریخ ہے آپ کی' داستان ہی ذلت اور رسوائیوں کی ہے۔ کس چیز کی وجہ سے؟ افراد کو راضی رکھتے ہو' نظام کے خلاف جنگ کرتے ہو کہ کہیں خدا اور رسول کا قائم کردہ نظام دوبارہ نہ آ جائے۔ اس کی مخالفت کرتے ہو افراد کو راضی رکھتے ہو۔ نتیجہ ''خزیٔ عظیم''۔

قرآنی نظام حیات کو عملاً متشکل کرنے کا تصور صدیوں سے اوجھل ہے

عزیزانِ من! ساری داستان یہ ہے کہ افراد کو راضی رکھا ہے آپ نے' زندہ سامنے ہے اگر تو ظلُّ اللہ اس کو کہا ہے آپ نے' جھکے ہیں اس کے سامنے' سجدے بھی کیے ہیں ان افراد کے سامنے۔ اور اس کے بعد اگر اس دنیا کو جسے آپ روحانیت اور مذہب کی دنیا کہتے ہیں' وہ بھی چند افراد کا نام ہے کسی کو رحمۃ اللہ علیہ' کسی کو آپ نے رضی اللہ تعالیٰ کہہ دیا' افراد ہیں۔ نظام کو رکھنے کی کبھی بات آپ نہیں کرتے۔ غلط نظام کے اندر عزیزانِ من! افراد اگر اپنے اندر کچھ خوبیاں بھی رکھتے ہیں جو ان کی ذات تک محدود ہیں' کتنے ہی درست کیوں نہ ہوں' کتنے خوش اطوار کیوں نہ ہوں' ان کی اپنی ذات تک کی کوئی چیزیں ہیں۔ خدا کے نزدیک تو سوال یہ ہے کہ تم اس نظام کے قیام کے لیے کیا کرتے ہو۔ یعنی نظام کو راضی رکھنے کے لیے کیا کرتے ہو' افراد کو تو تم راضی رکھتے ہی ہو۔ مذہب میں افراد اپنی نجات کے لیے کچھ کرتا ہے افراد ہی کو راضی رکھتا ہے۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ ان کے احبار و رہبان' وہ خدا بن جاتے ہیں یہ کیا بات ہے۔

مذہب کا تمام تر دارومدار ہمیشہ اشخاص تک محدود ہوتا ہے' دیکھیے دورِ خلافت کے بعد کی تاریخ ان حقائق کی آئینہ دار ہے

آپ نے غور کیا اس میں فرق کتنا ہے۔ احبار و رہبان کے متعلق اگر آپ ان کی بات مانیں گے تو افراد کو آپ راضی رکھیں گے۔

مذہب کی دنیا میں کہیں نہ کہیں کسی شخصیت کے اوپر معاملہ چلا جاتا ہے۔ فقہ حنفی امام اعظمؒ فقہ شافعی امام شافعیؒ کے اوپر جا کے سلسلہ چشتیہ معین الدین اجمیریؒ پر۔ افراد۔ دین کی اقامت جب ہوتی ہے جسے آپ نظام کہتے ہیں۔ عجیب چیز ہے حالانکہ بلند ترین ممتاز شخصیتیں تھیں جن کو آپ خلفائے راشدینؓ کہتے ہیں۔ اب بھی ہمارے ہاں غیر شعوری طور پر خلافتِ راشدہ ہم کہہ کے اس کو بیان کرتے ہیں افراد نہیں لاتے اس کے اندر۔ یہ ہے نظام۔ وہاں سے ہم آگے چلتے ہیں۔ یہ خلافتِ راشدہ چاروں خلفاء اتفاق سے قریشی تھے۔ یہ مملکتِ قریشیہ نہیں تھی اسے کہا ہی خلافتِ راشدہ ہے۔ وہ نظام راشد تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نظام کے جو سربراہ افراد تھے یقیناً یہ بھی راشد تھے۔ لیکن آپ دیکھئے اس دور کے اندر مسلمان کتنا گہرائیوں میں جاتا تھا۔ ان کے نام سے یہ چیز نہیں کہی حالانکہ ان کو ہی راشد مانتے ہیں۔ اس نظام کو راشدہ کہا ہے انہوں نے۔ یہ تھی چیز۔ اور جب گاڑی دوسری پٹڑی پہ جا پڑی تو پھر خلافت نہیں سلطنتِ امیہ شروع ہوگئی۔ سلطنتِ عباسیہ شروع ہوگئی۔ سلطنتِ فاطمیہ شروع ہوگئی صاحب تقویہ شروع ہوگئی عثمانیہ شروع ہوگئی مغلیہ شروع ہوگئی۔ یہ ساری چیزیں جتنی آپ دیکھتے ہیں ان خاندانوں کے اندر آ کے گھر گئیں۔ اس کے بعد پھر مسلمانوں کی سلطنت کہیں قائم نہ رہی خلافتِ راشدہ تو بہت بڑی چیز ہے۔

ملتِ اسلامیہ پر علامہ اقبال اور قائداعظم کا احسان عظیم اور دین حق کے قیام کا تذکرہ

تاریخ میں پہلی دفعہ یہ Concept یہ تصور دیا یہاں علامہ اقبالؒ نے اور قائداعظمؒ نے آ کر کہ بابا کسی خاندان کی سلطنت نہیں کسی فرد کی مملکت نہیں بلکہ ایک نظام جو خدا کی دی ہوئی اقدار اور اصولوں کے مطابق یہاں قائم کیا جانا ہے۔ اس تصور کے لیے یہ خطۂ پاک لیا گیا۔ یہ بہت بڑا تجربہ تھا جو یہاں ہونا تھا۔ ٹھیک ہے اس وقت تک ہم اس میں ناکام ہیں لیکن ہم تو ناامید نہیں ہیں ہم تو پرامید ہیں۔ اور وہ اس لیے پرامید ہیں کہ بہرحال کوئی خطۂ زمین ہو یہ خطۂ زمین نہ ہو کوئی اور خطۂ زمین ہو اس کا وعدہ ہے کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) تو دنیا کے ہر نظام کے اوپر اس نظام نے غالب آنا ہے۔ یہ دیکھئے افراد نہیں کہا قرآن نے یہاں۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ (9:33) رسول کی عظمت بھی اس لیے ہے کہ وہ لے کے آیا ہے ایک دینِ حق کو ایک نظام جو حق پر مبنی ہے۔ اور وہ لے کے آیا ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) انسانی ذہنوں کے خود ساختہ نظاموں پر آخرالامر یہ غالب آ کر رہے گا۔ نظام کہا ہے۔

مومن اور منافق کے کردار میں فرق اور اس کا انجام

قرآن حکیم نے اسے دین الحق کہا ہے۔ فرد نہیں کہا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے جانشینوں نے بھی جو قائم کیا تھا تو یہ دین الحق قائم کیا تھا نظام قائم کیا تھا حق پر مبنی۔ افراد نہیں آتے تھے۔ اس لیے یہ کہا کہ تم افراد کو راضی رکھتے ہو يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (9:63) اور

نظامِ خداوندی کی مخالفت کرتے ہو۔نتیجہ اس کا نارِجہنم خَالِدًا فِيهَا ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ (9:63)۔کہتا ہے يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ (9:64) کہتا ہے ہروقت ان کو یہ پریشانی رہتی ہے کہ کہیں کوئی ایسی سورۃ نازل نہ ہوجائے جن میں ہمارا نام لے دیا جائے۔یعنی منافق' قرآن نے کہا ہے کہ جہنم کے اندر کافر بھی ہوتا ہے جوان اقدار کو نہ مانے۔کافر گالی نہیں ہے کوئی' Non-Member جس کو آپ کہتے ہیں۔یہ بھی ہوتا ہے ٹھیک ہے لیکن جہنم کا درکِ اسفل جو ہے نا' سب سے نچلا درجہ' اس میں منافق ہوتا ہے۔منافق ہروقت اس آگ کے اندر جھلستا رہتا ہے کہ کہیں میری پردہ دری نہ ہوجائے' کہیں میری بات نہ کھل جائے۔سچا آدمی' سچی بات جب کہہ دیتا ہے تو اس کے بعد اسے ایک اطمینان حاصل ہوجاتا ہے' سکون حاصل ہوجاتا ہے۔منافق جب کوئی بات کرتا ہے تو اس کے بعد ایک نیا جہنم اس کے سینے کے اندر بھڑک اٹھتا ہے کہ کہیں بات کھل نہ جائے۔یہاں کا بھی جہنم اور اس کے بعد جو قرآن نے نقشہ کھینچا ہے جہنم کا۔

انسانی زندگی کا سب سے بڑا جہنم ذاتِ انسانی سے مذاق کی نوعیت ہے

عزیزانِ من! کہا یہ ہے کہ سوچو تو سہی یہاں تم نے اپنے دوستوں کے مجمعوں میں اپنے ارادت مندوں کے حلقوں میں' اپنی مملکت کی رعایا میں' جتنا جتنا بھی تمہارا دائرہ تھا اس کے اندر' معلوم نہیں کیا کیا باتیں زبان سے کہیں اور دل میں کیا کیا چیز تھی اور لوگوں پہ اپنا اعتماد قائم رکھا۔وہاں تم بڑے صاحبِ اعتماد بنے' بڑے شریف النفس بنے' بڑے معزز اور واجب الاحترام بنے۔تم نے کوشش کی عمر بھر اپنی اس روش کو قائم بھی رکھا' کامیاب منافق رہے تم۔لیکن سوچو تو سہی۔عزیزانِ من! یہ ہے قیامت جسے کہتے ہیں۔ذرا سوچو کہ یہ سب جن کے اندر رہتے ہوئے تم نے یوں کیا' یہ سب کے سب تمہارے سامنے موجود ہونگے اور جو کچھ تم نے دل میں چھپا رکھا تھا ان کے متعلق وہ بے نقاب ہو کے ان کے سامنے آجائے گا۔کہا اس جہنم سے کہاں بھاگ کے جاؤ گے۔توبہ توبہ۔کہا اس چیز سے ہروقت ان کو دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ خدا کی طرف سے کوئی سورۃ نازل ہوجائے اور اس میں ہمارے نام لیے ہوئے ہوں اور اس طرح سے پول کھل جائے ہمارا۔ہروقت دھڑ کا لگا رہتا ہے۔کیا بات کہہ گیا ہے کہ یہ جو تمہاری روش اور ذہنیت ہے یہ خدا سے نہیں' ان انسانوں سے نہیں' تم زندگی سے مذاق کر رہے ہو۔(قُلِ اسْتَهْزِءُوْا) (9:64)۔زندگی کے متعلق تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر دل میں کچھ چھپا کے' زبان پہ کچھ اور لے آیئے تو طبعی حیات تو ٹھیک ہے جس وقت موت آگئی معاملہ ختم ہوگیا۔زندگی سے مذاق کر رہے ہو' زندگی تو تمہاری انہی خیالات جتنے خیالات' ارادے' افعال' اعمال ہیں انہی سے ترتیب پا کے زندگی بنتی ہے اور زندگی اس طبعی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتی۔زندگی سے مذاق کر رہے ہو۔

معاشرے میں منافق کی پہچان انسان کو خود کرنا ہوگی

سائیکولوجی کا طالبعلم اس کو Appreciate کرے گا کیا لفظ کہہ جاتا ہے قرآن ۔اِنَّ اللّٰهَ مُخۡرِجٌ مَّا تَحۡذَرُوۡنَ(9:64) ہم یہ نہیں کریں گے رسول اللہ ﷺ سے یہ کہا گیا' کہا کہ ہم کوئی مافوق الفطرت طریق اختیار نہیں کریں گے تمہارے لیے کہ تمہیں ہم بتا دیں چوری چوری کہ یہ بھی منافق ہے' یہ بھی منافق ہے۔کہا کہ اے رسول تمہیں اپنی فراست اور بصیرت سے'ان کے قول وفعل سے پہچاننا ہوگا کہ ان میں سے کون کونسا منافق ہے اور کون کونسا مخلص ہے۔ہم یہ نہیں کریں گے کہ تمہیں اس کا راز بتا دیا جائے۔اس لیے کہ جو معاملہ بھی خدا نے رسول سے کیا وہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے اُسے اسوہ بننا تھا۔اگر خدا رسول کو اس طرح سے غیب کے طور پہ بتا دیتا کہ یہ یہ ہیں' ہمارے لیے رسول ﷺ کا یہ فعل عمل جو تھا کہ آپ نے منافقوں کی نشاندہی کر دی' ہمارے لیے اسوہ کیسے بن سکتا تھا صاحب۔اُسے تو خدا نے بتا دیا' ہمیں خدا بتائے گا پھر؟۔یہ بچے رات کو جو کھیل کھیلتے ہیں یعنی کسی وقت کوئی بچہ جا کے پوچھ لیتا ہے وہ دہائی دیدیتی ہے دوسری والی''او جی او جی چاچا جی نے اوہنوں دس دتا سی' چاچا جی نے دس دتا ہیگا سی کوئی کھیل نہیں' اوایناں شرمندہ ہوندا ہیگا اے'' فخر سے جس نے کریڈٹ لینا تھا اپنی کامیابی کا۔یہ اس کا کوئی طریق نہیں ہے۔کہا اے رسول ہم یہ نہیں کریں گے۔اور یہ بھی نہیں ہے کہ اگر تم نے ذرا گہری نگاہ سے دیکھا تو یہ چھپے رہیں گے۔یہ بات نہیں ہے۔منافقت تو ماتھے پہ لکھی ہوئی ہوتی ہے' مجرم تو اپنی پیشانی سے پہچانا جاتا ہے' اس کے تو ماتھے پہ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ہماری ہی نگاہیں عزیزانِ من! سطح سے نیچے نہیں جاتیں اس لیے کہ ہم خود بھی نہیں چاہتے کہ دوسروں کی نگاہیں ہماری سطح سے بھی نیچے چلی جائیں۔ورنہ خود پہچانا جاتا ہے۔

خدا کے اٹل قوانین سے مذاق اپنی ذات سے مذاق ہے

وَلَـئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ لَيَـقُوۡلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوۡضُ وَ نَلۡعَبُ (9:65) جب کوئی بات ان کی پکڑی جائے اور ان سے پوچھو کہ تم یہ کچھ اس دین کے متعلق' اس نظام کے متعلق کہتے ہو۔کہتا ہے تمہیں پتہ ہے جواب کیا ہوتا ہے۔وہ جواب یہ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب''اسی تے ایویں ای مخول کردے ساں جی'' ہم تو یونہی مذاق کرتے تھے۔کوئی اور جواب نہیں' بات تو پکڑی گئی نا۔آپ دیکھتے ہیں روز منافق کا یہی جواب ہوتا ہے''او میں تے ہسدا اساں تیرے نال' میں ایویں آزمائش کرداساں پیا تو کیہو جیا ہیگا ایں''۔کیا یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو یونہی مذاق کرتے تھے۔کچھ نہیں کہا عزیزانِ من! ایک بات مذاق کرتے تھے۔ قُلۡ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَرَسُوۡلِهٖ كُنۡتُمۡ تَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (9:65) اوبازی بازی باریش حمد؟؟' مذاق کرتے ہو کہاں تک تمہارا ہاتھ پہنچتا ہے' کم بختو خدا سے مذاق کرتے ہو'اس کے اٹل قوانینِ فطرت سے مذاق کرتے ہو'ان قوانین کے مطابق نظام قائم کرنے والے رسول سے مذاق کرتے ہو۔کوئی گوشہ تو زندگی کا ایسا چھوڑو جہاں مذاق نہ کرو

تم۔عزیزانِ من! کیا یہ ہماری داستاں بیان نہیں ہو رہی‘ کیا ہم مذاق نہیں کر رہے خدا سے‘اس کی آیات سے‘اس کے رسول سے۔اوسوچو تو سہی کہاں تم مذاق کر رہے ہو۔اور بات اصل میں یہ ہی کہ حقائق سے مذاق‘ مذاق کرنے سے کیا حقائق بدل جایا کرتے ہیں۔وہ تو اٹل ہوتے ہیں‘ان کا نتیجہ تو اٹل ہوتا ہے۔

ذہنی اور دلی طور پر اپنی غلطی کے احساس کا دوسرا نام توبہ کی قبولیت ہے

لَا تَعۡتَذِرُوۡا (9:66)اس قسم کی بیہودہ معذرتیں مت پیش کرو۔ایمان کی بات کیوں نہیں کہتے۔ایمان کی بات سنیے عزیزانِ من! قَدۡ كَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ (9:66) زبان سے ایمان لائے ہو عملاً کفر کر کے دکھا رہے ہو۔یہ ہے منافق۔کافر ہے جو ایمان نہیں لاتا کہتا ہے کہ نہیں ایمان لاتا۔کہا یہ ہے جو کچھ تم کر رہے ہو کہتے یہ ہو کہ ہم ایمان لائے ہوئے ہیں قَدۡ كَفَرۡتُمۡ (9:66)اور انکار کیے ہوئے ہو اس سے۔اِنۡ نَّعۡفُ عَنۡ طَآئِفَةٍ مِّنۡكُمۡ نُعَذِّبۡ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ (9:66)اس کے بعد بھی ٹھیک ہے کفرِ مسلمہ تمہارے خلاف لیکن زندگی میں تو مواقع کھلے رہتے ہیں‘ ہم اب بھی تمہارے اوپر دروازہ بند نہیں کرتے۔اگر تمہیں احساس ہو گیا ہے کہ تمہاری روش غلط تھی‘ دل سے اگر تمہیں احساس ہو گیا ہے تم واپس آ سکتے ہو‘ ہمارا دروازہ کھلا ہے۔لیکن اگر تم نے انداز یہی رکھا اور پھر منافقت سے ایسا کیا تو اس کے بعد تو پھر اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ (9:666) اُس وقت تو تمہارا جرم ثابت ہو جائے گا۔اس سے پہلے تو تم بچ سکتے ہو لیکن جرم ثابت ہونے کے بعد بچ نہیں سکتے ہو۔اب بھی سوچ لو اپنے متعلق کیا فیصلہ کرنا چاہتے ہو۔ہم نے ہزار برس میں یہ فیصلہ نہ کیا کہ ہم منافقت چھوڑ کے یا کھلا ہوا کفر اختیار کر لیں۔اور ایمان تو ہوتا ہی کھلا ہوا ہے عزیزانِ من!۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ (خزیٌ عظیم) ہمارے اوپر ہے۔اَلۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ بَعۡضُهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ‌ۘ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمُنۡكَرِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمَعۡرُوۡفِ (9:67)یاد رکھو گروہ بنتے ہیں دنیا کے اندر۔کہتا ہے یہ جو اس قسم کی روش رکھنے والے ہیں‘ وہ ایک الگ ٹولہ بن جاتے ہیں‘ منافقین کا ایک ٹولہ بن جاتا ہے‘ایک پارٹی الگ بن جاتی ہے۔مومن اس میں فٹ نہیں ہوتا۔کافر بھی فٹ اِن نہیں ہوتا ان کے اندر۔ الگ ہی ہوتا جیسے یہ ٹولہ۔سائیکولوجی والے جانتے ہیں نشہ ایک شے ہوتی ہے جس کو ہم عام نشہ کہتے ہیں لیکن آپ کو پتہ ہے کہ بھنگ کا نشہ پینے والے‘ شرابیوں کے ہاں کبھی جا کے نہیں بیٹھتے۔’’شرابی اپنے نال کدی پوست پین والیاں نوں نئیں بٹھاندا‘‘۔یہ جو نشے ہیں ان کا کیف الگ الگ ہوتا ہے۔وہ ہمیشہ نشہ کرنے والا ان لوگوں کو ساتھی بناتا ہے جو کیف میں اس سے ہم آہنگ ہوتے ہیں صرف نشے میں نہیں۔نشہ تو صرف عقل کو مدہوش کرتا ہے نا‘ مدہوشی کے بعد بھی مختلف کیفیتیں مدہوشی کی رہتی ہیں۔ایک مذہب کے نشے کی مدہوشی ہوتی ہے‘ ایک جہالت کی بھی مدہوشی ہوتی ہے۔یہ الگ الگ Categories ہوتی ہیں۔وہ یہ کہتا ہے کہ یاد رکھو منافقت کی بناء پہ جو ایک

نشہ آ تا ہے یہ ایک مدہوشی ہوتی ہے یہ ایک الگ ٹائپ ہے اس میں یہی لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ ''جیہڑا اکدی ایویں پھنس جاندا ہیگا اوہدے بعد اوکوشش کرداا ے نکل جاواں اے تا گل گھٹ سٹ دے نامینوں جان نئیں دینا''۔لیکن فٹ اِن اس میں نہیں وہ کرسکتا۔عجیب چیز قرآن کہتا ہے کہ منافق کے ساتھ منافق فٹ اِن کرتا ہے۔مومن کی پہچان تو یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ان چیزوں کا حکم دیتے ہیں' ان چیزوں کو نافذ کرتے ہیں کہ جنہیں اس نے Recognize کیا ہوا ہے اور جو اس نے منع کی ہوئی ہیں' ان سے روکتے ہیں۔ان کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے مانتے تو ہیں ان چیزوں کو لیکن کرتے یہ ہیں کہ جن چیزوں سے وہ روکتا ہے' کوشش کرتے ہیں کہ وہ رائج ہو جائیں آپ کے معاشرے میں' یہ ایک ٹولہ بن جاتا ہے اس قسم کا۔وَ یَقۡبِضُوۡنَ اَیۡدِیَھُمۡ (9:67) بڑی چیز یہ بھی ہے کہ نوعِ انسانی کی بہبود کے لیے جہاں کچھ عام طور پہ کھلا رکھنے کا وقت آئے گا' وہاں یہ سکیڑ لیں گے۔یہ ان کی کیفیت ہوگئی۔وہ آ گئے الفاظ عزیزانِ من! جس کے لیے میں نے کہا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

خدا کو بھلا دینے کا حقیقی مفہوم قوانین خداوندی کو نظر انداز کرنے کے ہیں

کتنی بڑی بات قرآن کہہ گیا ہے۔نَسُوا اللّٰہَ (9:67) انہوں نے خدا کو بھلا دیا' عام ترجمہ یہ ہے لیکن اس کے معنی ہوتا ہے پسِ پشت ڈال دینا کسی کو' جو اس کا مقام ہوتا ہے' وہ نہ دینا۔انہوں نے خدا کو بھلا دیا۔فَنَسِیَھُمۡ (9:67) نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ یہ اپنے آپ کو بھول گئے کہ ہم کیا ہیں۔خدا فراموشی کا نتیجہ' خود فراموشی ہے۔اور یہی چیز اس نے دوسری جگہ سورۃ حشر میں کہی ہے وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنۡسٰھُمۡ اَنۡفُسَھُمۡ (59:19) وہاں زیادہ واضح ہے۔ان جیسے نہ ہو جانا کہ انہوں نے خدا کو بھلایا تو اس کا نتیجہ اپنی ذات کو بھلا دیا۔67ویں آیت ہم نے ختم کر لی 68 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

دسواں باب: **سورۂ توبۃ** (آیات 68 تا 72)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1973ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی 68 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (9:68)

جنگ کے معرکہ میں انسان کا ظاہر اور باطن نکھر کر سامنے آجاتا ہے

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ میں بنیادی طور پر تو جنگ کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ اور اسی ضمن میں منافقین کا ذکر آتا ہے۔ اور ان آیات کے درمیان ان کا ذکر خاص طور پہ جو کیا گیا جیسا میں نے عرض کیا تھا وہ یہ کہ آگے پیچھے تو انسان اپنی منافقت کو کسی حد تک چھپا سکتا ہے لیکن جو جنگ کے معرکہ میں تو ایمان اور نفاق نکھر کر سامنے آجاتا ہے' اس میں بات چھپائی نہیں جاسکتی۔ قرآن نے بتایا تھا کہ جب تک ایسا وقت نہیں آیا تھا' ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ نماز روزے میں مسلمانوں کے شریک ہو جاتے تھے' اسی تفصیل کے ساتھ' اسی احتیاط کے ساتھ ان ارکان کو یا رسوم کو ادا کرتے تھے جس طرح دوسرے مسلمان کرتے ہیں۔ اس لیے اس میں تو کوئی ایسی بات آزمائش کی نہیں تھی جو بات سامنے آجاتی۔ لیکن جنگ ایک ایسی آزمائش ہے اسی لیے جہاد یا قتال کو قرآن نے بلند ترین عملِ صالح قرار دیا ہے۔ کہ جس میں جان جیسی عزیز شے کو اپنے کسی ذاتی منفعت مفاد یا مصلحت کے بغیر خالص حق اور

صداقت کا کلمہ بلند کرنے کے لیے دینی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بہت بڑا امتحان ہوتا ہے۔ تو ایسے مواقع پر کفر اور نفاق کی پہچان بڑی آسان ہو جاتی ہے۔ اس لیے ان سورتوں میں ان آیات میں منافقین کا ذکر آ رہا ہے۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کیے گئے واقعات ہر دور اور ہر قوم کے لیے باعثِ عبرت ہیں

پھر دہرا دوں، جیسا میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ ایسا نہیں ہے کہ چودہ سو سال پہلے مکے شہر میں یا مدینے میں، حجاز میں، عرب میں کوئی خاص گروہ بستا تھا جس کی یہ داستانِ پارینہ ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو ہر دور کا مسلمان جس کے متعلق کہا ہے کہ **وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ مَا ھُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ** (2:8) وہ لوگ جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر آخرت پر **وَمَا ھُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ** (2:8) درحقیقت ایمان ہوتا نہیں ہے ان کا۔ اور یہ جو ایمان ہوتا ہے، یا نہیں ہوتا، انسان کا سینہ پنجرہ تھوڑا ہے کہ جس میں جھانک کے دیکھ لیجیے کہ اس کے اندر طوطا بیٹھا ہوا ہے یا نہیں۔ ہوتا ہے اور نہ ہوتا ہے کیا مطلب ہے۔ مردہ آں ایماں کہ نیاید در عمل۔ جس ایمان کی شہادت انسان کا عمل نہیں دیتا، وہ ایمان نہیں ہوتا۔ وہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے انسان کے کردار و اخلاق، اس کے اعمال، اس کے کاروبار، اس کے معاملات کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اگر وہ اس طرح سے محسوس پیکر میں سامنے نہیں آتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہے تو ضرور لیکن ہم نے سنبھال کے رکھا ہوا ہے کسی اور وقت کے لیے۔

قرآن حکیم کے نزدیک نیکی کا معیار

دیے کے جلنے اور بجھنے کی پہچان بڑی آسان سی ہے، دیا جلتا ہے تو اس کی روشنی باہر آتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ دیا جل رہا ہے اور ہم یہ کہیں کہ کوئی بات نہیں اگر روشنی نہیں تو کوئی بات نہیں، ہم یہی سمجھیں کہ دیا جل رہا ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو بھی فریب دینا ہے دنیا کو بھی فریب دینا ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے مختلف مواقع پہ یہ چیزیں کہی ہیں۔ کہیں یہ کہا ہے کہ تم ایسے وقت میں سبیلیں لگا کے بیٹھ جاتے ہو، جنہیں آپ اپنے ذہن میں نیکی کا کام سمجھ کے کرنے لگ جاتے ہو۔ یہ نیکی کے کام اس قسم کے نہیں ہیں ان میں تو ہر شخص شریک ہو سکتا ہے **لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡھَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ** (2:177) یہ نیکی کے کام ہیں کہ مشرق کی طرف منہ کر لیا یا مغرب کی طرف منہ کر لیا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ حاجیوں کے لیے پانیوں کی سبیلیں لگا دینا اور اس طرح سے چڑیوں کو چوگا ڈالتے پھرنا، بڑے نیکی کے کام ہیں صاحب۔ ساری دنیا کو لوٹ لینا اور اس کے بعد ٹرسٹ بنا دینا، یہ نیکی کے کام ہیں؟ ساری منافقت ہے عزیزانِ من!۔ سوال یہی ہے کہ جنہیں قرآن اقدار کہتا ہے، جنہیں اصول کہتا ہے، جنہیں کلمۃ اللہ اس نے کہہ کے پکارا ہے، دنیا میں اس کے تشکیلِ اقامت کے لیے کیا قربانی کرتے ہیں۔ اور اس قربانی کی صورت یہ ہے کہ اس کے اندر جو آخری معرکہ ہے، وہ میدانِ جنگ کا ہے۔ بطیّب خاطر، بغیر کسی

تامل اور تذبذب کے آپ ان چیزوں کے لیے تیار ہیں کیا؟

مومن اپنے ایمان کے پیشِ نظر اپنے کسی عمل کو ظاہریت پر استوار نہیں کرتا

عزیزانِ من! تیار ہونے کا سوال نہیں ہے' ہیرا جہاں رکھا ہے' اس نے روشنی دینی ہے۔ اس میں ایسڈ کرنے کی ضرورت نہیں' یہ محنت کی بات نہیں ہے کہ آپ کسی مواقع کے اوپر کسی ایسڈ کے ساتھ کوئی ایک کام کر کے دکھا دیں۔ وہ بھی ایمان نہیں ہے۔ ایمان تو وہ چیز ہے جو عمل کی شکل میں از خود باہر آتا ہے۔ مومن کا سارا کردار وہ پیکر ہوتا ہے اپنے ایمان کا' قدم قدم پر اس کا مظاہرہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کا کوئی عمل' کوئی ایکشن' کوئی کام' کوئی فیصلہ ان اقدار کے خلاف نہیں ہوتا جن پر اس کا ایمان ہوتا ہے۔ یہ ہیں ایمان کے معنی۔ قرآن نے کہا ہے کہ وہ ایمان جس کے ساتھ خیر شامل نہ ہو' وہ کوئی کام نہیں دیتا۔ لہٰذا یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ جتنا زیادہ کسی کے کردار میں اس کا مظاہرہ ہوگا اتنا ہی زیادہ قوی اس کا ایمان سمجھا جائے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ان آیات کے اندر منافقین کا ذکر بار بار چھیڑ رہا ہے جہاں یہ ٹیسٹ نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے کہ ان لوگوں کی ایمانی کیفیت کیا ہے۔

خدا کو بھلا دینا دراصل اپنی ذات کو بھلا دینا ہے

پچھلی آیت میں بڑی عجیب چیز قرآن نے کہہ دی تھی کہ منافق بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ خدا کو بھلا دیتا ہے' خدا فراموشی ہوتی ہے' درحقیقت نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (9:67) خدا فراموشی نہیں خود فراموشی ہوتی ہے۔ وہ حیوانی سطح پہ اپنی زندگی کو رکھتا ہے۔ شرفِ انسانیت کے لیے جسے انسان کی ذات یا اس کی خودی کہا جاتا ہے' وہ اس کو بھلا دیتا ہے۔ جس کے ذہن میں یہ چیز ہے کہ میری زندگی کا مقصد پرورش و تربیت و تزکیہ و ارتقائے ذات ہے تو پھر ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اس قسم کی کاریگری سے' مداری کی طرح روپے بنا بنا کے دکھاتا چلا جائے اور درحقیقت اس کے جھولے میں کچھ نہ ہو۔ اسے ایمان نہیں کہتے ہیں۔ ایمان کا مظاہرہ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے انسان کی پوری زندگی میں صبح سے شام تک ہوتا ہے' ہر قدم کے اوپر ہوتا ہے' از خود ہوتا ہے' Without Effort ہوتا ہے۔ اسے ایمان کہتے ہیں عزیزانِ من!۔ منافق بظاہر خدا کو بھلاتا ہے درحقیقت وہ اپنے مقام سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا نکتہ ماسکہ انسان کو اس کے اپنے مقام سے آگاہ کرنا ہے

اگر قرآنِ کریم کے متعلق کہا جائے کہ اس نے انسان کو کیا چیز دی ہے۔ اور وہ ایک ہی چیز ہے' ایک ہی لفظ ہے' ایک ہی فقرہ ہے: انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آگاہ کر دیا۔ منافق کے سامنے مقامِ انسانیت نہیں رہتا' اپنی ذات کا صحیح مقام نہیں رہتا۔ اور اسی لیے اس

نے کہا تھا کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (59:19) اور اسی ضمن میں یہ کہا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ كَالَّذِيْنَ (9:68-69) جہاں یہ قرآن میں آتا ہے نا خدا نے وعدہ کر رکھا ہے فلاں کے متعلق۔ یہ انداز بیان ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے یہ قانون مقرر کر رکھا ہے۔ جہاں بھی خدا کا یہ وعدہ آئے گا اور جہاں وہ کہے گا کہ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (13:31) وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا اس کے معنی یہی ہیں کہ اس نے یہ ایک قانون طے کر رکھا ہے اور اس کے مطابق ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ اپنے قانون کو تبدیل نہیں کرتا۔ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) . لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) یہ جو ہے نا کہ تبدیلی نہیں ہوتی اس قانون' سنت یا کلمہ میں یہی ہے جس کے لیے کہا ہے کہ وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ جیسا کہ اس نے اُدھر وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) یہاں بھی وعدہ کا لفظ ہے کہ اس کا یہ حتمی قانون ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ اس دنیا کے اندر اقتدار مملکت' حکومت دنیا کی' حکومت مملکت اقتدار۔ تو وعدہ جسے کہا ہے اس نے تو یہ اس کا حتمی قانون ہے۔

اعمالِ صالحہ کا حتمی نتیجہ اقتدارِ مملکت کی نعمت سے سرفراز ہونا ہے تا کہ کوئی اسے اچک نہ سکے

اگر دیکھنا ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں یا نہیں تو پہلی چیز اس قوم کے لیے یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ اسے اقتدار حاصل ہے یا نہیں' آزاد مملکت اس کے پاس ہے یا نہیں۔ اور آزاد مملکت بھی ایسی کہ جس میں پھر کسی اور کی محکومی یا کسی اور کا دباؤ اس کے اوپر نہ ہو' کسی کے دُبَیل نہ ہو وہ حکومت۔ یہ ہے خدا کا وعدہ۔ اب اس کے بعد جب ہم چلے قرآن کی تاویلوں کے اندر تو پھر ہم نے تو پوچھو نہیں اس کتابِ مبین کو کیا سے کیا کر کے رکھ دیا ہے۔ جب یہ چیز میسر نہیں آتی تو بجائے اس کے کہ کہا جائے کہ صاحب نہیں ہے ایمان نہیں ہیں اعمالِ صالحہ۔ پھر کھڑے ہو کے سوچا تو جائے گا کہ اگر نہیں ہیں تو پھر ہونے چاہئیں۔ خود کو فریب دے لیا صاحب کہ روحانی خلافت ہے اس کے معنی۔ چلیے صاحب پرکھتے پھرئے روحانی خلافت کو۔ روحانیت وہ شے ہے جس کا آج تک پتہ ہی نہیں چلا کسی کو کہ ہوتی کیا ہے یہ۔ فریبِ نفس ہے۔ یہ وہی استخلاف فی الارض ہے جسے قرآنِ کریم نے متعدد مقامات کے پر کہا ہے۔ کہیں بنی اسرائیل کو یہ کہا ہے کہ تمہاری اس جانفشانیوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم نے تمہیں فلسطین کی حکومت دیدی۔ کہیں جماعتِ مؤمنین سے کہا ہے کہ یاد رکھو ان وقتوں کو جب تم بڑے ہی کمزور شمار کیے جاتے تھے' ڈرتے تھے کہ اِدھر اُدھر کی غالب قومیں تمہیں اچک کر نہ لے جائیں۔ تو اس کے بعد خدا نے تمہیں تمہارے ایمان واعمالِ صالحہ کے بدلے میں ایک مملکت دی' حکومت دی' جائے پناہ دی' تمہیں طاقتور بنایا' استخلاف فی الارض تمہیں عطا کیا۔ یہ وہ مملکت تھی جو وہاں مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کبارؓ کے ساتھ ملی تھی۔ پھر وہ مملکت ایسی نہیں جو ہلاکو اور چنگیز کی طرح سے

استبداد کے زور پر ملی۔ وہ ملی بھی ایمان واعمالِ صالحہ کے صدقے میں' اُس نے قائم بھی اسی طرح سے رہنا تھا۔ جب یہ چیز نہ رہی تو پہلی سٹیج یہ آئی کہ وہ مملکت پھر چنگیز اور ہلاکو کی بن گئی۔ اور جس میں پھر عام مملکت کو قائم ودائم رکھنے کی بھی خصوصیات باقی نہ رہیں۔ بہرحال فرعون کے پاس بھی تو مملکت تھی۔ جب وہ چیز بھی باقی نہ رہی' ذلت اور خواری ان کے حصے میں آ گئی۔ پھر بجائے اس کے کہ اگر ہمارا کچھ نصیبہ بھی جاگتا تو ایسے وقت پہ ہم یہ سمجھ لیتے کہ خدا کے وعدے تو جھوٹے نہیں ہو سکتے۔

حقائق کے برعکس قرآنی احکامات کی مختلف تاویلوں کا ذکر

اگر ہم محکومیت کی' ذلت کی' خواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان واعمالِ صالحہ نہیں ہے۔ اب ان چیزوں کی تاویلوں میں نکل گئے۔ نہایت آسانی سے فریب دیا جا سکتا ہے' روحانیت ہے صاحب یہ چیز جو ہے'۔ کیجیے ٹسٹ اس روحانیت کا پھر۔ روحانیت کے ٹسٹ پہ رونے شروع ہو جاتے ہیں' کرامات سرزد ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔

کرامتیں طلب کرنے والوں کے سلسلہ میں عمر فاروقؓ کے دور میں ایک پادری کو جواب

یہ جادو اور جنتر' یہ دہریے اس قسم کی کرامات دکھاتے ہیں آپ کو کہ ہوش اڑ جاتے ہیں آپ کے دیکھ کر۔ قرآن سے پوچھئے وہ آپ کو بتائے گا۔ مانگتے تھے وہ کرامتیں' مطالبے کرتے تھے' تقاضے کرتے تھے بار بار' قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ کیا تقاضا کرتے ہیں۔ دیکھو میری زندگی ایک معجزہ ہے میرے ایمان واعمالِ صالحہ کا یہ نتیجہ ہے جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک سپاہی نے کہا تھا۔ پوچھا تھا کلیسا کے ایک پادری نے کہ دنیا میں ہر قوم کی ایک حقیقت ہوتی ہے ہر کلمہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے' ایک نظریہ زندگی جو وہ پیش کرتی ہے۔ آپ کو پتہ حقیقت کے معنی جو سامنے آ جائے' حق کے معنی وہ ہوتا ہے جو تمہارا دعویٰ ٹھوس شکل میں سامنے آ جائے' اُسے حق کہتے ہیں۔ اور یہ اُس نے پوچھا تھا کہ تم جو اتنا بڑا دعویٰ کرتے ہو اس دعوے کی حقیقت کیا ہے۔ اُسؓ نے کہا تھا کہ یہ چالیس ہزار شہر اور قلعے جو ہم نے فتح کیے ہیں یہ حقیقت ہے ہمارے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی۔ وہ جانتے تھے کہ ان آیتوں کا مطلب کیا ہے۔ اُس وقت تک ابھی فریب نہیں کھایا تھا مسلمان نے۔

علامہ پرویزؒ کی طرف سے اسلام کی تاریخ لکھنے کا پروگرام زیرِ غور تھا

یہ تو کبھی وقت آئے گا یا میں جب لکھونگا اسلام کی تاریخ' تو آپ کو پتہ لگے گا کہ اسلام سے کتنا بڑا انتقام لیا گیا ہے' کتنی بڑی سازش کی گئی اسلام کے ساتھ کہ تمام چیزیں جو اس دنیا کے اندر اس طرح قومی حیثیت سے ملنی تھیں' ان کو روحانیت کے اندر انہوں نے منتقل کیا'

آخرت کے اوپر جا کے نتیجہ رکھ دیا۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ذٰلِکَ (22:11)۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ جہاں خدا وعدہ کہتا ہے اس وعدے کے معنی اس کا اٹل قانون ہوتا ہے۔ قانون یہ ہے یاد رکھو منافق مرد ہو یا عورتیں ہوں' جہنم کی آگ ہوتی ہے جس میں ہر وقت جھلستا رہتا ہے۔ وہاں کی جہنم کی آگ تو وہاں جا کے دیکھی جائے گی' یہ جو یہاں مستقل جہنم کی آگ ہوتی ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ (104:607) خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ جو دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں۔

سب سے زیادہ جہنم میں مبتلا منافق ہوتا ہے

عزیزانِ من! کہ منافق سے زیادہ بدتر جہنم میں کوئی شخص نہیں ہوتا۔ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ [4:63] کہیں پتہ کھڑکا اور ان کی جان گئی کہ مارے گئے صاحب۔ کہ یہ زندگی ذرا سوچئے کہ ہر وقت انسان ادھر اُدھر گھومتا ہی رہے کہ اس نے تو نہیں معلوم کر لیا' اُس کو تو نہیں پتہ چل گیا' میری بات فلاں کھل تو نہیں گئی' کسی نے پہچان تو نہیں لیا کہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ سوچئے سارا وقت اس کو ایک سیکنڈ اطمینان کا نصیب نہیں ہوتا۔ کھلے طور پہ بات کہنے والا بات کہنے کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے' اس کے انجام وعواقب کچھ بھی ہوں اس کے لیے وہ تیار ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات تو نہیں ہوتی کہ کہیں میرا راز نہ کھل جائے' کہیں میرا بھید افشانہ ہو جائے۔ اور اسی لیے قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پہ کہا اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (4:145)۔ یہاں تو یہ کہا ہے کہ کفار اور منافق دونوں جہنم میں ہوتے ہیں۔ جہنم کے سب سے نچلے درجے میں منافق ہوتا ہے۔

آج کرہ ارض پر مسلمانوں کی حالت زار اور پھر اس پر پیش کی جانے والی تاویلیں

عزیزانِ من! ذرا تقابل کرنا ہے تو کر کے دیکھ لیجئے یورپ کی قومیں کفار ہیں نا' ان کو آپ کفار کہتے ہیں۔ آپ دیکھئے ان کا مقابلہ کر کے اپنے آپ سے ان دونوں میں کون زیادہ تلخی کے جہنم کے اندر ہے کون زیادہ اضطراب انگیز اور الم ناک جہنم کے اندر ہے۔ سوچئے تو سہی اگر ہم دونوں جہنم میں ہیں تو کیفیت ہماری یہ ہے کہ ہم یہاں اس جہنم میں بھی روٹی کے لیے کفار کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ او فٹے منہ تہاڈا۔ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (4145)۔ منافق کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اور یہ ہے منافقت عزیزانِ من! کہ وہ زبان سے کہے چلے جاتے ہیں' مردم شماری کے رجسٹر میں نام بھی یہی لکھا ہوا ہوگا ساری دنیا کی Population کی Figures آپ کے سامنے آئیں گی تو اس میں آجائے گا کہ ستر کروڑ مسلمان دنیا کے اندر بستا ہے۔ اور اس کے بعد کیفیت یہ ہے منافقت کی کہ یہ چیزیں یعنی ان کو تو چھوڑ دیجیے جو نہیں کرتے' یہ چیزیں' یہ نماز اور روزہ اور یہ حج اور زکوٰۃ کرنے کے بعد مطمئن ہو کے بیٹھ جانا کہ صاحب اسلام کا تقاضا تو ہم پورا کر رہے ہیں۔ جب پوچھا جائے تو اس نے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً (2:201) کہا تھا' وہ تو دنیا میں بھی حسنات

تمھیں کہتا ہے۔ کہا صاحب حسنات جو ہیں انسان کے قلب کا اطمینان ہیں اور روحانیت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ چلیے صاحب۔ کوئی ایسا تھرمامیٹر ایجاد نہیں ہوا جو روحانیت کو پرکھ سکے کہ کیا ہوتی ہے۔ فریب ہے، منافقت ہے قرآن کی اصطلاح میں عزیزانِ من!۔ ایمانداری سے کیوں نہیں اس چیز کو قبول کرتے کہ قرآن نے جو کہا تھا کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ سے استخلاف فی الارض ملتا ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ اگر تم مؤمن ہو اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139) پوچھیئے کہ اب اس کی تاویل کیا کریں گے، سب سے زیادہ، غالب سے زیادہ اونچے۔ الاعلیٰ خدا نے اپنی صفت بتائی ہوئی ہے اور اس کے بعد اس جماعتِ مؤمنین کی کہ جس کے اندر صفاتِ خداوندی جھلکتی ہیں۔ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139) مقام ہے مومن کا۔ دوسرے جگہ ہے کہ یاد رکھو! کفار کبھی مؤمنین کے اوپر غالب آ نہیں سکیں گے۔ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا (4:141) کفار کو راستہ ہی نہیں مل سکے گا کہ مومنوں کے اوپر غالب آ جائیں۔ اوقرآن کی ان آیتوں کا کیا کرو گے۔ کریں گے کیا، منافقت برتیں گے، کرلیں گے ان کی تاویلیں کہ صاحب یہ سارے مقام قلب کے ہیں یہ سارے روحانیت کے مقام ہیں اس میں یہ ہو گیا۔ ٹھیک ہے دے لیا فریب اپنے آپ کو۔ اس فریب سے عزیزانِ من! یہ تھوڑا ہے کہ انسان محفوظ ہو جائے۔ آنکھیں بند کر لینے سے کبوتر کے سامنے سے بلی چلی نہیں جاتی۔ وہ درک اسفل جو جہنم کہا ہے اس میں سے تو آپ یہ کہہ کے نہیں نکل سکتے کہ ان کے معنی سارے روحانیت کے ہیں۔ مذہبی دنیا میں جا کے یہ سب کچھ مل جائے گا۔ اس جہنم میں تو وہ سارے ہوتے ہیں کوئی اس سے باہر نہیں ہے۔

ہمیں ان حقائق کو بڑی جرأت سے تسلیم کرنا ہوگا

عزیزانِ من! اگر یہ دعویٰ کرنا ہے آپ نے کہ ہمارا ایمان اس پہ ہے تو یہ Boldly جرأت مندانہ طور پر آپ کو Face کرنی پڑیں گی Realities، حقائق کا سامنا کرنا پڑے گا کہ یہ ٹھیک ہے ہم زبان سے یہ چیز کہتے ہیں، ہم مومن نہیں ہیں۔ اس کے بعد پھر طے کر لیجیے مومن بننا چاہتے ہو، مومن بن کے رہنا چاہتے ہو۔ نہیں تو پھر کافر بن کے رہو اس درکِ اسفل سے تو نکل جاؤ گے۔ دنیا کی ہر مذہب پرست قوم منافق ہوتی ہے۔ دین ہے جو انسان کو مومن بناتا ہے اور وہ اپنے نتائج اس دنیا میں قدم قدم پر پرکھ کر دکھاتا ہے۔ اسی لیے اس نے یہ کہا ہے کہ درکِ اسفل کے اندر منافق ہوتا ہے۔ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ هِیَ حَسۡبُهُمۡ (9:68) ٹھیک ہے کافی ہے ان کے لیے یہ مقام جو دیدیا گیا ہے۔ وَلَعَنَهُمُ اللّٰہُ (9:68)

لفظ ''لعنت'' کا قرآنی مفہوم خوشگواریوں اور نعمتوں سے محروم ہو جانا ہے

جسے لعنت کہا جاتا ہے، یہ ہمارے ہاں کی پنجابی اور اردو کی لعنت نہیں ہوتی جس کے لیے پھر ہم سندیں پیش کر دیتے ہیں قرآن کی کہ دوسرے کو اپنے مخالفین کے اوپر لعنت بھیجتے ہیں۔ لعنت بھیجنا کوئی اچھا کام ہے؟ کہا کہ خدا لعنتیں بھیجتا ہے ہم نے بھیج دی تو کونسی بات

ہوگئی۔یعنی وہ عربی زبان کی لعنت کو پنجابی زبان کی لعنت میں لے آئے ''در فٹے منہ جنوں کیندے ہیگے نیں''۔لعن کے معنی ہیں محروم رہ جانا کسی چیز سے۔اُس نے کہا ہے کہ ایمان کی جو خوشگواریاں ہیں' جو نتائج وثمرات وحسنات ہیں' یہ ان سے محروم رہ جاتے ہیں۔زبان سے اقرار کررہے ہیں لیکن اقرار سے تو اس کے ثمرات نہیں مل سکتے۔ثمرات تو اس وقت ملیں گے جب اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔تو زبان سے اقرار کرنے والا' عمل سے اس کی تصدیق نہ کرنے والا لَعَنَهُمُ اللّٰهُ (9:68) وہ ان خوشگواریوں سے محروم رہ جاتا ہے جو اللہ نے ایمان کا نتیجہ بتائی تھیں۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (9:68) اور یہ ہنگامی دکھ درد اور الم نہیں ہوتا' پیہم مستقل ان کے دل کے اندر ہوتا ہے ایک ثانیہ بھی منافق کا ایسا نہیں ہوتا جو اطمینان سے کٹ جائے عزیزانِ من!۔ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (9:69) یہ پہلی بار نہیں ہے اس سے پیشتر بھی قومیں ایسی گذری ہیں۔ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا (9:69) فرق یہی نہیں ہے کہ ہم نے دولت حاصل کرلی' ہمارا جتھہ بھی بہت بڑا ہے' ووٹ بھی ہمیں بہت زیادہ مل رہے ہیں۔اُس زمانے میں تو یہ اولاد یا ابناء ہی کہا جاتا تھا کیونکہ قبائلی زندگی تھی اور قبائلی زندگی میں افراد جو تھے قبیلے کے' ان کا شمار ان کی تعداد' وہ ایک بہت وزنی Factor ہوا کرتی تھی قوموں کے اندر۔ لیکن جب ہمارے سیاسی حالات بدل گئے۔

حق کی تلاش کے لیے کثرت کے ترازو کو استعمال کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا

قبائل کے افراد کی گنتی اس طرح سے نہیں رہی لیکن اب پارٹیوں کے ممبروں کی گنتی یہ صورت اختیار کرگئی ہے۔تو جہاں قرآن میں یہ آتا ہے کہ ہماری اولاد بھی کثرت سے ہے' جنود بھی ہمارے زیادہ ہیں' افراد بھی ہمارے قبیلے کے زیادہ ہیں۔تو آج اسی کو یہ کہا جائے گا کہ ہماری پارٹی کے ووٹس زیادہ ہیں' ہمارے ممبر زیادہ ہیں۔محض اکثریت کی بنیادوں کے اوپر یہ سمجھ لینا کہ ہم حق پر ہیں۔قرآن نے بار بار کہا ہے کہ اس کے لیے یہ معیار تو نہیں ہے کہ وہ ضرور حق پہ ہوں جن کے خاندان کے افراد زیادہ ہوں' جن کے ووٹس زیادہ ہوجائیں' جن کے ابناء زیادہ ہوجائیں۔سوال تو یہ نہیں۔اَشَدَّ مِنْكُمْ (9:69) ان سے بھی زیادہ قوت میں دولت میں اور جتھے میں' افرادِ قبائل میں ان سے بھی زیادہ۔فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ (9:69) کہتا ہے پھر نتیجہ اس کا یہ' تاریخ بتارہی ہے' ٹھیک ہے تھوڑے سے وقت کے لیے تو کچھ مل جاتا ہے دنیاوی زندگی کا۔منافقت سے' فریب کاری سے' جھوٹ بولنے سے' کچھ تھوڑا سا حاصل ہوجاتا ہے۔

مقامِ عقل کو وحی کے ترازو میں تولنا ہوگا

وہ جو شروع میں قرآن نے یہ کہا کہ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (2:20) لق ودق صحرا' گھنگھور گھٹا' رات کا وقت' چاند تو ایک طرف ستارے تک بھی نہیں ہیں' بادل چھائے ہوئے' اس میں مسافر تنہا وہاں کھڑا ہے کوئی نشاناتِ راہ نہیں

ہے۔ کہا کہ کسی وقت اگر بجلی ذرا سی چمک جاتی ہے تو دو قدم تک چل لیتا ہے اور جب پھر اندھیروں میں آ جاتا ہے تو بھونچکا کھڑا رہ جاتا ہے ۔اس قسم کی زندگی میں تھوڑے وقت کے لیے حاصل ہو جاتی ہیں اور یہی چیز ہے اصل میں فریب کا باعث بن جاتی ہے۔ انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ کتنی جلدی یہ Millionaire ہو گئے انہوں نے یہ کچھ حاصل کر لیا۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ ٹھیک ہے صحیح طریقہ یہی ہے جو اختیار کرنا چاہیے۔ کہا کہ ان سے پہلی بھی قومیں گذری ہیں ان کی بھی یہی کیفیت تھی اُنہیں حاصل ہوا کچھ لیکن ذرا تاریخ کے اوراق سے پوچھو کتنے دنوں تک وہ رہا۔ اور اس کے باوجود قلبی کیفیت تھی کیا اس قوم کی' اخلاقی کیفیت کیا تھی ان کی۔ پوچھو تو سہی' کیا کرتے تھے؟

مومن اور منافق کی پہچان یہ ہے کہ مومن عمل کرتا ہے اور منافق باتیں

وَ خُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا (9:69) ''خض'' کسی چیز کے اندر تک چلے جانا۔ لیکن اس کے معنی ہوتے ہیں بیانات دیتے رہنا' باتیں ہی کرتے رہنا۔ کہا ان کی بھی یہی کیفیت تھی۔ مومن عمل سے اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ منافق صرف باتیں کرتا ہے اور باتوں سے یہ سمجھتا ہے کہ میں نے ثبوت بہم پہنچا دیا۔ قرآن نے کہا ہے یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا (3:188) بہت پسند کرتے ہیں اس بات کو کہ لوگ ان کاموں کی وجہ سے ان کی تعریف کریں جو کام یہ کرتے نہیں ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ کیا چیز بتائی ہے کہ وہ بھی باتوں میں الجھے رہتے تھے' ان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ (9:69) عزیزانِ من! سارے قرآن میں آپ دیکھیے گا ایمان و اعمالِ صالحہ کا پہلا نتیجہ فِی الدُّنْیَا (9:69) اس دنیا میں محسوس شکل کے اندر نکلتا ہے اور پھر اس کے بعد آخرت کی زندگی ہے۔ جس روشِ زندگی' جس دین' جس نظام' جس ایمان اور عمل کا نتیجہ اس دنیا کا سرفرازی اور خوشگواری نہیں ہے' یہاں اس قسم کے اختیارِ مملکت کا حکومت کا اقتدار نہیں ہے کہ جس کے اوپر کسی کا دباؤ نہ ہو۔ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (17:72) جو پھر اس طرح یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں کا بھی اندھا ہوگا۔ اسی لیے کہا کہ ان کے اعمال اس دنیا میں بھی ضائع ہو جاتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ اور یہ حبط جو ہے' یہ تو عجیب لفظ ہے۔

لفظ ''حبط'' کا قرآنی لغوی مفہوم

ایک بیماری ہو جاتی ہے عام طور پہ مویشیوں کو' بیلوں کو یا اونٹوں کہ جس میں ان کا پیٹ تو بہت پھولا ہوا نظر آتا ہے لیکن طاقت کچھ نہیں ہوتی۔ جو کچھ کھاتے ہیں وہ جزوِ بدن نہیں بنتا وہ ویسے کا ویسا Undigested نکل جاتا ہے۔ لیکن اپھارہ سا کچھ ہو جاتا ہے جس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ بہت پھولے پھلے ہوئے ہیں۔ اسی روش کا نتیجہ بظاہر یہ نظر آئے کہ وہ بہت فربہ ہو رہا ہے لیکن درحقیقت Digest نہ ہو کوئی چیز' جزوِ بدن نہ بن رہی ہو۔ اسے کہتے تھے وہ حبط۔ کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (9:69)

بڑے نقصان میں یہ لوگ رہتے ہیں۔

قوموں کی موت وحیات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد

اَلَمۡ یَاۡتِهِمۡ نَبَاُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ وَ قَوۡمِ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اَصۡحٰبِ مَدۡیَنَ وَ الۡمُؤۡتَفِکٰتِ(9:70) قرآن کہتا ہے کہ کیا انہوں نے ان اقوام کے واقعات' ان کی داستانیں' ان کی تاریخ نہیں دیکھی۔عزیزانِ من! یہاں ہی یہ بات پوچھ لیجیے قرآن جو کہتا ہے کہ ان قوموں کی تاریخ انہوں نے نہیں دیکھی۔تو تاریخ میں محسوس چیزیں سامنے آئیں گی جن کا انجام محسوس ہوا ہوگا محسوس طور پہ جو انجام اس دنیا میں ہوا ہوگا۔تاریخ یہی بتائے گی نا' یہ روحانیت کی باتیں بھی تاریخ ہی بتائے گی۔ان قوموں کی تباہی کس شکل میں قرآن نے بتائی ہے' کس شکل میں تاریخ میں آئی ہے۔قومیں ذلیل ہوئیں' خوار ہوئیں سلطنتیں مٹیں' حکومتیں تباہ ہوگئیں ان کی' ذلت وخواری ان کے نصیب میں ہوئی۔ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡکَنَةُ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) اُس نے کہا ہے۔ حکومتیں چھن گئیں ذلت اور خواری کی مار ماری گئی۔ جہاں جہاں گئے ذلیل ہوئے دنیا کے اندر۔انہی کی طرف وہ توجہ دلا رہا ہے کہ ذرا دیکھو ان اقوام کے ساتھ کیا ہوا تھا۔یہی کچھ ان کے ساتھ ہوگا جو آج یہ کچھ کر رہے ہیں۔

انسانوں کی اس دنیا میں قوانین خداوندی کی نوعیت اور حکمت

اَتَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ (9:70) بات پہنچانے والے جو وہ کھلے کھلے قوانینِ خداوندی ان کے سامنے لے کے آئے۔فَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیَظۡلِمَهُمۡ وَ لٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ (9:70) بڑی چیز ہے۔خدا تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔اب یہاں سے ایک عالمگیر قانون اور اصول آ گیا کہ نہ تو کوئی اس کی چہیتی قوم ہے' نہ وہ خوامخواہ کسی کے بیر پڑا ہوا ہے۔سوال ہی نہیں۔وہ کسی پہ زیادتی نہیں کرتا۔ان قوموں نے خود اپنے آپ پر زیادتی کی تھی اور پھر ان کا انجام۔وہ بتاتا ہے انجام اتنا ہی نہیں کہتا کہ تاریخ کی کتابوں میں دیکھو' وہ کہتا ہے فَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَةُ الۡمُکَذِّبِیۡنَ (3:137) جاؤ ذرا چلو پھرو اقوام سابقہ کی برباد شدہ بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھو' ان کھنڈرات کی ایک ایک ٹھیکری اور ایک ایک اینٹ' ان کی عبرت آمیز داستان کا مرقع نظر آئے گی۔یہ اجڑی ہوئی بستیوں کی طرف کیوں لے جاتا ہے۔بات اگر عزیزانِ من! غیر محسوس روحانیت اور عدمِ روحانیت کی ہوتی تو یہ برباد شدہ بستیوں کے کھنڈرات کی طرف قرآن نہ لے جاتا۔اسنے آباد بستیاں بتائی ہیں قوموں کی جن میں ان کی شان وشوکت' دولت وثروت' حکومت و سطوت یہ سب منعکس ہوتی نظر آتی ہیں۔عبرت آمیز داستانیں بتائی ہیں ان کی جن کے کھنڈرات رو رہے ہیں۔اور قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ پھر ان قوموں کی صرف داستانیں باقی رہ جایا کرتی ہیں۔او جن قوموں کی داستانیں عبرت آمیز دکھائی ہیں اس دنیا میں ان کا

اس قسم کا حشر ہوا ہے تو دکھائی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایمان و اعمالِ صالح کے جو نتائج اس نے بتائے ہیں اسی دنیا کے اندر درخشندہ نتائج بتائے ہیں۔ تاریخ ہمیں یہی بتائے گی' ان کے کھنڈرات ہمیں یہی بتائیں گے۔ پہلا ٹسٹ ہے یاد رکھیے قرآن کو اس نگاہ سے دیکھئے گا عزیزانِ من! اس کے وعدے اور اس کے ایمان اور عمل کے محسوس نتائج اس دنیا میں برآمد ہوتے ہیں قوموں کے۔

غیر اسلامی اصطلاحات اور خود فریبی کا جادو دنیائے اسلام کے لیے ہمیشہ خسارے کی شکل میں ظاہر ہوا ہے

نکل جائیے اس فریب سے کہ یہ چیز ذرا تفصیل طلب ہے۔ انشاءاللہ اسلام کی تاریخ لکھونگا اس وقت آپ کو بتاؤنگا میں یہ بات' کتنی بڑی سازش ہوئی تھی اسلام کے خلاف کہ اس کے ایمان و اعمال کے نتائج کے متعلق کہا کہ یہ روحانیت ہے جو دیکھی سنی نہیں جاسکتی۔ بہت بڑی سازش تھی' یہ کب شروع ہوئی تھی۔ اور یہ جتنی اصطلاحات آپ کے ہاں آج مروج ہیں' یہ ساری غیر اسلامی ہیں۔ دوسری قوموں کے ہاں یہ اصطلاحات موجود تھیں' وہاں سے مستعار لی ہوئی ہیں۔ خود لفظِ روحانیت' قرآن میں نہیں ہے۔ یہ تمام چیزیں یاد رکھیے گا۔ میں نے کہا ہے کئی دفعہ یہ کہتا چلا جاؤنگا عمر کے ڈھلتے ہوئے حصے میں ہوں۔ معلوم نہیں کہ اس کے بعد یہ مواقع آئیں گے یا نہیں آئیں۔

اسبابِ زوالِ امت کے تاریخی حقائق کو قلم بند کرنے کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کا اظہارِ خیال

عزیزانِ من! میں نے اپنی عمر میں کم از کم اسلام کی تاریخ کو اس نگاہ سے پڑھا ہے کہ بات صاف سمجھ میں آ گئی۔ اور قرآن ہی کی رو سے مجھ پہ یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جو میں سمجھا ہوں وہ دوسروں تک بھی پہنچاؤں۔ میرا یہ مشن ہے جو میں پہنچاتا چلا جا رہا ہوں۔ جو میں سمجھا ہوں قرآنِ کریم میرے سامنے ہے۔ اس میں اگر کسی قسم کی کوئی ہچکچاہٹ آ گئی' کوئی رورعایت آ گئی' کسی قسم کا اور لحاظ آ گیا' سب سے بڑا شرک ہوگا۔ اس لیے مجھے اس چیز کی ضرورت نہ پہلے تھی اور آج تو ہے ہی نہیں۔ اگلا حصہ میرے سامنے آ رہا ہے۔ مجھے بیبا کانہ کہنے دیجیے جو کچھ بھی ہے۔ اور یہ بات نہیں کہ جو میں کہتا ہوں اس کو اسی طرح سے مانتے چلے جائیے۔ میں آپ کو ایک راستہ بتاتا ہوں قرآن سمجھنے کا' تحقیق کرنے کا' جس روشِ کہنہ پہ چلے آ رہے ہیں' یونہی آنکھیں بند کر کے نہ چلے جائیے اس کے اوپر' کھڑے ہو جائیے خود سوچئے ہمارے ساتھ کیا ہوا۔ مت ان تاویلات میں جائیے جو قرآن کی تاویلات اس سازش اور انتقام کے تحت ہمارے ہاں داخل کی گئیں۔ ایک ایک چیز کے متعلق میں عرض کرونگا' اللہ نے مجھے اگر فرصت اور توفیق دی کہ کہاں سے آئے ہیں آپ کے ہاں یہ تصورات۔ سارے تصورات غیر اسلامی' سازش کے تحت آپ کے ہاں آئے ہیں' انتقام لیا گیا ہے اسلام کے خلاف مسلمانوں سے۔ سارا تصور یہ ساری روحانیت' یہ مامور من اللہ یہ سارے قصے یہ مجددین اور یہ سارے غیر اسلامی ہیں عزیزانِ من!۔ ایک ہی چیز اسلامی ہے' قرآن کا نظام' اس دنیا کے اندر

اعلون کی حیثیت' اقوامِ عالم پہ شاہد بن کے رہنا ان کے اعمال پہ نگران بن کے رہنا' دنیا کے اندر خدا کا کلمہ اس کی اقدار اور اس کے اصول عملاً نافذ کرنا اس کے نتائج اس دنیا کے اندر بنا دینا انسانیت کی اس دنیا کو۔ یہ ہے قرآن' یہ ہے اسلام جو وہ کرنے کے لیے آیا تھا۔

؎ اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

سب فریبِ نفس ہے سب منافقت ہے عزیزانِ من! ۔اگر ایک سجدے سے پہلے اور سجدے کے بعد آپ کی کیفیت دگرگوں نہیں ہوتی یاد رکھیے یہ سارا سجدہ منافقت کا سجدہ ہے۔اور آپ کو کھلونے دے کے الجھایا گیا ہے' فریب دیدیا گیا ہے کہ اس سے روحانیت بڑھتی ہے' انسان کیلئے یہ کچھ کرتی ہے۔روحانیت' روحانیت یہ ہے جو آپ کے کردار کے اندر جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔روحانیت تو یہ ہے کہ آپ اس دنیا کے اندر اعلون ہوں۔

؎ بہ آدم نہ رسیدی خدا را چہ می جوئی

صفِ آدمی میں آنے کے لیے آپ کے ہاں توفیق نہیں' تم خدا والے بنتے پھر رہے ہو۔

قرآن حکیم میں پیش کردہ تاریخی واقعات کو پیش کرنے کا مقصد

اسی لیے اُس نے یہ کہا ہے کہ جاؤ اقوامِ سابقہ کی داستانیں دیکھو اور ان کے کھنڈرات کی ٹھیکریوں کو جا کے دیکھو' کیا چیز نظر آتی ہے۔ محسوس چیزیں بتا رہا ہے قرآن ۔قوم کی کیفیت' ذلت کی کیفیت ان قوموں سے بھی بدتر' فریب ان کو اس منافقت کا دیا گیا کہ نہیں تم اعلون ہو روحانیت کی دنیا میں اعلون ہو تم' یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر آپ کے ہاں وہ مباحثے اور مناظرے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ اسلام اور قرآن کے جو دعاوی ہیں ان دعاوی کو وہاں پیش کر کے اور فاتح کی حیثیت سے آجانا کہ دیکھیے صاحب ہم نے ہندوؤں کے مقابلے میں' عیسائیوں کے مقابلے میں' سارے مناظرے جیت لیے اور خوش ہو کے چلے آ رہے ہیں صاحب۔یعنی یہ اس کی باتیں کر کے مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ (2:8) باتیں کر کے مناظرے جیت آنا اور خوش ہو جانا کہ دیکھئے نعرۂ تکبیر۔فریب ہے منافقت ہے عزیزانِ من! الجھایا گیا ہے آپ کو صاحب' آنے والوں کا انتظار کیجئے' وہ آتے بھی ہیں چلے بھی جاتے ہیں' پھر دوسرے کا انتظار کر لیجیے۔اس سے بھی کچھ نہیں بنا' آنے والے ایک عیسیٰؑ کا انتظار کیجئے' وہ نہیں آتا اس کا مثیل آجائے گا۔ایک مہدی آنے والا ہے۔مسلسل فریب کے اندر رکھا ہوا ہے اس قوم کو۔ بہت بڑا انتقام لیا گیا ہے صاحب آپ سے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق اور اس کا نتیجہ

قرآن کو قرآن سے سمجھئے عزیزانِ من! کسی فریب میں نہ آجایئے۔ایمانداری سے اس کے بعد اگر ہم کہتے ہیں' ایمان لائے ہیں تو

پھراس کے بعداس کی جھلک آپ کے اندر آنی چاہیے۔جھلک کے معنی ہیں وہ نتائج مرتب ہونے چاہئیں جو قرآن نے بتائے ہیں۔اور اگر یہ نہیں ہیں تو پھراس فریب سے نکل جایئے۔منافقت سے کفر بہتر ہے کہ وہ درکِ اسفل میں ہے یہ بہرحال کہیں اوپر کے درجے میں تو ہے۔وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (9:71)ان کے مقابل میں جب کہا تھا اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (9:67) کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے الٹی پٹی پڑھائیں گے۔یہاں یہ کہا کہ مومن ایک دوسرے کے بانہوں میں بانہیں ڈال کے چلنے والے۔آپ نے ان ندیوں کو دیکھا ہے کہ جن کا پانی تو تھوڑا تھوڑا ہی ہوتا ہے''آ جنوں کیندے نیں گِٹے گِٹے'' تیز اتنا ہوتا ہے کہ وہ پاؤں ٹکنے نہیں دیتا۔اس میں پار جانے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ دو چار ہوں تو بانہوں میں بانہیں ڈال لیجیے اس طرح سے اور پھر آپ چلئے۔آپ دیکھیں گے کس طرح سے محفوظ آگے چلے جاتے ہیں۔قرآن حکیم تو مومن کی کیفیت یہ بتا تا ہے کہ وہ زندگی کی طوفان آمیزیوں کے اندر بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلتے ہیں اس لیے موت کا خوف ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آنے دیتا۔خصوصیت قرآنِ کریم نے بار بار یہ بتائی ہے۔ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ(9:71) معروف چیزوں کا حکم دیتے ہیں منکر سے روکتے ہیں۔''معروف'' یہ ایک لفظ میں بات سمجھ آئے گی۔یہ ایک لفظ ہوتا ہے Valid اور Invalid یہ قانون کی اصطلاح ہے آپ احباب جانتے ہیں کہ Law invalid اس کے معنی ہوتے ہیں کہ قانون کے صحیح رائج العمل ہونے کے لیے جو شرائط مقرر کی ہوئی ہیں حکومت نے ان پہ پورا اترنا ہے۔

قرآنِ حکیم کے لفظ معروف کی وضاحت

بعض دفعہ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بڑے بڑے جرم عائد کر کے گرفتار کیے جاتے ہیں۔جرم بظاہر نظر آتا ہے کہ ثابت ہو جاتا ہے' کورٹ فوراً ان کو بری کر دیتی ہے۔کیا ہوا تھا؟ یہ جس دفعہ کے تحت گرفتار کیا تھا وہ کہتے ہیں Valid نہیں رہی' کوئی سقم آ گیا' Constitution کی فلاں شق کے مطابق نہیں تھی یا مثلاً کئی دفعہ ایسا ہوا کہ لکھا ہوا تھا کہ مجسٹریٹ کو چاہیے کہ اپنی کورٹ میں ضمانت لے کورٹ کا وقت ہو چکا ہوا تھا اس نے گھر پہ ضمانت لے لی۔اُس نے دوسرے دن اپیل کر کے کہہ دیا کہ وہ قانون Valid نہیں تھا' اس نے گھر میں ضمانت لی۔میں مثالیں دیتا ہوں یہ بڑی ضروری چیز ہوتی ہے جسے کہتے ہیں اس کا Valid ہونا۔یہ جو قرآن میں معروف ہے یہ وہ ہے جو قرآن کے ضابطہ کی رو سے Valid چیز قرار دی جائے وہ ہے معروف' Recognized by the Quran کہ ہاں یہ میرا قانون ہے۔اور منکر بالکل اس کے خلاف کہ جو Invalid ہو جائے کہ نہیں ہم نہیں اس کو تسلیم کرتے کہ یہ حق ہے۔بڑی جامع

اصطلاح ہے یہ، تفصیل نہیں قرآن اس طرح دیتا۔ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (9:71) وہ حکم دیتے ہیں معروف کا، روکتے ہیں منکر سے۔ آپ نے یہ الفاظ سنے ہونگے۔

خودمختار مملکت کے وجود کے بغیر امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ کیونکر ادا کیا جاسکتا ہے

ہاں یہ مولوی صاحبان، یہ روحانیت والے، یہ پیر صاحب یہ کیا کرتے ہیں؟ کہ جی یہ امر بالمعروف نھی عن المنکر کر دیتے ہیں۔ اچھا جی یہ کرتے کیسے ہیں؟ وعظ کرتے ہیں جی یہ۔ یہاں ہے یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (9:71) حکم دیتے ہیں۔ آئے نا اسی تاویل کی طرف ورنہ یہیں کھڑے ہوجانا چاہیے تھا کہ جب اپنے ہاتھ میں اختیار نہیں، قانون نہیں، خودمختار مملکت نہیں، Law کو Inforce نہیں ہم کرسکتے، قانون کو نافذ نہیں کرسکتے تو یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (9:71) کا فریضہ ادا کیسے کیا جائے گا۔ کہہ دیا کہ صاحب وعظ کرنے سے ہوجائے گا، پیر صاحب نے کہا جی ہماری مجلس میں بیٹھنے سے ہوجاتا ہے۔ اندازہ لگایے کتنے بڑے فریب ہیں۔ غیر مسلموں کی حکومت کے تابع فرمان رہ کر، امر بالمعروف نھی عن المنکر کر رہے ہیں۔ امر اور نھی تو ان کی حکومت کرتی ہے۔ چلے ہوئے ہیں فریب کے اندر، امر بالمعروف نھی عن المنکر ہوتا ہے۔ مومن ایک دوسرے کے ساتھ ہمراز ساتھی بانہوں میں بانہیں ڈال کے چلنے والے۔ ان کے دلوں کے اندر اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (8:63) دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے، کردار کی کیفیت یہ کہ جو زبان سے کہتے ہیں، اعمال ان کی شہادت دیتے ہیں، ایک اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اتنے صاحبِ اختیار ہیں کہ جسے قرآن نے معروف کہا ہے، حکماً اسے نافذ کرتے ہیں۔ قرآن نے تو عزیزانِ من! یہ چیز واضح کہہ دی ہے کہ تم ایمان کا دعویٰ کرتے ہو اور اپنے مقدمات غیر اسلامی عدالتوں کے اندر چلاتے ہو، طاغوت کی طرف جاتے ہو اپنے معاملات کے فیصلے کرانے کے لیے۔ یعنی یہ ایمان کے دعوے کے منافی ہے۔ یہ تھا اسلام، یہ ہے دین عزیزانِ من! کہ آپ کے پاس یہ قوت ہو کہ معروف کو آپ نافذ کریں، منکر کو روکیں۔ اور وہی مملکت مسلمانوں کی کہ جو معروف کو دنیا میں رائج کرے قانوناً، منکر کو روکے اپنی مملکت میں، وہ اسلامی ہوسکتی ہے۔ اب اسے قرآن سے طے کرنا پڑے گا کہ معروف کسے کہتا ہے، منکر کسے کہتا ہے۔ بڑی تفصیل سے اس نے بتا دیا کچھ مشکل نہیں ہے۔ تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔

نظامِ صلوٰۃ کو عملاً نافذ کرنا قرآنی حکومت کا بنیادی فریضہ

قرآن تو بڑی واضح کتاب ہے۔ کتنا آسان ہے اسلامی مملکت کے لیے کہ معروف اور منکر جو ہے قرآن سے ان کی فہرستیں مرتب کر لیجیے اور اس کے بعد ایک ہی قانون کی ضرورت ہے اس معروف کو ہم نے نافذ کرنا ہے اس منکر کو ہم نے روکنا ہے۔ اسلامی ہوگئی سلطنت۔ پھر اس نظام کی جو دو بنیادی چیزیں میں بار بار بتاتا چلا آتا ہوں۔ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (9:71) نظامِ صلوٰۃ

Establish کرتے ہیں قائم کرتے ہیں اُسے' نوعِ انسانی کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچاتے ہیں۔ امر بالمعروف نھی عن المنکر تو ہوگئی یہ وعظ وارشاد' اقامتِ صلوٰۃ ہوگیا نماز پڑھنا' ایتائے زکوٰۃ ہو گیا سال کے بعد کروڑوں روپے جمع کرنے کے بعد اڑھائی پرسنٹ اس میں سے نکال دینا وہ بھی اگر کتاب الحیل نہ پڑھی ہو تو۔ ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ دیکھ لیجیے کہاں چلے آ رہے ہیں آپ۔ یہ جتنی چیزیں بھی ہیں اس کے لیے اپنی حکومت کی ضرورت بھی کہیں پڑتی ہے۔ کونسی حکومت ہے جو آپ کو وعظوں سے روکتی ہے' نمازوں سے روکتی ہے' زکوتوں سے روکتی ہے۔ دیکھا آپ نے ایک ایک اصطلاح یا ایک ایک لفظ کے معنی ذرا یوں Twist کردینے سے' بدل دینے سے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ امر بالمعروف نھی عن المنکر وعظ' اقامتِ صلوٰۃ نماز پڑھ لینا' ایتائے زکوٰۃ اڑھائی پرسنٹ دیدینا۔

خدا اور رسول کی اطاعت کا قرآنی مفہوم اور ہمارا طرزِ عمل

وَ يُطِيعُونَ اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ (9:71) وہ جو کہا تھا' مقصد یہ ہے کہ وہ اطاعت کرتے ہیں ہر معاملے کے اندر اللہ اور رسول کی۔ قرآنِ کریم میں یہ اصطلاح ہے اللہ اور رسول کی اطاعت۔ وہ نظام جو خدا کے احکام واقدار کے مطابق سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا تھا اور اس کے بعد قرآن نے کہا تھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی تک ہی نہیں رہے گا اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ (3:144) اس کی موت کے بعد بھی یہ نظام اس طرح سے قائم رکھنا ہے تم نے۔ اس کی جو اطاعت تھی' اس نے خدا اور رسول کی اطاعت بتایا۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ اس کے متعلق کھینچا تانی کیوں ہو رہی ہے۔ ہزار برس سے اس بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ اطاعتیں دو ہیں یا ایک ہی ہے۔ اللہ کی اور رسول کی دو کی الگ الگ اطاعتیں ہیں مطع دو ہیں یا ایک ہے؟ چلی آ رہی ہے بحث امام شافعیؒ کے زمانے سے آج تک۔ بھرے ہوئے ہیں کمروں کے کمرے۔ جہاد بالقلم ہو رہا ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ اطاعت خدا کی ہے یا رسول کی ہے۔ رسول کی اطاعت کو چونکہ فریضہ قرار دیا اس کی رو سے۔ اب یہ طے ہوا کہ رسول کی اطاعت کس طرح سے کی جائے۔ اطاعت رسول اللہ تعالیٰ اور حضور ﷺ کی سنت کی اطاعت ہے۔ بات آگے چلی کہ صاحب سنت کسے کہتے ہیں۔ ان کو تو چھوڑیے جنہیں یہ لوگ منکرِ سنت کہہ دیتے ہیں' یہ جتنے بھی مدعیانِ سنت ہیں سنت کی Definition ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ملتی ان کی۔ کتابوں کی کتابیں لکھی ہوئی ہیں ایک کے سنت کے تصور کی تردید میں دوسروں کی طرف سے کہ سنت یہ نہیں' سنت یہ ہے۔ اچھا جی یہ تو Definition آپ کی ہوگئی۔ چلیے آپ ہی کی Definition مان لی یہ ہے کہاں؟ کہ جی یہ تو پھر مزاج شناسِ رسول ﷺ بتائے گا کہ کہاں ہے۔ چل بھئی۔ فریب ہے منافقت ہے جو دی جا رہی ہے امت کو۔

قرآنِ حکیم کے مطابق حکومت نہ کرنے والا کافر ہے

اطاعت ہے اس نظام کی اس مملکت کی جس کی بنیاد یہ ہے کہ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ جرات نہیں کسی میں اس کے اقرار کی۔ عزیزانِ من! آپ سوچئے کہ کچھ مشکل بھی ہے ان باتوں کا سمجھنا جو میں عرض کر رہا ہوں۔ اور پھر میں کوئی Plato افلاطون یا کوئی سقراط کے فلسفہ تو نہیں بیان کر رہا' قرآنی آیات کے کھلے کھلے الفاظ ہیں۔ آپ تھوڑی سی عربی پڑھ لیجیے خود آپ ترجمے کر لیں گے ان کے۔ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:66) تحکم یہ ہے نا کہ فیصلے کرتا ہے۔ کہا اس کے معنی فتوے دینے ہیں جی۔ چل بھئی۔

مملکتِ اسلامیہ کے تحت قانونِ خداوندی کے الفاظ کے مقابلے میں فتویٰ سازی کے عمل کی کیفیت

وہ جو Law کو ان فورس کرنا اس کے مطابق فیصلہ کرنا تھا' وہ ہو گیا فتویٰ دینا۔ ''تے فتوے دی 20 روپے قیمت ہونی اے''۔ میرے سامنے یہ قصے روز آتے ہیں' وہ فتویٰ لے کے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے مطابق نہیں چلتا۔ بہر حال قرآن کی بات میرے پاس تو سوال ہی دوسرا نہیں ہے میں تو جانتا نہیں' فتویٰ کیا ہوتا ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں جی چلتا تو فتویٰ ہے۔ وہ فتویٰ لینے آتے ہیں فتویٰ دید یجیے' یہ تو ہو نہیں سکتا ''او جیہڑا دو جانال آیا ہوندا اے او کہن لگا او چل میں کر آیا آں طے روپے 25 چاہیدے ہیگے''۔ وہ شام کو دوسرا فتویٰ لے آتا ہے۔ دیکھا آپ نے۔ غیر اسلامی حکومت کے اندر جب فتوے چلتے ہیں تو پھر ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ اسلامی حکومت میں فتوے کا سوال ہی نہیں ہے' Law کا سوال ہے۔ یعنی میں پوچھتا ہوں کہ اس بات کے لیے کہ دائیں طرف چلنا چاہیے یا بائیں چلنا چاہیے سڑک کے' کسی مفتیِ اعظم کا فتویٰ لینے جاتے ہیں؟ اور اگر وہ فتویٰ دے بھی دیں تو اس کی حیثیت کچھ ہے ''ٹکے دا کانسٹیبل جناب ہتھکڑی لا کے اندر دیدیندا اے''۔ یہ ہے فرق عزیزانِ من! حکومت میں اور فتوے میں۔

دین کی حکمرانی اور مذہبی اجارہ داری کی بنیاد

جب یہ دین نہیں رہتا تو پھر فتوے رہ جاتے ہیں' وعظ رہ جاتے ہیں' تلقینیں رہ جاتی ہیں' ارشادات رہ جاتے ہیں' ملفوظات رہ جاتے ہیں۔ یعنی منافقت رہ جاتی ہے' دین چلا جاتا ہے۔ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ (9:71) ہو گیا ترجمہ جن پہ اللہ اپنا رحم کرے۔ کیسے پتہ چلے کہ صاحب رحم کیا اللہ نے اس پہ یا نہیں۔ جس کے نام کے ساتھ رحمت اللہ علیہ لکھ دیا جائے تو وہ ہو گیا جی رحم کر دیا اُنہوں نے۔ علیہ الرحمہ' رحمت اللہ یہ ان کے لیے ہے' یہ اس زمرے میں ہیں' جن پہ رحم کیا جائے۔ ان کے ناموں کے ساتھ تو انہوں نے یہ کچھ کیا'' سانوں فکر پیدا

ہوئی'' کہ یا اللہ یہ رحمتیں تو یہی لے گئے ہم کہاں ہوئے۔ کسی نے اصطلاح دیدی امتِ مرحومہ ساری قوم ہی رحم یافتہ ہوئی۔ چل بھئی ''تھوک دے بھاہ وکی اے ہُن''۔ یہ تو غنیمت ہے کہ بعد میں آ کے مرحوم اور مرحومہ کے معنی مرا ہوا ہوگیا'' تے بات سمجھ اچ آ گئی''۔ کیا کیا چیزیں کہی جائیں۔

خدا علیم وخبیر تو انسان کو جہانِ فردا کے متعلق دی گئی اصطلاحات پر بھی غور وفکر کی دعوت دیتا ہے

میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا اس رحمت کا مفہوم قرآن کی رو سے۔ عزیزانِ من! عجیب کتاب ہے یہ' کوئی بھی اصطلاح اس کی ایسی نہیں ہے جس کے اس نے معنی خود متعین نہیں کر دیئے' محسوس شکل میں محض ذہنی نہیں۔ میٹافزکس کی تو باتیں ہی بڑی تھوڑی ہیں اس کے اندر۔ اور شاید اربابِ فکر کو یہ نئی سی بات نظر آئے۔ یہ عرض کروں قرآن نے کہا ہے کہ مومن وہ ہیں جو دنیا ہی نہیں آخرت کے معاملے میں بھی غور کرتے ہیں فکر کرتے ہیں (2:219-220)۔ وہ تو ان معاملات میں بھی غور وفکر سکھاتا ہے۔ تو یہ جتنی اصطلاحیں ہیں اگر وہ اسی طرح سے غیر متعین مبہم طور پہ چھوڑ دیتا' کہیں سے ان اصطلاحات کے معنی نہ لیجیے اگر مسلمان بن کر جینا چاہتے ہیں آپ' کم از کم قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اتنا ضرور کیجیے کہیں سے نہ لیجیے۔ یہ سب آپ کو دوسرے راستوں پہ ڈال دیں گے۔ قرآن سے پوچھئے وہ بتائے گا آپ کو۔ اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186) جو مجھے آ کے پکارتا ہے اور مجھ سے آ کے پوچھتا ہے میں جواب دیتا ہوں اس کا۔ یہ دیتا ہے جواب اس پکارنے والے کا۔ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (9:71) آیت کے آخر میں جو قرآنِ کریم خدا کی صفات بیان کرتا ہے اس کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے پہلے مضمون سے۔ یہ رحمت جو ہے آپ نے سوچا کہ یہاں عزیز کیوں آیا ہے عزیز کے معنی تو صاحبِ غلبہ ہوتا ہے صاحبِ قوت ہوتا ہے۔

قرآنی آیات کے آخر میں خدا تعالیٰ کی دی گئی صفات اپنے اندر ایک خاص مقصد لیے ہوئے ہوتی ہیں

رحمت کے تو معنی ہی ہمارے ہاں وہ ہیں جس میں غلبہ اور قوت کا سوال نہ آئے۔ Mercy یہ جو عیسائیوں سے لفظ ہم نے لے لیا۔ یہ کیا چیز ہے جس کے لیے وہ کہتا ہے کہ وہ عزیز ہے۔ تو کوئی ایسی بات ہے نا کہ جس میں قوت اور غلبے کی ضرورت ہے اور قوت اور غلبہ پھر ہلا کو والا نہیں حکیم ہے Rationally یہ چیز ہے۔ قوت غلبہ اور حکمت Reason بتایا ہے اس کی صفت جو رحمت کرتا ہے۔ اب یہ پتہ چلا کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جس کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ کیجیے متعین آپ تو پھر بات سمجھ میں آ جائے گی۔ اگلی ہی آیت کے اندر بات صاف ہوگئی۔

لفظ جنت اور جہنم کے سلسلہ میں پائے جانے والے تصورات کی حقیقت کے علاوہ ہمارے ہاں کے مقربین کی پہچان

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ (9:72) پھر وہی وعدہ آ گیا پھر وہی بات آ گئی کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ وہی جنت۔ جنت نہیں جنّت ہیں۔ ہمارے ہاں تو وہ ایک اصطلاح ہے جنت' یہاں تو جنّت ہیں۔ جن کے نیچے کہا جاتا ہے نہریں جاری ہونگی' آبِ رواں جن کے نیچے ہوگا' وہ باغات جن کی شادابیاں سرسبزیاں ان میں کبھی فرق نہیں آتا۔ چلتا ہوا پانی جن کے نیچے ہوتا ہے۔ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ (9:72) مساکن ہے یہاں' نہایت خوشگوار رہنے کے مقامات۔ اب جہاں یہ چیز آئی اعمالِ صالحہ کا نتیجہ قرآن نے یہی بتایا ہے جنت جنّت۔ اور بڑی آسانی سے ہم نے اس کو اٹھا دیا قیامت پہ' جہنم بھی وہاں اٹھا کے رکھ دیا' خود تو بچ گئے اور ان کے لیے کہہ دیا کہ یہ تمام غیر مسلم جہنم میں ہونگے۔ جنت بھی وہاں رکھ دی کہ کچھ بھی حال ہو سوال ہی نہیں یہ دنیا چند روزہ ہے' یوں جی لیا تو کیا' توں جی لیا تو کیا۔ بلکہ اس کے الٹ کہ خدا اپنے مقربین کا یہاں امتحان لیتا ہے ''جوتیاں ماردا رہندا اے تے کپڑے چلوندا رہندا اے' بوکھاں نال ماردا رہندا اے' ننگے پھردے رہندے نیں'' مقرب ہیں خدا کے۔ وہ کہتا ہے ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ (2:61) یہ ذلت اور مسکنت کی یہ بھوک یہ ننگے رہنے کی یہ جھونپڑوں میں رہنے کی زندگی' اُس نے کہا ہے یہ تو ذلتِ کی زندگی ہے اور یہ کہتے ہیں یہ مقرب ہیں خدا کے۔ ٹھیک ہے۔ ''نہ او روٹی کھاندا اے نہ ایناں نوں کھان نوں دیندا اے' نہ او کپڑا پوندا اے نہ ایناں نوں پان دیندا اے' اووی لامکان ہے اے وی سارے لامکان نیں''۔ وہ پیروڈی جعفری کیا کرتا تھا' شروع شروع میں جب ہم لوگ آئے تو اس کے بعد الاٹمنٹیں ہوئی تھیں۔ تو الاٹمنٹ کا کاغذ تو مل جایا کرتا تھا لیکن سب دھکے کھایا کرتے تھے۔

الاٹمنٹ ہے یاروں کی آستینوں میں
زمین ہے نہ مکاں لا الہ الا اللہ

جس خدا کی صفت اُنہوں نے لامکاں رکھی ہے' اس کے رنگ میں رنگے جانے کے معنی یہی ہیں نا۔ یہ ہے عزیزانِ من! جو فریب دیا ہوا ہے۔ آپ کے یہ ہاں تصور کہ جھونپڑوں میں رہنے والے' خدا کے مقرب ہوتے ہیں۔ کسی سے کہہ دیا جائے کہ گلبرگ کی کوٹھی میں بھی کوئی اللہ والا رہتا ہے' ذہن میں نہیں آتا ان کے۔ ''او کسے کُلی اچ رہے گا' جھونپڑے میں رہے گا''۔ اور پھر بتاتے ہیں کہ چالیس دن میں ایک جو کا دانہ ہم کھاتے تھے صاحب' یہ ان کی کیفیت تھی۔ خدا یہ کہتا ہے کہ یہ بھوک پیاس' مکان کا نہ ہونا' کپڑوں کا نہ ہونا' خدا کا

عذاب ہے۔ یہ مقربینِ بارگاہِ الٰہی ہیں صاحب۔ لہٰذا جنت کی زندگی وہاں' مساکنِ طیبہ وہ بھی وہاں یہاں کوئی گھر بار کی بات نہیں ہوئی۔ ابھی وہ چیز سامنے آئے گی تو آپ کو میں عرض کرونگا۔

ایران اور مدائین کی فتح جو سعدؓ بن وقاص کے ہاتھوں ہوئی وہاں کی تمدنی زندگی کا ذکر

جب حضرت سعد بن وقاصؓ نے ایران فتح کیا ہے' مدائن فتح کیا ہے۔ ایران کی ہزاروں سالوں کی پرانی تہذیب' اُس دور میں آپ سمجھ لیجیے کہ پیرس یا لندن یا اگر کسی بہترین شہر کا نقشہ سامنے ہو اُس دور کے اندر' مدائن کی یہ کیفیت تھی۔ عربوں کے مقابل میں یہ قومیں ایسی تھیں جن کی طرف کوئی للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا' یہ ساری تفاصیل وہ ہیں۔ زیادہ تر تفاصیل ایران والوں کی جن کی ایسی زندگی تھی جنہیں یہ بار بار دیکھتے تھے' کی تفاصیل تھیں: باغات آبِ رواں' اس کے اندر موتی جواہرات' صوفے قالین' یہ اساورہ۔ یہ قرآن میں آتا ہے اساورۃ اہلِ جنت کے لیئے' ایران کے نورتن بادشاہ کے وہ باڈی گارڈ ہوتے تھے' ان کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہوتا تھا کہ سونے کا کنگن دیا جاتا تھا بادشاہ کی طرف سے۔ قرآن میں اہلِ جنت کے متعلق یہ بتایا ہے۔ یہ ساری تفاصیل وہ ہیں۔ کیونکہ ان کے سامنے ایک مثالی دنیاوی زندگی جو ہوسکتی تھی' ہر آسائش وہ یہی ہوسکتی تھی جو ان کے قریب تھی۔ ''ورنہ اگر اوہناں نوں کہیا جاندا تہانوں گوجرانوالے دی باسمتی ملے گی اوہناں نوں سمجھ ای نہ اوندی پئی کہندا اکی ہیگا' یا اوہناں نوں کہیا جاندا کہ تہانوں ثمرِ بہشت آم ب لکھنؤ دادیاں گے' اوہناں نوں پتہ ای نئیں لگ سکدا''۔ اسی لیے قرآن میں جنت کی تفاصیل میں آم کہیں نہیں آیا ''اے ساہنوں نال لے جانیاں پینیاں گٹھلیاں' ساڈا گذارہ ہونا اے؟''۔ میں کہہ رہا تھا کہ اس نے کیا یہ ہے کہ جن چیزوں سے عرب واقف تھے وہ چیزیں اس نے گنائی ہیں۔ ایران جب فتح کیا ہے' مدائن فتح کیا ہے تو جب انہوں نے یہ دیکھا ہے نا تو یہ تفاصیل ان کے سامنے محسوس پیکر میں آ گئیں۔ حضرتِ سعدؓ نے حضرتِ عمرؓ کو خط لکھا تھا۔ عزیزانِ من! پھر بات میں سے بات نکل آتی ہے۔

حضرت صدیق اکبر کے بعد حضرت عمر فاروق کے عہد میں تمدنی زندگی کے محسوس خدوخال اپنی مثال آپ ہیں

اگر آپ نے اسلام کا صحیح نظام محسوس شکل میں دیکھنا ہو تو حضرتِ عمرؓ کا دورِ خلافت پڑھیے۔ بنیاد رکھی رسول اللہ ﷺ نے' ابتدائی پرورش کی صدیقِ اکبرؓ نے اور پوری آب وتاب کے اوپر آ گیا وہ حضرتِ فاروقِ اعظمؓ کے دور میں۔ لیکن طبری کی تاریخ میں نہ دیکھیے گا۔ تاریخیں لیجیے گا اور قرآن کی سند کے اوپر ان کو پرکھتے چلے جایئے گا۔ اس میں سے جو چیزیں اس چھلنے میں سے چھل کے نکلیں گی' ان کو اکٹھا

کیجیے گا دورِ فاروقیؓ صحیح معنوں میں آپ کے سامنے آئے گا اور آپ کو پتہ چلے گا کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور اسلامی نظام کے سربراہ کی زندگی کیسے ہوتی ہے۔قرآن کی ان آیتوں کی تفسیر پتہ چلی جب وہ خط لکھا حضرتِ سعدؓ نے حضرتِ عمرؓ کو اور اس میں اُنہوںؓ نے گنایا کہ وہاں کیا کیا کچھ ملا اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ امیر المؤمنینؓ کیا کوئی بات ایسی رہ گئی ہے جس کا وعدہ خدا نے جنت کی شکل میں ہم سے کیا ہوا تھا۔جب وہ خط آیا حضرتِ عمرؓ نے پڑھ کے کہا کہ سنوا ے جماعتِ مؤمنین! خدا اپنے وعدے کیسے پورے کیا کرتا ہے۔یہ تھے خدا کے وعدے پورے ہونا۔ہمارے ہاں ہر وعدہ اگلی زندگی کے اوپر جا کے ٹل رہا ہے۔بہر حال۔مَسٰكِنَ طَيِّبَةً (9:72) نہایت خوشگوار محلات۔لیکن بات آگے کہہ گیا قرآن۔

قرآنِ حکیم کے اصولوں پر قائم ہونے والا معاشرہ عملی طور پر جنتی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے

یہ چیز عزیزانِ من! آپ کو قرآن ہی میں مل سکتی ہے۔کسی سے پوچھ لیجیے یا خود بھی اپنے ذہن میں تصور کر لیجیے گا۔ایمان اور اعمالِ صالحہ مومن کی زندگی خدا کی اطاعت کی زندگی میں جو انتہا ہے‘ ہماری تمناؤں آرزوؤں کا یا ہم سمجھتے ہیں قرآن نے وعدہ کیا ہے جنت ہے نا‘ اس سے آگے تو کچھ نہیں۔جب یہ کہا جائے کہ اس کو خدا نے جنت عطا کر دی تو سمجھ لیا کہ منتہا تک وہ پہنچ گیا‘ اس سے آگے کی کوئی چیز نہیں‘ یہ انتہائی چیز ہے جسے یہ کہا گیا ہے۔قرآن اسے انتہائی چیز قرار نہیں دیتا۔وہ کہتا ہے مَسٰكِنَ طَيِّبَةً (9:72) اور اس کے آگے ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (9:72) اور اس سے بھی بڑی چیز ہے جو ملے گی۔اتنی جلیل چیز تھی جسے قرآن نے جنت سے بھی اکبر کہا ہے اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جنتی زندگی سے بھی اگلا قدم رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا مفہوم سمجھنے میں ہے

تمام مذاہب کے اندر عزیزانِ من! Heaven , Paradise جنت یہ منتہا ہے انسانی زندگی کا‘ مسلمانوں کے نزدیک بھی جنت منتہا ہے۔وہ مزید ایک چیز بتاتا ہے جسے کہتا ہے جنت سے بھی آگے ہے۔ہمارے ہاں کیا ہوا اس کے لیے؟ جہاں اس نے کہا تھا سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ (9:72) تو یہ تو ہو گیا رحمت اللہ علیہ جس کو کہہ دیا‘ رضوان من اللہ جس کے متعلق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہہ دیا۔کوئی محسوس چیز آپ کے ذہن میں نہیں آ رہی‘ کوئی متعین مفہوم ذہن میں نہیں آ رہا۔قرآن کے یہ الفاظ ہیں رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔ترجمہ ان کا ہمارے ہاں ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ سے راضی ہو گئے اللہ ان سے راضی ہو گیا۔کسی کے راضی ہو جانے پہ پہلے تو یہ چیز لازمی ہے نا کہ پہلے وہ ناراض ہو۔جس کے ساتھ آپ کے تعلقات ٹھیک چلے آ رہے ہیں کبھی اس کے متعلق بھی آپ نے کہا ہے کہ آج میں وہاں گیا تھا تو وہ مجھ سے راضی ہو گیا۔وہ تو یہی ہوتا ہے کہ روٹھا ہوا تھا‘ جھگڑا پڑا ہوا تھا‘ بڑی ناراضگی تھی آپس میں‘ بہر حال جی بڑی کوشش کی سب کچھ کیا‘ پھر کیا

ہوا؟ کہ جی اللہ کا شکر ہے وہ راضی ہو گیا۔ تصور ہی ہمارے ذہن میں رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کا کہ یہ خدا سے راضی ہو گئے ''اے وے رسئے ہوئے سن'' ورضوا عنہ خدا ان سے راضی ہو گیا۔ بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے۔ لیکن یہاں تو ساری عمر پھر آگے رضی اللہ عنہ و رضوا عنہ ''دو ہے دن مڑ کے اوشام نوں فیر لڑ پیے سو''۔ کیا تصورات ہیں۔

فکرِ قرآن کو سمجھنے کے لیے سب سے ضروری چیز خدا کے تصور کو سمجھنا ہے جو تمام انسانی تصورات سے بلند ہے

عزیزانِ من! وہاں سے چلے انہوں نے کہا کہ صاحب پھر ترجمہ ان کا ہونا چاہیے۔ خوشنودیٔ باری تعالیٰ یہ اللہ سے خوش ہو گئے اللہ ان سے خوش ہو گیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ خدا کا تصور ہم نے اپنے بادشاہوں کا تصور رکھا ہوا ہے۔ بادشاہت میں ایک ہی چیز کرنے کی ہوتی ہے صاحب کہ بادشاہ کو خوش کر لیجیے۔ اس کے نیچے آج بھی جو حاکم ہوتے ہیں' حاکم کو خوش کر لینا بس پھر راوی عیش لکھتا ہے۔ اللہ کی خوشنودی کے لیے ہم یہ کر رہے ہیں۔ (معاذ اللہ) سوچا ہی نہیں کسی نے کہ یہ جو خوش ہونا ناراض ہونا' راضی ہونا ان معنوں میں جن میں ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے یہ تو انسانی جذبات ہیں عزیزانِ من!۔ انسان کسی سے خوش ہوتا ہے کسی سے ناراض ہوتا ہے پھر اس کے ساتھ راضی ہوتا ہے' کیا خدا کے بھی یہی جذبات ہیں؟ لیکن ہم نے تو یہ چیزیں پہلے متعین کی ہوئی ہیں' ایک ٹکڑا ہمارے ہاں چلا ہوا جسے حدیث کہتے ہیں تخلق باخلاق اللہ' اپنے اندر خدا کے اخلاق پیدا کرو۔ گویا خدا کے بھی Ethics ہیں اخلاق ہیں۔ کہاں کہاں میں لیے جاؤں آپ کو۔ بہر حال یہ چیز کہا جاتا ہے کہ خدا کی خوشنودی ہو۔ عزیزانِ من! بات یہ نہیں ہے۔

عربی زبان میں لفظ ''رضا'' کا ترجمہ بڑا غور طلب ہے

عربی زبان میں ایک چیز ''رضا'' جو ہے اس کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا Congruous ہو جانا جسے کہتے ہیں۔ یہ جو چیز میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ خدا ایک The Most Perfect Complete Self ہے انتہائی درجہ کی کامل مکمل ذات۔ اس کی صفات ہمارے سامنے آتی ہیں ان صفات کا اپنے اندر پیدا کیے چلے جانا انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ علیٰ حدِ بشریت ہم آہنگ ہوتے چلے جانا صفاتِ خداوندی سے' یہ ہے رضائے خداوندی۔ صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً (2:138)۔ جو واقعہ دنیا میں سامنے آئے اُس واقعہ پر جس قسم کی صفت کا ظہور خدا کی طرف سے ہونا ہو وہ تو انتہا درجے کی ہے نا۔ محدود شکل میں اُسی قسم کا ری ایکشن جب ہماری طرف سے ہوگا اس کے معنی ہونگے رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ (98:8)۔ ہمارا ری ایکشن اور خدا کا ری ایکشن ہم آہنگ ہو گیا ایک دوسرے کے ساتھ۔ ایسے موقعہ پہ اُس نے بھی یہی کیا تھا ایسے موقعہ پہ ہم بھی یہی کر رہے ہیں۔ یہ رضوان وہیں کا لفظ ہے رضی کا اور یہ بات آگے چلی جاتی ہے جس میں شدت پائی جاتی ہے۔ کیا چیز ہوئی جنت اور رضوان آگے کی بات کیا ہوئی۔

آپ کو پتہ ہے کہ کوئی کام بھی کیا جائے ایک تو اس کام کا معاوضہ ہوتا ہے۔ چھوٹے معنوں میں میں بات سمجھانے کو کہہ رہا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آپ اپنی ڈیوٹی ٹھیک بجالا رہے ہیں' اس کی آپ کو تنخواہ مل رہی ہے یہ معاوضہ ملتا ہے ایک ایسی چیز میں جو محسوس شکل میں ہوتا ہے۔ ایک چیز ایسی ہے جسے آپ اپنی ڈیوٹی سمجھ کے بجالا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ Remunaration اس کا اس طرح سے آپ کو نہ ملے Compensation کہ پیسے نہ ملیں تنخواہ نہ ملے۔ ایک چیز آپ کے اندر پیدا ہوتی ہے کہ میں نے اپنا فریضہ انجام دیدیا۔ یا ایک آپ کا Colleague یا آفیسر آپ پہ اعتماد کرتا ہے اُس اعتماد کی بناء پہ ایک آپ کام کر لیتے ہیں۔ تنخواہ تو آپ کو ملے گی جو ملنی ہے مگر یہ چیز نا کہ اُس نے آپ کے اس اعتماد کو Appreciate کیا اور آپ نے یہ کہا کہ مجھ پہ یہ اعتماد ہوگیا۔ تو آپ دیکھیں گے کہ یہ Recompensation جو ہے یہ معاوضہ جو ہے Inkind نہیں مل رہا' آپ کو پیسے میں نہیں مل رہا۔ لیکن یہ اس تنخواہ سے کہیں اونچا ہوتا ہے عزیزانِ من!۔ دوستوں کے کام جس طرح آپ کرتے ہیں اُس میں یوں معاوضہ نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی ہوسکتا ہے کہ کوئی کام آپ دوست کا بھی کریں اُس میں ضروری ہو جائے کہ آپ کو معاوضہ بھی اس کا ملے۔ لیکن یہ جو Inkind معاوضہ آپ لے رہے ہیں اس کے علاوہ ایک اور چیز جو باہمی خوشگوار تعلقات جسے آپ کہتے ہیں آپس میں محبت کا بڑھنا کہتے ہیں' ہمدردی کے تقاضے جنہیں آپ کہتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اس سے الگ ہے جو چیز مل رہی ہے۔ ایک ڈاکٹر آپ کے بچے کو نہایت شفقت اور محبت سے دیکھتا ہے۔ ٹھیک ہے فیس لیتا ہے یہ اس کا حق ہے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ اپنی شفقت اور محبت جو دیتا ہے یہ اس کے فن سے الگ چیز ہے۔ اور اس کی جو Appreciation آپ کے دل میں پیدا ہوتی ہے یہ اس سے الگ چیز ہے جو دونوں میں پیدا ہوگئی۔ یہ دونوں میں جو بات ہوئی ہے یہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ (98:8) کی بات ہے صاحب۔ قرآنِ کریم نے اعمالِ صالحہ یا ایمان اور عمل کے جو نتائج بتائے ہیں ایک تو نتائج وہ بتائے ہیں جو محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں۔

اعمال صالحہ کا معاوضہ تو بڑا ہی لطیف ہوتا ہے اور وہ حسن کی شکل میں ملتا ہے

قرآن حکیم کے دو انداز ہیں بات کہنے کے اور بڑا ہی لطیف فرق ہے۔ بعض مقامات پہ اس نے کہا ہے جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (32:17) یہ بدلا ہے ان چیزوں کا جو انہوں نے کیا تھا' ان کے کام کا بدلا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جو مملکت کی شکل میں طیبات کی شکل میں خوشحالیوں کی شکل میں' سرفرازیوں کی شکل میں' جنت کی شکل میں ملتا ہے۔ مسکن کہا ہے طیبات کی چیزیں کہیں خوشگواری کھانے پینے کی کہی' عزت و آبرو کہی۔ یہ ایک محسوس شکل میں جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (32:17) بدلا اس کا کہ جو انہوں نے کیا۔ اور کہیں کہا ہے سَيُجۡزَوۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (7:180) جو کیا تھا وہی اس کا بدلا ہے۔ یعنی اس کا بدلا کسی دوسری شکل میں نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب تو

ان کی یہ فیس بلکہ ایسے مقام کہ جہاں ڈاکٹر محض جذبۂ ہمدردی کے ماتحت جا کے ادا کرتا ہے جو اس نے کیا ہے وہی اس کا بدلا ہے۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60) قرآن نے کہا ہے۔ احسان کے معنی وہ احسان نہیں جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ احسان کے معنی ہیں کہ دوسرے کی کمی کو پورا کر کے اس کا بیلنس درست کر دینا۔ کہا کہ کسی کی کمی رہ گئی تھی اس کا بیلنس پورا نہیں رہا تھا تم نے اس کی کمی کو پورا کر دیا اس کا کچھ معاوضہ چاہتے ہو اس سے۔ معاوضہ اس کا ملا ہے بہت بڑا' کیا ملا ہے؟ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60) میں نے اس کی کمی پوری کرنا چاہی کمی پوری ہوگئی' بدلا مل گیا۔ عمل خود اپنا بدلا ہو جاتا ہے۔ میں جو مثال دیا کرتا ہوں کہ صبح کو جو سیر کرنے کے لیے آپ جاتے ہیں۔ نوکر کو جو آپ بھیجتے ہیں ایک چٹ دے کے کہ جانا وہاں میاں ماڈل ٹاؤن میں جانا فلاں کو جا کے دے آنا' نوکر یا کسی کو Engage کر لیتے ہیں مزدور کو۔ وہ جا کے دے آتا ہے دو میل کا اُس نے سفر کیا ایک روپیہ آپ نے اس کو دیدیا' یہ اس کا معاوضہ ہوا ہے۔ اور یہ جو آپ صبح سیر کرنے کے لیے جاتے ہیں دو میل سیر کر کے آپ کہتے ہیں گھر میں بڑے بھائی سے یا میاں صاحب سے یا والد صاحب سے کہ صاحب "سُٹو روپیہ دو میل میں چل آیاں' اور روپیہ کا ہدا' او جی تسی اوہنوں قلی نوں وی تے دتا ہیگا سی"۔ وہ تھا جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (32:17) جو کام تم نے کیا ہے اس کا یہ ہے بدلا۔ یہ جو تم سیر کر کے آتے ہو اس کا تو معاوضہ ہر قدم پہ تمہاری صحت کی نمود میں ملتا چلا جاتا ہے سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (7:180) جو کرتے ہو وہی اس کا بدلا ہے۔

ذاتِ خداوندی کے ساتھ ذات انسانی کا ہم آہنگ ہونا جنت کی نعما سے کہیں مختلف اور بلند ہوتا ہے

قرآن نے یہ دو قسم کے بدلے بتائے۔ ایک چیز اُس نے بتائی جسے خود ہی بیع وشرٰی سے تعبیر کیا ہے۔ خوب ہے قرآن۔ ٹھیک ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) تم نے اپنا جان اور مال بیچ دیا اُس نے اس کی قیمت میں تمہیں جنت دیدی۔ اس کو اِشْتَرٰی بیع وشرٰی کہا ہے دوسری جگہ اس کو سورۃ الفتح کے اندر بیع کہا ہے۔ یہ بیع وشرٰی کا معاملہ۔ کیا بات ہے قرآن کی!! بغیر جھجک کے بات کرتا ہے۔ ٹھیک ہے بھائی تم نے بیچا ہم نے خریدا' قیمت فروخت ہم نے دی۔ یہ جنت ہے جو یہاں کہا گیا ہے اس کے لیے۔ اور ایک وہ کام ہیں۔ اور یہی کچھ کرنے سے جو آپ کی اپنی ذات اُس ذاتِ خداوندی سے علیٰ حدِ بشریت ہم آہنگ ہوتی چلی گئی۔ کہا رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (9:72)۔ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ (9:72) ہم نے جو معاملہ تم سے کیا تھا اس کے لیے مل گیا۔ ٹھیک ہے۔ اور کہا کہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہوا ہے میاں۔ جو ترازو سے تولا نہیں جا سکتا' ماپا نہیں جا سکتا اس کا معاوضہ گن کے نہیں دیا جا سکتا۔ تمہارے ہر عمل کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ تمہیں اس دنیا کے اندر بھی جنت کی زندگی ملی' وہاں بھی ملے گی۔

ذاتِ انسانی کا خدا کی ذات سے ''تعلقات'' میں اضافہ ہوتے چلے جانا نعمائے جنت کی ایک الگ نوعیت ہے

اس کے علاوہ کچھ اور بات ہوئی اور وہ کہ تمہاری اپنی ذات' ذاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی چلی گئی۔(اکبر) یہ اُس کاروباری معاملہ سے بڑی چیز ہے۔کیا بات ہے قرآن کی !!۔اب دونوں چیزیں آ گئیں اس میں ایمان واعمالِ صالحہ کا نتیجہ اس زندگی کے اندر وہ جنت جس کی تفصیل قرآن نے دی ہے۔ وہ نہایت شاندار صوفے اور وہ قالین اور وہ آبِ رواں اور وہ باغات اور جھکے ہوئے پھل' پرندوں کا گوشت' جواہرات اور کنگن اور یہ ساری چیزیں مَسٰکِنَ طَیِّبَۃً (9:72)۔یہ سب چیزیں اس زندگی کے اندر۔استخلاف فی الارض' عزت اور آبرو اور غلبہ' اقوامِ عالم کا شاہد بننا' نگران بننا یہ سب کچھ۔انہی اعمال کا یہ بھی نتیجہ۔اور ان میں سے ہر عمل کا نتیجہ یہ بھی کہ تم علیٰ حدِ بشریت خدا کی ذات سے ہم آہنگ ہوتے چلے گئے۔کہا یہ اعزاز اُس سے بہت بڑا ہے۔لیکن دونوں ملتے ہیں۔ہمارے ہاں جنت جو ہوئی وہ تو چلی عاقبت میں اور یہاں تو ذلت اور خواری رہ گئی۔باقی رہا رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ (9:72) رضی اللہ تعالیٰ عنہ' یہ چیز ہوگئی ان کے ساتھ۔ہوا کیا کہ یہ معاملہ بھی وہاں ہی کچھ اٹھا کے رکھ دیا' کچھ روحانیت سے متعلق ہوگئیں یہ باتیں جو ہیں' وہ ہم سے نہیں ہیں۔ اور پھر ہم نے یہ چیز کیٹگری کی' کی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک بعض کیٹگریز کو متعین کرنے کی وضاحت اور معاشرتی طور پر انہیں استعمال کرنے کی نوعیت اور ان کا مقام

ٹھیک ہے ان کیٹگریز میں قرآن نے انبیائے کرامؑ کے متعلق علیہ السلام کہا ہے۔ٹھیک ہے بعض اصطلاحات ہوتی ہیں ان کے مفہوم متعین ہو جاتے ہیں وہ تو انبیاء کے لیے ہے۔عام بزرگوں کے لیے ہم نے رحمۃ اللہ کہا۔درمیان میں آپ کو معلوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھ دیا' ہم نے یہ مخصوص کر دیا صحابہ کبارؓ کے لیے۔انبیائے کرامؑ تو ٹھیک ہے حضورﷺ پہ نبوت ختم ہوگئی علیہ السلام کی چیز ختم ہوگئی حضورﷺ کے بعد علیہ السلام قرآن کی رو سے کسی کو نہیں کہا جاسکتا۔رحمۃ اللہ علیہ ہر مومن کا حق ہے' اس کے ساتھ رحمت کی چیز ہے' رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہر مؤمن کی چیز تھی یہ قیامت تک کی چیز ہے۔قرآن نے وَعَدَ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ (9:72) ان کے لیے کہا ہے رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ (9:72) کی چیز تھی۔ان کی مثال دی کہ وہ سامنے تھے کہ یہ ہوتے ہیں اس قسم کے لوگ جو اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی بات بھی ان سے ہوتی ہے۔رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ (9:72) دونوں چیزیں عزیزانِ من!۔لیکن آپ کو معلوم ہے

مذہب میں آ کے کیا چیز ہو جاتی ہے۔ مذہب میں یہ سارے اعمال مکینیکل ہو جاتے ہیں۔ یعنی ان کا یہ کرنا کہ نماز میں اس طرح کھڑے ہونا' ایسے ہاتھ اٹھانا' یہاں ہاتھ باندھنا' یوں رکوع کرنا' یوں سجدہ کرنا' اس طرح سے تسبیح کرنا' یہ کچھ کر لیا تو یہ فریضہ ادا ہو گیا۔ اس طرح نہ اس دنیا میں جنت ملی نہ یہ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (9:72) کی کوئی چیز ہمارے ہاں پیدا ہوئی۔ عزیزانِ من! یہ وہ چیزیں تھیں کہ جن کے کرنے سے اس زندگی میں اجتماعی طور پہ جنت ملتی۔ اور ایسا کرنے والے ہر مومن کا کریکٹر اور کردار صفاتِ خداوندی کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو پھر یہ معاملہ خدا کے ساتھ بیع و شرٰی کا خالی رہ گیا وہ بھی اپنا ہی ذہنی۔ اُس نے تو کہا تھا کہ اس کے بدلے میں ہم جنت دیں گے جو اس دنیا میں تم دیکھو گے کہ یہ جنت ہوتی ہے۔ ذہنی طور پر خدا کے ساتھ ہم نے معاملہ یہ کر لیا۔ یہ جو نماز میں بھی آپ کہتے ہیں' یہ فرض' یہ سنتیں' یہ نفل' یہ وتر اور الگ الگ ہم نے کیٹگری رکھی ہوئی ہیں ''آ دو روپے سیر والے جی آ ڈیڑھ روپے والے' آ چوانی دے بھاہ لا دوتسی''۔ کیا کر رہے ہیں ہم۔ معاملہ سارا بیع و شرٰی کا ہے۔ ایک حج کر آئے جی' اتنا اس پہ ہوا جی خدا کے ذمے۔ وہاں رجسٹر کھلا ہوا ہے اس کے کریڈٹ کے خانے کے اندر یہ لکھا گیا صاحب۔ اس کے بدلے میں خدا نے اتنا کچھ وہاں سے ہمیں دینا ہے' مکینیکلی۔ نہ تو یہاں اجتماعی طور پر اس کا نتیجہ نکلا' نہ یہ کرنے والوں کے اندر ان کی اپنی ذات خدا کی صفات کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئی۔ ان کے کردار اور کریکٹر آپ کو نظر آتے ہیں نا جو کچھ بھی ہیں۔ قوموں کے اندر عزیزانِ من! تجربے سے' مشاہدے سے' بعض چیزیں محاورہ بن جاتی ہیں۔ یہ جو مذہب پرست طبقہ ہے ان کے ہاں یہ محاورہ بن گیا ہوا ہے کہ ''ٹھیک ہے میاں داڑھی والا ہے نا ایس واسطے جی' بڑیاں نمازاں پڑھدا ہوندا اے' تے جیہڑا حاجی کہہ دتا جائے تے پوچھو ای ناپئی کی ہو جاندا اے''۔ یہ کیا چیز ہے؟ اُس نے فریب دے لیا ہے کہ میں نے خدا کا یہ فریضہ ادا کیا اُس کے ذمے ہو گیا وہ مجھے دے جنت میں ایک گھر' مسجد بنا دی جنت میں مجھے گھر ملے گا۔ باقی نہ اپنے اندر ان صفات کا ظہور نہ اجتماعی طور پر ان اعمال کا کوئی نتیجہ۔ یہ ہے وہ چیز کہ جسے کاروبار کہتے ہیں۔ اقبالؒ تو ان چیزوں کو بڑے حسین انداز میں کہتا ہے۔ وہ اس قسم کے جو اعمال اور فرائض ادا کرنے والوں کے متعلق کہتا ہے کہ

متاعِ طاعتِ خود را ترازوِ در افراں زد

اپنی اطاعت کی جو پونجی لے کے آیا ہے اُس کے لیے کہتا ہے کہ جی ذرا تکڑی لٹکانا۔ خوبصورت الفاظ ہوتے ہیں

متاعِ طاعتِ خود را ترازوِ در افراں زد

بازارِ قیامت باخدا سوداگری کرداں

اس بیع و شرٰی میں لینے دینے والے کے کریکٹر' قلب اخلاق اس پہ کچھ اثر نہیں ہوتا مکینیکل چیز ہوتی ہے۔ وہ نہ کرنے والے تو

چھوڑ دیجیے ہمارے ہاں جوان فرائض کوادا کرتے ہیں ان کی بھی یہ کیفیت ہے۔ یہاں ذلیل ترین اجتماعی زندگی بسر ہو رہی ہے' مقربِ بارگاہِ الٰہی۔ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے متعلق خدا سے سودا بازی ہو رہی ہے۔ میں نے مسجد میں اتنا بنا دیا' اس کے معاوضے میں جنت مل گئی نا' باقی میرا کردار اخلاق معاملات وہ کسی قسم کے بھی ہوں وہ الگ چیز ہے۔ نیکیاں گنی ہوئی ہوتی ہیں' الم تیس نیکیاں' ہر حرف کی دس نیکیاں ہیں نا جی۔ ایک بیمار کی جا کے عیادت کر لیجیے تین حجوں کا ثواب۔ تو یہ ایسا ہے جیسا یہ پرچیوں کے اوپر لکھوا لکھوا کے اللہ میاں کے ہاں جمع کرتے چلے جاتے ہیں' وہاں جا کے پھر کہا جائے گا کہ ہاں جی ذرا حساب کرنا'' دیکھنا جی ساڈا حساب' تھوڑا جیا ساڈا کی جمع ہویا تہاڈے ولوں کی آیا''۔ یعنی یہ تصور عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ زندگی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں نظر آ رہا۔ یہ مذہب ہے' یہ دین نہیں ہے۔ دین میں ان چیزوں کا نتیجہ اس دنیا میں اجتماعی زندگی کے اندر سرفرازیوں میں نکلتا ہے۔ انفرادی طور پر ہر فرد کی ذات کی نشوونما خدا کی صفات کے رنگ میں علیٰ حدِ بشریت رنگی جاتی ہے۔ یہ ہے رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (9:72) اور یہ بڑی چیز ہے۔ یہ ساری چیزیں یہاں کی ہیں۔ اس رضوان من اللہ والی ذات کو لے کے انسان آگے چلتا ہے۔ اس لیے ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (9:72) بہت بڑی Achievement ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

گیارھواں باب: **سورۂ توبۃ** (آیات 73 تا 79)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1973ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 73 سے ہو رہا ہے۔ (9:73)

دین اور مذہب میں جہاد کا مفہوم ایک متضاد کیفیت کا حامل

تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ سورۃ انفال اور التوبہ میں جہاد کے متعلق تعلیم دی جا رہی ہے جہاد کی آخری شکل جسے قتال یا جنگ کہا جاتا ہے۔ جب حق اور صداقت کے لیے جسے خدا کا بلند کلمہ کہا گیا ہے وہ نظریۂ حیات جو حیوانی سطح سے بلند انسانی سطح سے متعلق ہے اس کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں سربکف جانا پڑے۔ وہ جدوجہدِ حیات کی آخری منزل ہے جسے قتال کہا جاتا ہے جسے جنگ کہہ کے پکارا جاتا ہے اور اسے جہاد بھی کہا جاتا ہے۔ اب تو جب جہاد کہا جاتا ہے تو اس سے وہی مقصود ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بہر حال یہاں جہاد کی آخری شکل قتال کی تعلیم چلی آ رہی ہے ہدایات ہیں راہنمائی ہے۔ اُسی سلسلہ میں منافقین کا ذکر ہے وہ گروہ جس کے متعلق

یہ کہا گیا کہ وہ دین کو اگر مذہب کی شکل میں اپنے ہاں رکھیں تو وہاں تک تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ نماز روزہ حج زکوٰۃ کی رسومات ادا کرتے ہیں۔ اسی قسم کے کچھ مناسک ہیں جن کی پیروی کرتے ہیں۔ کچھ اعتقادات کا مسئلہ آ جاتا ہے۔ معتقدات میں پھر ساری شدت اس چیز کے اوپر ہوتی ہے' نظری زبانی معتقدات۔ اور اس حد تک تو وہ بڑے متشدد ہوتے ہیں' دیندار اپنے آپ کو کہلاتے ہیں' مذہب پرست ہوتے ہیں لیکن جب معاملہ اس قسم کی قربانیوں کا آ جاتا ہے تو وہاں وہ جی چراتے ہیں' اعلانیہ انکار نہیں اس سے کرتے۔ اس لیے کہ منافقت کی بنیاد ہی عدمِ جرأت پر ہے۔ جس میں جرأت ہوتی ہے وہ کھلے بندوں کافر ہو جاتا ہے' وہ کھلے بندوں دہریہ ہو جاتا ہے۔ دہریہ ہونے کے لیے تو بڑی جرأت کی ضرورت ہے' وہ کھلے بندوں یہ کرتا ہے۔ لیکن ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ اس مقام پر جہاں کچھ صعوبات برداشت کرنی پڑتی ہیں' اپنے نظریہ کے تحفظ کے لیے وہاں اعراض برتتے ہیں' جی چراتے ہیں' پہلو تہی کرتے ہیں' گریز کی راہیں نکالتے ہیں۔ اور اس کا اعلان نہیں کرتے' اقرار نہیں کرتے' اعتراف نہیں کرتے کہ ہم یہ کرنا نہیں چاہتے۔ اس کے لیے پھر تاویلات نکالتے ہیں تعذیرات نکالتے ہیں' پھر وہ عذرات سامنے آتے ہیں۔ لیکن یہ ساری چیزیں' منافقت کی ہوتی ہیں۔ تو جنگ چونکہ ایک ایسی کڑی آ جاتی ہے زندگی میں کہ جہاں پرکھ ہو جاتی ہے کہ کون اپنے دعویٰ ایمان میں سچا ہے اور کون منافقت سے کام لے رہا ہے۔ اس لیے جنگ کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ان منافقین کا ذکر بڑی شرح و بسط سے کیا ہے۔ اور جیسا کہ میں مسلسل بیان کرتا چلا آ رہا ہوں کئی درسوں سے کہ یہ نہ کہیے کہ یہ اساطیر الاولین ہیں' ماضی کی کچھ کہانیاں ہیں' گزشتہ اقوام کی کچھ داستانیں ہیں۔ یہ تیرہ چودہ سو سال پہلے کے مدینے کے کسی گروہ کا ذکر نہیں ہے' یہ انسان کی نفسیات اور ذہنیت کا ذکر ہے۔ وہ ہمیشہ ساتھ رہے گا' ہر دور میں یہ ذہنیت موجود رہے گی۔ جس کی جیسی ذہنیت یہ ہوگی قرآن کی یہ راہنمائیاں یا یہ ارشادات جو منافقین سے متعلق ہیں' وہ ان پر Apply ہو جائیں گے۔ تو ہر دور میں ہر شخص کو خود یہ دیکھنا چاہیے کہ مجھ میں منافقت تو نہیں ہے؟ اگر ہے تو کہاں تک۔ پھر اپنے گروہوں تک دیکھنا چاہیے' اپنی قوم تک دیکھنا چاہیے۔ اور وہاں سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہم اپنے آپ کو خود فریبی میں تو نہیں رکھ رہے۔

قرآن حکیم مسلمان یا مومن ہونے کے لیے ایک کسوٹی عطا کرتا ہے ایک پیمانہ مقرر کرتا ہے

جو شخص بھی قرآن پر یا اسلام پر ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے' وہ اس کسوٹی کو پرکھ کر دیکھے کہ قرآن ہمیں رکھتا کس کیٹگری میں ہے۔ ہمارا شمار کس زمرے میں ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے یا زیادہ سے زیادہ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (2:8) وہاں تک اور پھر مطمئن ہو گئے کہ ہم مؤمنین کی کیٹگری میں آ رہے ہیں۔ مؤمنین اب ہمارے ہاں مسلمانوں میں یہ ایک خاص فرقے کے لیے لفظ استعمال ہو رہا ہے۔ باقی سارے اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے ہیں۔ لیکن مؤمن کہلائے یا مسلمان کہلائے' مسلم

کہلائے ایک ہی بات ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ ہم جو خود ہی اپنے آپ کو ایک کیٹگری میں شمار کر لیتے ہیں کہ ہم مسلم ہیں اس کی آپ کے پاس سند کیا ہے۔

قرآن حکیم تو انسان کے ایک ایک سانس کی کیٹگری متعین کرتا ہے

قرآنِ کریم نے مختلف کیٹگریز بتائی ہیں انسانوں کی' ان کے مختلف گروہ ہیں' مختلف طبقات ہیں۔ اس کا تعلق ان کے نظریۂ حیات' ان کے اعمالِ زندگی سے ہے۔ ان کے مطابق دیکھنا ہوگا کہ کس کیٹگری میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ اور یہ پرکھ ایک دفعہ کی نہیں ہے' یہ نیشنلٹی نہیں ہے کہ جو ایک دفعہ آپ نے لے لی اور اس کے بعد آپ بھی اور آپ کی اولاد بھی اس نیشنلٹی کے اندر اُسی طرح سے شمار ہوتے چلے جائیں۔ یہاں تو ایک ایک سانس میں یہ دیکھنا ہوگا۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (2:132) کے معنی یہ ہیں کہ مرتے دم تک اس کی پرکھ کرتے چلے جاؤ کہ ہمارا شمار کس کیٹگری میں ہوتا ہے۔ یہ ہے دین۔ تو جو کچھ پچھلی آیات میں آتا گیا وہ تو نظر آ رہا ہے۔ بہر حال میں کیوں آپ احباب سے کہوں اپنے متعلق یا جس تاریخ میں سے ہم گذرتے جا رہے ہیں' اس کے متعلق' ہمارا شمار ان میں تو نہیں ہوسکتا کہ جنہیں قرآن نے مؤمن یا مسلم کہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ عام اصطلاح میں مذہب پرست کہہ سکتے ہیں قرآن تو انہیں مومن نہیں تسلیم کرتا۔

قرآن حکیم کے نزدیک منافقین اور کفار میں کوئی فرق پیدا کرنا

اب یہ جو گروہ ہے کہ زبان سے نام لیتا ہے تمہارے ساتھ ہونے کا اور ساتھ ہونے کے لیے جس قسم کی خصوصیات' خدمات اور قربانیوں کی ضرورت ہے' ان کا زبان سے انکار نہیں کرتا' دل سے ان کا مخالف ہے۔ ہر وقت ہر مقام پہ' یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسا وقت نہ آ جائے کہ جہاں اس چیز کی پرکھ ہو جائے۔ یہ گروہ بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اور قرآنِ کریم میں اب جو آیت ہمارے سامنے آئی ہے اس میں کفار اور منافقین میں فرق ہی کچھ نہیں کیا۔ جہاں تک ان کی مخالفت کا اور ان کی مدافعت کا تعلق ہے کہا کہ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (9:73)۔

لفظ جنگ اور قتال ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں

اے نبی کفار اور منافقین خلاف۔ یہاں تو لفظ جہاد آیا ہے چند ہی آیات کے بعد اسے قتال کہا گیا ہے' جنگ کرو کفار اور منافقین کے خلاف۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ یہاں تو لفظ جہاد ہے ذرا آگے ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَ لْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ (9:123) یہاں لفظ آیا ہے اُغْلُظْ اور یہاں قتال کا لفظ جنگ کا لفظ ہے۔

اب دیکھیے کہ یہ جو چیز کہی گئی ہے یہاں وَاغۡلُظۡ عَلَيۡهِمۡ (9:73) وہاں قتال کے سلسلہ میں کہا کہ ایسی جنگ کرو کہ وہ تمہارے اندر شدت اور سختی محسوس کرلیں، وہ محسوس کرلیں کہ تم یونہی کچے نہیں ہو، چٹان کی طرح تم سخت ہو، فولاد کی طرح تیز اور صلابت والے ہو۔ یہ چیز تمہارے دشمن محسوس کرلیں اس حد تک جنگ کروان سے کہ وہ تمہاری قوت کا لوہا مان جائیں۔

لفظ رقیق القلب، غلیظ القلب کا حقیقی مفہوم اور اس کا استعمال

اب یہاں کہا گیا ہے کہ وَاغۡلُظۡ عَلَيۡهِمۡ (9:73) یہ رقت جو ہے عربی زبان میں یہ رقیق القلب تو ہم اپنے ہاں استعمال کرتے ہیں 'فلاں شخص بڑا رقیق القلب واقع ہوا ہے' رقت آجاتی ہے یہ لفظ بھی ہمارے ہاں ہوتا ہے اس کے معنی نرم دل ہوتا ہے۔ بالکل نرم دلی کے مقابلے میں مخالف سمت میں جو صفت آئے گی وہ غلظت قلبی ہوتی ہے۔ اردو میں ہم اسے یوں اس لیے استعمال نہیں کرتے کہ ہمارے ہاں غلاظت کا لفظ اور معنوں میں استعمال ہونے لگ گیا ہے ورنہ اس کے معنی گاڑھا ہونے کے سخت ہونے کے ہیں۔ رقت کے معنی پتلے ہونے کے ہیں اور نرم ہونے کے ہیں۔ نرم دلی کے لیے رقیق القلبی بولا جائے گا۔ اور عربی زبان میں جسے غلظت کہتے ہیں اُس کے مقابلے میں سختی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ وَاغۡلُظۡ عَلَيۡهِمۡ (9:73) سختی کروان کے ساتھ۔ سختی کرو کے معنی یہ نہیں کہ ویسے تو بربریت کا سلوک کرو۔ بلکہ اتنی سخت قوت سے ان کا مقابلہ کرو جسے ہم کہتے ہیں کہ ان کے Evil Designs کو کرش کرکے رکھ دو۔ یہ جو تمہارے دین کے خلاف اس قسم کی سازشیں کرتے ہیں اس قدر سختی سے اس کا مقابلہ کرو کہ اس کی آئندہ جرأت نہ کریں۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ (69:29) وہاں لفظ ہی شدت کا آیا ہے کہ ان کی صفت یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ تو بہت نرم دل ہوتے ہیں اور مخالفین کے مقابلے میں چٹان کی طرح سخت ہوتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں غلظت' دل کا سخت ہونا جو ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق لفظ نرم دلی کے ساتھ غلیظ القلب کے الفاظ کو استعمال کرنے کا مفہوم

یہاں ایک چیز بڑی اہم آتی ہے ہمارے سامنے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق سورۃ آل عمران میں کہا گیا ہے کہ فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ (3:159) یہاں وہ لفظ آیا ہے کہا کہ یہ خدا کی رحمت ہے اے رسول کہ تو نرم دل واقع ہوا ہے' محبت بھرا دل رکھتا ہے۔ اگر تو فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ (3:159) آپ دیکھیے وہی لفظ غلیظ جو میں نے کہا تھا غلیظ القلب آیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک لفظ فَظًّا بھی آیا ہے اور سختی کے لیے۔ اگر تو کہیں سخت دل کا ہوتا' سنگ دل ہوتا تو تیرے گرد یہ لوگ کبھی جمع نہ ہوتے' بھاگ جاتے تم سے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کی ایک خصوصیت کبریٰ بتائی ہے حضور ﷺ کا نرم دل ہونا اور اس کے برعکس کہا ہے کہ اگر تو غلیظ القلب ہوتا تو یہ لوگ جو تیرے گرد اس طرح پروانہ وار جمع ہو گئے ہیں' کوئی بھی تیرے ساتھ نہ رہتا۔ گویا بظاہر نظر

آ تا ہے کہ یہاں یہ جو ہے غلیظ القلب ہونا قرآن نے اسے معیوب قرار دیا ہے۔ یہاں یہ کہا ہے **وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ** (9:73) وہی لفظ استعمال ہوا ہے' شدت اختیار کرو۔ اب یہ چیز بظاہر متضاد نظر آتی ہے لیکن یہی وہ خاص نقطہ ہے جس کو میں سامنے لانا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں جس شخص کے متعلق کہا جائے گا کہ بڑا سنگدل ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زندگی کے ہر دور میں ہر گوشے میں' ہر شعبے میں' سنگدلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یعنی جس کے متعلق کہا جائے کہ وہ سنگدل ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ایک مستقل خصوصیت ہے سنگدلی۔ اس کے مقابل میں اگر کہا جائے کہ وہ بڑا نرم دل ہے تو یہ بھی اس کی ایک مستقل خصوصیت بتائی جائے گی۔ ذہن میں فوراً نقشہ آ جائے گا سنگدل کا بھی اور نرم دل کا بھی۔ جب بھی کسی سنگدل کے متعلق بات ہوگی تو پہلے کہا جائے گا کہ میاں اس سے کیا توقع رکھتے ہو بڑا سنگدل واقع ہوا ہے۔ یہ شخص بڑا رحم دل واقع ہوا ہے' بڑا نرم دل واقع ہوا ہے' بڑا رقیق القلب واقع ہوا ہے۔ تو گویا یہ ان کی سیرت کا مستقل پہلو ہے کہ سنگدل نرم دل نہیں ہو سکتا اور نرم دل سنگدل نہیں ہوتا۔ سنگدل ہے تو سنگدل اور نرم دل ہے تو نرم دل۔ اور یہاں یہ صورت بیان کی جا رہی ہے کہ یہ خدا کی رحمت ہے کہ تو بڑا نرم دل واقع ہوا ہے اور دوسرے مقام پہ یہ کہا گیا ہے کہ ان کے ساتھ بڑی سنگدلی سے کام لو بڑی سختی سے کام لو۔ دو متضاد صفات کا بیان ہو رہا ہے۔

خدا تعالیٰ کی دو متضاد صفات غفور رحیم اور پھر شدید العقاب کا بنیادی مفہوم اور ان کا استعمال

بڑی عجیب و غریب کتاب ہے عزیزانِ من! میں کہتا ہوں انسانی نفسیات اس میں چھلک کے اوپر آ جاتی ہے۔ یہیں نہیں اب ذرا آگے بڑھیے۔ خدا کی صفات آپ دیکھتے ہیں کس قدر متضاد نظر آتی ہیں قرآن کے اندر۔ ایک طرف وہ غفور رحیم ہے اور دوسری طرف وہ شدید العقاب ہے۔ ایک ہی ذات ہے وہ' یہ دو الگ الگ شخصوں کا بیان نہیں ہو رہا۔ ہمارے ہاں کبھی یہ نہیں ہوگا کہ ایک ہی وقت میں کہا جائے کہ بڑا سنگدل ہے' بڑا رقیق القلب ہے۔ کہتا ہے تیری مت ماری گئی ہے یا وہ سنگدل ہے یا وہ رقیق القلب ہے ایک بات کہو۔ وہاں یہ کہا جاتا ہے عفو کریم بھی ہے غفور رحیم بھی ہے شدید العقاب بھی ہے **اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ** [85:12] بھی ہے۔ کیا Metrically Opposite صفات ہیں ایک مقام پہ جمع ہو رہی ہیں۔ بات کسی انسان کی نہیں' خدا کی ذات کی صفات بیان ہو رہی ہیں۔ کیا چیز ہے یہ؟ بڑی اہم چیز ہے۔ وہاں تو ہم صفاتِ خداوندی کہیں گے۔ نیچے جب اترتے ہیں انسانوں کے لیے تو ہم ان کو مختلف جذبات کہیں گے۔ نرم دلی ایک الگ جذبہ ہے' سنگدلی ایک الگ جذبہ ہے۔ ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ دو جذبات ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ قرآن ایک جگہ اکٹھے کر رہا ہے ان کو۔ سب سے بڑی چیز یہ کہ خدا کی صفات تو ہمارے لیے سٹینڈرڈ بنتی ہیں اپنی ذات کی نشوونما کے لیے۔ وہاں متضاد صفات ہیں۔ یہاں اس کے بعد اسوۂ رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے نمونہ بتایا ہے قرآنِ کریم نے۔ حضور ﷺ کی ذات میں یہ دو

چیزیں متضاد دکھائی گئی ہیں۔ تضاد کی بات نہیں ہے۔ یہاں سے بات شروع ہوئی۔

قرآنی تصور کے برعکس نرم دلی اور سنگ دلی کے متعلق پائی جانے والی سوچ کا عملی نتیجہ

انسانی ذہن نے ان چیزوں کو متضاد تسلیم کیا ان میں سے بعض کو معیوب قرار دیا اور بعض کو مستحسن سمجھا۔ رحم دلی ایک مستحسن جذبہ گنا جاتا ہے نرم دلی رقتِ قلبی مستحسن جذبہ۔ اس کے مقابلے میں سخت گیری جسے اب سنگدلی کہا جاتا ہے' اسے بڑا معیوب جذبہ قرار دیا۔ انسانوں نے ان جذبات کی یوں تقسیم کی۔ اب مستقل طور پہ آپ کے ہاں ایک کیٹگری جذبات کی وہ آ گئی جنہیں آپ نے معیوب سمجھا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ جب آگے آئے تو ایسا نظر آیا کہ جیسے ضابطۂ اخلاق کی رو سے ہی یہ معیوب ہیں یعنی یہ جذبات ہیں ہی ابلیسی۔ جیسے تکبر؟؟؟؟؟ یعنی مستقل طور پر ایک جذبے کے متعلق کہدیا۔ اسی طرح سنگدلی سخت دلی معیوب جذبات میں شمار ہو گیا۔ تو گویا ایک جذبہ جو پیدا تو کیا گیا انسان کے اندر اور مستقلاً معیوب ہے۔ یہ وہی چیز آ گئی۔

عیسائیت کے ہاں نجات کا دارومدار عمل کے بجائے صرف رحم پر ہے

عزیزانِ من! بڑے غور طلب مقامات ہیں Christianity نے کہا تھا کہ انسانی بچہ تو اپنے Original Sin جسے کہتے ہیں Evil کو ساتھ لے کے پیدا ہوتا ہے اور Evil میں سخت گیری سنگدلی Evil میں شمار ہو گئی ان کے ہاں۔ کیونکہ وہاں تو God is Mercy رحم ہے' عیسائیت کے اندر صرف رحم ہے حتیٰ کہ وہاں اعمال بھی نہیں ہیں۔ سینٹ پال نے اعلانیہ لکھ دیا کہ کوئی شخص اعمال کی رو سے نجات حاصل نہیں کر سکتا' یہ صرف خدا کے رحم کی بناء پہ حاصل ہوتی ہے۔ گویا اعمال بھی کوئی شے نہیں۔ اسی لیے عیسائیت میں قانون کا تصور ہی نہیں وہاں تو قانون ہے ہی نہیں۔ رحم Mercy Mercy Mercy اور پھر وہی کہ ایک گال پہ طمانچہ مارے تو دوسری گال آگے کر دو۔ Mercy کے لیے یہ پادری اور رابیہ آپ کے ہاں جو نظر آتے ہیں وہ Lamb کی شکل کے اندر حضرتِ مسیحؑ۔ برّۂ معصوم جسے کہا جاتا ہے' ایک سمبل ہے سب سے زیادہ نرم دل ہونے کا۔ وہ تو نرم دلی تک ہے۔

بزدلی اور رحم میں پائے جانے والے بنیادی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ

برّہ کے تو معنی ہی Lamb کے ہیں۔ لیکن وہ اسے بزدلی تک نہیں لاتے' رحم تک رکھتے ہیں' رحم مستحسن جذبہ ہے' بزدلی پھر معیوب جذبہ ہے۔ اسی لیے ان کے اسلام پہ جس قدر اعتراضات ہیں وہ یہی کہ اس میں جنگ ہے قتال ہے' جہاد ہیں' غازی ہیں' شمشیر ہے۔ یہ اعتراض کس طرح ابھرے؟ پہلے رحم کو مستحسن جذبہ اور اس کے برعکس سختی کو معیوب جذبہ قرار دیا۔ آہستہ آہستہ اس کا پروپیگنڈہ اس طرح

سے کیا کہ عیسائیت سے آگے ہٹ کے یہ Universal Ethics میں آ گئی بات۔ عالمگیر اخلاقیات میں یہ بات آ گئی کہ سختی اور سنگدلی یہ بڑی معیوب بات ہے' رحم دلی نرمی بڑی اچھی بات ہے۔ پہلے ایک Universal Truth کی طرح اس کا پرچار کیا گیا' تسلیم کیا گیا کہ یہ مستحسن ہے Ethic میں۔ اور پھر وہ سنگدلی سختی جہاد تلوار تو معیوب ہو گیا۔ اور اس کے بعد اعتراضات شروع کر دیے اُنہوں نے۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ ہم میں سے کون متاثر ہوا۔ جو اس سے متاثر نہیں تھے ان کی بھی کیفیت یہ ہے کہ Apologetic Attitude ہے ''اولڑائی تے ایس لئی ہوئی سی جی اوہناں نیں جی ایہہ کرتا سی''۔ یعنی ہاتھ باندھے ہوئے ہیں کپکپا رہے ہیں کہ کہیں یہ نہ کہہ دیا جائے کہ واقعی ہم تلوار بھی اٹھاتے ہیں۔ یعنی اتنا گہرا اثر ہوتا ہے پروپیگنڈے کا۔ جنہوں نے بھی جہاد کے متعلق ہمارے ہاں لکھا ہے ان کو تو الگ کر دیجیے جن کے ذہن میں تھا کہ یہ کیا چیز ہے' یا تو انکار ہی کر دیا اور یا Apologetic۔ سارا انداز معذرت خواہانہ۔ اور یہ تو جی اس زمانے کے حالات کی بات تھی وہاں یہ ہو گئی اب بابا ہمارا پیچھا بھی چھوڑو اب ہو گئی ہم تو نہیں کر رہے ہیں۔ یہ انداز آپ کے ہاں کا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک جہاد اور قتال کی اہمیت اور ہمارے ہاں تصوف کے پیدا کردہ تصورات کا نتیجہ

قرآن جہاد اور قتال کا اتنا حکم دیتا چلا جا رہا ہے۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (48:29) بتا رہا ہے محمد رسول اللہ والذین معہ کو۔ خود خدا اپنے آپ کو شدید العقاب کہہ رہا ہے۔ تو گویا ہمارے اس اخلاقی نقطہ نگاہ سے تو یہ ساری چیزیں' توبہ میری توبہ' بھول چوک کی باتیں تھیں' بھئی ہو گئیں ہو گئیں بابا پیچھا بھی چھوڑو (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ آپ نے دیکھا کیا کیا ہے ہمارے ساتھ۔ اور پھر بات وہی آ گئی کہ کبھی خدا نے توفیق دی جب میں اسلام کی تاریخ لکھونگا' مسلمانوں کی نہیں' مسلمانوں کی تو تاریخیں بھری پڑی ہیں اسلام کی تاریخ نہیں لکھی گئی ابھی تک۔ اسلام کی تاریخ میں میں یہ چیز بتاؤنگا کہ کس طرح سے انتقام لیا گیا ہے اسلام سے اور مسلمان سے اس قسم کی اخلاقی جذبات کو اس کے اندر داخل کرنے کے اور اس سازش میں جو پوائنٹ ہمارے ہاں تصوف نے Play کیا ہے' بہت گہرا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں اہل تصوف کی کے خانوادے کتنے ہی الگ ہوں ایک قدر مشترک ہوتی ہے انکساری' عجز' رحم دلی۔ کبھی آپ نے نہیں سنا ہوگا کہ جی فلاں وہ تصوف میں صوفیاء یا اولیاء جو ہیں اُنہوں نے کبھی تلوار اٹھائی' سختی کی۔ اسلام کی تبلیغ ان کی ایسی بتائیں گے اور کرامات انہوں نے دکھائیں۔ اور اس کے ہاں یہ فاقے کر رہے ہیں۔

تصوف نے پٹھان کے بیٹے کو تنکا توڑنے کے قابل نہ رہنے دیا

''ہو جا ککھ مسیت دا''۔ یہ آپ کے ہاں کا محاورہ ہے۔ تصوف کی بنیاد اس کے اوپر ہے وہی Chirstianity کا راہب۔

Mercy رحم انکسار عجز ''کِکھ مسیت دا ہو جانا''۔ وہ پٹھان تھے نا جنھوں نے یہ کہا کہ

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دیں موڑ

چرن لگے رگوناتھ کے تنکا نہ جائے توڑ

ٹھیک ہے جی پٹھانوں کے بیٹے تھے فوجوں کی فوجوں کے منہ موڑ دیتے تھے۔ اب اس آستانے کے اوپر یوں گرے ہیں کہ تنکا نہیں توڑا جاتا۔ یہ انتہائے کمال ہے تصوف کی۔ انتہا تھی اس سازش کی۔ اتنا مستحسن کر کے بتایا اس جذبے کو کہ خدا کے مقربین کی مستقل علامت ہوگئی۔ اور اس کے خلاف یہ وَاغۡلُظۡ عَلَيۡهِمۡ (9:73) اور اَشِدَّآءُ عَلَى الۡكُفَّارِ (48:29) والی باتیں جتنی ہوئیں آپ کے ہاں معیوب قرار پا گئیں۔ آپ غور کر رہے ہیں کتنی بڑی سازش ہے۔ اور جب سے یہ جذبہ نکلا ہے اس کے اندر سے اس کے بعد جوں ذلیل سے ذلیل ہونی شروع ہوئی قوم۔

قرآن حکیم کے نزدیک دنیا میں باوقار زندگی گزارنے کا راز اس قوت کے حصول میں ہے جو مفادِ عامہ کے لیے ہو

عزیزانِ من! دنیا کے اندر زندہ رہنے' بلند ہونے سرفراز ہونے' کا تو راز قوت کے اندر ہے۔ قوت ہلاکو اور چنگیز والی نہیں قوت حدود اللہ کے اندر استعمال کی ہوئی۔

ہمارے ہاں اخلاقیات کے نام پر پڑھایا جانے والا لٹریچر جو اپنی ذات کی نمود کے بجائے' اسے مٹانے کی ترغیب دیتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایک بڑی سازش تھی۔ ہمارے ہاں یہ آہستہ آہستہ ہوئی پھر جو میں نے کہا ہے نا کہ Universal Ethic بن گئی ہے آپ کے ہاں۔ 'خودی خدا داوَیرْ' ایسا مسلمہ جیسے کوئی آیت پڑھ دی ہو کسی نے۔ یعنی Essential of Self اپنے متعلق اتنا بھی یہ کہنا کہ میں بھی کچھ چیز ہوں اس کے ساتھ خدا کا ویر ہے۔ سوال ہی نہیں ہے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر تو زندگی چاہے

کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

مٹا دے اپنی ہستی کو۔ Ethics آپ کے ہاں یہ بن گیا ہے' اخلاقیات کی کتابیں جو یہاں پڑھائی جاتی ہیں اخلاقِ معصری

اخلاقِ محسنی' اخلاقِ جلالی یہ آپ کے ہاں نصاب میں داخل ہیں ان سب میں یہ چیز آپ کو ملے گی۔ ''ہوجا ککھ مسیت دا''۔ اس لیے میں نے کہا ہے کہ یہ اخلاقیات ہیں۔

انگریز کی طرف سے جہاد کے خلاف پنجاب کی نبوت ایک بہت بڑی سازش تھی

اس کے بعد آگے چلتے ہیں تصوف میں پہنچتے ہیں تو پھر مقربین کی شناخت ہی ایک ہے یہ کہ بے حد رقیق القلب۔ یہ کیا تھا۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے بہت بڑی سازش تھی اور اس کی تکمیل آ کے ہوگئی ہمارے ہاں اس صدی میں' پنجاب کی نبوت میں آ کے یہ تکمیل ہوئی۔ یہاں ڈر پیدا ہوا وہابی مومنٹ سے انگریز کو 1857ء کے بعد' وہاں جہاد کی ایک بہت بڑی موومنٹ چلی تھی۔ الگ بات ہے کہ آپ اس پہ تنقید کریں۔ کچھ پلاننگز کی غلطیاں اس میں ہوئیں' کوئی سقم رہ گئے۔ جذبہ بہت بلند تھا اس چیز کا کہ زندگی قوت کا نام ہے' باطل کا مقابلہ کرنے کا نام ہے۔ اس سے انگریز کو یہاں بڑی دہشت پیدا ہوئی' خوف پیدا ہوا کہ ہم نے 1857ء میں ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ اگر اس راکھ کے اندر سے یہ چنگاریاں پھر کہیں ابھر آئیں۔ انہیں پتہ تھا کہ ہندو سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے' ہندو سوداگر واقع ہوا تھا اس کے ساتھ تو اُس نے کہا تھا بیع وشریٰ کا معاملہ ہے' وہ کرلیں گے۔ لیکن اگر یہ سر پھرے آ گئے پھر جہاد کے اوپر تو ان کے ہاتھوں یہاں پرامن زندگی بسر نہیں ہوسکتی۔

جہاد کے خلاف مرزا صاحب کا فرمان اور پھر نبی یا رسول کہلوانے کی بحث کا تذکرہ

یہ بڑا خطرہ تھا انگریز کو۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے یہاں ایک مامور من اللہ بھیجا گیا انگریزوں کی طرف سے۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ مجھے وحی ہوئی ہے یعنی حکم کے اعتبار سے' قانون کے اعتبار سے' باقی تو چھوڑ دیجیے۔ پتہ ہے کہ ایک وحی کیا ہے؟ ان کے الفاظ میں سنیئے' میرے الفاظ میں نہ سنیئے۔ اربعین ہے مرزا صاحب کی کتاب۔ لکھتے ہیں کہ آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا ہے' خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا ہے۔ خدا کے حکم سے بند کیا۔ چلے جا رہے ہیں کہ صاحب تشریعی نبی تھا' تشریعی نہیں تھا نبی تھا' رسول تھا۔ چلے جا رہے ہیں الفاظ کے گورکھ دھندے میں۔ خدا کے حکم سے۔ ایک ایسا حکم جو قرآن کے اندر اس طرح سے آیا ہے۔ کہتے ہیں خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا ہے۔ تو یہ اگر نبوت نہیں ہوتی یہ اگر وحی نہیں ہوتی تو اور کیا ہے۔ اور پھر یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہیں کہ صاحب پہلے بھی نہیں تھا۔ چار ہی سطریں پہلے کہا گیا ہے کہ جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدت کو خدا تعالیٰ آہستہ آہستہ کم کرتا گیا' حضرتِ موسیٰ کے وقت میں اس قدر شدت تھی کہ ایمان لانا بھی قتل سے نہیں بچا سکتا تھا۔ اُنہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ چیز خدا کی وحی نہیں تھی' بنی اسرائیل کی باتیں کر رہے ہیں۔ ظلم کی تو کیفیت ہے ان کی' شیر خوار بچے بھی قتل کر دیے جاتے تھے۔ جو فرعون کے متعلق قرآن نے کہا ہے یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ

کُمْ (2:69)۔ وہ یہاں یہ کہہ رہے ہیں کہ حضرتِ موسیٰؑ خدا کے حکم سے جو جہاد کرتے تھے اُس میں شیر خوار بچوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ پھر ہمارے نبی ﷺ کے وقت میں بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کا قتل کرنا حرام کیا گیا۔ یعنی جہاد کو حرام نہیں قرار دیا اُس میں یہ چیز جو تھی' یہ حرام قرار دی۔

مسیح موعود کے وقت جہاد کا کام تمام کر دیا گیا

گویا اللہ نے پہلے اس کو حلال قرار دیا ہوا تھا' رسول اللہ ﷺ کے وقت میں اس میں اتنی ترمیم ہوئی کہ انہیں قتل کرنا حرام قرار دیا گیا' جہاد تو رہا نا۔ اور پھر بعض قوموں کے لیے بجائے ایمان کے صرف جزیہ دے کر مواخذہ سے نجات پانا قبول کر لیا گیا۔ اور پھر مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم محفوظ کر لیا گیا۔ گویا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا یہ حکم' صرف بچوں کا قتل کرنا منع کیا گیا تھا۔ مسیح موعود کے زمانے میں جو جہاد تلوار سے' جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا' خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا ہے اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ رسولِ کریم ﷺ کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا ہے کہ مسیحِ موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ غور فرما رہے ہیں آپ۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں ہے۔ اور اس کے بعد ان کے شعر تو مشہور ہی ہیں پتہ نہیں ان کے شعر کون کہتا ہے۔

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

غور فرما رہے ہیں کہاں سے یہ سازش شروع ہوئی اور کہاں آ کے مقطع کا بند کو اگر حرام کہہ گیا' خدا کے حکم سے حرام قرار دیا گیا ذاتی جہاد نہیں ہے۔ یہاں کہا ہے وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (9:73)

متضاد صفات دراصل انسانی ذات کی مختلف صلاحیتوں کے استعمال کا نام ہے

بات یہ ہو رہی تھی کہ یہ جنہیں ہم متضاد جذبات بظاہر کہتے ہیں' یہ دو اکٹھے کیسے ہو سکتے ہیں۔ اور ان دو کا ہی ذکر نہیں' قرآن میں آپ صفاتِ خداوندی کو دیکھئے' اکثر و بیشتر آپ کو نظر آئے گا کہ اس میں متضاد صفات ہیں۔ یہ صفات یہ جذبات الگ الگ چیزیں نہیں ہیں عزیزانِ من!۔ انسانی ذات انسان کے اندر کی بعض صلاحیتوں کا نام ہے۔ وہ صلاحیتیں بجائے خویش نہ مستحسن ہیں نہ معیوب ہیں۔ وہ قوت ہے۔ اس صلاحیت کا استعمال اس کو مذموم یا مستحسن بناتا ہے۔ اس کا آپ استعمال کس طرح سے کرتے ہیں۔ محسوس مثال کہ تیغ زنی ایک صلاحیت ہے' ایک قابلیت ہے' ایک استعداد ہے' بازو کی قوت اور شمشیر زنی کی صلاحیت ہے۔ اگر آپ اُسے کسی مظلوم کا سینہ

چیرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں تو بدترین جرم ہے۔ اگر ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں تو بلندترین خوبی ہے۔ وہی آپ کے بازو کی قوت' وہی آپ کی تلوار' وہی اس تلوار نے کام کیا ہے۔ ایک انسان کے سینے کو چیرا ہے۔ ایک کے لیے صورت یہ ہے کہ آپ جہنم میں وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا (4:93) تلوار ہے' ہاتھ ہے' جہاں آ کے لگتی ہے وہاں Deciding Factor ہو گیا کہ کیسا ہے یہ۔ وہی تلوار ہے' وہی ہاتھ ہے' اس کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ اے رسول تم نے یہ تلوار نہیں چلائی تم نے قتل نہیں کیا' ہم نے قتل کیا۔ اللہ اکبر۔ کیا ہے یہ چیز؟

انسان کے اندر پائی جانے والی کوئی بھی صلاحیت Evil نہیں ہے

یہ انسان کے اندر پائی جانے والی ان صلاحیتوں میں سے کوئی بھی Evil نہیں ہے' کوئی بھی ان میں سے مذموم نہیں ہے' می نہ سزد خدائے را' کہ وہ ایسی چیز دنیا میں انسان کے لیے پیدا کرے کہ جس کے اندر شر اور Evil بھی خود پیدا کر کے رکھ دے۔ می نہ سزد خدائے را۔ بِیَدِکَ الۡخَیۡرُ (3:26) وہ کہتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے جو کچھ آئے گا وہ خیر ہوگا۔ خیر کے مقابل میں شر ہوتا ہے۔ یہ وہاں سے نہیں آیا' یہ تو ایران کی مجوسیت تھی جس نے خیر اور شر کو دو مستقل بالذات قوتیں قرار دے کے ایک دوسرے کے خلاف ہر وقت برسرِ پیکار رکھا۔ یہ مستقل بالذات الگ الگ قوتیں نہیں ہیں۔ قوت جو صلاحیت ہے۔ میں نے کہا ہے کہ محسوس طور پہ تو بات آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ زندہ رہنے کے لیے' زندگی کی حفاظت کے لیے قوت کی بڑی ضرورت ہے۔ تمام طاقتور اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ دوسروں کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں' طاقت کا ہونا ضروری ہے۔ اب طاقت کا استعمال ہو گیا۔ محلے کے اندر کا طاقتور اگر اس محلے کی بچیوں کی عصمت کی حفاظت کرتا ہے اپنی قوت سے' بلند ترین درجے میں طاقت کا استعمال ہو رہا ہے۔ اور اگر یہی طاقت والا شخص کسی بچی کو اغوا کر کے لے جاتا ہے تو اس کی یہی طاقت ابلیسی ہو گئی صاحب۔ طاقت بجائے خویش نہ کوئی ملائکہ کا جذبہ تھا' نہ ابلیس کا جذبہ تھا۔ ایک صلاحیت ہے سوال صرف اس کے استعمال کا ہے۔ ہم استعمال کے مقامات کو اکٹھا کر کے کہتے ہیں متضاد ہیں۔ یعنی یہ قوتیں متضاد ہیں۔ بدلہ لینا اور معاف کر دینا' متضاد ہے۔ سوال یہ نہیں ہے سوال تو مقامات کا ہے۔ کس مقام پہ بدلہ لیا جاتا ہے' کس مقام پہ معاف کیا جاتا ہے۔ یہ جو قوتوں کا استعمال ہے اس کے لیے خدا نے ایک معیار دیا' حدود مقرر کی ہیں یہ ہے جو وحی کا مقام ہے۔ اور قرآن میں جہاں جہاں آپ دیکھیں گے بظاہر ہمیں متضاد صفاتِ خداوندی نظر آئیں گی' وہاں آپ دیکھیں گے کہ کہاں اس صفت کا ظہور ہوا ہے آپ کو نظر آئے گا کہ یہاں واقعی یہ صفت ہونی چاہیے تھی۔ یہاں پکڑنا ہی ضروری تھا۔ یہاں چھوڑنا ہی ضروری تھا۔ تو انسانی صلاحیتوں کے استعمال کے متعلق جو حدود اور معیار قرآن نے مقرر کیے ہیں یہ ہے چیز جو ان قوتوں کے استعمال کو مستحسن اور اس کی خلاف ورزی کو مذموم قرار دیتی

ہے۔لہٰذا وہی رسول جس کے متعلق کہا ہے کہ یہ خدا کی رحمت ہے کہ تو نرم دل واقع ہوا ہے' سنگدل نہیں واقع ہوا' ورنہ تیرے گرد اپنے جمع ہوئے ہیں' یہ جمع ہی نہ ہوتے۔اپنوں کے ساتھ کہ جو آپ ﷺ سے ہم آہنگ ہیں' آپ ﷺ کے مشن کے ساتھ چلنے والے انسانیت کی بہبود اور مرفع الحالی میں آپ کے ساتھ تعاون کرنے والی جماعت جو ہے' وہاں اس سربراہ کا اس قائد کا' اس کا ہمدرد نرم دل رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) ہونا نہایت ضروری ہے۔لیکن جہاں مقابلہ پڑ جائے غنڈوں کے ساتھ اور ان بدمعاشوں کے ساتھ جو دنیا میں انسانیت کا گلا گھونٹ دینے کے لیے قوتیں جمع کر رہے ہیں وہاں ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے یہی صفتِ انسانیت ہے۔اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) یہ متضاد صفتیں نہیں ہیں۔آپ سوچئے تو سہی جسے آپ غیرت کہتے ہیں' حمیت جس کا نام لیتے ہیں' بڑا مستحسن جذبہ ہے وہ۔غیرت اور حمیت غصے کے بغیر آ ہی نہیں سکتی۔اگر غیرت کے مقام پہ کوئی شخص نرمی برتتا ہے' اُسے بے غیرت کہتے ہیں۔سوال تو یہ ہے کہ کونسا مقام ہے جہاں کسی صفت کا ظہور ہونا چاہیے۔یہ ہے قرآن کی تعلیم عزیزانِ من!۔خدا کی صفات جو بیان ہوئی ہیں ان پہ غور کیجیے تو آپ کو یہ نظر آئے گا کہ انسان کے اندر جو صفات ہیں انہیں کن مقام پر صرف کرنا' وہ صفاتِ خداوندی کا تقرب ہے اور اس کے خلاف صرف کرنا ابلیسیت ہے۔

ہر صلاحیت کا استعمال وقت کے تقاضوں کا رہین منت ہوتا ہے

ایک ہی قوت ہے۔کیوں کہتے ہیں اُسے بے غیرت۔جو شخص بلاوجہ قوت کا استعمال کرے اُسے ظالم کہا جاتا ہے۔وہ غصیلا ہوتا ہے۔اس کے معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ Rationally بات نہیں کرتا Reason پہ نہیں آتا' دھاندلی مچاتا ہے۔غصے کا استعمال کرتا ہے۔اور یہی میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اگر یہی غصہ کسی معصوم بچی کے اوپر ہاتھ ڈالتا ہے اور وہاں آپ کو غصہ نہیں آتا' بے غیرت ہیں آپ۔اور بے غیرتی تو آپ جانتے ہیں کہ کس قدر دنیا میں ذلیل ترین' کمینی ترین' صفت ہے۔یعنی کیا ہوا ہے؟ غصہ نہیں آپ کو آیا۔یہ جو متضاد صفات ہیں کہ جس وقت آپ کو بطشِ شدید کرنی چاہیے تھی' وہاں آپ نرم دل ہو رہے ہیں۔جہاں نرم دل ہونا چاہیے تھا' وہاں آپ سخت دل ہو رہے ہیں۔یہ ہیں معیوب چیزیں۔پھر کہیں گے بات یاد آ گئی۔گاؤں میں بڑا تگڑا تھا' وہ بھاگ دوڑ میں بھی' کبڈی میں بھی' قوت میں بھی۔صبح اٹھ کے گاؤں والوں نے دیکھا تو بیٹھا رو رہا ہے۔او کیا ہوا؟ کہنے لگا رات چور آیا' یہ کچھ لے گیا اٹھا کے۔کہنے لگے او تو سویا رہا' جاگ ہی نہیں آئی تجھے۔کہنے لگا نہیں تو آہٹ ہوئی اور فوراً جاگ اٹھا' کہنے لگا او جاگ اٹھا'' تے ایناں تگڑا تو ہیگاں توں رعب پایا اے ساریاں دے اتے' تے تیرے جاگدیاں چور لے گیا توں اٹھ کے پیچھا نہ کتا۔کہن لگا کتا سی' کہن لگا فیر پھڑیا نہ گیا؟ کہن لگا نئیں پھڑ لیا سی' کہن لگا تیتھوں تگڑا ہیگا سی؟ کہن لگا نئیں' او کہن لگا فیر ہویا کی؟ کہن لگا میں جس ویلھے او ہدی کلائی نوں ہتھ پایا تے چیچیا کہن لگا چھڈ

دے پھوڑاای ایتھے' اوتھے میں چھڈ دتا ہیگا'اوہدا پھوڑا دکھ گیا سی''۔''گھر آ کے رون لگ پیا سی کہ چور میرا سب کچھ لے گیا ہیگا''۔غور فرمایا آپ نے عزیزانِ من! پھوڑا دکھانا بڑی معیوب بات ہے لیکن جب چور کی کلائی پہ ہاتھ پڑے وہاں خدا کہتا ہے اِنَّ بَـطْـشَ رَبِّکَ لَشَـدِیْـدٌ [85:12] ہاتھ ڈالو تو اتنی سختی سے ڈالو کہ کلائی کی ہڈیاں توڑ کے رکھ دو تا کہ دوبارہ جرأت نہ ہو اس ظالم کو مظلوم کے خلاف ہاتھ اٹھانے کی۔انسانیت کے خلاف عزیزانِ من! جرمِ عظیم تھا کہ جب آپ کو صرف Mercy اور رحم دلی کو مستحسن جذبہ قرار دے کے اس قسم کے جذبۂ انتقام کو جس سے انسانیت کی حفاظت مقصود تھی' ایک معیوب جذبہ قرار دیدیا گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ مستبد قوتوں کو روکنے والا دنیا میں کوئی نہ رہا۔

قرآنی حقائق کو سمجھنے میں علامہ پرویزؒ کی تگ وتاز سال ہا سال کے غوروفکر کا نتیجہ ہے

قرآن کی بعض آیتوں کے اوپر تو عزیزانِ من! کہ میری اپنی کیفیت یہ تھی کہ جب میں نے پڑھا تو بات سمجھ میں نہیں آئی ایک کشمکش کے اندر مبتلا رہا کہ یہ باتیں ذہن میں نہیں آتی تھیں۔وہ مقامات تھے کہ مجھے بھی برسوں لگ گئے بات سمجھنے میں۔وَ ذَرُوا الَّـذِیْـنَ یُلْحِدُوْنَ فِیۤ اَسْـمَآئِهٖ (7:180) اسمائے خداوندی' صفاتِ خداوندی کو کہتے ہیں۔اب ہمارے ہاں تو ''یلحدون'' سے ایک لفظ الحاد نکال لیا' نا پھر ملحد اور بے دین نکال لیا اور دوسری طرف چل پڑے۔الحاد ہوتا ہے ایک سیدھے راستے کے اوپر جاتے ہوئے' دوسری طرف کو نکل جانا اور پھر اسی طرف نکلتے ہوئے چلے جانا۔یعنی Extreme ہو جانا کسی ایک سمت میں جانے کے لیے۔قبر میں جو لحد ہوتی ہے نا اب تو ہمارے ہاں وہ سیدھی سی قبر ہی بنا دیتے ہیں نا''روپے لیندے نیں تین گنا تے او کم کردے نیں بڑا آسان''۔لحد والی قبر کو پتہ ہے اُسے لحد کہتے اس لیے ہیں کہ وہ ایک طرف کو ہوتی ہے۔عربی زبان میں کسی ایک طرف نکل جانا اور اُسی طرف پھر چلتے جانا۔''اولائیکپو راچ ہوندی سی ساہ دی کبڈی' اوساہ دی کبڈی تہانوں پتہ ہیگی ناں کوڈی کوڈی کوڈی کوڈی کردے ہویاں تے فیر ایسے طراں مڑدے ہوئے اپنی اُس لائن تے آنا ہوندا سی' رستے اچ ساہ ٹوٹ جائے تے اوشکست ہوندی سی۔کوڈی کوڈی کردا ہو یا گیا بہت دور نکل گیا او ہنے پچھاں مڑ کے دیکھیا'لین تے بڑی دور ہیگی اے جے پچھاں گیا تے ساہ ٹوٹ جانا تے پھڑیا جانا' اوکوڈی کوڈی کردا گھر نوں ای چلا گیا''۔

الحاد کی بنا پر صفات خداوندی کو غلط نظری سے دیکھنے اور اسے اپنانے کا نتیجہ

اسے کہتے ہیں الحاد' ایک طرف نکل جانا۔آیت یہ تھی۔جب تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی یُلْـحِـدُوْنَ فِـیۤ اَسْـمَـآئِـهٖ [7:180] کیا بات ہے۔کہا ہے وَ ذَرُوا الَّـذِیْـنَ یُلْحِدُوْنَ (7:180) اتنے خطرناک ہیں وہ لوگ کہ جو خدا کی کوئی صفت لے کر اس میں ایک طرف کو شدت سے نکلتے چلے جائیں Extreme تک چلے جائیں۔کہا ان کا ساتھ چھوڑ دو ان کو ساتھ نہ رکھنا' چھوڑ دو

ان کو' بڑے خطرناک ہیں یہ۔ ذہن میں بات نہ آئے کہ صفت تو خدا کی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پہ یہ چیز ہے کہ جتنا زیادہ انسان اُس رنگ میں رنگا جائے' اتنا ہی زیادہ مقرب ہوتا ہے۔ اگر اس کی کوئی صفت لے کر اس میں آدمی Extreme تک نکل جائے تو یہ تو بڑی مستحسن بات ہونی چاہیے تھی۔ قرآن یہی نہیں کہتا کہ تم ایسا نہ کرنا' کہتا ہے کہ جو ایسا کریں' چھوڑ دینا ان کو' ان کے ساتھ نہ چلنا۔ کیا چیز ہوگئی۔ یہی بات جو ابھی میں نے کہا ہے۔ عیسائیت نے رحم کی صفت لی۔ صفت ہے خدا کی اور اس میں اُنہوں نے الحاد برتا ایک ہی طرف نکل گئے۔ عدل ان کے ہاں ہے نہیں صرف Mercy ہے۔ یہ ہے الحاد فی اسمآء۔ کتنی عجیب بات کہی تھی قرآن نے وَذَرُوا الَّـذِيْـنَ (7:180) چھوڑ دینا ان کو ان کا مسلک نہ کہیں اختیار کر لینا۔ ویسے بڑا جاذب اور بڑا فریبِ نگاہ کا مسلک نظر آئے گا' خدا کی کسی ایک صفت کے اندر اتنا زیادہ آگے چلے جانا۔ کہا ان کا مسلک نہ اختیار کرنا چھوڑ دینا ان لوگوں کو' بڑی خطرناک بات ہے۔ اور یہ خطرناک اسی لیے ہے عزیزانِ من! کہ وَ لِـلّٰـهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (7:180) کہا جتنی اس کی صفات ہیں حسنٰی کے معنی ہیں ان میں توازن برقرار رکھتے ہوئے ساری صفات کو اپناؤ۔ فَادْعُوْهُ بِهَا (7:180) لیکن الحسنٰی ہونا چاہیے۔

تمام صفات میں توازن برقرار رکھنے ہی میں حسن کی بحالی ہے

قرآن ہے عزیزانِ من! کوئی صفت بھی مذموم اور معیوب نہیں ہو سکتی' خدا کی صفت اور مذموم۔ ٹھیک ہے رحم بھی صفت ہے اس کا جبار ہونا بھی صفت ہے۔ کرو کیا؟ دونوں صفتیں پیدا کرو الحسنٰی کے مطابق اور توازن برقرار رکھو ان میں۔ ان سب کو سامنے رکھ کے پکارو کے معنی ہیں اپنے اندر ان چیزوں کو پیدا کرو الحسنٰی کے ساتھ۔ اور آگے ہے وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآئِهٖ (7:180) جو اس کی بعض صفات کو لے کر ایک ہی طرف کو جاتے ہیں' بالکل ان کا ساتھ نہ دینا' چھوڑ دو ان کو' وہ بڑے خطرناک ہیں۔ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (7:180) اور زمانہ بتا دے گا کہ یہ جو روش اختیار کیے ہوئے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہے۔ Christianity میں کوئی مملکت بھی ایسی نہیں ہے جو اس صفت کے اوپر اب ایمان رکھتی ہو' یا عمل کر رہی ہو کہ بدلہ نہیں لینا چاہیے' رحم ہی رحم ہونا چاہیے۔ زمانے کے تجربے نے بتا دیا کہ باطل کے اوپر ہوتے ہیں۔ کہا سَيُجْزَوْنَ (7:180) بہت جلدی پتہ چل جائے گا۔ اُنہوں نے تو یہ چیز کی لیکن آپ کے ہاں ابھی تک ایک عالمگیر ضابطۂ اخلاق Universal Ethic بنا' تصوف میں آ کے اور زیادہ اس میں شدت پیدا کی۔ الحاد فی الاسماء ہے یہ۔ کس قدر نگاہ فریب ہے یہ بات' کہ جس قدر بھی کوئی خدا کی کسی ایک صفت میں جتنا زیادہ آگے چلا جائے گا اتنا ہی ہمارے نزدیک زیادہ معزز اور مکرم اور مقرب بن جاتا ہے۔ اس کو الحاد فی الاسمآء کہتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرت نوع انسانی کے لیے اپنے اندر اعتدال پسندی کا بہترین نمونہ لیے ہوئے ہے

اور یہ الحسنیٰ ہے اس کی صفات کو پکارنا کہ ایک جگہ وہ رحمت ہے وہی رسول ﷺ دوسری جگہ کہا ہے کہ واغلظ علیھم ۔ نہ اس غلظت میں اس نے تشدد برتا نہ اس نرمی میں اس نے تشدد برتا۔ دونوں کو اپنے مقام پہ رکھا۔ مخالفین کی قوتوں کو اس طرح سے توڑا کہ ان کے آخری مرکز مکہ کو بھی فتح کیا۔ لیکن جب وہ پابجولاں سامنے آئے وہ لوگ تھے جنہوں نے آپ ﷺ کو اذیت پہنچائی ہوئی تھی۔ پوچھا آپ ﷺ نے کہ اس وقت تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم عرب ہیں جیسا عرب دشمنوں کے ساتھ برتاؤ کیا کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ تو دشمنوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ یہ تو قریش تھے عرب تھے اُنہوں نے کہا کہ جیسے دشمن دشمنوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں عرب ہیں جیسے عرب عربوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے کہا کہ ٹھیک ہے میں عرب بھی ہوں لیکن میں خدا کا عبد بھی ہوں خدا کا عبد ایسے مقام کے اوپر ذاتی انتقام نہیں لیا کرتا لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:92) یہ خدا کی صفتِ عفو ہے جو یہاں آئی۔ خدا کی صفت بطش کی وہ مکہ کے فتح کرنے کے اندر آئی۔ ایسا ضروری ہے ان صفات کا۔

حضرت عمرؓ کی شخصیت کردار کے آئینہ میں

حضرتِ عمرؓ کے متعلق تو معلوم ہے نا کہ ہاتھ میں درہ لیے ہوئے چلے جا رہے ہیں ''اینوں مار اینوں وڈ کھل لا''۔ ہمارے ذہن میں اتنا غلط تصور دیا ہوا ہے۔ ایک شخص کو گورنر منتخب کیا گورنری آرڈر زُ اُسے لکھوا رہے تھے منشی بیٹھا ہوا تھا۔ اندر سے ایک چھوٹا سا بچہ آیا وہ آتے ہی امیر المؤمنینؓ کی گود میں بیٹھ گیا آپ نے گلے سے لگایا اس کا سر چوما۔ وہ جو گورنر بننے والا تھا اُس نے کہا آپ بچوں سے اس طرح سے پیار کرتے ہیں۔ آپؓ نے کہا کہ بچے تو پیار کے مستحق ہوتے ہیں پیار کیا جاتا ہے۔ کہنے لگا کہ میرے ہاں تو پانچ چھ بچے ہیں کسی کو جرأت نہیں ہے میرے کمرے میں بھی آ جائے۔ آپؓ نے اُسے کچھ نہیں کہا منشی سے کہا کہ یہ کاغذ پھاڑ دو اُس نے کہا کہ جی کیا بات ہے کہنےؓ لگے میں نے تمہاری وہ صفات تو سن رکھی تھیں جس سے میں سمجھتا تھا کہ نظم ونسق بڑی عمدگی سے کرو گے لیکن یہ بات جو تم نے کہی ہے جس کے سینے میں اپنی اولاد کے لیے رحم نہیں اُس کے سینے میں رعایا کے لیے رحم کب ہوگا اس لیے تم گورنری کے اہل نہیں ہو سکتے۔ گورنری کے اہل نہیں ہو سکتے اگر سینے میں محبت نہیں ہے۔ اور وہی عمرؓ ہے کہ جب سنتا ہے کہ بیٹے سے ایک خطا ہوئی اور گورنرِ مصر نے اس کو سزا دی اپنے گھر کے اندر دی جسے پبلک میں دینا چاہیے تھا۔ اُسے بھی بلا بھیجا گورنر کو بھی بلا بھیجا بیمار بیٹے کو اونٹ کی ننگی پیٹھ پر یہاں بھیجو۔ اور یہ کہا کہ وہ سزا پبلک میں دی جائے گی۔ صحابہؓ نے کہا کہ بیمار ہے اس وقت وہ مر جائے گا۔ اُنہوںؓ نے کہا سزا تو بھگتنی ہوگی دہری سزا اس کو بھی دونگا جس نے امیر المؤمنین کا بیٹا سمجھ کے اس کو سرِ عام سزا نہیں دی جو قرآن کا حکم ہے گھر کے اندر سزا دی ہے۔ اُس کو تو الگ سزا

دونگا اور اسے الگ سزا دی جائے گی۔ اور سزا کے دوران حقیقی بیٹا مر گیا۔ اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ [85:12] اور رحم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ گورنر اگر یہ کہتا ہے صاحب آپ محبت کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں اگر دل میں محبت نہیں ہے تو تم گورنری کے اہل نہیں ہو۔ یہ ہے الحسنٰی کے طریقے کے اوپر اسمآء اللہ کو دعوت دینا۔ رحم کے وقت میں رحم' شدت کے وقت میں شدت۔ یہ ہیں وہ چیزیں عزیزانِ من! جو ہونی چاہئے تھیں کسی قوم کے اندر۔ اور یہ ہے وہ سازش جو کی گئی ہے۔ قوت کا نام آئے تو آپ کے دلوں کے اندر یوں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔

لفظ عزت کا بنیادی مفہوم Respect نہیں بلکہ غلبے کا ہے

اب آپ کے ہاں عزت کا مفہوم شرافت کا سا ہو گیا ہے اس کا ترجمہ ہی Respect رہ گیا ہے۔ یعنی وہ اصلی مفہوم ہی غلط ہو گئے۔ او عزت کے تو معنی ہی غلبے کے ہیں۔ جب خدا اپنے آپ کو بار بار کہتا ہے العزیز الکریم تو ہم سمجھتے ہیں ''جیویں اسی خط اچ لکھدے آں ناعزیزِ محترم یا او میرا عزیز ہوندا اے'' زیادہ سے زیادہ پیارے کے معنی میں آ گیا۔ وہاں بھی آپ دیکھیے عزیز کے معنی یہاں آتے ہیں اور پھر عزت کے معنی تو وہ شرافت ہے Respect اس کا ترجمہ آ گیا۔ اس کے معنی ہی قوت و غلبہ کے ہیں' یہ مفہوم ہی نکل گیا ذہنوں سے۔ یہ ہے جو کیا گیا مومن کی قرآنی صفات' جسے اقبال یوں پیش کرتا ہے' وہ ہے قرآن کے اعتبار سے جو مومن

علامہ اقبال کے الفاظ میں لفظ عزیز اور عزت کا حقیقی مفہوم اور اس کا استعمال

جس سے جگرِ لالہ مَیں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

دونوں خدا کی صفات ہیں۔

گذر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

کیا بات ہے!!!۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ [48:29] ۔ بات یہاں سے چلی تھی۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرت کا ایک اہم واقعہ دو متضاد جذبات کا مظہر تھا

وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ (9:73) ایک طرف یہ چیز ہے وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ (9:73)۔ اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ خدا کی رحمت ہے کہ تو بڑا ہی نرم دل واقع ہوا ہے۔ پھر میرا بیان کردہ واقعہ یہاں دوبارہ آ گیا اور اس مقام پہ بھی دہرانا ضروری ہے۔ ایک شخص یہودی کو قتل کی سزا موت دے رہے تھے حضور ﷺ خود کھڑے۔ سزا کے متعلق تو یہ حکم ہے کہ سامنے دی جائے اور گواہ بھی موجود ہوں۔ تو جلاد اُدھر سر پہ کھڑا تھا اِدھر سے اشارے کا منتظر تھا کہ اُس کی چھوٹی سی بچی چیختی آہ وفغاں کرتی ہوئی آئی اور حضور ﷺ کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئی اور یہ کہا کہ مجھے یتیم نہ ہونے دیجیے' میرے باپ کو معاف کر دیجیے۔ حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ صحابہؓ نے سمجھا کہ اب آپ معافی کا حکم دیدیں گے۔ جلاد انتظار کر رہا تھا آپ ﷺ نے حکم دیا اُس نے گردن کاٹ دی۔ بچی کو آپ نے گلے سے لگایا' لے آئے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ یہ کیا بات تھی۔ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو کیوں پھر اس وقت جاری ہوئے تھے اور اگر آنسو جاری ہوئے تھے تو پھر حکم کیوں دیا گیا۔ ایک فقرہ ہے عزیزانِ من! یہ ہیں فقرے کہ جن کو کہا جائے گا کہ حضور ﷺ کی حدیث ہے۔ کہا تم نہیں سمجھ سکے اس کو۔ اُس وقت محمد بن عبداللہ کی آنکھ رو رہی تھی اور محمد رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ اشارہ کر رہا تھا۔ اس قسم کے متضاد جذبات کو (میں متضاد کو کوٹڈ کہہ رہا ہوں) ایک ہی سینے کے اندر رکھنا اور اس کے بعد یہ دیکھنا کہ ان کا محل کونسا ہے' کہاں کس جذبے کو باہر آنا چاہیے یا کس معیار کے مطابق اس جذبے کا استعمال ہونا چاہیے۔ قرآن کی تعلیم ہمیں یہ بتاتی ہے' یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہمیں بتاتی ہے۔ قرآن اور سیرت کو پڑھو تو اس نقطۂ نگاہ سے پڑھو۔ کس وقت پر کیا ردِعمل ہمارے ہاں ہونا چاہیے۔ کس مقام پہ کونسے جذبے کا استعمال ہونا چاہیے اور کس حد تک استعمال ہونا چاہیے۔ حدود اللہ کہا ہے قرآن نے' باندھ کے نہیں رکھ دیا ان حدود کے اندر آپ کو اجازت دی ہے۔ یہ جتنی صفات آپ کو نظر آتی ہیں یہ سارے انسان کے اندر جذبات ہیں' ان سب کا پرورش کرنا اور نشوونما دینا نہایت ضروری ہے عزیزانِ من!۔ ذات کی نشوونما کے معنی یہ ہیں کہ ان تمام جذبات کی نشوونما ہو۔ اور اگلی چیز پھر یہ ہے کہ ان صلاحیتوں کا استعمال کس طرح سے کیا جائے۔ ان کو خدا کی بتائی ہوئی حدود کے مطابق استعمال کیا جائے۔

علامہ اقبال کی زبانی تلوار کے استعمال کا طریق

وہ جو اس نے کہا ہے اقبالؒ نے کہ

مومناں را تیغ باقرآں بس است

مومن کے لیے تلوار قرآن کے ساتھ بس کافی ہے

این دو قوت حافظ یک دیگرند

عجیب ہے یہ مصرع عزیزانِ من! یہ دوقوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں۔تلوار قرآن کی محافظ ہے' قرآن تلوار کو بیباک نہیں ہونے دیتا۔جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ (9:73) وہی رسول جسے وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (21:107) کہا ہے وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ (9:73) دونوں صفتیں خداوندی ہیں وہ روف ورحیم بھی ہے وہ جبار المتکبر بھی ہے۔اسی طرح سے اس کا رسول رحمآء بینھم بھی ہے اشدعلی الکفار بھی ہے۔وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ (9:73) اس لیے کہ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ (9:73) انہوں نے اپنی روش ایسے اختیار کر رکھی ہے یقیناً ان کی زندگی جہنم کی ہے جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا (9:74)

فرعون کا کفر اختیار کرنا بھی منافقت پر مبنی تھا

کہا کیفیت ان کی بزدلی کی' بے غیرتی کی' بے حمیتی کی یہ ہے' یہ ہے منافقت کہ جب کبھی گرفت میں آتے ہیں' قسمیں اٹھاتے ہیں۔خدا کی قسم کہ ہم نے بالکل نہیں کہا جی۔آپ نے دیکھا جرم کیا ہے؟ دھڑلے سے جو کہنے والے تھے کہ ہم کر رہے ہیں مخالفت' ان کے متعلق یہ نہیں کہا۔کہا ان کی کیفیت بے غیرتی کی' بے حمیتی کی ہے۔وہ اس مقام پہ کفر کو بھی مذموم قرار دیتا ہے جہاں وہ منافقت اختیار کرتا ہے۔اور منافقت کسی نہ کسی ڈر سے یا کسی نہ کسی تحریص یا رغبت کی وجہ سے لالچ سے ہوتی ہے۔آپ نے دیکھا کس مقام پہ قرآن نے کہا ہے۔فرعون کا پہلے کریکٹر وہ دیتا چلا جا رہا ہے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى [79:24] بڑا کریکٹر تھا اس کا 'خدا بن کے بیٹھنے والا' یہ کس کی نہریں ہیں' کس کے دریا ہیں' کس کی زمین ہے یہ' ہماری زمین ہے۔عَلَا فِی الْاَرْضِ (28:4) قرآن حکیم کہتا ہے کہ اس شخص نے حدود فراموشی کر دی ہے' حدود سے بڑھ گیا ہے اس معاملے کے اندر۔ٹھیک ہے' دعوت دی ہے نہیں مانا۔اُس کے بعد فرعون نے جب موسیٰ کا تعاقب کیا تو واقعہ تو یہ لمبا ہے' وہاں یہ ڈوبنے لگا' جب موت سامنے آ گئی۔اندازہ لگایے عزیزانِ من! ایمان ایسی چیز ہے کہ کسی وقت بھی کوئی کرے تو ہمیشہ ہونا چاہیے کہ قابلِ قبول چیز ہے مستحسن چیز ہے کہ صاحب ایمان لے آیا یہ اس نے اقرار کر لیا۔

موت کے ڈر سے فرعون کا ایمان لانا منافقت اور بزدلی پر مبنی تھا

قرآن بتا رہا ہے کہ جب ڈوبنے لگا تو اُس وقت اُس نے کہا کہ میں ایمان لاتا ہوں بنی اسرائیل جس پہ ایمان لائے۔بظاہر نظر آتا ہے کہ فرعون جیسا اتنا متکبر جب ایمان لانے والا ہو تو اس کے اوپر تو صلوٰۃ وسلام کے پھول برسانے چاہیئے تھے۔اتنا بڑا آدمی ایمان لا رہا ہے۔وہ یہ کہہ رہا ہے اور اِدھر سے جواب آیا کہ لعنت ہے تجھ پر' موت کے ڈر سے ایمان لاتا ہے فٹے منہ تیرا۔در کفر ہم پختہ نہ ای زنار را

رسوا مکن ۔نہیں قبول کیا گیا ایمان ۔کہا مومن ہونا تو بڑی چیز ہے تجھے تو فرعون بننا بھی نہ آیا۔ یہ ہے قرآن ۔ بے غیرتی اور بزدلی اور منافقت اور بے حمیتی جو ہے اوموت کے ڈر سے ایمان لا رہے ہو فتے منہ۔ یہ قرآن ہی کہہ سکتا تھا عزیز انِ من!۔

حاسد اور منافق کی سوچ رکھنے والے کا انجام یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ان کا دوست نہیں ہوسکتا

یَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوۡا (9:74) اوشرم نہیں آتی ذراسی گرفت میں آئے ہیں قسمیں اٹھا اٹھا کے کہہ رہے ہیں کہ صاحب ہم نے نہیں کیا۔وَلَقَدۡ قَالُوۡا كَلِمَةَ الۡكُفۡرِ (9:74) سب کفر کی باتیں کرتے بھی رہے ہیں۔وَ كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِسۡلَامِهِمۡ (9:74) اسلام کا اقرار کرنے کے بعد عملاً کفر کی طرف بڑھتے بھی رہے ہیں۔وَ هَمُّوۡا بِمَا لَمۡ يَنَالُوۡا (9:74) ٹھیک ہے جو چیز حاصل نہیں کر سکے اس کے متعلق کہتے ہیں کہ نہیں ہم نے تو اس کا کبھی ارادہ ہی نہیں کیا۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ پوری پوری کوشش کی انہوں نے اس کے حاصل کرنے کی ۔حاصل نہیں ہوا تو کہتے ہیں کہ نہیں صاحب ہم نے تو کبھی کیا ہی نہیں ہے اولعنت تم پہ۔وَ مَا نَقَمُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ اَغۡنٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗ مِنۡ فَضۡلِهٖ (9:74) وَ مَا نَقَمُوۡۤا اِلَّاۤ (9:74) کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ جماعتِ مؤمنین سے کس بات کا انتقام لے رہے ہیں اس حسد کی وجہ سے کہ خدا نے ان کو اتنی سرفرازی کیوں عطا کر دی۔ تم بھی اگر ایمان میں ان کے ساتھ مخلصانہ شریک ہوتے تو یہ تو تمہیں بھی حاصل ہوتا۔ اس بناء پہ تم ان سے انتقام لے رہے ہو۔ یا یہی چیز کہ تم خود پہلے اتنے مفلس تھے قلاش تھے تمہیں خدا نے اس قدر دیدیا تو کیا اس کے بدلے میں انتقام کی سوجھ رہی ہے تمہیں۔لیکن میں سمجھتا ہوں حسد کی بات کا اطلاق یہاں موزوں طریقے سے ہوتا ہے کیونکہ منافقت کا جذبہ حسد ہوتا ہے۔ اپنے اندر وہ صفت ہوتی نہیں اور جس کے اندر وہ صفت ہوتی ہے اُسے وہ دیکھ نہیں سکتا۔ بجائے اس کے کہ رشک پیدا ہو کہ میں بھی اس طرح کی صفت پیدا کروں الٹا حسد کرتا ہے کہ اس میں وہ صفت نہ رہے۔ یعنی جماعتِ مؤمنین کا یہ جرم ہے کہ خدا نے انہیں کیوں سرفرازیاں خوشحالیاں عطا کر دیں کہ جس کی وجہ سے یہ ان سے انتقام لے رہے ہیں۔ فَاِنۡ يَّتُوۡبُوۡا يَكُ خَيۡرًا لَّهُمۡ (9:74) پھر بھی دروازہ ابھی نہیں بند ہو رہا اب بھی اپنی اگر روش سے باز آ گئے تو خَيۡرًا لَّهُمۡ ان کے لیے بہتر ہو گا۔ ہم اپنی خاطر یہ نہیں کہہ رہے۔ وَاِنۡ يَّتَوَلَّوۡا يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيۡمًا فِى الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةِ (9:74) اور اگر اس کے باوجود پھر ایک دفعہ اقرار کریں کہ جی ہم باز آ گئے پھر وہی کچھ روش اختیار کریں پھر گریز کی راہیں نکالیں اعراض برتیں تو پھر کہا ہے کہ بڑی الم انگیز سزا ہے جو ان کو ملے گی خدا کے ہاتھوں سے اس دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ یہاں اس نظام کے ہاتھوں سے اور اس کے بعد جسے Diseased Mentality, Psychology مرض کہتے ہیں یہ ہے وہ عذاب جسے مرنے کے بعد کا جہنم قرار دیا ہے قرآن نے قرار دیا ہے۔وَمَا لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّ لَا نَصِيۡرٍ (9:74) تم دیکھو گے کہ منافق کا دنیا میں کوئی دوست اور مددگار

نہیں ہوتا۔ بڑی عظیم چیز قرآن کہہ گیا ہے صاحب۔ کھلی کھلی قوموں کے اندر آپس میں معاہدے بھی ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے حلیف بھی ہوتے ہیں۔لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ منافق کا دنیا میں کوئی دوست اور کوئی نصیر نہیں ہوا کرتا۔

معاشی میدان میں قرآن حکیم کے نزدیک نفاق کے سلسلہ میں گریز کے ایک پہلو کی وضاحت

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ[9:75] فَلَمَّاۤ اٰتٰهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَ تَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ (9:76) کہا کیفیت ان کی ہے کہ پہلے یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ ہم پہ فضل کرے کرم کرے تو یقیناً ہم اس کی راہ میں بہت کچھ دیدیں۔اور جب ایسا ہوگیا، ان کو اتنا کچھ مل گیا تو اس کے بعد وہ سب کچھ اپنے ہی لیے سمیٹ کے رکھ رہے ہیں۔ یہ بھی نفاق ہے۔دیکھ رہے ہیں منافقت کہاں کہاں آ رہی ہے۔وَ تَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ مُّعۡرِضُوۡن (9:76)اور پھر دیکھیں گے جہاں بھی منافقت آتی ہے۔ یہ تولوا اور اعراض کے الفاظ آتے ہیں، گریز کی راہیں نکالنا۔کروڑوں جمع کرنے کے بعد اڑھائی پرسنٹ نکال دیں۔اس نے کہا تھا کہ اپنی ضرورت سے زیادہ سب کا سب باقیوں کی منفعت کے لیے دیدو۔اس حکم کے بعد اُس کے متعلق یہ کہنا کہ اڑھائی پرسنٹ دیدیجیے تو چلیے صاحب یہ فریضہ ادا ہوگیا۔یہ ہے ''تولوا'' گریز کی راہیں نکالنا۔وَّ هُمۡ مُّعۡـرِضُوۡن (9:76) عجیب لفظ ہے۔''تول'' ایک وقت میں ہوسکتا ہے کہ گریز کی راہیں نکالیں' ''معرضون'' مسلک ہی یہ ہوگیا ہے' ان کا اعراض برتنا۔ثواب حاصل کرلینا ہاتھ سے کچھ نہ دینا۔فقیر نے مانگا اس کو اللہ کے نام پہ دیجیے' ثواب ہوگا' ایک روپیہ دیا ثواب ہوا۔اُس نے کہا کہ بیٹا ہم بہت خوش ہوئے ہیں مانگو کیا مانگتے ہو ہم سے' کہنے لگا جی یہ روپیہ واپس دیدیجیے۔ کہنے لگا تو تمہیں کیا ملا' کہنے لگا اُس دینے کا ثواب تو مجھ کو مل گیا نا۔مُّعۡرِضُوۡنَ(9:76) عجیب بات ہے یہ Psychological کہ پھر یہ ان کی روش ہی بن جاتی ہے یعنی وہ غیر شعوری طور پہ یہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ جب بھی وہ مرادیں مانگیں گے خدا سے کہ یا اللہ اگر اس سودے میں سے مجھے دس ہزار روپیہ بچ جائے تو میں تیرے نام پہ بہت کچھ کروں۔ وہ بچ جانے کے بعد پھر کیا ہوتا ہے؟ وہ کہتا ہے ''سونفل پڑھ دیندے ہیگے' پیسہ نہ پلوں گیا'' وہ جو منت مانی تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔ عجیب چیز ہے۔فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡن (9:77) کہا دیکھو تو سہی ایک ہی وقت میں کتنے جرائم ان سے ہوگئے۔

منافق کی ایک شکل کذب کی صورت میں بھی ہے

پہلی چیز تو یہ کہ ایک وعدہ کیا تھا خدا سے' وعدہ خلافی کی۔ جو چیز اس طرح سے کھلی رہنی چاہیے تھی خدا کے بندوں کے لیے' اپنی ذات کے لیے سمیٹ لی۔وَ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ (9:77) منافقت کے لیے قرآن نے کذب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہمارے ہاں

جھوٹ اور معنوں میں استعمال ہوجاتا ہے' جھوٹ ہوتا ہے جھوٹی بات کہنے والا۔ قرآنِ کریم میں سورۃ منافقین میں بڑی اہم چیز ہے۔ اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ [63:1] منافق جب تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم قسم اٹھاتے ہیں کہ تو خدا کا رسول ہے۔ کہیے ان کو کوئی جھوٹا کہے گا جو رسول اللہ ﷺ سے آ کے کہے کہ ہم قسم اٹھاتے ہیں کہ تو خدا کا رسول ہے تو سچی بات ہے نا یہ' اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔ کہا ہے وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ [63:1] خدا جانتا ہے کہ واقعی تُو تو اس کا رسول ہے۔ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ [63:1] اس کے ساتھ ہی خدا اس کی شہادت دیتا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ [63:1] یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی رو سے کذب کی Definition کیا ٹھہری۔ عزیزانِ من! عجیب چیز ہے۔ وہ کہتے ہیں تو رسول ہے خدا کا۔ کہا کہ خدا بھی شہادت دیتا ہے کہ تو رسول ہے۔ تو گویا ان کے دعوے کی شہادت خود خدا دے رہا ہے تو اس سے سچا کون ہوسکتا ہے۔ کہا ہم شہادت دیتے ہیں کہ بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ تو خدا کا رسول ہے۔ لیکن ہم اس کی بھی شہادت دیتے ہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔ تو جھوٹ کی Definition یہ ہوگئی کہ جہاں قلب اور زبان کی ہم آہنگی نہ ہو وہ سچی بات بھی جھوٹ ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

زباں ہو دل کی رفیق۔ یہ ہے صحیح Personality کی پہچان۔ کفر اور ایمان آگے چل کے آتا ہے۔

مومن کی طرف سے اور منافق کی طرف سے خدا کے رسول کو خدا کا رسول کہنا' کبھی برابر نہیں ہوسکتا

کفر میں بھی اگر زبان اور دل ہم آہنگ ہیں تو یہ ایک صفت ہے' جھوٹ نہیں ہے۔ ایمان میں تو پوچھو ہی نہیں کتنی بڑی چیز ہے۔ منافق کے متعلق عزیزانِ من! بڑی ہی باریک چیز قرآن کہہ رہا ہے۔ کہا کہ یہ خدا کی قسم کھا کے کہتے ہیں تو رسول ہے خدا کا۔ کہا کہ خدا خود شہادت دیتا ہے کہ تو واقعی رسول ہے۔ لیکن یہ جھوٹے ہیں۔ تیسری بات (وَ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ) تین جرم ان کے خلاف۔ تو دیکھیے اب یہاں کیا الفاظ آئے ہیں۔ نسخے سامنے رکھا کیجیے اور اتنی سی عربی ضرور سیکھ لیجیے عزیزانِ من! کچھ مشکل نہیں۔ قرآن بڑی آسان کتاب ہے عربی زبان کی۔ لیکن اُس میں پھر پتہ چلتا ہے کہ یہ کرکیا گیا ہے کہہ کیا گیا ہے۔

نفاق سے چھٹکارا حاصل کرنا مقصود ہو تو اپنے ہر وعدہ کو پورا کرنا ہوگا

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ (9:77) کہا یہ ہیں وہ چیزیں جن کی وجہ سے زندگی بھر نفاق ان کے قلوب کے اندر فَاَعْقَبَهُمْ (9:77) میں کیا عرض کروں اس کا ترجمہ ہی نہیں کرسکتا۔ نفاق ان کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ سکتا زندگی بھر۔ جہاں چلے جائیں' نفاق ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ کیوں نہیں چھوڑے گا؟ اس لیے کہ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ (9:77) پہلی بات تو یہ کہ جس چیز

کا وعدہ کرتے ہیں اُس کو یہ کبھی پورا نہیں کرتے۔ کہا کہ ہمیں اگر یہ مل جائے تو ہم خدا کی راہ میں یہ چیز دیں' اور ملنے پر اُس سے بُخل برتتے ہیں۔ اور پھر لَکٰذِبُوْنَ(63:1) ان کا دل اور ان کی زبان ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ ان جرائم کی بناء پر ساری عمر نفاق ان کے پیچھے لگا رہے گا چھوڑے گا نہیں پیچھا ان کا۔ کیا بات ہے اعقب کا کہا ہے قرآن نے!!!۔

ذات خداوندی تو انسان کے دل سے گذرنے والے ہر ہر خیال تک سے بھی واقف ہوتی ہے

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ سِرَّھُمْ وَ نَجْوٰھُمْ وَ اَنَّ اللّٰہَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (9:78) کسے دھوکہ دینا چاہتے ہیں' خدا کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں' انہیں معلوم نہیں کہ وہ دل میں گذرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے ان کی ساری رازداریوں کو ان کے خفیہ مشوروں کو جانتا ہے۔ یَعْلَمُوْا (9:78) اس کے بعد کہا عَلَّامُ الْغُیُوْبِ(9:78) Superlative Degree ہے کوئی بات چھپی نہیں ہے اور پھر غیب ہی نہیں عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (9:78) جمع کا صیغہ ہے۔ کیا بات ہے صاحب!! لطف آجاتا ہے ان چیزوں میں آ کے۔ اس لیے دھوکہ دیتے ہیں۔ جسے کہا ہے کہ خدا کو دھوکہ دیتے ہیں جیسے سورۃ بقرۃ میں ہے کہ یہ تمہیں دھوکہ نہیں دیتے' اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اور خدا کو دھوکہ دینا اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ ورنہ خدا تو اس سے بلند ہے اُسے کون دھوکہ دے سکتا ہے۔ (وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ(2:9) لیکن کس مقام پہ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ(2:12) غیر شعوری طور پر یہ فریبِ نفس میں' خود فریبی میں مبتلا ہو گئے۔

خود فریبی انسانی ذات پر کس نوعیت سے اثر انداز ہوتی ہے؟ بڑی قابل غور بات ہے

ابتدأً تو ذرا With Effort نفاق کرنا پڑتا ہے پھر اس کے بعد تو جسے کہتے ہیں کہ اپنے مومنٹم سے چلتی ہے چیز۔ آپ کو معلوم ہے کہ گاڑیوں میں یہ فرسٹ سپارک جو آتا ہے وہ موٹر کے چلانے کے لیے کہتے ہیں کہ کم از کم 600 یونٹس کی قوت اس کے اندر ہونی چاہیے۔ لیکن جب وہ چل پڑتی ہے تو پھر اپنے مومنٹم سے چلتی ہے کہ انجن بند کر دیا جائے تو بھی وہ کئی میلوں تک چلی جاتی ہے مومنٹم سے۔ یہ ہوتا ہے غیر شعوری طور پر کسی روش پہ چلے جانا۔ یہ ہے سائیکولوجی کی اگلی سٹیج جسے کہا ہے کہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ(2:12) یہ چیز پھر شعوری طور پہ نہیں رہتی' غیر شعوری طور پہ ہو جاتی ہے۔ اور اسی کو قرآن نے کہا ہے کہ ہم دل میں گذرنے والے خیالات سے بھی واقف ہیں جس تک تمہارا اپنا شعور نہیں پہنچ رہا' ہم اس کو بھی دیکھ رہے ہیں۔

قرآن حکیم کی تعلیم انسان کے غیر شعوری غلط تصورات کو بھی باقی نہیں رہنے دیتی

قرآنِ کریم جو کرتا ہے وہ یہ کہ جو چیزیں غیر شعوری طور پہ بھی اندر کام کر رہی ہوتی ہیں ان کو بھی وہاں سے نکال دیتا ہے ان کی جگہ صحیح

خیالات کوجا گزیں کر دیتا ہے۔ **اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ** (9:79) کہتا ہے ذرا آؤ بتاؤں تو سہی منافقین کرتے کیا ہیں۔ جماعت کے اندر ایک وہ لوگ ہیں مطوعین' طاعت کے معنی بتایا تھا کہ بطیّب خاطر دل کی رضا مندی سے بغیر کسی قسم کی ریا کاری کے کوئی کام کرنا' بڑی چیز ہے یہ۔

دل و دماغ کی رضا مندی کے بغیر حاصل کردہ نتائج' اطاعت کی بجائے استبداد کہلاتے ہیں

یہ عرب طاع النخل بولتے تھے جب کھجور پک کے خود گر جائے۔ ایک تو وہ ہوتا ہے نا ''جھانپل مارنی پئے'' تو پھر وہاں سے اتارنا پڑے تو پھر اس پھل کو تو پال ڈالنا پڑتا ہے خود پکانا پڑتا ہے۔ اس قسم کی اطاعت جو کرائی جاتی ہے اس کو برتنوں میں بند کر کے اوپر منہ مٹی سے لپیٹ کے تو پھر اطاعت ہوتی ہے۔ اسی کو تو استبداد کہتے ہیں' اس کا نام اطاعت نہیں ہوتا۔ یہ ہوتی ہے قانون کی پابندی۔ عجیب قوم تھی یہ۔ ایک یہ ہے کہ پکا ہوا پھل جب اپنی پوری انتہا تک پک جائے اُسے پھر ضرورت نہ رہے ساتھ رہنے کی' وہ خود ٹپک پڑتا ہے۔ یہ جو اس طرح سے پھل کا خود ٹپکنا ہے' اسے اطاعت کہتے تھے۔ قرآن نے اسی لیے اطاعت کا لفظ لیا ہے اپنے ہاں۔ قانون کی فرماں پذیری صرف نہیں کہا۔ کہا جماعت کے اندر وہ لوگ بھی ہیں **الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ** (9:79) کہ وہ انسانیت کی بہبود کے لیے اپنا مال دیتے ہیں' لا کے پیش کر دیتے ہیں۔ کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ دینے والے تو یہ کہتے ہیں دیکھیے نام و نمود کی خاطر چندہ لے آیا۔ بہت زیادہ مقرب بننا چاہتا ہے ان کی نگاہوں میں صاحب' آگے آگے ہو کے بیٹھتا ہے۔ کہتا ہے جو دینے والے ہیں ان کے خلاف اس قسم کے الزامات۔

خدائے علیم و خبیر کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا

ان میں غریب بھی ہیں اُن میں اس کی توفیق نہیں ہے کہ وہ کوئی مالی مدد کر سکیں۔ **لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ** (9:79) کیا بات ہے یہاں !! جماعت کے دونوں طبقوں کی بات۔ یہ ابتدائی دور ہے جس میں ابھی جماعت کی تشکیل ہو رہی ہے۔ جن کے پاس ہے وہ اس طرح مدد دیتے ہیں' جن کے پاس یہ نہیں ہے وہ اپنی خدمت پیش کر دیتے ہیں کہ ہم تو کچھ خدمت کر سکتے ہیں' وہ لے لیجیے' جو آپ کام کرانا چاہتے ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے جو دیتے ہیں ان کے خلاف یہ الزام ہوتا ہے کہ نام و نمود کی خاطر۔ جو نہیں دینے جوگے بیچارے وہ جماعت کے اندر آئے ہوئے ہیں' ساتھ لگے ہوئے ٹھیک ہے کل کو کچھ ملے گا تو ہمارا بھی اس میں حصہ ہوگا۔ کہنے لگے ان کی یہ کیفیت **فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ** (9:79) یہ ان کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ دونوں میں سے کسی کو نہیں بخشتے۔ **سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ** (9:79) سخر کے معنی ہوتا ہے کسی کو ذلیل کرنا نیچا کر دینا۔

قرآن حکیم کے الفاظ میں بطیّب خاطر اپنی خدمات پیش کرنے والے صحابہؓ کرام کی قلبی و دماغی کیفیت

کہتا ہے یادرکھیے اس سے یہ لوگ نیچے نہیں ہوتے یہ جو محنت اس طرح سے آ کے پیش کر رہے ہیں خالی' یہ تو

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

یہ وہ تھے کہ جن کے متعلق قرآن نے اسی سورۃ میں آگے کہا ہے کہ یہ تیرے پاس آتے ہیں کہ ہمارے پاس سواری نہیں ہے' ہم تو جنگ میں جانے کے لیے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا' لیکن کیا کریں کہ سواری نہیں ہے۔ قرآن میں ہے کیفیت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں کہ سواری کا انتظام میرے پاس بھی نہیں ہے۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ دونوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگ جاتے ہیں۔ نہ دینے والے کی تو یہ کیفیت ہے۔ کہاں ان کی کیفیت یہ ہے دینے والوں کو مطوعین نے کہہ کے قرآن نے بلایا ہے۔ قرآن کا لفظ دیکھیے اس قدر بطیّب خاطر دینے والے' جن کے پاس کچھ نہیں ہے وہ دل اور جان لا کے پیش کر رہے ہیں۔ ان کے متعلق یہ کہنا کہ یہ گداگروں کی جماعت اکٹھی ہوگئی ہے۔ ٹھیک ہے۔ یہ ذلیل نہیں ہونگے' تم ذلیل ہوگے۔ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ (9:79) الم انگیز عذاب ہوگا۔

انسانی زندگی میں دردناک عذاب یہ ہے کہ اپنوں میں منافقت کا پردہ چاک ہو جائے

منافقت جب کھلتی ہے' الم انگیز عذاب ہے عزیزانِ من! آپ دیکھئے لفظ کیا قرآن لاتا ہے۔ اس سے زیادہ الم انگیزی بھی کوئی اور ہے کہ دوستوں کی محفل میں منافقت کا پردہ چاک ہو جائے۔ ''لیکن اگلی سٹیج او اوندی ہیگی اے جیہڑی ساڈے آئی ہوئی ہیگی اے ڈھیٹ ای ہو جاندے ہیگے نیں''۔ وہ روز آ جاتا تھا کھانے کے لیے بیٹھ جاتا تھا' اُنھوں نے کہا صاحب کیا علاج کریں اس کا' کئی بار کہہ چکے' باز ہی نہیں آتا۔ اُن سے کہا کوئی بات نہیں کل آئے تو مجھے بتانا جوتے مارونگا۔ وہ آ کے بیٹھا اور اس نے آ کے دو چار دھول دھپے مارے۔ کہنے لگے سبحان اللہ اس طرح سے مار مار کر یا قبلہ ابا جان مرحوم کھلاتے تھے یا دوست کھلاتے ہیں۔ یہ عذاب الیم تو اس کو ہی ہو سکتا ہے جس میں کچھ رمق تو باقی رہے۔ ہم تو عزیزانِ من! منافقت میں اس مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں ہماری حمیت اور غیرت بھی نہیں جاگتی ہے۔ پوچھو نہیں کہ اس مانگنے کے عوض میں کیا کچھ ہمارے ساتھ ہوتا ہے اُس کا نام ہم نے Diplomacy رکھا ہوا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت 79 تک ہم آ گئے۔ یہ اناسی اور نواسی میں ہمیشہ مجھے اشتباہ رہتا ہے۔ اچھا ہی ہے کبھی کبھی رہنا آپ کو کچھ ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت 79 پہ ہم پہنچ گئے 80 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (2:127)

بارہواں باب: **سورۂ توبۃ** (آیت80)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج مئی 1973ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی 80 ویں آیت سے ہوتا ہے۔ (9:80)

منافق اپنے انداز میں مختلف کیفیات کا حامل ہونے کے باعث قوموں کے لیے سب سے زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے

آپ کو یاد ہے کہ ان دونوں سورتوں میں بنیادی موضوع تو جہاد یا قتال کے متعلق ہدایات ہیں۔لیکن اس ضمن میں اس ذہنیت کا ذکر بھی خاص طور پہ آ رہا ہے جو عمل کی دنیا میں بہانہ سازیاں کرتی ہے اور محض زبانی اقرار سے یہ سمجھ لیتی ہے کہ جو مقصد تھا دین کا وہ ہم پورا کر رہے ہیں۔انہیں قرآن کی اصطلاح میں منافق کہا جا رہا ہے۔تو ذکر چلا آ رہا تھا منافقین کا ان کی مختلف خصوصیات' ان کی ذہنیت' ان کی نفسیاتی کیفیات قرآنِ کریم ایک ایک کر کے بیان کرتا چلا آ رہا ہے۔اس لیے کہ سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا گروہ قوموں امتوں کے اندر' منافقین کا ہوتا ہے۔کھلے ہوئے دشمن کا آپ کو پتہ ہے اس سے آپ حفاظتی تدابیر بھی کر لیتے ہیں۔اُسے دور سے پہچان بھی لیتے ہیں۔لیکن یہ مارِ آستیں سب سے زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔اور خود ان کی اپنی زندگی بھی تو ہر وقت ایک جہنم کی آگ میں رہتی ہے۔اسی لیے قرآنِ کریم نے منافقین کے متعلق بڑی ہی شرح وبسط سے تمام کوائف اور ان کی ذہنیتیں بیان کر دی ہیں۔اُسی ضمن میں مسلسل اگلی آیت آتی ہے جس سے آج درس کا آغاز ہوتا ہے۔پہلے آیت کے الفاظ سنیے پھر آگے میں چلونگا۔

قرآن حکیم کے نزدیک مغفرت اور استغفار کا حقیقی مفہوم اور ہمارے ہاں کے تراجم اور تصورات

اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ ط وَ اللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ (9:80) پہلی بات تو یہی ہے کہ منافقت' کفر' فسق ایک ہی سکے کے مختلف رخ بتائے گئے ہیں۔ حالانکہ منافقت میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اقرار کرتے ہیں زبان سے' اس قوم کے اندر شامل ہوتے ہیں۔ کفار بالکل الگ ہوتے ہیں۔ اور فسق وفجور عام بے حیائی کی باتوں کو کہتے ہیں۔ لیکن قرآن تو یہ خصوصیات تینوں مشترک بتاتا ہے ان میں۔ اس چیز کو چھوڑیے اصل موضوع کی طرف آیئے جو اس آیت میں ہے۔ پہلے تو آپ یہ لے لیجیے کہ کسی ترجمے میں' کسی قرآنِ کریم میں' آپ دیکھیے مغفرت اور استغفار اور ''یغفر من یشآء'' وغیرہ کے الفاظ کا ترجمہ ہر جگہ بخشش آتا ہے۔ خدا سے بخشش مانگو' خدا بخش دیتا ہے۔ اور بخشش اور مغفرت کے الفاظ تو ہمارے ہاں مرادف ہو گئے ہیں۔ اللہ بخشے تو ہم یوں سانس سانس میں کہہ دیتے ہیں ہر مرنے والے کے ساتھ' خدا سے بخشش کی دعا مانگو میاں۔ بخش دینا' ہمارے ہاں اسکا یہ ترجمہ ہے۔ اور جیسا کہ میں بار بار یہ دہرائے چلا جا رہا ہوں کہ دین کے خلاف سب سے بڑی سازش یہ تھی کہ عربی زبان کے قرآنِ کریم کے ان الفاظ اور اصطلاحات کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان تراجم سے یہ گاڑی کسی اور ہی پٹڑی کے اوپر جا پڑتی ہے۔ مغفرت کا ترجمہ آج بخشش کیجیے تو دین اپنی اصل و بنیاد سے ہل جاتا ہے۔

ہمارے تمام تر تراجم کی بنیاد امام طبری کی لکھی گئی تفسیر اور تاریخ پر ہی رکھی گئی ہے

پھر دہرا دوں ذہنوں میں یہ بات آتی ہے کہ بہرحال یہ لوگ عربی جاننے والے تھے' اتنے بڑے عالم تھے۔ اب بھی وہ ہیں' پھر وہ یہی ترجمے کیوں کرتے چلے آئے۔ تو اس کی بنیاد تو آپ کی مروجہ تفاسیر ہیں اور ام التفاسیر تو آپ کے ہاں طبری کی ہے۔ یہ Concept ہی سارا ایرانی ہے۔ طبری خود ایرانی تھا' شیعہ بھی تھا' سنیوں کے امام ہیں یہ۔ یہ بات یونہی نہیں میں نے کہہ دی' میں نے عرض کیا ہے پھر مجھے دہرانا پڑتا ہے اس چیز کو' توفیق ہوئی' اسلام کی تاریخ آپ کے سامنے آئی تو آپ اس میں دیکھیں گے کہ یہ سازش کہاں سے شروع ہوئی اور اس زمانے کے ایران نے اس میں کتنا بڑا حصہ لیا تھا۔ بیشتر Concept آپ کے ہاں جو آج دین کے ہیں وہ ایرانی Concept ہیں۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ سب سے پہلی تفسیر بھی ان کی لکھی ہوئی ہے۔ تفسیر ہے احادیث پر مبنی کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا اس کے لیے۔ اور احادیث کے جو چھ مجموعے ہیں صحاح ستہ' حدیث کی چھ صحیح ترین کتابیں' سنیوں کی میں کہہ رہا ہوں شیعہ حضرات کے تو اپنے چار الگ مجموعے ہیں حدیث کے۔ سنیوں کی حدیثوں کی جو کچھ معتبر ترین کتابیں ہیں۔ وہ چھ کے چھ جامع ایرانی ہیں۔ ایک بھی عربی ان میں نہیں ہے۔ مؤرخ پہلا آپ کے ہاں بھی ایرانی ہے۔ مفسر پہلا بھی ایرانی ہے۔ حدیث کے جامعین جتنے ہیں'

سارے ایرانی ہیں۔

ہمارے یہاں مذہبی طور پر پائے جانے والے یہ تصورات قدیم ایرانی مذہب کے ترجمان ہیں

مجھے ایران اور عرب سے کوئی خاص طور پر مخاصمت یا کسی کی حمایت مقصود نہیں ہے۔ مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ جو Concept تصورات دین کے آپ کے ہاں آئے ہیں، جن کی بنیاد ان تفاسیر اور ان احادیث کے اوپر ہے۔ یہ تصورات قدیم ایرانی مذہب کے ہیں۔ اُنہیں لایا گیا ہماری تفسیر میں۔ اس کے بعد یہ عقیدہ بنا کہ ان الفاظ کے تراجم وہی ہیں جو تفسیر کی رو سے متعین ہوتے ہیں۔ لہٰذا ترجمے یہ ہو گئے۔ ترجموں کی سند تفسیر ہے۔ تو اُسی میں تصور جو ہے مغفرت کا: بخشش کا۔ پھر تفسیر میں ان آیات کی شانِ نزول ایک بیان ہو گئی تھی۔ اُس شانِ نزول نے اس مفہوم کے اوپر مہرِ تصدیق ثبت کر دی جو تفسیر میں بیان کیا گیا ہے۔ جب واقعہ بھی ساتھ بتا دیا جائے کہ یہ ہوا تھا اور اس پہ یہ آیت نازل ہوئی تھی یا اس آیت پر یوں رسول اللہ ﷺ نے اس پہ عمل کیا تھا تو پھر تو وہ پکا ہو گیا جو کچھ کہا گیا ہے۔ اُنہوں نے طریق ہی یہ اختیار کیا ہے اپنی تفسیر میں، اپنی تاریخ ترتیب دینے میں۔

قرآنی آیات کے نازل ہونے کے معاملے میں شان نزول کے عقیدہ کی وضاحت اور اس کا نتیجہ

شانِ نزول آئی اس آیت کی اس تفسیر کے اندر کہ مدینے میں منافقین کا سرغنہ سب سے بڑا سردار عبداللہ بن اُبی تھا۔ وہ ساری عمر اسلام کے خلاف سازشیں کرتا رہا۔ اس جماعت کے اندر شامل ہو کر، ان کی بیخ کنی میں مصروف رہا۔ جب اُس نے وفات پائی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی، مغفرت کی دعا بھی اس کے لیے کی۔ اور پھر یہ بات بھی آگے چلی کہ حضرت عمرؓ کے واقعات میں انہوں نے حضرت عمرؓ کی عجیب پوزیشن رکھی ہوئی ہے وہ جیسے Dominate کرتے ہیں (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ سے۔ اُس شانِ نزول میں ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بھی کہا اور حضرتِ عمرؓ نے آپ ﷺ کو روکا کہ ایسا نہ کیجیے۔ لیکن آپ ﷺ نے کہا کہ نہیں خدا نے یہ کہا ہے کہ ستر بار بھی تم اس کی بخشش کی دعا مانگو گے میں تب بھی نہیں بخشوں گا۔ اور مجھے اگر یہ معلوم ہوتا کہ خدا اس کے بعد بخش دے گا تو میں ستر سے زیادہ مرتبہ اس کے لیے دعائے مغفرت مانگتا۔ دعائے مغفرت بخشش کی دعا' اسی کو آپ کے ہاں استغفار کہتے ہیں۔ اپنے لیے بھی انسان بخشش کی دعا مانگتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی بخشش کی دعا مانگتا ہے۔

بخشش کے تصور نے تو دین کی ہیئت کو ہی بدل دیا ہے

پہلا تصور اس میں آ گیا بخشش کا۔ یعنی یہ تصور آپ دیکھیں گے ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔ بادشاہ کا تصور ہے کہ وہ کچھ کیا آپ نے اور

وہ ناراض ہوگیا' اس کے بعد کوئی صورت آپ نے کی۔قصیدہ پڑھا اس کی شان میں' کوئی خوشامد کی' اس کے مقربین جو تھے ان کو ساتھ ملایا' کچھ نذرانہ دیا جس کو آج کی اصطلاح میں رشوت کہا جاتا ہے۔یہ کچھ کیا آپ نے اور اس کے بعد وہ خوش ہوگیا تو اس نے کہا کہ یہ جو کچھ ظلم تم نے کیا تھا ہم نے اس کو معاف کیا' بخش دیا۔یہ ہمارے مسلمات میں سے آئی ہوئی چیزیں ہیں کہ جان کی امان پاؤں تو یہ عرض کروں' اگر بخش دیں آپ اس چیز کو۔بخشش بخشش۔آپ اس میں دیکھتے ہیں کہ یہ ایک شخص؟ ایک فرد کے مزاج کے اوپر ہوگیا' ناراض ہوگئے تو انہوں نے کولہو میں پلوا دیا' خوش ہوگئے تو جتنے بھی جرائم جنہیں گناہ کہا جاتا ہے' وہ سارے بخش دیے۔یہ ہے تصور آپ کے ہاں۔اسی لیے مرنے والے کے لیے دعائے مغفرت بخشش کی دعا' اللہ اس کو بخش دے۔ذرا گہرائی میں جایئے تو جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ اس ایک تصور سے ہی پورے دین کی بنیاد ہل جاتی ہے۔اگر ایک لفظ میں پوچھا جائے کہ قرآن نے ایک بنیادی تصور کیا آ کر دیا تھا تو میں بلا تامل کہونگا کہ قرآن نے انسان میں Scientific Attitude پیدا کیا ذہن کے اندر۔بہت بڑی چیز ہے' بہت بڑا انقلاب ہے۔

مٹھی بھر عرب قوم کے ہاتھوں رومن امپائر جیسی شان وشوکت کی مالک تہذیب ملیامیٹ ہوکر رہ گئی آخر کیوں؟

یہ جو تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ مٹھی بھر عرب اٹھے۔دو اتنی عظیم الشان سلطنتیں دائیں اور بائیں' ایرانیوں کی سلطنت ہزاروں سال کی تہذیب وتمدن اور شوکت وحشمت کو اپنے ساتھ لیے ہوئے۔رومن امپائر نام سے آج بھی تہلکہ مچ جاتا ہے ذہن کے اندر۔یہ ایرانیوں کی قدیم مجوسی تصورات کو لیے ہوئے' رومنز کی قدیم عیسائیت کے تصورات کو لیے ہوئے۔ان کے مقابل میں یہ عرب اٹھے اور انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں تہذیبوں کو نہیں' دونوں سلطنتوں کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔تو اس کے اسباب کے لیے بڑی تحقیقات ہوتی ہیں' بہت سی بیان ہوتی ہیں۔لیکن اس میں زیادہ کسی کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔قرآن پہ نگاہ اگر ہو تو سمجھ میں بات آجاتی ہے کہ یہ کیا چیز تھی عربوں کی کہ جن کی بناء پہ اتنی عظیم سلطنتوں کو فتح کر لیا۔ایران کی تو کیفیت یہ تھی کہ عربوں کے خلاف جنگ کرنا باعثِ ننگ سمجھتے تھے اپنے لیے۔یہ کیا چیز تھی جس کی وجہ عربوں کو اس طرح محیر العقول کامیابی حاصل ہوئی کہ وہ چھا گئے ان کے اوپر۔جواب اس کا ایک ہی لفظ کے اندر ہے کہ قرآن نے اس قوم کو Scientific Attitude دیا تھا۔ Scientific Attitude کیا ہے۔وہی جو میں تین لفظ دہرایا کرتا ہوں اور جسکی بنیاد قرآن سے ہی وابستہ ہے اگرچہ آج آپ کے ہیں وہ سائنس کا مسلمہ ہیں۔

قانون اور آئین میں فرق

Law یا قانون کی Definition جو ہے (If, Then, Always) اگر یہ کرو گے تو یہ ہوگا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔بس یہ Law بن جاتا ہے۔حکم اور قانون میں فرق یہ ہے حکم کسی ایک بات کے لیے ہوتا ہے اگر تم یہ کرو گے تو یہ ہوگا' تم اگر میرا یہ کام کر دو گے تو

میں دو روپے دونگا' یہ حکم ہے۔اور اگر یہی چیز مستقل ہو جائے کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوگا تو یہ حکم قانون بن جاتا ہے۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے تو خدا کا اذن اور اس کا امر اور ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں اس لیے یہ جب خدا کا حکم ہوگا تو ہو جائے گا خدا کی اجازت ہوگی تو ہو جائے گا۔ اذن اور امر وغیرہ الفاظ کے یہ معنی تو ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ایک دفعہ کوئی کام کرانا ہو یا بات کہنا ہو تو اذن اور حکم کے الفاظ تو آتے ہیں اور جب یہ آ جائے کہ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ(10:64) کہ ایک دفعہ ہم نے جو حکم دیا ہے مستقلاً وہی ہوگا اُسے قانون کہا جاتا ہے۔

سائنس کی ساری بنیاد ہی لفظ Law پر استوار ہوتی ہے

If & Then کی جو بات ہے وہ تو دونوں جگہ رہتی ہے۔ آخری شرط جو ہے کہ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا (33:62) یہ ہوگا۔ یہ قانون بن جاتا ہے۔ ساری سائنس کی بنیاد اس مسلمہ پر ہے کہ اگر یہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا اور ہمیشہ وہی Always ہوگا۔ Conditions اگر وہی مہیا کر دی جائیں تو اس قانون کے ماتحت ایسا کرو گے تو یہ نتیجہ نکلے گا اور جہاں وہ Conditions ہونگی' ہمیشہ ایسا ہوگا۔ اسے عزیزانِ من! Law کہتے ہیں۔ اور سائنس کی ساری عمارت اس Law اس قانون' اس مسلمہ پہ اٹھتی ہے 'اگر یہ کرو گے تو یہ ہوگا'۔ اس اعتماد سے وہ یہاں سے ایک راکٹ کو چاند میں بھیج دیتے ہیں' اعتماد یہ ہے کہ اگر اس میں یہ یہ چیزیں فنکشن کرتی رہیں تو یہ اس رفتار سے محفوظ وہاں تک پہنچ جائے گا۔ اور جب تک یہ یوں فنکشن کرتی رہیں گی' ہمیشہ پہنچتا رہے گا۔ قانون بن گیا۔

عیسائیت کے ہاں حضرت مسیحؑ کے کفارے کے عقیدے کی نوعیت

یہ دو تو میں جو میں نے ابھی گنائی ہیں ان کی کیفیت کیا تھی۔ ان کا Unscientific , Attitude تھا' عیسائیت کے اندر یہ بات تھی کہ کام کرنے سے اعمال سے' کچھ نہیں مل سکتا۔ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پہ ایمان لانے سے جنت حاصل ہو جاتی ہے۔ یعنی صرف یہ مان لیجیے کہ حضرتِ مسیحؑ نے اپنی جان دے کر میرے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا' یہ مان لیجیے صرف' تو تمہارے سارے گناہ دھل گئے۔ آپ دیکھتے ہیں Most Unscientific Attitude ہے اس میں قانون کی بات ہی کوئی نہیں آتی۔ اسی لیے یورپ میں جب انگریزی زبان میں بھی اس کے ترجمے Faith ہوئے ہیں تو Faith کے معنی ہی یہ ہیں کہ جس میں علت ومعلول (Cause & Effec) قانون کی بات نہ ہو۔ ایک بات کو آپ مان لیں اور وہ پھر ٹھیک ہے۔ یہ مان لیں کہ حضرتِ عیسیٰؑ نے جان دی تھی میرے گناہوں کے کفارے کے طور پر' مان لیں صرف اس بات کو۔ آپ دیکھتے ہیں اس میں کوئی قانون کی بات نہیں Cause & Effect نہیں' علت ومعلول نہیں۔ بلکہ اسے فقط ماننا ہوگا۔

مجوسیوں کا عقیدۂ تقدیر جس نے انسانی صلاحیتوں کو بھی تباہ و برباد کر دیا

آپ غور کیجیے جسے ہم ایمان کہتے ہیں کتنی بڑی بنیادی چیز ہے قوموں کے لیے وہ۔ یہ چیز تھی عیسائیت کے اندر۔ دوسری طرف ایران۔ مجوسیت کا عقیدہ تقدیر تھا کہ ہر شے پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے خدا کی طرف سے۔ یہ طے شدہ چیزیں ہیں کوئی اسے بدل نہیں سکتا ویسا تو ہو کے رہنا ہے۔ جب یہ چیز آپ کے ہاں آ جائے Most Unscientific Attitude جسے کہیے۔ یعنی میرے کرنے سے کچھ ہو ہی نہیں سکتا' میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ چیز مان لیجیے کہ ہر شے خدا کے حکم سے پہلے سے طے شدہ ہے یہاں وہ ویسے ہی ہو کر رہے گی تو انسان کی ساری قوتیں ختم ہو جاتی ہیں یہاں پہنچ کے۔ یہ بنیادی سبب دونوں کے' یہودیت اور ہندویت بعد میں آئے گی۔ Immediatly جو قومیں ان کے سامنے تھیں جن کے ساتھ عربوں کا تصادم اور تقابل ہوا ہے وہ یہ دو قومیں تھیں۔ یہ دونوں قوموں کے مذہب کی بنیاد Unscientific تصور پر تھی۔

قرآن حکیم نے جہالت پر مبنی اس انسانی سوچ کا رُخ ہی بدل دیا

قرآن نے آ کے ان عربوں کو بتایا یہ تھا کہ (انْ – ف) سارا قرآن آپ دیکھیے عزیزانِ من! ان اور ف پہ چلتا ہے سارا' اگر یہ کرو گے تو یہ ہوگا اور ہمیشہ ہوگا لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62)' وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) انْ، ف اور لا مبدل' Law کی Definition ہے عزیزانِ من!۔ Most Scientific Attitude جسے آپ کہیں۔ یہ Attitude دیا تھا عربوں کو اس تعلیم نے' یہ ذہنیت اس تعلیم نے پیدا کر دی تھی کہ یوں کیا جائے گا تو یہ ہوگا۔ احد میں شکست کی وجہ جاننے کیلئے پوچھا گیا کہ کیا یہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا نے کہا ان سے کہو تم نے میدان جنگ میں مقررہ جگہ چھوڑی تو یہ اس کا نتیجہ ہے Scientific Explaination جسے کہا جاتا ہے۔ کیا کیا جائے۔ یہاں سے غلطی ہوئی تھی اس لیبارٹری میں فارمولے میں' ٹیسٹ کرنے میں' Experiment کرنے میں' صحیح فارمولا لے آ ؤ صحیح نتیجہ نکل آئے گا۔ صحیح فارمولا کر لو اصلاح (من تاب و اصلح) اور اس کے بعد وہی آتا ہے۔

سب پر غالب آنے کے لیے قرآنِ حکیم کی تعلیم قدم قدم پر انسان کو سوچنے کی ترغیب دیتی ہے

دیکھیے قرآن میں۔ جو پہلے فَ تھا اگر یہ کرو گے تو پھر یہ ہوگا' جہاں یہ نہیں ہوتا وہاں کہتا ہے کہ کھڑے ہو کے سوچو (تتفکروا) سوچو۔ سوچو کیا؟ کہیں غلطی ہو گئی۔ Detect کر لی غلطی' اب کیا کروں؟ تـــاب چلو واپس وہاں' جہاں سے غلط موڑ مڑے تھے۔

ٹھیک ہے Undo کرو جو غلط ہوا ہے۔ کر دیا جی، میں پہنچ گیا ہوں اُسی چوراہے پہ لیبارٹری میں فارمولے کے اُسی ٹکڑے پہ پہنچ گیا ہوں پھر؟ اصلح اب صحیح طریق کے اوپر Follow کرلو۔

قانون خداوندی کے سلسلہ میں استثنا کے پہلو کی وضاحت خود نبی اکرم ﷺ کی زبانی

عزیزانِ من! قرآن کو پڑھیے گا اس انداز سے تو جھوم اٹھیں گے آپ۔ اور یہ ہے راز۔ وہ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139) کتنی بڑی چیز ہے سب پہ غالب آجاؤ گے' کیسے؟ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ (3:139) اگر مومن ہو جاؤ گے۔ وہی If' وہی اس کا نتیجہ۔ یہ تبدیلی کی گئی تھی' یہ تھا جو عرب بنا دیا گیا تھا۔ اس تبدیلی کے اندر کہیں Exception نہیں' کہیں استثنا نہیں کوئی Exemption نہیں۔ ذہن میں سب سے بڑی ہستی جو آسکتی ہے وہ نبی اکرم ﷺ کی ہے۔ اُن ﷺ کے سامنے بھی' ہمارے سامنے بھی' قیامت تک ہمارا ایمان کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ یہ جو چیز تھی Scientific Attitude والی اس میں قرآن کریم نے میں سمجھتا ہوں Illustrate کرنے کے لیے اس کی وضاحت کرنے کے لیے پختگی سے ذہن نشین کرنے کے لیے ایک بار نہیں کتنی مرتبہ قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلایا گیا۔ قُلۡ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ [39:13] ان سے کہہ و اعلان کر دو کہ اگر میں بھی خدا کے قانون کے خلاف کچھ کرونگا تو اس کا نتیجہ مجھے بھی بھگتنا پڑے گا۔ کوئی استثنا نہیں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ سے جب یہ کہلا دیا گیا تو' تا بہ دیگراں چہ رسد'۔ آپ نے غور کیا یہ چیزیں قرآن نے کیوں دی ہوئی ہیں۔ وہی Scientific Attitude کہ اور تو اور رسول ﷺ تک سے کہلوایا گیا ہے کہ قُلۡ (39:13) کہو ان سے' بتاؤ انہیں کہ میں بھی اگر خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرونگا' مجھے بھی یہ نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ یہ تھی چیز جو ان عربوں کے اندر پیدا کر دی تھی۔ ایک طرف مجوسیت کی تقدیر' سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے' پہلے سے طے شدہ ہے' وہی ذلت دینے والا' وہی عزت دینے والا' وہ ملک دینے والا' وہ چھین لینے والا' یہ بندہ بشر ہے یہ تو کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ یہ عقیدہ ان کے ہاں ہے۔

قانون کی حکمرانی کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے عہد میں تاریخ کا بیان کردہ ایک اہم واقعہ

آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس کے مقابلے میں جب یہ قوم آجائے کہ جس کا عقیدہ یہ ہو کہ یہ کرو گے تو یہ ہوگا' یہ نہیں کرو گے یہ نہیں ہوگا' یہ کیسے ٹھہر سکتے تھے ان کے سامنے۔ وہ بات یونہی نہیں ہے' تاریخی اعتبار سے بڑی اہم بات ہے کہ جب گورنر ایران کا شکست کھا کر گرفتار ہو کر حضرتِ عمرؓ کے سامنے آیا ہے اور آپؓ نے یہ پوچھا کہ کہو اس سے پہلے تو تمہاری کیفیت یہ تھی کہ عربوں کے ساتھ جنگ کرنا باعثِ ننگ وندامت سمجھتے تھے۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ وہی عرب ہیں کوئی دو چار نسلیں ان کی آگے نہیں بڑھی ہیں۔ وہی ہیں کہ کل تک تم ان

کے ساتھ جنگ نہیں کرتے تھے۔اب جس میدان میں یہ جاتے ہیں' تم بھاگتے پھر رہے ہوتمہارا بادشاہ پن چکی میں جا کے پناہ لے رہا ہے۔اوہوا کیا ہے تمہیں' حضرتِ عمرؓ اس سے پوچھتے ہیں یہ دیکھنے کے لیے ان کی نگاہ کہاں تک جاتی ہے۔بات ایک فقرے کی ہے عزیزانِ من! سارا راز آ جاتا ہے ساری تاریخ اسلام کی اس میں آ جاتی ہے۔اُس نے کہا کہ بات بڑی صاف سی ہے عمرؓ اس سے پیشتر جب مقابلہ ہوتا تھا تو ایک طرف ایرانی ہوتے تھے ایک طرف عربی ہوتے تھے۔ایرانیوں کے مقابلے میں تنہا عرب کوئی شے نہ تھے۔

بائبل اور بخاری شریف کے ورد کرانے کے پروگرام کا مقصد دراصل دو سوچوں کا ٹکراؤ تھا

اب جہاں مقابلہ ہوتا ہے ایک طرف تو ایرانی ہوتے ہیں تنہا' دوسری طرف عرب ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ خدا ہوتا ہے۔ان دو کو ہم شکست نہیں دے سکتے۔ایران کا گورنر یہ بات بتا رہا ہے۔یہ خدا کا ساتھ ہونا کیا چیز ہوتی تھی جسے کہتے ہیں خدا ساتھ ہوتا تھا' خدا کا دیا ہوا یہ قانون ان کے ساتھ ہوتا تھا یہ Scientific Attitude ان کا بنا دیا گیا تھا۔اُنہوں نے کہا کہ نہیں مقابلہ کر سکتے' ہم جنگ نہیں کریں گے' ملک سارا دیدیا۔اُدھر دوسری بازنطینی امپائر تھی' رومن امپائر تھی۔جن کی کیفیت یہ تھی کہ ادھر سے فوجیں چلی ہوئی ہیں قسطنطنیہ تک پہنچی ہوئی ہیں' بجائے اس کے کہ وہاں یہ Scientifically دیکھتے کہ اگر ہم نے یہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا' یوں مدافعت کرنی چاہیے۔اُنہوں نے اندر بائبل کا ورد شروع کر دیا جیسے بخاری شریف کا آپ کے ہاں ورد ہوا کرتا ہے۔اُنہوں نے کہا کہ یہ جو ایمان ہے ہمارا مسیحؑ کے کفارے پہ' جتنا زیادہ یہ ایمان تقویت پکڑ جائے گا' جتنا ایمان یہ مضبوط ہو جائے گا' بس وہی ہمارے لیے حصارِ عافیت' وہی ہمارے لیے حفاظت کا سامان ہوگا۔یہ عرب کوئی شے نہیں ہیں کہ ہمیں شکست دیدیں۔وہ اپنے اندر اس ایمان کو دہرا رہے تھے کفارے کے عقیدے پہ۔اور یہ باہر یہ کہہ رہے تھے کہ اگر ہم نے اس دیوار کو منجنیق سے تباہ کر دیا تو اس کا یہ نتیجہ نکل آئے گا' عرب یہ سوچ رہے تھے۔یہ دو سوچیں تھیں جو وہاں ٹکرا رہی تھیں۔

خدا کے صحیح تصور نے ملتِ اسلامیہ کی سوچ کو بدل دیا تھا

دنیا میں جہاں سائنٹفک سوچ اور Unseientific سوچ ہوگی Unscientific سوچ کبھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔یہ تھا عرب کا راز۔جب ہرمزان نے کہا تھا کہ تمہارے ساتھ خدا ہے' ہم جنگ نہیں کر سکتے۔اُس وقت تو سرنڈر کیا۔سارا راز اس میں ہے انہوں نے کہا کہ جب تک خدا کو اس قوم سے الگ نہ کر دیا جائے' انہیں شکست نہیں دی جا سکتی۔سارا راز آپ کی تاریخِ اسلام کا یہ ہے کہ اس قوم سے خدا کیسے چھڑایا جائے' قرآن کیسے چھڑایا جائے۔یوں تو یہ چھوڑ نہیں سکتے تھے۔بدترین جہالت آمیز' تو ہم پرست قومیں' بت پرستی نہیں چھوڑتی' گائے کی پوجا نہیں چھوڑتیں' یہ معتقدات تو اتنے دل کی گہرائیوں میں گئے ہوئے ہوتے ہیں بچھڑے کی محبت (اُشْـرِبُـوْفِـیْ

قُلُوۡبِهِمُ الۡعِجۡلَ (2:93) ہوتا ہے' یہ بڑی گہرائی میں گئے ہوتے ہیں' یہ نہیں جاتے۔

گہری سازش کے تحت قرآنی اصطلاحات کا مفہوم بدل جانے پر اصل تصویر کا اصل رخ نظروں سے اوجھل ہو گیا

ایرانیوں نے ریشہ دوانیوں کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ الفاظ وہی رہیں' اصطلاحات وہی رہیں' رسوم و رواج کی شکلیں وہی رہیں' مفہوم بدل دیجیے۔ قرآن میں مغفرت کے لفظ تو ہم بدل نہیں سکتے۔ یہ لفظ آئیں گے تو کیا کیا جائے؟ معنی ان کے بخشش کر دیجیے۔ Unscientific Attitude آ گیا۔ قرآن کے اندر **قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَىۡءٍ قَدۡرًا** (65:3) آیا ہے خدا نے ہر چیز کے لیے پیمانے اور قانون مقرر کر دیے۔ کہہ دیا کہ اس کا ترجمہ تقدیر کر دیجیے۔ یوں کیا اور اس پر کئی کتابیں لکھوا ڈالیں آپ کا سارا فلسفہ تمام مجوسی تصورات کو یوں بدل ڈالا۔

ہمارے ہاں مجوسی تصورات پر مبنی وہ دلائل جو اسلام کا روپ اوڑھے ہوئے ہیں

آپ جو کہتے ہیں ہم دلائل کی رو سے اسلام کی افضلیت ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ کی ساری عمر مجوسی تصورات کے حق میں دلائل دیتے ہوئے گزر گئی۔ سارا فلسفہ اس محور کے گرد گھومتا ہے کہ خدا قادرِ مطلق ہے اسکے حکم کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا۔ کمرے کے کمرے بھرے ہوئے ہیں' کتابوں سے اس چیز کو دلائل کی رو سے ثابت کرنے کے لیے۔ بزعمِ خویش آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اسلام کی افضلیت اور حقانیت کو دلائل اور براہین اور علم و بصیرت اور فلسفے کی رو سے ثابت کر رہے ہیں۔ مگر ثابت کر رہے ہیں آپ غیر قرآنی تصورات کو مجوسی تصورات کو جو اسلام کا نقاب اوڑھے ہوئے ہیں۔

عیسائیت کے تصورات تھے جس میں بخشش آتی ہے' جس میں شفاعت آتی ہے' جس میں کفارہ آتا ہے۔ یہ کچھ ہمارے ساتھ ہوا عزیزانِ من۔

ہمارے ہاں کی قدامت پرست مذہبی پیشوائیت اور کیتھولک فکر و نظر میں ہم آہنگی

عمر کے آخری حصے میں نہیں' ایک مدت سے میں تو اس چیز پہ چلا ہوا تھا کہ بتایا جائے کہ یہ تصورات آئے کہاں سے' پھر اس تفسیر میں کیسے داخل ہوئے پھر ترجمے کیسے ہوئے۔ استغفار' مغفرۃ' خدا بخش دے **لَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ** (9:80) اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ پہلے تو جسے چاہے وہ بخش دیتا ہے۔ بات ختم ہو گئی۔ اِنۡ اور ف ختم ہوا آپ کا' قانون جو ہے Scientific Attitude جو ہے

Most Unscientific Attitude مذہب کا ہوتا ہے Unscientific Attitude میں بدل گیا۔ دنیا میں سب سے زیادہ اور مذہب میں بھی سب سے زیادہ مسلمان کا۔ یورپ میں جب تک Christianity زوروں پر رہی اور وہ بھی کیتھولک کے ہاں' ہمارے ہاں جیسے قدامت پرستی کی پیشوائیت والے کہتے ہیں کہ شرع میں کس کو دخل نہیں ہے۔ ''اک تے شرع اچ شرم نوں دخل نئیں تے' اک عقل نوں دخل نئیں''۔ کیتھولک بھی بڑے ہی قدامت پرست متشدد' Unscientific Attitude میں بہت زیادہ متشدد۔ یہ تو مارٹن لوتھر نے ان کو بچالیا۔

علامہ اقبال کے نزدیک نیٹشے اور لوتھر قابلِ قدر اہمیت کے حامل تھے

بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ اقبالؒ نے جو کہا ہے نیٹشے کے متعلق

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؒ اس کو بتلاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اگر کہیں لوتھر کے قریب کوئی اقبالؒ اس زمانے میں ہوتا دنیا کا نقشہ آج بدل گیا ہوتا۔ ہم کو معلوم ہے کہ لوتھر نے ترجمہ کیا تھا قرآن کا۔ یہ جتنی چمک نظر آتی ہے آپ کو ان کے اندر وہ ساری اس لیے ہے کہ اس کی نگاہ قرآن کے اوپر تھی۔ بہرحال وہ یہاں تک لے آیا تھا۔ یورپ میں کیتھولک کا زور رہا۔ آپ دیکھیں گے سترہویں صدی سے پہلے تک کا یورپ ڈوبا ہوا ہے جہالت کے اندر۔ اور اس کے مقابلے میں دوسری قومیں دنیا کی کتنی بڑھ رہی ہیں۔ یہ عربوں کی پھر بہرحال مسلمانوں کی' جنہیں ایک دھکا لگا تھا پیچھے سے ایک دفعہ Scientific Attitude کا وہ اپنے مومنٹم میں ہی ان کو اتنی دور لے گیا تھا۔ مقابلہ ہی نہیں کر سکتے تھے۔ ایرانی وہ مسلمان ہو کے یوں آ گئے اور آ کر جو کچھ کیا وہ میں بتاؤں گا تاریخ میں۔ یورپ کے اندر عیسائی' عیسائی رہے تھے۔

یورپ کی تمدنی زندگی کو تبدیل کرنے میں نیوٹن اور کاپرنیکس کا بڑا اہم رول تھا

عربوں کے زمانے کی فتوحات میں یہ رومن امپائر والے جو عیسائی تھے' وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے اس لیے ان سے ہم بچ گئے تھے۔ ان کے ہاں یہ جذام اور کوڑھ جو تھا Unscientific ذہنیت اور Attitude کا یہ یورپ میں چھایا ہوا تھا۔ اُس دن اُس نے تبدیلی حاصل کی جب نیوٹن اور کاپرنیکس وغیرہ پیدا ہوئے جنہوں نے ان سے کہا کہ بابا تم اور تمہارا خدا اور تمہارے یہ بخشش کے عقیدے' گرجے کی چار دیواری کے اندر' خدا کے لیے ہمیں زندگی کے راستوں میں کچھ سوچنے دو۔ اور یہاں اُنہوں نے Scientific Attitude پیدا کیا۔ یورپ کی ساری ترقی کا راز اس میں ہے۔ آج بھی جو قومیں Scientific Attitude سے دور ہیں ان کو زیادہ مار پڑ رہی

ہے۔ Attitude رکھنے والوں کے دوران بھی Attitude تقابل ہے کہ کوئی اس میں عملاً کتنا آگے چلا جاتا ہے' کتنی زیادہ Discoveries کررہا ہے کتنی زیادہ Inventions کررہا ہے۔ان کا آپس میں یوں تقابل ہے۔اور ہماری طرح کی قوموں کے ساتھ تو بات ہی اتنی ہے کہ کہاں تک Unscientific ہیں۔

مکافاتِ عمل کا تمام تر دارومدار انسانی خیالات پر مبنی ہوتا ہے

قرآن نے کیا بتایا تھا؟ قانونِ مکافاتِ عمل: ہر کام ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اور کام میں وہ دل میں گذرنے والے خیالات کو بھی لے کے آگیا۔اصل میں تو کام کے بنیادہی خیالات ہوتے ہیں جو پہلے ابھرتے ہیں۔کسی کام کے متعلق خیال آپ کو نہ آئے' کام ہو ہی نہیں سکتا۔وہ یہاں سے پکڑتا ہے کہا کہ تمام چیزوں کا بھی نتیجہ نکلتا ہے' ہر کام کا ایک متعین نتیجہ۔آپ نے دیکھا قرآن نے عمل اور اس کے نتیجے کے لیے عام طور پر کھیتی کی مثال دی ہے۔بڑی محسوس مثال ہوتی ہے۔بڑی سائنٹفک چیز ہے یہ۔یہ قرآن نے دیا تھا۔یہ اس Attitude یا اس پروسیس میں یا اس عمل میں آپ دیکھتے ہیں کہ معاف کردو' بخش دو' یہ آتا ہی نہیں ہے۔

غلط روش کی موجودگی میں بخشش کے پردوں میں نجات کا تصور کرنا قرآن حکیم کے تصورِ زندگی کے خلاف ہے

ڈال دیجیے آپ غلط بیج' گیہوں کی جگہ جو ڈال دیجیے اس کے بعد پوری محنت سے وہی طریقہ کار اختیار کریں جو گیہوں کے لیے کرنا تھا۔جب اس کے اوپر بالیں آئیں اور اس میں آپ کو نظر آئے کہ یہ تو جو ہے۔لے آیئے دنیا بھر کی قوتوں کو کہ وہ آپ کی اس غلطی کو بخش دے۔ہے بخشش کہیں ہے؟ اسی لیے اُس نے جہاں کھیتی کی مثالیں دی ہیں کہ جھٹ سے بات سمجھ میں آئے۔سمجھ میں تو ان کی آئے جس نے سمجھ سے کام لینا ہے۔ہم یہ بھی پڑھ لیتے ہیں' وہ بھی پڑھتے ہیں' جو چاہے وہ کر دیتا ہے' یہ بھی کھیتی کی مثال ہے جو پڑھ لیتے ہیں۔ہوتا کیا ہے؟ ہوتا دونوں سے ثواب ہے۔بات ختم ہوگئی۔ارے بھئی کوئی عاقبت کی فکر ہوئی' وہ اللہ تعالیٰ کی بخشش مغفرت' رسول اللہ ﷺ کی شفاعت۔Most Unscientific Attitude۔مغفرت۔میں نے کہا ہے کہ آیت یہاں سے شروع ہوئی ہے۔

اپنی ذات کے سلسلہ میں دعویٰ حق و باطل کے متعلق علامہ پرویزؒ کی حساس خیالی

یہ جو میں عرض کرتا رہتا ہوں ہمیشہ اور یہ کہتا رہتا ہوں کہ یہ کچھ کرو۔ایسی بات نہیں ہے کہ مجھے کوئی دعویٰ ہو رہا ہے مامور من اللہ ہونے کا کہ خدا کی طرف سے خاص طور پہ مجھے بتایا جارہا ہے۔جبریل امین (معاذ اللہ) آتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں اس کے یہ معنی غلط ہیں' یہ ٹھیک ہیں' یہ صحیح ہیں۔سوال یہ ہوتا ہے کہ اس کا ذریعہ کیا ہے۔وہی کتابیں جو ان کے ہاں پڑی ہوئی ہیں۔ Quranic Attitude

ہونا چاہیے آپ کا۔ عربی زبان میں یہ چیزیں موجود ہیں' قرآن میں یہ معانی موجود ہیں۔ میں نے تو اپنے لغت میں ایک ایک لفظ کی سند دی ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کے خلاف کس قدر شور اٹھے گا۔ اس میں اگر ایک لفظ کی بھی گرفت ہوگی تو پہلے ہی ڈھنڈورا کم نہیں پیٹتے تو اس میں پتہ نہیں کیا صورت ہوتی۔ اور ویسے بھی مجھے احتیاط برتنی تھی میں تو قرآن کا لغت لکھ رہا تھا۔ میں تو جب صبح اٹھ کے قرآن کھولتا ہوں تو عزیزانِ من! رُواں دُواں نیازمندی سے کانپ رہا ہوتا ہے۔ بہت بڑی چیز ہے۔ عربی زبان میں یہ چیزیں موجود ہیں' قرآن میں یہ چیزیں موجود ہیں جو میں عرض کر رہا ہوں۔

قرآن حکیم انسان کو بخشش کی بجائے سامان حفاظت کا تصور پیش کرتا ہے

بخشش نہ عربی زبان کی چیز ہے نہ قرآن کی چیز ہے۔ غَفَرَ یَغْفِرُ مَغْفِرَةً یہ ساری چیزیں عربوں کے ہاں سامانِ حفاظت کے لیے بولی جاتی تھیں۔ مغفر بولتے ہیں اس ہیلمٹ کو جو جنگ میں پہنی جاتی ہے لوہے کی ٹوپی اور اس لوہے کی ٹوپی کے نیچے زرہ جیسی فولادی لڑیاں۔ مغفرت کے معنی ہیں وہ خول پہن کر میدانِ جنگ میں جانا تاکہ آپ اس حملے میں دشمن کے ہتھیاروں سے محفوظ رہیں۔ حفاظت کا سامان۔ وہ جب آپ Indent بھیجتے ہیں اس کے لیے' طلب کرنا' استغفار کہلاتا ہے۔ وہ اس زمانے میں بھی بولتے تھے وہ آج بھی بولتے ہیں۔ اور قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں یہ لفظ حفاظت کے معنوں میں موجود ہیں۔ اس کے معنی سامانِ حفاظت طلب کرنا ہے۔

لفظ استغفر اللہ کا قرآنی مفہوم اور ہمارا طرزِ عمل

وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ (3:17) کتنی بڑی چیز ہے۔ ترجمہ اس کا ہوتا ہے صبح کے وقت اٹھ کے استغفر اللہ پڑھنے والے۔ عام طور پر جو گیارہ تسبیحاں ہوتی ہیں استغفر اللہ کی وہ صبح کے وقت میں ہوتا ہے۔ جلدی جاگ اٹھتے ہیں اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ ہزار دانے کی کر رہا ہے' ہزار دفعہ دہرا دیا' مطمئن ہو گئے کہ یہ تو بخشے گئے جتنے بھی غلط کام تھے' غلط بیج جو میں بوآیا تھا گیہوں کی جگہ جو بوآیا تھا' میں نے صبح اٹھ کے ایک ہزار دانے کی تسبیح پڑھ لی ہے اور میرا معاملہ درست ہو گیا۔ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ (3:17) سحر کہتے ہیں کام کی جو ابتداء ہوتی ہے۔ مومن کی خصوصیت یہ بتائی کہ کام شروع کرنے سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ اس میں سامانِ حفاظت جو چاہیے' وہ میرے پاس ہے یا نہیں۔ نہیں ہوتا تو طلب کرتے ہیں' تلاش کرتے ہیں۔ جہاں ہوتا ہے وہاں سے لیتے ہیں۔ استغفار کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کی تجسس جستجو طلب۔ آج کل جو شہر کے اندر شور مچا ہوا ہے کہ کالرا اور ٹائفائیڈ پھیل رہا ہے خاص طور پر۔ جو اس کے لیے Inoculation کا سامان ضروری ہے وہ ٹیکہ لگانے کا سامان' اس چیز کو مغفرت بولتے ہیں۔ اس حفاظتی

سامان کو یہ جب آپ ڈاکٹر کے پاس جا کے کہتے ہیں کہ مجھے یا بچوں کو Inoculate کر دیجیے تو یہ استغفار ہے۔ وہ جب Inoculate کرتا ہے آپ کو تو یہ مغفرت ہے۔ قرآن آگے بھی گیا' تیسرا Attitude جو میں نے عرض کیا تھا کہ پھر بتاؤں گا۔

یہودیت کے اور ہندو دھرم کے ہاں لغزش یا غلطی کے ازالہ کے طریق کے برعکس قرآن حکیم کے نزدیک اس کا علاج

یہودیوں کے ہاں یہ ایک چیز تھی کہ ایک دفعہ کی لغزش غلطی سے اس کی بازیابی نہیں ہوسکتی۔ خواہ تین ہی دن کے لیے جہنم میں رہنا پڑے' وہ وہاں تین دن کے لیے اندر رکھ دیتے ہیں' پھر اس کے بعد ان کے بڑے آجاتے ہیں وہ ان کی ضمانت دے کے چھڑا کے لے جاتے ہیں۔ وہ جہنم میں نہ سہی' پولیس حوالات ہی سہی۔ لیکن وہ کہتے یہ ہیں کہ اس میں بازیابی کی صورت نہیں تھی۔ ہندو دھرم کے اندر بھی تناسخ میں ان کے ہاں بازیابی نہیں تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تصور بھی غلط ہے۔ Preventive چیزیں یقیناً ہونی چاہئیں لیکن اگر کسی وقت کوئی کی لغزش ہوگئی ہے تو اس کے بعد جسے آپ کیوریٹو کہتے ہیں' اس کے ذریعے اس کا سدِ باب کیا جاسکتا ہے۔

قوت مدافعت کے بڑھ جانے کا دوسرا نام مغفرت بھی ہے جبکہ ہمارے ہاں کی غلط سوچ نے مغفرت کے حقیقی مفہوم کو ہی بدل دیا ہے

کسی ڈاکٹر سے پوچھئے وہ بتائے گا کہ بنیاد اس کی یہ ہے کہ آپ کے اندر Resistance کی جو Power ہے قوتِ مدافعت ہے ہم اس کو زیادہ Increase کرتے ہیں اس کو بڑھاتے ہیں تاکہ جو تباہ کن عناصر اندر گئے ہیں' ان کا مقابلہ اندر کی قوت اس طرح سے کرے کہ وہ انہیں شکست دیدے۔ قوت مدافعت کو زیادہ کرتے چلے جاتے ہیں' بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن اس کو بھی مغفرت کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے بازیابی کی شکل ہوسکتی ہے پیدا۔ لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ اس میں دیر نہ کرنا۔ وہ جو ہے اَنَّـهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَ اَصۡلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (6:54) کہ غلطی سے جہالت سے' پہلی چیز تو اس میں جہالت کی ہے کیوں کہ دانستہ کرنے سے تو قانون شکنی ہوجاتی ہے۔ یہ کیا جائے اور اس کے بعد کہا ہے کہ اس میں تاخیر نہ کی جائے (4:17) فوراً ڈاکٹر کے پاس پہنچا جائے بتایا جائے جلدی علاج کرا لیجیے گا تاکہ وہ قوتِ مدافعت کو ذرا زیادہ بڑھا دیں اور وہ جو تدبیریں کرنی ہیں' وہ کر دی جائیں۔ اُس سے نکل آتا ہے آدمی۔ پھر اس کے بعد وہ تقویت کے لیے غذا بتاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں کیا ہوتی ہیں؟ یہ سامانِ حفاظت بہم پہنچاتی ہیں۔ قرآن نے ایک اصول دیا کہا ٹھیک ہے' لغزش موجود ہوتی ہے' آجاتی ہیں اس قسم کی چیزیں۔ کیا طریقہ اختیار کیا جائے اس کے بعد؟ یہاں آپ کسی سے پوچھئے وہ کہیں گے کہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگی جائے' بخشش کی دعا مانگی جائے' استغفار کی تسبیح پڑھی

جائے۔ جنت تو بخشش سے ملتی ہے یا پھر شفاعت کا عقیدہ آپ کے ہاں ہے' وہی کفارے کا عقیدہ۔ وہاں سے ملتی ہے۔

لغزشوں کے نتائج کو ہموار اور تعمیری سوچ کے ترازو میں تولنا ہوگا

قرآن کا Scientific Attitude جو ہے اندازہ لگایئے عزیزانِ من! چار لفظوں کے اندر پورا اصول بیان کر گیا ہے۔ کہا کہ ٹھیک ہے ہوسکتی ہیں ناہمواریاں پیدا' لغزش ہوسکتی ہے۔ اس کا طریقہ کیا ہے؟ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ (11:114) یاد رکھو ناہمواری والی بات ایک ہوگئی ہے' تم چاہتے ہو کہ اس کے نقصان سے بچ جاؤں۔ طریقہ اس کا کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہمواریاں پیدا کرنے والے کام کرو۔ اس نقصان سے بھی بچ جاؤ اور اس کی تلافی بھی ہوجائے سائنٹفک۔ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ (11:114)۔ جن کے اندر یہ سائنٹفک Attitude پیدا کیا تھا' جنہیں اب مومن کہا جاتا ہے ان کی خصوصیت قرآن نے بتائی ہے وَّ یَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ (13:22) وہ لغزشوں کے نتائج کو' ناہمواریوں کو دور کرتے ہیں اور اچھے کام کرکے۔ توازن بگڑ گیا۔ جسے کہتے ہیں بیماری آگئی۔ کسی معالج سے پوچھئے گا سائنٹفک طریق پہ' وہ کہتے ہیں کہ اندر توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس توازن کو برقرار رکھنے کا نام شفا یا صحت ہوتی ہے۔ اس کے لیے قرانی لفظ حسنات ہیں' جس کا ترجمہ نیکی کیا گیا۔

کوئی عمل کرنا یہ تو انسان کے اختیار میں ہے لیکن اس عمل کے نتیجہ کو بدلنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں

قرآن حکیم اسے قانون مکافاتِ عمل کہتا ہے یعنی یہ کام کرو گے تو یہ نتیجہ نکلے گا اور اس کے لیے ہر فرد کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے' اپنے عمل کا اپنے کام کا۔ نہ ذمہ دار کوئی دوسرا اور نہ اس سے کوئی چھڑانے والا۔ آگ میں انگلی ڈال دیجیے' اُس نے کہا ہوا ہے کہ یاد رکھو انگلی جل جائے گی سخت درد ہوگا۔ قانون: آگ میں انگلی ڈالو تو اس کا نتیجہ درد ہوگا جل جائے گی' Always جب ڈالو گے یہ ہوگا۔ اور جب یہ درد ہوگا تو اس کے بعد اُس نے کہا ہے کہ پھر' دیکھیے کسی حاکم کو رشوت کہ صاحب سو روپیہ لے لیجیے اور یہ درد معاف کر دیجیے۔ کہا لے آیئے President of Pakistan کی سفارشی چٹھی کہ اے درد دینے والے فرشتے ہم تمہیں یہ کہتے ہیں کہ Recommend کرتے ہیں کہ اس کا درد نکل جائے۔ Scientific Attitude ہے' کسی کی نہیں مانتا۔ اُس نے کہا کہ اس کے لیے ایک قانون ہم نے بنایا ہوا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ اس قسم کی دوائیاں جو ہیں وہ لگاؤ۔

لفظ توبہ اور لفظ عمل صالح کی حقیقت پر مبنی محسوس وضاحت قرآن حکیم کی روشنی میں

پہلی چیز تو یہ ہے کہ آگ میں ہاتھ پھر نہ ڈالو' توبہ کرو۔ سخت قسم کی کھانسی آرہی ہے پہلی چیز ڈاکٹر یہ کہتا ہے کہ یہ سگریٹ جو تم پی رہے ہو' پہلے تو اس کو چھوڑو۔ یہ ہے توبہ۔ پھر اس کے بعد اسی قانون کے مطابق اس کا یہ علاج کرو۔ یہ ہے عملِ صالح' تَابَ وَ اَصۡلَحَ ۔ کہا اس

سے جو نقصان ہے درد کا اس سے بچ جاؤ گے تم۔ اور اس کے لیے یہ جو کہا ہے کہ جو کرو گے' بھگتنا پڑے گا۔ چار لفظ عزیزانِ من! سورۃ بقرہ کی آخر کی آیت جو ہے۔ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (2:284)۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (2:286) اور جھومئے عربی زبان کی جامعیت کے اوپر کہ وہ دو ہی Prepositions یا جار گن کو کہتے ہیں حروف' ایک میں ل ہے دوسرے عَلَيْهَا (2:286) ہے دونوں میں کسب Verb ہے۔ یہ ل آتا ہے فائدہ مند چیزوں کے لیۓ' جو کوئی بھی قانون کے مطابق کام کرتا ہے لَهَا (2:286) اُس کا منفعت بخش نتیجہ اُسے ملتا ہے۔ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (2:286) اور جو بھی اس کے خلاف کام کرتا ہے اس کا نقصان رساں نتیجہ اُس کے خلاف جاتا ہے۔ لھا کسی کے حق میں جانا' علیھا کسی کے خلاف جانا۔ اور جب بات آگے چلے تو پھر مزید دلچسپ ہو جاتی۔ کسبت اور اکتسب۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (2:286) اکتسب ہوتا ہے ایسے کام کرنا جس میں صرف اپنا ہی فائدہ مقصود ہو' کسب ہوتا ہے وہ کام کرنا جس میں اپنا اور دوسروں کا فائدہ بھی مقصود ہو۔ کہا کہ نیکی وہ ہے کہ جس میں تمہارا اور دوسروں کا فائدہ بھی مقصود ہو۔ غلط یہ ہے کہ اپنا ہی فائدہ سوچو اس کا نقصان ہوگا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (2:286)۔ قرآن ہے عزیزانِ من!۔ بنیادی طور پہ جو میں عرض کر رہا تھا اس کو ذہن میں رکھیے گا۔ Scientific ذہنیت یا Attitude قرآن یہ پیدا کر رہا ہے۔ تم سنکھیا کھاؤ گے تم ہلاک ہو گے' ہو نہیں سکتا سنکھیا تم کھاؤ' پڑوس والا ہلاک ہو جائے۔ پھر اس کے بعد علاج کرنا ہے' تمہیں ہی دوائی پینی پڑے گی' ہو نہیں سکتا کہ باپ بیمار ہو جائے' بیٹا دوائی کھائے۔

ظہورِ نتائج کے وقت کوئی کسی کا پرسان حال ہو ہی نہیں سکتا

وہ جو قرآن میں ہے نا کہ اُس وقت تم دیکھو گے کہ بیوی خاوند سے بھاگ جائے گی' بیٹا باپ سے بھاگ جائے گا' بھائی بھائی کو چھوڑ جائے گا۔ یہ بھاگ جائے گا اور چھوڑ جائے گا کیا؟ روز ہمارے ہاں یہ چیز ہوتی ہے۔ سرہانے کھڑا ہوا بیٹا یوں کہیے کہ بچہ ضد کرتا ہے دوائی کے لیۓ' باپ ماں ''بھاویں کناای وارے وارے جان'' دوائی تو اس بچے کو ہی پینی پڑے گی۔ مامتا کی ماری ماں شاید جان دیدے' یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ دوائی پی لے اور آرام بچے کو آئے۔ جسے کہتے ہیں کہ خدا کو رحم آ گیا' اُس نے بخش دیا' ماں سے زیادہ رحم کس کو آئے گا لیکن اُس رحم میں بھی وہ اس بچے کو اُس سرجری کے آپریشن سے' اس انجیکشن کی سوئی سے' اس کے درد سے اس دوائی کی کڑواہٹ سے نہیں بچا سکتی۔ وہ تو اُسے ہی لگے گی۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (17:7) اِنْ اور ف دیکھتے چلے جایۓ عزیزانِ من!۔ حفاظتی تدبیریں اختیار کرو گے تو تمہاری ہی صحت ٹھیک ہوگی' سیر کرو گے' تمہاری صحت ٹھیک ہوگی۔

ایصالِ ثواب کے تصورات کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے پیاس صرف اسی کی بجھے کی جو خود پانی پیئے گا

یہ جو ہمارے ہاں ایصالِ ثواب کی رسم ہے۔ وہ مر گیا ہوا ہے' چلا گیا ہوا ہے' یہ پیچھے سے پارسل بھیج رہے ہیں۔ ''ایناں نوں پتہ نہیں پئی اوساڈے ورگا ڈاک خانہ اے' اتھے اوٹکٹاں لالیندے ہیگے نیں' جیب اچ پاندے نیں' پارسل کھوہ اچ سٹ دیندے نیں''۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (17:7) عام ترجمہ: جو بھی توازن قائم رکھنے والا کام تم کرو گے تمہارا توازن صحیح رہے گا۔ (وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا) (17:7) توازن بگڑنے والے کام لغزش والے کام کرو گے تمہیں ہی نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ سیدھی سی بات ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں جسے میں نے وہ لفظ کیا ہے Scientific Attitude وہی اِنْ اور ف یہ کرو گے تو یہ ہوگا۔ تمہیں ہی بھگتنا پڑے گا جو کچھ تم کرو گے۔ اس موضوع پہ میں کہوں تو اس میں تو عزیزانِ من! کئی ہفتے مہینے لگ جائیں سارا قرآن ہی اس موضوع پہ چلا جا رہا ہے۔ لیکن میں تو یونہی چند ایک آیات آپ کے سامنے دیدوں۔ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (6:164) بڑی عجیب چیز ہے۔ کیا تم کہہ رہے ہو Unscientific Attitude اختیار کرلوں اور ان لوگوں کو اپنا رب اور نشو ونما دینے والا مان لوں کہ انہوں نے میری خاطر جان دیدی تھی' اس لیے یہ ہوگئے۔ یہ میرے لیے کفارہ ادا کر رہے ہیں' یہ ہوجائے گا' یہ شفاعت کر رہے ہیں' یہ ہوجائے گا۔ قطعاً نہیں۔ ربوبیت تو صرف اس کے قانون کے مطابق ہوگی۔ اگر اس کو چھوڑ دیا جائے گا تو یہ نہیں ہو سکے گی۔ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (6:164) كُلُّ نَفْسٍ (6:164) کسے باشد' کوئی بھی ہو' جو کرے گا بھرے گا۔ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (6:164) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ غور فرما رہے ہیں آپ! کس قدر واضح صاف سائنٹفک ہے جو کچھ کہہ رہا ہے۔ سوال ہی نہیں کسی دوسرے کا بوجھ بٹانا۔ کتنی ہی زیادہ ماما کی ماری ماں ہو جو بچے کو درد ہو رہا ہے انگلی کے جلنے سے' نہیں درد لے سکتی وہ' نہیں بٹا سکتی۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (6:164) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اور ایک اور آیت کے اندر تو اور وضاحت سے اسے بیان کیا ہے۔ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (35:18) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا' اپنا اپنا بوجھ لاد کے جانا ہوگا۔ وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (35:18) کہا کتنا ہی تمہارا قریبی کیوں نہ ہو وہ خواہ تیار بھی کیوں نہ ہو جائے' اگر تم اُسے آواز دو گے کہ بھئی کچھ تھوڑا سا میرا بوجھ اٹھا لو۔ کہتا ہے کہ لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ (35:18) وہ ذرا بھی تمہارا بوجھ نہیں بٹا سکتا' نہیں بٹا سکے گا۔ ہونا ہی ایسا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے ہمارے انسانی جذبات کچھ چاہتے ہیں تھوڑی سی رعایت ''اویار ایناں وی سخت کی ہونا چاہیدا اے انسان''۔ یہ بات کسی جج سے پوچھئے جو خدا کو سامنے رکھ کے وہاں بیٹھا ہوا انصاف کی ذمہ داریوں سے فیصلہ کر رہا ہو کہ ذرا سا جھکاؤ بھی کہاں سے کہاں لے جاتا ہے بات کو۔

خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے جذبات سے بالاتر ہے وہاں صرف قانون کی حکمرانی ہے

خدا اس لیے ہے کہ اس میں جذبات نہیں ہیں۔ اور خدا ہو ہی وہ سکتا تھا ورنہ کائنات کا سلسلہ درہم برہم ہو جاتا عزیزانِ من!۔ ہمارے تمام سلسلے جو درہم برہم ہیں' اسی لیے ہیں کہ جذبات درمیان میں آ جاتے ہیں۔ ورنہ آئین اور قانون تو کہیں بھی ایسے نہیں ہوتے' کچھ تھوڑے بہت اس میں اسقام ہوتے ہیں' غلطیاں ہوتی ہیں۔ کہیں بھی ایسے نہیں ہوتے کہ جن کا نتیجہ تباہی ہو۔ یہ اتنے اچھے اچھے آئین وقوانین دنیا میں موجود ہیں اس کے باوجود جہاں یہ تباہیاں آتی ہیں کیوں آتی ہیں؟ قانون کو اس طرح سے نہیں نافذ کیا جاتا یا اس پہ عمل کیا جاتا جیسے خدا نافذ کر رہا ہے۔ اس میں انسانی جذبات دخل انداز ہو جاتے ہیں۔ جونہی کسی فارمولے میں آپ کا کوئی اپنا جذبہ بیچ میں آیا فارمولا بگڑا۔ سائنٹسٹ اپنی لیبارٹری کے اندر بالکل اندھا ہوتا ہے۔ لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (35:18) کتنا ہی قریبی کیوں نہ چاہتا بھی ہو وہ چیز جو ہے' اٹھا نہیں سکے گا۔

انسانی ذات کی نشو و نما کا دارو مدار صرف اور صرف قانون کی اتباع پر منحصر ہے

وَ مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ (35:18) جو بھی اپنی ذات کو نشو و نما دینے کے لیے یہ سامان کرتا ہے' قانون کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے' اُسی کی ذات نشو و نما پاتی ہے' دوسرے کی نہیں۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ اس میں کمزور رہ جاتا ہے' نقصان اٹھا جاتا ہے۔ اور اسی لیے پھر اُس نے تقابل میں لا کے وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ. وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ. وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ (35:19-20-21) کہا تم یہ کہتے ہو قانون کے مطابق کام کرنے والا' قانون شکنی کرنے والا' دونوں یکساں ہو جائیں۔ جس نے یہ کچھ کیا ہے اس کو تھوڑی سی رعایت دے دی جائے۔ کوئی دوسرا بٹا لے تو دونوں یکساں ہو گئے نا۔ کہا قانون کے اوپر عمل کرنے والا' قانون شکنی کرنے والا تمہاری رعایت کی رو سے وہ بھی بری ہو کر آ جائے گا نا اندر سے۔ کہا تمہارا تصور یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں یکساں ہو جائیں۔ کہا بتاؤ یہ کہ اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں' تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہو سکتی ہے' دھوپ اور چھاؤں کبھی ایک جیسی ہو سکتی ہے۔ اگر ایک جیسی نہیں ہو سکتی تو سن لو وَ مَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ (35:22) مردہ اور زندہ بھی برابر نہیں ہو سکتے۔

خدا کے ہاں قانون کی بارگاہ میں رسول اکرم ﷺ کی شخصیت اور اختیارات کے ذکر کے علاوہ زہر کے استعمال کا معاملہ

باقی رہا رسول اُس نے کہا اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ (35:23) یہ نہیں ہے کہ تو بھی ان کی شفاعتیں کرتا پھرے گا' رعایتیں دیتا پھرے گا'

مغفرت کی دعائیں کرتا رہے گا اِنۡ اَنۡتَ اِلَّا (35:23) Construction دیکھ رہے ہیں آپ۔اے رسول' تیری حیثیت صرف اتنی ہے کہ ان کو بتا دو کہ آگ میں انگلی ڈالو گے تو جل جائے گی' بس۔تو بھی ان کا درد نہیں بٹا سکتا۔اس لیے کہ اس نے تو خود کہہ دیا تھا کہ (اِنۡ عَـصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ) (6:15) میں خود ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے آگ میں انگلی ڈالی تو میری بھی یہی کیفیت ہوگی۔ایسی اعتدال کی زندگی بسر کرنے والا رسول ﷺ' پاکباز پاک' سیرت' پاک طینت' اتنی تھوڑی سی عمر 63 سال میں وہ فوت ہوگئے۔جب حضور ﷺ کو بخار آیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جو یہودیوں نے سالن میں زہر دیا تھا اس میں شبہ نہیں کہ میں نے وہ بوٹی نگلی تو نہیں تھی' چبائی تو تھی لیکن اُس سے ہی میں نے دیکھا تھا کہ زہر اثر کر گیا اور وہ آہستہ آہستہ اثر کرتا رہا۔یہ بخار تو اسی کا نتیجہ مجھے نظر آتا ہے۔اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ (6:15)۔کہا یہ کہ نہیں اٹھا سکو گے۔لہٰذا

بخشش کا تمام تر تصور عیسائیت کا پیدا کردہ ہے جس کا قرآن حکیم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں

عزیزانِ من! یہ تصور کہ کسی کے لیے بخشش کی دعا کرنا یا بخشش مانگنا یہ سارا سوال عیسائیت کا Unscientific تصور ہے۔اور اس کا نتیجہ تو پھر گداگری ہے' ہم تو مانگتے ہی بخشش ہیں} خدا سے' یا اللہ بخش دے} یا اللہ بخش دے' ''سویرے آ کے او فقیر وی او کچھ کیندے سن کوئی بخشش دے دیو جی تسی مینوں'' اُسے بھی ہم بخش دے کہتے ہیں۔بہشت فی سبیل اللہ ہم است۔قرآن کی رو سے جو بہشت ملتا ہے وہ تو جراُتوں بہادریوں اور ہمتوں کا صدقہ ہے۔کہتا ہے ہندی مسلمان سے کہو یہی عجمی مسلمان' وہ خوش ہے مست ہے' بہشت فی سبیل اللہ ہم است' ''اللہ واسطے وی ملدی ہوندی ہیگی اے بہشت} تینوں اولیھے گی''۔پتہ نہیں ہے کہ یہ ملا نہیں کرتی۔

خونِ جگر کے برعکس بخشش گداگری کا دوسرا نام ہے

صحت عزیزانِ من! نہ خریدی جا سکتی ہے نہ بخشش سے مل سکتی ہے} نہ سفارش سے مل سکتی ہے۔یہ تو آپ کے اندر کی ایک چیز ہے} قانون کے اتباع سے مل سکتی ہے۔جنت تیری پوشیدہ تیرے خونِ جگر میں ہے۔آں بہشتے کہ خدائے تو بخشد چیزے نیست۔وہ جنت جو تمہیں خدا بخشش میں دیدے کہا وجہ ذلت ہے' خیرات مانگ رہا ہے۔تا جزائے عمل تست جناں چیزے ہست۔عمل کے نتیجے میں ملے پھر ہے جنت لینے کے قابل ورنہ اگر بخشش میں ملتی ہے تو کہتا ہے گداگری ہے خیرات ہے جس کو تو لے رہا ہے۔

بخشش کے غلط نظریے کے نتیجہ نے اقوام کو گداگر بنا رکھا ہے

بات ساری وہی ہے عزیزانِ من! قرآن کا Scientific Attitude اور یہ مذہب کا Unscientific Attitude۔

کوئی مصیبت آئے کوئی بلا آئے، بجھ جاتی ہیں، اب تو ہمارے بچوں کو بھی یہ سکھایا جاتا ہے سکولوں اور کالجوں میں سفید چاندنیاں یہ سمجھ جاتی ہیں، آیہ کریمہ کا ورد ہو رہا ہے وہاں۔ مصیبت یہ ہے کہ قرآنی گھرانے کی بچی نے کسی دن مس سے یہ کہہ دیا کہ آیہ کریمہ سے اگر ہم نے پاس ہونا تھا تو پھر سال بھر آپ نے ہمیں محنت کرنے کی کیوں تاکید کی؟ پھر تو صرف چادر بچھا دینی تھی یہ ہو جانا تھا۔ ''اونے سکولوں کڈ دتا'' اس قسم کے کافر کا کیا دخل ہے اس اسلام میں۔ جی ہاں بخشش۔ قوم ہی بخشش کے اوپر آ گئی ہے۔ اتنے امکانات اتنی Potentiality ملک آپ کے پاؤں کے نیچے دفن ہے۔ عادت یہ پڑ گئی ہے کہ روٹی بھی بھیک کی مانگ کے کھا رہے ہیں۔ یہ ہے ایک غلط نظریے کا نتیجہ۔ Unscientific قومیں کرتی یہ ہیں۔ پھر ان کو شرم حیا بھی نہیں رہتی۔ وہاں جنت مانگی فی سبیل اللہ، بخشش کے طور پہ، یہاں روٹی مانگ رہے ہیں بخشش کے طور پہ۔ استغفار کے یہ معنی نہیں ہیں۔

خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا بنیادی مفہوم اور پھر ہمارا تصور

آ جانا چاہیے مجھے آیت کے اوپر۔ کیا چیز ہے یہ؟ منافقین ہیں۔ بڑے جرم کیے، بڑی خطائیں کیں، بڑے دھوکے بڑے فریب دیے، لیکن وہ جو چیز ہے باز آ ؤ۔ کسی وقت بھی تمہیں احساس ہو جائے کہ غلطی ہوئی ہے وہ کہتا ہے (لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ)(39:53) جس کے معنی ہم نے یہ کیے ہوئے ہیں کہ مرتے دم تک جتنے جی چاہے گناہ کرتے جاؤ، کرتے جاؤ، اُس کی رحمت سے نا امید نہ ہو وہاں گئے، وہاں تو عدل نہیں، رحمت ہے ''اوتکڑیاں وَ کڑیاں ایویں ای وکھان واسطے لایاں ہویاں نیں اوہنے''۔ یعنی وہ میزانِ عدل مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (99:7-8) ''اوسارے چکر کٹھے کتے ہوئے، فرشتے لوائے ہوئے، اوا ے سارا کچھ جو کچھ وی ہیگا ایویں وکھان واسطے ای ہیگا'' آخر میں ہوگا ''اولنگ جا، لنگ جا کون ویکھن ڈیا ہیگا''۔ ایسی قوم کا مذہب میں یہ Attitude ہوتا ہے۔

استغفار کے سلسلہ میں شانِ نزول کے علاوہ شفاعت کے متعلق پائے جانے والے تصورات کی حقیقت قرآن حکیم کی روشنی میں

استغفار کے یہ معنی نہیں ہیں۔ یہ مرنے کی بات نہیں ہے، یہ موت کے بعد کی استغفار اور بخششیں نہیں ہیں، یہ جنازے کے پڑھنے کی بات نہیں تھی جو آپ کے ہاں یہ شانِ نزول نے بتا دیا کہ وہاں اُس کے گناہ بخشانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے دعائیں کی تھیں۔ خدا کا رسول ﷺ تو یہ اعلان کر رہا ہے کہ اگر میں بھی قانون شکنی کروں تو میں بھی نہیں بخشا جا سکتا تو کیا وہ دوسرے کے بخشوانے کے لیے دعائیں

کرے گا؟ جس کو بخشوانے کی دعائیں کرے گا وہ نہیں کہے گا کہ ''میاں پہلے اپنے تے بخشوالے''اپنے متعلق تو یہ کہہ رہا ہے۔ یہ اس لیے کہلوایا گیا تھا حضورﷺ نے تو نہ معصیت کرنی تھی؟؟ نہ وہاں ہونا تھا اُنﷺ کے لیے تو یہ بات نہیں تھی۔ بات ان کے لیے تھی جن کے متعلق کہتے ہو کہ یہ بخشش کی دعا کریں گے میں بخشا جاؤں گا۔ وہاں شفاعت کریں گے۔ وہ ان کو کہہ رہا تھا کیا کہہ رہے ہوارے بابا وہ تم تو ایک طرف میں اگر اس کی خلاف ورزی کرونگا' میں بھی نہیں بخشا جاؤنگا۔ جب میں اپنے لیے نہیں بخشا جاؤنگا' تمہیں کیسے بخشوادونگا۔ کہنے کا طریق ہے۔ استغفار یہ کیا ہے؟ بھاگا ہوا مجرم' مفرور مجرم' احساس ہوگیا ہے اس ندامت کا۔ غلطی کی' کہا کہ کوئی بات نہیں آ ؤ اعتراف کرو۔ یہ آ ؤوالی بات جو میں نے کہی یہ ہے سارا راز۔ مرنے والے کے متعلق اگر بخشش کی آپ دعا کرتے ہیں تو وہاں تو آ ؤ ہوتا نہیں ہے۔ وہاں تو قرآن نے یہ بات کہدی کہ توبہ کے لیے ٹھیک ہے دروازہ کھلا ہے بشرطیکہ اس واپسی کے بعد دوبارہ کام کرنے کے لیے تمہارے پاس وقت ہو۔ کیونکہ اس کے بعد تم نے جو کام کرنا ہے اس کے نتیجے میں پہلے غلط کاموں کے جو تباہ کن نتائج کو مٹنا ہے۔ اور اگر اس کے بعد وقت ہی نہیں رہا تو؟ اسی لیے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے توبہ کے لیے دروازہ کھلا ہے لیکن موت اگر سامنے نظر آئے گی تو پھر کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ بات نہیں ہے کہ موت ایسی بھیانک چیز ہے جس کے بعد پھر کچھ نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ندامت کے بعد تم باز یاب بھی ہو پھر تمہیں وقت ملے اور تم اس کے ازالے کے لیے کچھ کرسکو۔ آپ سوچو تو سہی کہ جب انسان اُس مرض سے مر رہا ہو آخری دم ہو تو پھر یہ توبہ علاج معالجہ بے معنی چیز ہے۔ یہ ہے معنی کہ اس میں کام کے لیے وقت ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم قریب المرگ کی توبہ کو نہیں مانتا۔ ہم کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد کچھ شروع ہوجاتا ہے۔ وہ چلا گیا مر مرا گیا اور یہ اس کی بخشش کے انتظامات یہاں بیٹھ کے کر رہے ہیں۔ یہ بات مرنے کے بعد کی تھی نہیں۔ یہ وہ شانِ نزول ہے نہیں کہ وہ عبداللہ بن اُبَی مر گیا تھا اور حضورﷺ جنازے پہ جا کے اس کی مغفرت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا ہے عزیزانِ من! مشکل ہماری یہ ہے کہ قرآن سے ہم نہیں پوچھتے۔

نبی اکرمﷺ کی طرف سے منافقین کو غور و فکر کی دعوت موجودہ زندگی کے متعلق ہے نہ کہ مرنے کے بعد کے معاملات سے

منافقین کے متعلق یہ آ رہا ہے نا ذکر' غور سے سنیئے گا اور دیکھیے گا حوالے کو ملا کے۔ ایک سورۃ کا نام ہے منافقین' سورۃ منافقون۔ سن لیجیے نقطہ کیا بیان ہو رہا تھا۔ یہ کہ وہ مر گیا تھا۔ مرنے کے بعد رسول اللہﷺ اس کی مغفرت کی دعا کر رہے تھے۔ بخشش کی دعا مرنے کے بعد۔ قرآن کی رو سے ایسا ممکن نہیں۔ وہ تو اس زندگی میں بھی جو اپنے لیے یہ ان چیزوں سے محافظت چاہتا ہے' اس کے لیے کہتا ہے کہ وقت ہے ابھی کام کرنے کا؟ مرنے کے بعد کی بات نہیں ہے۔ منافقون کی سورۃ آ رہی ہے انہی کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ کہا ہے وَاِذَا قِيْلَ

لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ (63:5) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ میاں رسول اللہ ﷺ تمہارا سامانِ حفاظت تمہیں بہم پہنچا دیں آؤ حفاظت کا سامان لے لو اس سے۔ یہ تو **تَعَالَوْا** ہے یہ مرنے والے کو کہا جاتا ہے؟ یا اس کے جنازے کے بعد کہا جاتا ہے **تَعَالَوْا** ؟ ''توں ایویں تر گیا ہیگا ایں ذرا مڑ کے آ' آ و یکھ آں رسول اللہ آئے ہوئے تیرے سرہانے''۔ یہ منافقین کے متعلق ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کا طریق بتایا ہوا کہ یوں سمجھو اسے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ جنازے کی نماز نہیں تھی مرنے کے بعد یہ چیز نہیں تھی۔ **تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ** (63:5) ان کی کیفیت یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ تسلیم کریں کہ ہاں واقعی غلطی ہوگئی' ہمیں وہاں جانا چاہیے' اعتراف کرنا چاہیے' آئندہ کے لیے پروگرام لینا چاہیے کہ جو کچھ پیچھے کیا گیا ہے اس کے تباہ کن نتائج کا ازالہ ہو جائے' آئندہ کے لیے بہتری کی شکل ہو جائے۔ کہا بجائے اس کے کہ یہ صورت ہو کیفیت یہ ہے کہ وہ جو سربراہِ مملکت ہے' وہ جو ہیڈ ہے' چلو وہاں جا کے جرم کا اعتراف کرو آئندہ کے لیے ضمانت دو۔ کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ یوں سر مار کے چلے جاتے ہیں' ہمیں کیا ضرورت ہے **وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ** (63:5) یہ ہے وہ چیز' سرکشی برتتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

متکبرون کی ذہنیت تو کسی مرحلہ پر بھی اپنی غلطی کا احساس نہیں کرتی

کبھی آپ نے کسی سرکشی برتنے والے مجرم کے متعلق یہ سنا ہے کہ اس کو کہیں سے معافی مل گئی۔ عدالت بھی اگر کہیں تھوڑی سی اس قانون میں جو شق رکھی ہوئی ہوتی ہے رعایت برتنے کی' وہ اُسے ہی دیکھتی ہے کہ ہم نے مجرم میں اصلاح کی صلاحیت محسوس کی تو ہم نے اس کو یہ رعایت دی۔ اور جو وہاں جا کے یہ کہے کہ چودہ سال کی سزا دے رہے ہیں نا آپ' اکیس کی دیجیے' جب باہر آؤں گا اُسی دن بدلہ لوں گا۔ یہ دیکھیے **وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ** (63:5) ذہنیت ان کی یہ ہے۔ تو ان کی کیفیت' جن کی ذہنیت یہ ہو ان کے متعلق کہا **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ** (9:80) بابا جن کی ذہنیت یہ ہو ان کے متعلق اس کا امکان ہی نہیں ہو سکتا' تم ہزار بار چاہو کہ کسی طرح سے یہ مجرم نہ رہیں' کسی طرح ان طریقوں سے باز آ جائیں' کسی طرح سے یہ بچ جائیں۔ یہ جو ہے نا **سَبْعِيْنَ مَرَّةً** (9:80) یہ بات کہ ستر دفعہ حضور ﷺ نے کہا کہ مجھے معلوم ہوتا تو میں اکہتر بار جنازے کی نماز پڑھ دیتا۔ یعنی یہ شانِ نزول ہو رہا ہے کہ ستر کہا ہے نا خدا نے۔ پتہ نہیں یہ لوگ شاید ایرانی تھے اس لیے ان کو پتہ نہیں تھا اتنا عربی زبان کا بھی۔

محاورے کی زبان کے لیے ضروری ہے کہ اسے اسی انداز سے سمجھا جائے

یہ جو عربی زبان میں سبع اور **سَبْعِيْنَ** (9:80) اور یہ چیزیں آتی ہیں نا سات' سترہ' ستر' سات سو' یہ بعینہٖ ان معنوں میں آتا ہے کہ تمہیں میں نے بیس دفعہ کہا ہے کہ وہاں نہ جاؤ تو ایسا نہیں ہوتا کہ میں نے گن کے بتایا ہے۔ سو بار تمہیں اس کے متعلق کہا ہے' میاں تم اس

کو ہزار بار کیوں نہ کہو' یہ گنتی نہیں ہوتی ان کو عددِ کہتے ہیں زبان میں۔ یہ تاکید کے لیے آتے ہیں کہ تم سو بار بھی ان کے متعلق یہ کہو۔

نبی اکرم ﷺ کی حساس مشفق طبیعت کے متعلق قرآن حکیم کا بیان

رسول اللہ ﷺ کے متعلق قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ان کی تباہی کے اوپر آپ ﷺ کا جی بڑا کڑھتا تھا' بڑے ہی مشفق ہمدرد طبیب تھے۔ بڑا جی کڑھتا تھا مریض کی بداعتدالیوں' بدپرہیزیوں کے اوپر جی کڑھتا تھا۔ اور قرآنِ کریم حضور ﷺ سے یہ بار بار کہتا تھا کہ تمہارے کڑھنے سے کچھ نہیں ہوسکتا' یہ ذہنیت اپنی بدل لیں گے تو پھر ہوجائے گا۔ ایک جگہ کہا کہ ایسا محسوس ہورہا ہے کہ تُو تو اپنی جان ہلکان کرلے گا ان کے پیچھے۔ ارے بابا دیکھو تو سہی جو سرکشی برتے' جو منہ پھیر کے چل دے' جس کی کیفیت مردوں کی سی ہوجائے کہ سنے ہی نہیں' تمہارا جی کا کڑھنا' اتنی ہمدردی کرنا اُسے کیا فائدہ دے سکے گا۔ یہ کہا ہوا ہے وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (63:5) ان کے لیے سو بار بھی ہزار بار بھی تم اگر چاہو کہ ان کی حفاظت کا سامان ہوجائے تو وہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (63:5)۔ طریقہ کیا ہے (قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا) (63:5) آؤ۔ یہ آؤ کی بات ہے۔ دوسری جگہ اس کا طریقہ بتایا ہے اس قدر جامع ہے۔

اسلامی نظام میں اور مذہبی دنیا میں سربراہِ مملکت کے لیے عمل پیرائی کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے

عزیزانِ من! اور جو اسلامی نظام یا اسلامی مملکت میں جو پوزیشن ہوتی ہے سربراہِ مملکت کی اور اس میں ایک پوزیشن خدا کے قانون کی' اس کے اختیارات اپنے نہیں ہوتے وہ قانون کے ہوتے ہیں قانون کے مطابق یہ فیصلہ کرتا ہے۔

قرآنی نظام حکومت اور مذہبی دنیا میں اطاعت کرنے کے انداز میں فرق

عزیزانِ من! اتنے اہم مسائل ایک آیت کے چار لفظوں میں بیان کردیا ہے۔ پہلے تو یہ ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (4:64) رسول بھیجا اس لیے جاتا ہے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔ مذہب میں ہر شخص اپنے اپنے طور پہ جیسے جی چاہتا ہے' خدا کی اطاعت کرتا پھرتا ہے۔ دین میں اپنے طور پہ نہیں اطاعت ہوتی' ایک مرکز ہوتا ہے' ایک نظام ہوتا ہے اس کے فیصلوں کی اطاعت کی جاتی ہے۔ کہا رسول ہم بھیجتے اس لیے ہیں۔ ورنہ اگر خالی ان اخلاقیات کی اطاعت انفرادی طور پہ کرنی ہوتی تو ٹھیک ہے ہم اسے کسی پہاڑ کی چٹان پہ لکھ دیتے' تم لوگ پڑھ لیتے تو اپنے طور پہ یہ کرتے۔ مگر نظام بنانے کے لیے رسول بھیجنا پڑتا ہے ساتھ۔

ذاتِ انسانی پر نفسیاتی طور پر مرتب ہونے والے اثرات کی نوعیت

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (4:64) وہ لوگ جو اپنے اوپر کچھ زیادتیاں کر بیٹھیں۔ جہاں بھی قرآن نے جرائم یا گناہ گنایا ہے کہا اپنے خلاف تم زیادتی کرتے ہو' بظاہر دوسرے کے خلاف کرتے ہو' درحقیقت یہ تمہارے اپنے خلاف ہوتا ہے۔ میں پھر دوسرے

وقت عرض کرونگا قرآن کی رو سے جرم اوراس کے اثرات کا Most Psychological Aspect ہے جو قرآن نے نفسیاتی چیز بتائی ہے۔ بہرحال کہا کہ اپنے خلاف جو زیادتی تم کر لیتے ہو۔(ولو) اگر (جآء وک) اے رسول وہ تیرے پاس آئیں۔ دیکھا آپ نے کاہے کے لیے؟ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ (4:64) آئیں تیرے پاس کہ جو کچھ ہم سے غلطیاں ہوگئی ہیں، ہم لغزشیں کر چکے ہیں، ندامت ہے اعتراف کرتے ہیں، وہ جو اس کے نقصان رساں نتائج ہیں اللہ اُس سے ہمیں حفاظت دیدے۔ کہا کہ رسول کو ذاتی طور پہ اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ کہدے کہ اچھا جاؤ تم نے یہ کہدیا ہے، ہم نے معاف کیا۔ ہیڈ آف دی سٹیٹ ہے۔

قانون خداوندی کے تحت رسول کی اپنی حیثیت کا معاملہ

یاد رکھیے قرآن کی رو سے ہیڈ آف دی سٹیٹ کو بھی یہ اختیار نہیں ہوسکتا کہ وہ ازخود یہ کہے کہ جاؤ۔ کہا فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ (4:64) وہ آ کے یہ کہیں گے کہ قانونِ خداوندی کی رو سے ہمارے لیے یہ سامانِ حفاظت دیدیجیے۔ رسول کی ذات کی کیفیت نہیں ہے۔ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ (4:64) رسول پھر اس قانون کو سٹڈی کرے اس کو دیکھے اس کے بعد ہے کہ ہاں اس میں اس قسم کی Provision ان کی حالت ایسی ہے، سچے دل سے یہ دیانت سے امانت سے نیک نیتی سے، اس طرف آ گئے ہیں اس لیے ماقد سلف جو ہے پیچھے جو ہو گیا ہے، اسے کہا جائے کہ وہ سابقہ جرائم جو ہیں ان کی باز پرس تم سے نہیں ہوگی۔ اگر رسول دیکھے کہ وہ وہ کہہ رہے ہیں کہ خدا کے قانون کی رو سے ہمارے لیے سامانِ حفاظت دیدو۔ رسول کی اپنی حیثیت نہیں ہے کہ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ (4:64) رسول ان کے لیے پھر یہ دیکھے کہ اس کی رو سے یہ ہوسکتا ہے۔ کہا کہ اگر یہ چیز وہ پیدا کریں گے لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (4:64) خدا کو یہ دیکھیں گے کہ ان کی طرف لوٹ کے چلا آیا۔ وہ پھر آتا ہے خدا ہی کی طرف۔

قرآنی قانون کی مکمل عمل داری کی خاطر انسان کو مرکزِ ملت کی طرف لوٹنا ہی ہوگا

یہ درمیان میں رسول کی وساطت کیوں آ گئی۔ اس کے پاس کیوں آئیں۔ اپنے ہی طور پہ مصلیٰ پہ ہزار تسبیح کا دانہ کیوں نہ پھیر لیں جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ یہ دو مقام صرف گنائے ہیں۔

آخرکار انسان کو لفظ استغفار کے اس بیان کردہ عملی زندگی کی طرف لوٹنا ہی پڑے گا

عزیزانِ من! اس قسم کے بیسیوں مقام ہیں قرآن میں جہاں یہ کہا ہے کہ ان کے لیے ضروری ہے کہ یہ آئیں وہ جو مملکت کا نمائندہ ہے ہیڈ آف دی سٹیٹ یا اس کے نیچے نمائندہ اُس کے پاس آئیں۔ وہاں آ کے اعتراف کریں، وہ چھان بین کرے پھر قانون کو Consult کرے اور دیکھے کہ اس میں اگر امکان ہے تو پھر ان سے یہ نہ کہے کہ جاؤ، میں نے تمہیں معاف کیا لَوَجَدُوا اللّٰهَ (4:64)

کہے کہ جاؤ خدا کے قانون میں یہ رعایت تھی اس لیے تمہیں اس سے معافی ملی۔ یہ ہے عزیزانِ من! استغفار۔ یہ ہے دوسرے کے لیے جسے آپ کہتے ہیں مغفرت۔ یہ ہیں اس آیت کے معنی۔تو یہ جو استکبار کرتے ہیں، سرکشی برتتے ہیں، کبھی جھکتے نہیں ہیں، ندامت کا احساس ان کے اندر پیدا نہیں ہوا۔ان کے لیے خوامخوہ اپنی جان ہلکان کر رہا ہے۔ وہ تو اس کے لیے ہے کہ جو اس طرح سے تیرے پاس آئے اور آ کے کہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! اس آیہ مفصلہ میں یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر ستر بار بھی استغفار کرے اور یہ اس کیفیت میں تمہارے پاس نہ آئے ہوں، اپنے طور پر ان کے لیے یہ کچھ چاہے، سوال ہی نہیں ہے کہ انہیں حفاظت کا سامان مل جائے کسی طرح سے۔ ڈاکٹر کتنا ہی ہمدرد کیوں نہ کلینک کے اندر بیٹھا ہو، کڑھ رہا ہو، جب تک مریض آمادہ نہیں ہوگا علاج کے لیے اُس کو کسی صورت میں بھی مغفرت نہیں مل سکتی۔

جنازے کی دعا کا مفہوم آئندہ پیش ہوگا

اب اگلی چیز جو رہی کہ صاحب جنازہ کی نماز پڑھی جاتی ہے دعا بھی کی جاتی ہے یہ کیا ہے۔اس کے لیے آگے آتی ہے آیت **وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ** (9:84) ابھی، وقت بھی ہوگیا ہے آج ایک ہی آیت ہم نے لی سورۃ التوبہ کی آیت 80۔81 ویں سے ہم آگے لیں گے جا کے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

تیرہواں باب: **سورۃ توبۃ** (آیات 81 تا 84)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلموا تسلیماً کی حقیقت قرآن حکیم کے آئینہ میں

عزیزانِ من! آج مئی 1973ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 81 سے ہو رہا ہے۔ (9:81)۔

منافقین کا تفصیلی تعارف

آپ کو یاد ہے کہ سورۃ انفال اور التوبہ میں مسلسل جہاد کا ذکر آ رہا ہے یعنی قتال کا جنگ کا۔ اور اُسی ضمن میں منافقین کا ذکر ہے۔ اور خصوصیت سے اس مقام پہ ان کا ذکر آتا ہے جہاں وہ نماز روزے کے کاموں میں تو ان کے شریک ہوتے تھے لیکن اس عظیم مقصد کے لیے جب کسی مصیبت برداشت کرنے' صعوبت اٹھانے' قربانی اور جنگ کا یہ وقت آتا تھا تو پھر وہ اس سے گریز کی راہیں نکالتے تھے' اعراض برتتے تھے' اجتناب کرتے تھے' بہانہ سازیاں کرتے تھے۔ تو یہ ہے وہ خصوصیت جو منافقین کی اس مقام پہ بتائی گئی۔ اور اس کی اہمیت اتنی ہے کہ اس شرح وبسط سے' اس تفصیل کے ساتھ' اتنا لمبا چوڑا ذکر شاید ہی کسی اور ذہنیت کا آیا ہو۔ میں گروہ نہیں کہہ رہا' جماعت نہیں کہہ رہا کہ وہ محدود ومقصود ہو جائے گی خاص ماحول میں۔ بلکہ یہ ذکر ہے ایک خاص ذہنیت کا کہ مذہب کی حد تک تو پوجا پاٹ' پرستش مناسک' رسوم ورواج' تھوڑی بہت خیر خیرات کی باتیں' پُن دان کی چیزیں' یہاں تک تو وہ بالکل آگے آگے ہوتے ہیں۔ لیکن جب کہیں معاملہ اس قسم کا آ جائے کہ جہاں کچھ قربانی دینی پڑے اس مقصد کے لیے' وہاں وہ بہانہ سازیاں کرتے ہیں۔

قرآن حکیم کی نظر میں جنگ تبوک کے موقعہ پر نبی اکرم ﷺ کی رفاقت کے برعکس منافقین کا کردار

یہ ہے نفاق کی ذہنیت جس کا مظاہرہ قرآن ان آیات میں بار بار کرتا چلا آ رہا ہے۔ کہا کہ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (9:81) جنگ میں یہ لوگ چلے گئے‘ رسول اللہ ﷺ ساتھ گئے۔ یہ جنگِ تبوک کا ذکر ہے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا آخری معرکہ۔ شدت کی گرمی کے دن تھے‘ دور کا سفر تھا۔ تو اس میں یہ لوگ بہت سے بہانے کر کے پیچھے رہ گئے۔ کہا کہ پیچھے رہ گئے اور اس پہ خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے بڑی کاریگری کی جو اس مصیبت سے بچ گئے۔ خوش ہو رہے ہیں۔ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (9:81) اور اس چیز کو بڑا ناپسند کیا انہوں نے‘ جہاد کا وقت آیا کہ مال اور جان سے جہاد کیا جائے اللہ کی راہ میں۔ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ (9:81) خود بھی نہ گئے اور دوسرے لوگوں سے بھی یہ کہتے رہے کہ میاں اتنی سخت گرمی میں تمہاری مت ماری ہوئی ہے‘ اتنے لمبے سفر میں جا رہے ہو‘ شدت کی گرمی پڑ رہی ہے۔ قرآن نے ایک لفظ میں اس کا جواب دیدیا کہ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا (9:81) ان سے کہو کہ جہنم کی آگ تو تپش میں اس سے کہیں زیادہ شدید ہوگی۔

قرآن حکیم نے جہنم کی آگ کا خواہ وہ امروز ہو یا جہانِ فردا‘ دونوں کا ذکر کیا ہے

اس تپش سے بچنے کے لیے تم نے بہانہ سازی کی اور یہ نہیں سوچا کہ اس کا نتیجہ جہنم ہوگا اور وہی ان کی اُسی تپش کو یہاں لا کے کہا کہ جہنم کی آگ کی تپش تو اس سے کہیں زیادہ شدید ہوگی۔ اور آخرت کا جہنم اس کی تپش اس کی حرارت تو وہاں کی بات ہے۔ اِسی زندگی کے اندر وہ جہنم جس کے متعلق کہا کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (104:6-7) وہ جہنم کی آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔ اس کی تپش تو یہاں ایک ایک سانس میں محسوس ہوتی ہے۔ اور جس مسلسل جہنم میں بالخصوص منافق رہتا ہے‘ اس کا تو اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کہا کہ اور کچھ نہیں تو اس جہنم کی تپش جس تپش سے ڈر کے تم گھروں میں بیٹھے رہے ہو‘ اس کا مقابلہ اس جہنم کی آگ سے کرو جو دلوں کو لپیٹا کرتی ہے۔ دیکھو تو سہی وہ آگ کتنی الم انگیز عذاب کا موجب بنتی ہے۔ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (9:81) بڑی بات کہی ہے۔ اے کاش یہ لوگ جذبات سے مغلوب ہونے کی بجائے عقل وفکر سے کام لیتے تو یہ بات سمجھ میں آ جاتی کہ یہ آگ جسے یہ منافقت سے مول لے رہے ہیں یا اپنے سینوں میں بھڑکا رہے ہیں‘ یہ کہیں زیادہ الم انگیز ہے اس طبعی آگ سے یا موسم کی حرارت سے یا گرمی سے۔ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (9:81) حالانکہ یہ منافقت برتنے والے بزعمِ خود یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت عقل مندی سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ یہ عقل جو انسان کو بہانہ سازیوں کی طرف لے جاتی ہے‘ جو غلط کاموں کے لیے جواز بہم پہنچاتی ہے قرآن نے اسے تفقہ والی عقل کہا ہی نہیں ہے۔

انسانی جذبات وحی کے تابع ہوئے بغیر صحیح روش زندگی اختیار کر ہی نہیں سکتے

حقیقت میں وہی عقل آپ کو صحیح کام دے سکتی ہے جو جذبات کے تابع نہ رہے۔ زندگی کی روش وہ ہے کہ جذبات آپ کے عقل وفکر کے تابع اور عقل وفکر وحی کی روشنی میں کام کرے۔ یہ ہے صحیح روشِ زندگی۔ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (9:81)۔ اور آگے ایک فقرہ ہے کہ پیچھے رہ گئے' جسے ہم کہتے ہیں نا' چھلیاں مار رہے ہیں ہنس رہے ہیں' خوش ہو رہے ہیں' بڑی کاریگری کی' عجیب بہانہ سازیاں ہم نے کیں اور کامیاب ہوئے' جھُل دیا ان کو فریب دیا ان کو اور دیکھیے مزے میں بیٹھے ہیں ہنس رہے ہیں۔ کہا فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (9:82) ان سے کہو کہ ٹھیک ہے تھوڑے سے وقت کے لیے ہنس لیں پھر عمر بھر کا رونا ہوگا۔ اس قسم کی ہنسی اور اس قسم کی خوشیاں جو غلط کاموں کی کامیابی پہ انسان کو نصیب ہوں' کہا یہ کہ ٹھیک ہے تھوڑے وقت کے لیے تو اس سے ضرور خوشی کا سامان میسر آتا ہے۔ اس کا المناک انجام جب سامنے آتے ہیں تو ان کی مدت تو بڑی لمبی ہوتی ہے۔ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (9:82) اور یہ کہیں باہر سے نہیں آیا کرتا یہ رونا جو عمر بھر کا ہے' اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے انہی کے اندر یہ چیز چھپی ہوئی ہوتی ہے آخر کار پھر رونا جو عمر بھر کا۔ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ (9:83) کہا اگر تم کامیاب لوٹ آئے اور یہ دیکھیں کہ فتح نصیب ہوئی اور اتنی بڑی کامیابیاں اور سرفرازیاں ان کے جلو میں آ رہی ہیں۔ تو کہا اس کے بعد اگر تم کبھی جنگ کے لیے نکلو گے تو یہ لوگ کہیں گے کہ صاحب ہم آپ کے ساتھ ضرور جانے کے لیے تیار ہیں۔ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِىَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِىَ عَدُوًّا (9:83) کہا بالکل نہیں ہم دیکھ چکے ہیں' بار بار ہم دھوکہ نہیں کھا سکتے تم سے۔ اب تم ہمارے ساتھ کبھی بھی نہیں جنگ کے لیے جا سکتے' تمہارا اور ہمارا ساتھ ختم ہوگیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ جماعت میں اس وقت یہ لوگ ملے جلے رہتے ہیں' پہچان بھی ذرا مشکل ہے لیکن خدا کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ جماعتِ مؤمنین کو اسی حالت میں رہنے دے کہ مخلص مومن اور منافق ان میں سے چھٹ کے الگ الگ نہ ہو جائیں۔ یہ آخری مرحلہ تھا جہاں یہ منافقین اس کے بعد چھٹ کے الگ ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہاں ان کو اعلانیہ کہہ دیا گیا ہے کہ بس تمہارا اور ہمارا ساتھ ختم ہوا اس کے بعد تم ہمارے ساتھ کہیں نہ جا سکتے ہو نہ آ سکتے ہو' تعلق ہی تمہارے ساتھ ختم ہے۔ اور تعلق کے ختم کرنے کی اگلی آیت آتی ہے۔ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ (9:83) وہ زمانہ کہ جب تکالیف سامنے نظر آتی تھیں اس زمانے میں تو تم گھروں میں بیٹھے رہے اور اب جو تمہیں نظر آ جاتا ہے کہ فتح ونصرت کامیابیاں سرفرازیاں تمہارے قدم چومیں گی' اب تم ساتھ جانے کے لیے تیار ہو رہے ہو۔

قرآنی معاشرے کی تعریف یہ ہے کہ اس میں ہر شخص ہر آن معاشرے کی خوشی اور غمی میں برابر کا شریک ہوتا ہے

کسی نظام میں کسی تنظیم میں داخلے کے تو معنی یہ ہیں کہ جو حالات بھی اس کے اوپر گذریں' ان کا ساتھ دیا جائے۔ اس کے اوپر مشکل کا زمانہ آئے تو اس میں اور زیادہ خلوص اور شدت کے ساتھ ساتھ دینا چاہیے۔ نہ یہ کہ اس زمانے میں تم الگ ہو کر بیٹھ گئے اور جب کامیابیاں حصے میں آئیں تو آگے بڑھ بڑھ کے یہ کہا کہ ہم بھی تو تم میں سے ہی ہیں۔ ہم تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہیں۔ کہا کہ یہ غلط چیز ہے اب تم پیچھے رہنے والوں میں سے ہمارے ساتھ تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اب وہ مقام آ گیا ہے جہاں ان لوگوں سے کہہ دیا گیا کہ تمہارا ہمارے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ معاشرتی قطع تعلق جسے آپ کہتے ہیں یہ وہ مقام آ پہنچا ہے اور یہاں آتی ہے وہ اگلی آیت کہ جو تشریح طلب ہے اور آج کا درس غالباً وہی موضوع رہے گا۔ کہا یہ کہ

وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ مَاتُوۡا وَ هُمۡ فٰسِقُوۡنَ (9:84) ان کی کیفیت یہ تھی کہ ویسے تو ان کو الگ منافقین کہا گیا لیکن درحقیقت انہوں نے کفر برتا' انکار کیا ان صداقتوں سے سرکشی اختیار کی اور اسی حالت میں یہ مر گئے۔

بدعملیوں کا ازالہ کرنے کے لیے اگر وقت ہی نہ رہے تو پھر توبہ کیسی

قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوتا ہے بجز اس وقت کے کہ جب موت سامنے آ کے کھڑی ہو جائے۔ اور اگر کوئی اسی حالت کے اندر مر جائے تو پھر تو سوال ہی نہیں اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہو۔ ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ یہ اسی حالت میں مر گئے۔ اب یہاں یہ چیز آتی ہے وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ (9:84) یہی اس کا ترجمہ بھی کیا جاتا ہے' معنی بھی یہی لیے جاتے ہیں کہ آپ سے یہ کہا کہ ان کے جنازے کی نماز قطعاً نہ پڑھیے نہ ہی ان کی قبر پر کھڑے ہوئیے۔ اب یہاں یہ چیز آئی کہ یہ کیا ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور منع تو ان سے کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو منافق نہیں ہیں' مومن ہیں' مخلص ہیں' ساتھی ہیں ان کے لیے یہ چیز جائز ہوگی۔

نمازِ جنازہ کی اصل حقیقت' ایصالِ ثواب کی نوعیت اور ہمارے ہاں کی تقلید پرستی کا عملی نتیجہ

اب ایک چیز جو ہے تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ (9:84) یہ لفظ یہاں آئے ہیں۔ عام طور پر اس کے لیے نمازِ جنازہ کہا جاتا ہے۔ یہ کیا چیز

ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ پہلے چیز یہ دہرا لیجیے جو پچھلے درس میں میں نے پورے شرح وبسط سے عرض کیا تھا کہ ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے۔ اس کے ہر عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ جس طرح ہر شخص کا اپنا عمل اس کی صحت کو بناتا ہے‘ اس کی صحت کو بگاڑتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا ہو۔ جیسا میں نے کہا تھا کہ آگ میں انگلی ڈال لے تو جو درد اس سے ہوتا ہے‘ کوئی شخص اس درد کو بٹا نہیں سکتا‘ یہ ناممکن ہے۔ جو شخص سیر کے لیے نکلتا ہے‘ اس کی صحت اچھی ہوتی ہے‘ وہ اپنی اچھی صحت کو کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کے اپنے کام عمل حتیٰ کہ قرآن نے اس میں ارادے کو بھی شامل کیا ہے‘ نگاہ کی خیانتیں اور دل کے ارادے قرآن نے کہا ہے‘ اس کے بھی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ نتیجہ مرتب ہوتا ہے اس شخص کی ذات پر۔ طبعی جتنے بھی اعمال ہیں ان کا نتیجہ اس کی طبعی زندگی کے اوپر ہوتا ہے۔ اچھی خوراک کھاتا ہے‘ احتیاط کی زندگی بسر کرتا ہے Preventive Medicine مثلاً ضرورت ہے وہ بھی لیتا ہے اس سے اس کی صحت اچھی ہوتی ہے۔ کوئی اچھی صحت والا‘ کسی دوسرے کو اپنی صحت منتقل نہیں کر سکتا۔ یہ بات کہ اس قسم کے اثرات کا دوسرے کی طرف منتقل کرنا یہ قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے‘ جسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں کوئی اسے منتقل نہیں کر سکتا۔ معاشرتی چیز اور ہے کہ ایک دوست نے قرضہ دینا ہے اُس کے پاس رقم نہیں‘ دوسرا دوست اُسے کچھ روپے دے دے اور وہ قرضہ ادا کر دے‘ اُسے نہ دے اُس کے Behalf پہ یہ کر دے۔ یہ چیزیں معاشرتی ہیں۔ انسانی اعمال کا جو نتیجہ انسان کی ذات پر مرتب ہوتا ہے‘ اُس میں نہ کوئی شریک ہو سکتا ہے نہ کسی دوسرے کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ تصور غلط ہے کہ مردوں کو ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے‘ ثواب ان کو پہنچایا جاتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ کسی عقیدے کا سوال نہیں ہے‘ یہ ایک عملی چیز ہے۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ جسے تپ دق ہو گئی ہے اور دوسرا شخص جس کی صحت نہایت اچھی ہے‘ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اپنی اچھی صحت کسی طرح سے Inject کر دے اس کے اندر اور وہ اُدھر منتقل ہو جائے۔ اسی کو ایصالِ ثواب کہتے ہیں‘ ثواب کے معنی ہیں تمہارے اچھے کاموں کا جو نتیجہ مرتب ہوا اُسے دوسرے کی طرف منتقل کرنا۔ منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تصور غلط ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (2:286) بنیادی اصول ہے قرآن کا‘ اچھے کام کرنے والے کا نتیجہ بھی اس کے لیے غلط کام کرنے والے کا غلط نتیجہ تباہ کن‘ نتیجہ نقصان رساں نتیجہ بھی اس کے لیے۔ کوئی دوسرا کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا عزیزانِ من! چہ جائیکہ مرنے کے بعد اس کے بخشوانے کے انتظامات اس دنیا کے اندر اس کے لواحقین کر رہے ہوں۔ سوچیے تو سہی۔ مرنے کے بعد طبعی زندگی کا ایک سانس آپ نہیں دے سکتے چہ جائیکہ وہاں کی جنت یہاں سے خرید کے دیدیں کہ صاحب یہاں خریدی جائے گی‘ انتقالِ اراضی کے رجسٹر میں نام اس کا لکھ دیا جائے گا۔ Intimatation دیدیں گے ہم تمام جگہ ٹرسٹ کے ہاں بھی‘ کمشنر کے ہاں بھی‘ دفتروں کے ہاں بھی کہ یہ جو مکان میں نے خریدا ہے یہ درحقیقت میرے

والد ماجد جو فوت ہوئے ہیں، یہ ان کے نام الاٹ کیا جائے گا۔ ناممکن ہے۔ طبعی مثال میں دے رہا ہوں اور اس سے زیادہ مثالیں وہ ہیں جو میں نے ابھی دی ہیں۔

انسانی اعمال کے سوا زمین و آسمان کی ساری دولت ایک دوسرے کو منتقل کی جا سکتی ہے

آپ کا عزیز بیٹا مر رہا ہو اور آپ ساری دنیا کی دولت اس کی صحت کے لیے لٹا دینا چاہیں اپنی صحت میں ایک شمہ بھر اُسے آپ نہیں دے سکتے۔ نہیں منتقل ہو سکتا۔ کچھ نہیں کر سکتا کوئی دوسرے کے لیے۔ یہ بنیادی اصول یاد رکھیے۔ کفارے کا عقیدہ غلط ہے، عیسائیت جیسے کہ حضرتِ مسیحؑ نے جان دیدی صلیب پہ اور اپنے تمام ماننے والوں کے گناہوں کو بخشوا دیا ان کے لیے یہ سب کچھ کر دیا۔ قطعاً غلط ہے۔

مرنے کے بعد ان کو ثواب کی ترسیل اور دیگوں کی منتقلی قرآن حکیم کی فکر کو ماؤف کرنا ہے

یہ مرنے کے بعد کی یہ چیزیں کہ اتنی دیگیں پکا دیں، اتنی نیازیں دیدیں، یہ ختم دلا دیا، اس کا ثواب اس کو پہنچا دیا۔ قطعاً غلط ہے۔ اُس سے آگے یہ چیز کہ وہ قرآنِ کریم اتنے ختم کیے اور ختمِ قرآن کا ثواب اُدھر پہنچا دیا۔ پہلے تو یہی پوچھیے کہ قرآن کا ثواب تو یہ ہے کہ قرآن آپ نے سمجھا۔ یہ جو آپ نے سمجھا ہے، اس زندگی میں اپنی سمجھ دوسرے کی طرف آپ منتقل نہیں کر سکتے۔ اُسے خود سمجھنا پڑتا ہے، اُسے آپ علمی طور پہ سمجھا تو سکتے ہیں، تعلیم دے سکتے ہیں۔ اگر آپ یہ چاہیں کہ اپنا علم بغیر تعلیم دیے ہوئے کسی طرح اس کے بھیجے میں ڈال دیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ علم نہیں آپ دے سکتے۔ معاف رکھیے گا آج کل جو عام دستور ہو گیا ہے۔ چار سو بیس سے اس کی جگہ پیپر بھی آپ کر آئیے، پیپر بدل دیجیے، یہ سارا کچھ کر سکتے ہیں، اپنا علم آپ اس کو منتقل نہیں کر سکتے۔ زندگی میں نہیں کر سکتے مرنے کے بعد آپ کیسے منتقل کریں گے۔ کوئی ڈاکخانہ ایسا نہیں جو Accept کرے آپ کا یہ پارسل۔ لیکن نہیں آپ کو تو یہ بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے جنرل پوسٹ آفسز ہیں جناب بہت بڑے بڑے وہاں کے جی پی او کے پوسٹ ماسٹر جنرل بیٹھے ہیں، بلا لیجیے ان کو عماموں اور قباؤں کے ساتھ۔ بیٹھے ہوئے پڑھ رہے ہیں، اتنا میرا ثواب، اتنے میرے قرآن، اتنے میرے پارے۔ وہ اکٹھا کیے چلے جا رہے ہیں، ڈھیر لگائے چلے جا رہے ہیں اور یہ سارا کچھ کرنے کے بعد یہ دعا مانگتے چلے جا رہے ہیں کہ ان سب کا ثواب مرحوم کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور جیسے ڈاکخانے والے پہلے اپنی فیس لے لیتے ہیں۔ یہ جتنا بھی ہے یہ ان کا، بھیجنے والا جو ہوا پوسٹ ماسٹر اور یہ سب لوگوں کے جتنے بنڈلز ہیں وہ سب کے سب اس کو منتقل دیئے جائیں۔

شفاعت کا عقیدہ فریب نفس کے سوا کچھ نہیں اس نے امت مسلمہ کو بے عملی کی طرف راغب کر دیا ہے

عزیزانِ من! کس فریب میں اس قوم کو رکھا ہوا ہے۔ جو یہاں یہ نہیں ہو سکا تو آگے چلیے کہ شفاعت کے ذریعے سے بخشوانے کے طریقے ہیں صاحب۔ کمبل کے ایک ایک تاگے سے ہزاروں مرید چمٹے ہوئے چپکے سے اندر چلے جائیں گے' پتہ نہیں لگنے دیں گے جو ٹکٹ کلکٹر دروازے پہ کھڑا ہوگا۔ عزیزانِ من! دین کا ہم نے کیا مذاق بنا رکھا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہاں سے بات آگے چلے گی۔

بیماری کے دوران عیادت انسان کے لیے نفسیاتی سہارے سے کم نہیں

وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ (9:84) پہلی چیز یہ سمجھ لیجیے کہ جو مر گیا ہے اس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ سب کچھ معاشرتی چیزیں ہیں یہ بھی ضروری ہیں معاشرے کے لیے' اُس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ تیمارداری ہمدردی کے کچھ الفاظ نیک آرزوؤں کا اظہار' آپ دیکھتے ہیں اس کا Psychological اثر پڑتا ہے' نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ بیمار کو تنہا چھوڑ دیجیے کوئی اس کو دیکھنے پوچھنے والا نہ ہو' علاج کی بات نہیں ہے' چار ہمدردی کے لفظ کہنے والا نہ ہو' آپ دیکھئے اس کا اثر۔ اور آکے پوچھنے والے کی بات کے تعلقات پہ معکوس ہے۔ تعلق کی گہرائی میں تو کہہ گیا ہے غالبؔ کہ

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

بیمار کی کتنی مجبوری ہے کہ اپنی اصلی حقیقت بھی ان پر منکشف نہیں کر سکتا' جب بھی وہ آتے ہیں تو ان کے دیکھے سے منہ پہ رونق آ جاتی ہے۔ یہ جو دیکھے سے منہ پہ رونق آتی ہے یہ نفسیاتی اثر ہے' یہ عیادت ہے یہ نیک آرزوؤں کا اظہار ہے۔ اور اسی میں ایک چیز ہے جسے Appreciation کہتے ہیں کسی کے اچھے کام کی تحسین و تبریک Appreciate کرنا اس کی تعریف کرنا۔ اسے آج کی اصطلاح میں Moral Support کہتے ہیں۔ عجیب چیز ہے یہ۔ میں جب قرآنِ کریم کو اس نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ عزیزانِ من! قرآن کو ان نگاہوں سے دیکھئے' عجیب کیفیتیں منکشف ہونگی۔

قرآن حکیم کے ہاں لفظ صلوٰۃ یا صلّ علیٰ بڑی اہم اصطلاحات ہیں

صلو یا صلی کا مادہ جہاں سے صلوٰۃ ہے جس کا ترجمہ ہم نے نماز کیا ہے' صلوٰۃ بنیادی چیز ہے اور میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا اتباع کرنا' اس کو Follow کرتے چلے جانا۔ صلوٰۃ جب آئے گی تو میں عرض کرونگا کہ وہ کیا چیز

ہے۔جیسا کہ دوسری زبانوں میں بھی ہے Prepositions جو آتی ہیں ان سے معانی میں جو فرق پڑتا ہے یا وضاحت ہوتی ہے' عربی زبان میں یہ بڑی چیز ہے۔ان حروف کے ساتھ ملانے سے بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے۔یہی جو صلوٰۃ کا مادہ ہے ہی جب یہ صل اور صلوا کے ساتھ علیٰ آتا ہے تو اس کے معنی Appreciate کرنے کے ہو جاتے ہیں۔کسی کے اچھے کام کے اوپر اُسے شاباش دینا۔ شاباش سے بات یاد آ گئی انسان کسی کی تعریف کرنے میں تحسین برتنے میں بخیل اتنا ہوتا ہے کہ جو شاباش ہے یہ اصل میں ہے شاد باش' وہ بھی مخفف کر دیا کم بختوں نے کہ ''ہور کچھ نہیں دال ای کٹو ایہدے اچ' ماری ڈنڈی''۔یہ شاباش' شاد باش ہے یہ۔یہ جو چیز ہے دوسرے کو شاد باش کہنے کی' عربی زبان میں یہ ص ل کے ساتھ ص ل و کا مادہ اس کے ساتھ جب علیٰ آخر میں آئے گا تو اس کے معنی ہو جائیں گے Appreciate کرنا تحسین وتبریک کے پھول برسانا۔یہ Appreciation جو ہے۔میں کہہ رہا تھا اس نقطۂ نگاہ سے قرآن کو دیکھنے سے عجیب چیزیں سامنے آتی ہیں۔

انسانی معاشرے میں Social Justice کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی

یہ آج جسے آپ Social Justice کہتے ہیں یہ بڑا اہم مضمون ہے۔یعنی سوسائٹی میں افرادِ سوسائٹی کے ساتھ Justice کرنا۔بڑا مشکل موضوع ہے یہ' جسٹس کسے کہتے ہیں Individual Justice انفرادی انصاف کیا ہوتا ہے۔انصاف نہیں بلکہ عدل بھی اس کے لیے اچھا' لفظ نہیں۔بہرحال ایک Justice ہی ہمارے ہاں لفظ چلا آ رہا ہے۔سوشل جسٹس۔پوری کی پوری سوسائٹی میں سوشل جسٹس۔بات دوسری طرف چلی جائے گی مجھے سمٹ کے فوراً آ جانا چاہیے اسی نقطہ پہ۔سوشل جسٹس کے اندر مختلف نوعیتوں کی جسٹس وہ گنتے ہیں: اکنامک جسٹس' پولیٹکل جسٹس' لیگل جسٹس۔یہ ساری چیزیں سوشل جسٹس میں آتی ہیں۔جہاں انہوں نے افرادِ معاشرہ کے لیے اس قسم کی مساوات کا ذکر کیا ہے یا کسی کو کسی پہ حق دینے کا ذکر کیا ہے۔آپ حیران ہونگے کہ اکنامک جسٹس کے اندر ایک الگ ان کا Chapter ہے۔وہ کہتے ہیں ایک تو آپ انہیں انکم دیتے ہیں' آمدنی ان کی ہوتی ہے کہ یہ کام کیا اس کے عوض میں یہ دیا' دس روپے دیئے' بیس روپے دیئے' کھانے کو دیا یا کپڑا دیا۔

اکنامک جسٹس کے علاوہ میرٹ کی بنیاد پر تحسینی جذبات کی اہمیت اور اس کی قدر ومنزلت

ان کے ہاں ایک چیز ہے وہ کہتے ہیں اُسے Psychic Income (نفسیاتی آمدنی) اس شخص کی۔یہ Psychic Income کیا ہے؟ Appreciation: کسی کے میرٹ کی کسی کے اچھے کام کی تحسین Praise , Appreciation۔یعنی انہوں نے جو افرادِ معاشرہ کو Due ہونے والی چیزیں واجب ہوتی ہیں' جو ان کو ملنی چاہئیں۔اس کی اس کے لیے قانون اور قاعدے

انہوں نے مرتب کیے ہیں۔ وہ یہ بتا رہے ہیں کہ جب ہم Equality کہتے ہیں مساوات کہتے ہیں تو یہاں مساوات آپ نہیں قائم رکھ سکتے' میرٹ کے لحاظ سے آپ Appreciation کریں گے اور Appreciation جہاں نہیں ہوتی وہاں وہ کہتے ہیں کہ Social Justice نہیں ہو رہی۔ اور وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس کو بھی Justicable ہونا چاہیے یعنی عدالت میں جا کے وہ کنڈی کھٹکھٹائے اس کے متعلق۔

انسان کا مرتبہ ومقام اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی بنیاد پر ہی متعین ہوگا

دورِ موجود میں پتہ چلا کہ Appreciation کتنی بنیادی Value ہے' کتنی بنیادی قیمت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرٹ اصل میں Creative Effort کو کہتے ہیں میرٹ' تخلیقی استطاعت پیدا کرنا' یہ تو خدا کی صفت کے اندر شریک ہونے والی بات ہے۔ یاد رکھیے تخلیق یعنی پیدا کرنا' کچھ Create کرنا حیوان نہیں کر سکتا۔ حیوان کی سطح پر صرف تولید ہوتی ہے Procreation ہوتا ہے' نر اور مادہ کے اختلاط سے بچہ پیدا ہوتا ہے Create نہیں کچھ کر سکتا۔ Create کرنے میں تو صرف اوپر خالق ہے' خدا ہے' اور صرف آسمان ہے۔ اور اسی لیے خدا تعالیٰ نے اپنی اور صفات کو چھوڑ کے' تخلیق کی صفت میں یہ کہا ہے کہ وہ احسن الخالقین ہے۔ خالقین میں سے حسین ترین تخلیق کرنے والا۔ تو وہ خالقین کو مانتا ہے' ایک سے زیادہ خالق۔ اور یہ خالق انسان ہو سکتا ہے اور خدا کی صفتِ تخلیق میں یہ مشارکت ہے۔ اسی طرح سے رفیق بنتا ہے خدا کا' رفیقِ ادنیٰ ہی سہی۔ اسی لیے تخلیقی قوت Creative قوت' انسانیت کی خصوصیت ہے اور یہ انسانیت کی Definition ہے۔ جہاں یہ چیز نہیں سمجھ لیجیے گا کہ وہ فرد یا وہ قوم انسانیت کی سطح کے اوپر نہیں آئے۔ اور اس کے لیے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
نزد ما جز کافر و زندیق نیست

Creative Effort اگر کسی کے اندر نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ وہ مومن ہونا تو ایک طرف رہا 'بآدم نہ رسیدی' خدا چہ می جوئی' یہ تو صفِ میں بھی شامل نہیں۔ وہ کہتا ہے ہمارے نزدیک کافر و زندیق وہ ہے کہ جس کے اندر قوتِ تخلیق نہیں ہے۔

کسی کے تخلیقی جذبے کی تعریف یا حوصلہ افزائی کرنے کا عمل انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے

میں کہہ رہا تھا کہ Creative Effort کے اوپر کسی کی Appreciation۔ اس Appreciation سے ایک تو اس کے اندر حوصلہ افزائی ہوتی ہے وہ اور بڑھتا ہے اپنی تخلیق کے Effort میں۔ اور ایک جو Appreciate کرنے والا ہے جب وہ اس کام

کو پسند کرتا ہے تو بہر حال اس کے دل میں بھی یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ مجھے بھی یہ کرنا چاہیے۔ گویا اس سے تحریک پیدا ہوتی ہے معاشرے کے دوسرے افراد جو دیکھتے ہیں کہ اس تخلیق کے بعد یا اس میرٹ کے بعد اتنی Appreciation اس کی ہوئی ہے ان کے دل میں بھی یہ ذوق پیدا ہوتا ہے یہ شوق پیدا ہوتا ہے تخلیق کا۔ یوں آیا عام الفاظ میں کہ اچھے کاموں کے لیے کسی کی تعریف۔ قرآنِ کریم نے اس کو ایک بنیادی چیز قرار دیا ہے۔ اس کے لیے لفظ ہے ص ل و یا صَل کے بعد علیٰ کا آنا۔ اسی سورۃ میں چند آیات آگے جا کر کہا کہ یہ مومن تمہارے پاس، تمہاری جماعت کے افراد خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (9:103) عطیے لے کے آتے ہیں Contribution اپنا اپنا لے کے تمہارے پاس آتے ہیں۔ مومن ہیں جو کوئی معاوضہ نہیں چاہتے، کوئی صلہ نہیں چاہتے یہ ان کا ایمان ہے، ان کا فریضۂ زندگی ہے جس کو وہ ادا کر رہے ہیں۔ لیکن وہ جب لے کے آتے ہیں تو کہا تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا (9:103) کہ اس کے ذریعے سے ان کی ذات کی نشوونما کرو جتنی چیزیں اس کے راستے میں حائل ہیں ان کو الگ کرو، تطہیر کے یہ معنی ہوتے ہیں۔

تزکیہ نفس کا لغوی اور قرآنی مفہوم بڑا غور طلب ہے

وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا (9:103) عجیب چیز ہے کس کس لفظ پہ آؤں، موضوع سے دور نکل جاؤں گا۔ جو تزکیہ نفس آج کل آپ کی خلوت گاہوں میں اور مزاروں میں اور مجاوروں کے ہاں ہوتا ہے چیز کیا ہے قرآن کے ہاں۔ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا (9:103) یہ جو لا رہے ہیں Contribution اس کے ذریعے سے ان کا تزکیۂ نفس کرو ان کی ذات کو سامانِ نشوونما بہم پہنچاؤ۔ ایک تو بِهَا تو وہ بہر حال مال لاتے تھے Contribution کے لیے عطیات لاتے تھے ان کے ذریعے سے کرو۔ اور دوسرا اور ذریعہ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا (9:103) کا، وہ کیا ہے؟ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (9:103)۔ حالانکہ یہ جماعت تو وہ ہے جو اپنا سب کچھ بیچے ہوئے ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ (9:111) انہوں نے تو بیچ دیا ہوا ہے اپنا مال و جان۔ تو جس نے بیچ دیا ہوا ہے، یہ بیچ دینے والا اگر وہ جنس لا کے دیدے کہ لیجیے صاحب اپنی چیز جو آپ نے خریدی تھی تو اس کی Appreciation کس لیے؟ نہیں صاحب! یہاں تو بات ہی اور ہے۔

کسی کی طرف سے حوصلہ افزائی کے چند بول انسان کے قلبی اضطراب کو سکون فراہم کرتے ہیں

یہ جو ہے تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (9:103) گویا اس سے انسان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ دوسری چیز ہے صَلِّ عَلَيْهِمْ شاباش بھی دو ان کو، حوصلہ افزائی ان کی کرو۔ اس کے معنی پروان چڑھانا بھی ہوتا ہے۔ یہی تُزَكِّيْهِمْ بِهَا (9:103) جو ہے اس کے معنی کامیاب بنانا بھی ہوتا ہے۔ وہ جو پروجیکٹ لیے ہوئے ہے، جو کچھ کر رہا ہے، آپ اس کی کامیابی میں Indirectly Contribute کر رہے ہیں اس کی Appreciation کے ساتھ، Moral Support اس کو آپ دے رہے ہیں۔ اس معنی

میں بھی صل علیہ ہوجاتے ہیں، کسی کے پروجیکٹ میں کامیابی کے لیے کچھ کرنا، کسی کو پروان چڑھانا، اس کی حوصلہ افزائی کرنا۔ کیوں یہ کرو؟ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ (9:103) تیری Appreciation تیرے تحسین کے الفاظ، تیری طرف سے یہ حوصلہ افزائی ان کے قلبی اضطراب کو دور کرکے ایک سکینت پیدا کردے گی ان میں۔ اور ظاہر ہے کہ خاص طور پہ تخلیقی امور کے لیے تو دل کا سکون اور اطمینان نہایت ضروری ہے۔ ذرا سا Mind ڈسٹرب ہوجائے، تھوڑا سا بھی قلب میں ہیجان اور پریشانی ہوجائے، تخلیقی فکر ہی مفقود ہوجاتی ہے۔ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ (9:103)۔ رسول اللہ ﷺ سے تاکید کی جارہی ہے۔ یہ چیز تھی صل علیہ کی۔ ذرا آگے چل کے یہ کہا ہے کہ یہ جو آتے ہیں وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ (9:99) کہ یہ جو کچھ لاتے ہیں دینے کے لیے، اس سے مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ خدا کے ہاں ان کے مدارج بلند ہوں۔ یاد رکھیے قرب جسے کہتے ہیں، یہ مقربین بارگاہِ الٰہی جنہیں اب ہم کہتے ہیں، وہ جو ہمارے ہاں کے پست ترین ہوتے ہیں خاک میں ملے ہوئے۔ مقربین قرب کے معنی درجات کا بلند ہونا ہوتا ہے۔ کہا کہ مقصد ان کا کچھ معاوضہ لینا نہیں ہے یہ تو خدا کی طرف سے جو انسان کے مدارج بلند ہوتے ہیں، مقصد ان کا یہ ہے۔ اور دوسرا صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ رسولؐ سے Appreciation لینا۔ یہی جو Appreciation خدا کے ہاں سے ملتی ہے۔ آپ دیکھئے کونسا مقام ہے، کونسے اعمال ہیں ان کو Appreciation مل رہی ہے۔

منزل کے حصول کے دوران پیش آنے والی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا طریق اور انا للہ وانا الیہ راجعون کا حقیقی مفہوم

وَ لَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ (2:155) ایسے مواقع آئیں گے یہ جو جدوجہد ہوگی، معرکہ آرائیاں ہونگی، حق و باطل کی۔ اس میں تمہیں خوف ہوگا، بھوک بھی ہوگی، مال کا نقصان بھی ہوگا، جانوں کا نقصان بھی ہوگا، پھلوں کا نقصان بھی ہوگا، محاصل کا نقصان ہوگا، ہر قسم کی مضرت رسانیاں ہونگی، خوف ہوگا یہ سب کچھ ہوگا۔ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ (2:155) لیکن عمدہ نتائج کی خوش خبریاں دیدے ان لوگوں کو جو نہایت استقامت سے ایسے مقامات میں الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَةٌ (2:156) یہ پہلے بھی آچکا ہے کہ ہمارے ہاں تو مصیبت صرف مصیبت ہی کے لیے لفظ بولا جاتا ہے، عربی زبان میں یہ صرف مصیبت کے لیے نہیں آتا، ہر واقعہ کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ جب بھی اس قسم کا کوئی واقعہ ان کے سامنے آتا ہے، ان کو اس میں سے گذرنا پڑتا ہے، کوئی مہم سامنے آتی ہے، خوف ہوتا ہے، جان کا زیاں ہوتا ہے، مال کے نقصان کا احتمال ہوتا ہے۔ ان صعوبات اور مشکلات میں ان کی کیفیت یہ ہے کہ استقامت سے جم کے کھڑے ہوجاتے ہیں اور وہ کہتے یہ ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ

راجِعُوْنَ (2:156)۔ پھر اس کی تشریح میں چلا جاؤ نگا تو بات دور چلی جائے گی۔

زبردت مشکلات کے باوجود حصول منزل کے لیے ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے رہنا' یہ ہے راجعون کا مفہوم اور سلّموا تسلیما کے فریضہ کی عملی شکل کا نتیجہ

ہمارے ہاں تو آپ کو معلوم ہے انتہائی مظلومیت کا عالم کہ جہاں کچھ نہ کیا جا سکے اور انتہائی پریشاں کن مصیبت کی خبر' عام طور پہ موت کی اطلاع پہ ہوتا ہے کہ فلاں مر گیا' انا للہ وانا الیہ راجعون' چل بھئی۔ کتنی عظیم چیز کہہ کیا رہا ہے کہ اتنی اتنی مشکلات اور مصائب اور صعوبات کا سامنا ہوگا' اس قدر جاں گسل معرکہ آرائیاں ہونگی' وہاں یہ لوگ ہیں جن کو خوش خبریاں دیدے نیک انجام کی کہ جن کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ایسے موقعہ کے اوپر وہ جم کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور زبان سے یہ کہتے ہیں۔ اگر ہمارے معنوں میں ہوانا للہ تو آپ دیکھئے اس موقعہ پر ان کی زبان سے انا للہ یوں نکلے گا؟ ایسا موقعہ جب سامنے آئے کہ ہر قسم کا خوف طاری ہو' مصائب طاری ہوتے ہیں' یہ کہتے ہیں' کیا ڈراتے ہو ہم نے اپنے آپ کو خدا کے لیے وقف کر دیا ہے' ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھے گا تم ہمارے راستے میں حائل نہیں ہو سکتے اِلَیۡهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) گیا میں اس کی طرف۔ جیسے کہتے ہیں نا ''اوئے آمائی داجایا کوئی ہیگا تے' میں چلیا جے اوہدے ول''۔ یہ ہے اس کا ترجمہ۔

بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

ایسے معرکہ آرائیوں میں اتنے بڑے دشمن کھڑے ہیں' وہ کہتا ہے کہ کیوں ڈراتے ہو ہمیں' تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ہماری پوزیشن کیا ہے اِنَّـا لِلّٰهِ (2:156) ہم تو خدا کے ہو چکے ہیں' یہاں تو اپنا ہے ہی کچھ نہیں' اس لیے تم راستے میں ہمیں روک رہے ہو۔ تمہارے روکنے سے ہم رک جائیں گے؟ تم راستہ روک کے کھڑے ہو گئے کہ ہم آگے نہ بڑھ پائیں اِنَّآ اِلَیۡهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) میں چلا اس کی طرف۔ اور یہ مقام ہے جہاں کہا ہے اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ (2:157) دیکھا آپ نے صلوٰت کہاں آیا ہے۔ یہ ہیں وہ کہ ایسے مقامات پہ ان کی طرف سے یہ ہوتا ہے کہ کون روک سکتا ہے ہمیں صاحب' لو میں چلا۔ اِدھر یہ کیفیت ان کی اور اُدھر یہ چیز کہ یہ ہیں جن کے اوپر خدا کی تحسین و تبریک کے پھولوں کے ڈونگرے برس رہے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ رَحۡمَةٌ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ (2:157) آؤ تم ڈھونڈتے ہو کہ دنیا میں صحیح راستے کے اوپر چلنے والے کون ہیں' یہ ہیں صحیح راستے پہ چلنے والے۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ (2:157) موضوع کی بات میں یہ کہہ رہا تھا۔

خدائے علیم وخبیر ورحیم وکریم کی طرف سے رسول اکرم ﷺ کو صحابہ کے لیے حوصلہ افزائی کی تاکید اور اس کی اہمیت

آپ نے دیکھا صلوٰت علیہ ہے۔ یہ ہے وہ صلوٰت ۔ یہاں صلوٰت الرسول کہا تھا کہ یہاں یہ لے کے آتے ہیں اپنے Contribution اے رسول ان کی ذرا حوصلہ افزائی بھی کیا کرو Appreciation بھی کیا کرو۔ وہ Psychic Income جسے اُس نے کہا تھا Psychological Income وہ بھی ساتھ ان کے ہونی چاہیے' بڑا فائدہ اس کا ہوتا ہے۔ کسی کے میرٹ کی Appreciation کرنا عزیزانِ من! بڑی چیز ہے دنیا کے اندر۔ یہ کیا کرو۔ میں کہتا ہوں معاشرے میں اگر اور خوبیاں نہ تھیں' اتنی سی ایک بات آ جائے کہ کسی کے اچھے کام کے اوپر اس کی تعریف ہی کم از کم کر دی جائے' آپ دیکھئے کتنی خوشگواریاں ہو جاتی ہیں اس میں۔ کیفیت یہاں یہ ہے کہ کسی کے خلاف باتیں کرنی ہوں تو وہ گھنٹوں کیے جائے گا' آپ بھی بڑا مزہ لے کے سنتے چلے گئے۔ اچھا جی! ہاں! ہمیں کیا وہ ہے ایسا ہی۔ بڑے مزے میں سن رہے ہیں۔ اور اگر کہیں کسی کے متعلق تعریف سے کہہ دیا کہ صاحب وہ شخص تو بڑا دیانتدار ہے' کہنے لگے ہاں بظاہر تو ایسا نظر آتا ہے او میاں پتہ نہیں ''اسپغول تے وچوں نہ پھول' پتہ نہیں مگروں کی نکلدے نیں''۔ یعنی اس قدر ہمارے سینے میں بغض اور حسد اور کینہ اور نفرت آ چکی ہوئی ہے ہم کسی کی اچھی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لیکن وہاں تو خدا اور اس کا رسول ہے' خدا تو تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی بھر کے مشن کے خدوخال کے پیشِ نظر قرآن حکیم کی طرف سے تحسین افروز الفاظ کا ذکر

آپ دیکھتے ہیں کس طرح جھوم کے کہا ہے کہ تم کیا روک سکتے ہو اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) فوراً اوپر سے آواز آئی اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ رَحۡمَةٌ (2:157) اور یہی ہے وہ صلوٰت کے ساتھ علیٰ جو وہ ہماری مشہور آیت اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) اللہ اور اس کے ملائکہ' اب وہی لفظ آ گیا یصلون علی النبی' وہاں تو یہ تھا کہ نبی سے کہا تھا کہ وہ جو مؤمنین آتے ہیں Contributions لے کے ان کو ذرا شاباش دیا کرو۔ یہاں اللہ اور اس کے فرشتے جو ترجمہ کیا جاتا ہے ملائکہ کا یہ یصلون علی النبی' نبی کے ساتھ یہ چیز کرتے ہیں یہی جو میں نے ابھی کہا ہے۔ ذرا نبی کا مقام تو دیکھئے یعنی وہ جس مشن کو لے کے اٹھا ہے' عرب اور عجم کے ساتھ بیک وقت جنگ کا اعلان' ساری دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ تھا' جتنے بھی نظام اُس وقت دنیا میں موجود تھے' ہر

نظام کو چیلنج۔ کسی سے Compromise نہیں، مفاہمت نہیں، مصالحت نہیں، جھکنا نہیں، کہیں سودے بازی نہیں، اور قدم قدم کے اوپر مشکلات کا ہجوم اور اندوہ مصائب کا۔ اور اس میں یہ شخص جو انا اول المسلمین کہتا ہے، اکیلا اعلان کرنے والا۔ اپنوں نے اپنے شہر سے نکال دیا، گھر بار سے نکال دیا۔

چودہ سو سال ہوگئے ہیں یہ گاڑی جس طرح انجن کے بغیر دھکا لگنے سے چلا کرتی ہے نا، بغیر انجن کے یہ گاڑی چلے آ رہی ہے اس وقت تک، اتنا عظیم تھا وہ دھکا۔ اللہ اور اس کے ملائکہ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ اور اس کے ساتھ کہا یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ (33:56) اے جماعتِ مؤمنین تم بھی یہی کچھ کرو۔ اب صلوا علیہ کا ترجمہ آپ کے سامنے آ گیا Appreciation کرنا حوصلہ افزائی کرنا، پروان چڑھانا، کامیاب بنانا۔ خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید اُسے حاصل ہے، وہ اس کے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے انداز سے تائید کر رہے ہیں۔ اے جماعتِ مؤمنین تم بھی اس کی اسی طرح سے عملاً Appreciation کرو حوصلہ افزائی کرو، ساتھ دو، معیت اس کی ہو، کامیاب بناؤ پروان چڑھاؤ۔ اس کا طریقہ کیا ہے؟ قرآن ایسے نہیں چھوڑ دیتا بات کو۔ صَلُّوْا عَلَیْهِ (33:56) کا ترجمہ مفہوم عملاً طریقہ بتا دیا کہ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) پوری پوری اطاعت کرو جو حق ہے اطاعت کرنے کا۔ یہ ہوگی Appreciation، اس سے بڑی Appreciation کیا ہے کہ آپ کچھ کر رہے ہوں، کوئی دوسرا آپ کو کہتا ہے کہ آپ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں تو یہی ہوتا ہے نا کہ بھئی تم بھی کرو یہی کچھ۔ عملاً Appreciation یا حوصلہ افزائی یہ ہے کہ تم بھی پھر کرو، ساتھ دو چلو۔ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56)۔

سَلِّمو اتسلیماً کی عملی شکل صل علیٰ کے انداز میں اطاعت اختیار کرنا ہوگی

دو لفظوں میں بات بتا دی کہ رسول اللہ ﷺ کے اوپر یہ صل علیٰ کا ہم نے یہ کہا ہے، یہ کیا ہے؟ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) پوری پوری اطاعت کرو اس رسول کی، پھر دیکھو اس کا مشن کتنی جلدی کامیاب ہوتا ہے۔ اُدھر سے ہم اور ملائکہ وہ حوصلہ افزائی کر رہے ہیں، ہمارے قوانین کی نصرتیں اس کے ساتھ ہیں۔ جماعتِ مؤمنین تم بھی اس کی حوصلہ افزائی کرو، اس کے مشن کا میاب بنانے میں عملاً کوشش کرو اور تمہاری کوشش یہ ہے سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56)۔ اور یہ جو سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) ہے عزیزانِ من! انہی معنوں انہی لفظوں کے اندر دوسرے مقام پہ وہ آیا ہے کہ فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (4:65) تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اپنے ہر معاملے میں تمہیں اپنا حکم مقرر نہ کریں اور اس کے بعد کیفیت یہ ہو کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی تیرے فیصلے کے خلاف گرانی محسوس نہ کریں۔

اسے کہتے ہیں اطاعت کرنا۔ یہ قرآن نے جو کہا ہے۔ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) یوں اطاعت کرو اس کی کہ دل کی گہرائیوں میں اس کے خلاف گرانی محسوس نہ ہونے پائے۔ یہ ہے صلوا علیہ کا ترجمہ۔ ایک اور آیت ہے اسی سورۃ میں' وہاں کہا ہے اللہ اور اس کے ملائکہ تم پر یصلی علیکم' میں ابھی ترجمہ نہیں کر رہا اس لفظ کا۔ یہی الفاظ آئے ہیں هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43) خدا اور اس کے ملائکہ۔

انسان کے حسنِ عمل کو خدا اور اس کی قوتیں بھی Appreciation کرتی ہیں

اے مسلمانو اے جماعتِ مؤمنین هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ (33:43) وہی ہیں الفاظ۔ تمہارا مشن جس میں تم اس کا ساتھ دے رہے ہو جو کچھ تم قربانیاں کر رہے ہو اس کی Appreciation خدا بھی کرتا ہے' اس کی کائناتی قوتیں بھی کرتی ہیں۔ اس کے بعد کیا کہا ہے؟ وہاں کہا تھا کہ تم یہ کرو۔ یہاں یہ کہا ہے کہ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (33:43) اور اس لیے وہ کرتا ہے تاکہ تمہیں زندگی کی تاریکیوں سے نکال کے روشنی کی طرف لے جائے۔ خدا کی Appreciation یا حوصلہ افزائی یہ ہوئی۔

یصلون علی النبی اور لفظ صلوٰۃ کے مروجہ تراجم کی نوعیت

کہہ میں یہ رہا تھا کہ یہ وہاں بھی یہی الفاظ ہیں' یہاں بھی یہی الفاظ ہیں۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ پھر ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے۔

خدا اور اس کے ملائکہ یصلون علی النبی کا ترجمہ ہو گیا درود بھیجتے ہیں رسول ﷺ پر۔ صلوٰۃ کا ترجمہ نماز جو عربی زبان کا لفظ نہیں ہے' وہ پرانی پہلوی زبان کا لفظ ہے' مجوسیوں کے ہاں استعمال ہوتا تھا عبادت کے لیے۔ درود عربی زبان کا لفظ نہیں ہے' پرانی پہلوی زبان کا لفظ ہے' مجوسیوں کے ہاں استعمال ہوتا تھا دعاؤں کے لیے۔ مجوسی جنہیں اب پارسی کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہی عربی زبان کا نہیں ہے قرآن میں تو خیر آ ہی کیا سکتا تھا۔ درود بھیجتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ یہ کتنا بڑا کرنے کا کام تھا یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (6:65) یعنی پوری پوری اطاعت کرنی تھی یہ اتنا بڑا فریضہ' اتنا بڑا یہ منصب' یہ اتنی بڑی ڈیوٹی تھی۔ یہ تھا جو کچھ کہا گیا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56)۔

قرآن حکیم کے مروجہ تراجم ملت اسلامیہ کے ساتھ بہت بڑی سازش' اطاعت کا یہ لفظ درود وسلام میں بدل گیا

میں نے عرض کیا ہے عزیزانِ من! جو سازشیں ہمارے ساتھ ہوئی ہیں بنیادی سازش یہ ترجمے ہیں جو آپ کے ہاں ہوئے ہیں۔

اللہ اوراس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پرٗ اے جماعتِ مؤمنین! اے مسلمانو تم بھی درود بھیجو اپنے رسول کے اوپر۔ یہ تو ہو گیا صلوا علیہ۔ اب آیت ہے سلموا تسلیمًا بات صاف تھی کہ وہ لفظ ہے اطاعت کرو جیسا کہ اطاعت کرنے کا حق ہے۔ سلموا تسلیمًا سلام پڑھو اس کے ساتھ درود و سلام۔ کتنا آسان ہو گیا مرحلہ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) درود و سلام اور اس کے بعد پھر اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ اور پھر اس کی تسبیحاں اور پھر مختلف درود تاج اور درود لکھی اور درود ہزارا اور پھر اس کے بعد ہزار دفعہ درودٗ لاکھ دفعہ درودٗ عشاء کی نماز کے بعد بیٹھے ہوئے ہیںٗ درود پڑھ رہے ہیں۔ درود بھیج رہے ہیں یسلموا تسلیما درود و سلام بھیج رہے ہیں۔ وہاں بھی کہیں پکڑے نہ جائیں کہ بابا سلموا تسلیما ہے اس کو بتاؤ کیا کریں۔ وہ تو اطاعت ہے کہ جیسا حق ہے اطاعت کرنے کا اطاعت کرو۔ وہاں سلموا تسلیماً کے معنی کیے سلام بھیجو۔ اس کے بعد یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک یا حبیب سلام علیک صلوٰۃ اللہ علیک۔ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ من! کتنا عظیم کام تھا۔ یہ ہے چیز جسے کہا گیا ہے جہاد سے جی چراناٗ اعراض کی راہیں برتناٗ گریز کی راہیں نکالنا۔ اس سے بڑا گریز اور اعراض کیا ہوگا کہ جہاں یہ کہا گیا تھا خدا نے کہ ہر مصیبت اور ہر مشقت طلب معاملے کے سامنے وہ ڈٹ کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آؤ کون ہمیں روک سکتا ہے۔ اس کی بجائے کہا یہ کہ بیٹھ جاؤ گوشوں میںٗ کونوں میں سوا سوا لاکھ کی تسبیح لے لو اور درود بھیجا کرو۔ درود بھیج رہے ہیں صاحب۔ کتنا عظیم کرنے کا کامٗ جسے اس طرح سے ورغلا دیا۔ اور پھر اس قدر جاگزیں ہو جاتی ہیں یہ چیزیںٗ یعنی تصور میں بھی نہیں آ سکتا اگر یہ کہا جائے کہ بھئی یہ درودٗ یہ بات نہیں ہے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ درود شریف کے تو پھر فضائل آپ کو معلوم ہیں جتنے بھی ہیں۔ اتنا جڑ پکڑ گیا ہے۔

علامہ پرویز پر لگائے گئے الزامات کی تردید

مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ میں آپ سے کہہ رہا ہوں یہی باتیں باہر جا کے آپ کریں گے تو کیا کچھ میرے خلاف نہیں ہوگا کہ صاحب وہ تو درود کا بھی منکر ہو گیاٗ لو قیامت آ گئی۔ آپ جانتے ہیں کسی سے بھی یہ کہہ دیجئےٗ اس سے بڑا اشتعال انگیز اور ہوتا کیا ہے کہ صاحب رسول کا منکر تو پہلے تھا ہی اب درود کا بھی منکر ہو گیا۔ عزیزانِ من! بات ساری یہ ہے۔ وہ تو صلوٰۃ وہاں آیا تھا کہ ہر مشکل معاملے میں اس خدائی مشن کو آگے بڑھانے کے لیےٗ اس کے استحکام اور بقاء کے لیےٗ جتنی جانگسل مسائل مشکلات آئیں مردانہ وار اس کا مقابلہ کیا جائے۔ ہتھیلی پہ سر رکھا ہوا ہو اور کفن بدوش میدانِ جنگ میں جا رہا ہو۔ یہ تھا درود و سلام جسے آپ کہتے ہیں۔ یہ کرنا ہے۔ میں درود کا منکر نہیں میں سلام کا منکر نہیں۔

قرآن حکیم میں صلوٰۃ‘ اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جب کہ یسلموا تسلیماً تو انتہائی درجے کی اطاعت ہے

عزیزانِ من! میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ کرو جو کہا گیا ہے۔ کیوں گریز کی راہیں نکالتے ہو‘ کیوں فریب دیتے ہو اپنے آپ کو بھی اور قوم کو بھی۔ کہو کہ اطاعت ہے اس کے معنی۔ اطاعت یسلموا تسلیما انتہائی درجے کی‘ حق ہے جو اطاعت کرنے کا۔ یہ ہیں معنی‘ میں یہ معنی عرض کرر ہا ہوں آپ کے سامنے۔ سلموا تسلیما۔ یہ ہے صلوٰۃ جسے آپ درود بھیجنا کہتے ہیں۔ یہ بھیجنا نہیں ہے‘ یہ کرنا ہے کچھ۔ پھر قرآنِ کریم نے یہ بتا دیا جماعتِ مؤمنین کے متعلق کہ کرتے کیا ہیں ان کا فریضہ دیکھئے قرآن کس طرح سے اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنے والوں کی کیفیت یہ ہے فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ (7:157) جو ایمان لانے والے ہیں اس رسول پہ‘ خدا کی کتاب پہ ان کی کیفیت کیا ہے عَزَّرُوۡهُ وَ نَصَرُوۡهُ (7:157) یہ ہے صاحب درود‘ وہ اس رسول کو تقویت پہنچاتے ہیں‘ اس کی مدد کرتے ہیں‘ اس کے مشن میں مدد کرتے ہیں۔ کیسے کرتے ہیں؟ وَ اتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِيۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (7:157) یعنی اس قرآن کا اتباع کرتے ہیں جس کو ہم نے نازل کیا ہے اس کے ساتھ۔ یہ ہے جو کچھ بتایا گیا ہے‘ یہ ہے رسول اللہ ﷺ کے مشن کی Appreciation‘ حضور ﷺ کی مجاہدانہ کاوشوں کی تحسین و تبریک کہ اطاعت کی جائے جو اطاعت کا حق ہے۔ یعنی وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِيۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (7:157) یہ ہیں فلاح پانے والے جن کی کھیتیاں پروان چڑھا کرتی ہیں۔ یہ ہے صلوا علیہ کا مفہوم۔ یہ کیا جائے گا نَصَرُوۡهُ اس کی مدد کی جائے گی۔ میں نے کہا تھا نا عربی زبان میں اس کے معنی پروان چڑھانا ہوتا ہے‘ کامیاب بنانا کسی کے مشن کو۔ ”نصر“ وہ کہا ہے کہ وہ اس کی مدد کرتے ہیں۔ کس طرح سے؟ حضور ﷺ کے زمانے کے لوگ تھے تو اس طرح ساتھ مل کے‘ ان مہموں میں جاتے تھے۔ بعد والے کیا کرتے ہیں؟ وَ اتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِيۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ (7:157) وہ روشنی جو اس کے ساتھ ہم نے نازل کی ہے یعنی قرآن مجید‘ وہ اس کا اتباع کرتے ہیں یوں ان کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔

خدا اور ملائکہ جماعت مومنین پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں

یہ ہے صلوٰۃ یہاں جو کہا تھا کہ خدا اور اس کے ملائکہ تم پر بھی صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ اب وہ بھیجنے کا لفظ کہنا پڑ رہا ہے اور لفظ ہے ہی نہیں‘ دیکھئے نا زبان میں کیا کر دیا جاتا ہے‘ آپ کے پاس لفظ ہی نہیں ہے صلوٰۃ کے ساتھ کچھ اور کہنے کے لیے۔ صلوٰۃ بھیجنا ہی رہ گیا ہے ہمارے ہاں اردو میں‘ درود بھیجنا ہی لفظ رہ گیا ہے درود کرنا لفظ نہیں ہے‘ صلوٰۃ کرنا لفظ نہیں ہے آپ کے ہاں زبان میں۔ یہ ہوتی ہیں

سازشیں۔تو یہ تو کوئی صلوٰۃ کرنا تھا۔خدا نے کہا ہے کہ خدا اور اس کے ملائکہ اے جماعتِ مؤمنین! اِنَّ اللّٰـهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ (33:56) هُوَ الَّـذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ (33:43) کا ہے کے لیے یہ کہا تھالِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (33:43) تا کہ تمہیں زندگی کی تاریکیوں سے روشنی کے طرف لے آئے۔ بڑی جامع چیز ہے۔ یہاں کہا کہ وہ اتباع کرتے ہیں خدا کی اس کتاب کا جو اُنہیں ظلمات سے نور کی طرف لے آتا ہے۔نور کا اتباع کرتے ہیں۔

نزولِ قرآن کے مقصد کی وضاحت کے سلسلہ میں داستانِ بنی اسرائیل کی مثال

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ (14:1) یہ قرآن نازل کیا تیری طرف اے رسول لِتُخْرِجَ النَّـاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (14:1) تا کہ تو نوعِ انسانی کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔یہی الفاظ ہیں۔اور اس کی سب سے بڑی محسوس تاریخی مثال کونسی دی۔وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ (14:6) صاحبِ ضربِ کلیم اور فرعون کی کشمکش کا ذکر آ گے آتا ہے۔قوموں کا ظلمات سے نور کی طرف نکل کے جانا یہ کیا ہے؟ اس کی تاریخی شہادت ہے۔فرعون کے عہد کی تاریکیاں کیا تھیں؟ فرعون کا استبدادِ ملوکیت جو کہتا تھا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی (79:24) ہر مستبد نظام کا نمائندہ فرعون ہے۔ مذہبی پیشوائیت جس کا نمائندہ ہامان اور اس کے جنود ہیں' مذہبی پیشوائیت اور ان کا تمام لاؤلشکر اور نظامِ سرمایہ داری کا نمائندہ قارون۔ تینوں ایک جگہ جمع تھے اور ان کے نیچے یہ بنی اسرائیل بیچاری محکوم اور متبوع تڑپتی پھڑکتی مضطرب۔ان تاریکیوں سے نکال کے حضرتِ موسیٰؑ ان کو خدا کے قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے لے گئے تھے۔ یہاں ذکر آیا ہے کہ خدا ان کو ظلمات سے نور کی طرف لے جائے۔ کہا ہے وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰهِ (14:5) اے رسول ان کو اللہ کے دنوں کی یاد دلایا کرو۔ اللہ کے دن کہا ہے حالانکہ ہر دن اللہ کا ہے۔ یہ دن جس میں اس قسم کا کوئی معرکہ سرزد ہو جائے حق اور باطل کا' اُسے خدا نے اپنے دن کہا ہے۔ یہ ہے ظلمات سے نور کی طرف لے جانا۔

سلموا تسلیما جیسے عظیم پروگرام کا ماحصل تو اصل طلوع آفتاب کی نوید ہے

جسے آپ کہتے ہیں درود بھیجنا یہ تو کوئی بڑا عظیم پروگرام تھا جسے رسول لے کے اٹھا اور اس نے اس حسن وخوبی سے اسے سرانجام دیا کہ بے ساختہ پکار اٹھا خدا اور اس کے ملائکہ' ولولہ انگیزی میں' مسرت آمیزی میں یہ نعرہ بلند ہوا اُدھر سے کہ اِنَّ اللّٰـهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) کیا بات ہے تمہاری' کمال کر کے دکھا دیا تم نے۔ یہ ہے وہ چیز۔اے جماعتِ مؤمنین ساتھ دو اس رسول کا جو اتنا کچھ کر کے بتاتا ہے۔ساتھ دینے کے معنی یہ ہیں سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) پوری پوری اطاعت کرو تا کہ یہ تمہیں ظلمات سے نور کی طرف لے جائے' تمہیں ہی نہیں الناس کو۔ اور اگر تم ایسا کرو تو دیکھو اللہ اور اس کے ملائکہ تم پہ بھی یہی صلوٰۃ' تمہاری بھی

Appreciation کریں گے، تمہاری حوصلہ افزائی کریں گے، تمہاری تقویت کا سامان بہم پہنچائیں گے، پروان چڑھائیں گے تمہارے اس نظام کو، تمہارے اس مشن کو۔ یہ ہے عزیزانِ من! ''صل'' کے بعد جب ''علیٰ'' آتا ہے۔ اور پھر جس شکل میں بھی ہمارے ہاں یہ چیز ہے درود بھیجنے کی جو شکل ہے وہ اگرچہ بخاری کی حدیث ہے جب یہ آیت نازل ہوئی۔

درود کے سلسلہ میں بخاری کی ایک حدیث کی نوعیت اور پھر اللھم صل علیٰ کے الفاظ کا تجزیہ

آپ دیکھئے کہاں بات پہنچا دیتے ہیں۔ تو صحابہؓ نے خود رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یہ جو ہم سے کہا گیا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ (33:56) تو ہم یہ کس طرح آپ پر درود بھیجیں۔ گویا یہ صحابہ بھی نہیں جانتے تھے کہ صل علیٰ کے معنی کیا ہیں۔ اور جو آگے کہہ دیا سلموا تسلیمًا اس کا مطلب کیا ہے۔ اور وضع کردی ایک روایت اُنہوں نے پوچھا کہ ہم یہ کیسے کریں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللھم صل علیٰ محمد و علیٰ اٰل محمدؐ یہ کہا کرو تم۔ کبھی سوچا بھی ہے کسی نے یہ کیا چیز ہوتی ہے۔ اللھم صل علیٰ کے معنی ہوتا ہے یا اللہ تو درود بھیج محمد کے اوپر۔ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) کہ خدا اور اس کے فرشتے یہ کر رہے ہیں۔ اور وہ کہہ رہا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ (33:56) او مسلمانو تم بھی یہ کرو۔ مسلمان کیا کہتا ہے؟ اللھم صل علیٰ محمد۔ وہ کہتا ہے اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ (33:56) اِنَّ ہے وہاں، او بابا پکی بات ہے، ہم اور ہمارے فرشتے کر رہے ہیں، او تم کرو۔ یہ کہتے ہیں اللھم صل علیٰ محمد ایک دفعہ نہیں سوا لاکھ مرتبہ کہتے ہیں ساری ساری رات کہتے ہیں۔

مروّجہ تراجم سے باہر نکلے بغیر قرآن حکیم کی حقیقی تعلیم سامنے آ ہی نہیں سکتی

میں کیا عرض کروں میرا تو کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم کرو، یہ کہتے ہیں اللھم صل علیٰ ''توں ای کر''۔ عزیزانِ من! جب تک ان چیزوں سے نکل کے آپ قرآن کی طرف نہیں آئیں گے، دین نہ سمجھ میں آئے گا نہ جو کچھ کیا جاتا ہے اس کا کوئی نتیجہ آپ کے سامنے آئے گا۔ کروڑوں مرتبہ یہ درود جسے آپ کہتے ہیں، ہر فرد بھیج رہا ہوتا ہے۔ چودہ سو سال سے پوری امت اس میں لگی ہوئی ہے۔ جس کے لیے اس نے کہا تھا کہ اس کا زندہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم ظلمات سے نور کی طرف آ جاؤ گے۔ اور چودہ سو سال کے اندر ہر صدی میں ان کی ظلمات بڑھتی چلی جا رہی ہیں صاحب۔ ٹیسٹ یہ تھا کہ وہ مشن کامیاب ہوگا اور الناس نوعِ انسانی تاریکیوں سے روشنی میں آ جائے گی۔ یہاں بھیجنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا بھر کی تاریکیوں کے اندر، قرآن نے جو کہا، یہ ایسی تاریکیاں کہ جن میں ہاتھ دکھائی نہیں دیا کرتا۔

قرآن حکیم کے نزدیک انسانیت کی نشوونما کا یہی ایک واحد عملی طریق ہے

قرآن نے کہا کہ ان تاریکیوں کے اندر یہ ڈوبی ہوئی قوم ہے۔ صرف ایک فریضہ اگر یہ سمجھ لیتی کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡهِ (33:56) اس کے معنی کیا ہیں تو دنیا کی اقوام ان کے اوپر درود بھیجتیں۔ کیونکہ یہ پوری انسانیت کے لیے یہ بہتر کام کرتی' اس نے تو اچھے کام کا معیار ہی ایک بتایا تھا کہ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17) یاد رکھو بقاء صرف اس عمل کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہو۔ سیدھی سی بات ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش کام اگر یہ کرتی تو یہ انسانیت اور یہ قومیں وہ ان کے اوپر درود نہ بھیجتیں پھر؟ قدم قدم کے اوپر ان کو یہ کہتیں کہ آ ؤ کیا بات ہے تمہاری' کیا کر دیا تم نے' جیتے رہو' صدقے جاواں تہاڈی ایس قوم دے' گل بندی ناں' قوم ہونا ہو یا' جتاں ہو یانا' کسے مائی دا لعل''۔ قومیں ان کے متعلق یہ کچھ کہتیں عزیزانِ من! اگر یہ صرف صلوا علیہ کا مفہوم ان کے ذہن میں باقی رہ جاتا۔ لیکن ان کو تو ڈال دیا دوسری پٹڑی کے اوپر۔ خوش ہیں مطمئن ہیں۔ اس قدر اطمینان ان کو نصیب ہوتا ہے یہ پڑھنے سے تو کرنے کی طرف تو نیت ہی نہیں جاتی۔

قرآن میں جہاں ''صل'' کے بعد ''علیٰ'' آیا ہے اور یہی مقامات ہیں صرف جہاں یہ آیا ہے۔ اور یہ مفہوم قرآن نے خود واضح کر دیا ہے کہ اس کی ضرورت کتنی ہے میں نے پہلے عرض کر دیا ہے کہ ٹھیک ہے تعریف کرنے سے' غلط قسم کے دماغ اس کا غلط اثر لے لیتے ہیں۔ سوال اس کا نہیں ہے۔ یہ غلط قسم کے کام ہیں' وہ جو اس نے کہا ہے یُحِبُّوۡنَ اَنۡ یُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُوۡا (3:188) یہ وہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ لوگ ہماری تعریف کریں ان کاموں کے بدلے میں جو ہم کرتے نہیں ہیں۔

قوموں کی تباہی اور بربادی کی بنیادی وجہ تین الفاظ میں پوشیدہ ہے کہ ہو جائے گا' ہو جائے گی' ہو جائیں گے

پتہ ہے یہ کیا پروگرام ہے۔ یہ دو چار دن ہوئے اخبار کے ایک مزاحیہ کالم میں کسی نے ایک بڑی گہری بات کہی تھی۔ اُس نے کہا کہ اس معاشرے کی ساری تباہی یہاں تین حرفوں کے اندر پوشیدہ ہے۔ اُنہیں اگر نکال دیا جائے اس معاشرے سے تو ''ستے خیراں ہو جان گیاں'' سب کام ٹھیک ہو جائیں گے ہمارے۔ تین ہی حرف وہ کہہ رہا ہے کوئی وہ تعویذ ہے کوئی گنڈا ہے کیا چیز ہے۔ وہ کہنے لگا بات بڑی آسان سی ہے۔ اُس نے کہا کہ جس کی وجہ سے تباہی ہماری آ رہی ہے جو میں چاہتا ہوں نکل جائے وہ ''ہے گا گی گے''۔ اُس نے کہا یہ بات کیا ہوئی۔ کہنے لگا بس پچیس سال سے یہ ہوگا' یہ کر دیا جائے گا' یہ ہو جائے گی' یہ ہو جائیں گے۔ کہنے لگا پچیس سال سے' یہ ہو جائے گا' کر دی جائے گی' کر دیے جائیں گے۔ اُس نے کہا ہے یہ گے گی اور گا نکال دو اس کے بعد پھر آپ دیکھ لیجیے کس قدر مشکل میں یہ پھنس جائے گی۔ پھر تو یہ ہو گیا نا یہ کر دیا ہے۔

خدا تعالیٰ کے ہاں Appreciation ہمیشہ ''ہو جائے گا'' کے بجائے ''ہو گیا ہے'' کی ہوتی ہے

یہ چیز تھی جس کے لیے اُنہوں نے کہا کہ Appreciation یا Praise۔ ایک اور جماعت بھی یہ چاہتی ہے۔ وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا (3:188) چاہتے ہیں کہ ان کاموں کی وجہ سے تعریف کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں ہیں۔ ان کو چھوڑ دیجیے۔ قرآن تو Appreciation دیتا ہے ان چیزوں کی جو کرتے ہیں دوسرے۔ اس کرنے کی Appreciation اور اس کا مقصد کا یہ ہے جو کر رہا ہے یا جس نے کیا ہے' اس کی حوصلہ افزائی (Moral Support) کہ اسے زیادہ کرنے کے لیے Incentive مل جائے۔ یہ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے سوشل جسٹس والوں کی اصطلاح Psychological Income اس کو دی جائے' اس کے کیے کا نفسیاتی بدلا اس کو دیا جائے۔ جو یہ کہہ رہا ہے اس کے دل میں خود اس کے لیے Incentive پیدا ہو کہ مجھے بھی یہ کرنا چاہیے۔ جو کسی کام کو اچھا کہتا ہے یقیناً اس کے اپنے دل کے اندر یہ چیز پیدا ہوتی ہے کہ مجھے بھی ایسا کرنا چاہیے۔ جو سنیں وہ بھی کہیں کہ ہاں صاحب ایسا کرنا چاہیے' اچھے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔

دھاندلی کی بنا پر کھڑے کیے گئے مجسمے کبھی حیات جاوید حاصل نہیں کرتے

یہ جن کے مجسمے کھڑے کیے ہیں قوموں نے' یہ جن کی یادگاریں بناتی ہیں قومیں' یہ کونسے لوگ ہیں؟ انہوں نے کوئی نہ کوئی ایسا کام کیا ہوتا ہے کہ جو نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہوتا ہے۔ باقی مجسمے جو دھاندلی سے کھڑے کیے جاتے ہیں' ایک دھاندلی ان کو کھڑا کر دیتی ہے' بعد کی دھاندلی ان کو اٹھا کے نیچے پھینک دیتی ہے۔ لیکن مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (13:17) جو قرآن نے کہا تھا عزیزانِ من! بقاء اس کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کے لیے کوئی منفعت بخش کام کرتا ہے۔ تاریخ ساری انہی چند نفوس کے اجتماع کا نام ہے جنہوں نے نوعِ انسانی کے لیے کچھ کیا ہے۔ انہی کے مجسمے قائم ہیں' انہی کی یادگاریں مسلسل اور متواتر آگے چلتی ہیں۔ یہ وہ ہیں کہ جن کے اوپر خدا اور ان کے فرشتے درود بھیجتے ہیں۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ (33:43)۔ یہ ہے خدا کی طرف سے صلوٰۃ کی چیز جو تھی' یہ بھیجنا۔ اب آگے اس کا دوسرا مقام آتا ہے۔

مرنے کے بعد کسی کے متعلق چند معاشرتی ادب و آداب کا ذکر

جب کوئی شخص وفات پا جاتا ہے تو تجہیز و تکفین اور جنازہ اور قبر اور کفن اور دفن یہ سب معاشرتی چیزیں ہیں' دین کی چیز نہیں ہے۔ مرحوم کو اس کا کچھ فائدہ نہیں پہنچتا' بے جان لاش ہے' جس طرح جی چاہے Dispose-off کر دیجیے۔ یہ جو ہم ابھی زندہ ہیں ہمارے

لیے یہ ضروری ہے کہ نہایت عزت کے ساتھ' احترام کے ساتھ' توقیر کے ساتھ' یہ سب کچھ کیا جائے۔ٹھیک ہے۔اس کی کچھ باتیں بھی کی جائیں گی' مرنے والے کی تو باتیں کی جاتی ہیں نا۔قرآن نے یہاں یہ بتایا کہ مرنے والے! اس طرح کی زندگی بسر کر کہ تیرے مرنے کے بعد بھی تیری تعریف وتوصیف کریں تیرے جنازے پہ کھڑے ہو کے۔یہ ہے''صل علیہ''۔مرنے کے بعد کسی کا نمازِ جنازہ پڑھ لیا۔ وہ تو جیسے ہم پانچ وقت کی نماز میں کر کے آتے ہیں' جو وہاں ہم کرلیں گے۔کیابات کہہ گیا ہے

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ درد عاشق کے

ہم مر کے کیا کریں گے' کیا کرلیا ہے جی کے

جس نے جی کے کچھ نہیں کیا' مرنے کے بعد اس کی تعریف کیا ہوگی۔لیکن اس سے مراد یہ تھی قرآن کی کہ رسول ﷺ نے جو کہا ہے ''صل علیٰ' مرنے کے بعد''صل علیٰ'' کے کیا معنی ہونگے کہ جینے والے ایسے کام کر کہ جیتے جی تو یہ رسول' اسکی جماعت تیرے ساتھ رفقاء' نوعِ انسانی تیری تعریف وتوصیف کرتی تھی Appreciate کرتی تھی' ایسے کام کر کہ مرنے کے بعد بھی تیری تعریف وتوصیف کی جائے کہ کیابات ہے صاحب' کیابات کر گیا ہے۔یہ ہے جسے نمازِ جنازہ جسے آپ کہتے ہیں یہ ہے کسی کی قبر کے اوپر کھڑا ہونا جسے آپ کہتے ہیں۔اس کے سودمند کاموں کو یاد کر کے اس کا تذکرہ کیا جائے اس کی Appreciation کی جائے' یہ ہونی چاہیے زندگی۔یہ تھا عزیزانِ من! جسے آپ نمازِ جنازہ کہتے ہیں یہ ہے جسے آپ احترام اور ادب دیتے ہیں۔اُس سارے وقت میں مرنے والے کے متعلق باتیں ہوتی رہتی ہیں۔اس کے بعد رسوم اور معاشرتی رواج آپ منا لیجئے۔ہمارے ہاں تو قل اور چہلم وغیرہ ہو گیا۔خاص دن کو متعین رسم نہ کیجیے۔یہ چیزیں میں سمجھتا ہوں معاشرتی طور پہ اچھی ہیں۔یہ جن کے ہاں موت ہو چکی ہوتی ہے ان کی ہمدردی کے لیے لوگ آتے ہیں' آنا چاہیے۔بجائے اس کے کہ وہ بیٹھا ہی رہے اب وہاں ''کسے ہور کام کاج جوگا نہ رہے''۔ٹھیک ہے کچھ وقت مقرر کر لیجئے' کچھ دن مقرر کر لیجیے کہ احباب جنہوں نے آنا ہے اُس وقت آئیں' اس سے تعزیت کریں' اس سے ہمدردی کریں۔کوئی دن کر لیجئے' تیسرا دن رکھ لیجئے' دسواں سہی۔لیکن میں نے کہا ہے کہ وہ رسم کے طور پہ پھر یہ عقیدہ نہ بن جائے آپ کا۔پہلی جمعرات دوسری جمعرات تیسری جمعرات۔ وہ جمعہ بیچارہ تو یونہی چلا جاتا ہے''اوہدی رات بڑا تنگ کردی ہیگی اے''۔پھر وہ چالیسویں کی چیز۔میں کہہ رہا ہوں کہ معاشرتی طور پہ یہ چیزیں بری نہیں ہیں۔جو رنگ ان کو دیدیا گیا ہے' اس کے خراب نتائج نکلتے ہیں۔

کسی کی فوتیدگی کے بعد بغیر سوچے سمجھے قرآن حکیم پڑھ پڑھ کر اسے ثواب پہنچانا' چہ معنی؟

تصور یہ کہ وہ سارے بیٹھیں قرآن شریف پڑھیں۔میں کہتا ہوں یہ بھی جس نے ایجاد کیا ہے' بڑی اچھی چیز ہے۔ورنہ اگر کہیں بھی

دس بیس مسلمان بیٹھ جائیں' وہ باتیں کرنی شروع کر دیں۔ نتیجہ اس کا ایک تو مرنے کے اوپر آئے تھے۔ پتہ نہیں ان میں سے کتنے مر کے اٹھیں۔ یعنی ان کو اگر چھٹی دیدی جائے باہمی باتیں کرنے کی تو یہ تو ابھی متشابہات ہیں نا' محکمات میں اترے اور خنجر نکلا۔ کسی نے بہت اچھا اس کے لیے سوچا کہ ان کے ہاتھوں میں قرآن کے پارے دیدو۔ ٹھیک ہے اچھی بات ہے' قرآن پڑھیں میں کہتا ہوں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کچھ اور باتیں تو نہیں کریں گے' آئے اور تھما دیے جب ختم کیا مولوی صاحب نے' سلام علیکم کیا تو وہ رخصت ہو گئے' بچ گئی ہے قوم۔ لیکن یہ چیز جو اس کے اندر آ گئی کہ یہ جو ہم پڑھ رہے ہیں بغیر سمجھے ہوئے' اس کا کوئی ثواب ہوتا ہے اور پھر یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تو کسی کام کی چیز نہیں ہے ''اینوں بھیج دیو اوہدر''۔ اور اگر Genuinely کوئی Believe کرتا ہے کہ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جس سے اس مردے کی کچھ مغفرت ہو جاتی ہے' اس کو ثواب پہنچ جاتا ہے' اس کی نجات ہو جاتی ہے بڑا غلط تصور ہے۔ یہ تصور درمیان میں نہ آئیں۔ معاشرتی رسم ہے یہ ایک۔ اور میں نے جیسا عرض کیا ہے نمازِ جنازہ' تدفین' تجہیز' تکفین' اچھی رسمیں ہیں معاشرے کی' بڑی عمدگی سے ان کو سرانجام دینا چاہیے۔ لیکن بات ساری یہ ہے کہ مرنے والا ایسے کام کر کے کچھ جائے کہ اس کے بعد جب باتیں کی جائیں اس کے جنازے پہ اس کی میت پہ اس کی قبر پر تو وہ پھر اس کی Appreciation ہی ہو۔ ورنہ عام جنازے کی تو صورت یہی ہوتی ہے کہ وہ تحصیلدار کے کتے کے جنازے کے اوپر پانچ سو آدمی' تحصیلدار کے جنازے پہ پانچ آدمی۔

خوش بخت ہے وہ شخص جس کے مرنے کے بعد لوگ اسے اچھے نام سے یاد کریں

اصل شے تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد آپ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں سے ذہن میں یہ بات آ گئی۔ ہمارے ایک دوست شائد آپ بھی اِن سے واقف ہوں۔ وہ بحیثیت انسان بہت اچھے تھے' مرنے کے بعد ان کی یاد آ جاتی ہے' بہت اچھے تھے۔ تاج محمد خیال ان کا نام تھا پروفیسر خیال' پرنسپل بھی وہ رہے غالباً۔ کبھی کبھی شعر کہا کرتے تھے۔ بڑے شستہ ذوق کا انسان تھا' بڑی محبت والا۔ ایک مصرعہ ہے ان کا جو میرے ذہن میں اس وقت آیا۔ کوئی اور ان کا شعر بھی سامنے نہ ہو تو میں سمجھتا ہوں اس ایک مصرعہ سے نظر آ جاتا ہے کہ وہ کیسا عمدہ شاعر تھا۔ بات سنیے کیسے عمدہ کہہ گیا ہے۔

؎ میرا مرنا خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے

واہ واہ واہ واہ۔ یہ ہے ساری بات عزیزانِ من! کسی کے جنازے پہ جانا' اس کی قبر پہ کھڑے ہونا' اس کے قل میں جانا' اس کے چالیسویں میں جانا' اس کے لیے دعا کرنا۔ ساری بات یہ ہے کہ 'میرا مرنا خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے'۔ نوحہ گر کا خلوص یہی ہے کہ مرنے کے بعد اس کی تعریف کرے۔ سامنے تو ہر ایک تعریف کرے گا صاحب۔ کہتا ہے کہ ایک فائدہ تو میری موت کا یہ ہوا کہ نوحہ گر کے خلوص

کی آزمائش ہوگئی ہے۔کتنی بابرکت ہے اس کی زندگی کہ اس کی موت کے بعد نوحہ گروں کے خلوص قائم رہیں اس کے ساتھ عزیزانِ من!۔

اور یہ تھے مقابل میں وہ منافقین جن کے متعلق کہا ہے قرآن نے۔حتمی اور تاکیدی طور پہ کہنا پڑا رسول ﷺ کو کہ **وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنۡھُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمۡ عَلٰی قَبۡرِہٖ** (9:84) یہ اس قابل ہیں کہ مرنے کے بعد ان کی تعریف وتوصیف میں کوئی کلمہ کہا جائے؟ یہ اس قابل ہیں کہ تم ان کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کے دعا ان کے لیے یہ کرو؟ کیا ان کے افعال واعمال ایسے تھے کہ کچھ ان کے متعلق کہا جائے؟۔یعنی میں کہتا ہوں کہ نفاق اور منافقت کے متعلق جو کچھ قرآنِ کریم کہتا چلا آ رہا تھا اتنی لمبی (معاف رکھیے) جو غزل لکھی تھی اس نے یہ مقطع کا بند انتہائی چیز ہے جو کہہ گیا ہے قرآن کہ زندگی میں تو جو کچھ ان کے ساتھ تعلقات' تھے وہ تو ایک طرف رہے یہ تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان کے حق میں ایک لفظ بھی دعائے خیر کا کہا جائے' ان کی زندگی منافقت کی زندگی تھی۔یہ ہے عزیزانِ من! منافقت اور یہ ہے جو اس آیت کے معنی ہیں۔**وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنۡھُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمۡ عَلٰی قَبۡرِہٖ** (9:84) بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ ان کا خداوہ' مرے کو مارے شاہ مدار' مرنے کے بعد بھی یہ نہیں چھوڑتا۔یقیناً اس قابل ہوتے ہیں یہ منافق کہ باقی ساری دنیا کو بتا دیا جائے کہ ان لوگوں کا انجام یہ ہے کہ زندگی میں تو ایک طرف رہا' مرنے کے بعد بھی یہ اس قابل نہیں ہیں کہ ایک لفظ بھی ان کی تعریف کا کہا جائے۔اس لیے کہ انہوں نے کوئی کام ایسا کیا ہی نہیں ہے۔اور منافقت ہمارا شیوہ نہیں ہے کہ ہم اس کے بعد جھوٹی تعریفیں ان کے لیے کرتے چلے جائیں کہ اچھے آدمی تھے' بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔یعنی یہ وہ طریقہ ہوتا ہے نا ایک خوبی متعین نہیں بتاتے۔تھی نہیں۔بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ہم یہ نہیں کہنے والے' ہم منافقت نہیں برت سکتے۔اور کوئی متعین خوبی ایسی ہے نہیں جس کا ہم ذکر کریں۔اس لیے یہ کہا گیا **وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنۡھُمۡ مَّاتَ اَبَدًا** (9:84) عزیزانِ من! بات ہمارے لیے یہ نکلی کہ زندگی میں جب تک یہ مہلت اور گنجائش ہے کوئی کام تو ایسا کر جایئے کہ مرنے کے بعد یاد کر کے ہی تمہاری قبر پہ کھڑا ہو کے تمہارے حق میں کچھ کہہ دے۔کتنی حرماں نصیبی کی زندگی ہے جس کے حق میں کوئی ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے۔ہم سورۃ التوبہ کی آیت 84 پہ آ گئے عزیزانِ من! 85 سے آئندہ شروع کریں گے۔بات جو تھی یہ ''صل علیٰ'' کی میں نے وضاحت کی' آگے آتی جائے گی یار زندہ صحبت باقی۔ابھی پھر آئیں گے یہ مقامات ''صل علیٰ'' کے اور مزید وضاحت سے ان چیزوں کو قرآن کی روشنی میں بیان کرونگا۔سرِ دست میں نے یہی عرض کیا کہ کس کی موت اچھی ہوتی ہے۔یہ موت جس کے بعد حکم ہو جائے کہ اس کی قبر پہ بھی کھڑے نہ ہونا' بڑی ہی لعنت کی موت ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

چودھواں باب: سورۂ توبة (آیات 85 تا 89)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1973ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 85 سے ہو رہا ہے۔ (9:85)

مذہب اور دین کے معاملات میں فرق کے ساتھ متضاد رویہ کا ذکر

کئی درسوں سے مسلسل یہی موضوع زیرِ نظر چلا آ رہا ہے۔ بات منافقت کی ہو رہی تھی اور وہی سلسلہ آگے بھی چل رہا ہے۔ شروع میں آپ نے دیکھا تھا کہ منافقت کی یا منافقین کی تفصیلات تو طول طویل ہیں لیکن قرآن نے بتایا تھا اور بڑے ہی ایجاز اور اعجاز اور بڑی جامعیت سے اس نے کہا یہ تھا کہ جہاں تک تو معاملہ مذہب کا رہتا ہے (اب یہ ایک چیز ہے سمجھنے کی) وہاں تک یہ بالکل پکے اور سچے مسلمان بنتے ہیں لیکن جب دین کا معاملہ آتا ہے، مشکل وہاں آ کر پڑتی ہے۔ مذہب کا معاملہ یعنی پوجا پاٹ، پرستش نماز روزہ رسومات، مناسک، زبانی اعتقادات، یہ ساری چیزیں مذہب کی ہیں۔ تو کہا کہ وہاں تک تو انہیں کوئی الجھن نہیں ہوتی لیکن دین کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے معاملات آئیں، فیصلہ احکامِ خداوندی کے مطابق کیا جائے۔ اور پھر اس فیصلے کی تعمیل میں جس قدر قربانی اور ایثار کی ضرورت ہو وہ بھی کیا جائے، جس قدر صعوبات اور مشکلات اٹھانی پڑیں، وہ بھی اٹھائی جائیں۔ دین کا دائرہ یہاں آ جائے گا۔ تو کہا وہاں تک تو یہ ٹھیک رہتے ہیں لیکن جس وقت یہ دائرہ آتا ہے تو وہاں یہ کہیں کہ یہ اس قسم کا دین ہمارے بس کی بات نہیں ہے، ہم اس پر نہیں چل سکتے۔ ٹھیک

ہے اس دائرے سے نکل جائیے۔لیکن اتنی اخلاقی جرآت نہیں ہوتی۔اس کے ساتھ چپکا بھی رہنا چاہتے ہیں اور انداز یہ اختیار کرتے ہیں کہ مختلف قسم کی بہانہ سازیاں' عذر تراشیاں' تاویلات والی یہ روش اختیار کر لیتے ہیں۔اسے قرآن نے منافقت کہا ہے۔

ہم نے صدرِاول کے بعد سے دین کو مذہب میں بدل رکھا ہے

آپ غور کریں گے کہ ہماری تاریخ جو چلی آ رہی ہے اتنے عرصے سے صدرِاول کے بعد' ہمارا اسلام یہی رہ گیا ہے۔ ہمارا اسلام بھی سمٹ کر مذہب کی سطح پر آ چکا ہے۔ وہاں تک ان چیزوں کی پابندی نہایت شدت سے کی جاتی ہے لیکن جہاں معاملہ یہ آ جاتا ہے کہ زندگی کے معاملات کے فیصلے ما انزل اللہ کے مطابق کرنے چاہئیں تو اس کی جگہ یہ مسائلِ شریعت' فقہ کے فیصلے' وضعی روایات' تفسیرات' تاویلات یہ کیا ہیں؟ یہ منافقت ہے۔قرآن کی بات تو بڑی صاف صاف ہے۔ یہ ہمارے نہ ماننے کی وجہ ہے جو ہم نے اس قسم کی عذر تراشیاں کر رکھی ہیں۔ یہ سارے دین سے بچنے کے حیلے ہیں۔اس میں بڑی آسانیاں ہوتی ہیں۔ دین تو زندگی کا ایک نظام چاہتا ہے اور اس نظام میں زندگی کے جتنے معاملے آئیں گے ان کے فیصلے آپ کو احکامِ خداوندی کے مطابق کرنے پڑیں گے۔ اپنی سیرت اور کردار اس کی بتائی ہوئی اقدار کے قالب میں ڈھالنی پڑے گی۔ اور ظاہر ہے کہ پابندیاں اپنے اوپر عائد کرنا پڑیں گی' بہرحال کچھ تو ایثار کی ضرورت ہوتی ہے' کچھ تو مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں دین کی جگہ یہ مذہب کو ترجیح دیتے ہیں۔

جہاد کی ضرورت نے منافقانہ ذہنیت کو بےنقاب کر دیا

دین مذہب میں تبدیل ہی اس مقام پر ہوتا ہے۔ یہ لوگ ان باقی معاملات میں ساتھ تھے مسلمانوں کے۔لیکن جہاں یہ مسئلہ آیا اور قرآن نے نمایاں طور پہ یہ کہا کہ جب دین کے معاملے میں نظام کے استحکام اور حفاظت کے لیے جہاد کی ضرورت آن پڑی' وہ بہت بڑا ٹیسٹ تھا ان لوگوں کا۔ اتنا عرصہ تک تو کسی نہ کسی طرح سے یہ نقاب اوڑھ کر بچتے چلے گئے۔لیکن جہاد کے معاملے میں تو کسی قسم کی نقاب پوشی کام نہیں دے سکتی یہاں تو میدانِ جنگ میں آنا پڑے گا۔انفاق کے لیے سب کچھ دینا پڑے گا۔اور یہاں اس امتحان سے ان کی قلعی کھل گئی۔ یہ ہے وہ مقام جہاں قرآن اس شرح وبسط سے سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ میں نہایت وضاحت سے ان کے حالات وکوائف بیان کرتا ہے۔

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ تعلیم' انسانیت کے عروج وزوال کے اصولوں سے وابستہ ہے

یہ میں نے جیسا عرض کیا تھا کسی خاص گروہ' جماعت کے تاریخ میں کسی خاص زمانے کے واقعات نہیں ہیں۔ یہ تو انسان کی ایک

کیفیت کا نام ہے' ایک نہج کا نام ہے' ایک سوچ کا نام ہے' ایک طرزِ زندگی کا نام ہے' وہ ہر دور میں ہوگی۔ اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کھلے کھلے الفاظ میں اگر کہنا چاہیں تو یہی بات ہوگی کہ دین بدلا جاتا ہے مذہب میں منافقت کی بناء پر۔ ساتھ بھی رہنا چاہتے ہیں لیکن دین کی صعوبات اور مشکلات اور ایثار اور قربانیاں اس سے جی چراتے ہیں۔ اور اس کے لیے پھر اس قسم کی چیزیں وضع کر رکھی ہیں کہ جن میں یہ کچھ نہ کرنا پڑے۔ آہستہ آہستہ ہاں جہاد کے لیے پہلے تو نو من تیل اکٹھا کیا کہ پھر رادھا ناچے گی۔ پھر دارالحرب بنائے اور دارالاسلام بنائے۔ اور آہستہ آہستہ ایک مقام کے اوپر ایک مامور من اللہ آ گئے اور انہوں نے کہا کہ صاحب جہاد منسوخ ہی ہو گیا ہے' حکم ہو گیا ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ جی چرانا ہے اس سے۔ تو جی چرانے کے لیے بھی گرزالہ کی ضرورت ہے' اس کے لیے تو جرأت کی ضرورت ہے' اس کے لیے بھی ایک کریکٹر کی ضرورت ہے۔ کفر ایک کریکٹر چاہتا ہے Atheism ایک کریکٹر چاہتی ہے۔ منافقت کہتے اُسے ہیں جہاں کریکٹر نہیں رہتا انسان کا' Characterlessness یہ ہے جو ذکر چلا آ رہا ہے ان لوگوں کا۔

مذہبی تصورات میں الجھی ہوئی زندگی کے نشیب وفراز کی حالت

آج کی آیت سے بات ایک اور شروع ہوئی اور یہ کسی خاص زمان اور مکان کی بات نہیں ہے یہ کہ اکثر اس کے بعد خیال آتا ہے انسان کو کہ صاحب یہ ٹھیک ہے جو بھی آپ ان کو کہیے' برا کہیے' بھلا کہیے۔ لیکن آپ دیکھئے پنپتے کیسے چلے جاتے ہیں یہ لوگ' کامیابیاں کتنی ان کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ کاروبار ان کے چمکتے ہیں Overnight Billionaire ہو جاتے ہیں۔ ملازمتوں میں ہیں تو اس قسم کی منافقت سے' رشوت ستانیوں سے آپ دیکھئے کتنا کچھ جمع ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ تو حاصل ہو جاتا ہے اس سے۔ اور اس میں اگر مذہب آ جاتا ہے تو اس میں کچھ خیرات کی جاتی ہے' کچھ اڑھائی پرسنٹ دیدیا جاتا ہے' کچھ دیگیں چڑھادی جاتی ہیں' کچھ نذر نیاز دیدی جاتی ہے۔ یہ مذہب کا پہلو بھی ساتھ رہتا ہے۔ اور ایسا کرنے والا تو معاشرے میں بھی ایک مقام حاصل کر لیتا ہے۔

انسانی معاشرے میں منافق کا طرزِ عمل اور مومنانہ زندگی کے خدوخال

معاشرہ کہ جس میں معیار ہی صرف دولت رہ گیا ہے' کوئی Value معیار نہیں رہا۔ اس کے متعلق یہ وہ ہے جو قرآن میں ایک آیت ہے کہ جب ان کے سامنے قرآنِ خالص پیش کیا جائے تو کہتے ہیں (اَلْغَوْا فِيْهِ) (41:26) پرندوں کی سی چائیں چائیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ قرآن نے لفظ ہی یہ استعمال کیا ہے بڑا عجیب لفظ ہے۔ تو یہاں آ جاتی ہے منافقت۔ یہ سارا کچھ جس طریقے سے بھی ہو' اکٹھا کر لیجیے اور پھر خدا کو راضی کر لیجیے صدقہ اور خیرات دینے سے' فی سبیل اللہ کام کر لینے سے۔ اور معاشرے کے اندر منافق کو

ذلیل ترین فرد ہونا چاہیے معاشرے میں۔ لیکن پوری منافقت سے یہ سب کمانے کے بعد جب اس قسم کے دو چار کام کر دیے جائیں اور معاشرے کے اندر بھی عزت مل جاتی ہے۔ تو اس سے انسان یہ فریب کھا جاتا ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں بات تو ٹھیک ہے جو قرآن کہتا ہے' اوسارے قرآن پہ کس نے عمل کیا اب دیکھئے' یہ نیک کام بھی تو کرتے ہی ہیں ساتھ اس کے اور اس سے حاصل اتنا کچھ ہوتا ہے۔

دیانتدار کے لیے غلط معاشرے کی پیدا کردہ الجھن کا نتیجہ

خالص مومن بننے میں تو بہر حال بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ دیانتدار بن کے دیکھ لیا' کاروبار ہی نہیں چلنے دیتے۔ غلط معاشرے کے اندر یہی تو مصیبت ہے غلط معاشرے کی کہ وہ خود کرنے والے' وہی غلط کوش اور غلط کار نہیں ہوتے وہ کسی کو صحیح روش پر چلنے نہیں دیتے کہ اس سے دونوں کے اندر فرق نظر آ جائے گا۔ اس مارکیٹ کے اندر کوئی شخص تہیہ کر کے بیٹھے کہ میں نے دیانتداری سے یہاں دوکانداری کرنی ہے' پورا جتھہ اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے کہ اس کو پنپنے نہیں دینا اور بھگا دیتے ہیں۔ یہ کیفیت ہم لوگوں کی دیکھی ہوئی چیز ہے۔ کسی نے اگر دیانتداری سے امانتداری سے وہاں کام کرنا چاہا' اتنا تنگ کرتے ہیں صاحب کہ یا تو ان کی روش اختیار کرے اور یا چھوڑ کے بھاگ جائے۔ بڑی ہمت کا کام ہے اس دور کے اندر یہ کچھ بننا۔ یہ کیا جاتا ہے۔ اس سے تھک کے' تنگ آ کے پھر اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ وہ کہتے ہیں کہ یہ کچھ بھی ہم نے کر کے دیکھ لیا ہے' کامیابی نہیں ہو سکتی۔ طریقہ یہی ہے کامیابی کا۔ اس سے ایک فریب کھا جاتا ہے۔ اور یہ میں نے جیسا عرض کیا ہے بات اُس وقت کی نہیں' بات آج کی بھی ہے۔ **وَ لَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ** (9:85) دیکھنا جو اس طرح سے بڑی دولت اکٹھی کر لی انہوں نے' بڑے مالدار بھی ہو گئے۔ ساتھ اولاد کا ذکر بھی قرآن کرتا ہے۔ اولاد کے معنی جتھہ ہوتا تھا اس زمانے میں۔ وہ دور ایسا قبائلی دور تھا قبیلے کے افراد جن کے زیادہ ہوتے تھے ان کی طاقت زیادہ ہوتی تھی۔ شروع سے یہ بات چلی آتی تھی۔ ''ابناء'' کہیں ان کو کہتا ہے ''بنون'' کہتا ہے ''بنین'' کہتا ہے ''اولاد'' کہتا ہے۔ مقصد اس سے افرادِ خاندان یا قبیلے کے افراد ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں تو یہ خاندانی چیز تھی' یہ قبیلے کے افراد تھے۔ اس کی جگہ اس دور نے پارٹی سسٹم نے لے لی ہے' پارٹی کے ممبر وغیرہ ہوتے ہیں۔ دیانتدار ایماندار آدمی کوئی تحریک لے کر اٹھتا ہے' چار آدمی بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ سیاست ہی ایسی ہو گئی آپ کے ہاں کی میکاؤلی کہ جس قدر اس میں منافقت برتی جائے' اتنی ہی زیادہ اولاد جسے قرآن نے کہا ہے پارٹی ممبر آج کی اصطلاح میں اُسے کہہ لیجیے' جتھہ کہہ لیجیے' گروہ کہہ لیجیے' جماعت کہہ لیجیے' اسکے افراد بھی زیادہ۔ وہ کہتا ہے صحیح راستے پر دیانتدار صداقت پر چلنے والوں کے لیے یہ بات دھوکے کا باعث نہ کہیں بن جائے یہ نہ دل میں خیال آنے لگ جائے کہ معیار تو کامیابی ہے اور دیکھئے کتنی کامیابی ہو رہی ہے ان کو۔ مال بھی اتنا اکٹھا کیا' پارٹی کے افراد بھی اتنے ان کے زیادہ ہو گئے۔ ابھی میں عرض کرونگا اس کے متعلق' آیت پوری کر لینے

دیکھئے۔عجیب چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔

قرآن حکیم میں معاشرتی تباہی کی بنیادی وجہ منافق کو دولت کی بنا پر صاحبِ احترام جاننا ہے

عزیزانِ من! ایک ذرا سا لفظ ہوتا ہے اس کے اندر سم کا وہ حرف جس سے دروازہ کھل جاتا ہے' تالا کھل جاتا ہے۔کہا اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ (9:85) کہا کہ یہ بات تمہیں کہیں فریب میں نہ ڈال دے یعنی یہ چیز جو تم سمجھتے ہو کہ ان کی کامیابی کیلئے' یہ دولت کی فراوانیاں' پارٹی کے اتنے زیادہ ممبر' بظاہر معاشرے میں ان کی یہ عزت' یہ سب چیزیں۔کہا یہی وہ چیزیں ہیں جن کی بناء پر تباہی آتی ہے۔منافق کو اگر معاشرے کے اندر پہلے دن سے ذلت کی نگاہوں سے جانا جائے' کامیابی ہونہ اس کو منافقت سے' دولت بھی نہ ملے' ساتھ بھی اس کے کوئی نہ آئے دوسرے دن منافقت چھوڑ دے۔کہا کہ یہ چیزیں جو بظاہر عام سطح بیں انسانوں کو فریب میں ڈال دیتی ہیں کہ کتنی بڑی کامیابی ہے' یہ بِھَا دیکھئے کتنی بڑی چیز ہے' کہا یہی تو وہ بوجھ ہے جس سے یہ کشتی ڈوبے گی۔خود انہیں مغالطہ لگ جائے گا کہ روش بڑی ٹھیک ہے' شروع شروع میں ذرا ذرا سی انسان لغزش میں آتا ہے' پہلے ہی دن اتنا بڑا پکا مخلص منافق نہیں ہو جاتا' تھوڑا تھوڑا سا کچھ دیانتدار بھی رہتا ہے۔جوں جوں کامیابیاں ہوتی ہیں' اس کے معیار کے مطابق بڑھتا چلا جاتا ہے۔کہا کہ یہی جو تم کہہ رہے ہو کہ ان کی کامیابیاں ہیں' یہی کامیابیاں تو ان کو لے کے ڈوبیں گی' یہی بوجھ اس کشتی کو ڈوبا دے گا۔ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا (9:85) اور پھر فی الدنیا ہے۔

وسیع سے وسیع تر مملکتوں کی تباہی ان کے اختیار کردہ منافقانہ نظام کی ہی وجہ جواز بنتی ہے

عزیزانِ من! یہاں سے وہ بات صاف ہوگئی جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ معاملہ قیامت تک ہی نہیں اٹھا رکھتا قرآن' یہاں اسی دنیا کے اندر اسکا انجام آتا ہے۔وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ (9:85) اور پھر اس کے بعد اس حالت میں یہ دنیا سے جائیں گے ذلیل وخوار ہو کر کفر کی زندگی کے اندر۔تو بات اس میں یہ ہے اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا (9:85) اسی کی بناء پر تو ان کی تباہی آتی ہے۔اور انسانیت کی ساری تاریخ عزیزانِ من! اس نگاہ سے آپ پڑھئے۔آپ دیکھیں گے بڑی بڑی جاہ وحشمت کی مالک قومیں' صدیوں تک پھیلی ہوئی ان کی تہذیب تمدن' بڑی بڑی وسیع سلطنتیں' بے مثال قوتیں۔اور اسکے بعد کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر انہیں ہوا کیا کہ ایک چکر کہیں سے آتا ہے اور اس کے بعد آپ قرآن کے الفاظ دیکھئے کہ ان کے کھنڈرات باقی رہ جاتے ہیں' پھر ان کی داستانیں صرف باقی رہ جاتی ہیں۔یہ ہوتا کیا ہے؟ بظاہر تحقیق کرنے والے ان کے خارجی اسباب کی طرف جاتے ہیں۔یہاں کچھ کاروباری غلطی کر گئے۔یہاں سیاست کے تدبر میں تھوڑا سا سقم رہ گیا۔یہاں فوجوں کی قوتیں جو تھیں ان کے ہاں کم ہوگئیں۔سٹرٹیجی کچھ صحیح نہ رہی۔

فلاں قوم نے ان پہ حملہ کیا اس نے سازش کی۔ کچھ نہیں۔

انسانیت کی فلاح و بہبود کا راز مفادِ عامہ میں ہے

قرآن کہتا ہے کہ باطل کی بنیادوں پر اٹھا ہوا نظام چند دنوں کے لیے جب ابھر رہا ہوتا ہے تو نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتا ہے انجام اس کا تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17) بقاء اسی نظام اور اسی تدبیر اور اسی نظریے کی ہے جو پوری انسانیت کے لئے منفعت بخش ہوتا ہے۔ ایک معیار۔ کہا ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ آخر تک کامیاب رہیں۔ جو ابتداً ان چیزوں کی وجہ سے، یہ کچھ اکٹھا کر لیتے ہیں، وہ تمہیں کسی طرح سے فریب میں نہ ڈال دے۔ قرآنِ کریم میں عزیزانِ من! آپ دیکھ جایئے اقوامِ سابقہ کی داستانیں وہ محض Historical , Chronicles نہیں ہیں، وہ وقائع نگاری نہیں ہے کہ قرآن نے واقعات لکھ کے تاریخ کی کتاب مرتب کرنی ہے۔ جتنی اقوامِ سابقہ کی تاریخیں ہیں اس میں یہی بتایا ہوا ہے کہ ان کے نظام میں یہ بنیادی غلطی تھی۔ غلطی کے معنی یہ تھے کہ وہ اقدار جن سے انسانیت کی تعمیر ہوتی ہے ان کے خلاف فلاں چیز ان کے نظام کے اندر تھی۔ ان کے ہاں جو عمارت اٹھی ہے تو بڑی بلند تھی، بڑی چکا چوند کر دینے والی تھی لیکن اس کے بعد تم تاریخ سے پوچھو کہ ان کا انجام کیا ہوا۔ کیا انجام ہوا وہ تاریخ سے پوچھو، کیوں ایسا ہوا کہا یہ ہم سے پوچھو۔ اور یہ انہوں نے بتا دیا۔ دو ایک مثالیں اس وقت آپ کے سامنے آ رہی ہیں۔

علامہ پرویزؒ کی نظر میں پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ

سارے قرآن میں اقوامِ سابقہ کی داستانیں اسی مقصد کے لیے ہیں۔ گذشتہ کنونشن میں میرا ایک مقالہ تھا ''پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ'' اس میں میں نے بتایا یہ تھا قرآن نے جہاں سے اقوامِ سابقہ کی داستان شروع کی ہے قومِ حضرتِ نوحؑ سے نبی اکرم ﷺ تک۔ یہ جتنی بڑی بڑی اقوام تھیں تاریخ میں جن کا نام بڑے ہی نمایاں الفاظ میں لکھا ملتا ہے۔ ان کی داستانیں قرآن سے میں نے Trace کیں اور تاریخ سے بتایا کہ کس قدر شان و شوکت و حشمت و دولت ان کے قبضہ میں تھی۔ کیا ان کا انجام ہوا۔ کیوں ان کا ایسا انجام ہوا یہ قرآن سے بتایا۔ اور اس کیوں کے جتنے بھی عناصر اور Elements تھے ایک ایک کر کے۔ اور اس کے بعد اس مقالے کے آخر میں میں نے بتایا کہ ان اقوام میں قرآن نے ایک ایک چیز بتائی تھی کہ وہاں سرمایہ داری کا نظام تھا، وہاں کی سیاست استبداد پر مبنی تھی، وہاں کا معاشرہ بد دیانتی پر مبنی تھا، وہاں کے افراد میں عفت و عصمت کا کوئی خیال نہیں رہا تھا، فحش کاریاں عام ہو چکی ہوئی تھیں، دھوکہ دہی، فریب دہی، بد دیانتی عام ہو گئی تھی۔ میں نے ان اقوام میں ایک ایک گنایا تھا۔ اور یہاں وہ تمام جرائم ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہوئے تھے۔ تو اگر تو یہ محض وقائع نگاری ہے تو آپ کہہ کے یہ خوش ہو جایئے کہ پرانی قوموں کی داستانیں قرآن بتا رہا ہے، ہم سے ان کا کیا واسطہ۔

قرآن حکیم کی عظمت اور تاریخی فلسفہ کی اہمیت

نبی اکرم ﷺ کی جو مخاطب قوم تباہ ہوئی تھی قرآن کہتا ہے کہ اس لیے ہوئی کہ جب ان کے سامنے یہ داستانیں بیان ہوتی تھیں تو وہ کہتے تھے قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (25:5) یہ پہلی قوموں کی کہانیاں ہیں جو یہ بیان کر رہا ہے' ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کہا یہی چیز تھی جو انہیں تباہ کر گئی۔ ایک آیت میں ایک بات سامنے آئے گی' وہاں دیکھئے گا قرآن اس غلط مفروضے کی کس طرح تردید کرتا ہے جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ قرآن نے عزیزانِ من! فلاسفی آف ہسٹری پیش کی ہے۔ ہمارے دور میں بڑے فخر سے کہا جاتا ہے۔ عام طور پہ ہیگل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے تاریخ کا فلسفہ بیان کیا تھا۔ اور فلسفہ یہ تھا کہ یہ جو واقعات تاریخ میں ہمارے سامنے آتے ہیں' یوں ہی اتفاقیہ طور پہ نمودار نہیں ہو گئے تھے بلکہ فلسفہ کے معنی ہوتا ہے کہ اس کے نیچے ایک Rational Ground تھی' Cause سبب تھا اس کا' اس کی وجہ سے ایسا ہوا۔ قرآن بیان ہی اس طرح سے کرتا ہے۔ جس قوم کی تباہی کو لیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کی بنیاد میں یہ سقم تھا اس کی تعمیر کی بنیاد میں یہ خرابی کی صورت مضمر تھی۔ اور اس کے بعد اگلی چیز جو کہتا ہے' جو ڈور کو سلجھایا اور سرا ہاتھ میں نہ آیا کہ یہ فلسفۂ تاریخ جو ابدی ہے' ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ جس دور میں جو قوم یہ روش اختیار کرے گی اس کا یہی نتیجہ نکلے گا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) یہ بات تھی جہاں آ کے قرآن ان سے منفرد ہوا۔ قرآن نے تاریخ کو اس طرح سے بیان کیا ہے۔ یہی چیز جو ہمارے سامنے آئی کہ کامیابیاں قوموں کو بڑی حاصل ہوتی ہیں۔

قرآنِ حکیم تو قوموں کے نشیب و فراز کو بیان کرنے کا ایک خاص مقصد لیے ہوئے ہے

میں نے جیسا ابھی عرض کیا ہے کہ اس کے لیے تفصیل سے آپ دیکھنا چاہیں تو وہ مقالہ میرا دیکھ لیجیے تمام اقوام کے متعلق اس میں میں نے لکھا ہے۔ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (40:82) بات اس طرح سے شروع کرتا ہے کہ کیا دنیا میں چل پھر کے تم نے نہیں دیکھا۔ فَیَنْظُرُوْا (40:82) دیکھو وہاں چل پھر کے۔ کیا چیزیں تمہیں وہاں نظر آئیں گی؟ جس چیز کو آپ Archaeological آثار کہتے ہیں اس کی Importance یا اہمیت ایسا نظر آتا ہے جیسے ہمارے دور کی ہو۔ یہ اثریات کا جو علم' کھنڈرات کا علم ہے' ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ یونہی بیکار بیٹھے ہیں' زمین کھودتے رہتے ہیں یہاں سے اتنا ٹکڑا مٹی کا آ گیا اس کو لے کے بیٹھے ہیں اور دس برس اس نے بقول ہمارے' اس پر ضائع کر دیے اور بتایا یہ کہ اس کا سرشتہ حمورابی سے جا کے اس طرح سے ملتا ہے۔

قرآن حکیم کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں قوموں کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات تاریخ کی معتبر ترین گواہی ہے

ہمارے ہاں اس کی Importance نظر نہیں آتی اس کی Importance قرآن نے کہی ہے۔ کہا تھا جا کے دیکھو ان قوموں کی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریوں پہ پڑھو اور تمہیں ان کے انجام کا سبب معلوم ہوگا۔ یہ کھنڈرات کی ٹھیکریوں پہ پڑھنے کا جو علم ہے اس کی طرف توجہ تو قرآن نے دلائی تھی اس سے پیشتر یہ آثارالارض یا اثریات یا Archaeology ایک برانچ آف سائنس کے تھی نہیں دنیا میں۔ یہ پہلی دفعہ قرآن نے کہا کہ جو وقائع نگاریاں لکھی ہوئی تاریخ میں ملتی ہیں اسے پڑھو بھی۔ ٹھیک ہیں جو یہ لوک گیت اور یہ لوگ کہانیاں مشہور ہوتی ہیں یہ بھی داستانیں ہیں۔ لیکن کہا سب سے زیادہ بنیادی معتبر ترین تاریخ ان کھنڈرات سے مرتب ہوتی ہے۔ تو کھنڈرات کی ٹھیکریاں جب پڑھی جائیں گی وہ تو اسی طرح پڑھی جاتی ہیں۔ ان قوموں نے یہاں سے چیزیں لیں اور وہ مردہ چیز جن کا بولنے والا آج کوئی باقی نہیں' ان زبانوں کی تحقیق کر کے زمانے کو مرتب کیا انہوں نے اور پھر وہاں سے ان کی ساری تاریخ سامنے آئی۔ یہ تاریخ ان سے کہیں مختلف تھی جو ان لوگوں نے ویسے اکٹھی کی ہوئی تھی۔ قرآن کی آیت پہ آ رہے ہیں ہم۔ اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ (40:82) یہ یسیروا فی الارض کیوں کہا یہ کیوں نہیں کہا کہ لائبریری میں جا کے بیٹھ کے دیکھتے نہیں ہو کہ کیا کچھ ہے' کیوں نہیں کہا کہ فلاں کتاب اثریات ہے اس کو اٹھا کے کیوں نہیں دیکھ لیتے۔ اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ (40:82) کہا بنیادی سند تاریخ کی جو ہے اسکی طرف جاؤ اور (فینظروا)(40:82) وہاں اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ بہت بڑا فریضہ قرآن نے عائد کیا ہوا ہے۔

ہم نے دین کو مذہب میں بدل دیا ہے

آپ کو شاید یاد ہوگا پھر وہ بات ذہن میں آ گئی کہ پھر دین' مذہب میں کیسے تبدیل ہوا۔ یہ سیروا فی الارض قرآن کا فریضہ ہے اور یہ چیزیں تو پھر کچھ آپ بیتی کی ہیں جو سنا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت صاحب سے ملنا ہے جواب ملا نہیں' حضرت صاحب تو مل نہیں سکتے' بھئی کب ملیں گے دو چار دن میں؟ کہنے لگے نہیں وہ تو قریب چالیس دن کے بعد ملیں گے' بھئی یہاں نہیں ہیں؟ کہا یہیں ہیں اندر' وہ چالیس دن اندر کیا کریں گے؟ کہ حضرت صاحب آج کل سیروا فی الارض کا مراقبہ کر رہے ہیں' چلہ کر رہے ہیں۔ یعنی ویسے تو یہ سیروا کا چلہ کرنے سے کم از کم باہر تو آ جاتے تھے اب یہ سیروا فی الارض کا فریضہ ادا ہو رہا ہے۔ چالیس دن اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلیں گے سیروا فی الارض کا چلہ ہو رہا ہے۔ قرآن نے جو فرض قرار دیا تھا وہ یوں پورا ہو رہا ہے' ایک گوشے میں بیٹھے ہیں۔ تو اُس نے تو کہا تھا کہ فینظروا'

کہنے لگے ٹھیک ہے ہم آنکھیں بند کرتے ہیں سب کچھ نظر آجاتا ہے۔ اس نے فیلٹر والا اسی لیے کہا تھا کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ نظر سے اس کا تعلق ہے۔ وہ کہتے ہیں نہیں یہ آنکھیں بند کرنے کی بات ہے۔

اپنے اپنے خود ساختہ نظام ہائے زندگی کے نتائج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے والی قوموں کو خطاب

بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ (40:82) یعنی یبصروا وہ کہتا تو پھر بھی تھا کہ شاید نگاہِ بصیرت ہی سے کہہ رہا ہے۔ وہ Physical آنکھ کی طرف اشارہ کر رہا ہے یَنۡظُرُوۡا دیکھو ان آنکھوں سے جاکے۔ تو دیکھا تو اسی طرح جائے گا' وہ جو کھنڈرات وہاں پڑے ہوئے ہونگے' ان کھنڈرات کے نیچے جو چھپا ہوا ہے ان سے دیکھا جائے گا نا۔ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ کَانُوۡۤا اَکۡثَرَ مِنۡهُمۡ وَ اَشَدَّ قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ (40:82) کہا یہ قومِ مخالف جو اس وقت تمہارے سامنے آ رہی ہے اور وہ کہہ رہی ہے کہ ہم نے اتنا مال اکٹھا کیا' اتنی اولاد ہے' اتنے ابنائے خاندان ہیں' اتنا جتھہ ہے۔ کہنے لگے وہ قومیں ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ صاحبِ طاقت تھیں' کہیں زیادہ تعداد ان کی اَکۡثَرَ مِنۡهُمۡ وَ اَشَدَّ قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ (40:82)۔ اور پھر جو کچھ وہ اپنے نشانات دنیا کے اندر قائم کر گئے اس اعتبار سے تمہاری مخالف اقوام ہیں ان سے کہیں زیادہ آگے بڑھی ہوئی تھیں۔ یہ تو شے ہی کچھ نہیں ہیں اس کے مقابلے میں۔ اَکۡثَرَ مِنۡهُمۡ وَ اَشَدَّ قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ (40:82) یوں ان کا کسبِ ہنر جس سے یہ کچھ انہوں نے کیا' کسی کام نہ آیا۔

استبداد کی بنیاد ضرورت سے زیادہ جمع کرنے میں شروع ہوتی ہے

فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ (40:82) کیا کیا الفاظ ہیں عزیزان قرآن کے۔ قومیں یہ کچھ اکٹھا کر کے تو مستغنی سمجھ لیتی ہیں اپنے آپ کو کہ اب ہمیں کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے۔ یہیں سے استبداد شروع ہوتی ہے' یہیں سے دھاندلی شروع ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی قوم یا کوئی فرد یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اب کسی کی پرواہ نہیں ہے' وہ دھاندلی شروع کر دیتا ہے۔ اور جس چیز سے دھاندلی شروع ہوئی وہ لفظ کہا ہے فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ (40:82) جس دولت و قوت کی بناء پہ وہ اپنے آپ کو کہتے تھے کہ ہم مستغنی ہو گئے ہیں' ہمیں کسی کی پرواہ نہیں ہے' وہ ان کے کسی کام نہ آیا' وہ ان کو مستغنی نہ کر سکا' اس تباہی سے بچا نہ سکا مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ۔ فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ وَ حَاقَ بِهِمۡ مَّا کَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (40:82-83) یونہی نہیں کہ چپکے سے بغیر کچھ بتائے ہوئے تباہی آ گئی' آئے ان کو بتانے والے' کہنے والوں نے کہا ان سے کہ غلط ہے یہ روش اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ تم کیا بتا رہے ہو' ہمارا علم بڑا وسیع ہے' ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ ہوا کیا؟ حَاقَ بِهِمۡ مَّا کَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (40:83) مذاق اڑایا ان کا

او جاؤ بابا اس قسم کی باتیں سنتے چلے آ رہے ہیں ہم' جاؤ جاؤ وعظ کہو تم جا کے' ہم جانتے ہیں اپنے معاملات کو ہم نے پوری طرح سے تمام انتظامات کر رکھے ہیں۔ کہا کہ باطل کے نظام کی تباہی کے نتائج جب سامنے آنے شروع ہوئے تو جن چیزوں کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی تباہی بن کے چھا گیا ان پر (حاق بھم) گھیر اڈال لیا اس نے۔

غلطی کا اعتراف نتائج نکلنے سے پہلے کرنا ہوتا ہے قرآن حکیم نے فرعون کی زندگی کو بطور مثال کہا ہے

فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗ (40:84) جب تباہی محسوس شکل کے اندر سامنے آ گئی تو اس وقت پھر یہ بات واضح ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں اس بات کو کہ یہ روش غلط تھی۔ ہم اس دوسری روش کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ کہا کہ نہیں۔ فَلَمۡ یَکُ یَنۡفَعُهُمۡ اِیۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا (40:85) جب غلط نظام کے تباہ کن نتائج تباہی بن کے سامنے آ جاتے ہیں تو پھر یہ اعتراف کوئی کام نہیں دے سکتا۔ وہ تو اس کی اصلاح کرنا ہوتی ہے اور جب اصلاح کرنے کا موقعہ اور وقت ہی باقی نہ رہے تو پھر یہ اعتراف کچھ معنی نہیں دیتا۔ بلکہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں نے آپ کو بتایا کہ قرآن نے فرعون کے قصے میں تو کہا یہ ہے کہ یہ بھی پستی کردار ہے کہ ایسے وقت میں جب تباہی سامنے آ جائے' اس وقت ڈر کے کہنا کہ ہاں میں ایمان لایا۔ قرآن نے کہا کہ جب یہ ڈوبنے لگا ہے تو کہا تھا کہ میں ایمان لا رہا ہوں۔ عزیزانِ من! فرعون جیسا اتنا بڑا اگر وہ ایمان لائے تو ہم لوگ تو جلوس نکالتے اس کا۔ قرآن کہتا ہے (لعنة) اولعنت ہے تجھ پہ' اتنے سے کردار کا ثبوت بھی نہ دیا موت سامنے آئی تو یہ کچھ کہنا شروع کر دیا' درکفر ہم پختہ نہ ای زنار را رسوا مکن' منافقت ہے یہ کردار نہیں۔ تو بات تو اصل میں یہ تھی کہ قرآن نے کہا ہے کہ اس وقت کی توبہ جب اس کی اصلاح کی گنجائش یا موقعہ باقی نہ رہے' وقت باقی نہ رہے' توبہ بے معنی ہو جاتی ہے۔ آخری سانس آتے وقت کتنا ہی بڑا طبیب حاذق اور اعلیٰ درجے کا ڈاکٹر آپ لے آئیں' وہ تو بات ختم ہو چکی ہوتی ہے' سوال ہی نہیں ہوتا۔ اُس وقت اگر مرنے والا یہ کہتا ہے کہ ہاں صاحب میں اب توبہ کرتا ہوں اس کے بعد کبھی سگریٹ نہیں پیؤ نگا تو وہ کہتے ہیں کہ اب اس کا فائدہ کیا ہے' وقت گذر گیا ہے' پھیپھڑے گل چکے ہیں۔

غلط نظام یا غلط ماحول میں قرآنی اقدار کو پیش نظر رکھنا بڑی جرأت کا کام ہے

فَلَمۡ یَکُ یَنۡفَعُهُمۡ اِیۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا (40:85)۔ اور وہ بات جو میں کہہ رہا تھا یہاں آئی ہے۔ کہا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِهٖ (40:85) خدا کا یہی ایک قانون ہے جو پہلی قوموں کے اندر بھی جاری رہا۔ اور دوسرے مقام پہ اس نے کہا (وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا) (33:62) اور اس قانون میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ وَخَسِرَ هُنَالِکَ الۡکٰفِرُوۡنَ (40:85) جنہوں نے صحیح نظام سے سرکشی برتی تھی' ان کا نتیجہ اس طرح کی تباہی ہوا کرتا ہے۔ یہ ہے وہ فریب جس سے نکالنا چاہتا ہے قرآن' افراد کو

بھی اقوام کو بھی۔ اور اقوام کو یہ سب سے پہلے ایڈریس کرتا ہے کہ افراد تو اقوام کے ہی تابع چلتے ہیں حقیقت میں۔ افراد تو بڑی خصوصیت کے مالک ہوتے ہیں جو غلط نظاموں کے اندر بھی اپنی اقدار کو قائم رکھتے ہیں۔ بڑی بات ہے عزیزانِ من! اور بڑی چیز ہے یہ۔ اور یہی لوگ ہوتے ہیں اور یہی شمعیں ہوتی ہیں اندھیری راتوں کے اندر جسے قرآن نے قندیلِ راہبانی کہا ہے کہ تاریک صحرا کے اندر کہیں ہاتھ نظر نہ آئے، کسی جھونپڑی کے اندر ایک چھوٹا سا دیا بھی انسان کے اندر زندگی کی کرن جگا دیتا ہے۔ اس لیے ایسے تاریک دور کے اندر تھوڑے سے کریکٹر کا مظاہرہ بھی وہ بڑی چیز ہوتی ہے، حوصلے بندھ جاتے ہیں تنہا مسافروں کے کہ کوئی بات نہیں یہاں کوئی اور ہے اس صحرا کے اندر۔

مجرم قوم خواہ اس کا تعلق کسی دور سے ہو آخر کار اس پر روڈ رولر پھیر دیا جاتا ہے

اوپر سے چلی آ رہی ہے داستاں قومِ عاد کی۔ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا (46:25) قرآن کا انداز بھی جسے آپ Story Writing کہتے ہیں آپ نے دیکھا ہوگا آج کل ایک نیا انداز چلا ہے کسی کہانی کو، افسانے کو ابتداء سے شروع نہیں کرتے کہ ایک تھا وہ، ہمارے ہاں تو یہ تھا نا کہ ایک تھا بادشاہ اس کا یہ تھا اور وہاں سے آخر تک پہنچاتے ہیں۔ اب انداز یہ آ گیا ہے کہ درمیان سے کوئی بات شروع کرتے ہیں اور اس کے بعد پھر واپس لاتے ہیں۔ قرآن کا یہ انداز تھا بات کرنے کا۔ تباہی سے بات شروع کی اور تباہی کے لیے لفظ ہے یہ جسے روڈ رولر آپ کہتے ہیں، کہنے لگا کہ اس کے بعد انجام اس کا یہ سمجھ لیجیے کہ روڈ رولر پھر گیا۔ لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ (46:25) بس یہ دیکھ لو جو باقی رہ گئے۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (46:25) جتنی بھی قومیں مجرمین ہیں، مجرم جو ہیں ان کا انجام یہ ہوا۔ كَذٰلِكَ (46:25) کیا بات ہے کذٰلک کہنے کی کہ یہ انجام ہوا کرتا ہے۔

لفظ جرم مجرمین کے مفہوم پر دورِ حاضر کی سیاست کا مدار اور اس کا فلسفہ حیات

جرم کے معنی تو زبان کے اعتبار سے بڑے ہی وسیع ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر عربوں کے ہاں جرم کا مطلب کسی دوسرے کے پھل کو کاٹ کے اپنے گھر لے جانا تھا۔ 'دانہ ایں می کارد وآں حاصل برد' بات کہتا ہے دورِ حاضر کی سیاست کے متعلق امتے برامتے دیگر چرد' ہر قوم کا مویشی اپنے کھیت میں نہیں چرتا دوسرے کے کھیت میں اس کو چراتا ہے 'دانہ ایں می کارد وآں حاصل برد' جوتتا بیجتا بوتا یہ ہے اور فصل کا خرمن کوئی اور اٹھا کر لے جاتا ہے۔ یہی تو وہ خرمن تھا کہ جس کے متعلق اقبال نے کہا کہ دہقان کو اگر اس سے روزی میسر نہیں آتی تو پھر اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔ جلا دینے سے ایک نقصان تو ہوگا جو منفیانہ نقصان ہے۔ مگر جو چیز کہ ماحصل لے جانے کے بعد اُسی ماحصل کے زور پہ پھر آئندہ سال بھی قوت اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جلا دینے سے یہ قوت تو نہ اسکے ہاتھ میں رہے گی۔ بات اور طرف نکل گئی۔

ابدی قوانین کی خلاف ورزی کے باعث علم وفضل کی دولت سے مالا مال مملکتیں مکافات عمل کی زد سے نہ بچ سکیں

كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (46:25) آپ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ من! کیا اشارہ کرتا ہے۔ یہ ہیں ان کے مساکن اور یوں ہم قوم مجرمین کو ان کے کردار کا بدلا دیا کرتے ہیں۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ (46:25) یہ قوم بیچاری کیا قوم بنی پھرتی ہے، جو تمکن ان کو حاصل ہوا تھا' ان کے خواب وخیال میں نہیں آ سکتا وہ تمکن۔ اور اگلی بات یہ کہ ایسا نہیں تھا کہ بڑے بے وقوف تھے جاہل تھے' وحشی تھی' بربریت تھی' جس کی وجہ سے ایسا ہو گیا۔ بالکل نہیں۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً (46:26) دوسری جگہ ہے مستبصرین (29:38) وہ دیکھنے بھالنے والے تھے' آنکھیں رکھتے تھے' سماعت رکھتے' سوچنے کی صلاحیتیں رکھتے تھے' علم وفضل رکھتے تھے' سائنس کے میدانوں میں ان کی کیفیت یہ تھی کہ کرۂ ارض کیا آسمانوں تک چلے گئے' تھے چاند تک ان کے پاؤں کے نیچے تھے یہ ان کی کیفیت تھی یہ سب کچھ انہیں حاصل تھا۔ اور پھر وہی الفاظ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَىْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (46:26) جب انہوں نے خدا کے ابدی قوانین کی خلاف ورزی میں سرکشی اس طرح سے برتی' يَجْحَدُوْنَ ہے یہاں لفظ کہ ضد کی بناء پہ ایک چیز کا کہے جانا کہ ہم نہیں مانتے۔ علم کی بناء پہ اگر وہ آتے تو یقیناً اسے تسلیم کر لیتے۔ لیکن جن صحیح قوانینِ انسانیت سے ضد کی بناء پہ انکار کیے چلے جا رہے تھے' ان کی سمع اور بصر اور فواد یہ تمام ذرائع علم فہم فراست بصیرت' یہ عقل کچھ کام نہ آئی ان کے۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (46:26) وہی الفاظ۔ جن چیزوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے گھیر لیا ان کو آ کے۔ تِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ (28:58) یہ دیکھیے یہ ہیں کھنڈرات۔ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (46:25) او دیکھنے والو سمجھ رکھو اس طرح سے انجام ہوا کرتا ہے ان کا جو جرائم پہ اتر آتے ہیں۔

روما اور ایران جیسی عظیم مملکتوں کی تباہی کی وجہ جواز اور آج نظام سرمایہ داری کی پیدا کردہ تباہ کاریاں

دیکھا قرآن کیا بتا رہا ہے بات یہ تھی دیکھئے کہ بد دیانتی' بے ایمانی کتنی پھولتی پھلتی ہے' کہا اس فریب میں نہ آ جانا کہیں۔ تم تو انہیں دیکھ رہے ہو' ان کے ہاں تو بات ہی کچھ نہیں ہے۔ آؤ ہم تمہیں ایسی قومیں بتائیں کہ تاریخ میں آج تک ان کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ روما کی سلطنت' ایران کی سلطنت علم و ہنر کی داستانیں آپ دیکھئے دنیا کے اندر' تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ اور وہاں جا کے دیکھئے تو کھنڈرات کے علاوہ کوئی زندہ نشانی ان کی باقی نہیں نظر آتی۔ اور سب سے بڑی چیز جو قرآن کہتا ہے اس باب میں وہ آج کے دور میں جس کی زیادہ اہمیت ہے' وہی نظامِ سرمایہ داری جس کو کہا جاتا ہے۔

کہا کیفیت یہ ہے انسان کی۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پہ ہے کہ جس سے بھی آپ یہ کہیں مثلاً کسی صنعتکار سے یا کسی بڑے تاجر

سے کہیں، جنہوں نے بہت تھوڑے وقت میں سرمایہ حاصل کرلیا ہو' وہ ہمیشہ یہ کہیں گے کہ ہم میں یہ صلاحیت تھی اس چیز کی' یہ ہماری ہنر مندی کا نتیجہ ہے' ہماری قابلیت کا نتیجہ ہے' یہ جو کچھ ہم نے حاصل کرلیا ہے۔ وہی یہ بات کہ اس میں دوسروں کا کیا حق' یہ تو سراسر ہماری محنت کا پھل ہے''اے جنوں کیندے نیں اے چاچے لگدے نیں''۔ میں نے اس کو اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے' یہ ٹھیک ہے ان کو میں کچھ گداگری کے طور پر خیرات کے ٹکڑے بانٹ دونگا۔ یہ بات کہ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19) جن کی اپنی محنت سے ضروریات پوری نہیں ہوتیں ان کا یہ حق معلوم ہے تمہارے اس مال کے اندر' As of right ڈیمانڈ کر سکتے ہیں۔ حق ہے خیرات نہیں۔ وہ مانگتے ہیں تو خیرات نہیں مانگتے تم دیتے ہو تو کوئی احسان نہیں کرتے' As of right مانگ سکتے ہیں۔ اور وہ تم نے مملکت قائم کی تھی Constitution بنایا تھا کہا تھا کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (6:151) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں۔ تم نے یہ ان سے وعدہ کیا تھا تو اب ان کا حق Establish ہوگیا' آج کی اصطلاح میں جسے Constitutional Right آپ کہتے ہیں۔ Right ہے' لاء کی بھی ضرورت نہیں۔ لاء تو صرف یہ کہے گا کہ اس کا Right ہے یہ ملنا چاہیے۔ Right ہے قرآن کہتا ہے (حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ)(70:24-25)۔ یعنی یہ جواب ہے ان کی اس دلیل کا کہ یہ جو کچھ ہے ہماری ہنرمندی کا نتیجہ ہے ہماری قابلیت کا نتیجہ ہے۔ الفاظ پڑھ دوں تو پھر اگلی بات کہونگا۔ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا (39:49) مصیبت آتی ہے ہمیں پکارتا ہے۔ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا (39:49) ہماری طرف سے جب اس کو کوئی چیز ملتی ہے قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ (39:49) وہ کہتا ہے یہ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ جو کچھ مجھے ملا ہوا ہے اس میں خدا کیا' خدا کی دین کیا' اس کی نعمت کیا' اس کی طرف سے کیا' کیا باتیں تم کر رہے ہو۔ عَلٰى عِلْمٍ (39:49)۔ یہ الفاظ دو مقام پہ آئے ہیں ایک مقام پہ تو براہِ راست قارون کی طرف سے آیا ہے کہ اس نے یہ بات کہی۔ اور دوسری جگہ عام طور پہ سرمایہ دار یہ کہتے ہیں' دولت اکٹھی کرتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے کسی اور کا حق اس میں نہیں ہے۔ میری مرضی ہے جتنا دوں کسی کو' بطور حق کے نہیں کوئی لے سکتا اس میں سے۔ یہاں کہا کہ عام طور پہ ذہنیت یہ ہوتی ہے۔ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (39:49) کہا اصلی فساد کا موجب تو یہ ذہنیت ہے وہ اتنا روپیہ جو اکٹھا کرلیا۔ وہ تو چھینا بھی جا سکتا ہے' بدلا بھی جا سکتا ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کے متعلق قرآن حکیم کی وضاحت اور فیصلہ

هِيَ فِتْنَةٌ (39:49) یہ ذہنیت ہے اصل فتنہ اور فساد۔ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (39:49) علم و بصیرت کی بنیادوں پہ یہ بات نہیں سوچتے۔ ایسے سوچیں تو ان کو نظر آجائے کہ کتنی بڑی فساد کی بنیاد ہے یہ ذہنیت جو ہے۔ اور یہ نئی بات نہیں وہی بات۔ قَدْ قَالَهَا

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (39:50) ان کی بات نہیں ان سے پہلے بھی اس قسم کے لوگ اس نظام کے حامل یہی کچھ کہا کرتے تھے۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (39:50) جو کچھ انہوں نے اس طرح سے جمع کر رکھا تھا وہ انہیں بچا نہ سکا تباہی سے۔ وہی اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

تدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بناء سرمایہ داری ہو

قرآن یہ کہہ رہا ہے فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (39:50) ان کے تدبر کی فسوں سازیاں ان کو بچا نہ سکیں۔قرآن نے یہاں بھی کہا ہے نِعْمَةً مِّنَّا' سورۃ نحل میں بھی یہ بات آئی ہے کہ اکتسابِ رزق میں تم دیکھو گے فرق ہوتا ہے۔تو وہ جو زیادہ کما لیتے ہیں وہ اس میں ان لوگوں کو شریک نہیں کرتے کہ جو پوری محنت بھی کرتے ہیں اس کے باوجود اس کا ماحصل اتنا نہیں ہوتا۔ وہ انہیں یہ زائد دولت میں جو حصہ نہیں دیتے یہ کہتے ہوئے کہ صاحب واہ اس طرح سے تو گھوڑا گدھا سب برابر ہو گئے۔فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (16:71) وہاں لفظ ہے سب برابر ہو گئے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اگر ہمارے ہاں بھی اگر کہیں اکنامکس پہ ریسرچ ہوئی' مساعد حالات ہوئے اور قرآن کو بنیاد کسی نے بنایا تو وہ بتائے گا کہ یہ قرآن بنیادیں کیا بتاتا ہے۔وہاں کہا ہے اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (16:71) بات سمجھئے یہ کیا ہے۔ بنیادی طور پہ کہا یہ جاتا ہے اور یہ چیز میں عرض کروں کہ مجھ پہ یہ بیتتی ہے' علمائے اقتصادیات اکثر آتے ہیں اور نئی جنریشن کے نوجوان بھی۔

انسانی صلاحیتوں کے فرق کی نوعیت اور قرآنی نظام میں ان کے استعمال کا طریق

سوال ہی یہ کرتے ہیں کہ پیدائشی طور پہ بھی بچوں کے اندر صلاحیتوں کا فرق ہوتا ہے۔ دماغی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں' کوئی بڑا ہی ذہین پیدا ہوتا ہے کوئی کم ذہین پیدا ہوتا ہے۔تو آپ اس فرق کو کیسے مٹا دیں گے۔ یہاں انسان واقعی کچھ شش و پنج میں پڑ جاتا ہے۔اور پھر یہ صغریٰ کبریٰ قائم کیا اور آگے اس کا منطقی نتیجہ کہ یہ طبقاتی تفاوت تو پھر خدا کا منشا ہے۔ وہ تفاوتی چیز تو پیدائشی ہوتی ہے بچوں کے اندر' خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔تو پھر خدا تو خود یہ طبقات کی تقسیم کر رہا ہے' وہ چاہتا ہے کہ یہ باقی رہیں۔اور سطح بیں آدمی واقعی اس فریب میں آ جاتا ہے کہ واقعی یہ فرق ہوتا ہے اور فرق اگر اس کی طرف سے ہوتا ہے تو پھر تم کون ہوتے ہو مٹانے والے۔ یہ ہے بنیاد صاحب اور یہ ہے جو سورۃ نحل میں اس نے کہا۔اور عزیزانِ من! قرآن نے ایک لفظ میں جواب اس کا دیا ہے اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (16:71) سوچئے تو ایک سیکنڈ میں بات سمجھ میں آ جائے گی۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ صاحب' پیدائش کے اعتبار سے اس کو زیادہ اچھی صلاحیت میسر آئی۔

قرآن کہتا ہے کہ جو چیز تم خود کہہ رہے ہو کہ اس کو پیدائش کے اعتبار سے ملی نہ تو اس نے خریدی، نہ اس نے محنت سے حاصل کی تو اس کا معاوضہ کیا مانگتا ہے یہ۔ وہ کہتا ہے معاوضہ تو اس کا مانگے جو اس نے خود کچھ کیا ہو۔ اور خود تو لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39) خود تو محنت ہی کرتا ہے انسان' محنت کا تو معاوضہ ہوگا۔ تم مانتے ہو کہ خدا کی طرف سے زیادہ ملی ہے' اسے کیا حق حاصل ہے کہ خدا کی طرف سے دی ہوئی چیز کا معاوضہ خود مانگتا ہے۔ یعنی ایک بچہ اگر اپنے باقی ماندہ اہل خانہ سے زیادہ خوبصورت پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے بعد وہ کہتا رہے کہ لاؤ سو روپیہ میں خوبصورت پیدا ہوا تھا۔ او ٹھیک ہے ''او ہدے اچ تیری کنی کاریگری ہیگی اے' جیہڑا او بیچارہ ذرا کوہجا پیدا ہو گیا اے او ہنے کی جرم کِتا ہیگا سی تے توں کیہڑی کاریگری ورتی ہیگی سی''۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ذہنیت ہر جگہ ہے۔ یہ جن چیزوں میں اپنے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس بناء پہ ساری عمر آدمی دوسرے سے کچھ مانگتا چلا جاتا ہے کہ میرا حق ہے یہ۔ امیر کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کا کوئی دخل نہیں کہاں پیدا ہو گیا' ساری عمر یہی کہ جاگیر ورثہ میں مل گئی' عزت مل گئی' توقیر مل گئی۔ یہ بھی چھن گیا تو اس کے بعد پھر یہ بات کہ صاحب ہم سید زادے ہیں۔ ''او تیری کاریگری ایہدے اچ کا ہدی اے''۔

مختلف انسانوں میں مختلف صلاحیتیں پیدا کرنے کی وجہ جواز تقسیمِ کار کو سرانجام دینے کے لیے ہے

عزیزانِ من! ایک لفظ کہا تھا قرآن نے' ساری عمر غور کرتے چلے جایئے آپ دیکھیں گے کس طرح پیچیدگیاں حل ہوتی چلی جاتی ہیں جس سطح ہیں انسان کچھ وقت کے لیے تو واقعی اس بھنور میں پھنس جاتا ہے کہ بات تو ٹھیک کہی ہے اس نے کہ قابلیتیں یا صلاحیتیں بچوں کے اندر تو مختلف ہوتی ہیں۔ اگلا غلط نتیجہ جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا طبقات رکھتا ہے۔ کہا یہ بات نہیں۔ قرآن نے خود کہا' کہ معاشرے میں تقسیمِ کار ضروری ہو جاتی ہے۔ لِّيَتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا (43:32) یہ تقسیمِ کار کی بات ہے۔ اس نے کہا کہ یہ جو کہہ رہا ہے کہ مجھ میں زیادہ ہے یہ' جتنا زیادہ دوسرے سے کہہ رہا ہے اس سے پوچھو کہ اس میں تیرے کسب و ہنر کا کیا دخل ہے۔ نعمۃ اللہ ہے خود مانتے ہو نعمۃ اللہ ہے تو کہا کہ جو خدا نے دی ہوئی ہے اس کا معاوضہ خود کیوں مانگ رہے ہو۔ دوسری جگہ قرآن نے کہا کہ ان سے کہو کہ خدا کی دی ہوئی چیز کا معاوضہ' خدا کو لوٹا دو' اس کی تھی اس کو دیدو۔ باقی کیا رہ گیا' تمہاری محنت' محنت کا معاوضہ لے لو۔ جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

عقل و فکر کی روشنی میں قائم ہونے والے معاشرے میں تفاوت کو کم سے کم حد تک بھی لایا جا سکتا ہے

عزیزانِ من! یہ باطل تصورات کہ وہ خود تفاوت پیدا کرتا ہے۔ یہ الگ چیز ہے۔ آگے جو قرآن کہتا ہے کہ تمہارا علم آگے بڑھتا چلا جائے گا' یہ بچوں کے تفاوت بھی کم ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ تو جسمانی ساخت ہے' یہ تو دماغ کے سیلز (Cells) ہیں۔ اور سائنس جاننے

والی قوموں نے یہ تفاوت کم کرنے شروع کر دیے ہوئے ہیں۔ پہلے تو قوموں کے مقابلے میں، وہ قومیں ہم سے زیادہ صلاحیتوں والے بچے پیدا کر رہی ہیں، زیادہ تنومند توانا بچے پیدا ہو رہے ہیں، دماغی اعتبار سے زیادہ صحت مند بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر ان کے اندر بھی اتنا نمایاں فرق نہیں ہوتا جتنا ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک چیز ہے۔ لیکن اس کو تسلیم کیے ہوئے کہ ٹھیک ہے فرق ہے، لیکن دلیل تو وہ ہے جو قرآن دیتا ہے کہ بابا کچھ اپنی محنت سے کیا ہوا ہو تو اس کا تو معاوضہ بھی مانگو، تمہیں خود تسلیم ہے کہ یہ ہمارا اپنا نہیں ہے، ملا ہوا ہے خدا کی طرف سے۔ تو اس کے بعد یہ نتیجہ تمہاری کج نگہی کا پیدا کردہ ہے کہ خدا تفاوت رکھنا چاہتا ہے۔ وہ تفاوت نہیں رکھنا چاہتا۔ اس معاوضہ کے تم حقدار نہیں ہو۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں زیادہ صلاحیتیں پانے والوں کی بلند فکری جو باعثِ تقلید ہے

اسی لیے قرآن حکیم نے کہا ہے کہ جو مومن اس نظریہ پہ ایمان رکھنے والا ہے، وہ قوم جو یہ مانتی ہے کہ صلاحیتوں میں فرق ہے، زیادہ صلاحیت سے زیادہ کمایا جا سکتا ہے۔ وہ جو اپنی ضرورت سے زیادہ دوسروں کو دیدیتا ہے تو کہتا ہے کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9) اس کا کوئی معاوضہ ہم تم سے نہیں مانگتے اس لیے کہ یہ میرا نہیں تھا، مجھے تو مفت کہیں سے ملا تھا۔ جس خدا نے مجھے یہ دیا تھا اس سے جو زیادہ ملا ہے اُس نے کہا ہے کہ فلاں کو دیدو، تو میں نے دیدیا، تم سے میں معاوضہ کیا مانگوں۔ (وَّلَا شُكُوْرًا)(76:9) وہ کہتا ہے کہ اچھا بھئی تمہارا شکریہ، وہ کہنے لگا نہیں شکریہ بھی اس چیز کا ہوتا ہے جو میں دوں تمہیں، شکریہ ادا کرنا ہے تو اس کا ادا کر جس نے مجھے یہ صلاحیت دی اور ساتھ کہہ دیا کہ اس کو جا کے دیدو۔ کیا بات ہے صاحب!!!۔ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ من! جسے آپ نے Purely Economic اور اقتصادیات کے مسائل کہا ہوا ہے، قرآن کس طرح سے حل کرتا ہے ان کو۔

سوشل ازم کے نظام کی موجودہ حالت اور حیوانی سطح کی اقدار کے منتہا فلسفۂ حیات کا نتیجہ

پھر اگلی چیز کس طرح سے حل کی اس نے۔ عام الفاظ جو آپ کہہ لیں روٹی کپڑا اور مکان وغیرہ یعنی منتہا ہی زندگی کا یہ ہوا۔ اس کو بھی چھوڑ دیجیے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے یا نہیں، آج تک یہاں ہمارے ہاں تو نظام ہی سوشل ازم کا نہیں ہے، جن اقوام میں یہ نظام آیا وہاں بھی یہ چیز ابھی تک پوری نہیں ہو سکی۔ وہاں بھی اتنا فرق ہے عام مزدور اور عام کاشتکار میں اور اوپر کے طبقے میں کہ جو نظام سرمایہ داری والا ہے۔ چھوڑ دیجیے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ہو بھی جائے، فراوانی سے کچھ مل بھی جائے جسے آپ زندگی کی ان ضرورتوں کی فراوانی کہتے ہیں، خوشحالی کہتے ہیں۔ افراد کو یہ کچھ بھی مل جائے تو کیا اس سے انسانی معاملات حل ہو جائیں گے۔ انسان کی زندگی اتنی ہی ہے؟۔ حیوان کی تو اتنی ہی ہے اُسے اگر پیٹ بھر کے کھانے کو مل جاتا ہے تو پھر کوئی پرابلم باقی نہیں رہتی، اس کی پرابلم ہی کھانے پینے کی ہے۔ اس لیے کہ

زندگی ہی طبعی ہے‘ طبعی اسباب ملے زندگی کا مقصود پورا ہو گیا‘ مطلوب مل گیا‘ منتہا حاصل ہو گیا۔

کیا نظام سرمایہ داری نے انسانیت کے مسائل کو حل کر دیا ہے؟

کیا انسانی زندگی کا مقصود و مطلوب اتنا ہی ہے کہ اگر اس کو یہ طبعی سامانِ زیست جسے آپ روٹی کپڑا مکان یا دوسری چیزیں مل جائے تو کیا واقعی انسانی معاملات حل ہو جاتے ہیں۔ ہم سے نہ پوچھو ان سے پوچھو جنہیں اتنا ملا ہوا ہے‘ سنبھال نہیں سکتے‘ پوچھئے آپ کی زندگی کے تمام مسائل حل ہو چکے ہیں‘ اطمینان حاصل ہے آپ کو‘ پورا سکون مل گیا کوئی پرابلم باقی نہیں رہی؟ اور پھر اس نظام سے پوچھئے قرآن کہتا ہے کہ جس میں یہ چیزیں حاصل ہو جائیں اور اقدار اور Values اس میں نہ رہیں۔ جب منتہا یہ ہو جائے کہ کھانے پینے کو ہر ایک کو ملنا چاہیے تو اس میں اقدار کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا۔

قرآنی اقدار ہی انسانی اور حیوانی سطح زندگی میں فرق پیدا کرتی ہیں

لینن نے اسی لیے کہا تھا کہ ہمارے سوشلزم یا کمیونزم کا ماحصل یہ ہے کہ ہر ایک کو اس میں کھانے پینے کو ملے اور ہم کسی Value کسی اقدار‘ کسی ابدی قانون کے‘ قائل نہیں ہیں ہم جانتے نہیں اخلاقیات کس کو کہتے ہیں۔ یہ نظامِ سرمایہ داری کے حاملوں کا پیدا کردہ فریب ہے۔ Values کوئی نہیں‘ اقدار کوئی نہیں تو انسان کی زندگی سطح حیوان پہ آ جاتی ہے۔ حیوان کو Value کا تصور نہیں ہوتا۔ انسان Value کے تصور سے اونچا جا نہیں سکتا۔ اتنا کچھ کسی کو دے دیجئے اس دینے کے بعد ذرا گھور کر دیکھئے اس کی طرف‘ کچھ نہیں کہا آپ نے اس کو‘ گالی دیدیجئے‘ جاتے جاتے اس سے کہہ دیجئے‘ بڑا کمینہ ہے۔ اور میں کہتا ہوں اس نے سن لیا‘ غیرت مند ہے‘ اٹھا کے پھینک دے گا‘ کہہ دے گا کہ بھوک سے مرجانا اچھا ہے یہ سننے کی بجائے۔ یہ کیا چیز تھی روٹی کپڑا مکان ہی اگر چیز سب کچھ ہے وہ تو مل گیا تھا اس کو بڑی عمدگی سے پھر وہ فرق کیوں پیدا کیا جاتا ہے۔ ہے نا Value کا کوئی تصور۔

قرآن حکیم عقل انسانی کو ایک مستقل روشنی عطا کرتا ہے

وہ کہتا ہے کہ نظام وہ چل سکنے کے قابل ہے جس میں Values کی بنیادوں پہ معاشی نظام قائم ہو۔ قرآن حکیم کہتا ہے میں کر کے بتاتا ہوں اور وہ چیلنج کرتا ہے کہ تم Values کو درمیان میں سے نکال کے Mechanically کوئی نظام قائم کر کے بتا دیجئے‘ نہیں چل سکے گا۔ چار دن کی بات نہیں ہے۔ جواری بھی جس دن جیت کے آتا ہے‘ راوی عیش لکھتا ہے۔ پہلے دن جب وہ آتا ہے کمانے کے بعد تو اکڑتا ہے‘ دوسرے ہی دن جب وہ ہارتا ہے تو اس کے بعد میرے مولا‘ میری بگڑی بنا دے۔ کہتا ہے یہ چیز قمار بازی ہے۔ بات آ گئی

یاد' یہ قمار تو قمر سے ہے اور قمر کے متعلق کل تک تو یہی پتہ تھا کہ دنیا کی حسین ترین چیز اور اسی چاند سے جواب پردہ اٹھتا ہے' وہ تصویر سامنے آتی ہے' بچے ڈر جاتے ہیں۔ جب بے نقاب ہوا ہے چاند تو اندر سے یہ نکل آیا ہے۔ پتہ نہیں اس قوم نے ''قمار'' یہاں سے کیوں لفظ نکالا تھا۔ اس کی چاندنی' روشنی' حسن تو اتنا فریبِ نگاہ دلکش اور جاذب اور اسکے بعد اس کی تصویر آتی ہے تو بڑی بھیانک۔ یہ قمار یہاں سے تھا۔ بہر حال وہ یہ کہتا ہے کہ یہ جو تم خوشحالیاں دیکھتے ہو' یہ جوئے بازی کی جیت ہے۔ ایک ہی دن میں نہ فیصلہ کرلو۔ دو چار دن وہاں انتظار کرلو اس کے بعد پھر تم یہ دیکھ لینا۔ عجیب عجیب مثالیں دیتا ہے۔

کسی کی متواتر ثابت قدمی کے ساتھ کی گئی محنت نسل در نسل پھل دیتی ہے

قرآن۔ وہ پودا جو دو دن کے اندر کھڑا ہو جاتا ہے' دس دن کے اندر وہ جو پھل بھی دیدیتا ہے' کہتا ہے تیسرے دن پھر مرجھا بھی جاتا ہے۔ کھجور کے پودے کو دیکھو' ٹھیک ہے چالیس سال اس زمانے میں لگتے تھے پکنے میں اور اس کے بعد کہتا ہے چار ہزار سال تک کچھ نہیں بگڑتا۔ مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (13:17) بقاء اس کے لیے ہے جو انسانیت کی منفعت کے لیے تم کرتے ہو۔

قوموں کی زندگی کا معیار صرف دولت کی فراوانی پہ ہی نہیں ہوتا

جتنی فراوانیاں قرآن کہتا ہے معاش کی اس بناء پہ لفظ آ گیا کہا تمہارے نظام میں یہ بات ہے کہ جس قوم کے اندر معاشی خوشحالیاں ہوتی ہیں' وہ قوم تباہ نہیں ہوتی۔ مطمحِ نگاہ یہ ہے' یہ ہے نصب العین تمہارا۔ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا (28:58) کتنی ایسی قومیں تم تاریخ میں دیکھو گے Over Flow کر رہا تھا رزق جن کے ہاں' یہ ان کی کیفیت تھی۔ جاؤ جا کے دیکھو کہ کتنی دولت تھی ان کے پاس۔ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا (28:58) اور یہ ہیں ان کے مساکن کے کھنڈرات جن میں ان کے بعد کوئی بسا ہی نہیں' اس قسم کی تباہی۔ گھر خالی کر جائے کوئی تو دوسرا بس جاتا ہے' گھر تباہ ہو جائے تو اس میں پھر دوسرے نے بسنا کیا ہے۔ قومیں ایسی بھی تباہ ہوئی ہیں کہ ان کے بعد وہاں کسی دوسری قوم نے جگہ ہی نہیں لی' تباہی ایسی ہوئی ہے ان کی۔ یہ ہیں وہ قومیں لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ (28:58) کوئی وارث بھی باقی نہ رہا۔

دنیا میں آج تک کوئی بھی قوم یونہی تباہ نہیں ہوئی

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا (28:59) کہا ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے یونہی اندھیرے میں بغیر بتائے ہوئے کسی قوم کو تباہ کر دیا۔ قوموں کو پہلے واضح کر دیا جاتا ہے کہ یہ روش غلط ہے جس پہ چل رہے ہو۔

میں پوچھتا ہوں کہ آج دنیا کی کونسی قوم ہے جس تک یہ نہیں پہنچ سکا کہ یہ روش غلط ہے۔ختمِ نبوت کے معنی یہ تھے کہ اس کے بعد خود کوئی نبی آ کے براہِ راست نہیں بتا سکتا' ذرائع ابلاغ اور وسائلِ رسل ورسائل اتنے عام ہو چکے ہیں کہ دنیا ساری کی طنابیں کھنچ کے ایک محلّہ بن گئی ہوئی ہے۔ دنیا کا بعید تریں گوشہ بھی ایسا نہیں رہا جہاں آپ کہیں کہ آواز وہاں تک نہیں پہنچی۔اس لیے یہ جو کہا گیا ہے کہ کوئی قوم تباہ نہیں ہوتی کہ جب تک ہمارے پیغامبر وہاں نہیں آتے ۔ نبی ہی پیغامبر نہیں ہے آج تو پیغام ہوا کے کندھوں پہ لکھا ہوا ساری دنیا میں بیک وقت پھیل جاتا ہے اور پھیل چکا ہے۔

نوعِ انسانی کے لیے اب پیغام رسانی کا سلسلہ سن بلوغت تک پہنچ چکا ہے

آپ نے دیکھا کہ نبوت کا سلسلہ کیوں ختم کیا تھا قرآن نے ۔ پیغام ہی دینے کے لیے وہ آتا تھا' دنیا پھیلی ہوئی تھی تو ہر قریہ میں قرآن کہتا ہے' رسول آتا تھا' ہر قوم میں آتا تھا' ہر بستی میں آتا تھا' ہر زمانے میں آتا تھا۔اور جب آگے بڑھتا گیا انسان اور وہ دور آ گیا جس میں یہ بچہ بالغ ہو گیا اور یہ اسبابِ رسل ورسائل اور ذرائع ابلاغ اس قدر عام ہونے کا دور آ گیا اب ایک فرد جو تھا وہ خدا کی طرف سے آ کے پیغام پہنچائے' وہ سلسلہ ختم کر دیا۔پیغام کو محفوظ کر دیا' کہا اب یہ پیغام چلے گا خود بہ خود۔ یہ طاقت ہے اس پیغام کے اندر۔تو یہ جو کہا ہے کہ ہم نے کسی بستی کو اس طرح ہلاک نہیں کیا تا نکہ وہاں پیغام دینے والے نہ ہوں۔تو اب کہا جائے گا کہ تاوقتیکہ وہاں پیغام نہ پہنچا ہو۔اگلی بات یہ کہ پیغام پہنچا تو اس کے بعد بات کیا ہوئی پھر کون تباہ ہوا ان میں سے **وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ** (28:59) صرف اس وقت تباہ ہوئے جب وہاں کے رہنے والے ظالم تھے۔

قرآن حکیم کے نزدیک لفظ ظلم کی وضاحت اور اس کا انجام

اب ظلم کی بات قرآن سے پوچھیئے کہ کیا کیا چیزیں بتاتا ہے' کئی درس چاہئیں اس کے لیے عزیزانِ من! کہ ظلم کسے کہا جاتا ہے۔ قرآن نے جب بنیادی طور پر کہا کہ ہلاک وہی قوم ہوتی ہے جس میں ظلم آ جاتا ہے۔تو ظلم کی تفصیل وتشریح اس نے اس انداز سے کی ہے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی ابہام اور التباس نہیں رہا' متعدد گوشے اس نے گنائے ہیں ظلم کے۔ ہمارے ہاں یونہی ظلم کہا جاتا ہے دھاندلی' ناانصافی' زیادہ سے زیادہ کسی کورٹ کا فیصلہ جو ہمارے حق میں نہ ہو۔لیکن قرآن تو بڑی چیزوں کو ظلم کہتا ہے۔ بہرحال چھوڑیئے۔ وہ کہتا ہے تباہی آتی ہے جب ظلم آتا ہے۔عزیزانِ من! قرآن سے ظلم کو سمجھ لیجئے پھر پتہ چل جائے گا کہ ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ جب یہ بات ہے کہ **لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (33:62) وہ کہتا ہے کہ ظلم کا انجام تباہی ہوتی ہے' بتا رہا ہے کہ ظلم کیا ہے؟ اگر ظلم کسی قوم میں ہو رہا ہے تو وہ کہہ رہا ہے کہ ہماری یہ سنت بدل نہیں سکتی کہ ظالم پنپ نہیں سکتا۔**اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:21) بڑی چیز

ہے' ظالم کی کھیتی کو وہ پنپنے نہیں دیتا۔کہا بات یہ ہے وَ مَآ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ زِیۡنَتُھَا (28:60) ٹھیک ہے بہت کچھ ان کے ہاں تمہیں نظر آیا' بڑی مال و دولت ثروت' عیش و عیاشی کی زندگی۔تو کہا یہ سب چیزیں ٹھیک ہیں' یہ قریبی مفاد ہیں' طبعی زندگی کے مفاد ہیں۔وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی (28:60) خدا کے قوانین اور اقدار کے تابع جب یہی کچھ ملتا ہے تو اس میں خیر بھی ہے اور اَبۡقٰی بھی ہے۔دیکھو شر کے مقابلے میں خیر لے آیا قرآن کہ اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوگا۔اور اس کے بعد یہ چیز لایا پہلے کہا ہے کہ تباہی ہو جائے گی' وَّ اَبۡقٰی (28:60) اسی میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوگی۔کہا یہ بات یونہی نہیں ہم نے کہہ دیا کہ تم آنکھیں بند کر کے مان لو اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (28:60) عقل سے' جذبات سے الگ ہو کے اگر تم سوچو گے تو اسی نتیجہ پہ پہنچو گے جس پہ ہم پہنچا رہے ہیں کہ ظلم کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔افلا ''تعقلون'' کہہ رہا ہے۔

بات یہ ہوئی عزیزانِ من! قرآن نے کہا کہ یہ لوگ جو فریب سا کھا جاتے ہیں بد دیانتی' بے ایمانی' منافقت کا' آپ دیکھئے تو سہی آپ کہتے ہیں کہ یہ پنپ نہیں سکتے' وہ تو دن بدن آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں' دولت بھی ہے' قوت بھی ہے' اختیارات بھی ہیں' ثروت بھی ہے' سب کچھ ہے اور آج اس دور کے اندر بہر حال عزت بھی ہے اور چاہیے کیا۔کہا یہ فریب ہے جس میں یہ گھرے جاتے ہیں' یہ جوا ریے کی جیت ہے۔تھوڑا سا انتظار کیجیے اور اس کے بعد دیکھئے کہ کیا انجام ہے۔قرآن یہ چیزیں دیتا ہے' یہ نظری چیزیں الفاظ کے ذریعے دیتا ہے۔وہ اس کے ثبوت میں تاریخ کو بطور اپنی شہادت کے پیش کرتا ہے کہ دیکھو تاریخ تمہیں کس نتیجے پہ پہنچاتی ہے۔اور اس کے بعد کہتا ہے کہ پھر اپنے زمانے پہ نگاہ کرو اور دیکھو کہ جس قوم کا نظام ان غلط بنیادوں پر استوار ہوگا' اس کا نتیجہ پہلے بھی یہ نکلا ہے' آج بھی یہ نکلے گا وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا (33:62) تم ہمارے قانون اور روش میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔اور میں عرض کر دوں بات میں سے بات آ جاتی ہے۔قرآن نے لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (10:64) بھی کہا ہے وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا (33:62) بھی کہا ہے۔

قرآن حکیم میں استعمال ہونے والے مرادفات اور شاعری کے مرادفات میں فرق کی نوعیت

قرآن شاعری نہیں کرتا۔عام طور پہ مرادفات جو ہوتے ہیں' یہ شاعری کے لیے ہوتے ہیں کہ وہ شعر میں ایک لفظ لاتے ہیں تو اس سے وزن ٹھیک نہیں بیٹھتا تو اس کی جگہ ایک مرادف لے آتے ہیں کہ اس کا ذرا وزن ٹھیک ہو جائے۔ورنہ شہد اور انگبیں میں کوئی فرق نہیں فارسی زبان میں۔قرآن کوئی شاعری نہیں اس کے ہاں مرادفات یوں نہیں آتے' بڑا شدید کا فرق ہوتا ہے اس کے اندر اور بڑا ہی بنیادی فرق ہوتا ہے۔اور یہ عربی زبان کی خصوصیت ہے۔ایک ایک چیز کے لیے سینکڑوں نام' اونٹ کے لیے چھ سو' تلوار کے لیے ہزار۔یعنی

سوچئے تو سہی وہ کون کون سی چال ہے اونٹ کی جس کا الگ الگ نام وہ رکھتے ہونگے۔لیکن ان کی ادب کی کتابوں میں دیکھئے جھوم جاتا ہے آدمی جہاں وہ فرق کر کے دوسرا نام لیتے ہیں۔اور پھر ان کے ہاں حسین ترین چیز وہ ناقہ ہے۔انیقہ کے معنی سب سے خوبصورت ہیں اور سب سے خوبصورت سے ان کے ہاں یہ جمال جسے کہتے ہیں' یہ جمل ہی تو ہے'اونٹ'۔لیکن عزیزانِ من! عرب سے پوچھئے کہ اس کا اونٹ اور اس کی اونٹنی' اُسے وہ جمل کہتا ہے اسے وہ ناقہ کہتا ہے۔بڑی پریکٹیکل قوم تھی جس جانور نے ان کو اتنا فائدہ پہنچایا ہے اُسے ہی انہوں نے جمیل ترین قرار دیا ہے۔

کلمت اللہ اور سنۃ اللہ میں پائے جانے والے فرق کی نوعیت

بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے ایک جگہ کلمت اللہ کہا ہے دوسری جگہ سنۃ اللہ کہا ہے۔وہ بھی تبدیل نہیں ہوتے' یہ بھی نہیں ہوتے۔ Law جب الفاظ میں ہوتا ہے' نظری اعتبار سے لاء جب ہوتا ہے قانون' وہ کلمہ کہلاتا ہے اور جب وہ پریکٹس میں لایا جاتا ہے تو اسے سنت کہتے ہیں۔سارے سائنس کے تمام Laws جب وہ کتابوں کے اندر ہوتے ہیں تو وہ کلمات کہلاتے ہیں جسے آپ نظریہ پاکستان کہتے تھے' یہ کلمہ تھا۔یہ سنت بنی تھی مملکت ملنے کے بعد جب اس کو پریکٹس میں لانا تھا۔نظریہ یا کلمہ کتابوں کے اندر بند پڑا رہے کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا خواہ وہ غیر متبدل ہی کیوں نہ ہو۔جب اس کو آپ Into Practice لاتے ہیں پھر وہ اپنے نتائج دیتا ہے۔تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ نظریہ کے اعتبار سے دیکھئے جو کلمات یا قوانین ہم دیتے ہیں' ان میں اس اعتبار سے بھی کمی نہیں ہوگی۔ H_2O قیامت تک اسی طرح سے رہے گا' کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔اور اس کی سنت یہ ہے کہ جب بھی آپ آکسیجن اور ہائیڈروجن کے دو اور ایک کی نسبت سے اکٹھا ملائیں گے تو پانی کا قطرہ پیدا ہوگا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) یہ سنت اللہ ہے۔

تمت کلمت اللہ اور سنۃ اللہ کی اصطلاحات کو استعمال کرنے کا مقصد

جب نتائج نکلتے ہیں تو جہاں جہاں قرآن نے قوموں کے غلط نظام کے نتائج کا بیان کیا ہے ہر جگہ سنت کا لفظ لایا ہے۔جہاں ان کی حفاظت کا ذکر کیا ہے تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:115) ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں جب قرآن حکیم نازل ہوا ہے تو یہ کلمات اللہ' سنت اللہ میں ابھی سارے تبدیل نہ ہوئے ہوں وہاں تمت کلمت اللہ کہا ہے قرآن نے۔اور جہاں تاریخ میں یہ کلمات Into Practice آئے ہیں' انہوں نے نتیجہ پیدا کیا ہے سارے قرآن میں وہاں کلمہ نہیں آیا' سنت آیا ہے۔کہا یہ چیز بدل نہیں سکتی۔

اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا (9:85) جبھی اقوام عالم کے انجام کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس دنیا کے اندر انجام دکھا رہا ہے وہ۔ قیامت کا انجام تو ان کے ان مساکن سے اور تاریخ سے نظر نہیں آسکتا۔کہا کیفیت یہ ہے کہ وَ اِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ

جَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهٖ (9:86) قرآن حکیم میں جب بھی کوئی ایسی آیت نازل ہوتی ہے کوئی ایسا قانون نافذ ہوتا ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ بابا' ایمان یہ ہے کہ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ جَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهٖ (9:86) اللہ پہ ایمان لاؤ تو اس کے بعد جہاد کرو رسول کے ساتھ ملکر جب بنے تم مومن۔

قرآن حکیم ذات خداوندی کو ماننے اور نہ ماننے کا متعین مفہوم پیش کرتا ہے جب کہ قوموں کا عروج و زوال اسی تصور سے ہی وابستہ ہے

امنوا باللہ تک کی بات تو صرف مذہب کی ہے' ہم خدا کو مانتے ہیں' کسی سے پوچھئے کہ صاحب ''یہ مانتے ہیں'' کیا ہوتا ہے' مانتے ہیں کہ خدا ہے' کہا اگر آپ کہیں خدا نہیں تو پھر کیا۔ یعنی جیسے وہ اس کا محتاج ہے۔ آپ کہیں ہے تو وہ ہے' آپ کہیں نہیں ہے تو وہ نہیں ہے۔ اور آپ کو کیا فرق پڑا جی اس سے۔ وہ کہتا ہے اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ جَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهٖ (9:86) کہ اس کے ساتھ جہاد کے لیے نکلو۔ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ (9:86) کہتا ہے ان میں سے یہی لوگ جو دولتمند ہیں' سرمایہ دار یہ ہیں' جو آکے کہیں گے کہ ''بڑا اوڈا کم اک آ پیا ہیگا بنک اچوں اک ڈرافٹ چھڑانا اے' جے نہ چھڑایا تے تاریخ بدل جائے گی' او Consignment اک آیا ہویا ہیگا جی اوہنوں کراچی اوں لینا جانا اے'' مجھے تو آپ کوئی چار دن کی چھٹی دیدیجیے میں آجاؤنگا بعد میں یہ کاروبار ذرا بھگتا لوں اس کے بعد فارغ ہو کے بس آجاتا ہوں۔ کہتا ہے اولوا الطول وہ آتے ہیں یہ کچھ کہنے کے لیے۔ اس زمانے میں بھی یہی کچھ کرتے تھے آج بھی یہی کیفیت ہے ان کی۔ وَ قَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ (9:86) کہا کہ کیا عذر ہے' کہنے لگے کہ آپ کی جماعت میں سے بھی تو کچھ ہیں جو نہیں جاسکتے پیچھے رہ گئے۔

لفظ ''قعدین'' اور ''خوالف'' کا قرآنی لغوی مفہوم

یعنی وہ جو بیمار ہیں' جو مجبور ہیں' کچھ معذور ہیں بہر حال انہیں تو رہنا پڑتا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ''ساہنوں وی ایہو جیا معذور ای سمجھ لؤ' فٹے منہ تہاڈا۔ یعنی ہم تمہارے اسلام سے تو نہیں بھاگ رہے' مسلمانوں سے تو الگ نہیں ہو رہے۔ مسلمانوں کے بھی تو دو گروہ ہیں نا' کچھ تو ایسے ہیں نا جو پیچھے رہ جانے والے ہیں' تو ہمیں بھی ان میں شمار کر لیجیے آپ۔ یہ اولوا الطّول کہتے ہیں۔ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ (9:87) کیا بات ہے قرآن کی!!! اُنہوں نے قعدین کہا تھا انہوں نے خوالف کہا ہے۔ یہ محاورہ جو ہمارے ہاں بھی ہے نا کہ چوڑیاں پہن کے بیٹھ جانے والے' کہا یہ معذوری والی بات نہیں ہے' یہ ان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں جو میدانِ جنگ سے بھاگ

کے' چوڑیاں پہن کے گھروں میں بیٹھے رہنا چاہتے ہیں۔ کیا بات ہے قٰعدین اور خوالف کے دو لفظوں کے فرق میں بات ساری واضح کر دی۔ قٰعدین میں تو وہ آ سکتے ہیں کہ جو واقعی معذور ہوں اور نہ جا سکتے ہوں' خوالف وہ ہوتے ہیں جو کر سکتے ہیں کسی کام کو لیکن اس کے باوجود نہ کرنا چاہیں۔ کیا بات یہ ہے ''قٰعدین'' کہہ رہے ہیں' اصل میں ''خوالف'' ہیں۔

ہر قسم کے مالی وسائل کو اقدار کے تابع نہ رکھنے سے انسانی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں

کہنے لگے سمجھاؤ کیا' دولت اگر اقدار کے تابع نہ رکھی جائے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ وَ طُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَفۡقَہُوۡنَ (9:87) پھر دلوں پر مہریں لگ جایا کرتی ہیں اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں ختم ہو جایا کرتی ہیں' ننانوے کے پھیر میں آ جاتا ہے انسان' کہتا ہے وہ سمجھ سوچ کی بات نہیں رہا کرتی۔

دوسری طرف لٰکِنِ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ جٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الۡخَیۡرٰتُ ۫ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (9:88) اس کے مقابلے میں یہ جو کہہ رہے ہیں کہ قٰعدین کے ساتھ ہم بیٹھ جائیں' تو بتاؤ کہ ایمان لانے والے جو ہیں وہ معذروں کی مثال نہ لو' وہ یہ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور اس کے بعد جب آواز آئی ہے تو ہتھیلیوں پہ سر رکھ کے اموال اور انفس جہاد کے لیے یوں نکل پڑے ہیں کہ 'سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا'۔ یہ ہیں وہ لوگ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الۡخَیۡرٰتُ (9:88) وہاں خیر کہا تھا یہاں جمع آئی ہے اس کے متعلق۔ میں نے جیسا عرض کیا تھا کہ بڑی چیز تو انسان اور حیوان کی ما بہ الامتیاز یہ ہے کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ یہ جتنے بھی اختیارات قرآن نے اس قسم کے دیے ہیں' اس کے لیے ہمیشہ کہا ہے کہ اس سے خیر زیادہ بڑھے گا' اختیارات کی وسعتیں بڑھ جائیں گی انسان کی۔ جس کا ترجمہ ہم نے محض نیکی کر لیا۔

فارسی تراجم نے قرآنی الفاظ کے حقیقی مفہوم کو ہی بدل دیا ہے

یہ جو فارسی زبان کے اندر ترجمے ہوئے ہیں نا' ستیاناس کیا ہے انہوں نے۔ نیکی' نیک بخت' پھر نیک بخت تو آپ سمجھتے ہی ہیں ''جیہدا آٹا وی کتا لے جائے تے اگوں کچھ نہ کہے''۔ خیرات' اور خیرات کا لفظ پھر ہمارے ہاں آیا جو مٹی پلید اس کی ہوئی۔ یعنی جسے چاہنے کو کوئی اختیار ہی نہیں' گداگر فقیر' خیرات مانگنے والا وہ ہے۔ یہ عظیم چیز تھی اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الۡخَیۡرٰتُ (9:88) وہ کہتا ہے جنگ میں جانے سے تم دیکھتے ہو مصائب و مشکلات' ایک جنگ جیت کے آؤ دیکھو اختیارات کی وسعتیں کتنی زیادہ بڑھ جاتی ہیں تمہارے اوپر۔ یہ پابندیاں لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا (2:286) ترجمہ ہو گیا ہمارے ہاں کہ خدا ہر ایک کی وسعت کے مطابق ہی اس کو تکلیف دیتا ہے۔ ٹھیک ہے اس کا تو پیمانہ وہ شخص خود ہے وہ کہدے کہ جی ''میں تے اینے جوگا ہیگاں''۔ جس کے سر پہ آپ بیس سیر دودھ لا دیں

اور وہ یہ کہے کہ میں نہیں اٹھا سکتا کم کیجیے' آپ کس پیمانے سے ماپیں گے کہ اٹھا سکتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان پر لگائے جانے والی پابندیوں کا تصور انسانی اختیارات کو وسعت دینا ہے

کہا یہ تھا قرآن نے کہ یہ پابندیاں جنہیں تم پابندیاں سمجھ رہے ہو' یہ پابندیاں نہیں ہیں' یہ پابندیاں اس لیے ہیں کہ تمہاری وسعتیں زیادہ ہوں' تمہاری ذات کی وسعتیں زیادہ ہوں۔ یہ تو نہر کی ٹھوکر ہے کہ جو بظاہر نظر آتی ہے کہ راستے میں ایک پابندی ہے' راستے میں رکاوٹ ہے' وہ اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی رفتار میں اور تیزی آ جائے۔ جتنی زیادہ درخت کی جڑیں زمین میں زیادہ گہری چلی ہوئی ہونگی وہ پابند ہوگا جتنا زیادہ گہرائیوں کا' اتنا ہی اونچا چلا جائے گا۔ جتنا وہ اپنی پابندی کو کم کرلے گا کے اوپر اوپر ہی اس کی وہ جڑیں رہیں گے ایک جھونکا آئے گا وہ گیا' اس کو خیرات حاصل نہیں ہوئی۔ سن لیا خیرات کیا ہوتا ہے۔ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْخَیْرٰتُ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (9:88) یہی ہے جس کے درخت پھل لائیں گے۔ وہی درخت پھل لاتا ہے جو جتنا زیادہ زمین میں گڑا ہوتا ہے۔ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ؕ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (9:89) ان کے لیے ان کے رہنے کے لیے خوشگواریوں کے سدا بہار باغات ہیں جن کی شگفتگی سرسبزی اور شادابی میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ وہی جو اقبالؒ کا شعر دہرایا کرتا ہوں

یہ نغمہ فصلِ گل لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

مذہب کی دنیا میں نجات کا تصور

خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ؕ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (9:89) یہ نجات نہیں ہے کہ پھنسے ہوئے تھے کسی مصیبت میں وہاں سے چھٹکارا مل گیا دنیا کے ہر مذہب میں نجات یا Salvation منتہا ہے۔

مومن کی زندگی تو ہمیشہ اختیارات اور خیرات ہے' مفلحون سے اور فائزوں کے زیور سے آراستہ ہوتی ہے

قرآن نے کہیں منتہا نجات قرار نہیں دی' فوز کہا ہے Achievement کہا ہے Acheievement بھی عظیم ہے بہت بڑی Achievement ہے جسے یہ حاصل ہو جائے۔ اس قسم کی زندگی کہ جو خزاں ناآشنا ہو' ہمیشہ سرسبز و شاداب رہنے والی زندگی' جس میں خیرات ہو' جس میں اختیارات کی وسعتیں ہوں' جس میں ذات کی صلاحیتیں حدود نا آشنا ہوتی چلی جائیں۔ اَلْفَوْزُ

الْعَظِيْمُ (9:89) بہت بڑی Achievement ہے جو اس طرح سے حاصل ہوتی ہے۔ کہا کہ پیچھے رہنا ہے تو پیچھے رہنے والوں میں سے یہ کیوں کہتے ہو کہ معذوروں میں ہم شامل ہو جائیں گے تو ہم بھی جماعتِ مؤمنین میں ہی ہو نگے۔ وہ یوں پیچھے رہنے والے نہیں ہیں' معذور ہیں' تم خوالف کے ساتھ رہو گے پیچھے' کر سکتے ہو اور کرنا نہیں چاہتے۔ مومن وہ ہیں کہ جب آواز آتی ہے تو اس طرح سے وہ جوق در جوق نکلتے جاتے ہیں۔ یہ وہ ہیں کہ جن کے لیے خیرات ہے' یہ وہ کہ جو مفلحون ہیں' یہ وہ ہیں کہ جو فائزون ہیں' ان کے لیے بہت بڑی Achievement ہے۔ وقت ہو گیا عزیزانِ من! سورۃ توبہ کی آیت 89 تک ہم آ گئے 90 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

پندرہواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 90 تا 99)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1973ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 90 سے ہو رہا ہے۔ (9:90)۔

لفظ جہاد کا بنیادی مقصد اقدار خداوندی کے لیے مسلسل تگ و تاز ہے

آپ کو تو اب تجدیدِ یادداشت کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ دو ایک ماہ سے مسلسل یہی مضمون چلا آ رہا ہے سورۃ انفال کے علاوہ سورۃ التوبہ میں بھی۔ اصولی طور پر بات اس جہاد کی ہو رہی تھی جس کی آخری شکل قتال یعنی جنگ ہوتی ہے۔ جہاد تو زندگی کی ہر جدوجہد کا نام ہے اور اسلام کی زندگی تو مسلسل جہاد ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اس جدوجہد میں اور قرآن کے الفاظ میں یہ کلمۃ الحق یعنی صحیح اقدارِ

خداوندی کا غلبہ پیدا کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا غلبہ ان کا استحکام ایک نظام کی شکل میں ہوسکتا ہے۔ تو اس میں ایک آخری مقام یہ آتا ہے کہ جہاں مخالف قوتیں قوتِ بازو سے اس کے راستے میں مزاحم ہوتی ہوں اور انہیں قوت سے جب ہٹانا پڑے تو یہ اس تسلسلِ جدوجہد کا وہ آخری مرحلہ ہے' جسے قتال کہا جاتا ہے' جنگ کہا جاتا ہے اور جہاد بھی کہا جاتا ہے۔ ضمناً ذکر آیا اس میں ایک گروہ کا جسے منافقین کہہ کر پکارا گیا اور اب کئی درسوں میں وہی آیات مسلسل چلی جارہی ہیں۔ تو یوں کہیے کہ سورۃ توبہ کا اکثر و بیشتر حصہ انہیں کے متعلق ہے۔ اور یہ اسی سورۃ کی بات نہیں ہے' آگے چل کے بھی آپ دیکھیں گے قرآنِ کریم میں کفار کے متعلق اتنا زیادہ شرح وبسط سے نہیں آیا' جتنا منافقین کے متعلق آیا ہے۔

مذہب کی دنیا میں تو دین کی پیش کردہ اصطلاحات کو ہی بدل دیا جاتا ہے

ایک بات پھر دہرادوں کہ دین جب مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں یہ اصطلاحات بھی اپنا حقیقی مفہوم کھو دیتی ہیں اور ان کے معنی بھی کچھ انفرادی سے ہوجاتے ہیں۔ آج کل اگر یہ بات کسی سے کہیں کہ بڑی منافقت سے کام لے رہا ہے' بڑا منافق واقع ہوا ہے تو اس سے زیادہ سے زیادہ معنی یہ ہونگے کہ میرے ساتھ جو اس کی Dealings ہیں' میرے ساتھ جو معاملات ہیں اس میں یہ خلوص نہیں برت رہا کچھ دیانتداری سے کام نہیں لے رہا۔ بس اتنا ہی ہوتا ہے یہ۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ دین میں کونسا مقام ہے کہ جہاں اسے منافقت سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایسا کرنے والوں کو منافق کہا گیا ہے۔

یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن نے یہ بتایا ہے کہ جس دعویٰ ایمان کی صداقت انسان کے اعمال نہیں دیتے' وہ منافقت ہے۔ اور شروع میں یہ بھی قرآن نے بتادیا تھا کہ جب تک تو معاملہ محض نماز روزے تک کا تھا تو یہ بڑے پکے اور سچے مومن بنتے تھے۔ لیکن اس کے بعد جب یہ دعویٰ ایمان کی صداقت کے لیے جہاد کو بطور ثبوت پیش کرنا ہے۔ اس جدوجہد میں جو جہاد مال کا تھا قرآن نے کہا تھا کہ وہاں تک بھی یہ لے ہی آتے تھے کسی نہ کسی طرح۔ لیکن جب جہاد بالنفس کا سوال آیا' میدانِ جنگ میں جانے کا سوال آیا تو وہاں آ کے انہوں نے بہانے تراشنے شروع کیے' معذرتیں پیش کیں عذر لائے تاکہ جہاد میں جانے سے بچ جائیں۔

منافق کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ صداقت کا عملی ثبوت پیش نہیں کرتا

وہ ایمان جس کی صداقت کا ثبوت انسان کے عمل پیش نہیں کرتے' اُسے منافقت کہا جاتا ہے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ ہم جو اپنوں میں سے بعض کو منافق کہتے ہیں' ہمیں اپنے متعلق سوچنا چاہیے کہ ہمیں قرآن کیا کہتا ہے۔ یہ بڑا فریبِ نفس ہوتا ہے' ہم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو منافق نہیں سمجھتا۔ ہمارے ساتھ جب کسی کا معاملہ پڑتا ہے' اُسے ہم منافق کہتے ہیں۔ اور اگر اس آئینے میں دیکھا جائے

جو قرآن نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے تو اس کے بعد ردِ عمل ہمارا کیا ہو۔ اُس حبشی کا ردِ عمل جس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو بڑی بھیانک نظر آئی تو اس نے آئینے کو پتھر پہ مار دیا کہ نہ رہے آئینہ اور نہ اس میں بھیانک شکل نظر آئے۔ دین جب مذہب کی شکل اختیار کرتا ہے تو اس میں یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ ان اصطلاحات کے مفاہیم بدل دیے جاتے ہیں درحقیقت یہ اس آئینے کو توڑنے کی کوشش ہوتی ہے' توڑ دیا جاتا ہے۔ جہاد کا مقام جہاں آتا ہے وہاں وہ اس شدومد سے یہ پکارتا ہے کہ صحیح کسوٹی یہ تھی۔

جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر مذہب کی پیدا کردہ اصطلاحات ہیں

آپ کو معلوم ہے کہ پھر یہ آئینہ توڑا کیسے گیا۔ کہا بجا ہے صاحب' جہاد سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے لیکن جہاد کی قسمیں ہیں۔ ایک جہادِ اصغر ہوتا ہے' ایک جہادِ اکبر ہوتا ہے۔ اچھا جی!!! یہ جہادِ اکبر کونسا ہوتا ہے' کہ جی یہ جہاد بالنفس ہوتا ہے اپنے آپ کے ساتھ ہی جہاد ہوتا ہے' دشمن کو میدانِ جنگ میں جا کے مارنا نہیں' نفس کشی کا نام جہادِ اکبر ہوتا ہے۔ یہ مراقبوں سے حاصل ہوتا ہے' چلوں سے ریاضتوں سے' ورد سے وظائف سے' یہ جہادِ اکبر ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے اوپر جو شاعری شروع ہوئی کہ صاحب یہ میدانِ جنگ میں جسے آپ شہید کہتے ہیں وہ مجاہد فی سبیل اللہ کہ جو اس کے لیے جان دیدیتا ہے کہتا ہے اُس کا اور اس کے ساتھ مقابلہ کیا جو خدا کی محبت میں اپنے آپ کو اپنے گھر کے قالین پہ بیٹھا ہوا' اپنے نفس کو اس کی راہ میں جو شہید کرتا ہے۔ ان دونوں میں کہا تقابل کیا' وہ جو میدانِ جنگ میں جان دینے والا ہے' آں کشتۂ دشمن است' وایں کشتۂ دوست'۔

ادبی دنیا میں شاعری کا ایک اپنا مقام ہے

آپ نے دیکھا کہ پھر جب یہ شاعروں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر دین کیا بن جاتا ہے۔ شاعری مذہب میں ہی نہیں آتی یہ تو ایک ذہنیت کا نام ہے۔ مذہب اور نفرت تو اس کے اظہارِ بیان کا ایک طریقہ ہے' ایک ذریعہ ہے۔ ضمناً بات آگئی' قرآنِ کریم نے جب شعراء کے متعلق کہا ہے تو وہ یہ چیز نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص نہایت اعلیٰ درجے کی چیز موزوں الفاظ میں کہدے' جسے نظم یا شعر کہا جاتا ہے۔ وہ یہی ہوتا ہے کہ موزوں الفاظ ہوتے ہیں اس میں وزن ہوتا ہے تو وہ اس قابل ہو کہ اُسے آپ کفر قرار دیں۔ اور اگر وہی ان موزوں الفاظ کو توڑ کے ناموزوں بنادے' جسے نثر کہا جاتا ہے' بکھرے ہوئے الفاظ ہو جائیں تو وہ عینِ اسلام بن جائے۔ تو یہ بات نہیں تھی۔

قرآن حکیم نے میدان جنگ سے فرار کی راہیں تلاش کرنے والے کو منافق کہا ہے

شاعری کو اس نے ایک ذہنیت کا نام دیا ہے اور ذہنیت یہ ہے کہ الفاظ تو وہی رکھے جائیں' ان کا مفہوم بدلا جائے اور ایسے خوش آئند

پیرائے میں پیش کیا جائے کہ دوسرا مسحور ہو جائے خود فریبی میں آ جائے۔ دیکھا آپ نے کہ یہ جہادِ اکبر جو کہا گیا' اس کی حقیقت کیا تھی۔ اس کی حقیقت تھی منافقت۔ میدانِ جنگ میں سربکف جانے سے فرار کی راہیں تلاش کرنا۔لیکن یہ چیز اگر یوں کہہ دی جائے تو وہ ذرا سوچئے تو سہی کہ پھر معاشرے میں یعنی مقربینِ بارگاہِ الٰہی ایک طرف رہا' معاشرے والے ہی اس کا کیا حلیہ بگاڑتے ہیں۔اور اگر توفیق نصیب ہو جائے اور اپنے آپ کو؟؟؟ کہ کس قدر منافقت برت رہے ہو تو آپ سوچئے کہ اپنا نظام کیا ہو جائے۔ جی نہیں' فریب دیا اس نے شاعری کی اس کے ساتھ کہ اسے کہا جہادِ اکبر۔ کہا ٹھیک ہے ہم مانتے ہیں کون اس سے انکار کرتا ہے لیکن وہ جہادِ اصغر ہے۔ اب اس کے لیے دلیل چاہیے تھی' دلیل شاعری پیش کرتی ہے۔ اور وہ دلیل یہ کہ سیدھی سی بات ہے کہ 'آں کشتۂ دشمن است وایں کشتۂ دوست' وہ دشمن کے ہاتھوں کا مارا ہوا اور اسے دوست خود آ کے قتل کر رہا ہے۔ چلئے جہادِ اکبر کی افضلیت سامنے آ گئی۔

ہماری ہزار سالہ تاریخ کا انجام

ہزار سال میں پھر اس امت کو انہوں نے اس جہاد سے کہ جس کے اندر حقیقت میں راز پوشیدہ تھا دین کی تقویم کا' اس سے امت کو گمراہ کیا اور ان کے دل میں احساس ہی پیدا نہ ہونے دیا' وہ کتنا بڑا فریضہ تھا دین کا کہ جس سے ہم اعراض برت رہے ہیں' اجتناب برت رہے ہیں' گریز کی راہیں نکال رہے ہیں۔ نہیں! خوش ہو گئے کہ ہم نے وہ جہادِ اصغر چھوڑ کر جہادِ اکبر کی راہ اختیار کر لی۔ لیکن وہ جو دشمن تھا جس کے یہ کشتہ ہوتے تھے کہ جنہیں خدا نے کہا ہے کہ انہیں مردہ بھی نہ کہو' وہ دشمن اس سے بھی مطمئن نہ ہوئے۔

ہم نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹیں
وہ ستم گر میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

جذبۂ جہاد کو ختم کرنے کے سلسلہ میں انگریز کی یہ چال کہ جہاد اکبر جہاد بالقلم ہے جس کے لیے وحی نازل ہوئی ہے

انگریز نے کہا کہ نہیں ابھی دھڑکا ہے ہمیں ان سے' اس راکھ کے اندر ابھی کوئی دبی ہوئی چنگاریاں ہیں' ہوسکتا ہے کہ 1857ء کی جنگ کے بعد یہ دبی ہوئی چنگاریاں کبھی ابھر آئیں۔ تو ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ اس جہادِ اصغر کو دفن ہی کر دیا جائے۔ تو پہلے تو اس کی تاویل یہ کی گئی یا کرائی گئی کہ ایک مامور بھیجا اس مقصد کے لیے مامور کے معنی ہوتا ہے جسے حکم دیا جائے۔ تو پہلی چیز یہ کہ جہادِ اکبر جہاد بالقلم ہے' بیٹھے رہیے اپنے کمرے کے گوشے میں ائرکنڈیشنڈ روم میں' قلم ہاتھ میں فراغت ہو' کمانے والے دوسرے ہوں' کھانے والے آپ ہوں'

کیے جایئے جہادِ اکبر ساری عمر۔ پتہ نہیں کتنی الماریاں کہتے ہیں بھر دی ہیں جہاد کر کر کے۔ یہ کچھ ہوا۔ ان سے پوچھا گیا تو جواب ملا کہ نہیں ابھی خطرہ باقی ہے' لکھنے میں بھی تو یہ آ سکتا ہے۔ اور وہ کچھ لوگ تھے کہ جنہوں نے لکھنے میں یہ بات کہی کہ نہیں جہاد فی الحقیقت وہی ہے کہ جو میدانِ جنگ میں جا کے ہوگا اور یہ دین کا فریضہ ہے۔

جہاد بالسیف کا تصور سابقہ دور کی ایک یادگار ہے جہاد کو منسوخ کرانے کی ایک نئی چال

اس سے بھی کام نہ چلا تو میں نے پتہ نہیں ایک درس میں عرض کیا تھا اور وہ عبارت پڑھ کے سنائی تھی کہ اُنہوں نے یہ کہہ دیا کہ خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی ہے ہم پہ کہ جہاد دین میں چلا آ رہا تھا پیغمبروں کے زمانے میں' حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں جہاد تھا اس میں عورتوں بچوں کو بھی قتل کر دیا کرتے تھے' رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آ کر اس میں اتنی ترمیم ہوئی کہ نہیں ان کو قتل نہ کیا جائے لیکن بہر حال میدانِ جنگ میں جہاد بالسیف کا حکم جاری رہا۔ لیکن اب میرے ذریعے سے خدا نے یہ کہہ دیا ہے کہ تلوار کا جہاد اب حرام قرار دیدیا گیا ہے' یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ یہاں یہ تاویل نہیں ہے کہ اس زمانے میں بھی تلوار کا جہاد نہیں ہوا کرتا تھا۔ کہا گیا ہے کہ اس زمانے میں بھی تھا۔ اندازہ لگایئے عزیزانِ من! اس جرأت کی۔ میری وساطت سے جو وحی بھیجی ہے اس کے ذریعے سے اس جہاد بالسیف کو حرام قرار دیدیا گیا ہے' حکم ہی منسوخ کر دیا۔ پوچھا ہوگا کہ کیوں جی پے گئی ٹھنڈ۔ یہ ساری سورتیں اور اتنی آیتیں یہ کیا بتا رہی تھیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں مسلسل یہ چلا آ رہا ہے کہ میدانِ جنگ میں نہ جانے کے لیے بہانہ تراشیاں' اس کا نام قرآن منافقت قرار دے رہا ہے' کفر کہہ رہا ہے' کفر سے بدتر کہہ رہا ہے' جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ان کا مقام بتا رہا ہے کفار سے بھی نیچے۔ میدانِ جنگ میں جانے سے بہانہ تراشیاں۔ تو یہ تو بیچارے کچھ بہانے تراشتے تھے' یہ نہیں کہتے تھے کہ حضور ﷺ پر یہ جو حکم نازل ہو رہا ہے یہ معاذ اللہ حکم ہی غلط ہے۔ اس قابل ہے کہ اسے منسوخ قرار دیدیا جائے۔ یہ نہیں وہ کہہ رہے تھے وہ صرف معذرت پیش کرتے تھے کہ جی میں بیمار تھا' میرے پاس کچھ نہیں تھا گھر اکیلا تھا' اس لیے نہیں جا سکا۔ پھر بھی اس میں معذرت کا پہلو ہے اس کے باوجود اسے کفر قرار دے رہا ہے قرآن' اسے منافقت کہہ رہا ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا چیز ہوئی۔ جہاد کا لفظ بالکل صحیح ہے رہے گا فریضۂ خداوندی بھی ہے' بجا ہے جناب' ہم اس میں معذرت بھی نہیں پیش کرتے کیونکہ وہ منافقت ہے۔ پھر' ادائیگی کیسے ہو رہی ہے' جہاد بالقلم کرتے چلے جا رہے ہیں اور اس سے آگے بڑھتے ہیں تو ہم گوشوں میں بیٹھ کر جہادِ اکبر نفس کشی سے کر رہے ہیں۔ تو دو گوشے ہمارے ہاں ہو گئے ایک تو علمائے کرام کا جو جہاد بالقلم کرتے چلے گئے اور دوسرے مقربینِ بارگاہِ الٰہی جنہوں نے نفس کشی کا نام جہادِ اکبر رکھ لیا۔ یہ وہ بہانہ تراشا جس بہانے کے پیش کرنے میں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی ندامت محسوس ہو بلکہ فخر محسوس کیا جائے کہ ہم بہت بڑا جہاد کرتے ہیں' جہادِ اکبر۔ آپ نے دیکھا عزیزانِ من!

کہ دین مذہب میں جب آتا ہے تو اس کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے۔اور یہ وجہ ہے جو قرآن اس تسلسل سے شرح وبسط سے باصرار وتکرار سے منافقین کا موضوع جو سامنے لا رہا ہے۔لیکن کفار کے متعلق اس شرح وبسط سے نہیں کہا۔ان کے ہاتھوں نہیں آدمی مار کھاتا' کھلا ہوا دشمن ہے پتہ ہے۔للکار کے آتا ہے آپ کو بھی معلوم ہے۔لیکن یہاں جب یہ کیفیت ہو جائے کہ یہ عظیم فریضہ جو بنیاد ہے دین کی اُسے منسوخ قرار دیا جائے اور اس کی بجائے جہادِ اکبر ان چیزوں کا نام قرار دے کے اپنے آپ کو شاید فریب دیا جائے یا کم از کم دنیا کو فریب دیدیا جائے اور امت کے ذہن سے اس تصور کو ہی نکال دیا جائے۔

قرآن حکیم کی آیات کے متعلق ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ

آپ دیکھ رہے ہیں کہ کتنا حسین طریقہ تھا منافقت برتنے کا۔لیکن قرآن تو کوئی راستہ چھوڑتا نہیں جانے کا۔یہ وجہ ہے کہ اس نے یہ ساری چیزیں بھی لیں اور یہ بھی کہدیا کہ ہاں نماز روزے تک تو ٹھیک پکے مومن تھے۔جب قتال کے متعلق آیتیں آتی ہیں تو کہا تھا کہ ان پیشانیوں کے اوپر بل پڑ جاتے ہیں۔جی ان کا یہ چاہتا ہے کہ یہ آیتیں اس میں نہ رہیں۔یہ کہا تھا نا قرآن نے۔انہوں نے کیا کیا؟ آیتوں کو تو اس میں سے نہیں نکال سکے' پہلے عقیدہ وضع کیا گیا ناسخ ومنسوخ کا' قرآن کی آیتیں قرآن کے اندر تو موجود ہیں پڑھی جائیں گی لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہوا ہے۔جس کی کتاب ہے اس کے سوا کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ اس میں سے ایک لفظ کے متعلق بھی یہ کہدے کہ مٹا دیا گیا ہے' صرف وہ کہہ سکتا ہے۔جس حکومت نے قانون نافذ کیا ہو صرف وہ حکومت کہہ سکتی ہے کہ ہم اپنا وہ قانون واپس لیتے ہیں یا اس میں ترمیم کرتے ہیں۔یا اس کی جگہ کوئی دوسری حکومت آجائے تو وہ یہ کہدے کہ ہم سابقہ حکومت کے تمام قوانین کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی غیر اس حکومت کو حکومت بھی مانے اور یہ کہے کہ ہم منسوخ کرتے ہیں اس حکومت کے فلاں حکم کو۔اور آپ کے ہاں یہ ہوا کہ خدا کی کتاب کی کم از کم ابتداء میں پانچ سو احکام کی آیتیں تو منسوخ کرتے تھے۔ان آیتوں کے متعلق یہ کہدیا کہ منسوخ ہیں۔کس نے منسوخ قرار دی ہیں؟ ہم منسوخ قرار دیتے ہیں۔اور جو منسوخ قرار نہ دی گئیں' جو باقی بھی رہ گئے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے کہیں' ان کے متعلق یہ کہ ان کی تاویل کی جائے گی۔تاویل کیا کی جائے گی؟ یہی جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ جہاد برحق ہے لیکن یہ جہادِ اصغر ہے۔جہادِ اکبر یہ ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں۔یہ کچھ ہوا ہے ہمارے ساتھ عزیزانِ من! یہ جو مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔راکھ کا ڈھیر اس طرح سے بنایا گیا ہے۔لیکن یہ اس راکھ کو راکھ نہیں سمجھتے' کشتہ سمجھتا ہے۔

کسی معاملے کو حق تسلیم کرنے کا معیار عقل انسانی کی بجائے وحی کو حرف آخر تسلیم کرنا ہوگا

یہ ہے جو موضوع چلا آ رہا ہے عزیزانِ من! اور اسے قرآن منافقت کہتا ہے۔اے کاش کہ ہم جو دوسروں میں منافقت دیکھنے کے

عادی ہوگئے ہیں کبھی اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال کے دیکھیں۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ معیار یہ ہونا چاہیے اگر یہ معیار نہ ہوتو کوئی منافق بھی اپنے آپ کو منافق نہیں کہتا۔ معیار خارجی ہونا چاہیے۔ اور وحی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ معیار یہ نہیں کہ میری عقل وفکر کا' آپ کی عقل وفکر کا انسانوں کی عقل وفکر کا معیار ہو' اُس نے کہا ہے کہ معیار خارجی ہو ہی وہ سکتا ہے جو انسانوں کی عقل وفکر سے ماوراء کسی سرچشمے سے ملے۔ ورنہ اپنی شکل حسین دیکھنے کے لیے آئینہ ساز تو معلوم نہیں کس کس قسم کے آئینے تراش لے۔ وحی معنی یہ رکھتا ہے کہ وہ میری یا آپ کی فکر کی تراشیدہ چیز نہیں ہوتی۔ معیار خارجی ہوتا ہے اور خارجی معیار ہی وہ شے ہے وہ آئینہ ہے کہ جو صحیح انسانی خدوخال بتا سکتا ہے۔ اسے معیار قرار دیا جائے تو پھر نظر آتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔

ہمارے ہاں قرآنی اصطلاحات کا قرآنی مفہوم بدل دینے کا نام مذہب ہے

کیا ہے وہ ایمان جسے ہم لیے پھرتے ہیں' کیا ہے وہ مذہب جس کی ہم پرستش کرتے پھر رہے ہیں۔ پوچھیئے قرآن سے وہ بتادے گا کہ بنیادی چیز کہ قرآن کے ان الفاظ اور اصطلاحات کے مفہوم اپنے طور پر پیدا کرنا نہایت خوش آئند اور ان کو ان کی حقیقت سے بدل کے رکھ دینا یہ ہے حقیقی منافقت جو ہم نے کی ہے اپنے ساتھ۔ اس کا نام مذہب رکھ لیا ہم نے۔ قرآن چلا آ رہا پیچھے سے یہ کہتے ہوئے وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ (9:90) پہلے ذکر ہورہا تھا شہری آبادیوں والوں کا۔ عربوں کی آبادیاں تو آج بھی اسی طرح سے بٹی ہوئی ہیں۔ لیکن نزولِ قرآن کے زمانے میں تو شہری آبادی اور صحرائی آبادی میں اتنا بُعد اور تفاوت تھا ان کی ذہنیتوں میں' ان کی بودوباش میں' ان کے انداز میں' ان کے تمدن میں' بالکل دوالگ الگ مخلوقیں تھیں۔ اور اسی اعتبار سے عرب اپنی زبان میں ان دو کو الگ مخلوقیں قرار دیتے تھے۔ شہروں کی مل کر بسنے والی آبادی کو وہ الناس کہا کرتے تھے اور صحراؤں میں جو نگاہوں سے اوجھل آبادیاں ہوتی تھی خانہ بدوشوں کی انہیں الجن کہا کرتے تھے۔ اور قرآن عربی زبان میں الناس والجن جب بھی کہتے تھے تو اس کے معنی ہوتے تھے شہری آبادیاں اور یہ صحراء نشین لوگ۔ اس سے پہلے قرآن ذکر کرتا چلا آ رہا تھا ان شہری آبادیوں کا۔

قرآن حکیم نے شہری اور صحرائی آبادی کو جن اور اُنس کے نام سے پکارا ہے

کہا کہ اعراب میں سے یہ جنہیں بدو کہا جاتا ہے یہ صحرانشینوں کی آبادیاں' وہ جسے ہم گاؤں کہتے ہیں ان کے ہاں تو سب سے بڑا شہر ہوتا تھا وہ۔ ان کی بھی یہ کیفیت کہ حالانکہ بڑے جنگجو ہوتے تھے ان کی سرشت میں قتال تھا' مسلسل سوسو برس تک ایک ایک لڑائی ان کی جاری رہا کرتی تھی۔ کہا کہ تم نے دیکھا کہ جنگ کے نام پر اس طرح لپک کر جانے والے' اب جنگ سے کس طرح جی چرا رہے ہیں۔ کہا ایسا نہیں کہ جنگ سے ڈر رہے ہیں' بات کچھ اور ہے۔ اس سے پہلے جنگ کی جاتی تھی مالِ غنیمت کے لیے' لوٹ مار کے لیے' ذاتی انتقام

لینے کے لیے قبیلے کی Prestige کے لیے اپنے ذاتی پندار کی خاطر۔

قرآن حکیم نے مالِ غنیمت کے حصول کی خاطر جنگ وقتال کے جذبۂ محرکہ کے تصور کو ہی بدل دیا

مشہور ہے نا وہ واقعہ ذاتی پندار کہ بدر کے میدان میں جب ابوجہل کی چھاتی پہ چڑھ کر دہ نوجوان قتل کرنے لگا تو اس نے کہا کہ حلق پہ سے قتل نہ کرو یہاں نیچے سے قتل کرو' لڑکے نے کہا ہے کہ گردن تو بڑی آسانی سے قتل ہو جاتی ہے نیچے سے تو ہڈیاں کاٹنی پڑتی ہیں اتنی اذیت بھی پہنچے گی تو یہ کاہے کے لیے۔ کہنے لگے کہ جنگ کے بعد دستور تھا کہ بڑے بڑے سرداروں کے سر نیزوں پہ اٹھا کر ان کا جلوس نکالتے تھے۔ کہا کہ جب وہ جلوس نکلے گا تو ابوجہل کا سر باقیوں سے دو انچ اونچے ہوگا۔ پندار کی کیفیت یہ تھی۔ ان کے جنگ کے محرکات یہ ہوا کرتے تھے۔

ابوجہل کی آخری خواہش اور قرآن حکیم کا فلسفہ حیات نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

قرآن نے کہا کہ چونکہ اب جو جنگ لڑی جائے گی اس میں ان محرکات میں سے کوئی ایک محرک جذبہ بھی نہیں ہے' یہاں تو خالصتاً خدا کی اقدار اور اصول کو بلند کرنے کے لیے جنگ لڑی جائے گی۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی۔ اس لیے یہ نہیں کہ جنگ سے ڈرتے ہیں' جنگ کا محرک جذبہ ان کے ہاں ویسا نہیں پیدا ہو سکا کہ جو ایمان پیدا کیا کرتا ہے اس لیے منافقت ہے۔ یعنی عجیب بات ہے۔ یہ جو مشہور تھے جنگجو قوم یہ بھی بہانے کرنے کے لیے آ گئی' جنگ سے بہانے کرنے کے لیے آ گئی۔

انسان کے جذبۂ محرکہ کا نام ہی تو ایمان ہے

کہا دیکھ لیا کہ اصل شے محرک جذبہ ہوا کرتا ہے اور جذبۂ محرکہ کو ایمان کہا کرتے ہیں عزیزانِ من! آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ اعمال صحیح ہونے چاہئیں ایمان کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں پتہ نہیں ایمان کہتے کس چیز کو ہیں۔ جنگ ایک عمل کا نام ہے۔ جنگ تو موجود ہے عمل' ایمان کی کیا ضرورت ہے۔ ایمان کی ضرورت یہ ہے کہ جنگ مالِ غنیمت کے لیے بھی ہے جنگ قبیلے کے انتقام کے لیے بھی ہے جنگ ذاتی پندار کی خاطر بھی ہے۔ یہ ایمان ہے۔ اور جنگ صرف خدا کے کلمہ کو اس کے قانون کو اس کی اقدار کو بلند رکھنے کے لیے غالب رکھنے کے لیے بھی جنگ ہے۔ یہ بھی ایمان ہے۔ اب ایمان اور ایمان میں فرق آپ دیکھ لیجیے جنگ میں کتنا فرق پیدا ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں ایمان۔ کہا یہ اتنے بڑے جنگجو وہ بھی عذر تراشیوں پہ آ گئے۔ مُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ (9:90) ڈرنے والے نہیں ہیں عذر لے کے آ رہے ہیں لِيُؤْذَنَ لَهُمْ (9:90) کہ ہمیں بھی اجازت دے دیجئے کہ ہم پیچھے رہ جائیں۔

مسلمان ہونے کی پہلی شرط خدا کے ساتھ بیع وشرٰی کے معاملے کو قبول کرنا ہوتا ہے

وَقَعَدَ الَّذِیْنَ کَذَبُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ (9:90) کہا پیچھے رہنا چاہتے ہیں یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم نے جو وعدے کیے تھے خدا اور اس کے رسول کے ساتھ اسلام لاتے وقت' وہ جھوٹے وعدے تھے۔ پوچھو یہ کیوں کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجیے ہم پیچھے رہ جائیں' سیدھی بات کیوں نہیں کہتے کہ وہ وعدے جھوٹے تھے۔ مسلمان ہونے کے لیے تو ایک ہی بنیادی وعدہ کیا جاتا ہے بلکہ وہ تو بیع وشرٰی کا ایک معاملہ ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (9:111) اسلام لانے والا تو لکھ کے دیدیتا ہے کہ میں نے اپنی ساری کمائی جو کچھ کسب و ہنر سے میرے پاس ہے اور یہ جان جو میری اپنی بھی نہیں ہے یہ دونوں ہی میرے کسب و ہنر کی کمائی اور مجھے جو کچھ وہبی طور پر ملا ہوا ہے یہ سارے کا سارا ابھی نہیں کہ میں نے یونہی دیدیا' بیچ دیا ہے۔ کہا کہ وَقَعَدَ الَّذِیْنَ کَذَبُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ (9:90) یہ جو اجازت مانگ رہے ہیں پیچھے رہنے کی' پیچھے رہنے کی بات نہیں ہے' اسلام لاتے وقت جو وہ کیا تھا' کہہ رہے ہیں وعدہ جھوٹا تھا۔ اسی لیے کہا سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (9:90) یہ کفر ہے جو اختیار کر رہے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس چیز کا نام کفر ہے۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ یہ بڑی زیادتی ہے کہ آپ کفر اور اسلام کی بحثیں چھیڑ دیتے ہیں کہ کسے مسلمان کہا جائے گا' کسے مسلمان نہیں کہا جائے گا۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو تمہیں آ کے سلام کہے ٹھیک ہے جی یہ مومن ہے۔ پوچھیے ان سے کہ سلام کی بات تو ایک طرف رہی وہ تو ہر چیز میں پورے اترتے چلے آ رہے ہیں قرآن یہ کہتا ہے سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (9:90) یہی تو کفر ہے۔ اور کفر کی بدتر شکل۔ ایک وہ تھا کہ جس نے آ کے یہ بیچا ہی نہیں تھا۔ ایک وہ ہے کہ جو آ کے یہ عہد نامہ لکھ کے دیدیا تھا میں نے بیچ لیا ہے' جب مانگا جاتا ہے اس چیز کو تو اس وقت پھر بہانہ تراشیاں کرتا ہے۔ یہ اس سے بدتر چیز ہے۔ پہلے دن سے کہہ دیتا کہ نہیں صاحب ہم نے نہیں دینی۔ کفر ہے اور بدتر قسم کا کفر ہے۔ کہا ٹھیک ہے ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ جس میں انسان جنگ میں نہ جا سکے ایسی صعوبات برداشت نہ کر سکے۔ لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَی الْمَرْضٰی وَ لَا عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ (9:91) کمزور ہے' سفر کی صعوبت برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں' بیمار ہو گئے ہیں عارضی طور پر' وہ بھی نہیں۔ ایک اور قسم بھی ہے۔

عہد نبوت میں ریگولر آرمی کا یا Paid فوج کا کوئی وجود نہ تھا

جنگ میں جانے کے لیے حالت مملکت کی کیا تھی۔ اس زمانے میں یہ سٹینڈنگ آرمی تو ہوتی نہیں تھی۔ ایک ریگولر آرمی گورنمنٹ کی Paid الگ سے ہوتی نہیں تھی۔ ہر مومن سپاہی ہوتا تھا۔ کاروبار کرتے تھے اپنے' جب جہاد کے لیے آواز پڑتی تھی' باہر آ جاتے تھے۔

ان میں سے جنہیں کاروبار کے لیے چھوڑنا مقصود ہوتا تھا' مملکت انہیں چھوڑ دیتی تھی' باقی چلے جاتے تھے اپنے اپنے خرچ پر۔ اپنے اپنے خرچ پر جاتے تھے مالِ غنیمت میں ان کا اپنا حصہ کوئی نہیں ہوتا تھا۔ عزیزانِ من! جو میں کہا کرتا ہوں کہ ان کا دھکا لگا ہوا تیرہ سو سال سے' بغیر انجن کے گاڑی چل رہی ہے' نام کی سہی چل رہی ہے' یہ ان کے ایمان کا ہی صدقہ ہے۔ وہ بھی تھے جن کے پاس جانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ابھی وہ آیت آتی ہے عزیزانِ من! کلیجہ پھٹ جاتا ہے اس آیت کو دیکھ کے۔ کہا ٹھیک ہے ایسے لوگ جو ہیں' یہ نہ جائیں' پیچھے رہ جائیں۔

کفار کے ساتھ جنگ کے لیے پیچھے رہ جانے والے منافقین کا کردار

منافقین کا بتایا ہے کہ پیچھے رہ کے کیا کرتے تھے۔ تو جب انہیں وہاں شکست ہوتی تھی تو ان سے کہتے تھے کہ دیکھا ہم ٹھیک کہتے تھے نا کہ نہیں جانا چاہیے۔ ہم ساتھ جاتے تو ہم بھی مرتے' تم ساتھ جاتے تم بھی مرتے۔ اور اگر وہاں کامیابی اور فتح ہو جاتی تو کہتے فتح اور کامیابی اس قوم کی ہوئی ہے نا ہم بھی اسی قوم میں سے ہیں۔ فتح تو قوم کی ہوتی تھی۔ شکست ان افراد کی ہوتی تھی۔ کہتا ہے یہ پیچھے یوں کرتے رہتے تھے۔ اور کہا کہ یہ پیچھے رہ جانے والے جو ہیں پیچھے تو یہ بھی رہیں گے' پیچھے وہ بھی رہے تھے۔ اِن کی کیفیت کیا ہے اِذَا نَصَحُوۡا لِلّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ (9:91) یہ پیچھے بیٹھے ہوئے کیا کریں گے' لفظ نصیحت ہے عزیزانِ من! اب دیکھا نصیحت ہمارے ہاں کیا معنی پیدا کر گئی۔ اور پھر جب حضرتِ ناصح شاعروں کے ہاں چلے گئے تو پھر تو پوچھو نہیں' اس کی شخصیت ہی کتنی تبدیل ہو گئی۔ یہ نصیحت کیا ہے؟ بنیادی معنی نصیحت کے ہوتے ہیں کسی کے چاکِ گریباں کی رفو گیری کرنا کسی کے پھٹے ہوئے کپڑے کو سی دینا۔ ان کے ہاں ناصح درزی کو ہی کہتے تھے۔ ہمارے ہاں ناصح وہ ہوتا ہے جو باقی دھجی کوئی بچ گئی ہے اسے اپنے کچوکوں سے مزید لیر لیر کر دیتا ہے۔

پیچھے رہ جانے والے محسنین کی مصروفیات کا ذکرِ خیر

معاف رکھیے۔ کہا کہ یہ جو پیچھے رہ جائیں گے یہ پیچھے رہ کے کیا کریں گے؟ یہ یہاں بیٹھے ہوئے ان کی کیفیت ہوگی کہ جسے ہوم فرنٹ آپ کہتے ہیں نا یہ وہ سنبھالیں گے۔ اللہ اور رسول کے متعلق جہاں کہیں دیکھیں گے کہ ان کے دامن میں کہیں کوئی چاک پیدا ہونے والا ہے' جھٹ سے اس کو رفو کر دیں گے' معاشرے کو خلفشار سے بچائیں گے' انتشار سے بچائیں گے۔ لفظ بدنام ہو گیا ہوا ہے جسے پروپیگنڈہ کہا جاتا ہے۔ اب تو وہ بڑے ہی برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ صحیح خیالات پھیلائیں گے یہاں' جانے والوں کی تقویت کا سامان کریں گے' ان کے گھر والوں کی تسکین کا موجب بنیں گے۔ ایک ہی لفظ ہے (نَصَحُوۡا لِلّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ) (9:91) اللہ اور رسول کے لیے دوسروں کے پھٹے دامنوں کی رفو گیری کریں گے۔ قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ دیکھنے کے قابل ہے۔ کہا یہ بھی بیٹھیں گے' وہ

بھی بیٹھیں گے' وہ بیٹھ کے تمہارے باقی کپڑوں کو چیرتے جائیں گے' یہ بیٹھ کے رفوگری کرتے چلے جائیں گے۔مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ (9:91) یہ ہیں وہ محسنین جن کے اوپر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔انہیں محسن کہا ہے۔محسن کسے کہتے ہیں؟حسن کا تو آپ کو پتہ ہے ناکسی کے بگڑے ہوئے توازن کو صحیح کر دینا' اسے محسن کہتے ہیں۔ذرا کسی کی کرسی کا توازن بگڑ جائے' تین پاؤں بالکل صحیح اور چوتھا پاؤں ذرا سا ادھر آنے دیجیے' اسے توازن بگڑنا کہتے ہیں' وہ جو جھٹ سے اسے سنبھال لے' اسے محسن کہتے ہیں۔یہ پیچھے بیٹھے ہوئے اس معاشرے کے توازن کو بگڑنے سے بچا رہے تھے۔ان کا کوئی مواخذہ نہیں۔وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (9:91) دونوں چیزیں ہیں: خدا ان کی محافظت کا سامان بھی کرے گا ان کی نشوونما کا سامان بھی وہ کرے گا۔

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا کی کیفیت رکھنے والی موتیوں سے لبریز آنکھوں کا ذکر

وہ جو گئے ہیں ان کے متعلق بھی' یہ جو پیچھے رہ گئے ہیں ان کا بھی۔وَّ لَا عَلَی الَّذِیْنَ اِذَا مَآ اَتَوْکَ لِتَحْمِلَھُمْ (9:92) ان پہ بھی کوئی الزام نہیں ہے کہ وہ تیرے پاس آتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ جہاد میں جانے کے لیے تو 'سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا' تڑپ رہے ہیں جانے کے لیے' سواری ہے نہیں اس کا کچھ انتظام کر دیجیے۔قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُکُمْ عَلَیْہِ (9:92) اور تیری یہ کیفیت کہ تو نے کہا کہ میں کیا کروں سواری تو میرے پاس بھی نہیں ہے تمہارے لیے۔کہتا ہے اس کیفیت کے بعد دو لفظ ہیں تَوَلَّوْا (9:92) پلٹ کے یہ گئے' کس عالم میں؟ وَّ اَعْیُنُھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا یَجِدُوْا مَا یُنْفِقُوْنَ (9:92) آنکھوں سے آنسو رواں تھے ان کے بھی تیرے بھی۔ایک وہ تھے پیچھے رہ جانے والے۔آ ہاہاہا۔ان آنسوؤں کی قیمت کوئی کیا دے گا۔

قرآنی معاشرے میں خوف و حزن کے سلسلہ میں مومنوں کی کیفیت اور غیر قرآنی معاشرے میں انسانوں کی حالت زار کی تصویر کشی

تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا (9:92) آپ یہاں لفظ حزن دیکھئے۔اس مہینے کے طلوعِ اسلام کے لمعات میں یہ چیز آئی تھی۔پوچھا یہ گیا تھا کہ اسلامی مملکت میں ایک مومن کی نمایاں خصوصیت قرآن نے کیا بتائی ہے۔پہلے ہی پارے کے دوسرے ہی صفحہ کے اوپر جس میں یہ کہا ہے فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ (2:38) اس کا نتیجہ کیا ہوگا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (2:38) اُنہیں نہ خوف ہوگا اور نہ حزن ہوگا۔اور ان دو لفظوں کی تشریح میں نے کی ہے قرآن سے۔خوف تو کسی خارجی خطرے کو کہتے ہیں' حزن دل گرفتگی کو کہتے ہیں۔وہ معاشرہ ہوگا کہ جس میں نہ خارج سے کوئی خطرہ ہوگا نہ اندر ہی دل گرفتگی اور پژمردگی ہوگی کسی قسم کی۔یہاں یہ لفظِ حزن ہے اور عرب عام

طور پہ استعمال کیا کرتے تھے اُس بال بچے والے کے لئے جو صبح نکل کے گیا کہ کچھ کما کے لائے شام تک اسے کچھ ملا نہیں' اس مزدور کی طرح جو صبح آ کے ایک بکنے والی جنس کی طرح اس مارکیٹ میں بازار میں سڑک کے کنارے پہ آ کے بیٹھ جاتے ہیں۔عزیزانِ من! اگر دل پہ ضبط ہو تو کسی وقت یہ دیکھا جائے جا کر' غلام بھاگتا تھا پکڑا نہ جائے' یہاں یہ آزاد گھروں سے نکلتے ہیں اور سڑک کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں بکنے کی تلاش میں' خریداروں کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں' کوئی آتا ہے تو سب اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔طلب اور رسد کا معاملہ' ہے سپلائی اینڈ ڈیمانڈ کا معاملہ ہے۔انسانوں کے ہاتھوں انسان بکتا ہے۔وہ آ کے ان میں سے جس کو بقدرِ ضرورت وہ مزدوروں کو لے جاتا ہے اور ایک ٹائم ہوتا ہے جس میں مزدوری شروع ہوتی ہے۔جب وہ وقت ختم ہو جاتا ہے اور انہیں خریدنے والا کوئی نہیں ملتا تو جس انداز سے یہ گھر لوٹتا ہے اس گھر میں جہاں یہ بچوں کو کہہ کے آیا تھا کہ میں ابھی بچو تمہارے لیے آٹا لینے جا رہا ہوں' جس انداز سے یہ من من بھر کے قدم اٹھاتا گھر کو آتا ہے' عرب اسے حزن کہا کرتے تھے۔تو حزن وہ دل گرفتگی ہے جو اس قسم کی بیچارگی سے پیدا ہو۔یہاں وہ لفظِ حزن آیا ہے۔تو آمادگی کا یہ عالم ہے کہ خود چل کے آئے ہیں تمہارے پاس' بیچارگی کی یہ کیفیت ہے کہ سواری نہیں ہے' خود تمہاری بھی یہ کیفیت ہے ابھی مملکت کے پاس بھی سواریاں نہیں ہے۔واپس لوٹ رہے ہیں تو آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور اسے کہا ہے حزن۔

قرآنی مفہوم میں مجرم کی تعریف

اِنَّمَا السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ یَسۡتَاۡذِنُوۡنَکَ وَ ہُمۡ اَغۡنِیَآءُ (9:93) آؤ تمہیں بتائیں کہ مجرم کون ہیں' سب کچھ ہوتے سوتے جو آ کے بہانہ تراشیاں کرتے ہیں کم بخت' ان کی یہ کیفیت ہے یہ ہیں مجرم۔رَضُوۡا بِاَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَوَالِفِ (9:93) راضی ہیں اس پر دل کی رضامندی سے' وہ لوگ چاہتے ہیں' میں نے کہا تھا''قٰعدین اور خوالف''میں عربی زبان میں یہ فرق ہوتا تھا' قٰعد میں تو وہ بھی ہو سکتا ہے جو کسی عذر خالص کی بناء پر بھی بیٹھ جائے جنگ میں نہ جا سکے' خوالف اسے کہتے تھے جو سب کچھ ہوتے سوتے اس قابل اور استطاعت رکھنے کے باوجود محض اس بناء پر پیچھے ہو کے بیٹھ جائے' چوڑیاں پہن کے جسے آپ کہتے ہیں۔قران کہتا ہے سب کچھ ہونے کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ پیچھے رہنا چاہتے ہیں۔کہتا ہے ذہنیت یہ ہو جائے جہاں منافقت کی' وہاں سمجھانے کے لیے سر مارنے سے کیا فائدہ۔یہ ہیں وہ جن کے متعلق کہا وَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (9:93) ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔وہ بات ان کے سمجھانے کی کرے گا نا' اور جس کی کیفیت یہ ہو کہ کانوں میں ڈاٹ ٹھونس لیں' آنکھوں پہ پٹیاں باندھ لیں' انہیں آپ علم و بصیرت کی بناء پہ کیا سمجھائیں گے' وہ سمجھنا چاہتے ہی نہیں۔یَعۡتَذِرُوۡنَ (9:94)

دروسِ قرآن حکیم کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کی طرف سے ایک وضاحت

عزیزانِ من! اس لفظ سے پہلے ایک یونہی خوش آئند بات آئی' دسواں پارہ یہاں ختم ہوتا ہے گیارہواں شروع ہوتا ہے۔خوش آئند اس لیے کہ یاد آ گیا لاہور میں آ کر درسِ قرآنِ کریم 1958ء میں شروع کیا تھا کراچی میں تو بہت پہلے سے تھا یہاں 1958ء میں نئے سرے سے شروع کیا تھا 1968ء میں دس سال کے عرصے میں ہم نے ختم کر لیا تھا ایک دفعہ پورا قرآنِ کریم درس میں۔ مارچ 1968ء میں ہی پھر شروع کر دیا گیا تھا جون 1973ء میں پانچ سال میں ہم دس پارے ختم کر پائے ہیں۔تو گویا پہلے درس کے مقابلے میں یہ زیادہ تفصیلی آ رہا ہے۔وہاں ہم پانچ سال میں نصف ختم کر چکے تھے اور اب ہم پانچ سال میں ایک تہائی ختم کر چکے ہیں۔اس کے معنی یہ ہیں کہ بہ ہیئت مجموعی یہ درس درسِ اول کے مقابلے میں زیادہ تفصیلی ہے۔بہتر کا تو میں نہیں کہہ سکتا' وقت کے اعتبار سے یہ زیادہ تفصیلی تھا۔تو دسواں پارہ آج ہم نے ختم کیا ہے اس لیے فوراً ذہن میں یہ بات آئی۔

کوتاہیوں کا اعتراف کرنے پر قرآن حکیم کی کشادہ دلی اور لفظ عالم غیب اور لفظ شہادت کی وضاحت

یَعۡتَذِرُوۡنَ اِلَیۡکُمۡ اِذَا رَجَعۡتُمۡ اِلَیۡہِمۡ (9:94) کہا یہ ذہنیت ہے جب تم واپس آؤ گے نا استقبال کے لیے باہر نکلیں گے۔قُلۡ لَّا تَعۡتَذِرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکُمۡ (9:94) کہا کچھ ضرورت نہیں ہے اس وقت معذرتیں پیش کرنے کی' تمہاری بات کو کبھی صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ "نُؤۡمِنُ لک اور نُؤۡمِنُ بک" ان کی Preposition میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ایمان باللہ کے معنی ہوتا ہے اسے حقیقت تسلیم کر لینا' "ل" کے ساتھ ایمان ہوتا ہے کسی کی بات کو سچا مان لینا۔کبھی تمہاری بات کو سچا نہیں مانیں گے۔قَدۡ نَبَّاَنَا اللّٰہُ مِنۡ اَخۡبَارِکُمۡ (9:94) تمہاری حقیقت ہم پہ ظاہر ہو چکی ہے اب تم دھوکہ نہیں دے سکتے۔تو کیا یہ ابدی طور پر Condemn ہو گئے' یہ راندۂ درگاہ ہو گئے' اب بازآفرینی کی کوئی شکل باقی نہیں ہے۔قرآن ایسا نہیں کرتا عزیزانِ من! بڑا کشادہ دل واقع ہوا ہے' بڑی کشادہ نگہی ہے اس کے اندر' تنگ نظر نہیں ہے۔کہا نہیں کوئی بات نہیں ہے یہ جو کچھ پیچھے ہوا ہے اس کے متعلق ہم کہہ رہے ہیں۔وَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمۡ وَ رَسُوۡلُہٗ (9:94) اس کے بعد خدا اور اس کا رسول دیکھیں گے کہ تم پھر کس قسم کے کام کرتے ہو۔دیکھا وہی عَمَلَکُمۡ (9:96) ہے یہاں' منافقت کا فیصلہ تو اس پہ ہونا ہے۔دعوائے ایمان تو تمہارا پہلے بھی تھا' دعوائے ایمان اب بھی ہے۔اس کو تو ہم جھانک کے دیکھ نہیں سکتے تمہارے سینے کے اندر' تمہارے اعمال نے بتا دیا کہ جھوٹے تھے اپنے دعوے میں' عَمَلَکُمۡ (9:96) پھر ہم دیکھیں گے کہ تم کیا کام کرتے ہو۔ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰی عٰلِمِ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (9:94) دونوں باتیں اس میں آ گئیں: وہ خدا' خدا کا قانون۔عالمِ غیب اور شہادت دونوں۔شہادت تو وہ ہے جو مشہود طور پر ہمارے تمہارے اور خدا کے سامنے

آ جاتا ہے۔اس میں تو سب شامل ہوتے ہیں۔جو کچھ محسوس طور پر سامنے آ جائے' وہ مشہود ہوتا ہے' اُسے شہادت کہتے ہیں۔خدا کے متعلق عالمِ غیب جو تھا اس کے ساتھ شہادت بھی کہا ہے۔تو اس میں تو انسان بھی شامل ہوتے ہیں کیونکہ یہ شے محسوسات کے دائرے میں آ جاتی ہے۔ ہر وہ چیز جو محسوسات کے دائرے میں نہ آئی ہو' انسان کی نگاہیں جس کا مشاہدہ نہ کر سکیں' اسے غیب کہا جاتا ہے۔اور کہا کہ وہ غیب بھی جانتا ہے اس لیے تمہارے اعمال کے متعلق دیکھ لیا جائے گا' محسوس شکل میں وہ کیسے سامنے آتے ہیں اور ان کے پیچھے جذبۂ محرکہ یا نیت کیا ہوتی ہے۔فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (9:94) پھر دیکھئے وہی عمل آ رہا ہے کہ ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تمہارے اعمال نے تمہارے متعلق کیا نتیجہ پیدا کیا ہے۔آئندہ کے متعلق یہ کچھ ہوگا پیچھے جو کچھ ہے وہ ہمیں علم ہے اس لیے اس کی بات مت کرو اس کی بناء پر تو تم ہم میں شامل نہیں ہو سکتے' آئندہ کے لیے دروازہ کھلا ہے۔ٹھیک ہے اپنے آپ کو سچا پکا مومن ثابت کر دو' ہمارا دروازہ کھلا ہے۔عزیزانِ من! اسے کشادہ نگہی کہتے ہیں اور یہ بہت بڑا وصف ہے۔

فرعون کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ کی طرف سے سینے میں کشاد پیدا کرنے کی دعا

جو شخص بھی اتنا بلند پروگرام لے کر نکلے اس کے لیے کشادہ ظرفی وسعتِ نگاہ بڑی ضروری چیز ہے۔یہ چیز تھی جس کے لیے حضرتِ موسیٰؑ کو جب کہا گیا کہ جاؤ فرعون کی طرف اور ٹکراؤ اس سے (اِنَّهُ طَغٰى) (79:17) سر چڑھ گیا ہے وہ۔حضرتِ موسیٰؑ کو فرعون کے خلاف ایک ذاتی رنجش بھی تھی' وہاں سے بھاگے ہوئے تھے اس نے انؑ کے لیے سزائے موت تجویز کر دی تھی۔ان کی قوم کے اوپر بھی جو کچھ گذر رہی تھی یہ اس قوم میں سے بھی تھے۔تو دل کے اندر انتقام کے جذبات تھے۔آپ کو معلوم ہے کہ جاتے وقت جو دعا یا آرزوئیں کی تھیں کہ کیا کیا میں چاہتا ہوں۔اس میں یہ چیز بھی تھی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي (20:25) میرے نشو و نما دینے والے میرے سینے میں کشاد پیدا کر دے' ایسا نہ ہو کہ اس ذاتی رنجش کی بناء پر میں وہاں تنگ نظر ثابت ہو جاؤں' کشادہ ظرفی عطا کر دے۔اور اسی وجہ سے قرآن میں کہا گیا کہ اے موسیٰ ہم جانتے ہیں کہ تمہاری طبیعت بڑی جلالی واقع ہوئی ہے فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا (20:44) نرمی سے بات کرنا' ہو سکتا ہے کہ نرمی کا اثر ہو جائے۔

نبی اکرم ﷺ کی بلند ظرفی اور کشادہ نگہی تو اپنی مثال آپ تھی

یہ وہی کر سکتا تھا جس کے سینے میں کشاد پیدا ہو جائے اور یہ وہی نعمتِ کبریٰ تھی جس کی یاد حضور اکرم ﷺ کو دلائی گئی کہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (94:1) کشادگیٔ نگاہ عزیزانِ من!۔اور پھر جب اقتدار اور قوت ہاتھ میں آئے' اس وقت نگاہ کی کشادگی کہ جب پورے اہلِ مکہ جکڑے ہوئے رسیوں اور زنجیروں میں پا بجولاں سامنے کھڑے ہوں۔دنیا کے ہر قانون اور خود عربوں کے قاعدے کے

مطابق ان کا سراڑا دیا جائے اور کسی کو اس پہ اعتراض نہیں ہوسکتا تھا۔ عین اس وقت جب انہوں نے پوچھا کہ ہمارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ تو کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم دین کے بھی دشمن ہو لیکن تم نے ذاتی طور پر مجھے جو تکلیفیں پہنچائی ہیں اس کا بھی میرے سینے میں زخم ضرور موجود ہے۔ لیکن آج جو تم اس دین کو قبول کر رہے ہو تو تمہارے اس عمل کے اوپر میری ہزاروں ذاتی رنجشیں نثار ہیں۔ **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) یہ ہے شرح صدر عزیزانِ من! تنگ نظر صاحبِ قوت کے ہاتھوں دشمن آیا ہوا تو پوچھو نا پھر کیا کرتا ہے اس کے ساتھ۔ اسے Sadistic Tendency کہتے ہیں سائیکولوجی میں' کسی کو ایذاء پہنچا کر خوش ہونا۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں اس کے بعد فوری قتل نہیں کر دیا جاتا۔ ورنہ اگر دشمن ہے اس سے خطرہ ہے تاریخ میں بھی آپ پڑھتے ہیں واقعات دیکھتے ہیں' مار دینا بھی بڑا آسان ہوتا ہے ایک گولی مار دی جائے۔ اس طرح سے نہیں مارا جاتا ہے جس کے متعلق کہا تھا کہ

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ایک بار نہیں مارا جاتا۔ اس طرز عمل کو Sadism کہتے ہیں اذیت پہنچا کے لذت حاصل کرنا۔ یہ تنگ نظری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس جذبے سے جو بلند ہونا ہے اسے کہتے ہیں شرح صدر۔ اور بلند انسان کریکٹر کی ایک یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ عین ایسے وقت میں وہ شرح صدر سے کام لیتا ہے۔ اس لیے یہ چیز کہی کہ آئندہ کے لیے دروازے کھلے ہوئے ہیں' ہم تنگ نظر واقع نہیں ہوئے ہیں تمہارے اعمال نے اگر یہ بتا دیا کہ تم واقعی اپنے دعوئ ایمان میں سچے ہو' ہم گلے سے لگالیں گے تمہیں۔

ہمارے ہاں قرآن حکیم کے تراجم کا معیار لفظ رِجس کے سلسلہ میں کیے گئے ترجمے سے دیکھا جاسکتا ہے

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ (9:95) اللہ کی قسمیں کھا کھا کے کہیں گے جب تم واپس آئے کہ نہیں صاحب درگذر کیجیے' بات بالکل سچی تھی جو ہم نے کہی ہے' یونہی آپ کے کسی نے کان بھر دیے۔ **فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ** (9:95) اعراض برتیئے ان سے۔ قطع نہیں کیا گیا' کاٹ کے نہیں پھینک دیا گیا۔ کہا کیا تھا ان کو؟ کہا ہوا یہ تھا **اِنَّهُمْ رِجْسٌ** (9:95) اب آپ ترجمے دیکھیے قرآنِ کریم میں ترجمہ ان کا ناپاک اور پلید لکھا ہوا ہوگا۔ یعنی عزیزانِ من! سوچیے اگر یہی بات تھی اتنا کچھ ان کے خلاف ہو رہا ہے کہ جاؤ ہم کبھی اس شکل میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں ملائیں گے۔ معلوم ہوگیا ہے تم جو کچھ ہو' تمہارے اعمال نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ یہ ساری چیزیں ان کے متعلق کفر کہا جاتا ہے' جہنم کے کندے کہا جاتا ہے۔ جب پوچھا جاتا ہے کہ جرم کیا تھا تو جرم اتنا ہی تھا کہ جاؤ تم ناپاک ہو جاؤ' نہا کے آؤ۔ **رِجْسٌ**' بڑی عجیب چیز ہے صاحب۔ جو تھوڑا پانی اگر کنویں میں ہو اور نیچے ساری کھار اور گدلا پن اس میں ڈول نہیں بلکہ وہ جو ٹوبے اس میں ڈالتے ہیں کانٹوں والی زنجیریں' وہ اس میں سے چیزوں کو تلاش کرتے ہیں۔ آپ دیکھیے اس وقت اس

پانی کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ کہا کہ ہوا یہ تھا کہ پانی تو ذرا مقطر صاف اور شفاف تھا جس میں یہ چوبے اور ٹوبے اترے تھے۔ ان کی جذبات پرستیوں نے انہیں گھولا مار دیا اس لیے ان کے اندر شکوک شبہات پیدا ہوئے۔ شکوک کا نتیجہ یاد رکھئے اضطراب ہوتا ہے' اضطراب ہوا پیدا' یقین گیا۔ یقین گیا' ایمان گیا' ایمان گیا' عمل گیا۔ کہا ہوا یہ ان کے ساتھ۔ ایک لفظ میں کہ ان کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ کہا ہوا یہ تھا کہ اِنَّهُمْ رِجْسٌ (9:95) Confusion Create ہوگئی۔ واہ واہ واہ۔ پانی تو بڑا صاف تھا انہوں نے کچھ تلاش کرنے کے لیے جو چیز ڈالی تھی' بجائے اس کے کہ مقطر پانی میں کچھ دیکھتے ان حرکتوں سے خود ہی اس کو گدلا کر دیا۔ کہی تھی وہ بھی بات عجیب ہے کہ

میرے ساقی نے عطا کی تھی مے بے دُرد
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

لیکن یہ تو پیمانے کا رنگ ہے جو پانی کو اس نے ستیاناس نہیں کیا' وہ اس طرح سے باقی ہے اس کے اندر۔ یہ ''رجس'' تو وہ کیفیت ہے کہ پانی ایسا نہیں رہتا' بڑا گدلا ہو جاتا ہے۔ وَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (9:95) یہ نہ کہیے کہ ہم نے کچھ کر دیا تھا' ہماری طرف سے کچھ ہو گیا تھا' جو انہوں نے کیا تھا نا اس کنویں میں اتر کے' یہ اس کا نتیجہ تھا۔

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ منافقین کی طرف سے انفرادی سطح پر ایک اور چال

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا (9:96) کہتا ہے ان کی اگلی چال دیکھئے یہاں سے پھٹکارے گئے تو الگ الگ جانا شروع کر دیا مومنوں کے پاس کہ دیکھئے نا بھائی صاحب آپ مجھے تو جانتے ہیں کہ میں بالکل سچا تھا جب میں نے کہا تھا کہ نہیں جائیں گے یہ سب کچھ' اب وہاں کوئی دو چار بیٹھے ہوئے ہیں' انہوں نے پٹی پڑھا دی ہے کان بھر دیے ہیں۔ اب میں ہزار بولتا ہوں' وہ مانتے ہی نہیں ہیں۔ اور پھر وہ تو تھا ہی منافق ہم منافق تر ہوتے ہیں اُسے کبھی نہیں کہتے کہ نہیں تم منافق تھے اور واقعی تمہارے ساتھ یہ ہونا چاہیے تھا' ٹھیک ہے جی بہرحال میں دیکھ لاں گا۔ منافق تر۔ کہا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا (9:96)۔

دین میں سوال خدا تعالیٰ کے ساتھ انفرادی رضامندی کا نہیں بلکہ نظام خداوندی کو راضی کرنے کا ہے

تمہارے پاس آئے لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ (9:96) تمہیں راضی کرنے فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ (9:96) کہتا ہے اگر انفرادی طور پر تمہیں یہ راضی بھی کر گئے تو کیا ہوا یہاں تو انفرادی طور پہ نہ کوئی کسی سے راضی ہوتا ہے' نہ کسی سے ناراض ہوتا ہے' نہ کسی کی ناراضگی سے اس فیصلے پہ اثر کچھ ہو سکتا ہے' نہ ناراضگی سے اثر ہوتا ہے۔ سوال ہی نہیں ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (9:96) یاد رکھو اس قسم کے لوگ جو صحیح راستہ چھوڑ کے ایک طرف کو نکل جاتے ہیں' خدا ان سے راضی نہیں ہوتا۔ تم انفرادی طور پہ ان سے راضی ہو جاؤ گے

تو کیا ہو جائے گا اس کے بعد۔ سوال تو یہ ہے کہ خدا کا نظام راضی ہوتا ہے یا نہیں؟!!!۔ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (9:97) کہتا ہے بدوی زندگی والے یہ صحرا نشین بڑے سخت قسم کے لوگ واقع ہوئے ہیں۔ یہ کفر میں بھی بڑے سخت تھے اب منافقت میں بھی ویسے ہی سخت ہیں۔

وحی کی اقدار کے بغیر انارکی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا

کہا بات یہ ہے وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (9:97) اصل بات یہ ہے عزیزانِ من! جسے حدود کہا گیا ہے۔ وحی یا قرآنِ کریم یا دین انسان کو صحیح آزادی دینے کے لیے آتا ہے لیکن آزادی وہی صحیح ہوتی ہے جو کچھ پابندیاں ساتھ لگاتی ہو۔ ان پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے اگر آزاد ہیں تو وہ صحیح معنوں میں آزاد ہیں اگر ان پابندیوں کو توڑ دیا جائے یعنی کوئی پابندی بھی نہ رکھی جائے وہ آزادی نہیں ہوتی' وہ انارکی کہلاتی ہے' فوضویت کہلاتی ہے' جسے مادر پدر آزاد ہو جانا کہتے ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی ایسی آزادی نہیں چل سکتی۔ یہ تمام پابندیاں جن کے اندر رہتے ہوئے آزادی حاصل ہوتی ہے انہیں حدود کہا جاتا ہے۔ حدیں باندھی ہوں Limitations۔ جیسے میں مثال میں کہا کرتا ہوں فٹبال کے کھیل میں میدان میں جو لائنیں لگائی جاتی ہیں' وہ حدود ہوتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے احکام کی جو تعلیم دی ہے وہ حدود اللہ ہے۔ وہ صرف باہر کی لائنیں لگائی ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے تمہیں ہر قسم کی آزادی ہے۔ لیکن دیکھنا ان حدود کو کہیں پھاند کے آگے نہ چلے جانا لَا تَعْتَدُوْهَا (2:229) ان سے تجاوز نہ کرنا ان کے اندر آزادی ہے۔

قرآن حکیم کی متعین کردہ ڈیموکریسی اور مغرب کی ڈیموکریسی میں بنیادی فرق

ہمارے ہاں کی ڈیموکریسی' مغرب کی ڈیموکریسی نہیں ہے۔ مغرب کی ڈیموکریسی حدود فراموش ہے۔ ان کے ہاں قانون یا قاعدہ یا فیصلہ کے لیے باہر سے کوئی پابندیاں نہیں عائد کی ہوئیں وہاں اقتدارِ اعلیٰ' اقتدارِ مطلق قوم کے ہاتھ میں ہوتا ہے' عوام کے ہاتھ میں ہوتا ہے' پبلک ہوتی ہے۔ اس کے نمائندے جو فیصلہ کریں' وہ جائز قانون قرار پاتا ہے۔ اسلام اس ڈیموکریسی کو انارکی کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے صحیح مشاورت ہی ڈیموکریسی ہے۔ اسے اسلام کی جمہوریت کہتے ہیں۔ پہلے ان حدود کو متعین کرو پھر Lagislative بناؤ یعنی اسمبلی پھر قائم کرو۔ جسے لاء ممبر بنا کے اسے پہلے بتا دو کہ یہ ہیں وہ حدود ان کے اندر رہتے ہوئے تمہیں اختیار حاصل ہوگا قانون سازی کا اور اجرائے قانون کا بھی۔ یہ ہوگئی اسلامی جمہوریت عزیزانِ من!۔ میں نے عرض کیا تھا کہ انہیں حدود اللہ کہا ہے۔ کہا یہ منافق' یہ صحرا نشین لوگ' ان کی تعلیم و تربیت کچھ اس انداز کی نہیں ہوئیں کہ یہ حدود اللہ کو پہچان سکیں۔ ان حدود کا پہچاننا' یہ ہے اصل چیز۔ جہاں رکنا ہے' وہاں رک جانا ہے۔ جہاں بڑھنا ہے وہاں بڑھتے چلے جانا ہے۔ یہ لوگ اسے نہیں پہچانتے۔

خدا تعالیٰ کی صفات میں سے الحکیم صفت بڑی جامع ہے

وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ (9:97) خدا نے جتنی بھی پابندیاں عائد کی ہیں یہ جو لائنیں کھینچی ہیں وہ علم پر مبنی ہیں، حکمت پر مبنی ہیں۔ میں نے ایک جگہ تبویب کے اندر ہی یہ لکھا ہے کہ خدا کے متعلق جہاں آیا تھا حکیم، حکمت Rationalism کو کہتے ہیں Reason کو کہتے ہیں، دلیل کو کہتے ہیں، علم و بصیرت کو کہتے ہیں، فلسفہ کو کہتے ہیں۔ خدا قادرِ مطلق ہے، قادرِ مطلق خدا کا یہ تصور دینا کہ وہ حکیم ہے یعنی وہ Rationally فیصلہ کرتا ہے جو وہ فیصلہ کرتا ہے۔ کم از کم میری محدود نگاہ میں میں نے مذاہب عالم کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور پھر میری کتاب اور ''مذاہب عالم کی کتابوں کی تاریخ'' وہ بھی اس کی شہادت دیتی ہے۔ خدا کا تصور بنیادی چیز ہے دین میں عزیزانِ من! سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جو مذہبی مدعی ہے صداقت کا، وہ خدا کا تصور کیا دیتا ہے۔ قرآن نے جامع طور پر جو صفات گنائی ہیں یہ آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔ اور سب سے بڑی چیز جو میں ابھی عرض کر رہا تھا کہ میری نگاہ نے کسی مذہب کی کتاب میں خدا کے متعلق حکیم نہیں دیکھا لکھا ہوا۔ قادرِ مطلق تو لکھا ہے، ڈکٹیٹر تو کہا گیا ہے، آمر تو ہے، یہ سب ہے لیکن یہ کہ وہ جو فیصلہ کرتا ہے، جو قانون بناتا ہے، وہ عین علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے Rationally فیصلے کرتا ہے، یہ خدا کی صفتِ حکیم صرف قرآن کے اندر آئی ہے۔ اور اتنی شدومد سے آئی ہے۔

اس پوری کائنات کی تخلیق بہت بڑی حکمت پر مبنی ہے

عزیزانِ من! وہ کہتا ہے کہ جب کوئی نہیں تھا، خدا تھے ہم، جب ہم قانون بنا رہے تھے، سنکھیے کو کیوں مہلک ہونا چاہیے، پانی کیوں ممدِ حیات ہونا چاہیے وہاں سوال ہی نہیں تھا کہ اس کیوں کا جواب دیا جاتا۔ یہ ہمارا ایک بڑا پلان تھا ہم نے وہاں مَا یُرِیۡد (11:107:22:14) کے طور کے اوپر قانون بنائے یہ بھی حکمت کے اوپر مبنی تھے وہ ہماری حکمت تم نہیں جانتے۔

تعمیر کائنات اور حکمت آمیز قوانینِ کائنات، خدائے علیم و خبیر کے نازل کردہ ہیں

جو قانون ہم نے تمہیں دیے ہیں، ہر قانون حکمت پر مبنی ہے اور اس حکمت کو تم سمجھ سکتے ہو۔ یہ وجہ ہے قرآنِ کریم نے! کتاب اور حکمت دونوں کو منزل من اللہ کہا ہے۔ کتاب بھی خدا نے نازل کی اس کے ساتھ اس کی حکمت، کتاب کے معنی قانون، The Law & the why of it، ہم نے یہ قانون ایسا کیوں بنایا ہے، اس قانون کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے کہتے ہیں حکمت۔ اور یہ ہے وہ مملکت یا حکومت جو صحیح معنی میں Rationally Law پر مبنی ہے کہ یہ اپنے ہر قانون کو Explain کرتے ہیں Reason کے اعتبار سے کہ ہم نے ایسا کیوں بنایا۔ حکم تو ایک ڈکٹیٹر کا بھی ہوتا ہے، حکم ایک اس حکومت کا بھی ہوتا ہے جو Rationally Formed ہوتا

ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ قانون خدا نے بنایا اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ قانون کے ساتھ ہم نے اس کتاب میں جب قانون دیا ہے' اس کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ کیوں ایسا قانون دیا' ایسا کرنے سے کیا ہوگا۔ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183) فرض قرار دیدیے گئے تمہارے اوپر صیام جسے ہم روزہ کہتے ہیں۔ ایک حکم ہے۔ خدا کو خدا ماننے والوں کے لیے یہ کافی تھا آگے کچھ ضرورت نہیں تھی۔ کہا نہیں! لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تا کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں' یہ قانون کی حکمت ہے۔ قرآن کو اس نگاہ سے پڑھیے' عجیب چیزیں سامنے آئیں گی۔

کائناتی قوانین کی حکمت یہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے بغیر نہ رہ جائے

جتنے احکامِ خداوندی ہیں ان کی حکمت خود قرآن کے اندر موجود ہے۔ اور ایمان علی وجہ البصیرت لایا ہی اس صورت میں جاتا ہے جبکہ حکم کی حکمت جو ہے وہ ساتھ سمجھ میں آجائے کہ یہ یوں ہے۔ یہ تو حاکم ہے آپ اس ڈاکٹر کا علاج نہیں کرتے جو آپ کو یہ نہ بتائے کہ یہ دوائی ایسا کیوں کرے گی "اوہنوں عطائی کیندے نے ناں"۔ یہ فرق ہوتا ہے۔ تو حکیم ہے وہ خدا جو ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا' ہم نے ایسا کیوں بتایا ہے۔ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (9:97) علم پر مبنی ہے' حکمت پر مبنی ہے۔

مرکزِ ملت کی طرف سے کوئی چیز طلب کرنے پر منافقین کی قلبی کیفیت

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَن يَّتَّخِذُ مَا يُنفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ (9:98) کہا یہ ٹھیک ہے جب کچھ ڈیمانڈ کی جاتی ہے' طلب کی جاتی ہے کہ کچھ جنگ کی ضروریات کے لیے چاہئے تو یہ لے آتے ہیں کچھ پیسے بھی لے آتے ہیں' لیکن کیسے دیتے ہیں تمہیں معلوم ہے؟ کہتا ہے یوں سمجھتے ہیں جیسے بیگار میں چٹی پڑ گئی ہو' مفت کا جرمانہ۔ وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ (9:98) لانے کے ساتھ یہ خلوصِ نیت نہیں ہوتی کہ خدا کرے تم کامیاب فاتح منصور ہو' نہ' لاتے ہیں چٹی کی طرح اور دل میں کہتے ہیں یا اللہ "ایناں دا بیڑہ غرق کر" مار دیا روز انہوں نے مانگ مانگ کے "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کیا کریں مصیبت میں آگئے۔ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ دوائر عجیب لفظ ہے Vicious Circle جسے کہتے ہیں یہ چاہتے ہیں۔ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ (9:98) کہا یہ چیز جو یہ تمہارے متعلق آ کے کہتے ہیں کہ اس طرح سے گرداب و بھنور میں ہوں' ان سے کہو انتظار کیجیے' لیکن انہیں معلوم نہیں یہ کس قسم کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اتنی جرأت نہیں کہ اعلانیہ کہہ دیں کہ ہمارے بس کی بات نہیں' کفر اختیار کرلیں۔ یا یہ چیز کہ شاید ساتھ رہنے سے کچھ فائدہ ہی ہو اعلانیہ یہ بھی نہیں کہتے اور صدقِ دل سے ساتھ بھی نہیں رہتے۔ کہتا ہے تمہیں پتہ ہے دَآئِرَةُ السَّوْءِ (9:98) یہ ہے Vicious Circle اس Vicious Circle میں کس بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں ان کو کچھ پتہ نہیں ہے۔ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (9:98) ہم سنتے بھی ہیں

ان کی باتیں اور ایسا نہیں ہے کہ صرف سن کے ہی فیصلہ کر لیتے ہیں، علیم بھی واقع ہوئے ہیں، جانتے بھی ہیں۔ سنتے بھی ہیں، جانتے بھی ہیں، سننے والے کے لیے جاننے والا ہونا ضروری ہے۔ وَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ (9:99) Out right نہیں Condemn کر رہا کہ پوری کی پوری قوم کے متعلق فیصلہ کر دیا۔ کہنے لگے غلط بات ہے، ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو سچے دل سے ایمان لائے ہوئے ہیں۔ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ (9:99) جو لاتے ہیں اس لیے لاتے ہیں۔

خدا کا مقرب ہونے کا مفہوم اور اس کا عملی مظاہرہ

میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ جسے قربِ خداوندی کہا جاتا ہے کہ خدا کے رنگ میں رنگے جانے والے، مقرب خدا کے جو ہیں۔ ہمارے ذہن میں تو تصور آیا ہوا ہے کہ جس کے متعلق آئینے ہی بدل کے رکھ دیے ہوئے ہیں۔ یہ لفظ قرب یا قربت بلندیٔ مدارج کے لیے آتا ہے، اپنے مدارج کی بلندی۔ اور دوسری چیز ہے یہاں عنداللہ، یہاں یہ بات ان کے ذہن میں ہوتی کہ اتنا کچھ دید یجئے خان بہادر کا خطاب مل جائے گا وہ جو تختی لگے گی ہسپتال کے باہر اس پر سنگ مرمر میں یہ کندہ کیا جائے گا کہ فلاں صاحب نے اتنا دیا قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰهِ (9:99) مدارج چاہتے ہیں لیکن خدا کے قانون کے مطابق مدارج چاہتے ہیں۔

صَلَوٰتِ الرسول کے سلسلہ میں Appreciation کی اہمیت اور اس حسن عمل کا نتیجہ

دوسری چیز صَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ (9:99) وہ پچھلا درس یاد کیجیے جس میں میں نے صلوٰۃ وسلام کے متعلق عرض کیا تھا یہ وہ لفظ آ گیا۔ یہ چاہتے کیا ہیں؟ رسول سے بھی کوئی معاوضہ نہیں مانگتے کچھ نہیں، لیکن ایک چیز Psychological ہوتی ہے صرف یہ Appreciation چاہتے ہیں کہ شاباش بیٹا بہت اچھا کیا۔ قرآن اس کو ضروری سمجھتا تھا۔ آج کی سائیکولوجی میں یہ چیز آ گئی ہے کہ جب بھی آپ Wages Determine کرنے لگو Labour کی تو جو بھی اس کے لیے فارمولا تم اختیار کرو، وہ تو انکم کا ہوگا لیکن اس انکم میں Psychological Income بھی شامل کرو۔ اس کا نام ہے Psychological Income اور یہ ہے کسی کی تحسین و آفرین اور Appreciation اس کی جو کی جائے۔ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تم زیادہ Production چاہتے ہو، بہترین کام کوئی چاہتے ہو اس کے لیے یہ چیز بھی ضروری ہے کہ اچھا کام کرنے والے کی تحسین و آفرین بھی کرو۔ رسول سے کہا گیا کہ جب یہ تمہارے پاس عطیے لے کے آئیں۔

مخلصانہ عمل کے دلی طور پر اعتراف کے سلسلہ میں نیک تمناؤں کے اظہار کی اہمیت کا ذکر

بالکل خلوصِ قلب سے' معاوضہ نہیں چاہتے کسی سے' تم سے بھی معاوضہ نہیں چاہتے۔لیکن وصول کیا کرو اور اس کے بعد (صَلِّ عَلَیۡھِمۡ) (9:103) ساتھ یہ کہا کرو شاباش' بہت اچھا کیا تم نے۔کیوں کیا کرو؟ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمۡ (9:103) تیری شاباش سے ان کو سکون حاصل ہوتا ہے اور وہ سکون حقیقت میں جب انسان واپس آتا ہے تو پہلے سے زیادہ محنت سے کام کرنے پہ راضی ہوتا ہے۔اور پھر جو خود یہ صلوٰت یا تحسین کرتا ہے اس کے دل کی کشادگی بھی تو آپ کو معلوم ہے نا۔تنگ نظر کے پاس لے جایئے کوئی کام' کبھی جی نہیں چاہے گا کہ چھوٹے منہ سے ایک لفظ بھی تعریف کا وہ کہہ دے۔تو یہ جو شاباش دینے والا ہے اس کی کشادگی نگاہ' جس کو تم اس طرح سے شاباش دیتے ہو اور تحسین وآفرین کہتے ہو' اس کے اندر ایک نیا ولولہ بیدار ہوتا ہے۔مزید خوشامد کرتا ہے اور نہ وہ اس کا متمنی تھا' دونوں چیزیں جو کی جاتی ہیں یہ صرف خدا کے لیے کی جاتی ہیں۔کہا یہ اس لیے ایسا کرتے ہیں اَلَآ اِنَّھَا قُرۡبَۃٌ لَّھُمۡ (9:99) ٹھیک ہے ان کے مدارج بلند ہونگے ہمارے نزدیک۔سَیُدۡخِلُھُمُ اللّٰہُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (9:99) ان کو خدا اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔رحمت کے معنی آپ نے سمجھ لیا ہوا ہے وہ سامانِ جو انسان کی ذات کی نشوونما کرتا ہے اس طرح جیسے رحم میں بچے کی نشوونما ہوتی ہے کہ جس میں کوئی مزدومعاوضے کا تصور نہیں ہوتا۔

عیسائیت کا خدائی تصور' اور رحم مادمیں جنین کی پرورش کے آئینے میں' رب کا مفہوم

شاید میں نے ذکر کیا تھا یا نہیں کہ میرے نزدیک جو تصور تھا نا عیسائیت میں خدا کو وہ سمجھے ہیں کہ ہم نے بہت بڑا رشتہ قائم کیا ہے اس سے۔فادر نہیں' یہ تو ان کی خود اپنی بنائی ہوئی تعلیم ہے۔خدا کی تعلیم ہوتی تو وہ فادر کا رشتہ نہیں قائم کرنے دیتا۔فادر کا بھی ایک رشتہ ہوتا ہے لیکن رشتہ حقیقت میں ماں کا ہوتا ہے۔اس رشتے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ باپ اگر بچے کی پرورش کرتا ہے اس پہ صرف کرتا ہے' تعلیم بھی دیتا ہے ٹھیک ہے اس کا فریضہ بھی ہے لیکن آپ کو معلوم ہے غیر شعوری طور پر کہتا ہے کہ یہ میرے لیے عصائے پیری ہوگا' میرے بڑھاپے میں میرا سہارا بنے گا۔اپنا سہارا بنانے کے لیے اس کو یہ سب کچھ بنا رہا ہوتا ہے۔ماں جنین کو جب اپنے رحم میں پرورش کر رہی ہوتی ہے وہ تو اپنا جسم بھی آدھا اس کے اندر انڈھیل کے رکھ دیتی ہے صاحب اور اس کا معاوضہ کچھ نہیں لیتی۔وہ اسے اس قابل بناتی ہے کہ لوتھڑے سے جیتا جاگتا بچہ بنتا ہے' وہ بن جائے کچھ۔پیدا ہونے کے بعد اپنے خون کو دودھ میں Convert کر کے اس کی پرورش کرتی چلی جاتی ہے۔اور پرورش اس طرح سے کرتی ہے کہ وہی بچہ جب ذرا سا گھٹنوں چلنے لگتا ہے تو چراغاں کرتی ہے گھر میں ''رڑن لگ پیا جی چانن میرا''۔یعنی اس میں اپنے پاؤں میں کھڑے ہونے کی کچھ صلاحیت پیدا ہو رہی ہے۔دیکھتے ہیں آپ۔اور اگر وہ چلنے لگ جائے تو

اس دن تو پوچھو ہی نہیں گھر میں کیا ہوتا ہے ''ترن لگ پیا جی''۔ پوچھیے اس ماں سے کہ جس کے سامنے ہو۔ اور جب پہلی بار وہ کہتا ہے مم یا اماں تو پھر تو وہ نچھاور ہو جاتی ہے ''بولن وی لگ پیا''۔ یعنی یہ کیا اپنی Perfection کی طرف پہنچ رہا ہے۔ وہ اس کی نشو ونما کیسے چلے جاتی ہے صرف یہ جذبہ کہ اس کی نشو ونما ہو جائے۔ اور اگر وہ بچہ سوکھے کی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو پھر اس ماں کو پوچھیے، خاص طور پہ گاؤں کی ماں کو اس دھوپ کے اندر دس میل کا سفر کرتی ہے، کچھ بھی ہو اس پیر کے پاس اس فقیر کے پاس ''ہر طراں دے جتن کرن ڈئی ہیگی اے'' کس کام کے لیے؟ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے۔

''رب'' کی وضاحت کے بعد ''غفور'' کی اہمیت اور عالمی سطح پر مقام نبوت کی حدود نا آشنا صفات

عزیزانِ من! مامتا یہ چیز ہے۔ تعلق اسے کہتے ہیں کہ دوسرے کو اس کے پاؤں پہ کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا جائے۔ حقیقی تعلق یہ ہونا چاہیے۔ خدا نے اپنا تعلق، رب کا تعلق کہا ہے نشو ونما دینے والا، ٹھیک ہے اس میں داخل ہو جاتا ہے، باپ بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے، ماں بھی ہو جاتی ہے۔ اس نے رحیم جو اپنے آپ کو کہا ہے جیسے رحم کے اندر پرورش ہوتی ہے، اس میں صرف ماں داخل ہوتی ہے عزیزانِ من! باپ نہیں داخل ہوتا۔ وہ تو والد تو ہوتا ہے تولید کے بعد اس کا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ پھر رحیم جو ہوتی ہے رحمت جو ہوتی ہے، اس کے بعد ماں کی ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خدا نے غفور کہا ہے Protection دیتا ہے باپ دیتا ہے، غفور کے ساتھ رحیم ساتھ کہا ہے کہ اکیلے باپ کی بات نہیں ہے اس کو اس انداز سے نشو ونما دینے والی ماں ہے حقیقت میں۔ اور رحمت تو بہت بڑی چیز ہے کہ ماں کے بعد پھر دوسرا رحیم کون ہوتا ہے دنیا کے اندر۔ جو اپنا اسے دیتا چلا جاتا ہے تاکہ یہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو جائے، یہ استاد ہوتا ہے۔ **وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ** (2:129) نبی کی یہ خصوصیت بتائی کہ یہ استاد ہے تمہارا، اپنا علم تمہارے اندر انڈھیلتا چلا جاتا ہے اور اس کے بعد فخر کرتا ہے۔ ہر استاد اپنے قابلِ فخر شاگرد کو دیکھ کے پھولا نہیں سماتا، بڑا عالم بن گیا ہے جناب بڑا اسکالر ہو گیا ہے۔ آپ نے دیکھا یہاں وہ پرائمری سکول کے ماسٹر بیچارے چلے آ رہے ہیں، کہاں آ رہے ہیں؟ ''کہ جی میں ملن چلیاں ہیگاں جی ملک صاحب نوں، او میرا شاگرد ہوندا ہیگا سی میں، اوہنوں پڑھایا ہیگا اے''۔ وہ کچھ مانگنے کے لیے نہیں آتا ان سے۔ صرف یہ خوشی محسوس کرتا ہے کہ میں نے اپنا علم جو اس کو دیا تھا اس کی بناء پہ آج یہ اس قابل ہو گیا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے عزیزانِ من! ماں کے بعد رشتہ استاد کا رشتہ ہے جو اپنا علم انڈھیل دیتا ہے دوسرے کے اندر۔ اُس نے اس میں سے کیا لینا ہے یعنی اس کے علم میں سے تو اسے کچھ بھی نہیں لینا ہے۔ لیکن اپنا علم دیے چلا جا رہا ہے تاکہ یہ اس سے بھی آگے چلا جائے کسی طرح سے۔

امت اور نبوت کے درمیان تعلیمی رشتہ اور عالمی سطح پر کتاب وحکمت پہ مبنی باہمی تعلقات کی نوعیت

تو یہ رشتہ ہے جو رسول کا رشتہ بتایا اور اس رشتے کی بناء پہ کہا وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (21:107) یہ ہے وہ رحمت۔ اور پھر یہ رحمت صاحب وہ ''سکیوں تیکر'' ہی نہیں ہے لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (21:107) جس کسی کو بھی ضرورت ہے اس رحمت کی پرورش کی اس کے لیے اس کی رحمت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس کی تعلیم وَ یُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ (2:129) اور پھر کتاب ہی نہیں دیتا وہ اس کے ساتھ حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور تعلیم کے اعتبار سے اس کے ساتھ رحمت کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے عزیزانِ من! اس لیے خدا اس معنی میں رحیم ہے کہ وہ سامانِ نشوونما بھی دیتا ہے اس کا رسول اس لیے رحمت ہے کہ وہ اپنی تعلیم سے انسان کی جہالت کو دور کرتا ہے۔ اُس کی رحیمیت بھی عالمینی ہے' اِس کی رحمت بھی عالمینی ہے اور اس کا قرآن بھی ذکر للعلمین ہے ساری دنیا کے لیے۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (9:99) حفاظت بھی دیتا ہے باپ کی طرح اور اس کے ساتھ نشوونما بھی دیتا ہے ماں کی طرح۔ وَ السّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُھٰجِرِیۡنَ وَ الۡاَنۡصَارِ (9:100) ان کا ذکر آ رہا ہے کہ جن کے نقشِ قدم سے ہمارے ایمان کی منزلیں روشن ہو رہی ہیں صحابۂ کبارؓ۔ دیکھئے گا خدا اور اس کے فرشتے کس طرح سے ان کا ذکر کرتے ہیں اور کس وجد و مسرت سے ان کے اوپر تحسین و تبریک کے ڈھونگرے برساتے ہیں۔ سورۃ التوبہ کی آیت 99 تک ہم آ گئے 100 ویں آیت سے آئندہ ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

سولھواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 100 تا 106)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صحابہ کرام کے متعلق قرآنی حقائق کو نظر انداز کرنے میں ہماری تاریخ کا کردار

عزیزانِ من! آج جون 1973ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 100 سے ہو رہا ہے۔ (9:100)

اطلاعاً عرض کر دوں کہ اخبار میں یہ خبر میں نے دیکھی ہے کہ لاؤڈ سپیکر کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ میں نے اس حکم کے اصلی الفاظ تو نہیں دیکھے لیکن خبر یہی ہے کہ اس پہ پابندی لگائی ہے اور استثنیٰ اس میں ہے مساجد میں اذان اور خطبات۔ اس کے علاوہ کہیں لاؤڈ سپیکر استعمال کرنا ہو تو اس کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اجازت لینا ہوگی۔ ممکن ہے اصلی احکام میں یہ ہو کہ Public Places میں لاؤڈ سپیکر پر پابندی ہے۔ اس صورت میں ہمارا درس تو یہ Private Premisis کے اندر ہوتا ہے‘ اس پہ پابندی نہیں ہوا کرتی۔ لیکن یہ کہا نہیں جا سکتا کہ اصل احکام کیا ہیں۔ اور اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ میں اس کے متعلق وضاحت لے لیتا کہ کیا اس قسم کی Gathering میں پابندی ہے یا یہ اس سے استثنیٰ ہے۔ تو بر بنائے احتیاط یہی مناسب سمجھا گیا ہے کہ آج ہم لاؤڈ سپیکر استعمال نہ

کریں، آئندہ ہم وضاحت اس کی لے لیں گے۔ تو اس کے لیے کچھ تعاون کی ضرورت ہوگی آپ احباب دور نہ بیٹھئے قریب قریب آ جائیے۔

سورۃ التوبہ مسلسل چلی آ رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں آپ کو یہ موضوع اتنا تو حفظ ہو گیا ہوگا کہ وہ جنگ کے دوران کی ہدایات ہیں اور اس کلائمکس پہ پہنچنے کے بعد وہ منافقین کا ذکر کرتا ہے۔ اور منافقین ان کو قرار دے رہا ہے جو عام مناسک اور رسوم اور عقائد وغیرہ میں تو آپ کے ساتھ ہوں۔ لیکن جہاں دین کے معاملے میں، خدا کی اقدار و اصول کو بلند کرنے کے سلسلہ میں کسی قربانی کی ضرورت پیش آئے، کوئی مشکل برداشت کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہاں پھر وہ معذرتیں پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس میں وہ شریک نہیں ہوتے۔ انہیں قرآن نے منافق قرار دیا تھا اور میں تفصیلاً عرض کرتا چلا آ رہا تھا کہ یہ جو معذرتیں ہیں، ان کی کئی نوعیتیں اور شکلیں ہیں۔

جہاد کے قرآنی مفہوم کے برعکس روایتی سوچ کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دینے کا نتیجہ

ایک سب سے زیادہ خطرناک شکل یہ ہے کہ آپ قرآن کے ان احکام کی تاویل ایسی کر لیں کہ مستقل معذرت بن جائے مثلاً اس نے جہاد کا حکم دیا ہے اور اس کی تاویل کر لی جائے کہ جہاد تو فقط تقریر و تحریر کے ذریعے ہے، آگے چل کر اسے جہادِ اکبر قرار دیدیں، یہ نفس کشی اور چلہ اور ریاضتیں۔ یوں قرآن نے جو کہا کہ لوگ اپنی جان دیدیتے ہیں وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ (2:154) یہ قتل کا لفظ قرآنِ کریم میں ہے قتال کا لفظ قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ لیکن بہرحال جب معذرت آ جائے تو پھر کون پوچھتا ہے کہ کیا الفاظ اس میں آئے ہوئے ہیں۔ تو یہ چیز کہ دین کے الفاظ، قرآن کے الفاظ تو اپنی جگہ پر رکھے جائیں لیکن ان کا مفہوم اس طرح سے بدلا جائے کہ وہ اپنی منشاء کے مطابق ہو جائے۔ اور پھر اس بدلے ہوئے مفہوم کو سند دیدی جائے کہ یہی مفہوم عینِ دین بن جائے۔ یہ نہ ہو کہ فلاں مفسر نے ایسا کہا ہے، فلاں مؤرخ کا ایسا خیال ہے بلکہ یہ ہو جائے کہ اس آیت کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے ایسے بیان فرمائی ہے۔ اور جب یہ چیز آ جائے تو اس کے بعد تو پھر ایسی پکی سند ہو گئی کہ قرآن تو بالکل پسِ پشت چلا گیا۔ اس کا مصرف خالی ثواب حاصل کرنا رہ گیا۔

وضعی روایات کے بعد کشف و الہام کی بنیاد پر پیش کردہ تصورات کی نوعیت

چنانچہ اس پہ عمل کیا جانے لگا، وہی قرآن نے جو کہا ہے کہ انہوں نے اس قسم کی تاویلات کے مفہوم میں تغیرات کئے۔ اور پھر انہیں منسوب کر دیا گیا کہیں تو نبی اکرم ﷺ کی طرف اور کہیں بزرگانِ کرام کی طرف اور ان کا مرتبہ اتنا بلند کیا کہ وہ خدا سے براہِ راست ساری چیزیں پاتے تھے اور اس طرح سے ان کے کشف اور الہام کی بناء پہ ان الفاظ کے مفاہیم آتے تھے۔ تو بات وہی ہو گئی۔ یہ مفہوم بھی ان کا اپنا نہ رہا بلکہ خدا کے ہاں سے لیا ہوا مفہوم ہو گیا۔ تو اب قرآن کے الفاظ اور خدا ہی نے ان کا مفہوم بیان کیا، کہیں روایات میں، کہیں ان

کے کشف والہام میں۔ یہی چیزیں آپ کی تفاسیر کے اندر آ گئیں اور اُن کی منزلیں اسی کے مطابق طے ہونی شروع ہو گئیں۔ سند مستقل حاصل ہو گئی ایسی مستقل کہ اس کے مقابلے میں جب آپ قرآن کی کوئی آیت پیش کریں تو اتنی سی چیز آپ کو کافر قرار دیدینے کے لیے کافی ہو جائے۔

کیا قرآن حکیم کو کافی کہنے والا کافر ہے

آپ کو معلوم ہے کہ فتویٰ کے اندر یہ چیز کہی گئی کہ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ کہنے والا۔ یعنی یہ کہنے والا کہ خدا کی کتاب کافی ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ میرے نہیں تھے۔ ان سے پوچھئے کہ جن کا نام یہ خود درود وسلام سے لیتے ہیں یہ تو حضرتِ عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کہے تھے۔ لیکن آج وہی الفاظ قرآن کی یہ آیتیں ان سے پوچھو کہ کیا قرآن تمہارے لیے کافی نہیں ہے۔ آج قرآن کو کافی کہنے والا کفر اور ارتداد کا مرتکب ہو گیا۔ اور اس کے مقابلے میں قرآن کے یہ مفاہیم جو ان معذرتوں کا دوسرا نام ہے' وہ عینِ دین بن گیا' وہ عینِ قرآن بن گیا۔

مختلف تاویلوں اور تفسیروں کے ذریعے قرآنی حقائق کو ہی بدل دیا گیا جو ایک سنگین جرم تھا اور ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کہاں تک معاملہ پہنچا ہوا ہے۔ کتنی بڑی گہری سازش ہے جو دین کے ساتھ ہوئی ہے۔ وہ جو منافق آ کے کہتے تھے' وقتی چیز تھی۔ قرآن ان کا ایک ایک قول معذرت' عذر لے کے ان کی نقاب کشائی کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اس سے بھی زیادہ گہری شدید اور سنگین تر چیزیں یہ لوگ قرآن کے احکام کی تاویلوں میں اور تفسیروں میں بیان کرتے ہیں۔ کہہ دیتے ہیں کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے' یہ وحی خفی کی رو سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' یہ کشف والہام کی بناء یہ حضرتِ ابنِ عربی نے ارشاد فرمایا کہ یہ تو خدا کا دیا ہوا ہے۔ خدا نے اپنی کتاب کا مفہوم آپ بیان کیا ہے' تم کون ہوتے ہو اس سے الگ مفہوم دینے والے۔ خدا کی کتاب بالکل معطل ہو کے رہ گئی عزیزانِ من! ۔ یہ ہے آپ کے ساتھ جو ہوا ہے۔ قرآن حکیم کے تمام احکام جو اس کو مذہب سے الگ کر کے ایک نظام' جماعت' دین مملکت' قانون' اصول کی شکل میں پیش کرتے تھے' ان تمام کی تاویلات اس طرح سے کی گئی کہ یہ پھر سے وہی رسم و رواج اور انہی مناسک اور نظری عقائد کا مجموعہ بنا کے رکھ دیا گیا۔ اور کوئی شخص ان کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔ یہاں پہنچا دیا گیا آپ کو۔

قرآن حکیم نے زندگی کے حقائق کو تقابلی انداز میں بیان کرنے اور سمجھانے کا بڑا موثر انداز اختیار کیا ہے

میں کہہ رہا تھا کہ قرآن کی یہ صورت ہے۔ قرآن کا انداز بڑا حسین ہے اور وہ وہی ہے جسے غالب نے بھی کہا ہے کہ

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا ہو نہیں سکتی

یعنی بیک گراؤنڈ Dark اگر ہو اس کے سامنے ایک سفید چیز رکھی ہو تو آپ دیکھتے ہیں وہ کتنی ابھرتی ہے۔ اسی کو آج فلسفۂ اضداد کے نام سے پکارا جاتا ہے حالانکہ وہ کچھ اور بات ہے جو ہیگل اور مارکس نے کہی تھی۔ لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ تقابل میں جو ضد کی ہو اس کے مقابل میں لایا جائے تو اس کا اثر بہت نمایاں طور پہ سامنے آتا ہے۔ یہ تحریر میں' انشاء پردازی میں یہ ایک خاص انداز ہوتا ہے اور اسے بڑا Appreciate کیا جاتا ہے۔ ہم لکھنے والے لوگ جانتے ہیں اس چیز کو کہ یہ کیا چیز پیدا کرتی ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے۔

قرآنِ حکیم میں منافقین کا مقام اور صحابہ کرام کے مدارج کے تعین کا ذکر

پچھلی آیتوں میں منافقت کے متعلق اور منافقین کے متعلق کلائمکس پہ لے آیا تھا قرآن جہاں یہ کہہ دیا کہ ان کی قبر پہ کھڑے نہ ہونا ان کے لیے دعا تک نہ پڑھنا۔ نظر آتا تھا جیسے مدینہ میں اس زمانے میں یہی گروہ تھے' یہی لوگ تھے جو یہ کچھ کرتے تھے۔ اس کلائمکس پہ پہنچانے کے بعد کہا کہ ایک طرف تو ان کی یہ کیفیت ہے اور دوسری طرف تمہیں معلوم ہے کہ کون لوگ ہیں۔ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (9:100) اس بیک گراؤنڈ کے اندر آپ دیکھئے وہاں بھی کلائمکس پہ پہنچایا تھا قرآن نے انہیں۔ مہاجرین اور انصار میں سے بھی السابقون الاولون کو پہلے لایا ہے اور اس کے بعد اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ (9:100) صحابہؓ میں سے یہ لوگ۔ اب اس سے بڑا مقام مشکلات کا' اور دشواریوں کا' صعوبات کا قربانیوں کا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

دین سے ہٹ کر مذہب کے اندر وطن کی کوئی تفریق نہیں ہوتی

پہلے تو ہجرت کو آپ لے لیجیے۔ اچھے بھلے اپنے گھر بار میں رہ رہے ہیں' اچھے خوشحال لوگ ہیں' معزز لوگ ہیں' معاشرے میں بڑا مقام ہے ان لوگوں کا' بال بچے ہیں رشتہ دار ہیں۔ اختلاف تو اتنا ہی ہے نا (قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ) (41:30) یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اب انہیں وہاں بھی نہ رہنے دیا جائے۔ مذہب کے اندر تو کوئی بھی ایسا نہیں کرتا کہ گھر بار سے بھی کسی کو نکال دیا جائے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ خود مکے کے اندر بھی تو وہ لوگ بستے تھے جو قریش سے مذہب میں مختلف تھے۔ ایران کے مجوسی بھی وہاں موجود تھے' عیسائی بھی وہاں موجود تھے' حنیف بھی وہاں موجود تھے وہ جو اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کی ملت سے کہتے تھے' توحید پرست تھے' بتوں کے خلاف تھے۔ انہوں نے ان کو ان کے گھر بار سے نہیں نکالا' کسی مذہب پرست کو بھی کوئی گھر بار سے نہیں نکالتا۔ اس سے ہوتا کیا ہے؟ آپ اپنے ہاں بیٹھے ہوئے جس طرح سے جی چاہے' بغیر بت کے سجدہ کر لیجیے' بت کے سامنے سجدہ کر لیجیے' پڑوس والے کو اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔ لیکن یہ ایک جماعت' یہ انقلابیوں کی جماعت ان کے ساتھ یہاں تک صورت آن پہنچی کہ وہاں رہنا محال کر دیا گیا تھا۔

مدینے کی طرف ہجرت کا مرحلہ' وہاں کی تمدنی زندگی کی استطاعت اور پھر مسجد کی تعمیر کا ذکر

اب وہاں سے نکل کے جائیں تو جائیں کہاں۔ اس کرۂ ارض کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا کہ جہاں اپنے اس دین کو ساتھ رکھتے ہوئے پناہ مل جائے' آماجگاہ مل جائے بلکہ اس کی نشو ونما کے امکانات کے مواقع مل جائیں۔ مدینے میں انہی جیسے چند لوگ ایسے تھے پہلے' جنہوں نے یہ کہا کہ ہمارے ہاں مخالفت اتنی شدید نہیں ہے جتنی شدید مخالفت مکے میں ہے۔ لہٰذا آپ لوگ ہمارے پاس چلے آیئے جیسے تیسے ہوگا گذارہ کر لیں گے۔ مکہ کے مقابلے میں ویسے بھی مدینے کی آبادی' یہ قوت میں بھی کم تھی' دولت وثروت میں بھی کم تھی۔ مکہ تو ایک بہت بڑا بین الاقوامی مرکز بن گیا ہوا تھا۔ اور پھر مدینے کے مسلمان کھیتی باڑی کرنے والے لوگ تھے' تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں تھی' کچھ بااثر بھی نہیں تھے۔ بااثر تو یہاں یہود تھے اور یہودی تو سخت مخالف تھے اس دین کے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے کہا کہ آپ آ جایئے۔ اس آ جانے میں آپ سوچئے گھر بار چھوڑنا پڑا' بیوی بچے چھوڑنے پڑے' عزیز واقارب چھوڑنے پڑے' جو بھی یہاں مال ودولت وجائیداد تھی وہ چھوڑنی پڑی۔ پھر قریش میں سے ہونے کے اعتبار سے جو تکریم واحترام تھا وہ سارا چھوڑنا پڑا۔ قریش کا بڑا مقام تھا' قریش کے بھی یہ قبیلے کہ جس میں عثمانؓ اور ابوبکرؓ اور عمرؓ موجود تھے ان کا تو بڑا مقام تھا' کعبے کے متولی تھے یہ۔ یہ سب چیزیں چھوڑنی پڑیں۔ جانا وہاں پڑا کہ جہاں رہنے کے لیے بھی ابھی مکان نہیں ہے۔ وسعت اور استطاعت کی کیفیت یہ کہ وہاں جا کے جو مسجد بنائی ہے تو چھ فٹ اونچی یا آٹھ فٹ اونچی زیادہ سے زیادہ' نیچے کنکریاں بچھائیں اوپر کھجور کے پتے ڈالے۔ اندازہ لگایئے ان حالات میں یہاں سے جانا ہے۔ جب یہ کہا گیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ یہاں سے نکلنا ہے۔ تو یہ جو نکلے ہیں یہ کہتے ہوئے' لبیک اللّٰھُمَّ لبیک' آئے ہم ساتھ تیری آواز کے اوپر سوچئے تو سہی کتنی بڑی قربانی ہے۔ مہاجرین' ان میں سے (9:100)۔

ہجرت کے ایک سال بعد جنگ بدر کا معرکہ اور اس کے خدوخال

یہاں آئے سال بھر ہی ہوا تھا' بے بسی وبے کسی کے عالم میں سر چھپانے کو جگہ بمشکل ملی۔ کہ قریش اپنی پوری قوت سے لشکرِ جرار کو لے کے مدینے پہ حملہ آور ہو گئے' اب یہاں بھی نہیں رہنے دیں گے۔ اور یہاں کُل کائنات تاریخ کے مطابق تین سو نفوس تھے جن کے پاس تلواریں پوری نہیں تھیں' گھوڑے تو شاید دو ہی تھے ان کے پاس۔ ان حالات میں اس میدانِ جنگ میں آنا پڑا۔ یہ وہ مجاہدین وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ (9:100) انصار یہ ہو گئے مدینے والے جنہوں نے مدینے میں ان کو اس طرح سے پناہ دی۔ آپ دیکھئے ادھر منافقین کی صورت یہ ہے کہ مملکت بن چکی ہوئی ہے وہاں۔ یہ بات معلوم ہے کہ ان کے ساتھ رہنے میں اتنے مفاد ہیں۔ ساتھ رہنا چاہتے ہیں' چھوڑنا بھی نہیں چاہتے۔ لیکن جہاں کہیں ایسی مشکل آتی ہے' مشکلات اس قسم کی تو نہیں تھیں کہ جو

انہیں اٹھانی پڑی تھیں۔ ذرا سا جب بھی قربانی کا وقت آتا ہے تو وہ معذرتیں پیش کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ اس رویئے کو Contrast کہتے ہیں اس کے مقابلے میں کہا کہ ایک طرف تو یہ لوگ ہیں، یہ بھی انسان ہیں۔

اہل مدینہ کی طرف سے مکہ کے مہاجرین کے ساتھ حسنِ سلوک کی ایک درخشندہ مثال اور اساسِ باہمی کے انمٹ نقوش کی زندہ جاوید داستان اور تاریخ کا ایک روشن باب

آؤ ہم دوسرے دکھائیں وہ بھی انسان تھے کہ جنہوں نے ان حالات میں سبقت کی پہل کی، سب کچھ چھوڑ کر آ گئے۔ اور جو مدینے والے تھے انصار، جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب ان کے سامنے ڈھیر کر دیا اور کہہ دیا کہ ہم سب ایک جماعت، ایک ملت، ایک اخوت بن گئے۔ جو کچھ ہے یہ ہے آؤ مل بانٹ کے کھا لیتے ہیں۔ یہ تھی جماعت جو پیدا کی تھی نبی اکرم ﷺ کی تربیت نے۔ وہ آنے والے یوں پلہ جھاڑ کے آ گئے جن کے پاس آئے ہیں، ان کی کیفیت یہ ہے کہ دو دو مکان نہیں کہ ایک مکان ہی دیدیں۔ کہا یہ ہے موجود اور اس سے پہلے ہم اتنے تھے آج ہم اتنے ہو گئے ہیں، چلئے مل بانٹ کے کھاتے ہیں جو کچھ بھی ہے۔ آنے والوں کی یہ کیفیت تھی کہ لکڑہارا تھا اس نے کہا کہ بھئی مجھے تو کچھ نہیں چاہیے مجھے تو ان سے ایک کلہاڑی لے دو، کلہاڑی بھی پاس نہیں ہے لکڑہارے کے۔ سوچئے ذرا حالات کیا تھے۔ یہ ان کے ایمان کا تصدق ہے کہ ہم آج مسلمان کہلانے کے قابل ہیں۔ یہ ان کا صدقہ ہے۔ اور یہ وجہ ہے کہ قرآن اس انداز میں ان کی بات کرتا ہے اور نظر آ جاتا ہے کہ واقعی خدا اور اس کے فرشتے پھول برسا رہے ہوں (وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ) (9:100)۔ کہا ایک طرف وہی منافقوں کی جماعت، سن 9 ہجری میں بھی ان کی یہ کیفیت ہے کہ جب اتنی بڑی مملکت بن گئی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں اس دور کی کیفیت، اسے کہتے ہیں عزیزانِ من! Contrast۔ کتنا بڑا Contrast ہے، وہ بھی کلائمکس پہ یہ بھی کلائمکس پہ پہنچی ہوئی بات ہے کہ ان کے مقابلے میں انہیں دیکھئے۔ پہل انہوں نے کی۔ پہل جنہوں نے کی وہیں تک قرآن نہیں رہا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ بعد ازاں آہستہ آہستہ وہاں سے آنے شروع ہو گئے۔ اور پھر یہ مردوں ہی کی بات نہیں ہے آپ کو معلوم ہے کہ وہ جو مؤمنات تھیں ان کی بھی یہ کیفیت تھی۔ عورت کے لیے یہ چھوڑنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ خاوندوں کو چھوڑا، بچوں کو چھوڑا اور کن حالات میں ان کے شکنجے سے یہ بچ کے نکلی ہونگی۔ کتنی بڑی ہمت طلب چیز ہوگی یہاں سے نکلنا۔ یہاں سے نکلتے وقت خود رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھی رات کے اندھیرے میں نکلے ہیں اور غار میں چھپے ہیں۔ وہ تو نکلنے والوں کا پیچھا ایسا کرتے تھے۔ ان حالات میں ان بے بس اور تنہا اور بے کس عورتوں کا وہاں سے نکل آنا۔ محبت اور مامتا کی یہ کیفیت کہ بچوں کو بھی چھوڑا اور شوہر کو بھی چھوڑا، ماں باپ کو بھی چھوڑا، بہن بھائیوں کو بھی چھوڑا، تنِ تنہا یہاں سے نکل کے وہاں چلی آ رہی ہیں۔ یہ بھی السٰبقون الاولون میں سے تھیں۔ وَاتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ (9:100) ان

کے بعد آنے والے بھی بہت بڑے حسن کارانہ انداز سے آئے۔

قرآن حکیم کے لفظ ''الفوز'' کا مفہوم اور مذہب میں نجات کے ماحصل کی نوعیت

کیا بات ہے قرآن کے کہنے کی!! دو ہی لفظوں میں ساری بات کہہ جاتا ہے۔ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (9:100) اس سے بڑا اور سرٹیفکیٹ کونسا ہوسکتا ہے۔ وَ اَعَدَّ لَهُمْ (9:100) یہ اعد بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔ آنے والوں کے استقبال کے لیے جو پہلے سے تیاریاں کی جاتی ہیں نا' یہ وہ لفظ ہوتا ہے کہ ابھی آئے نہیں مہمان' ان کے آنے سے پہلے ہم نے ان کے لیے یہ کچھ تیار کر رکھا ہے کہ آیئے تو سہی' دیکھئے تو سہی ہم تمہارے استقبال کے لیے کیسے کھڑے ہیں۔ پہلے سے یہ کچھ تیار کر رکھا ہے ان کے لیے۔ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (9:100) نجات نہیں ہے کہ پھنسے ہوئے ہیں کسی عذاب میں اور وہاں سے چھٹکارا پاکے آگئے۔ نجات تو ہوتی ہے جب فوجی قید بھگتنے کے بعد نکل آتا ہے وہاں سے' کچھ Acheivement تو نہیں ہوتی کچھ حاصل تو نہیں کیا۔ مذاہب کے اندر منتہا یہ ہے نجات اور Salvation' پھنسا ہوا ہے عذاب کے اندر' وہاں سے چھٹکارا مل جائے کسی طرح سے۔ اور وہ چھٹکارا پانے کے لیے پھر کیا کیا نہیں کیا ان کے ہاں عقائد کہیں کفارے کا عقیدہ ہے کہیں شفاعت کا عقیدہ ہے اور معلوم نہیں کیا کچھ ہے۔ یہاں قرآن نجات کی بات ہی نہیں کرتا کہتا ہے نجات تو منفیانہ پہلو ہے Negative Aspect ہے۔ زندگی میں ہوا کیا۔ ہم نے بھیجا دنیا میں انسان کو تو کیا پھنسا دیا وہاں جاکے جیل خانے میں اتار دیا کہ پھنسے رہو' ہمارے اس نبی پہ ایمان لاؤ کفارے پہ ایمان لاؤ شفاعت پہ ایمان لاؤ روزے رکھو نمازیں پڑھو مصیبتیں اٹھاؤ۔ کاہے کے لیے؟ ہم نے جو تمہیں پھنسا رکھا ہے یہاں سے چھوٹنے کے لیے۔ می نہ سزد خدائے را۔ قرآن ہمیشہ یہ کہتا ہے الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (9:100) بہت بڑی Achievement ہے جو انہوں نے حاصل کی بہت کچھ حاصل کیا ہے انہوں نے۔ عذاب سے چھوٹنے والی بات نہیں ہے۔ ایک ہی آیت عزیزانِ من! درمیان میں قرآن لایا ہے اور اسکے بعد پھر وہی تذکرہ۔

صحابہ کرام کی تگ و تاز اس چیز کی ترجمان ہے کہ جنت کا حصول' خونِ جگر کا متقاضی ہوتا ہے

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ (9:101) غور فرمایا آپ نے درمیان میں یہ آیت لا کے ذہنوں کو کس طرف لے گیا' مسلسل ذہن پہ یہ چیز سوار تھی کہ اس دور میں ہوتے ہی ایسے تھے۔ یہ بتانے کے لیے کہ یہ Exceptions تھیں جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ حقیقت میں ان کا تو انداز ہی اور تھا' وہ تو یہ لوگ تھے۔ پھر ایک آیت بیان کردی اور سب کچھ کہہ دیا اس آیت کے اندر۔ مہاجرین کہہ دیا' انصار کہہ دیا' مکے کے مسلمان کہہ دیا' مدینے کے مسلمان کہہ دیا' ان کے بعد آنے والے وہ بھی شامل کردیے۔ سب سے بڑی سند بھی دیدی رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔ یہ کہہ دیا کہ ان کے آنے سے پہلے ہم نے ان کے لیے جنتیں تیار کر رکھی ہیں' کہہ دیا کہ بہت

بڑی Achievement ہے جو ان کو حاصل ہوگئی۔ ایک آیت میں عزیزانِ من! سب کچھ کہہ گیا کہنے والا۔ کہا یہ نہ ذہن میں رکھنا کہ وہ معاشرہ ہی کچھ اس قسم کا بن گیا ہوا تھا۔ وہ تو کچھ Exceptions تھے' جن کو ختم کر دیا گیا۔ یہ تھا وہ معاشرہ جن کے صدقے میں یہ دین ان بلندیوں تک اور استحکام تک پہنچا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی۔

قرآنی حقائق کے برعکس تاریخی طور پر صحابہ کرام کے سلسلہ میں ہمارے ہاں ہونے والی سازش کا ذکر

عزیزانِ من! جب بھی صحابہ کبارؓ کے متعلق قرآن میں کوئی ریفرنس آئی ہے' میں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ موضوع وہ ہے کہ جہاں بھی کوئی ریفرنس آئے گی' قرآن کی مدد سے آپ کو تفصیل سمجھنا پڑے گی کہ صحابہؓ کا مقام کیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں ہے' فرقہ بندی شرک ہے قرآن کی رو سے۔ لیکن بعض چیزیں جو سامنے آتی ہیں' اس کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ سازش یہی نہیں ہوئی ہمارے ساتھ کہ تاویلات کے ذریعے قرآن کے ان احکام واقدار کے مفہوم ایسے بدل کر دیئے کہ یہ دین مذہب کی سطح پہ آ گیا۔ یہ بھی سب سے بڑی چیز ہوئی کہ جن کے متعلق یہ سارا کچھ قرآن کہتا ہے' ان کے متعلق اتنی گھناؤنی تصویر ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے کہ اس دور میں منافقین ہی منافقین نظر آئے۔ یعنی سارا معاشرہ ہی منافقین کا ہوگیا' یہ چار پانچ بچے رہ گئے وہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد پانچ مسلمان رہ گئے تھے۔ وہ بھی Maximum تعداد ہے ورنہ تین ہیں' یہاں پانچ ہیں زیادہ سے زیادہ۔ تئیس سالہ تعلیم وتربیتِ نبوی ﷺ ان میں وَ السّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَ الۡاَنۡصَارِ وَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ بِاِحۡسَانٍ (9:100) یہ سارے ملا کے بھی پانچ رہ گئے تھے۔

صحابہ کرام کے متعلق بخاری کی ایک حدیث کے برعکس صحابہ جیسی عظیم ہستیوں کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

کہ یہ بات شیعہ حضرات تک ہی نہیں ہے کہ ان کا عقیدہ ہے۔ وہ سازش تو بڑی دور تک پہنچتی ہے۔ آپ کے ہاں سنیوں کی کتابوں کے اندر' بخاری کی حدیث کو دیکھئے کہ قیامت میں حساب کتاب ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ دیکھیں گے کہ گروہ کے گروہ جا رہے ہیں جہنم کی طرف۔ رسول اللہ ﷺ دیکھیں گے کہیں گے کہاں لیے جا رہے ہو یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ صحابہؓ کو پہچان کے کہیں گے۔ خدا آواز دے گا کہ ہاں ہیں تو تمہارے صحابہؓ' تمہیں پتہ نہیں جب تک تم زندہ تھے اس وقت تک تمہارا ساتھ دے رہے تھے' تم نے آنکھیں بند کیں یہ سارے کے سارے (معاذ اللہ معاذ اللہ) سب مرتد ہوگئے تھے اس لیے جہنم میں لیے جا رہے ہیں ان کو۔ بخاری کی حدیث ہے۔ کہاں جائیں گے آپ۔ اور پھر جو آگے قصہ چلے گا تو ایک حدیث ہی نہیں' ابھی تو تاریخ آئے گی آپ کی۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ اس پہ آئیں ذرا دیکھئے تو سہی قرآن کہتا کیا ہے ان کے متعلق۔ نبی اکرم ﷺ سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔ وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ

مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ (18:28) کہا کہ اے رسول استقامت سے رہو۔ کیسے استقامت سے رہیں، مخالفتیں تو بڑا ہجوم کر کے آ گئے ہیں۔ کہا یہ لوگ جو تمہارے ساتھ ہیں۔ واہ واہ واہ۔ یہ تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا خصوصیت ہے ان کی؟ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ (18:28) یہ دن رات صبح شام اپنے خدا کو دعوت دیتے رہتے ہیں، پکارتے رہتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے۔ اور اس کے بعد یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ (18:28) ایک لفظ میں بات کہہ گیا۔ کوئی اپنا ذاتی مفاد نہیں ہے، اپنا کوئی ذاتی مقصد پوشیدہ نہیں ہے، صرف اس کے مقصد کی خاطر یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اس قدر مخلص احباب کی جماعت۔ اور حضور ﷺ سے یہ کہا گیا ہے یہ چیز کہ استقامت اختیار کرو ان کے ساتھ رہتے ہوئے۔ بڑی متاعِ عظیم ہے۔ اور ان کے لیے یہ سرٹیفکیٹ خدا کی یہ سند کہ مجھے یہ پکارتے رہتے ہیں دن رات، ان کی کیفیت یہ ہے۔ اور پھر دل کی گہرائیوں سے پکارنے والے کبھی منافق بھی ہو سکتے تھے؟ جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد پھر جانے والے ہوں۔ کہا یہ وہ لوگ ہیں کہ کوئی اور مقصد نہیں ہے ان کا سوائے اس کے کہ خدا کی رضا جوئی کے حصول کے لیے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اس لیے اے رسول ان کو ساتھ رکھو اور استقامت سے رہو۔ وَ لَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (18:28) یاد رکھو مقابلے میں جو قریش کے بڑے بڑے اکابر ہیں، نظر آتا ہے کہ ان کے پاس بہت کچھ ہے، مال و دولت اور ثروت اور عزت اور جتھہ۔ کہا کبھی اس کو خیال میں نہ لے آنا کہ ان کے مقابلے میں، یہ کچھ غریبوں کی سی جماعت ہے۔ بالکل نہیں۔ یہ خیال کر کے کہیں نگاہوں سے نہ گرا دینا ان کو۔ یہ بڑی متاعِ عظیم ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں ان کے ساتھ استقامت سے اپنے پروگرام کے اوپر جمے رہو۔ آپ نے دیکھا کہ ان کا وزن اور ان کی قیمت کتنی بتائی جا رہی ہے۔ اور یہ خدا کا سرٹیفکیٹ ہے۔ اور آگے چلئے۔

صحابہ کرام کا باہمی روابط تو تالیفِ قلب کی کیفیت سے آراستہ تھے

ہُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ (8:62) کتنی بڑی چیز ہے۔ اے رسول خدا نے تمہیں تقویت پہنچائی ہے اپنی طرف سے بھی اس نے نصرت دی ہے، تقویت کا موجب یہ جماعتِ مؤمنین ہے۔ رسول کی تقویت کا موجب اور ایک مقام پہ کھڑا کیا ہے نصرتِ خداوندی اور یہ جماعت۔ دیکھ رہے ہیں یہ مقام کتنا بڑا ہے۔ پھر ان کی خصوصیت یہ بتائی کہ وَ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ (8:63) ان کی کیفیت یہ ہے کہ یونہی یہ ووٹ لے کے ایک پارٹی نہیں بن گئے ہوئے، ان کے دلوں کے اندر ایک دوسرے کی الفت یوں جاں گزین ہے کہ ''من تو شدم تو من شدی'' کی کیفیت ہو چکی ہوئی ہے۔ جماعت بھی افراد کے مجموعے کا نام نہیں ہے صرف، سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے یہ تمہارے ساتھ جو کھڑی ہے۔ یہ تالیف کا لفظ عربی زبان والے بولتے تھے کہ جب بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے کے اندر آ کے مل جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا وہ تو ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ کہا ان کی کیفیت یہ ہے ان کے قلوب ایک

دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، مدغم ہوئے ہوئے ہیں۔ یہ پیکر تو الگ الگ تمہیں نظر آتے ہیں ان کے آپس کی یہ کیفیت ہے۔ مقام اتنا بڑا کہ خدا کی نصرت اور اس جماعت کی تائید ایک مقام کے اوپر دونوں کو بیان کیا گیا ہے۔

مومنین کے مابین ذہنی رفاقت کی قدر و قیمت

اور یہ جو چیز ہے اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیۡنَهُمۡ (8:63) ساری دنیا کی دولت صرف کر دی جاتی تو بھی ان کے قلوب کی یہ کیفیت نہ ہوسکتی کبھی۔ خدا نے یہ چیز کی ہے۔ اب خدا کی پیدا کردہ قلوب کی الفت کی سند یہاں موجود ہے۔ میں زور اس لیے دے رہا ہوں کہ ابھی آگے تاریخ آپ کے ہاں آنی ہے۔ یہ خدا کا سرٹیفکیٹ ہے اس پوری جماعتِ مؤمنین کے متعلق جس میں کوئی Exception نہیں، کوئی استثنیٰ نہیں۔ اِنَّهٗ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ (8:63)

قرآن کریم کے نزدیک جماعت مومنین اور نبی اکرم ﷺ کے مابین ذہنی رفاقت کی قدر و منزلت کی کیفیت

اور اس کہنے کے بعد جیسے کہتے ہیں نا ''ہجے جی نئیں بھریا ہجے راضی نئیں ہویا'' اتنا ہی کافی تھا جو کہا گیا' نہیں!! یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسۡبُکَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (8:64) اے نبی تیرے لیے دو چیزیں کافی ہیں اللہ اور یہ جماعتِ مؤمنین۔ ایک سانس میں ایک آیت میں ایک مقام پہ رکھا ہوا ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ من! کیا مقام ہے۔ یہ ہیں جن کے دل جڑے ہوئے ہیں۔ اور سورۃ فتح کی وہ آیت تو میں کہتا ہوں سدرۃ المنتہیٰ کی شاخوں کی طرح جھوم رہی ہے اس فضا میں کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ وَ الَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ تَرٰىهُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا (48:29) اللہ اکبر اللہ اکبر۔ محمد اللہ کے رسول اور ان کے ساتھ ان کی جماعت کی کیفیت یہ ہے کہ مخالف سامنے آتے ہیں تو چٹان کی طرح سخت ہو جاتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ ریشم کی طرح نرم ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ہے نا تالیفِ قلوب۔ کہ کیفیت یہ ہے کہ دل کے اندر خلوص' خدائی پروگرام کے حصول کے لیے ایک جذبہ کے آثار ان کے چہروں پر نمودار ہو رہے ہیں، بالکل نور برس رہا ہے چہروں کے اوپر۔

تورات اور انجیل میں جماعتِ مومنین کی ذہنی آسودگی کا ذکرِ خیر اور سورۃ التوبۃ اور سورۃ فتح کا بیان

ذٰلِکَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ ۚۖۛ وَ مَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ (48:29) یہی نہیں ہے ہم نے تو ان کی مثال تورات اور انجیل میں بھی بیان کر دی تھی کہ آنے والا آئے گا تو اس کے ساتھیوں کی یہ کیفیت ہوگی۔ اور آگے یہ۔ کہا تمہیں معلوم ہے کہ انہیں دیکھ کے ہماری کیا کیفیت ہوتی ہے۔ کہا یہی ہوتی ہے کہ کسی باغبان کا باغ بھرپور بالکل پروان چڑھ گیا ہو اور اس کے پھلوں کے خوشے لٹک رہے ہوں انہیں دیکھ

کے جس طرح سے اس کا جی راضی ہوتا ہے اے رسول انہیں دیکھ کے ہم تو یوں خوش ہوتے ہیں۔ یہ ان کا مقام ہے۔ یہ جو آیت ہے سورۃ التوبہ کی یہ 9 ہجری کی بیان کی جاتی ہے' میں یہ کہہ رہا ہوں انہی کی تاریخ کی رو سے۔ یہ نہیں ہے کہ ابتدائی دور کی چیز تھی' درمیان میں تو صاحب پھر وہ سب ختم ہو گئے تھے۔ آخری دور کی چیز ہے۔ اور وہ سورۃ فتح جو ہے وہ تو فتح مکہ کی بات ہے جو کہی گئی ہے 7,8 ہجری کی بات ہے یہ۔ آخری دور کی آیتیں ہیں یہ۔ یہ ان کا مقام قرآن بتا رہا ہے عزیزانِ من! ۔ اسی سورۃ انفال میں آخری آیتیں دیکھئے۔

جیسا میں نے پہلے بھی کہا تھا اتنا بڑا سٹیفکیٹ کسی اور کے لیے نہیں آپ کو ملے گا خدا کی طرف سے' آخری دور میں رسول اللہ ﷺ کے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا (8:74) یہ لوگ کہ جنہوں نے ہجرت کی' جہاد کیے اللہ کی راہ میں اور دوسری طرف یہ کہ جنہوں نے ان بے کسوں کو ٹھکانہ دیا' پناہ دی مدد کی۔ مہاجر انصار مجاہد سارے اس میں آ گئے۔ آخری دور کی آیتیں ہیں یہ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (8:74) او یہ پکے اور سچے مومن ہیں۔ پکے اور سچے مومن' خدا کی گواہی۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (8:74) مغفرت کی ضمانت دی ہوئی ہے۔

قرآنی حقائق کے برعکس تاریخ کی سازش

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ (8:75) یہی نہیں کہا کہ چلو وہاں تک بات ہو گئی کہ صاحب یہ پہلے جو آئے وہ تو مومن تھے جو بعد میں سارے آئے تھے' وہ منافق تھے۔ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (8:75) بعد میں بھی جو آئے ہیں۔ یہاں جو کہا تھا نا اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ (9:100) یہ وہ بھی آ گئے۔ ان آیات کے نزول تک کا سرٹیفکیٹ تو آپ کے پاس موجود ہے۔ کیا پانچ ہی تھے وہ یا تین ہی تھے؟ ان بعد کے متعلق قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پہ اور تصریح کر دی ہے کہ ان میں بھی مدارج کا فرق تو ضرور ہوتا ہے جو سب سے لبیک کہنے والا اتنی بڑی مشکلات میں جان دینے والا ہے۔ ٹھیک ہے بعد میں آنے والا جو ہے مدارج کا صرف فرق ہوتا ہے۔ یہ ایسے نہیں ہے کہ جو پہلے ہیں ان چار کے متعلق تو جنت کے وعدے اور سارا کچھ اور باقی سارے جہنم میں (معاذ اللہ) جانے والے۔ یہ بات نہیں ہے۔ سنیئے قرآن اس کی شہادت دے رہا ہے۔ قرآن تو ان تمام سازشوں کے راستے بند کرتا تھا۔

انسانی معاشرے میں مدارج کا فرق تو ہو گا لیکن آسودہ زندگی کا وعدہ تو تمام کے لیے ہے

کہا یہ ٹھیک ہے۔ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ (57:10) فتح مکہ سے پہلے جب حالات بڑے ہی ناخوشگوار تھے بلکہ بڑے ہی یاس انگیز تھے' صبر آزما تھے' ہمت شکن تھے۔ اُس زمانے میں جنہوں نے خدا کی راہ میں مال بھی دیا جانیں بھی دیں اس میں شبہ نہیں کہ وہ اور بعد والے اس اعتبار سے تو برابر نہیں ہو سکتے۔ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ

وَقٰتَلُوْا (57:10) یہ ٹھیک بات ہے کہ اس میں فرق آجاتا ہے مدارج کا۔ لیکن یہ ہیں عزیزانِ من! الفاظ وَ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی (57:10) اللہ نے جو وعدے کیے ہوئے ہیں وہ وعدے سب کے ساتھ برابر ہیں۔ تو اس کے نزدیک تو کیفیت یہ ہے ان کی۔ یہ ہیں وہ لوگ عزیزانِ من! جن کو صحابہ کبارؓ کہا جاتا ہے' یہ ہیں جن کے خدا نے کہا ہے کہ ہر ایک ساتھ ہمارے وعدے ہوتے ہیں۔ مومن حقا کا سرٹیفکیٹ دیا ہوا ہے۔ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ وَ اَعَدَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ (9:101) یہ سارا کچھ قرآنِ کریم کے اندر ہے۔

ذہنی اور قلبی ہم آہنگی کا ماحصل ہمیشہ آسودہ حالی کی شکل میں نکلتا ہے

اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ (8:60) والی بات آ گئی ہے دلوں کے اندر محبت ڈالی ہوئی ہے ایک دوسرے کے۔ ایک جگہ پہ وہ بنعمتہ اخوانا (3:103) کہا ہے صرف' کہ خدا نے اپنے خاص انعام سے ان کو بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ وہاں اخوت کا درجہ تھا۔ وہ جیسا میں نے کہا ہے ناکہ ''ایہدا جی نئیں بھردا ہورا گاں چلدا اے'' اخوت تک نہیں رکھا اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ (8:63) یہ اخوت سے بھی آگے درجہ ہوتا ہے۔ یہ کیفیت ان کی بیان کی۔ اُدھر یہ کہا کہ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ (4:93) اور اس کے بعد لَّعَنَہُ اللّٰہُ وَغَضِبَ عَلَیْہِ (5:60) جس نے ایک مومن کو بھی عمداً قتل کر دیا' جہنم میں جائے گا سیدھا' لعنت ہے خدا کی اس پر غضب ہے خدا کا اس کے اوپر۔ ایک مومن کو جان بوجھ کر عمداً قتل کرنے والا۔ یہ جماعتِ مؤمنین پوری ہے جس کے دلوں کے اندر خدا نے ایک دوسرے کی الفت ڈال دی ہے' اخوت کے رشتے میں پرو دیا ہے خدا کی نعمت نے' رحماء بینھم (48:29) کی شہادت دیدی ہے خدا نے آخری دنوں کے اندر بھی۔

صحابہ کے متعلق اصل حقائق کے برعکس تاریخ کے خودساختہ چند بدنما داغوں کی کیفیت

تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے اس تاریخ کے اندر یہ پورے صحابہؓ کو اکٹھے کر لیتے ہیں' کوئی نہ بچ پائے نا۔ آدھے ایک طرف آدھے دوسرے طرف۔ اور پہلی جنگِ جمل' دس ہزار ایک دن میں قتل۔ اور اگلی جنگ میں تاریخ کی رو سے ستر ہزار ایک دن میں قتل۔ یعنی یہ مکے اور مدینے کے اردگرد میں ہونگے اور کتنے اس سے زیادہ۔ حجۃ الوداع میں جب کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ کے قریب تھا جو مجمع جمع ہوا ہے۔ تو یہ جو ستر ہزار قتل ہو گئے ہیں وہ قتل تو چھوڑ دیجئے' وہ ایک دوسرے کو مارنے کی فکر میں قتل ہوئے ہیں۔ یہ جو باقی بچ گئے ہیں وہ ہیں جو خود نہیں مرے' مارنے میں تو انہوں نے کوئی فرق نہیں کیا ہوگا۔ یہ صفین کی جنگ ہے' وہ جمل کی جنگ' ہے سارے صحابہؓ اکٹھے کر لیے ہیں میدانوں میں کھڑے کر دیے ہیں' کھڑے کر کے یہ نقشہ دکھا رہے ہیں۔ جن کا سرٹیفکیٹ خدا دے رہا ہے۔ آپ اندازہ لگایئے کہ ہمارے

ساتھ ہوا کیا ہے تاریخ میں۔

ہم نے قرآنی حقائق کی بجائے تاریخ کو مقدس تصور کر رکھا ہے

کیفیت یہ کر دی گئی ہے ہماری تاریخ کے تقدس کی کہ شاید آپ کو یاد ہو گا اس سے پہلے بھی یہ کسی ایک خطبے میں آیا تھا تو ایک صاحب سامعین میں سے چلا اٹھے تھے کہ پھر ساری تاریخ ہی ہماری غلط ہے۔ میں نے کہا بھائی آپ سچا سمجھتے ہیں تو سمجھئے ان سب کو' یہ تو قرآن کہہ رہا ہے میں تو نہیں کہہ رہا میں تو ان کے لیے کہہ رہا ہوں جو قرآن نے شہادت دی ہوئی ہے۔ اور وہ اٹھ کے چلے گئے تھے درس سے کہ لو یہ ان صحابہؓ کو جہنم میں بھیج ہی نہیں رہا' اس کا قرآن سننے کے لیے آ جائیں۔ کیا غلطی کی تھی؟ کہ طبری نے جو کچھ لکھ دیا ہے یہ اس کے خلاف کیوں کہہ رہا ہے خواہ قرآن کی آیتیں بھی کیوں نہ پیش کرے۔ مرتد یقیناً یہ ہو گئے تھے' ہم نے کہا کہ کیسے ایک دوسرے کے خلاف تھے' کہنے لگے سب مرتد ہو گئے تھے اسلام کو چھوڑ کر۔ او بابا کیسے تم کہہ رہے ہو' وہ تو جس نے یہ کہا ہے مومن حقا ہیں' جس نے کہا ہے کہ ان کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے' وہ مرنے کے بعد تک کا جاننے والا تھا یا نہیں' یا اس نے پہلے لاکھوں کے لیے جنت تیار کیا ان میں سے تین چار باقی رہ گئے'' تے باقی او ہنے ٹھیکے تے دے دتی ہونی اے فیر کہ او یار او تے آئے نئیں ہیگے جناں واسطے تیار کتی سی او پھیر سارے مرتد ای ہو گئے'' (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ یعنی جن کے لیے وہ کہتا ہے وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ (9:100) جن کے لیے تیار کیا' تیار کرنے والے کو اتنا بھی علم نہیں ہے کہ میں جو ان لاکھوں کے لیے یہاں مکان بنوا رہا ہوں' کالونی بنوا رہا ہوں' جنت تیار کر رہا ہوں آنا تو ان میں سے پانچ چار نے ہے باقی کا کیا کرونگا۔ تیار کرنے والا خدا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہاں کہاں جا کے یہ نشتر کی زد پڑتی ہے۔

دوسو سال بعد بخاری کی ایک حدیث کہ جنگ جمل میں 10 ہزار صحابہ باہمی طور پر قتل ہو گئے

امام بخاری نے ایک صحیفہ مرتب کر دیا اس کے اندر ایک حدیث لکھی ہوئی۔ طبرستان سے ایک صاحب اٹھتے ہیں جنہوں نے آپ کی تاریخ مرتب کر ڈالی۔ تاریخ میں یہ لکھا ہوا ہے۔ تین سو سال بعد' زبانی روایات کی بناء پہ' کوئی Written Material نہیں ہے۔ لکھا کیا جاتا ہے؟ کہ سارے ہی صحابہؓ اکٹھے ہو گئے تھے ایک دوسرے کے سامنے جنگ کے میدان میں' عمداً ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے۔ دس ہزار جنگِ جمل میں کر دیے تھے' ستر ہزار وہاں کر دیے تھے۔ قرآن کی آیت موجود ہے کہ جو شخص کسی ایک مومن کو عمداً قتل کرتا ہے جہنم میں جاتا ہے' لعنت ہے خدا کی' غضب ہے اللہ کا (4:92)۔ ایک مومن کو۔ یہاں ہول سیل ریٹ پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ اور تقدس اتنا ہے ان کا' امام طبری امام بخاریؒ۔ میں کسی کی تنقیص و تحقیر نہیں کر رہا میں اس چیز کو کہہ رہا ہوں جو ان کے اندر ہے اس وقت۔ پتہ نہیں اُنہوں نے بھی یہ لکھا تھا یا نہیں لکھا تھا۔ لیکن جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے اُسے آج قرآن سے زیادہ معتبر سمجھا جا رہا ہے۔ کسی سے جواب نہیں

بن پڑتا۔ شیعہ حضرات کی تو بات ہی اور ہے' اُنہوں نے عقیدتاً یہ چیز کہہ دی ہوئی ہے' وہ ٹھیک ہے کھلے کھلے کہتے ہیں۔ ان سنیوں سے پوچھئے کہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم بھی ان کے ناموں کے ساتھ' یہ جتنے بھی وہاں جنگوں میں شریک تھے' ہر ایک ساتھ یہ کہتے ہیں نا اور ایک دوسرے کے قاتل بھی۔

تقلید پرستی حقائق کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ کا باعث بنتی ہے

ہزار سال میں جب بھی یہ پوچھا گیا کہ بابا ان کے متعلق کیا کہتے ہو' یہ دو چیزیں اتنی متضاد ہیں۔ آپ کو پتہ ہے عقیدہ کیا ہے؟ عقیدہ یہ ہے کہ اس مقام پہ ہمیں خاموش آگے بڑھ جانا چاہیے۔ چل بھئی!!۔ خاموش تو ہو سکتے ہیں آپ' زبان سے تو خاموش ہو سکتے ہیں' دل بھی آپ کا خاموش ہو سکتا ہے اس کے بعد؟ وہ سوچنا چھوڑ دے گا اس کے بعد؟ ۔عزیزانِ من! یہ ہے خدا کی شہادت۔ مجھے نہ کسی طبری سے بیر ہے نہ بخاری سے مخالفت ہے' جو میں ان کے مجموعوں کے متعلق کچھ کہتا ہوں۔ ایمان ہم خدا کی کتاب پہ لانے کے لیے مکلّف ہیں' کسی طبری اور بخاری کے اوپر ایمان لانے کے مکلّف نہیں ہیں۔ یہ ہے جس کے ایک ایک لفظ کی صداقت پہ ہمارا ایمان ہے۔

قرآن حکیم کے برعکس روایت کے متعلق مولانا اسلمؒ جیراجپوری کا فرمان

کوئی چیز جو قرآن کی شہادت کے خلاف جائے گی۔ استادِ محترمؒ مولانا اسلم جیراجپوری کے الفاظ میں بتاتا ہوں ایسے ہی مقام کے اوپر اُنہوں نے کہا تھا۔ حدیث وہ لائے جو اس طرح سے خلاف جاتی تھی اور کہا' یہ بہت بڑے اہلحدیث تھے کسی زمانے میں امام تھے' کہ دیکھئے نا راوی کتنے بڑے ہیں' اُنہوں نے کہا کہ مولوی صاحب آپ تو ان راویوں کا صرف نام دیتے ہیں' اگر آپ یہ کہہ دیں کہ آپ کی روایت کی کتاب میں لکھا ہو کہ جبریل بھی راوی ہے تو میں قرآن کے مقابلے میں اُسے بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میرا ایمان خدا کی کتاب کے اوپر ہے۔ جبریل کا مقام یہ ہے کہ وہ یہ کتاب لایا تھا۔ اگر آپ کہتے ہو کہ جبریل اس کتاب کے خلاف کوئی روایت لایا تھا تو میں اس کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ جبریل پہ ایمان قرآن کی بناء پہ ہے' قرآن پہ ایمان جبریل کی وجہ سے نہیں۔

تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا بلکہ تم سے تو یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا

بات ساری یہ ہے پہلوں نے جو کیا میں نہیں کہہ سکتا کیوں کیا' کیسے کیا۔ آج ہماری صورت یہی ہے جو قرآن نے کہا تھا وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (6:91) یہ اللہ کی قدر ہی نہیں پہچان سکے۔ اللہ کی یہ قدر ہو رہی ہے نا۔ یہ اس کا کلام ہے' کتاب کیا ہے خدا اس وقت باتیں کر رہا ہے ہم سے' اس وقت خدا کہہ رہا ہے کہ یہ مومن حقا تھے۔ ہم نے ان کے لیے جنت تیار کیا تھا' ہم ان سے راضی ہیں یہ ہم

سے راضی تھے۔ اور ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں صاحب وہ طبری بات ٹھیک کہہ رہا ہے کہ یہ سب اکٹھے ہو کے ایک دوسرے کی گردنیں اڑا رہے تھے۔ آپ کہتے رہیے رحماء بینھم‘ آپ کہتے رہیے کہ ہم نے ان کے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی تھی۔ ٹھیک ہے آپ کہتے رہیے‘ آپ بھی سچے ہیں‘ بزرگ ہیں اب کیا کہیں صاحب‘ بات وہی ہے جو طبری کہہ گیا ہے‘ بخاری کہہ گیا ہے۔ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (6:91) حقیقت میں ہم نے خدا کی قدر ہی نہیں پہچانی مذاق ہی کر رہے ہیں ہم اس کے ساتھ عزیزانِ من! ۔ یہ ہے مثال۔

سب سے زیادہ فخر کی بات کسی مملکت کے وجود کو قائم کرنا نہیں بلکہ کسی کو انسان بنانا ہے

عزیزانِ من! نبی اکرم ﷺ کی کئی سالہ اس تمام جدوجہد کا ماحصل کیا ہے‘ مقصد نبوت کا کیا تھا؟ انسانیت سازی۔ انہوں نے یہ بات کی مملکت بنائی‘ نظام قائم کیا‘ سکندرِ اعظم نے تو شاید اس سے دس گنا بڑا کر دیا ہوگا‘ بڑے بڑے فاتح دنیا کے اندر گذرے ہیں۔ سوال یہ نہیں ہیں‘ یہ چیزیں تو بنائی جا سکتی ہیں۔ کسی ایک آدمی کو انسان بنا دینا‘ یہ ہے قابلِ فخر چیز۔ اور محمد ﷺ جیسی انسانیت سازی جو ہے اس کی نظیر تو دنیا پیش نہیں کر سکتی۔ جن کی کیفیت یہ تھی کہ ایک ایک اونٹنی کے اوپر سو سو سال تک جنگیں آپس میں جاری رہا کرتی تھیں‘ میدانِ جنگ میں تڑپ رہے ہیں‘ شدت ہے پیاس کی‘ خون نکل گیا ہے جسم اور خون نکلنے کے بعد تو پیاس کا پوچھو نہیں‘ کتنی شدت ہوتی ہے‘ تھوڑا سا پانی کا مشکیزہ لیے ہوئے ایک پانی پلانے والی پانی پلا رہی ہے ایک کے پاس آ کے پانی منہ میں ٹپکانے لگی ہے تو آواز دوسری طرف سے آتی ہے‘ وہ کہتا ہے کہ اس کی آواز میں زیادہ درد نظر آتا ہے‘ اُسے پہلے پلا کے آؤ۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ حضور ﷺ کی انسانیت سازی کا صدقہ تھا۔

حضرت عمرؓ کے دور میں اقدار خداوندی کی نوعیت

حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں جب قحط پڑا ہے‘ دیکھئے اس قحط کے اندر کیفیت ان کی کیا ہوتی ہے۔ بائیس لاکھ مربع میل کی سلطنت تھی اس کا دار السلطنت مدینہ تھا‘ یعنی ان کا اپنا زندگی کا معیار بھی کتنا اونچا ہو گیا ہوا تھا۔ قحط میں جب یہ باہر کے لوگ ہجوم کر کے ادھر آئے ہیں سارے قحط کے دوران میں مدینے کے کسی گھر کے اندر اپنا کھانا نہیں پکا۔ یہ جو قحط زدہ باہر آ کے جنہوں نے کیمپ لگا لیے تھے‘ سارے مدینہ کے یہ صحابہؓ اُن کے ساتھ بیٹھ کر اپنا کھانا کھاتے تھے جتنا حصے آتا تھا۔ اور کیفیت یہ تھی کہ عمرؓ نے ایک دن دیکھ لیا کہ ان کی پوتی خربوزہ کھا رہی ہے‘ بیٹے کو بلایا‘ کہا کھال ادھیڑ دونگا‘ کہنے لگے لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ ان کو کھانے کو نہیں ملتا اور عمرؓ کی پوتی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ فروٹ کھا رہی ہے۔ یہ کیفیت ہے تمہارے تفاوت کی۔ اُس نے کہا حضورؓ! عمرؓ کی پوتی نے فروٹ کہاں سے کھانا تھا‘ یہ صبح جو ناشتے میں بچوں کو گٹھلیوں کے ستو ملے تھے وہ ایک بد ولڑکا کہیں ککڑی لیے جا رہا تھا‘ یہ اس بچی نے اپنے حصے کے ستو اس کو دیے اور اس نے اس کے

بدلے میں، یہ اس بدو لڑکے سے لے لیا تھا۔ یہ ہے کیفیت ورنہ عمرؓ کے گھر میں بھی نہیں پک رہا۔ اسی عمرؓ نے یہ کہا تھا، جب ایک گلی سے گذر رہے تھے کہ بچی بڑی خوبصورت سی تھی لیکن بے حد ضعیف ہوگئی تھی زرد رو، پہچانی نہیں گئی، ادھر اُدھر نظر دوڑا کے پوچھا کہ یہ کون بچی ہے کس کی بچی ہے، بیٹے نے کہا کہ امیر المؤمنینؓ کی پوتی ہے۔ کہا خیال کیوں نہیں رکھتے، کہا امیر المؤمنین نہیں خیال رکھتے۔ کہنے لگے جو کچھ امت کے دوسرے بچوں کو ملتا ہے، یہی کچھ ان کو ملتا ہے۔ مدینے میں رہنے کی وجہ سے چونکہ اس چیز کے یہ عادی نہیں تھے بچے اس واسطے کیفیت یہ ہوگئی۔ کہنے لگے اللہ تعالیٰ خوش رکھے اس کو کہ جس نے یہ کیفیت ان کی کردی ہے۔ اور وہ تو بچی تھی، امیر المؤمنین کا بھی حشر ہوگیا تھا۔ صحابہؓ نے یہ کہا ہے کہ اگر کہیں وہ قحط مہینہ بھر تک اور رہتا تو عمرؓ زندہ نہیں بچ سکتے تھے جس حد تک اپنے آپ کو لے گئے تھے۔ یہ تو مرنے کے بعد کی باتیں آ رہی ہیں۔ یہ لوگ جن کی باہمی اخوت کی یہ کیفیت تھی کہ شہید ہونے والا اپنے آخری سانس میں پانی Prefer نہیں کرتا اپنے اوپر، دوسرے کی آواز پہ کہہ رہا ہے کہ اس میں زیادہ سوز ہے، شدت ہے اُسے پلا، کوئی بات نہیں، ادھر آتی ہے تو اتنے میں وہ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ چار دنوں میں سب اکٹھے ہو جائیں گے ایک میدان میں اور ستر ہزار ایک دوسرے کو قتل کردیں گے اور دوسرے مقام پر دس ہزار کو قتل کردیں گے؟ پھر شادیانے بجاتے ہوئے فتح اور مسرت کے گیت گاتے آجائیں گے تاکہ امام طبری کو افسانہ نگاری کے لیے مواد حاصل ہو جائے۔ مجھے نہیں ضرورت کہ میں ان کو Defend کرتا پھروں، مجھے ضرورت اس لیے ہے کہ قرآن نے مجھے مجبور کیا ہوا ہے کہ میں اس پہ ایمان لاؤں کہ ان میں سے ہر ایک مومن حقا تھا قرآن کہتا ہے۔ میں کس طرح سے اس سے انکار کردوں عزیزانِ من!۔ دہرایے پھر آگے چلتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کے زیرِ نگرانی تیار کردہ معاشرے کی خصوصیت

قرآن منافقین کی بات کو کلائمکس پر لے گیا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ قدم قدم کے اوپر عذر اور معذرتیں اور یہ چیزیں پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ذہن میں یہ بات نہ ہو کہ یہی معاشرہ تھا جو رسول عربی ﷺ نے تیار کیا۔ کہنے لگے نہیں نہیں! یہ تو کچھ Exception تھی۔ آؤ تمہیں چھوٹی سی جھلک چلتے چلتے دکھا دیں ایک آیت میں کہ کیا تیار کیا گیا تھا معاشرہ۔ **وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ** (9:100)

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ (9:101) پھر وہی بات آگئی۔ عجیب انداز ہے قرآن کا صاحب!! روح میں شگفتگی پیدا ہوگئی ایک آیت سے اور معلوم ہوگیا کہ یہ ان Exceptions کی بات ہو رہی ہے، جو وہاں یہ پیدا ہوگئے ہوئے تھے۔ کہنے

لگے وہ تو شہریوں کے متعلق ہم بات کر رہے تھے۔ اور یہ وہ اعراب تھے' اعراب کے متعلق قرآن نے بتا دیا ہے کہ وہ تھے جس انداز کے ہم مسلمان ہیں۔ ان کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ کہد یا ہے کہ ان اعراب سے یہ کہو یہ جو مسلمان ہو گئے تھے کہ ایسا نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِي قُلُوْبِكُمْ (49:14) ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا ابھی تک' ان سے کہو کہ یہ کہیں اَسْلَمْنَا کہ یہ جو مملکتِ اسلامیہ ہے ہم نے ان کے سامنے سرنڈر کر دیا ہوا ہے اپنے آپ کو۔ اس کے بعد جب یہ اپنے اعمال سے ثابت کر دیں گے کہ ایمان ان کی دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے تو پھر اپنے آپ کو مومن کہیں۔ قرآن نے کہنے نہیں دیا۔ یہ اعراب تھے جن کے متعلق یہ چیز ہے یہ ابھی تازہ تازہ ایمان لائے تھے اور ان کے متعلق کہا کہ ان سے کہو کہ ابھی اقرار نہ کریں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ اَسْلَمْنَا (49:14) سرنڈر کیا ہے۔

قرآنی اقدار کے ترازو میں ہماری حالت تو بالکل بے وزن ہو چکی ہے

اور جیسا میں کہا کرتا ہوں' ہمیں اپنے متعلق تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم کس کیٹگری میں ہیں' ایمان تو ہم لائے نہیں ہیں۔ ''ایمان نال کہو کہ ساری عمر اچ کسی دن ایمان لیا ندا ہیگا''۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہمارے لیۓ' ہم کبھی سوچتے نہیں کہ ایمان لانے والی کوئی چیز ہے۔ وہ سرنڈر والی بات بھی کچھ نہیں۔ یعنی ہماری صورت تو یہ ہے کہ پیدا ہو گئے عبدالرحمٰن کے گھر میں' عبداللہ انہوں نے نام رکھ دیا' اللہ اللہ خیر سلا۔ ہم تو ان اعراب کی کیٹگری میں بھی نہیں آتے وہ بھی پھر اپنے اختیار و ارادے سے ہی سرنڈر ہی سہی' خود تو کچھ کیا تھا۔ ہم نے تو کبھی ویسا بھی نہیں کیا تھا۔ اور پہلے زمانے کی بات تھی۔ مُلّا نکاح کے وقت کلمہ پڑھایا کرتا تھا' آپ نہیں پڑھا کرتے تھے' وہ بولتا جاتا تھا پیچھے پیچھے دہراتے چلے جاتے تھے۔ اور اب اس ماڈرن طریقہ میں اتنا بھی نہیں رہا ہوگا۔ اعراب ہیں وہ جن کے متعلق قرآن نے خود کہہ دیا ہے۔ آپ دیکھئے فرق ہے یہ۔

مہاجرین اور انصار کے علاوہ ایک تیسری کیٹگری کا ذکر اور موجودہ اسلام کی پس ماندگی کی وجہ جواز

ابھی ابھی مہاجرین اور انصار کے متعلق کہا مومن حقا کا۔ ایک اور کیٹگری کہ جو مسلمان ہو گئے ہیں لیکن ان کے متعلق کہا کہ ابھی یہ نہ کہیے کہ ایمان لے آئے ہیں' ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا ہوا ابھی تک۔ کہا ان میں بھی اس قسم کے ہیں جو مملکت کی شان و شوکت دیکھ کے ادھر آ گئے تھے' ان کی تو کیفیت یہ ہوتی تھی۔ اور آگے چل کے کہیں یہ بات آئے گی جب میں اسلام کی تاریخ لکھونگا کہ یہ جو اسلام بنا ہے بعد میں یہ سارا ان لوگوں کی وجہ سے بنا تھا جو شبا شب مسلمان ہو گئے اس سے' سرنڈر جنہوں نے کیا تھا اپنے آپ کو مملکتِ اسلامیہ کے سامنے۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِي قُلُوْبِكُمْ (49:14) جن کے دلوں کے اندر ایمان داخل نہیں ہوا تھا' جن کی

تعلیم وتربیت نہیں ہوئی تھی۔ان کا بنایا ہوا اسلام' آپ کے ہاں اس وقت سند یافتہ اسلام بن چکا ہوا ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے رسولوں تک وحی کی حدود کا تعین اور رسول اکرم ﷺ کی نگاہ بصیرت کا ذکر

وَ مِنۡ اَهۡلِ الۡمَدِيۡنَةِ مَرَدُوۡا عَلَى النِّفَاقِ (9:101) یہ دونوں مل گئے یعنی شہر والے اور دیہات والے دونوں ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ نفاق کے اوپر آ گئے' اڑے بیٹھے ہیں۔لَا تَعۡلَمُهُمۡ (9:101) قرآن نے بتایا ہے دوسرے مقام پہ بھی اور یہاں سے عظمت نظر آتی ہے رسول کی اور رسول کے خدا کی۔ جماعت کے اندر منافقین بڑا ہی نقصان پہنچاتے ہیں' تنگ بھی بڑا کرتے ہیں' اذیت دیتے ہیں نقصان بہم پہنچاتے ہیں' زچ پڑ جانے والی کیفیت ہو جاتی ہے۔خدا عالم الغیب ہے یہ کیا مشکل تھا جو پہلے ہی بتا دیتا کہ فلاں فلاں فلاں منافق ہیں۔ٹھیک ہے پہلے ہی دن سے رسول اللہ سے۔قرآن نے یہ بات کہی ہے کہ وحی تک کا معاملہ تو صحیح ہے وہ تو خدا کی طرف سے تمہارے پاس آتی ہے اور وہ تم آگے پہنچا دیتے ہو۔لیکن باقی معاملات میں کوئی چیز فوق الفطرت اپنی طرف سے نہیں ہم کہیں گے ۔یہ تو رعی ہو جائے گی' برابر کا مقابلہ نہیں رہے گا۔کہا یہ کہ انہیں خود پہچاننا پڑے گا ان کی باتوں سے تمہیں رسول! پہچاننا پڑے گا ان کے ماتھے پہ ہم نہیں لکھ دیں گے کہ یہ منافق ہیں۔تجربے کے بعد یہ کچھ کرنا پڑے گا' پہچاننا ہوگا ان کی لغزشوں سے ان کی منافقت کی چالوں سے' تمہیں ہی یہ کچھ کرنا پڑے گا۔لَا تَعۡلَمُهُمۡ (9:101) تو نہیں جانتا ان کو۔نَحۡنُ نَعۡلَمُهُمۡ (9:101) ہم جانتے ہیں۔تمہیں خود جاننا پڑے گا۔ سَنُعَذِّبُهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ ثُمَّ يُرَدُّوۡنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيۡمٍ (9:101) تم جانو گے اسی طرح سے کہ جب کہیں ٹکراؤ ہوگا نفاق میں اور خلوص میں تو اس میں ان کی منافقت تو چل نہیں سکتی زیادہ عرصہ تک' ایک تاؤ دیا جائے گا' ہو جائے گا منہ فق۔وہ جو بچپن میں ایک نظم پڑھا کرتے تھے ضمناً باتیں آ گئیں کیا اچھا دور تھا' کیا اچھے وہ لکھنے والے بھی تھے۔وہ ان چھوٹی چھوٹی بچوں کی نظموں میں ساری باتیں کہہ جاتے تھے۔وہ

چاندی کی انگوٹھی پہ جو سونے کا چڑھا جھول
کہنے لگی اترا کے بڑا بول کہ میں ساتھ رہونگی
یہ اَور ہیں میں اَور ہوں یہ لفظ میں کہونگی

ظاہریت پر مبنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا انجام

کیا چیز تھی؟ نیا نیا انگریز یہاں آیا اور ہمارے ہاں کے اس قسم کے لوگ جنہوں نے وہ وضع قطع Westernize اپنانا شروع کی تو یہ تھے تو ہمارے معاشرے کے لوگ۔لیکن آج بھی آپ دیکھئے گا جب ایک شخص پاجامے کے بعد پتلون پہن لیتا ہے اور پھر ڈالتا ہے اس کی جیب میں ہاتھ اور کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میری رائے میں یہ ہے۔وہ اپنے آپ کو صاحب بہادر سمجھنے لگ جاتا ہے۔''کدی کسے

پاجامے والےنوں نئیں تسی ویکھیا ہوگا اکڑ کے کھلوتا ہونداا ے''۔تو اس قسم کے جب نئے نئے صاحب بہادر بنے انہوں نے پھر اپنوں سے نفرت شروع کی۔تو پھر دیکھئے ان لوگوں کا انداز بات یوں نہیں کہی۔

منافقت کے دھاگے سے تیارہ کردہ لباس ایک ہی تاؤ میں تارتار ہوجاتا ہے

تاؤ دینے پہ ساری چیز یہ ہوجاتی ہے۔یہ جو قرآن نے کہا ہے منافقین سے کہ آپ دیکھیں گے کہ کس طرح سے یہ عذاب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔بس ایک تاؤ کہیں آجانا چاہیے۔منافقت کے پردے تو بڑے باریک ہوتے ہیں بڑی جلدی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔تو کہا کہ تم دیکھو گے کہ خود بھی یہ عذاب میں پھنس جائیں گے۔ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (9:101) اوراس کے بعد پھر آخری عذاب وہ آئے گا کہ جس میں سے ان کو پاک کردیا ہے۔قرآن نے یہ کہا ہوا ہے یادرکھئے عزیزانِ من! کہا ہوا ہے کہ ہم مومنین کی یہی حالت نہیں رہنے دیں گے کہ ان کے اندر یہ گھسے رہیں ملے رہیں' اختلاط ان کا رہے معلوم ہی نہ ہو۔ہم وہ کیفیت پیدا کریں گے (حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ) (3:179) خبیث اور طیب کو الگ الگ کرکے رکھ دیں گے پھر یہ معاشرہ اپنی ٹھیک جگہ پہ آئے گا۔یہ ہو چکا تھا رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے اندر۔یہ وہ عذابِ عظیم تھا جس میں وہ لوگ آئے ہیں اوراسی جنگِ تبوک میں آگئے تھے' چھٹ کے سامنے آگئے تھے' الگ کردیے گئے تھے۔ابھی بات آتی ہے۔

خود پر زیادتی کرنے والوں کی طرف سے احساس ندامت کے اظہار پر خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا انداز

اس میں ایسے بھی آگئے تھے کہ منافقت تو نہیں تھی اور پھر جو ان تین کا واقعہ قرآن بیان کررہا ہے' اللہ اکبر' ابھی بات آئے گی۔وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا (9:102) کہتا ہے ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو یونہی پھنس گئے تھے ان کے ساتھ' انہوں نے بھی کچھ اس قسم کی باتیں کیں۔لیکن انہوں نے بعد ازاں اعتراف کرلیا ہے اپنے جرائم کا۔تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اچھے کام بھی کیے' کچھ لغزشیں بھی ہوگئیں۔اچھے کام اور لغزشیں مل گئیں لیکن اس کے بعد انہوں نے توبہ کرلی' ندامت کا اظہار کیا' اعتراف کیا اپنے جرائم کا۔لہٰذا جب یہ کیفیت ہو عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ (9:102) خدا بھی ان کی طرف پلٹ کر آجائے گا۔اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (9:102) یہ قرآن کا انداز جو ہے خدا کی صورت یہ ہے کہ دروازہ بند نہیں کرتا کسی کے اوپر۔جب بھی کوئی نادم ہو کے آتا ہے' وہ تائب ہوتا ہے یہ تواب ہوتا ہے وہ ایک قدم اس کی طرف آتا ہے وہ کہتا ہے میں دو قدم تمہاری طرف چل کے آجاتا ہوں۔

اعتراف جرم کرنے والوں کے متعلق نبی اکرم ﷺ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ارشاد

یہ وہ تھے۔رسول سے کہا خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (9:103) کہ ٹھیک ہے انہوں نے اس قسم کی روش اختیار کی تھی لیکن اب

جب یہ اعتراف جرم کے بعد ندامت کے ساتھ آ گئے ہیں تو پھر یہ اب جو عطیے لا رہے ہیں' ان کو قبول کر لو۔ اس سے پیشتر ان کے عطیے بھی قبول نہیں کیے جاتے تھے' معاشرے سے ان کو الگ کر دیا گیا تھا۔ وہ جو کہا تھا کہ ان کی قبر پہ بھی کھڑے نہ ہونا۔ میں نے اس دن کہا تھا کہ یہ معاشرتی قطع تعلق ہے۔ لے لو ان سے۔ تُطَهِّرُهُمْ (9:103) یہ قریب کرو' دل سے ندامت کے ساتھ آئے ہیں۔ وہ جو دماغ کے اندر پاک چیزوں کے ساتھ غلط باتیں بھی آ گئی تھیں' ان آلائشوں کو دور کر دو۔ طھر کے معنی دور لے جانا ہوتا ہے کسی چیز کو۔ اور اس طرح سے وَ تُزَكِّيهِمْ بِهَا (9:103) یہی جو لائے ہیں نا عطیہ لائے ہیں اس سے انہی کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاؤ' تزکیہ نفس ان کا کرو۔ بِھا دیکھیے عجیب چیز یہاں آئی ہوئی ہے۔ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (9:103) میں نے اس دن بھی کہا تھا ''لائے ہیں'' یہ اس اعتراف کے ساتھ ہی' ٹھیک ہے یونہی لے کے رکھ نہ لو اس کا اظہار بھی کرو کہ تم اب ان سے راضی ہو گئے ہو۔ ان کا اعتراف جرم قبول کر لیا گیا ہے' اتنا ہی نہیں بلکہ صل علیھم شاباش بھی دو ان کو' Appreciation بھی کرو۔ آپ کو یاد ہے میں نے ایک پورا درس اس پہ صرف کیا تھا یہ بتانے کے لیے کہ اس دور کی سائیکولوجی نے یہ کہا ہے کہ جب Wages Determine کرتے ہو تم Labour کی اجرت مقرر کرتے ہو۔ تو جو اور Factor بھی تم اپنے سامنے لاؤ' ان میں ایک Term ہے' Psychological Income اس میں سے بھی ان کو حصہ دو۔ Psychological Income اس کو کہتے ہیں۔

Appreciate کرنے کی اہمیت کے برعکس Demoralise کا نقصان

شاباش دینے کو' Appreciate کرنے کو۔ بڑی چیز ہوتی ہے یہ۔ اچھے سے اچھے کام کرنے والے کو Demoralise کر دیجیے ذرا تھوڑے سے وقت کے لیے' آپ دیکھئے کہاں پہنچ جاتا ہے' وہ لکھا پڑھا بھی بھول جاتا ہے۔ یونہی بچہ کھڑا ہو آ گے' اسے کہو کہ ''تینوں ککھ نئیں اوندا ہیگا'' بالکل نہیں آتا' روز میں تمہیں یہ کہتا ہوں' روز یہ کچھ کرتے ہو۔ آپ دیکھیں گے جو آتا جاتا ہے اس کو وہ بھی بھول جاتا ہے۔ اور اگر شاباش! میرے بیٹے بہت اچھا کیا تم نے' ہاں پانچ سوال میں سے تین ٹھیک کر آئے ہوا بڑی اچھی بات کی ہے تم نے صاحب۔ اور اس کے بعد دیکھئے دوسرے دن وہ پانچ ٹھیک کر کے آتا ہے۔ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (9:103) Appreciate بھی کرو ساتھ۔

لفظ درود وصلوٰۃ کا مفہوم دراصل Appreciation کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی تحسین و آفرین کے معنوں میں

میں چونکہ اس درود وصلوٰت کے متعلق پورا درس دے چکا ہوں اس لیے اس مقام پہ اور تفصیل میں نہیں جاتا۔ وہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ

یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:43) کیا تھا؟ یہی Appreciation تھی۔ جماعتِ مؤمنین کے اوپر ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ (33:43) مسلمان جماعتِ مؤمن کے اوپر یہ درود اللہ تعالیٰ جو بھیجتا ہے صرف رسول کے اوپر نہیں بھیجتا پوری جماعتِ مؤمنین کے اوپر ہے۔

نماز اور درود کا لفظ عربی کے بجائے پہلوی زبان کا ہے

درود چونکہ ترجمہ کرتے ہیں اس لیے میں نے کہہ دیا ورنہ میں نے کہا تھا یہ تو عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے۔ یہ تو پہلوی زبان کا لفظ ہے مجوسیوں کے ہاں بولا جاتا ہے۔ نماز اور درود دونوں عربی زبان کے لفظ نہیں ہیں۔ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ (9:103) تیری شاباش سے ان کو بڑا سکون حاصل ہوتا ہے۔ کیا بات ہے۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے اس منافقت میں پتہ نہیں کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ ایک دفعہ اپنے جرم کے اعتراف کے بعد آئے ہیں' تو لے کے رکھ ہی نہ لو صرف بلکہ ساتھ ان کی Appreciation بھی کرو تحسین و آفرین بھی کرو۔ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ (9:103) تیری Appreciation ان کے لیے وجہ سکون ہوگی۔ بڑی چیز ہے۔

تو چھپا چھپا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

نبی اکرم ﷺ کے فرمان کی روشنی میں درجات کی بلندی کا معیار

لیکن بات یہ نہیں' بات وہی تھی جو حضور ﷺ نے فرمایا تھا۔ چلے جا رہے تھے تو ایک ساتھ جا رہا تھا' بات اس نے پوچھی کہ حضور ﷺ جس نے کوئی خطا نہیں کی' خدا کی معصیت نہیں کی اور ایک وہ ہے جس نے یہ کی' اس کے بعد توبہ کر لی۔ تو یہ دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ آپ ﷺ نے کہا کہ بھئی تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری تانی کے اندر جو تاریں ہوتی ہیں' سوت کے تاگے ہوتے ہیں۔ ایک تاگا وہ ہے جو شروع سے ساتھ ہے ایک تاگا وہ ہے جو ٹوٹ گیا ہے اور تم نے گرہ لگائی ہے۔ دونوں یکساں ہوتے ہیں؟ جولاہے کو بات سمجھائی جا رہی ہے۔ دونوں یکساں نہیں ہوتے۔ ٹھیک ہے گرہ لگ جاتی ہے۔ صحیح بات ہے۔ ٹھیک ہے تانی میں اسے شمار کیا جاتا ہے کپڑے کے اندر وہ آ بھی جاتا ہے یہ سب چیزیں ٹھیک ہیں۔ اُسے مسترد نہیں کیا جاتا' راندۂ درگاہ نہیں بنایا جاتا لیکن بہر حال گرہ لگے ہوئے تاگے میں اور اس میں جو شروع سے ہی ساتھ چلا آ رہا ہے' ایک فرق تو پڑ جاتا ہے۔ لیکن مجھے اور آپ کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ ہم یہ کرتے رہیں۔ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ (2:284) کپڑے کا خریدار اس چیز کو جانتا ہے کہ اس میں کتنا فرق کرنا ہے۔ میرے اور آپ کے نزدیک ایک جیسا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے صَلِّ عَلَیْھِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ (9:103) ہمارے لیے بھی یہ بات ہے کہ کوئی

شخص جس میں لغزش آ گئی ہے اور وہ اعتراف کرتا ہے' ندامت کرتا ہے اس کے بعد اس کو گلے لگانا' اس کے لیے وجہِ سکون ہوگا۔ ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم تفریق کرتے پھریں اس میں۔ یہ تفریق اصل میں دوسروں میں نہیں ہوتی' اپنے آپ میں ہوتی ہے اور یہ پندارِ نفس ہوتا ہے عزیزانِ من!۔ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (9:104) تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ہمارے دروازے بند نہیں ہوا کرتے' ہم دروازے کھلا رکھا کرتے ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں ہے ہم نے ان سے کہہ رکھا ہوا ہے کہ آ ؤ آ جاؤ' یہ آتے ہیں ہم دو قدم آگے بڑھ کے انہیں ملنے کے لیے اٹھتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے' اعتراف کیا ہے انہوں نے اپنے جرم کا' یہ بڑی چیز ہے۔

قصہ آدم میں بیان کردہ حقائق بڑے غور طلب ہیں

پہلے دن کا قصۂ آدم وہی ہے۔ آدم سے بھی ایک خطا ہوئی اور ابلیس سے بھی ایک خطا ہوئی۔ آدم سے پوچھا تو نے کیوں کیا اُس نے کہا کہ ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) مجھ سے غلطی ہوئی میں نے زیادتی کی (وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ (7:23) تو اگر رحم نہیں کرے گا تو پھر ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ کہا کوئی بات نہیں ہے' تیرے لیے دروازہ کھلا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ یہ کہہ دیا کہ بس ٹھیک ہے اب موج ہوگئی۔ نہیں!! فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) ہماری طرف سے راہنمائی آئے گی جو بھی تم میں سے اس راہنمائی کا اتباع کرے گا پھر اسے کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ دروازکھلا رکھا گیا ہے۔ ابلیس سے کہا گیا تم نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ کہنے لگا مالک الملک' کیا کہہ رہے ہیں آپ' آپ قادرِ مطلق آپ کے حکم کے بغیر تو پتہ نہیں ہل سکتا' میں کون ہوں معصیت کرنے والا۔ تو نے خود ہی تو مجھ سے یہ کچھ کرایا ہے۔ کہا کہ اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرتا اور ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا' اس ذہنیت کے لیے قیامت تک کے لیے کوئی دروازہ کھلا نہیں معافی کا۔ بات اتنی سی ہے جو ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا ہے اس کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی ابلیسیت ہے۔ جو ذمہ داری کو قبول کر کے اعتراف کرتا ہے' اس کے لیے دروازہ کھلا ہے۔ وہ الگ بات ہے اس کے بعد پھر وہ نہ آئے' نہ آئے تو نہ آئے لیکن دروازہ بند نہیں ہوتا۔

زندگی کے کسی موڑ پر غلط راستے سے لوٹ کر واپس آنا ہی' کافی نہیں ہوتا

اتنا کہنے سے کہ ان کا صدقہ لے لیجیے ان کی Appreciation کیجیے بات ختم نہیں کی۔ بات یہاں ہے وہ۔ وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ (9:105) جاؤ ٹھیک ہے ہم نے سمجھ لیا تم ہم میں سے ہو' اب جا کے کام کرو۔ تمہارا کام خدا بھی دیکھے گا' اس کا رسول بھی دیکھے گا' جماعتِ مؤمنین بھی دیکھے گی۔ یہ ہے وہ چیز۔ دروازہ کھلا رکھا گیا ہے بات آگے صرف کام کے

اوپر ہے، تم کام کرو کام سے دیکھا جائے گا کہ تم پھر کس زمرے میں شامل ہونے کے قابل ہو۔ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (9:105) کہا یہ کام تو یہاں دیکھ لیا جائے گا اور اس کے مطابق یہاں بھی تمہارا مقام متعین کر دیا جائے گا۔

ظاہریت کی بجائے دنیا میں خلوص ہی وہ شے ہے جسے ترازو میں تولا جائے گا

زندگی یہیں تو ختم نہیں ہو جائے گی، آگے بھی جائے گی، پھر دلوں کے حالات جاننے والا بھی تمہیں بتائے گا کہ اس میں تمہارے خلوص کا کہاں تک دخل تھا۔ وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (9:106) کہا کہ وہ کچھ جو میں نے کہا تھا، آگے بات ان کی آتی ہے۔ ان کے لیے ابھی آخری احکام خدا کی طرف سے نہیں آئے ابھی فیصلہ کن بات آئے گی ان کے متعلق۔ میں عرض کرونگا یہ کون تھے کیوں فیصلہ ان کا Pending رکھ دیا تھا، جسے کہتے ہیں تاریخ دیدی تھی اگلی، کچھ مزید شہادات جیسے ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو کہا ان کو اگلی تاریخ دیدو اس تاریخ کو ان کے متعلق فیصلہ کر دیا جائے گا۔

قرآن حکیم تو نفاق کی بنیاد پر تعمیر کردہ مسجد کو بھی قبول نہیں کرتا

اور اس کے بعد پھر یہی جو منافق تھے ان کی منافقت کے اوپر قرآن میں یہ کہا جاتا ہے کہ جس نے یہاں مسجد بنا دی، جنت میں اس کے لیے موتیوں کا گھر بن گیا۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ مسجد اور مسجد میں فرق کیا ہوتا ہے۔ یہ واقعہ آ گیا ایک مسجد بنانے کا، منافقین کے مسجد تعمیر کرنے کا ذکر آ گیا۔ دیکھئے گا کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ میں نے کہا ہے نا کہ کلائمکس پہ پہنچا دیتا ہے۔ ان کے نفاق کی انتہا یہ ہے کہ مسجد بنا رہے ہیں۔ یعنی اس سے زیادہ پکے مومن ہونے کی کیا بات ہے۔ اور اسی کو قرآن حکیم میں پیش کر رہا ہے کہ انتہائی درجے کی منافقت ہے۔ بلا دلیل نہیں کہتا یہ نہیں کہتا کہ اللہ جانتا ہے تمہارے سامنے تو مسجد ہے ٹھیک ہے، ہر مسلمان کہے گا مسجد ہے، دلیل دیتا ہے اس کے لیے کہ یہ کیوں ہے۔ اور وہ دلیل یہ ہے کہ ہر شخص جان سکتا ہے کہ فلاں مسجد اس مقصد کے لیے بن رہی ہے یا نہیں بن رہی۔ اور اس پہ کہتا ہے کہ جو اس مقصد کے لیے مسجد بنتی ہے، وہ ہے منافقت، وہ ہے کفر۔ یہ پھر کلائمکس میں پہنچا دیتا ہے اس چیز کو آ کر۔ آج وقت ہو گیا اسے پھر ہم آئندہ لیں گے۔ ہم سورۃ التوبہ کی آیت 106 تک آ گئے 107 آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

سترہواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 107 تا 110)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نبی آخرالزماں کی بعثت کا مقصد پوری نوع انسانی کے لیے اُمت واحدہ کی تشکیل تھا

عزیزانِ من! آج جون 1973ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 107 سے ہو رہا ہے۔ (9:107)

پرویزؒ کی طرف سے ایک اہم وضاحت قرآن حکیم کی تعلیم کا بنیادی محور عالمگیر برادری کی تشکیل ہے

سابقہ درس کے اختتام پہ میں نے یہ کہا تھا کہ یہ آنے والا درس جس آیت سے شروع ہوتا ہے وہ ایک بڑے ہی اہم موضوع کی حامل ہے۔ اس موضوع کے متعلق جستہ جستہ تو ہم قریب قریب ہر دوسرے چوتھے درس میں بیان کرتے چلے آ رہے ہیں کہ بات بڑی بنیادی ہے۔ لیکن جیسا ہمارا اسلوب ہے کہ قرآن میں جس مقام پر اس موضوع کے متعلق کوئی بنیادی، عمودی یا اساسی آیت آتی ہے تو پھر جتنے مقامات الگ الگ ہوتے ہیں، میں انہیں اس میں یکجا کر دیتا ہوں تا کہ وہ ایک ہی درس میں یا ایک ہی مقام پر پورے کا پورا موضوع مرتکز ہو کر نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ اس اعتبار سے میں نے کہا تھا کہ یہ آیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کا مقصد کیا ہے۔ تو اسے دو لفظوں میں یوں کہہ دیا جائے گا کہ وہ انسانوں کے باہمی اختلافات اور افتراقات کو مٹا کر، انہیں ایک عالمگیر برادری بنانا چاہتا ہے۔

وحی کا بنیادی مقصد نوع انسان کو اس کے باہمی اختلافات اور خون ریزیوں سے بچنے کے طریق سے روشناس کروانا ہے

تخلیقِ آدم کی جو ایک بنیادی کمزوری بتائی گئی تھی' بنیادی نقص بتایا گیا تھا وہ یہی تھا کہ یہ جو صاحبِ اختیار پیدا کیا جا رہا ہے' یہ دنیا میں فساد مچائے گا' خوں ریزیاں کرے گا۔تو یہ فساد اور خوں ریزیاں تو اختلافات اور افتراقات کا نتیجہ ہیں۔اور اس کے جواب میں کہا صرف یہ گیا تھا کہ نہیں! فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ(2:38) ہم اس کی راہنمائی کے لیے اپنی طرف سے اصول وقوانین واقدار بھیجیں گے۔اس کے مطابق اگر وہ اپنی زندگی بسر کرے گا تو جو چیزیں وجہِ خوف وحزن بتائی گئی ہیں کہ فسادانگیزیاں اور خوں ریزیاں کرے گا' باہمی اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔تو ان چیزوں سے یہ انسان محفوظ اور مامون ہو جائے گا اگر یہ اتباع کرے گا ہماری طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت کا۔گویا یہ اس کے اختیار وارادے کے برتنے کا ایک خدشہ' نتیجہ' خطرہ' اندیشہ یہ تھا کہ اس سے باہمی اختلافات پیدا ہونگے۔اختلافات کے نتیجے میں خوں ریزیاں ہونگی' فسادانگیزیاں ہونگی۔وہاں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ یہ نہیں ہوگا۔کہا یہ گیا تھا کہ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ اگر یہ آسمان سے بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرے گا تو پھر ان چیزوں سے محفوظ رہے گا۔تو گویا آسمان سے بھیجی ہوئی ہدایت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انسان میں یہ جو اختلافات اور افتراقات پیدا ہوتے ہیں وہ ان کو مٹائے انسانیت کو عالمگیر برادری بنائے تا کہ ان میں باہمی فسادانگیزیاں اور خوں ریزیاں نہ ہوں۔یہ ہے قرآن حکیم کی مرکزی تعلیم یا اس تعلیم کا مقصد جسے اس نے پوری اپنی دفتین کے اندر مختلف انداز اور اسلوب میں بیان کیا ہے۔اور یہی ہے آج کا موضوع اس آیت کا جو ہمارے سامنے آتی ہے اور ہمارے اس درس کا بھی سمجھ لیجیے۔وہی چیز کہ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو پھر سے عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔یہیں سے ہم بات شروع کرتے ہیں۔دو آیتوں کو آپس میں ملایئے۔سورۃ یونس کی آیت 19۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق اور لفظ شجر کا لغوی مفہوم

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک موضوع اور مضمون کی آیتوں کو بیک وقت سامنے لایئے پھر بات واضح ہوتی ہے۔

اس آیت میں یہ کہا گیا کہ وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (10:19) نوعِ انسانی ابتداء میں ایک عالمگیر برادری تھی اور اس کے بعد ہے فَاخْتَلَفُوْا(10:19) انہوں نے اختلاف کیے۔اب اس کے ساتھ دوسری آیت ملایئے (2:213)

اس پہلی آیت میں یہ ہوا کہ وہ عالمگیر برادری تھی انہوں نے اختلاف پیدا کیا آپس میں۔ تو اب اختلافات پیدا ہو گئے اس عالمگیر برادری کے اندر۔ یہی وہ شجرۃ تھا جس سے روکا گیا تھا' منع کیا گیا تھا۔ مشاجرت جسے کہتے ہیں کہ یہ چیز تم اپنے اندر پیدا نہ ہونے دینا۔ یہ پیدا ہوئی تو کہا یہ تھا کہ اس کے مٹانے کے لیے طریقہ یہ ہوگا کہ ہماری طرف سے جو ہدایات آئیں گی ان پہ عمل پیرا ہوا جائے گا تو پھر یہ افتراق باقی نہیں رہے گا۔ 2:213 میں کہا گیا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) وہی الفاظ جو پہلی آیت میں کہے گئے تھے اس کا وہاں یہ کہا گیا تھا کہ فَاخْتَلَفُوْا انہوں نے اختلاف کیے۔

انسانوں کے باہمی اختلافات کو مٹانے کے لیے انبیائے کرام کی معرفت وحی کا پیغام

اب اس کے بعد یہاں کہا گیا ہے فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ (2:213) خدا نے انبیاء کو بھیجا۔ تو ظاہر ہے کہ ایک عالمگیر برادری تھی' امتِ واحدہ تھی ان میں اختلاف پیدا ہوئے۔ خدا نے یہ انبیاء کا سلسلہ شروع کیا۔ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ (2:213) وہ انہیں آ کے یہ بتاتے تھے کہ اگر تم نے اپنی ہی روش اختیار رکھی تو اس کا نتیجہ خوں ریزیاں۔ فساد انگیزیاں۔ تباہیاں اور بربادیاں ہوگا۔ اور اگر تم نے اتباع کیا تعلیمِ آسمانی کا تو مُبَشِّرِيْنَ (2:213) تمہارے لیے زندگی کی خوشگواریوں کی بشارتیں ہیں۔ وہی ایک امت بن جانے والی بات جو ہے۔ یہ چیز پیدا ہوگی۔ طریق اس کے لیے کیا بتایا گیا؟ انبیاء کو بھیجا تو انہوں نے آ کے ایک شخص کی طرح سے کوئی بات نہیں کہی۔ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (2:213) ہر نبی کے ساتھ ایک کتاب بھیجی۔ ضابطہء قانون بھیجا۔ احکام بھیجے۔ وحی بھیجی وہ حق پر مبنی تھی۔ کاہے کے لیے یہ بھیجی؟ محض تلاوت سے ثواب حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ مقصد جو ہے وہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس آیت میں اخْتَلَفُوْا (2:213) کہ انہوں نے باہمی اختلافات کیے تھے جس کے بعد یہ سلسلہ جاری کیا گیا' انبیاء بھیجے ان کے ساتھ کتابیں بھیجیں۔ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ (2:213) تاکہ جن امور میں یہ لوگ باہمی اختلافات پیدا رکھتے تھے ان اختلافات کو مٹایا ان انبیاء کرام نے ان کتابوں کے ذریعے سے جو انہیں خدا کی طرف سے ملتی تھیں۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر نبی کو کتاب دی گئی تاکہ وہ لوگوں کی اس کے مطابق راہنمائی کرے

ضمناً ایک تو یہاں دیکھ لیجیے کہ انبیاء کا ذکر ہے اور کہا ہے اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (2:213) ہر ایک کو کتاب دی۔ اور یہ جواب نئی نبوت آئی ہے کہ صاحب نبی آیا ہے کتاب نہیں لے کے آیا۔ پوچھئے ان سے کہ یہ قرآن کی آیتوں کا کیا کریں گے۔ انبیاء آئے اور ان کے ساتھ کتاب آئی۔ نبی کا کام ہی خدا کی راہنمائی دینے کے لیے آنا ہے۔ نبی آئے اور وہ راہنمائی خدا کی نہ لائے تو آئے کس کے لیے وہ؟ کتاب کا مقصد بتایا ہے کہ ان کے اختلافات کو مٹائے گی۔ تو دو چیزیں ہوئیں: نبی آئے گا کتاب لائے گا وہ ضرور' پہلی چیز۔ عملاً اس

بات کی تو اب ضرورت نہ رہی کہ خاتم النبین کے بعد نبی کے آنے کا تو سوال نہ رہا اور اگلی بات یہ ہے کہ نبی آئے گا تو وہ کتاب لائے گا۔ ٹھیک ہے آخری نبی آیا تو آخری کتاب آ گئی۔

آخری نبی ﷺ اور آخری مکمل کتاب

نئی کتاب تو اس وقت آئے گی جب کوئی نیا نبی آئے گا۔ ختمِ نبوت کے معنی ہی یہ ہیں ختمِ کتاب۔ آخری کتاب آ گئی۔ کتاب کا مقصد کیا ہے؟ کاہے کے لیے کتاب بھیجی گئی ہے؟ یہیں بتادیا ہے لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (2:213) تاکہ لوگوں کے اختلافی معاملات کا فیصلہ کرے۔ وہ حکم بنے۔ آخری فیصلہ دینے والی چیز ہو تاکہ ان کے اختلافات مٹیں اور انسانیت امتِ واحدہ بن جائے۔ بات صاف ہوگئی یہاں تک۔ آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے بنیادی مقصد نبوت کا کیا بتایا ہے۔ کتاب کا مقصد کیا بتایا ہے۔ کتاب کی موجودگی کا مقصد کیا بتایا ہے۔ آخری نبیؐ کی نبوت قیامت تک اس لیے کہ اس کی کتاب قیامت تک موجود ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت تو انسانیت کا ہر شعبۂ زندگی متضاد تصورات میں الجھا ہوا تھا

کتاب کا مقصد یہ ہے کہ وہ اختلافات کو مٹا کے نوعِ انسانی کو ایک برادری بنا دے۔ اب ظاہر ہے کہ کتاب آئی یا نبی آیا یا نبی آخر الزمان ﷺ تشریف لائے، کتاب ساتھ لائے قرآنِ کریم۔ انسانیت اس زمانے میں بٹی ہوئی تھی اختلافات کی بناء پر مختلف گروہوں کے اندر۔ قبائل کے اندر۔ قوموں کے اندر۔ فرقوں کے اندر۔ مذاہب کے اندر۔ رنگ خون نسل مذہب عقیدہ وہ تمام بنیادیں تھیں انسانیت میں اختلافات پیدا کرنے کی۔ تو ظاہر ہے کہ جب یہ اختلافات مٹانے کے لیے کتاب یا نبی آیا ہے تو یہ وجوہِ اختلافات مٹائے گی نا وہ۔ یہ اگر اختلافات کی وجوہات نہ مٹائے گی تو اختلاف مٹے گا کس طرح سے۔ تو کتاب کا بنیادی مقصد یہ بتایا ہے۔

نبوت کا فریضہ پوری انسانیت کی ایک عالمگیر برادری کی تشکیل تھا

قرآنِ کریم میں بیشتر مقامات میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ کتاب اے رسول تمہیں دی گئی ہے اس لیے تاکہ یہ لوگ جن چیزوں میں اختلاف کرتے ہیں، ان کا فیصلہ کردے۔ اختلافات مٹتے چلے جائیں۔ افتراقات باقی نہ رہیں۔ یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے یہ ایسا کرنے کے لیے آیا تھا یہ۔ انسانیت کے اختلافات مٹا کے پوری انسانیت کو عالمگیر برادری بنانے کے لیے۔ یہ مقصد بتایا گیا ہے نبوت کا۔ یہ مقصد بتایا گیا ہے آسمانی کتاب کا۔ اب ظاہر ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے نزولِ قرآن کے وقت تو انسان بٹا ہوا تھا مختلف گروہوں میں۔ قبیلوں میں۔ قوموں میں۔ مذاہب میں تو اس مقصد کے لیے ظاہر ہے ایک جماعت کی ضرورت تھی جو ان تمام اختلافات سے بلند

اور ماوراء ہوتی۔ جتنا بھی کوئی مشن یا کوئی مقصد سامنے ہوتا ہے وہ انسانوں کی جماعت کے ذریعے سے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ نبی اکیلا اپنی ایک آواز کے ساتھ یہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اور پھر نبی بھی اگر کسی ایک گاؤں میں پیدا ہوتا اور اس کی نبوت گاؤں تک محدود اور اسی کی زندگی تک محصور ہوتی تو پھر بھی ہم کہہ سکتے کہ چلئے ایک فرد ایک شخص جو تھا اس نے کچھ ایسا کام کردکھایا۔ بات تو یہ نہیں تھی۔ اپنے زمانے میں بھی وہ ذکر للعلمین اور رحمت للعلمین تھا اقوامِ عالم کی طرف وہ آیا انسانیت کے اختلافات مٹانے کے لیے آیا۔ تو ایک وقت میں Space یا مقام جسے آپ کہتے ہیں وہ بھی حدود فراموش تھا۔

عالمگیر برادری کی تشکیل کے لیے ایک جماعت کی ضرورت کا ''الحق'' ہونا لازم ہے

رسول اللہ ﷺ مکے کے لیے یا عرب کے لیے نہیں تھے انسانیت کے لیے تھے۔ اور پھر ختمِ نبوت کے معنی تھے کہ زمان کے اعتبار سے ٹائم کے اعتبار سے بھی وہ آخر تک تھے۔ تو ایک نبی کی ذات اکیلی شخصیت Personality ایک تھی یہ اس کا کام نہیں تھا۔ اس کے لیے ظاہر ہے کہ پہلے ایک نیوکلئس تیار کرنا تھا۔ ایک خمیر تیار کرنا تھا۔ ایک بنیادی چیز تیار کرنی تھی۔ وہ کیا تھی؟ بنیادی چیز ظاہر ہے کہ ایک جماعت تیار کرنی تھی۔ اس مقصد کے لیے کہا۔ میں ایک ایک دو دو آیت کا حوالہ دونگا ورنہ اس موضوع پر قرآن میں بہت سی آیات ہیں۔ اور درس میں یہ مقصود نہیں ہوتا کہ میں ساری آیات ایک وقت میں سامنے آپ کے لاؤں۔ کہا یہ کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (2:143) کہا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے کہ انسانیت نوعِ انسانی کے اختلافات ختم ہوجائیں اور یہ ایک عالمگیر برادری بنے۔ سب سے پہلے ہم نے تمہیں ایک اُمَّةً وَّسَطًا (2:143) بنایا ایک امت بنایا، ایک جماعت بنایا، ایک قوم بنایا۔ کوئی لفظ اختیار کرلیجیے یہ وَّسَطًا تھی۔ پہلی ہی چیز یہ بتائی کہ خود اس امت کا وجود کوئی نیا فرقہ پیدا کرنے کے لیے، کوئی جماعت پیدا کرنے کے لیے، کوئی نیا گروہ یا افتراق پیدا کرنے کے لیے یہ جماعت وجود میں نہیں لائی گئی تھی کہ اتنی پہلے تھی ان میں ایک اور کا اضافہ کردیا جاتا۔ یہ وَّسَطًا تھی یہ بڑا ہی گہرا اور جامع معنی ہے جو قرآن یہاں لایا ہے۔

انسانیت کی سطح پر قائم ہونے والی سوسائٹی کی کیفیت ایک مرکز کی سی ہوتی ہے

یہ جو ہے وَّسَطًا کے معنی ہوتا ہے Equally Distant جو ہر ایک سے یکساں فاصلے کے اوپر ہو۔ بڑی عجیب جامع تعریف یا صفت یا مقصد بتایا گیا ہے اس امت کا جو وجود میں لائی گئی تھی انسانیت کو ایک مرکز پہ لانے کے لیے۔ ایک مرکز کی Definition یہ ہوتی ہے کہ وہ محیط Equally Distant ہوتا ہے وہاں سے، یکساں فاصلے کے اوپر ہوتا ہے۔ اس قوم کی صورت یہ نہیں تھی کہ کسی کے تو قریب تھی کسی سے دور تھی، کسی کے مخالف تھی۔ نوعِ انسانی کا ہر فرد ہر قوم ہر گروہ ہر اہلِ مذہب وہ اس کو اتنا ہی قریب پاتا تھا جتنا دوسرا

قریب پاتا تھا۔ یا انہیں اپنے سے اتنا ہی قریب رکھتی تھی جتنا دوسرے کو رکھتی تھی۔ جب یہ فاصلے مٹا دیے جائیں پہلی بنیادی چیز اختلاف کے مٹانے کی یہ ہے عزیزانِ من! ۔ مرکز محیط کا فاصلہ کہیں کوئی، کہیں کوئی کر دیجیے' آپ دیکھیں گے دائرہ بن ہی نہیں سکتا۔ ذرا اس دائرے کا نقشہ ذہن میں لائیے کہ سنٹر سے کہیں اس محیط کا فاصلہ کتنا ہو' کہیں کتنا ہو۔ دائرہ ہی نہیں بن سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں ایک ایک لفظ قرآن کا کہہ کیا جاتا ہے۔ کاہے کے لیے ایک قوم ایسی بنائی جو دائرے کے مرکز کی طرح بیٹھی ہوئی ہے۔ پوری انسانیت اس سے Equal Distance پر ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد پوری انسانیت کے اعمال کی نگرانی کرنا تھا

کس مقصد کے لیے یہ انسانیت کے اوپر یکساں نگاہ ڈال رہے تھے لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) تاکہ یہ Watch کریں' نگرانی کریں۔ آپ دیکھتے ہیں وہاں تھا (کان الناس امةً واحدةً) ان کے لیے آئی ہے یہ جماعت۔ الناس کو ایک مرکز پہ جمع کرنے کے لیے یہ جماعت وجود میں لائی گئی ہے۔ لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) تاکہ پوری انسانیت کے اعمال کی نگرانی کرے کہاں اختلاف ہو رہا ہے' کون اختلاف پیدا کر رہا ہے' کون فساد کی طرف جا رہا ہے۔ یہ نگاہ رکھے۔ اور چونکہ یکساں فاصلے پہ ہے ہر قوم سے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ عدل کرے' کسی کے ساتھ ظلم کرے۔ اس کے لئے ہر انسان برابر ہر قوم برابر' ہر گروہ برابر۔ اس لیے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کسی کو یہ اس مقصد کے لیے قریب کر دے' کسی کو دور کر دے۔ اور نگرانی کرے الناس کی' پوری انسانیت کو Watch کرے یہ کہ کون کہاں کیا کر رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پھر محض Watch کرنے کی بات نہیں ہے۔ جو Watch Tower پہ کھڑا ہوتا ہے اس کے پاس اتنا انتظام اور انصرام اور قوت ہوتی ہے کہ جو نیچے فساد آمادہ ہونے والا ہو' اس کو فساد سے روک سکے۔ یہ جو ایک چوکیدار بنائی گئی تھی جماعت یہ' جنہیں طآئفین کہا گیا تھا۔

لفظ طواف کا لغوی مفہوم اور جماعتِ طائفین کا فریضہ شہدآء علی الناس کا مقصد

میں نے عرض کیا ہوا ہے کہ اب طائف یا طواف تو ہمارے ہاں کعبہ کے گرد چکر لگانے کا نام رہ گیا ہے۔ یہ جو رات کو نکلتے ہیں آپ کے ہاں پولیس والے پہرے کے لیے۔ آج بھی عربی زبان میں ان کو ہی طائف کہا جاتا ہے۔ طائفہ کے معنی ہوتا ہے یہ رات کو گھوم کر پہرہ دینا۔ یہ بنائی اس لیے گئی تھی کہ اس واچ ٹاور کے اوپر ہو اور اس کی نگاہ پوری انسانیت کو محیط ہو۔ اور پھر اس کے پاس یہ انتظام و انصرام ہو' یہ قوت بھی ہو۔ اور اسی لیے سورۃ حدید میں کہا گیا ہے کہ (وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ)(2:213) اور اس کے ساتھ ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (57:25) اور اس کے ساتھ ہم نے فولادی شمشیرِ خارہ شگاف بھی نازل کی کہ جس میں بڑی سختی ہوتی ہے۔

انسانیت کی خوں ریزیوں اورفسادانگیزیوں کوروکنے کے لیے جہاں انتہائی درجے پہ پہنچ کے اس کی ضرورت ہوگی' واچ ٹاور کے اوپر سپاہی کے لیے بندوق بھی ضروری ہوتی ہے۔للکارتا ہے' آواز دیتا ہے' ٹھہراتا ہے اور جب ان چیزوں سے کام نہیں چلتا تو آخر میں قوت بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔بہرحال مقصد یہ تھا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (2:143) کا۔

اورخود اپنی کیفیت کیا تھی۔جماعتی حیثیت تو خود ایک مرکز کی متقاضی ہوتی ہے۔نوعِ انسانی کے اعمال کی یہ نگران۔وَ یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا (2:143) اوران کا مرکز جو ہے وہ ان کے اعمال کا نگران۔یہ انسانیت میں کیا چیز نہیں پیدا ہونے دینا چاہتے تھے؟ افتراق' اختلاف' تفرقہ۔توان کا رسول کیا چاہتا تھا؟ ان کے اپنے اندر یہ چیز پیدا نہ ہو۔اگر اختلاف مٹانے والوں کے اندر ہی اختلاف پیدا ہو جائیں تو یہ دوسروں کے اختلاف مٹائیں گے کیا۔یہ امتِ واحدہ تھی۔بنائی اس لیے گئی۔یہ وجہ ہے کہ جو قرآن نے یہ بتا دیا رسول سے یہ کہہ دیا کہ رسول ان کے اعمال کی نگرانی کرنے کے لیے تھا۔یاد رکھئے جہاں رسول آتا ہے رسول کی ذات مقصود نہیں ہے۔وہ شخصیت اگر ہے تو وہ تو طبعی زندگی ہے خواہ وہ 63 برس کی ہو یا 63 سو برس کی ہو بہرحال اس نے تو ایک دن دنیا سے چلے جانا ہے۔اسی لیے قرآنِ کریم نے یہ کہہ دیا کہ یہ بات نہیں کہ محمد ﷺ کی ذات تک یہ چیز ہے۔اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ (3:144) کل کو جب یہ یہاں سے مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم کہو کہ یہ تو محمد ﷺ کی ذات تک معاملہ تھا وہ چلا گیا ختم ہوا قصہ۔اب ہم پھر لوٹ جائیں گے اپنی روشِ کہن کے اوپر۔کہا نہیں! یہ سلسلہ چلے گا۔تو اس لیے جہاں یہ رسول کہا ہے تو اس کے بعد اس سلسلہ کو قائم رہنا ہے تو مقصد اس کا یہ سلسلہ ہے۔بہرحال یہ دوسری بات ہے۔میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس امت کا مقصد انسانیت کے اختلافات کو مٹا کر ایک مرکز پہ جمع ہونا ہے۔اس امت کی روش اور مسلک پر نگاہ رکھنے والا ان کا اپنا مرکز تا کہ ان میں کسی قسم کا اختلاف وافتراق پیدا نہ ہو تفرقہ پیدا نہ ہو۔بنیادی چیز یہ کہہ دی یہ وہ لوگ ہیں جو رسول پہ ایمان رکھتے ہیں۔

دین میں تفرقہ پیدا کرنے والے کا رسول اکرم ﷺ سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہتا

کہا اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (6:159) سن رکھیے عزیزانِ من! یہ وہ لوگ ہیں کہ جو خدا' رسول' ملائکہ' کتب' آخرت سب پر ایمان رکھتے ہیں۔یہ مرتد یا کافر نہیں ہو گئے جن کا ذکر آ رہا ہے یہ مسلمان ہیں۔کہا یہ کہ اے رسول جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر لیں' فرقے پیدا کر لیں تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ بنیادی مقصد اس تعلیم کا تو انسانیت کے اختلافات کو مٹانا تھا۔ Justification اس امت کو Raise کرنے کی' اس امت کو وجود میں لانے کی وجۂ جواز یہ تھی کہ یہ انسانیت کے افتراق اور تفرقہ کو مٹائے۔اس امت کا ذمہ یہ تھا' فریضہ یہ تھا۔اسی کے لیے ایک رسول ان کی بہاری کا بندھن تھا کہ یہ

اس مقصد کو پورا کرسکیں۔ اور اگر انہی کے اندر فرقے پیدا ہو جائیں‘ انہیں میں تفرقہ پیدا ہو جائے‘ انہیں میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ تو آپ دیکھئے بات کیا کہی ہے قرآن نے‘ کہا ہے اے رسول تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور جب رسول کا واسطہ کسی امت سے نہ رہے تو وہ امت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ امت تو بنتی ہی رسول کی طرف نسبت سے ہے۔ خدا کو ماننے سے امت نہیں بنتی۔ خدا کے ماننے والے تو دنیا میں مختلف قوموں میں‘ گروہوں میں‘ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ وہ ایک مرکز پہ نہیں جمع ہوئے۔

رسول اکرم ﷺ کی اُمت میں شمولیت کی تو پہلی شرط ہی‘ فرقہ بندی سے اجتناب ہے

ایک مرکز پہ جمع ہوتے ہیں رسول کے اوپر ایمان لانے والے۔ یہ بٹے ہوئے‘ منقسم متفرق مختلف انسانوں کے اندر سے ایک جماعت بنی جس کے اپنے اندر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس بناء پر بنی‘ رسول کو مرکز ماننے سے بنی‘ رسول پر ایمان لانے سے بنی۔ لہٰذا جب ان کے اندر اختلاف پیدا ہوا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ رسول کا ان سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ یوں کہہ دیجیے کہ انہیں رسول سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ رسول سے کہا گیا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6:159) اگر انہوں نے اپنے اندر تفرقہ پیدا کرلیا‘ اختلاف پیدا کرلیا‘ فرقہ بندی پیدا ہوگئی اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ تو جب اس رسول کا کوئی واسطہ نہ رہا ان سے‘ تو پھر یہ کیا رہ گئے دنیا کے اندر۔ انہوں نے اگر قوم بننا ہے تو قوم بننے کی وجہ کوئی اور تلاش کرنی پڑے گی۔ اس رسول کی نسبت تو پھر یہ قوم نہیں رہے گی دنیا میں۔ اس کو کوئی واسطہ ہی نہیں رہے گا نسبت ہی نہیں رہے گی۔ اب جو امتِ محمد ﷺ کہلاتے ہیں قرآن کی اس آیت کی رو سے غلط ہے اگر ان کے اندر اختلاف و افتراق پیدا ہو گیا۔ رسول سے کہا گیا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6:159)۔ آپ دیکھتے ہیں قدم بہ قدم کیسے چلے آ رہے ہیں اس معاملے کے اندر۔ اسی لیے رسول سے کہا کہ اعلانیہ ان سے کہہ دیجیے کہ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (6:153) یہ ہے میرا راستہ ایک امت بن کے رہنے کا۔ اسی راستے کے اوپر چلنا ہے تمہیں۔ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ (6:153) مختلف راستوں کے اوپر نہ چل نکلنا۔ تم نے اگر ایسا کیا فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (6:153) یہ نہیں رہے گا کہ پھر اس کے بعد تم میں سے ایک تو خدا کے راستے کے اوپر رہے اور باقی نکل جائیں گے۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اپنے اپنے مفاد کی خاطر فرقہ بندی کو دوام بخشنے کے سلسلہ میں فریبِ نفس کے سہارا کی قرآنی تردید

عزیزانِ من! یہ ایک عجیب مغالطہ دیا جاتا ہے کہ جب امت میں فرقے بن جاتے ہیں تو اس کے بعد ایک رہتا ہے صحیح دین کے اوپر‘ باقی سارے جو ہیں اختلافی چیز ہو جاتے ہیں۔ میں ابھی ابھی آؤنگا اس آیت کی طرف۔ اس میں کہا ہے کہ اگر سُبل پیدا ہو گئے مختلف راستے پیدا ہو گئے تمہارے اندر۔ تو یاد رکھو فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (6:153) وہ جو ایک راستہ تھا خدا کا اس سے تم الگ ہو جاؤ گے

سب الگ ہوجاؤ گے۔ایک راستہ تو امتِ واحدہ ہونے کا تھا عزیزانِ من! جونہی وہ امت امتِ واحدہ نہ رہی' اس ایک راستے پہ تو کوئی بھی نہ رہا۔اب یہ تو مناظرہ بازیاں' یہ تو مباحثے ہوئے' یا فریبِ نفس ہوا' یا فریب دہی ہوا فقط یہ کہنے کے لیے کہ نہیں صاحب ہم تو اسی راستے پہ ہیں' باقی چھوڑ کے نکل گئے ہوئے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ وہ جو اس کا راستہ ہے پھر وہ تو گم ہوگیا تمہاری نگاہوں سے۔وہ راستہ تھا امتِ واحدہ بن کے رہنا۔غور فرمایا آپ نے۔کہا پھر وہ راستہ تمہارے سامنے باقی نہیں رہتا۔جب اختلاف پیدا ہوجائے تو پھر صورت کیا ہوتی ہے۔بات تو سیدھی سی ہے۔اختلاف پیدا ہوا پھر وہی خوں ریزیاں اور فسادانگیزیاں شروع ہوئیں۔وہی جس کو مٹانے کے لیے انبیاء بھیجے گئے تھے۔وہی جنہیں ایک امت میں Weld کرنے کے لیے یہ کتابیں آئی تھیں۔وہ سارے مقصد فوت ہوگئے۔اور پھر وہ خوں ریزیاں' فسادانگیزیاں' اختلافات شروع ہوگئے۔یہ کیا چیز ہے۔قرآن ایک لفظ میں انہیں بیان کردیتا ہے۔خدا کا عذاب۔

ایمان لانے کے بعد فرقہ بندی کو ہوا دینے اور افتراق و اختلاف پیدا کرنے والوں کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (3:105) کہا یہ واضح تعلیم خدا کی طرف سے۔ اس تعلیم کے آجانے کے بعد سوال ہی نہیں ہے کہ پھر تم آپس میں اختلاف اور افتراق پیدا کرو۔اگر اس کے بعد بھی تم نے آپس میں اختلاف پیدا کرلیا تو یاد رکھئے وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (3:105) ان پر خدا کا عذاب' عذاب بھی عذابِ عظیم آئے گا جو بنیادوں تک کو اکھیڑ کے رکھ دے گا۔عظیم وہ بنیادی چیز ہوتی ہے' عظم ان بنیادی ہڈیوں کو کہتے ہیں جن کے اوپر یہ گوشت پوست سارا آتا ہے انسان کا۔افتراق اور اختلاف کا نتیجہ یہ بتایا کہ اس کا نتیجہ پھر یہ عذابِ عظیم آئے گا۔

قرآنی ضابطہ حیات کیا تھا' نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد نوعِ انسانی کو عالم گیر برادری کی لڑی میں پرونا تھا

اگلی دو آیتوں کے اندر ہے کہ امتِ واحدہ کے بعد یہ کچھ بننے والے ظہورِ نتائج کے وقت' ایک تشبیہ یا تمثیل سے بات سمجھائی کہ کچھ چہرے ہونگے نورانی کچھ چہرے سیاہ پڑے ہوئے ہونگے۔یہ جو سیاہ چہرے والے ہونگے یہ وہ ہونگے جنہوں نے افتراق کیا۔اور ان سے کہا جائے گا اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (3:106) حالانکہ ایمان سے انکار انہوں نے نہیں کیا' صرف فرقہ پیدا کیا ہے' افتراق کیا ہے۔کہا یہ کہ کیا تم نے پھر ایمان کے بعد کفر اختیار کرلیا تھا۔تو ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا ہے۔ایمان تو تھا ہی وحدت کا نام' توحید کا نام

تھا' ایک ہوجانے کا نام تھا۔ اگر اس کے اندر بھی یہی چیز ہوگئی اختلافات اور افتراقات' تو نبی کو نہ ماننے والے اور نبی کو ماننے والے' ہدایت کے مدعی اور اس سے انکار' اس سے فرق کیا پڑا۔ اس نے کہا کہ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (3:106) ایمان لانے کے بعد تم نے کفر اختیار کرلیا۔ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (3:106) آپ یہ دیکھئے کہ اختلاف کے متعلق اوپر یہ کہا ہے تفرقہ اور افتراق' اسے کہا ہے فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (3:106) اپنے کفر کا مزہ چکھو پھر۔ کفر ہے۔ اور یہ انہیں کہا جارہا ہے صاحبِ ایمان کہتے ہیں' مسلمان کہتے ہیں' اس امت کی طرف نسبت کررہے ہیں۔ لیکن وہ ان دعوؤں کو کب مانتا ہے۔ کہتا ہے اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (3:106) پھر اس کا مزہ چکھو۔ افتراق کا نتیجہ یہ ہونا تھا۔ کہتا ہے وہ لوگ کہ جنہوں نے نہیں کیا تھا' امتِ واحدہ رہے تھے وہ اللہ کی رحمت کے اندر ہونگے۔ رسول اللہ ﷺ اگر رحمت للعالمین تھے تو اس لیے کہ انسانوں کے اختلافات کو مٹا کے ایک مرکز پر انہوں نے جمع کیا تھا ان کو۔ یہی مقصدِ کتاب تھا یہی تقاضائے نبوت تھا یہی مطلوب تھا آسمانی ہدایت کا۔ اسی کے لیے یہ امت وجود میں آئی تھی کہ انسانوں کے اختلافات مٹائیں۔ یہیں واضح کرکے بتادیا قرآن نے۔ اسی لیے یہیں دو آیتیں آگے چل کے کہا كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) تم وہ بہترین قوم ہو جو نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ للناس پھر یہاں آگیا۔ اس کا تو مقصد ہی الناس کو ایک مرکز پر لانا تھا' انسانوں کے اختلافات مٹانا تھا۔ یہ پیدا ان کے لیے کی گئی تھی' شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) تھی یہ قوم۔ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے اس کے فائدے کے لئے تم وجود میں لائے گئے تھے۔ تم مقصود بالذات نہیں تھے' کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی تمہاری امت کی وحدت۔ اور وہ تھا انسانوں کو ان کے فسادات وخوں ریزیوں اختلافات وافتراقات سے ہٹا کر ان میں یگانگت اخوت اور محبت پیدا کرکے' ایک عالمگیر قوم بنا دینا۔ اس مقصد کے لیے تمہیں وجود میں لایا گیا ہے۔ اسی لیے تم خیر امت ہو۔ ادھر یہ کہا گیا اُدھر رسول سے یہ کہا گیا کہ اگر انہوں نے بھی اپنے اندر اختلاف بعد میں پیدا کرلیے اے رسول! تو تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں' خدا نے کہہ دیا ایمان سے ان کا کوئی تعلق نہیں' یہ کفر ہے۔ وہی عذاب ان کے اوپر مسلط ہوگا جو کفر کا عذاب ہے۔ کفر کیا تھا؟ اختلافات وافتراقات ہی تو تھے جن کو مٹانے کے لیے یہ آئے تھے۔ یہاں کفر کہا گیا ہے۔ یہ مختلف سُبل جنہیں کہا گیا ہے مختلف راستے اختیار کرلینا' مختلف فرقے پیدا کرلینا یہ کیا چیز ہے۔

انسانوں سے خدا تعالیٰ کے تعلقات کی نوعیت اور وضاحت

یاد رکھئے خدا کا تعلق انسانوں کے ساتھ اس کی کتاب کے ذریعے ہوتا ہے۔ اُس نے جب کہا تھا کہ سلسلہ اس لیے جاری کیا کہ اختلافات مٹیں تو کہا یہ تھا کہ ہم نے کتاب بھیجی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اختلافات کو مٹا دے۔ گویا اگر ایک کتاب کے اوپر ایمان رہے

دوسرے الفاظ میں ایک خدا پر ایمان رہے' ایک کے فیصلے کے تابع یہ سب رہیں تو پھر تو یہ توحید ہوئی۔ اور جب آپ تفرقہ لیں گے' فرقہ بندی لیں گے تو ظاہر ہے نا کہ ایک فیصلے کے اوپر سب نہیں چل رہے' مختلف فیصلوں پہ چل رہے ہیں نا۔ جب مختلف فیصلے ہوئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مختلف فیصلہ دینے والوں کو یہ مان رہے ہیں۔ اسی کو تو شرک کہا جاتا ہے۔

الصلوٰۃ کا بنیادی مقصد احکاماتِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے

لیجیے قرآنِ کریم نے بات واضح کردی۔ مُنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ وَاتَّقُوۡهُ وَ اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ (30:31) ایک نقطہ سامنے رکھو اور خدا کو اپنا حاکم مان لو' اس کی کتاب کے مطابق متنازع فیہ اختلافی معاملات کا حل وہاں سے ڈھونڈنا اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے' اس کی طرف لوٹتے ہوئے۔ وَاتَّقُوۡهُ (30:31) اسی کو نصب العینِ حیات بناتے ہوئے۔ اس کا عملی ذریعہ کیا تھا اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ (30:31) آپ دیکھ رہے ہیں کہ الصلوٰۃ کیا معنی رکھتی ہے' الصلوٰۃ کا مقصد کیا تھا۔ اگلے دو لفظ یا چار لفظ سامنے لے آیئے تو اقیموا الصلوٰۃ کے معنی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ یہ درس اس کے لیے نہیں ہوگا' کئی درس آئیں گے جس میں میں بتاؤں گا کہ یہ اقامتِ صلوٰۃ کیا ہے۔ جسے ہم نے ''نماز پڑھ لو'' میں تبدیل کیا۔

قرآن حکیم کے ساتھ ہونے والی سب سے بڑی سازش' اس کی اصطلاحات کے مفہوم کو بدلنا ہے

میں نے پچھلے درس میں بتایا تھا کہ سب سے بڑی سازش یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاحات کے ہم نے ترجمے کر کے ان کو بدل کے رکھ دیا۔ اقامتِ صلوٰۃ کے بعد کہا اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ (30:31) مُنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ (30:31) ایک خدا ایک مرکز کی طرف سارے اپنا رخ رکھو' عملی زندگی تمہاری یہ ہے اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ (30:31)۔ مفہوم اس کا قرآن کی رو سے یہ ہوتا ہے کہ کسی کے پیچھے پیچھے چلے جانا التزاماً' مسلسل' اِدھر اُدھر دیکھنا تک نہیں۔ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ (30:31) یاد رکھو پھر مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ (مِنَ الَّذِيۡنَ) (30:32) یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ (30:32) جنہوں نے دین میں اپنے فرقے پیدا کر لیے تھے۔ وَ كَانُوۡا شِيَعًا (30:32) خود بھی ایک پارٹی بن کے بیٹھ گئے تھے۔ وہ بات آ گئی جو میں نے آگے کہی تھی کہ پھر ان میں سے کسی سے پوچھیے جب فرقہ پیدا ہو جائے' ہر ایک یہ کہے گا کہ صاحب میں کیا کروں میرا کیا قصور ہے ہم تو اسی صحیح اسلام کے اوپر ہیں یہ باقی دوسرے ہیں جنہوں نے الگ فرقے پیدا کر لیے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ نہیں جب سُبل پیدا ہو جائیں گے تو وہ خدا کی طرف جانے والا راستہ تو گم ہو جائے گا نگاہوں سے۔

آج اپنے اپنے طور پر ہر فرقہ دوسرے فرقے کو غلط قرار دینے اور خود کو اُمت محمدی ﷺ سے ہونے کا داعی ہے

یہاں یہ کہا ہے کہ جب یہ فرقے پیدا ہو جائیں گے تو پھر کیفیت یہ ہوگی کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32) ہر فرقہ پھر مگن ہو جائے گا کہ میں تو ہوں صحیح راستے پہ میں کیا کروں باقی جہنم میں جانے والے، جنہوں نے فرقہ پیدا کیا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32)۔انہوں نے اپنی خود فریبی یا خوش فہمی کے لیے پھر روایات وضع کیں اور اس میں یہ چیز بتادی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری امت میں تہتر فرقے پیدا ہو جائیں گے۔ میری امت' وہ رسول کی امت رہے گی؟ نظر آتا ہے کہ کس قدر وضعی چیز ہے۔ تہتر فرقے پیدا ہو جائیں گے بہتر جہنم میں جائیں گے ایک فرقہ جو ہے وہ جنتی ہوگا۔ رکھ لی Exception گنجائش رکھ لی ایک کے لیے۔ متعین تو کیا نہیں کہ کونسا ایک۔ ہر ایک ان میں سے ایک۔ ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ ٹھیک ہے تہتر والی بات تو بالکل ٹھیک فرمائی ہے وہ بہتر اور ہیں، ہم تو وہ ایک ہیں جن کے متعلق کہا تھا کہ وہ جنتی ہوگا۔

ہم کیوں کہتے ہیں کہ یہ چیز غلط ہے۔ اس لیے کہ اس نے یہ کہا تھا کہ اگر سُبل پیدا ہو گئے تمہارے ہاں' مختلف طریقے پیدا ہو گئے تو وہ جو سبیل اللہ ہے، پھر وہ باقی نہیں رہے گی۔ اور یہاں اس نے یہ کہہ دیا ہے كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32)۔ وہ ایک کی گنجائش رکھی ہے اس وضعی روایت میں' یہاں نہیں رکھی گئی۔ پھر ہر گروہ مگن ہو جاتا ہے اپنی اس خوش فہمی کے اندر کہ میں حق کے اوپر ہوں۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (30:31) عزیزانِ من! ایک ایک کم از کم آیت اس موضوع کی آپ کے سامنے پیش کی۔ حوالے آپ کو دیدیے۔ یہاں دیکھ لیجیے گھر میں جا کے دیکھ لیجیے، بار بار ان چیزوں کو دیکھ لیجیے۔

فرقوں کی موجودگی میں توحید کا کیا کام

آپ نے دیکھ لیا کہ بہ نصِ صریح قرآنِ کریم کی رو سے امت میں فرقوں کا پیدا ہو جانا۔ پہلی بات قرآن نے کہی کہ رسول سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہتا' کسی فرقے کا بھی نہیں رہتا۔ دوسری بات کہی کہ یہ کفر ہے' ایمان کے بعد۔ ایمان امتِ واحدہ بنتا تھا' کفر تقسیم ہو جانا تھا۔ پھر عرض کردوں کہ بنیادی مقصد ہی اس تعلیم سے یہ تھا کہ پوری انسانیت کو ایک مرکز پہ لا رہا ہے وہ' ایک امت وجود میں لا رہا ہے کہ جو مثالی امت ہے دوسروں کے سامنے کہ دیکھو ہمارے اندر کوئی اختلاف وافتراق نہیں۔ جب اتنے انسان اس طرح سے ایک مرکز پہ جمع ہو سکتے ہیں تو پورے انسان کیوں نہیں ہو سکتے۔ اُنہوں نے تو یہ مثالی امت بننا تھا۔ پھر اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ یاد رکھو یہ فرقوں کے

اندر بٹ جانا شرک ہے۔ٹھیک ہے توحید تو رہتی نہیں اس کے بعد' توحید تو وحدت کا نام ہے۔توحید کا لازمی فطری نتیجہ وحدتِ امت ہے۔ توحید باقی نہیں رہتی۔پھر جب یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اس خوش فہمی اور خود فریبی میں نہ رہنا کہ باقی بہتر تو جہنمی ہیں ہم بالکل جنت والے ہیں۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (30:32)۔بات یہ باقی رہتی نہیں ہے۔اس کے لیے کہا یہ تھا وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (30:31) یہ بتایا گیا ہے نا ایک پروگرام۔

صلوٰۃ کا لفظ نظام زندگی کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی ایک اصطلاح ہے جب کہ مسجد کو ایوان حکومت اور چیمبر کا مقام حاصل ہے

آیئے صلوٰۃ کی نسبت سے اب' جنہیں ہم مساجد کہتے ہیں۔میں عرض کردوں کہ قرآنِ کریم کی رو سے دین ایک نظام ہے جس میں خدا کے اصول و اقدار کے سامنے جھکا جاتا ہے۔پہلی چیز یہ سمجھ لیجیے۔اس کی ہی ایک محسوس شکل ہے جسے سجدہ کہا جاتا ہے۔بنیادی معنی سجدہ کے کسی کے سامنے جھک جانا ہے' سرِ تسلیم خم کر دینا' اطاعت اختیار کر لینا۔اسی کو کہتے ہیں سجدہ ریزی۔وہ مقامات مسجد دو معنی میں آجائے گا۔عربی زبان کی رو سے بھی ایسا کرنا' وہ بھی اس میں آجائے گا اور وہ مقامات کہ جہاں یہ چیزیں کرنے کے لیے تعلیم و تلقین و تشکیل و تقویم کی جائے۔اس نظامِ مملکت کے تمام شعبے جہاں امت کو امتِ واحدہ رکھنے کے لیے' نوعِ انسانی کو عالمگیر بنانے کے لیے جو کچھ بھی آپ یہاں کریں گے۔یہ ایوانِ حکومت' یہ مقنّنہ' یہ چیمبرز' یہ نظام پورے کا پورا ان میں سے ہر جگہ' ہر مقام جہاں اس نظامِ وحدت کی عملی تشکیل ہوگی' وہ مسجد ہوگی۔یہ کچھ کرنا صلوٰۃ ہوگا۔اس کی ایک عملی شکل چھوٹے سے پیمانے پر وہ ہے جسے آپ مخصوص عمارت جسے آپ مسجد کہتے ہیں' اُس مسجد کے اندر' جسے اب نماز کہا جاتا ہے' یہ تو عربی زبان کا بھی لفظ نہیں ہے یہ بہرحال یہ جو شکل اجتماعات کی ہے مسلمانوں کی یہ اسی کی ایک سمٹی ہوئی شکل ہے' اسی کی یاددہانی کے لیے ایک شکل ہے اجتماعات جو ہیں نماز کے۔اب یہ جو چیز ہے جہاں وہ اجتماعات منعقد ہوتے ہیں' اُسے مسجد کہا جاتا ہے۔

مساجد میں اجتماعات کے بنیادی مقصد کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ

ٹھیک ہے۔کاہے کے لیے ہیں؟ یہ سارا کچھ کاہے کے لیے ہے؟ امتِ واحدہ بنانے کے لیے۔یہ امتِ واحدہ کاہے کے لیے بنتی ہے؟ انسانیت کو عالمگیر برادری بنانے کے لیے۔اگر اس سے اس نظام میں جو کچھ بھی یہ کاروبار کرتے ہیں کوئی چیز بھی ان کے اندر ایسی آگئی کہ ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا تو سارا نظام بنیاد سے اکھڑ گیا۔نہ ان کا رسول سے واسطہ رہا' نہ خدا سے واسطہ' نہ دین سے تعلق

رہا۔ یہ کفر ہو گیا یہ شرک ہو گیا' یہ رسول اللہ سے کٹ گئے۔ اسی کے لیے یہ کہا تھا قرآنِ کریم نے کہ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (72:18) بڑی جامع آیت ہے۔ یاد رکھئے کہ مساجد صرف اس مقصد کے لیے وجود میں آتی ہیں' وحدت پیدا کرنے کے لیے۔ اور وہاں کہا تھا کہ یہ شرک ہو جائے گا۔

وحدتِ انسانیت کے پیشِ نظر مساجد اللہ کے نام کے علاوہ کسی دوسرے نام سے نہیں پکاری جائیں گی

فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (72:18) اس کے ساتھ اگر کسی اور کی طرف تم نے اپنی توجہ کر لی' شرک ہو گیا۔ مساجد محسوس طور پر خواہ وہ مقامات کہہ لیجیے' نظام کی مختلف شکلیں کہہ لیجیے' جو آئیڈیل دیا ہوا ہے اسے کہہ لیجیے' ان سب معنی کے لیے مسجد کا لفظ آئے گا۔ اور اس کے لیے اس نے کہہ دیا کہ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (72:18) یاد رکھو کوئی اور مقصد اس کے لیے نہیں ہے' صرف وہ ایک مقصد ہے جو خدا نے متعین کیا تھا: وحدتِ امت' وحدتِ انسانیت کے لیے۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کی طرف توجہ نہ پڑے' کسی اور کو مت پکارو۔ یہ دین میں فرقے کیسے پیدا ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں تو صدیوں سے مساجد کو امت وحدہ کے تصور کے برعکس مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے

کسی فرقے کو لے لیجیے ان کے عقیدہ اور ان کے مسلک کی انتہائی سند' کوئی نہ کوئی شخصیت ہو گی۔ علیٰ مذہبِ امام ابوحنیفہ' علیٰ مذہب امام مالک' علیٰ مذہب امام شافعی۔ یہ الفاظ ہیں آپ کے ہاں یہ حنفی یہ شافعی یہ مالکی یہ حنبلی۔ آگے اس چیز کو Cover-up کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ بہرحال ہم اہلِ سنت ہیں' سنتِ رسول اللہ ﷺ کے لیے ہیں۔ ٹھیک ہے جی۔ پوچھئے تو سہی حنفیوں سے کہ یہ اہلِ سنت نہیں ہیں؟ کیا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم سنتِ رسول اللہ ﷺ کے اوپر نہیں ہیں؟ شافعی سنتِ رسول اللہ ﷺ کا دعویٰ نہیں کرتے؟ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرے۔ ایک رسول کی سنت کے اوپر عمل کرنے والے یہ تمام مختلف نظر آئیں گے جن میں سے ہر ایک اس کا مدعی ہے۔ تو کیا رسول کی سنت اتنی اختلافی تھی کہ اس میں سے حنفی بھی بن سکتا ہے' شافعی بھی بن سکتا ہے' سنی بھی بن سکتا ہے' شیعہ بھی بن سکتا ہے۔ ایک ہی رسول یہ کچھ دے گیا تھا آپ کو؟ جس رسول سے یہ کہلوایا گیا کہ اگر اس امت نے' تمہارے ماننے والوں نے' باہمی فرقہ پیدا کیا' اختلاف کیا تو اے رسول تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ تو کیا رسول کی سنت ایسی تھی' رسول ایسی سنت دے گئے تھے کہ ہر فرقے کو اس سنت سے وجۂ جواز مل جائے' سند مل جائے۔ غور کرنے کی چیز ہے۔

مختلف فرقوں کی متضاد نظریاتی سوچ کا نتیجہ باہمی انتشار اور اُمت کی بربادی

اس رسول کی زبان سے یہ کہلوایا گیا تھا کہ ان سے کہہ دو کہ ھٰذِہٖ سَبِیۡلِیۡۤ (12:108) یہ ہے میرا ایک راستہ۔ اگر تم نے تفرقہ پیدا کر لیا سُبل اختیار کر لیے تو پھر یہ ایک راستہ تمہارے سامنے باقی نہیں رہے گا۔ تو یہ مختلف' سنت کے مختلف مدعی جتنے بھی چلے آ رہے ہیں جو مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں' وہ تو سبل پہ چل رہے ہیں' وہ سبیل تو ہے نہیں پھر۔ جس طرح سے قرآن نے کہا تھا خدا پر ایمان کے مدعی جب تفرقے میں بٹ جائیں گے' تو مشرک ہو جائیں گے اور ان میں ہر ایک مگن ہوگا اپنے اپنے طریقے پہ۔ حالانکہ کوئی بھی خدا کے طریقے پہ نہیں رہے گا۔ اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مدعی مختلف طریقوں پہ چل رہے ہیں تو ان میں سے کوئی بھی سنتِ رسول اللہ ﷺ کے اوپر نہیں ہو سکتا۔

اعتراف حقیقت کی بجائے مکاتب فکر کے نام پر ایک نئی چال' ایک نئی گمراہی

عزیزانِ من! اتنی صاف اور واضح باتیں ہیں۔ لیکن کس میں جرأت ہے اس چیز کی کہ اس کا اعتراف کرنے کے بعد یہ کہے کہ ہاں صاحب اس حالت کے اندر تو ہمارا تعلق باقی نہیں رہتا۔ نہ خدا سے' نہ اس کے رسول سے نہ اس کی کتاب سے' نہ اس کے دین سے۔ یہ وجہ ہے کہ آپ ساری عمر وعظیں ان کی سنتے آئے ہونگے۔ یہ آیات جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں کہ دین میں فرقے پیدا کرنا کفر اور شرک ہے' رسول سے کوئی واسطہ نہیں رہتا' خدا سے نہیں رہتا' کسی وعظ میں یہ آیتیں نہیں آئیں گی آپ کے سامنے۔ اب یہ جو اس مقام سے قرآنِ کریم کی یہ آواز اٹھ رہی ہے اس فضا کے اندر' جب یہ آیتیں گونجتیں۔ چالیس سال سے ان آیتوں کو میں نقل کیے جا رہا ہوں۔ قرآنِ کریم کی آیتیں ہیں عزیزانِ من! میرا اپنا تو کچھ نہیں ہے۔

بوقت اذان مختلف مساجد کی طرف مختلف مکاتب فکر کی سمت بھاگ دوڑ کا منظر

تو آپ کو معلوم ہے اس کے بعد کیا کہا گیا۔ یہ فریبِ نفس: کہ جی یہ فرقے نہیں ہیں' یہ مکاتبِ فکر ہیں۔ یہ رام داس نہیں عبدالرحمٰن ہے۔ چل بھئی۔ مکاتبِ فکر ہیں۔ یہ جو فکری مکاتب ہیں ان کا نقشہ ذرا دیکھئے۔ میں کئی دفعہ یہ کہا کرتا ہوں اچھے بھلے سارے بیٹھے ہوئے ہیں ایک مجمع میں' ایک بازار میں' انارکلی میں ہر جگہ' ٹھیک ہے بالکل۔ مختلف مکاتبِ فکر بھی ٹھیک ہے ہو سکتا ہے ان کے ہاں کا۔ اور ادھر سے اذان ہوئی یہ مختلف فکری مکاتب والے مختلف سمت کی طرف بھاگے۔ اور ایک اذان پہ ہی نہیں ہے اذانوں کے اندر ان کو پتہ ہے کہ یہ اذان ہوئی اُنہوں نے کہا کہ چلو' اُنہوں نے کہا کہ نہیں "اے اہلِ حدیث والیاں دی اے"۔ اذان بھی ان کے ہاں کی یہ اہلِ حدیث کی

اذان ہے صاحب ''آ آئی نا سنیاں دی واج'' یہ سنیوں کی ہے ''اے حنفیاں دی ہیگی اے''۔ اور اس اذان کی آواز پر یہ اِن افرنگ زدہ' ان مغرب زدہ کو چھوڑیے جنہوں نے نمازیں چھوڑ دیں' مذہب چھوڑ دیا' یہ تو پھر بھی اس مجمع میں اس بازار میں اکٹھے ہونگے۔ یہ جسے دین داروں نے اختیار کیا تھا' یہ سُبل کی طرف نکل جائیں گے کوئی اس طرف کوئی اُس طرف۔ یہ مکاتبِ فکر اسی کو کہتے ہیں؟ پچیس برس سے آپ چلا رہے ہیں کہ یہاں ایک قانون بنے گا ایک ضابطۂ قوانین جو سارے مسلمانوں کے اوپر لاگو ہوگا۔

ان الگ الگ مکاتب فکر والوں کی ''باہمی رفاقت'' کا تجزیہ

یہ جنہیں مکاتبِ فکر کہہ کے پکارتے ہیں اُنہوں نے یہ چیلنج کر رکھا ہے کہ تم فلاں فرقے کے مطابق قانون بناؤ' ہم قانون شکنی کریں گے اس کی' یہ مداخلت فی الدین ہے۔ مکاتبِ فکر بنائے ہوئے ہیں۔ او خدا کے لیے کچھ تو اس قسم کے فریب سے باہر آؤ' کیا جواب دو گے خدا کو کیا' جواب دو گے خدا کی اس کتاب کو۔ فرقہ اور کیا ہوتا ہے۔ عقائد میں اختلاف' روز سر پھٹول ان کی ہوتی ہے' عمل میں اختلاف' نماز میں اختلاف' فقہ میں اختلاف' شریعت میں اختلاف' الگ الگ فیصلے ان کے ہاں کی شریعت کے ہوتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کے اندر۔ او پھر یہ دین کس طرح باقی رہتا ہے۔ یہ اگر فکر کا اختلاف ہے تو پھر وہ دین کا اشتراک کہاں آتا ہے آپ کے ہاں۔ عزیزانِ من! اس خود فریبی سے کام نہیں چلتا۔ آپ نے دیکھا کہ اس خود فریبی کے بعد بھی جو قرآن نے کہا تھا کہ عذاب میں مبتلا ہو گے اگر یہ کچھ کیا۔ اس عذاب میں فرق آتا ہے یہ کہہ دینے سے کہ مکاتبِ فکر ہیں' یہ مختلف فرقے نہیں ہیں؟

نماز پڑھنے کے دوران باہمی اختلافات کے محسوس نشانات

اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ(30:31) اقامتِ صلوٰۃ جس کی وجہ سے اس نے کہا تھا کہ وحدت قائم رہے گی۔ اب آپ کے ہاں کی یہی اقامتِ صلوٰۃ جو ہے جسے آپ کہتے ہیں نماز پڑھنا' محسوس طور پر آپ میں اختلاف کی نشانی بنی ہوئی ہے۔ یہ نمازی جس وقت جاتا ہے مختلف مسجدوں کے اندر' یہ ملحد اور بے دین تو پھر بھی اکٹھے تھے اور اس کے بعد بھی یہ اکٹھے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاں کے دیندار اور یہ ماننے والے یہ سُبل اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہی صلوٰۃ جسے اس نے کہا تھا کہ تمہیں شرک سے بچائے گی' وہ صلوٰۃ آپ کے ہاں کی محسوس چیز ہو گئی ہے آپ کو شرک میں مبتلا کرنے کی۔ وہی مساجد جس کے لیے اُس نے کہا تھا کہ یہ للہ رہیں گی' وہ مساجد آپ کے ان فرقوں کی آماجگاہیں بن گئی ہوئی ہیں۔ اور یہ ہے وہ آیت جہاں سے شروع ہوتا ہے آج کا ہمارا درس۔

دورِنبوت میں مسجد ضرار کی تعمیر پر وحی خداوندی کا نزول

بات چلی آ رہی تھی ان منافقین سے۔ کیا کرتے تھے وہ آ کر؟ اس امت کے اندر اختلاف پیدا کرتے تھے' افتراق پیدا کرتے تھے اس امت کے اندر۔ کیا کیا تھا اُنہوں نے؟ یہ لوگ مسجد میں جاتے ہیں یہاں گرجا بنایا جائے۔ اس میں تو اختلاف ہو جائے گا نا پیدا۔ لیکن اس اختلاف میں فریب دہی تو نہیں رہے گی گرجا گرجا ہے' مسجد مسجد ہے۔ ہر ایک کو پتہ ہے کہ یہ عیسائی ہیں یہ مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کے اندر اختلاف تو اس سے نہیں پیدا ہوتا۔ مندر بننے سے نہیں ہوتا' گرجے بنانے سے نہیں ہوتا۔ کس چیز سے ہوگا؟ مسجد اور بنا دو۔ تو یہ آج کی بات نہیں اُسی دور کے منافقین نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس امت کے اندر افتراق جب پیدا کیا جائے گا تو مختلف گرجے اور مندر اور صومعے اور یہ چیزیں بنانے سے نہیں ہوگا۔ اس کے اندر اختلاف کی شکل یہ ہے کہ مسجدیں ہی بناؤ۔ چنانچہ انہوں نے اس کی ابتداء کر دی۔ اُنہوں نے اس کی اینٹ رکھی اور اس للکارنے والے نے اسی وقت للکار دیا کہ اس فریب میں نہ آ جانا کہ مسجد بن رہی ہے۔ کہا کہ وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا (9:107) کہا کہ یہ لوگ جنہوں نے یہ مسجد بنا لی ہے اس مقصد کے لیے۔ اب الفاظ دیکھئے عزیزانِ من! ضِرَارًا (9:107) دین کو نقصان پہنچانے کے لیے مسجد۔ مندر نہیں' گرجا نہیں' سینما گھر' نہیں شراب خانہ نہیں' مسجد بنا دی۔ کاہے کے لیے مسجد بنا دی؟ ضِرَارًا سخت نقصان پہنچانے کے لیے تمہاری وحدت کو۔ مسجد کاہے کے لیے بنا دی وَّكُفْرًا (9:107) کفر کے لیے۔ کبھی ذہن میں بھی آتا ہے کسی کے لیے' کبھی سنا بھی ہے کافروں کی مسجد۔ یہ تو قرآن ہے۔ یہاں تک پھر بھی بات میں کوئڈ انٹر پریٹیشن جسے کہتے ہیں تعبیر کا اختلاف ہوسکتا تھا صاحب۔ وہ تو چھوڑتا ہی نہیں ہے۔ یہ کیا چیز تھی ضِرَارًا (9:107) دین کی بنیادیں ہلانے والی کیا چیز تھی جسے کہا ہے کفر کی مسجد' کفر کے لیے مسجد کیا چیز تھی۔ وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (9:107) بھاگئے کہاں بھاگتے ہیں آپ۔ کہا امت کے اندر تفرقہ پیدا کرنے کے لیے۔ تو سازش تو یہی ہوگا نا عزیزانِ من! کہ مسجد بنا کے اس میں تفرقہ پیدا کرو۔ مندر بنا کے تو تفریق بین المؤمنین نہیں ہوگی جو مندر میں چلا جائے گا' وہ تو اس امت کے اندر کا رہے گا ہی نہیں' وہ دعویٰ ہی نہیں کر سکے گا جرأت ہی نہیں اس کو ہو سکے گی' مانے گا ہی کوئی نہیں۔ کرو اس طرح سے کہ بلند ترین نیکی کا کام اسے قرار دو' جنت میں موتیوں کا محل۔ کوئی نہ کہے اس چیز کو کہ یہ کافروں کی عبادت گاہ ہے' کوئی اس کا دوسرا نام ہی نہ رکھے اسے گرجا نہ۔ کیا بات ہے صاحب سازش کی۔ مسجد بنا دی۔ کہا مسجد ہے ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (9:107) جماعت میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے ہے۔ صحیح طریقہ یہ تھا سازش کا کہ مسجد بنا لو۔ اور آگے بڑھیے صاحب۔ کہتا ہے مسجد ہے یہ۔

خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کی طرف سے مسجدِ ضرار کی تعمیر کی سازش قرآن حکیم کی روشنی میں

اِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ مِنۡ قَبۡلُ (9:107) وہ تمام لوگ جو خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کے لیے پناہ گاہ بن رہی ہے۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر۔ افوہ۔ پناہ گاہ بن رہی ہے ان کے لیے۔ اس سے بڑا جرم بھی کوئی اور ہوسکتا ہے عزیزانِ من! ۔ غیر مسلم بھی اس دنیا میں رہتے ہیں' مملکتِ اسلامیہ میں بھی رہتے ہیں' خود مدینے کی مملکت کے اندر بھی یہ غیر مسلم' یہ عیسائی یہ یہودی' یہ مجوسی یہ رہتے تھے سارے۔ ان کو وہاں رکھا جاتا تھا' امن دیا جاتا تھا' ذمہ داریاں دی جاتی تھیں' ان کی حفاظت کی جاتی تھی۔ لیکن ان میں سے جو مملکت کے خلاف بغاوت کرتا تھا' اعلانِ جنگ کرتا تھا اس کے خلاف بہر حال پھر مملکت ہوتی تھی' ان کو وہاں سے نکالنا بھی پڑتا تھا۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کہا ہے کہ وہ جو مملکت یا اسلام کے خلاف بغاوت کرنے والے ہیں یہ ان کی پناہ گاہ ہے۔ ٹھیک ہے جو اس طرح سے باغی ہوجائیں' مرتد ہوجائیں' عیسائی ہوجائیں' اعلانِ جنگ کردیں۔ ان کا تو آپ کہہ سکیں گے کہ ان کے خلاف جنگ کرو' ان کو نکال دو۔ یہ جو مسجد کے اندر مسلمان کی حیثیت سے آکے بیٹھیں اور نماز پڑھنے لگیں کیا کریں ان کو جناب۔ آپ کو پتہ ہے یہ جو چیز کہی جارہی ہے کہ صاحب خدا کو بھی کوئی چھوڑ دے' کوئی رسول کو بھی چھوڑ دے' کوئی نئی امت بن جائے' کوئی نیا نبی دھار لے' یہ سارا کچھ ہے۔ کہا جارہا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی آپ یہ نہ کہیۓ دائرہ اسلام سے خارج ہوگیا ہے۔ کیوں جی؟ کہ جی وہ امام اعظمؒ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ جتنے بھی اہلِ قبلہ ہیں وہ سارے مسلمان ہیں یعنی قبلے کی طرف منہ کرنے والے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرتِ امامؒ کا یہ قول ہوسکتا ہے امام اعظمؒ بہت بلند انسان تھے' مجھے معلوم ہے ان کی ذہنیت' بڑے قرآنی آدمی تھے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کہا یہ جارہا ہے کہ قبلہ مشترک اگر ہو' قبلے کی طرف منہ کرنے والے جو ہیں' انہیں یہ نہ کہو۔ آپ تو کہہ رہے ہیں قبلے کی طرف منہ کرنے والے' یہ تو مسجد بنائی ہوئی ہے انہوں نے' مسجد کے اندر جا کے نماز پڑھنے والے لوگ ہیں' ان سے کہا گیا ہے کہ یہ وہ ہیں جو خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے والوں کی پناہ گاہ ہے' کفر ہے' تفریق بین المؤمنین ہے مسجد۔ اشتراکِ قبلہ کیا ہوتا ہے؟ ایک مرکز۔

اِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ مِنۡ قَبۡلُ (9:107) اس سے پہلے جو جنگ کی کیفیت اپنے قلوب میں رکھتے تھے اس نظام کے خلاف ان کو کہیں پناہ گاہ نہیں ملتی تھی یہ پناہ گاہ مل گئی ان کو یہ بنانے کے بعد۔

ایک ہی محلے میں مسجد کے مقابل دوسری مسجد کی تعمیر آخر کیوں؟

تَفۡرِیۡقًۢا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (9:107) عزیزانِ من! یہ ہے مرکزی خیال اس کے اندر۔ کہا پھر کیفیت یہ ہے وَ لَیَحۡلِفُنَّ اِنۡ

اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی (9:107)ان سے جب پوچھو گے کہ کیا کر رہے ہو۔قسمیں کھا کھا کے کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بڑا نیک ہے مسجد بنا رہے ہیں۔اس میں بھی کوئی برائی کی بات ہے؟ کبھی کسی نے آج تک یہ کسی کے منہ سے سنا ہے کہ مسجد بنا رہے ہیں کوئی برائی کی بات ہے۔حنفیوں کے محلے کے اندر مسجد موجود ہے اتنی بڑی کہ سارے اہلِ محلّہ بھی آ جائیں جب بھی اس میں گنجائش باقی رہتی ہے۔ایک اور مسجد اٹھ رہی ہے۔یہ مسجد کاہے کے لیے اب دوسری بن رہی ہے؟ اس نے کہا بن کیا رہی ہے آپ دیکھتے ہیں وہ یہاں ہاتھ رکھ کے نماز پڑھنے والے سارے کے سارے' سب کی نمازیں باطل ہو جاتی ہیں۔یہ مسجد صحیح نماز پڑھانے کے لیے الحمدللہ بنائی جا رہی ہے۔قسمیں کھائیں گے اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی (9:107) قسمیں کھائیں گے ہماری نیت بڑی نیک ہے صاحب' صحیح نمازیں پڑھنے والوں کے لیے ہم بنا رہے ہیں یہ مسجد۔ہرنئی مسجد تفریقاً بین المؤمنین کے لیے ایک نیا اڈہ ہے' ہر مسجد بنانے والا قسمیں کھا کے کہے گا کہ ہم تو نیک کام کر رہے ہیں۔روکیے تو۔جس زمین پہ چاہے ان کے دولوٹے دو اینٹیں انہوں نے رکھیں اللہ اکبر کہا اور اس کے بعد کسی کی ہمت نہیں ہے وہاں سے ان کو اٹھائے۔کسی کی ہو' کسی مقصد کے لیے رکھی ہوئی ہو' حکومت نے کسی مقصد کے لیے رکھی ہوئی ہو' کسی کی ذاتی ہو۔یہاں تو یہ چیزیں تھی۔یہ ہندو چھوڑ گئے ہوئے تھے۔کچھ بھی ہو سوال ہی نہیں ہے۔یعنی آپ حکومت کی کسی زمین کے اوپر ایک انچ کی Emplacement اگر کر لیں۔کمیٹی والے آ جاتے ہیں دس برس کے بعد کہ یہاں تمہاری دیوار اٹھی ہے' یہ ماپ کے دیکھئے ایک انچ یا دو یا ایک فٹ۔حکومت کی زمین پر Emplacement آپ نے کر لی ہے۔قانون یہ ہے کہ بلڈنگ مسمار کی جا سکتی ہے' وہ عمارت ڈھائی جا سکتی ہے کہ اس زمین پہ Emplacement ہے۔پوری کی پوری زمین کے اوپر مسجد بنا دیجیے۔جتنی یہ مسجدیں بن رہی ہیں ان میں سے کسی سے پوچھئے کہ مسجد کی زمین خریدی ہے ان میں سے کسی نے۔

مسجدِ ضرار بنانے والوں کے متعلق قرآن حکیم کا بیان

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ قسمیں کھائیں گے کہ ہماری نیت نیک ہے مسجد بنا رہے ہیں۔اور کوئی Question نہیں کرتا مسجد بنانے والوں کے متعلق۔یہاں قرآن دیکھئے کہاں تک لے جاتا ہے۔مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی (9:107) کہا یہ قسمیں کھا رہے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو بالکل نیک ارادہ ہے۔یہ قسمیں اٹھا رہے ہیں اور مقابلے میں وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (9:107) عدالت میں گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا خدا کہہ رہا ہے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ یہ پکے جھوٹے ہیں کم بخت۔یعنی انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہمارا ارادہ نیک ہے' نیت نیک ہے۔اس پہ یہ کہا ہے کہ یہ پکے جھوٹے ہیں۔سوال ہی نہیں۔جو تفریقاً بین المؤمنین پیدا کرنے کا ذریعہ بنے وہ نیک ارادہ کیسے ہو سکتا ہے وہ مسجد کیسے ہو سکتی ہے۔خدا نے ان کے متعلق تو یہ کہا۔وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (9:107) عربی جاننے والے جانتے

ہیں کیا بات کہہ گیا ہے۔ ان سے نہیں کہا کہ رسول تم بھی جانتے ہو مؤمنین سے نہیں کہا کہ تم بھی جانتے ہو۔ جرم اتنا سنگین ہے مقدمہ اتنا بھاری ہے دعویٰ اتنا بڑا ہے کہ اس کی تردید کے لیے جو گواہ ہے آسمان سے بلایا گیا ہے وہ گواہ خود خدا کہتا ہے کہ ہم گواہی دیتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں جو یہ کہتے ہیں۔ مسجد نہیں بنا رہے کوئی نیکی کا ارادہ اس کے اندر شامل نہیں ہے۔ کوئی شے بھی جو تفریق بین المؤمنین کے لیے بنائی جائے اس میں نیک ارادہ شامل ہوسکتا ہے؟ ہم گواہی دیتے ہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔ یہ گواہی دی اور اس کے بعد۔ رسول اللہ ﷺ تھے جو دوسری طرف کے نمائندہ تھے۔ گواہی دینے کے بعد حکم دیا کہ اے رسول لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا (9:108) اے رسول! ایک قدم نہ رکھنا اس کے اندر ابدًا کبھی نہ رکھنا اس کے اندر۔ کہا تھا کہ جو تفرقہ پیدا کرلے دین میں اے رسول لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (6:159) تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ تو اگر اس تفرقے کے لیے مسجد بنا لیتے ہیں تو اس مسجد کے ساتھ کیا واسطہ ہے رسول کا۔ نہ اس مسجد کا واسطہ خدا سے نہ مسجد بنانے والوں کا واسطہ رسول سے۔ عزیزانِ من! یہ بے نمازی یہ فرنگ زدہ مغرب زدہ لوگوں کی جماعت نہیں ہے مسجد بنانے والوں کی ہے جو ایمان کی قسمیں اٹھا رہے ہیں کہ نہیں یہ تو نماز کے لیے بنائی ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے۔ خدا گواہی دیتا ہے جھوٹے ہیں۔ رسول سے کہا جا رہا ہے اس مسجد میں قدم نہ رکھنا باہر نماز پڑھ لینا اگر پڑھنی ہو۔ لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا (9:108)۔

جس مسجد کی بنیاد وحدتِ ملت پر نہیں خدا تعالیٰ اسے کسی صورت پسند نہیں کرتا

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ (9:108) مسجد کی بنیاد قوانینِ خداوندی کی نگہداشت پہ ہونی چاہئے جس کا عملی مظاہرہ وحدتِ ملت میں ہونا چاہئے وحدتِ امت کے اندر ہونا چاہیے۔ جو مسجد تفریق بین المؤمنین کے لیے ہے اس کا تقویٰ سے کیا تعلق ہے۔ اُسِّسَ اس کی بنیاد غلط ہے بنیاد تقویٰ کے اوپر نہیں ہے۔ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا (9:108) یہاں وہ لوگ جاتے ہیں جو اختلاف و افتراقات کے تمام خیالات کو دماغ سے نکال کے نہایت پاکیزگی کے ساتھ ایک خدا کے مرکز پہ جمع ہونے کے لیے جاتے ہیں۔ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ (9:108) یہ ہیں جن کو اللہ پسند کرتا ہے۔ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ (9:109) سوچو تو سہی۔

مسجد کی عمارت کی بجائے اس کی بنیاد پر نگاہ ڈالنا ہوگی

اب دونوں کا تقابل آرہا ہے۔ بات کیا عجیب قرآن بتا رہا ہے۔ مسجدوں کی شکل تو سب کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ حنفیوں کے مقابل میں اس جو اہلِ حدیث نے بنائی تھی باہر سے آپ دیکھیں گے کوئی فرق نظر آتا ہے ان میں؟ ایک جیسی عمارت ہوتی ہے۔ بلکہ مسجد کی عمارت تو ذرا سا مینار کا فرق انہوں نے کیا وہ جو مسجد شہداء جسے کہتے ہیں اس میں ذرا انداز بدل دیا ہے ترکی جیسا ذرا

مخروطی سا بنایا ہے۔ مقدمہ دائر کر دیا کہ یہ الگ قسم کی بنا رہے ہیں۔ لیکن عزیزانِ من! حنفیوں کے محلے میں کوئی اہلِ حدیث' اہلِ حدیث کے محلے میں جب یہ حنفی مسجد بناتا ہے' کوئی اعتراض نہیں اس کے اوپر ہوتا' وہ الگ نہیں ہے۔ کیوں؟ شکل تو مسجد جیسی ہے نا۔ اب شکل کے اوپر ساری بات آ گئی۔ حالانکہ اس کے اوپر تو نہیں انہوں نے لکھا تھا کہ یہ حنفی کے لئے' یہ اہلِ حدیث کے لیے ہے۔ آ گئی وہی بات کہ وضع قطع تراش خراش یہ رہ گئے اسلام کا نشان۔ مسجد کی شکل ہونی چاہئے۔ اس لیے قرآن نے کیا کہا **لَمَسۡجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقۡوٰى** (9:108) فقط عمارت ہی نہ دیکھ لینا کہ یہ بھی تو ویسی ہے جیسی مسجدِ نبوی ﷺ بنی ہوئی ہے۔ کہا ذرا بنیاد میں جھانک کے دیکھنا کہ بنیادیں کس چیز پہ اٹھی ہوئی ہیں۔ اور بنیاد ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے۔ بنیاد پہ اٹھی ہوئی عمارت نظر آتی ہے آپ کو۔ کہا بنیاد دیکھو تم مسجد کو نہ دیکھو کہ مسجد جیسی شکل وصورت ہے اس کی۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وضع قطع میں فرق اور پھر نماز کی ادائیگی میں فرق

جب مسجد جیسی شکل وصورت ہے تو نمازیوں کی شکل وصورت بھی باقی نمازیوں جیسی ہوئی' ان کی نماز کی وضع قطع بھی وہی ہوئی۔ وضع قطع تو پھر بعد میں آ کے بدلی ہے۔ اس زمانے والے ایسے نہیں تھے۔ وہ وہیں وضع قطع بدل لیتے' تو اسی سے پکڑے جاتے کہ ٹھیک ہے کہتے تھے مسجد بنائی ہے' نماز کس قسم کی پڑھ رہے ہو۔ پہلے یہ مسجد اس قسم کی بنائی' وضع قطع وہی رکھی پھر آہستہ آہستہ اس نماز کے اندر بھی تھوڑا تھوڑا سا فرق پیدا ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کے زمانے کو ڈھیروں ہو گیا وقت۔ اور یہ کہنے کی گنجائش نکل آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے پڑھی تھی جیسے ہم پڑھتے ہیں۔ اُس نے کہا نہیں ویسے پڑھی تھی جیسے ہم پڑھتے ہیں۔ تو اس زمانے میں تو ایسا نہیں ہوا ہوگا اگر اس میں کوئی نماز پڑھتے بھی ہونگے تو نماز میں انہوں نے فرق نہیں کیا ہوگا۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ اس کی بنیاد پہ نگاہ رکھو۔ اوپر سٹرکچر تو بالکل ویسا بنا دیں گے یہ۔ بڑے گہرے سازشی ہیں۔ سارے اسلام کا سٹرکچر عزیزانِ من! یہ الگ بنا ہوا ہے۔ بنیاد کے اوپر نگاہ رکھو۔ کہا کہ وہ ایک مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پہ ہے۔ **اَمۡ مَّنۡ اَسَّسَ بُنۡيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانۡهَارَ بِهٖ فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ** (9:109) اور ایک اس کے بعد یہ عمارت کھڑی کر رہے ہیں اتنی بڑی' کس چیز پہ کھڑی کر رہے ہیں؟ ریت کے اوپر' ریت بھی کہیں کوئی صحرا والی نہیں ہے کہ دور دور تک کوئی ایسے خدشہ خطرہ نہ ہو۔

فرقہ واریت پر تعمیر ہونے والی مسجد کی بنیاد دریا کے کنارے ریت پر رکھی جاتی ہے

دریا کے کنارے پہ۔ لفظ یہ ہے (**شَفَا جُرُفٍ**) (9:109) " کنارہ جنوں ڈھالگی ہوئی ہووے" یہ اسے کہتے ہیں۔ جو اوپر سے ویسے ہی رہا کرتا ہے اندر ہی اندر وہ دریا یوں کرتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر کسی ایک دن یا ایک رات میں چپکے سے سب گڑم ہو جاتا ہے۔ کہا کہ

مسجد ہے ٹھیک ہے بڑی مضبوط عمارت بنائیں گے۔ ذرا بنیاد تو دیکھئے کس چیز پہ رکھی ہوئی ہے۔ سمجھانے کی خاطر تفریقِ بین المومنین کی بنیاد ریتلی زمین دریا کے کنارے پہ دریا وہ کہ زمین کے اندر ہی اندر جس کی موجیں اسے کھوکھلا کیے جا رہی ہیں۔ ہمارے ہاں اس کو کہتے ہیں ڈھالائی ہوئی ہے' ڈھا کے معنی اس کو گرا دینا ہوتا ہے' ڈھے گئی جسے ہم کہتے ہیں اردو میں بھی۔ دریا بھی وہ کہ جس میں یہ ڈھے لگائی ہوئی ہے' ریتلی زمین دریا نیچے سے بہہ رہا ہے جس میں ڈھے لگائی ہوئی ہے۔ کہا کہ پھر ہو گا کیا ایک دن؟ مسجد بمعہ نمازیوں کے **فَانۡهَارَ بِهٖ فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ** (9:109) پوری کی پوری جہنم کے اندر جا کے گر جائے گی۔ **وَ اللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ** (9:109) اس قدر ظالم قوم ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ظالم کے معنی کیا ہوتے ہیں' جس چیز کو جس مقام پہ ہونا ہو وہ نہ ہو۔ شکل وصورت وہی ہے مسجد' مسجد نہیں ہے۔

مسجد کا مقام اور اس کی عظمت توامت واحدہ کے تصور کے ساتھ مشروط ہے

مسجد کا مقام یہ تھا امت میں وحدت پیدا کرنے کی چیز تھی۔ **لَا يَزَالُ بُنۡيَانُهُمُ الَّذِىۡ بَنَوۡا رِيۡبَةً فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلَّاۤ اَنۡ تَقَطَّعَ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ** (9:110) کہا اس قسم کی مسجد ٹھیک ہے' ذرا اتحاد اور وحدت پیدا کرنے والوں کے دلوں کے اندر بھی جھانک کے دیکھئے۔ عزیزانِ من! جس کا مقصد اختلاف مٹا کے وحدت پیدا کرنا ہوتا ہے' خواہ کتنے ہی چھوٹے پیمانے کے اوپر ہو آپ دیکھیں گے کہ اس کے دل میں نفرت' حسد' دشمنی برائی گالی گلوچ' یہ کچھ نہیں ہوتا۔ بڑا سکون ہوتا ہے اس کے اندر۔ اور اس کے مقابلے میں یہ بنا رہے ہیں مسجد' مقصد یہ ہے کہ تفریق بین المومنین ہو' ڈھے جائے کسی طرح سے یہ دین کی عمارت ان کی۔ ان سازشوں میں لگے ہوئے ہیں۔ کہا جیسے وہ مسجد علی مسجد جیسی' ویسے ہی ان کی یہ شکل وصورت ان کی یہ نمازیں اور یہ چیزیں بھی تمہارے جیسی ہیں۔

فرقہ واریت پر تعمیر ہونے والی مسجد کی بنیاد دریا کے کنارے ریت پر رکھی جاتی ہے

وہاں ہم نے کہا تھا بنیاد میں جھانک کے دیکھو' ہم یہاں کہہ رہے ہیں ذرا ان کے دل میں جھانک کے دیکھئے کس طرح سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ (ریبۃً) اضطراب۔ تم پنپ رہے ہو' کامیاب ہو رہے ہو' ان کے دل پہ برچھیاں چل رہی ہیں۔ **تَقَطَّعَ قُلُوۡبُهُمۡ** (9:110) قلب وجگر کے ٹکڑے ہو رہے ہیں ان کے۔ **وَ اللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ** (9:110) یہ جاننے والا خدا کہہ رہا ہے یہ حکمت والا خدا کہہ رہا ہے۔ دھاندلی والا خدا نہیں' جذباتی خدا نہیں کہہ رہا' علم وحکمت پہ مبنی ہے۔ آپ نے دیکھا عزیزانِ من! دین کے اندر۔

وحدت انسانیت کے تصور کے تحت امت واحدہ کی تشکیل ہی دین کی بنیاد ہے

میں نے کوشش کی ہے کہ مختصر وقت میں ایک درس میں دونوں چیزیں سامنے آ جائیں۔ مقصد دین کا وحدتِ انسانیت ہے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک امتِ واحدہ کی تشکیل ہے۔ اس کی بنیاد ایک خدا کے قانون کا اتباع۔ محسوس طور پر ایک مرکز امت کا جو رسول

ﷺ کی زندگی میں رسول ﷺ، آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے جانشیں۔ اقامتِ صلوٰۃ وحدت کا عملی نمونہ۔ مساجد ان کے مظاہر اس قسم کے۔ یہ دین۔ اس کے خلاف اس دین میں کسی قسم کا فرقہ پیدا کرنے کا، قرآن کی رو سے پھر خدا کے راستے گم، یہ کفر ہے یہ شرک ہے۔ اور اس میں شکل وصورت کے اعتبار سے خواہ وہ مسجد تک کیوں نہ ہو، نمازیں بھی کیوں نہ اسی قسم کی ہوں۔ یہ ساری چیزیں امت کو عذاب میں مبتلا کرنے کی چیز ہے۔ اور اس کے بعد جہنم میں گر جانے والی چیز ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کی آیات۔

اُمت واحدہ کے تصور کے برعکس فرقہ واریت پر مبنی سوچ شرک اور جہنم کو دعوت دیتے ہوئے خدائے علیم وخبیر کو فریب دینا ہے

میں پوچھتا یہ ہوں کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلام آ بھی سکتا ہے اس قوم کے اندر؟ یہ جمع بین نقیضین جسے کہتے ہیں یہ Opposite چیزوں کا یکجا کرنا یہ ممکن بھی ہے؟ یہ چھوٹے موٹے گناہ یا لغزشیں نہیں جو قرآن کہہ رہا ہے، قرآن کفر کہہ رہا ہے، قرآن شرک کہہ رہا ہے، قرآن جہنم کہہ رہا ہے۔ مسجد کو کہہ رہا ہے کہ جہنم میں لے ڈوبے گی۔ کیا اس قسم کے کفر اور شرک اور تفریق اور اعلانِ جنگ خدا اور رسول کے خلاف یہ سارا کچھ موجود ہوتے ہوئے، دین اسلام میں وحدت آ بھی سکتی ہے؟ ایک ہی قوم کے اندر دو چیزیں جمع ہو جائیں؟۔ کہ جی وہ تو اب اتنے گہرے ہو گئے ہیں، یہ پیدا ہو گئے ہیں، یہ تو نہیں جا سکتے۔ ٹھیک ہے کہو نہیں جا سکتے، ملوں نہ ختم کردو، فقرہ مکمل کرو، یہ نہیں جا سکتے اس لیے اسلام تو ہم میں نہیں آ سکتا۔ یہ اگلا ٹکڑا نہیں کہیں گے۔ لیکن کیا اس کے نہ کہنے سے اسلام آ جائے گا، خدا کو فریب دے دو گے؟ وہ کہتا تھا کہ اس کا نتیجہ عذابِ عظیم ہوگا۔ کم ہو رہا ہے عذابِ عظیم آپ کے ہاں؟ بالکل سیدھی سی چیز ہے عزیزانِ من!۔ اور پھر مذہب ہو یا سیاست یہاں تو ثنویت پیدا کر دی نا۔ مذہبی فرقہ بندیاں ان کے خلاف سب کچھ، سیاسی پارٹیاں ان کی گنجائش Constitution تک کے اندر۔ یہ تفریق بین المؤمنین نہیں ہے؟

قرآنی فلسفہ حیات کے برعکس یورپ کے علاوہ پوری ملت اسلامیہ صدیوں سے سیکولرازم کے تحت مختلف قوموں کا گہوارہ بنی ہوتی ہے

یورپ میں یہ چیز تھی کہ مذہب کو الگ رکھیے۔ اور ٹھیک ہے مذہب کی رو سے وحدت بھی پیدا کرتے چلے جایئے، سیاسی پارٹیاں الگ ہونگی۔ سیاسی پارٹیوں کو چھوڑ دیجیے عزیزانِ من! آگے بات چلایئے۔ پوری امت آپ کی مختلف قوموں میں بٹی ہوئی ہے۔ وطنیت کے اعتبار سے، جغرافیائی باؤنڈریز کے اعتبار سے، نسلی اعتبار سے۔ یہ عرب قوم، یہ افغان قوم، ایران قوم، مختلف قوموں میں مسلمان بٹا ہوا ہے۔ یہ تفریق بین المؤمنین نہیں ہے؟ مختلف قوموں کی موجودگی میں یہ امت امتِ واحدہ بن سکتی ہے؟ کہتے یہ ہیں کہ صاحب مذہب کی

حیثیت سے آپ امت رہیے' سیاست کی حیثیت سے قوم بنئے۔کیا بات ہے امت اور قوم۔یہ وہی چیز ثنویت ہے کہ مذہب الگ چیز ہے' سیاست الگ چیز ہے۔مذہب کی رو سے امت ایک بن جائے۔وہ کہتے ہیں فرقہ بندی یہ جو ہے یہ امت میں تفرقہ پیدا کرتی ہے' یہ مٹانا ضروری ہے' یہ جو قومیتیں مختلف یا سیاسی پارٹیاں مختلف ہیں اس کا تعلق تو سیاست مملکت سلطنت سے ہے مذہب سے کیا واسطہ۔

حصول پاکستان کے دوقومی تصور کو مکمل طور پر نظر انداز کرنے کی سر توڑ کوشش

چلیے صاحب۔تفریق کی ہم بات کر رہے تھے' ذہن کا ذکر کیا یہاں سرہی غائب ہے۔سرے سے دین کا تصور ختم مذہب الگ' سیاست الگ قومیت الگ' امتیت الگ۔اور وہاں پھر بھی یہ تھا کہ ایک وطن ایک مملکت کے اندر تو ایک قوم بنا رہے تھے آپ۔یہاں ایک وطن کی چار دیواری کے اندر پھر مختلف چار قومیتیں۔کہا گیا کہ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ کہا ٹھیک ہے آپ امت ایک بناتے رہیے' علامہ صاحب بڑا مقدس مشن ہے آپ کا۔قومیتیں اور چیز ہوتی ہیں امت اور چیز ہوتی ہے۔وہ کس لیے ایک بنتی ہے پھر؟ نمازیں پڑھنے کے لیے۔قومیتیں الگ۔

بلا آخر نظریاتی طور پر مملکت پاکستان کو ہم نے پوری طرح سیکولر سٹیٹ بنا دیا

ایک وطن کے اندر پھر قومیں الگ' پھر ایک وطن کے اندر قومیتیں الگ' پارٹیاں الگ' مذہب میں فرقے الگ۔اور اس کے باوجود ہر ایک کا دعویٰ کہ ہم مسلمان ہیں۔وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَھُمۡ (2:9) دھوکہ دینا چاہتے ہیں خدا کو اور مؤمنین کو۔خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہے یہ۔اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔اگر مسلمان دین پہ آنا چاہتا ہے تو جب تک اس میں یہ جرأت پیدا نہیں ہوتی یہ کہنے کی کہ تفریق کے ہوتے ہوئے' اسلام نہیں آ سکتا' اسلام نہیں آ سکتا۔اور اگر یہ خود فریبی میں رہنا چاہتا ہے کہ تفریق باقی رہ سکتی ہے' اسلام کے لیے تو پھر عزیزانِ من! اسلام کسی اور جماعت کے اندر اور امت کے اندر اور قوم کے اندر آئے گا جو خدا کی اتباع میں رسول کو' ایک رسول مان کے' ایک امت بنے گی جس میں فرقہ نہیں ہوگا' پارٹیاں نہیں ہونگی' قومیتیں نہیں ہونگی۔وہ تو اسلام کو لے آئے گی' یہ اسلام کو نہیں لاسکیں گے۔ہم سورۃ التوبہ کی دو آیتیں لے سکے 111 آیت سے عزیزانِ من! ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

اٹھارہواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 111 تا 112)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1973 کی پہلی تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی 111 آیت سے ہو رہا ہے۔ (9:111)

قرآنِ حکیم کے بیان کردہ حقائق زندگی اگر بے مثل ہیں تو اس کا انداز بیان بھی لاثانی ہے

میں نے کسی سابقہ درس میں بھی یہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کا اسلوبِ بیان بھی قطع نظر اس کی معنوی انفرادیت اور اس کے انداز اور حقائق اور معارف اور پھر خود اس کا اسلوبِ بیان بھی بڑا ہی معجزانہ ہے۔ اور اس میں ایک چیز یہ بھی ہے کہ جب بھی وہ کسی موضوع کے کلائمکس پہ پہنچتا ہے' انتہا پہ پہنچتا ہے تو اس کے فوری بعد بالکل اس کی ضد لاتا ہے اور اس کی ابتداء انتہا سے کرتا ہے۔ لکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ یہ انداز کس قدر مؤثر ہوتا ہے' دل میں اتر جانے والا ہوتا ہے' نگاہوں کو روشنی بخشنے والا ہوتا ہے' مطالب کو کس طرح واضح کرتا ہےBy Contrast۔

مذہبی سطح پر زندگی گزارنے والوں کا طرزِ زندگی اور ان کی طرف سے پیش کردہ تاویلات کی نوعیت

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے پچھلی دو سورتوں سے جنگ کے سلسلہ میں مسلسل بیان چلا آتا ہے منافقین کا۔ یعنی ان لوگوں کا جو دین کو مذہب کی سطح پہ رکھ کے وہاں تک تو بالکل ٹھیک چلتے ہیں کہ اس میں نہ کوئی خطرہ ہوتا ہے' نہ کوئی ایثار اور قربانی ہوتی ہے۔ زبانی دعوے ہوتے ہیں کچھ الفاظ جن کو دہرا دیا کچھ حرکات وسکنات جن کے ادا کرنے کے بعد مطمئن ہو گئے کہ مذہب کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ اور

جب کبھی ایسے مواقع آئے جہاں فی الحقیقت اعلائے کلمۃ الحق کے لیے یعنی ان صداقتوں کے بلند کرنے' استحکام کے لیے جن پر ان کے ایمان کا دعویٰ ہے' کچھ بھی قربانی کرنی پڑے' ایثار کرنا پڑے۔ وہاں پھر یہ معذرتیں پیش کرتے ہیں۔ کفر کی طرح اعلانیہ انکار نہیں کرتے۔ اقرار تو رہتا ہے زبان سے لیکن اس کے لیے پھر معذرتیں پیش کرتے ہیں کہ وہ کچھ کرنا نہ پڑے۔ اسے قرآن منافقت قرار دیتا ہے۔ اور جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں قرآن سے جو یہ انداز ہوا ہے اس ہزار برس میں' وہ اس کی تاویلات کہی جاتی ہیں۔ تاویلات درحقیقت اس کے حقائق سے بچنے کے لیے گریز کی راہیں ہیں۔ وہی معذرتیں ہیں جنہیں قرآن یہ کہتا ہے کہ' کیوں نہیں کہتے کہ ہم کھلے طور پر کفر اختیار کرتے ہیں۔ وہ اس انداز سے چلا آ رہا تھا۔

ایک طرف تو مسجد کو گرایا جا رہا ہے اور دوسری طرف جان اور مال تک بیچ دیا جاتا ہے

اور ان کے ہاں کی بہت سی چیزیں ایک ایک کر کے پیش کرتا تھا کہ پھر وہ کلائمکس پہ آ گیا کہ اب انتہا ہو گئی ہے ان کی ریشہ دوانیوں' سازشوں' کمینگی کی کہ مسجد کھڑی کر دی ہے جس پہ کسی کو بظاہر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ بڑا نیکی کا کام صاحب۔ مسجد کی تعمیر جس کے بدلے میں بالکل لکھا لکھایا ہوا جنت میں ایک موتیوں کا محل مل جاتا ہے۔ مسجد تعمیر کر دی۔ اور سوچا کہ اب اس کے خلاف کیا کہیں گے۔ کہنے والا تو وہ تھا کہ جو دل کے ارادوں تک سے واقف تھا۔ اس نے کہا کہ یہ مسجد ہے یہ درحقیقت پناہ گاہ ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے کے لیے ہیں۔ اس لیے کہ اس سے مقصد تَفۡرِيۡقًۢا بَيۡنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (9:1070) ہے اس امت میں تفرقہ پیدا کرنا اس سے مقصد ہے۔ لہٰذا یہ کفر ہے۔ بڑی چیز جو میں نے کہا پناہ گاہ ہے' کیا بات کہہ گیا ہے!! ان کے لیے کہ جو جنگ کرنا چاہتے ہیں اس نظام کے خلاف۔ اس لیے حضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ اس مسجد میں قدم تک تم نہ رکھنا۔ اور سینے اور دل پہ ہاتھ رکھ کے سنیے' یہ تاریخ بتاتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو گا کہ حضور ﷺ نے اس مسجد کو گرا دیا۔ مسجد کو جسے آج گرا دینے کا لفظ بھی اس کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا' شہید کر دیا کہتے ہیں نا اب تو۔ کیا کہیں گے!! رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے عمل کو جو اس مسجد کو گراتے ہیں تو مسجد کو شہید کرنا کہا جائے گا پھر۔ یہاں تک قرآن پہنچا اور آپ دیکھئے کہ جو موضوع چلا آتا تھا اس میں یہ کلائمکس تھا۔ یوں یہاں تک لایا ہے۔

اور دیکھئے اس کا اعجاز کہ جونہی یہ آیت ختم ہوتی ہے تو اس کے فوری بعد کہتا ہے کہ یہ تو یہ جماعت رہی اور اس کے برعکس ایک اور جماعت ہے آؤ اس کا بھی تعارف تم سے کرائیں۔ اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَ اَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ (9:111) ایک جماعت وہ ہے کہ جس نے اپنا سب کچھ بیچ دیا ہے آ کر' جان بھی بیچ دی۔ چلئے یہ تو غالب نے کہا تھا کہ' جان دی دی ہوئی اسی کی تھی'۔ مال بھی اپنی کمائی بھی' وہ ساری لا کر بیچ دی۔ اب دونوں جماعتوں کا کردار ملاحظہ کیجئے۔ میں نے کہا ہے

یہ بھی کلائمکس پہ پہنچی ہوئی بات ہے۔فروخت کر دیا' دیدیا' بیچ دیا۔قبل اس کے کہ ہم اس سے ذرا آگے وضاحت کریں میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیہ جلیہ اوراس سے متعلقات جتنی بھی چیزیں آتی ہیں قرآن میں تو یہ موضوعی ہوتی ہیں۔قرآن کی مرکزی اور عمودی چیز ہوتی ہے کہ جس کے ساتھ پھیلتی ہیں باقی ساری چیزیں۔عمودی چیز یہ ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔یورپ میں جو ایک بہت بڑی تبدیلی آئی ہے سیاست میں وہ انقلاب ہے فرانس کا اوراس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے حکومت اور افرادِ معاشرہ کے درمیان جو تعلق ہے اس تعلق کو Contractual کہا ہے یعنی ایک معاہدے کی رو سے یہ تعلق دونوں میں قائم ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک معاہدے اور خرید وفروخت میں فرق

ایک معاہدہ کیا جاتا ہے Contract کیا جاتا ہے۔جس سے مقصد یہ تھا کہ اس میں کوئی حاکم اور محکوم کی بات نہیں ہے بلکہ دو فریق تراضی مابین سے ایک معاہدہ کرتے ہیں اور معاہدے کی رو سے یہ تعلقات استوار ہوتے ہیں۔نظری اور اصولی اعتبار سے واقعی یہ بہت بڑی چیز ہے۔لیکن جن کے سامنے قرآن ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ تعلق جو ہے معاہدانہ تعلق معاشرے اور افرادِ معاشرہ کا' اس سے بھی ہزار برس پیشتر یہ قرآنِ کریم نے دیا تھا جب یہ کہا تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ (9:111) یہ ایک معاہدہ ہے برابر کے فریق ہیں وہ کچھ بیچتا ہے' یہ کچھ خریدتا ہے۔اوراس نے بھی اس معاہدے کو خرید وفروخت کا معاہدہ نہیں قرار دیا تھا۔خرید وفروخت میں تو بڑی عجیب بات آتی ہے اس میں جبر اور استحصال اور تغلب اور تسلط کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا۔سوال ہی نہیں ہے۔خرید وفروخت میں جبر وسلب ونہب واستحصال یہ پیدا ہی نہیں ہوتی بات۔اپنی مرضی سے وہ آکے بیچتا ہے وہ اپنی مرضی سے خریدتا ہے' درمیان میں وہ قیمتِ فروخت ہوتی ہے' اُسے بھی دیکھ لیا جاتا ہے۔یہ تو سیدھی سی بات ہے جو ہمارے ہاں روزمرہ ہے'' میاں پجدا اے تے لے نئیں پجدا تے نہ لے' کوئی زبردستی اے''۔یعنی یہ ہے معاہدے کا انداز کہ جس میں کامل تر تراضی مابین ہوتا ہے۔دونوں کی رضامندی ہوتی ہے۔اور یہی وہ معاہدہ کرنے والے تھے ایک طرف فریق خدا اور دوسری طرف مؤمنین۔جن کے متعلق انتہائی طور پہ......کہا رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔

قرآن حکیم کے نزدیک معاہدے کا انداز' سوشل ازم میں ذاتی ملکیت کی حیثیت اور پھر منڈی میں بیع و شرح کی نوعیت

آپ کو پتہ ہے کہ یہ الفاظ کیا ہیں یہ کس مقام کی رضامندی ہے۔یہ اسی مقام کی رضامندی ہے جہاں باہمی معاہدہ ہوا ہے۔اس چیز

میں یہ سیاسی اور معاشی نظام ہمارے ہاں خاص اہمیتیں حاصل کر رہا ہے۔اوراس دور میں تو سیاسی سے کہیں زیادہ معاشی نظام۔ میں کہتا ہوں اس ایک آیہ جلیلہ نے یہ سارا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا۔حکومت کتنا لے سکتی ہے' کتنا اس کوحق پہنچتا ہے۔اُدھر سے ایک ازم ہمارے سامنے لائی جاتی ہے سوشل ازم کہ یہ جتنے بھی ذرائع پیداوارحتیٰ کہ اموال ودولت' لوگوں کی کمائی تک بھی ساری کی ساری' حکومت کے قبضے میں رہے گی۔اُسے حق حاصل ہے اس چیز کا' وہ اسے اپنے قبضے میں لیتی ہے' خریدتی نہیں ہے۔جاتی تو یہاں بھی وہ چیز دوسرے فریق کے پاس ہے۔ایک چیز کا فروخت کے اعتبار سے یا خرید کے اعتبار سے کسی فریق کے پاس آنا اوراسی چیز کا چھین لینے سے کسی کے پاس آنا' آپ جانتے ہیں اس میں کتنا فرق ہے۔اتنا ہی فرق ہے جتنا ایک بیع وشرح کی منڈی میں اور باقی میں فرق ہوتا ہے۔

مومن تو اپنی وہبی اور اکتسابی صلاحیتیں بھی جنت کے عوض خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے

ڈاکو کے پاس بھی اس کی چیز چلی جاتی ہے' اُسے کیوں ڈاکہ قزاقی اور رہزنی کہتے ہیں۔اس لیے کہ اس میں دوسرے فریق کی مرضی کا دخل نہیں ہوتا وہ اس کی قیمتِ فروخت نہیں دیتا۔ یہاں وہ چیز منتقل تو ہوتی ہے پہلے سے طے شدہ قیمت کے مطابق منتقل ہوتی ہے۔کیا ہے یہ؟ تین چیزیں ہوتی ہیں بائع اور مشتری اور قیمتِ فروخت' بیچنے والا خریدنے والا اور وہ قیمتِ فروخت جو ہے۔اب اس میں خریدنے والا اِنَّ اللّٰـــــهَ (9:111) ہے اللہ خریدنے والی پارٹی ہے مؤمنین بیچنے والی پارٹی ہے قیمتِ فروخت بِـــاَنَّ لَهُــمُ الْجَنَّةَ (9:111) یہ الجنة کہہ کے قرآن اتنی بڑی جامعیت اس کے اندر لے آیا ہے کہ سب کچھ آ گیا۔اُدھر بھی سب کچھ تھا جان اور مال اس کے بعد تو کچھ باقی رہتا نہیں اور اس کو ذرا پھیلائیے کہ ہر وہ شے جو وہبی طور پر ملی ہے' فطرت کی طرف سے اسے۔جان اور جان سے متعلقات یا سب چیزیں جن سے جان قائم رہتی ہے' اس میں سب چیزیں آ جاتی ہیں۔یہ وہبی طور پہ ملتا ہے اور اکتسابی طور پہ جو کچھ بھی انسان کماتا ہے دنیا میں اُسے مال کہا جاتا ہے۔تو گویا ایک فرد کی وہبی اور اکتسابی صلاحیتیں اوران کا ماحصل یہ سب کچھ' باقی یہاں بھی کچھ نہیں رہتا۔ اور ادھر سے جو اس کے مقابلے میں ملتا ہے وہ اَلْجَنَّةَ (9:111)۔

قرآن کریم میں بیان کردہ جنت کی تفصیل

اب قرآنِ کریم میں آپ دیکھئے اَلْـجَنَّةَ (9:111) کی تفاصیل' اس میں کیا کچھ نہیں آجاتا۔کسی سے پوچھئے انتہا یہ ہوتی ہے کہنے والے کی بھی' ماننے والے کی بھی انتہا یہ ہوتی ہے کہ صاحب وہاں جو مانگو گے ملے گا' جو چاہو گے ہوگا۔اس سے زیادہ تو نہ کوئی کہہ سکتا ہے' نہ کوئی مانگ سکتا ہے' نہ ذہن میں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس سے زیادہ بھی کچھ۔قرآن کہتا ہے کہ ٹھیک ہے اس کے اندر مِــمَّـا یَشْتَهُــوْنَ (77:42,56:21,52:22) ہوگا جو کچھ بھی تمہاری آرزو اور خواہش ہوگی وہ ملے گا۔تو انتہا ہوگئی عزیزانِ من! آپ بھی سوچئے کہ

اس کے بعد کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے۔ ذہن میں نہیں آ سکتا۔ اور وہ کہتا ہے کہ نہیں(وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ) (50:35) اس سے بھی زیادہ کچھ ہم دیں گے۔ ارے جو تم نے مانگا جو تم نے چاہا وہ سارا کچھ ملا اور اس سے زیادہ کیا۔ کیا بات ہے قرآن کی!! وہ کہتا ہے کہ انسان' اس کے چاہنے کے پیمانے بڑے محدود ہیں یہ انتہا درجے کا بھی کچھ مانگے گا تو اپنے پیمانے کا مانگے گا۔ اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ اسے اس سے زیادہ کی بھی ضرورت ہے(وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ)(50:35) ۔اللہ اکبر۔

خدا کے ہاں قیمتِ فروخت کی نوعیت

عزیزانِ من! اسے Appreciate کرنے کی بات ہے۔ یہ کہنے کی بات نہیں کہ کیا کہہ جاتا ہے قرآن' کہاں لے جاتا۔ الجنة ہی کچھ کم بات نہیں تھی' مَا يَشْتَهُوْنَ (77:42) بھی کچھ کم بات نہیں تھی کہ اس کے بعد کہتا ہے(وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ)(50:35) ہم اس سے بھی زیادہ دیں گے۔ یہ ہے وہ قیمتِ فروخت جو مل رہی ہے وہاں سے۔ کم از کم جہاں سے آغاز ہوتا ہے انسان کی طبعی زندگی کا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ کم از کم ہے یہ پست ترین سطح ہے۔ خود اس کی طبعی زندگی جو ہے وہی حیوانی زندگی ہے' انسانی زندگی تو اس سے اونچی آئے گی۔ لیکن یہ جو اتنی زندگی ہے پست ترین زندگی جسے کہا جاتا ہے۔ آج کے دور میں منتہا جو ہے وہ اس کے اوپر ختم ہوتا ہے۔

انسانوں کے وضع کردہ معاشی نظام کا ماحصل قرآنی معاشرے کی نوعیت نیز حیوانی سطح زندگی اور انسانی زندگی میں بیّن فرق کی وضاحت

جتنے بھی آپ کے ہاں یہ معاشی نظام کہے جا رہے ہیں۔ جیسے سوشل ازم ہے جس کی اگلی شکل کمیونزم آتی ہے۔ بہت بڑا احسان جو کیا جا رہا ہے وہ یہ کہ تمہاری طبعی (Physical Needs) بنیادی ضروریاتِ زندگی روٹی کپڑا اور مکان تو اس میں دیدیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم اسے پست ترین سطح کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ تو ضرورت ہے زندگی کی' جسم کی پرورش نہایت ضروری ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ یہاں سے تو انسانی زندگی کی ابتداء نہیں ہوتی یہ تو سمجھ لیجیے کہ نیچے کھڑے ہونے کے لیے پتھر ہے جس پہ کھڑا ہوتا ہے' سواری کے لیے ایک گھوڑا ہے جس پہ اس نے سفر کرنا ہے اس سے زیادہ تو اس کی حیثیت کچھ نہیں ہے۔ لیکن اس نظام میں یا جس آرزو میں اسی کو انتہا قرار دیا جاتا ہے قرآن یہ کہتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12) اگر یہ کھانے پینے تک ہی انتہا ہے انسان کی یہ تو حیوانی زندگی ہے انسانی زندگی نہیں ہے اور اسے وہ کفر کہتا ہے۔ یعنی ایمان تو انسانی زندگی سے شروع ہوگا' حیوان تو نہ مومن ہوتا ہے نہ کافر ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے مقابلے میں جب انسان آئے گا تو چونکہ یہاں تقابل ہو جائے گا کفر اور ایمان کا لہٰذا یہ کفر کی زندگی

ہے۔لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بہرحال ایک ضرورت ہے انسان کی طبعی زندگی کی نشوونما کے لیے جو کچھ چاہئے۔ یہ جسے **الجنۃ** کہا ہے اندازہ لگائیے قرآن یہاں سے ابتداء اس کی کرتا ہے۔ جنتِ آدم ابتدائی سٹیج کی زندگی ہے اور اس میں اس نے یہ کہا ہے وہ مشہور آیت کہ **اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِیۡهَا وَ لَا تَعۡرٰی ۙ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّکَ لَا تَظۡمَؤُا فِیۡهَا وَ لَا تَضۡحٰی** (20:118-119) کہ روٹی کپڑا اور مکان جسے انتہا درجے کی چیز کہہ رہے ہو یہ تو بالکل ابتدائی چیز ہے۔ اور اس کے لیے اس نے یہ کہا ہے **فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشۡقٰی** (20:123) کہ یہ جو کچھ بھی ہے یہ جگر پاش مشقتوں کے بعد نہیں ملے گا' محرومیوں کے بعد یہ کچھ نہیں ہوگا' احتیاجات سے پورا کرنے کی بات نہیں ہوگی۔ یہ تو فراوانی سے ملے گا اس انداز سے ملے گا کہ **وَ کُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا** (2:35) جہاں بھی کسی کو بھوک لگے گی وہاں اس کے لیے یہ موجود ہوگا۔ دیکھا **لَا یَشۡقٰی** (20:123) نے کتنی بڑی بات پیدا کر دی۔

انسان کی بنیادی ضروریات کو مکمل طور پر پورا کرنے کا اعلان ابھی تک کوئی ازم نہیں کر سکا

کوئی ازم بھی آپ لے لیجیے معاشیات کا جسے اب انتہائی احسان بتایا جا رہا ہے۔ کس قدر جگر پاش اور دلسوز مشقتیں ہیں جن کے بعد ابھی وہ سٹیج نہیں آئی جس کے بعد اس کی ضمانت دیدی گئی ہے۔ اس بات کی ضمانت ابھی تک کوئی ازم نہیں دے سکا۔ یہ ضمانت کہ جس میں قرآن نے کہا تھا کہ اعلان کر دو کہ **نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَ اِیَّاهُمۡ** (6:151) تمہاری اور تمہارے بچوں کی رزق کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ کوئی نظام کوئی مملکت' ان کی کوئی حکومت' کسی قسم کی سوشل ازم' کوئی کمیونزم ابھی یہ اعلان نہیں کر سکی صاحب۔ نہ وہ اس قابل ہے۔

مارکس کی ناکامی کی بنیادی وجہ اور اس کا اعتراف

تصور کیا تھا مارکس نے کہ انسانیت کی مشکلات کا حل اس وقت ہوگا کہ جب نظام اس کی ذمہ داری لے لے۔ لیکن اس نے کہا ہے کہ یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق نہ میں تصور کر سکتا ہوں' نہ میں بتا سکتا ہوں کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ اس کی پارٹی کے افراد نے اس سے کچھ گفتگو کرنی چاہی کہ اس کے متعلق کچھ Discuss تو کریں۔ اُس نے روک دیا کہ Discussion اس کے اوپر کچھ نہ کرو اس لیے کہ ہمارے پاس وہ میٹریل ہی نہیں جس سے ہم اس کا جواب دے سکیں۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کی پارٹی کے اولیں افراد اس ایشو کے اوپر اس سے الگ ہو گئے تھے کہ بتا یہ رہے ہو کہ انسانیت کی مشکلات کا حل اس میں ہے اور کہتے ہو کہ چہ جائیکہ یہ کہا جائے کہ ایسے ہوگا تم کہتے ہو کہ گفتگو ہی نہ کرو۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ جس بات کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں' اس پہ گفتگو کرنا بڑا مضر ہوگا۔

انسانیت کے لیے قرآن حکیم کا معاشی نظام سب سے بڑی ضمانت فراہم کرتا ہے

میں کہہ یہ رہا ہوں کہ جن نظاموں کو یہ کہتے ہیں کہ انتہا ہے کم از کم معاشیات میں' ان نظاموں کی یہ کیفیت ہے کہ اس کی کوئی ضمانت

نہیں دیتا۔ یہ ہے جو یہ کہہ رہا ہے، ضمانت دیتا ہے، چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے **نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَاِیَّاھُمۡ** (6:151) ہم دیں گے تمہیں، تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ہم ذمہ دار ہیں۔ اس لیے کہ ہم نے جو قیمتِ فروخت مقرر کی تھی اس میں کہہ دیا تھا کہ **الجنة** تمہیں دیا جائے گا۔ یہ تو بالکل نقطۂ آغاز اور پست ترین سطح ہے۔ اور انتہائی چیز تو میں کہہ رہا ہوں کہ جب وہ آیت ہمارے سامنے آئی تو پھر اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو چاہو گے ملے گا اور اس سے بھی زیادہ ملے گا۔ تو حیوانی زندگی کی سطح یہیں تک تھی جسے اس نے پہلے فقرے میں ختم کر دیا۔ اور اس کے بعد انسانیت کی زندگی شروع ہوئی اور اس کے لیے تو پوچھو نہیں کہ کیا کیا ضرورتیں ہوتی ہیں کیا کیا تقاضے ہوتے ہیں۔ ہر ایک ان میں سے پورا ہوگا اور اس سے بھی زیادہ۔ یہ ہے عزیزانِ من! جو قیمتِ فروخت دی گئی۔ اگر اس قیمت کی تفصیل میں جائیں تو ہمیں قرآن سے **الجنة** کا پورا نقشہ سامنے لانا ہوگا۔ اس کے لیے تو وقت نہیں ہے۔ جوں جوں سامنے آتی جائیں گی تفاصیل ہم ان کو دیکھتے چلے جائیں گے۔ لیکن کم از کم جو میں نے عرض کیا ہے وہ تو یہاں سے نقطۂ آغاز ہے جو انتہائی نقطہ ہے آج آپ کے ہاں کے معاشی نظام کے تصورات کا عمل کا نہیں۔ وہ اس کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ ہے وہ **الجنة** وہ قیمت جو ادا کی جا رہی ہے اس کے بدلے میں یہ جو سودا ہوا ہے۔

قرآنی نظامِ حیات کی تشکیل کے لیے جان و مال کا سودا کرنا ہوگا اور پھر اس کا نتیجہ الفوز العظیم کی شکل میں نکلتا ہے

بتایا گیا ان کے متعلق یہ **یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ** (9:111) انتہا ہے جان دینے کی، مال تو بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس بلند ترین مقصد کے لیے میدانِ جنگ میں جانا ہوگا تو وہ سر ہتھیلیوں پہ لے کے نکل آئیں گے۔ پھر یا تو فاتح و منصور واپس لوٹیں گے یا وہیں اپنا سر دیدیں گے۔ کہا یہ کہ ہمارا وعدہ ہے کہ اس کے مقابلے میں ان کو **الجنة** ملے گی نئی بات نہیں ہے **وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىةِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ وَ الۡقُرۡاٰنِ** (9:111) خدا کے اوپر یہ واجب ہے یہ وعدہ ہے اور ابھی آتا ہے **وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ** (9:111) خدا سے زیادہ وعدے کا پورا کرنے والا کون ہے۔ اور عزیزانِ من! یہاں تک قرآن اس باب میں یہ کہہ گیا ہے **وَ کَانَ عَهۡدُ اللّٰهِ مَسۡئُوۡلًا** (33:15) سمجھانے کے لیے کہ اگر بفرضِ محال وعدہ پورا نہ ہو سکے تو اس کی باز پرس کی جا سکتی ہے۔ افوہ۔ ابھی تک آپ کے ہاں ان چیزوں کو Justicable بھی نہیں قرار دیا جا رہا کہ نہ ملنے کی صورت، اول تو ملنے کی ضمانت ہی نہیں ہے، نہ ملنے کی صورت میں کہیں کوئی دروازہ ہو، جو کھٹکھٹایا جائے کہ یہ جو کچھ تھا ہم بیچ چکے اور بیچ کے ہم نے ان کے حوالے بھی کر دیا انکی Possession میں بھی آ گیا اور اس کے مقابل میں جو کہا گیا تھا کم از کم وہ دیں گے، وہ نہیں دیتے۔ کوئی دروازہ تک نہیں ہے۔ خدا کا

وعدہ ہے اس کے متعلق پہلے تو یہ کہا گیا ہے کہ وہ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ (13:31) وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرے گا اس سے زیادہ وعدے کا پورا کرنے والا اور کون ہے' بالکل ٹھیک ہے ایمان ہے ہمارا۔ اور یہ کہہ دیا کہ اگر بفرضِ محال یہ وعدہ پورا نہ ہو' مسئول ہے وہ اس کے لیے۔ وعدہ ایسا ہے۔

خدا تعالیٰ کے ساتھ اتنے سستے سودے پر جشن مناؤ۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے زلیخا نے سوت کی ایک مالا سے یوسف جیسی جان خرید لی ہو

کہا یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے مومن جہاں بھی آیا ہے' تاریخ کے کسی دور میں آیا ہے' کسی زمانے میں آیا ہے' کسی مقام پہ بھی آیا ہے اس کے اور اس کے خدا کے درمیان یہ معاملہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ انجیل میں بھی یہ بات تھی' تورات میں بھی یہ کچھ کہا جا رہا ہے' قرآن میں بھی ہم نے یہ کہا ہے۔ خدا کے اوپر یہ وعدہ واجب ہے اس کا پورا کرنا۔ اور جب یہ ہو گیا کہ اتنی بڑی چیز وہ تمہیں اس کے بدلے میں دے رہا ہے۔ اور وہ دینے والا ایسا وعدہ تم سے کر رہا ہے تو سوچئے تو سہی کہ اس سے بڑی کوئی اور خوشخبری نصیبِ جاں فزاں بھی ہو گی؟ اس لیے کہا فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ (9:111) کہ اس سودے کے اوپر خوشیاں مناؤ' جشن مناؤ۔ کتنا سستا سودا رہا تمہارے ساتھ۔ مجھے اکثر یاد آتا ہے کہ مولانا جامی نے جو یوسف زلیخا لکھی ہے تو اس میں یہ چیز کہی۔ جب زلیخا نے وہ محبوبِ جاں نواز جس کے انتظار میں راتیں جاگ جاگ کے کاٹیں تھیں جو قیمت بھی مانگی ان سوداگروں نے اس غلام کی وہ اس نے ادا کیا' وہ ادا کر سکتی تھی۔ اس کے بعد جب آئی ہے تو سہیلیوں نے پوچھا کہ کیا سودا کر آئی ہو۔ عجیب انداز میں اس نے یہ بات کہی ہے۔ اُس نے ان سے کہا کہ درہم چند دادم جاں خریدم' میں نے کچھ سکے دیے اس کو اور اس کے معاوضے میں جان خریدی'؟؟ علی اللہ چہ ارزاں خریدم' اللہ کی قسم کتنی سستی خریدی ہے میں نے یہ۔ کہاں سے لیا تھا جامی نے یہ؟ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ (9:111) جاؤ مسرت کے جشن مناؤ' کہو کہ کتنا سستا خرید لیا میں نے صاحب۔ وَ ذٰلِکَ ھُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ (9:111) بہت بڑی Achievement ہے یہ۔ برابری کا ہی سودا نہیں ہے یہ خرید کر لے جانے والا اسے Achievement کہا ہے۔ Achievement تو بڑی چیز ہوتی ہے آپ جانتے ہیں فوز' الفوز بھی فوز العظیم۔ کتنی بڑی چیز ہے جو خرید کے لے آتا ہے مومن۔

آپ نے دیکھا کہ وہ جو پیچھے سے کلائمکس منافقین کا چلا آ رہا تھا کہ کہیں چار پیسے بھی دینے پڑ گئے ہیں تو اس کے لیے ہزار قسم کی توجیہات اور تاویلات ہوتی آ رہی ہیں' گریز کی راہیں تلاش کر رہا ہے' جان جا رہی ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے بعد دوسری طرف ایک جماعت یہ کہہ رہی ہوتی ہے۔ جماعت مؤمنین کی جن کی کیفیت یہ ہے کہ جان تک دے آتے ہیں اور اس پہ خوشیاں مناتے ہیں کہ کتنا سستا

سودا تھا جو ہم کر آئے۔

ہمارے ہاں پائے جانے والے اکثر تصورات کی اصلاح ضروری ہے

یہاں ایک چیز آتی ہے ہمارے سامنے کہ عام طور پہ لوگوں کی زبانوں پہ یہ الفاظ ہوتے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہی ہے حقیقت میں مالک تو وہی ہے مالکِ حقیقی وہی ہے۔ اور پھر وہ جو میں کہا کرتا ہوں آپ دیکھیں گے عام طور پہ مکانوں کے باہر ایک پتھر کی سِل لگی ہوئی ہوتی ہے کہ 'ایں امانت چندروزہ نزدِ ما است' درحقیقت مالکِ ہر شے خدا است' مالک تو وہی ہے' یہ میرے پاس چندروزہ امانت ہے اس کی۔ اول تو یہ چندروزہ جو ہوتی ہے یہ ساری عمر ہوتی ہے' مرنے کے بعد بھی لکھ کے دے جاتا ہے۔ پھر یہ ہوتی ہے اس کی مالک کی' ساری عمر اس مالک سے کبھی پوچھتا تک نہیں ہے۔ خود جی چاہے آپ رہے' کرائے پہ دیدے' فروخت کردے' ڈھالے' اس کو آگ لگا دے' جو جی میں آئے کرتا چلا جائے۔ یہ امانت ہے اس کے پاس۔ یہ کیوں ایسا کہا جاتا ہے؟ اس لیے کہ یہ یقین ہے کہ نہ اس نے کبھی آنا ہے' نہ یہ دینی پڑنی ہے۔ اگر کبھی ذرا سا بھی اس کا احتمال ہو کہ شاید کسی وقت وہ مالک آ نکلے' جو اتنا عرصہ ہو گیا ہے' گم تو ہو گیا ہے کہیں' لا پتہ معلوم تو نہیں لیکن احتمال بھی ہو کہ آ نکلے دستاویزیں پھاڑ دے آدمی' مکر ہی جائے۔ لیکن یہاں یہ یقینِ کامل ہے کہ اس نے آنا ہی نہیں ہے۔ تو جب یہ یقینِ کامل ہو تو پھر یہ شاعری کرنا کیوں ضروری ہے کہ یہ تو اس کی ملکیت ہے' ہمارے پاس یہ چند دن کے لیے امانت ہے۔ اسے مذہب کہتے ہیں عزیزانِ من! کہ جب کوئی بات نظری عقیدے تک رہے اور وہ عمل میں کبھی نہ آنی ہو۔ جان بھی اس کی' مال بھی اس کا' سب کچھ اسی کا ہے۔ کائنات میں زمین سے آسمان تک سب کچھ اس کا ہے۔ البتہ انفرادی ملکیتیں جو ہیں ان کو چھینا نہیں جا سکتا خدا بھی ان کو نہیں لے سکتا۔ تقدس ہے انفرادی ملکیت کا۔

ملکیت زمین کے سلسلہ میں آج کی شریعت حقہ کا فتویٰ

آپ دیکھتے ہیں یہ منافقت کہاں تک ہے۔ وہ سہارے قائم ہیں۔ قرآن نے ان کے متعلق کہا ہے اس کی معذرتیں کہا ہے' وہ تاویلات جو آپ کے ہاں آجاتی ہیں مذہب میں۔ شریعتِ حقہ کی رو سے اسلام میں یہ چیز آئی ہے۔ قرآن کا نام نہیں لیں گے کیونکہ یہ دستاویز ہے یہ تو سامنے رکھی جا سکے گی' اس کی رو سے نہیں اسلام کی رو سے۔ آج تک کوئی بتا ہی نہیں سکا کہ وہ ہے کیا۔ اسی کی رو سے یہی نہیں کہ ایک وقت میں ایک کے نزدیک یہ چیز' دوسرے کے نزدیک' وہ تو دوسری۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی کے نزدیک ایک وقت میں یہ چیز کہ صاحب انفرادی ملکیت پہ کسی قسم کی حد بندی اسلام کی رو سے ناجائز ہے۔ دوسرے ہی وقت میں یہ چیز کہ صاحب انفرادی ملکیت کے اوپر سوا سو ڈیڑھ سو ایکڑ کی حد لگانا شریعت کے عین مطابق۔ وہ بھی شریعت کے عین مطابق' یہ بھی عین مطابق۔ کرتے چلے جایئے۔

قرآنی دستاویز تو اس قسم کی ہے نہیں۔ اسے کبھی درمیان میں نہیں لائیں گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مذہب کی دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ یہ ساری چیزیں نظری ہوتی ہیں۔ اسے کہتے ہیں کہ عقائد درست ہونے چاہئیں انسان کے۔ ٹھیک ہے بگڑتا کیا ہے۔ عقیدہ ہے یہ کہ واقعی مالک حقیقی خدا ہے، یقین ہے اس کا کہ وہ کبھی آ کے لے گا ہی نہیں۔ یہ ہوتے ہیں جنہیں عقائد کہا جاتا ہے آپ کے ہاں۔

نظری طور پر مذہبی عقائد کے برعکس قرآن حکیم کی واضح دوٹوک تعلیم

لیکن دین میں تو یہ چیز نظری نہیں رہتی۔ اُس نے جب یہ کہا تھا کہ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ (9:111) یہ جو بیع تم نے کی ہے۔ بیع کا لفظ تو ہمارے ہاں بھی عام ہے۔ یہ جو تم نے بیع کر دی ہے اپنی جان اور مال، اس کے اوپر خوشیاں مناؤ۔ تو کیا یہ محض عقیدے کی چیز تھی۔ کہتا ہے یہ محض نظری اور عقیدے کی چیز نہیں تھی عملاً یہ بیع وفروخت کا معاملہ جو ہے یہ طے پائے گا۔ عملاً طے پائے گا سچ مچ یہ چیز آپ کو لکھنی پڑے گی۔ وہ معاملہ تو خدا کے ساتھ ہو رہا ہے کیا اللہ میاں عرش سے آئیں گے اس معاملے کو طے کرنے کے لیے ہمارے سامنے؟

خدا تعالیٰ اپنے وعدے ایک نظام کے ذریعے پورے کرتا ہے

تو جب فریقِ مقابل آئے گا ہی نہیں تو آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ یہ سچ مچ ہوگا۔ کہا سچ مچ ہوگا۔ اس کے لیے ہم نے ایک نظام طے کر دیا ہے یہ جتنی ذمہ داریاں ہم لیتے ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے، جتنی چیزیں خریدتے ہیں، ان کو اپنی تحویل اور قبضے میں لینے کے لیے ان کی قیمتِ فروخت ادا کرنے کے لیے۔ یہ نظری اور اعتقادی چیز نہیں ہے یہ عملی چیز ہے۔ یہی کہتے ہو کہ خدا خود نہیں آتا۔ اس نے کہا کہ تمہارے عام معاملات میں بھی ضروری نہیں ہے کہ مشتری خود وہاں حاضر ہو، اس کا وکیل سب کچھ کر دیا کرتا ہے۔ ہوتے ہیں نا معاملے یوں طے۔ یہاں ان معاملات کے لیے بھی خدا کے Behalf پہ کچھ کرنے والا موجود ہے۔ اور سب سے پہلا جو تھا وہ رسول ﷺ تھا۔ دیکھئے کس انداز میں قرآن نے بات واضح کر دی۔ بیع کا لفظ یہاں موجود ہے۔ یہی بیع آئی ہے آگے بھی ایک جگہ آئی ہے۔ کہا یہ بیع اور شریٰ کا معاملہ ان جماعتِ مؤمنین اور خدا کے درمیان طے پاناتھا۔ کہا یہ دیکھئے طے پا رہا ہے تو خدا تو نہیں ہے یہاں کس طرح طے پا رہا ہے۔

خدا تعالیٰ کے نام پر حکومت قائم کرنے والے کی ذمہ داری اور اس کی حیثیت کا ذکر

کہا اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (48:10) اے رسول یہ جو تمہارے ساتھ بیع کا معاملہ کر رہے ہیں یہ درحقیقت خدا کے ساتھ کر رہے ہیں۔ بیع وشریٰ کے اندر اب بھی آپ دیکھیں گے، دستاویز کے معاملے تو بعد میں جا کے آتے ہیں۔ اور اصل میں تو

ابھی زیادہ ضرورت پڑی ہے اس سے پیشتر اعتماد ہوتا تھا ایک دوسرے کے اوپر۔ اس کے لیے ایک علامت ہوتی تھی کہ طے ہوا بھئی' اس نے طے کیا" ہتھ لے آ " یہ انداز ہوتا تھا۔ یہ باہمی معاہدے کا یہ انداز ہوتا ہے۔ کہا یہ کہ یَدُ اللّٰـهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (48:10) اس بیع کے معاملے کے اندر یہ جو ہاتھ لاؤ والی بات ہے نیچے تو ان کا ہاتھ ہے بظاہر اوپر تمہارا ہاتھ ہے تمہارا نہیں یَدُ اللّٰـهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (48:10) خدا کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ کے اوپر۔ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ (48:10) ان سے کہہ دو کہ جو معاہدے سے پھر جائے گا اس کا نقصان اسی کو اٹھانا پڑے گا۔ حالانکہ خریدار کو بھی تو نقصان ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے ہمارا اس میں کچھ نقصان نہیں ہوتا اُسی کو اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ (48:10) یہ دیکھیے وہ آ گئی بات۔ جو اس معاہدے کو پورا کرے گا وہ معاہدہ کہا اللہ کا معاہدہ جو اس کے ساتھ ہوا ہے کہتا ہے فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (48:10) اس کو بہت بڑا اس کا بدلہ اور صلہ ملے گا۔ یہ نظری اور اعتقادی چیز نہیں رہی' یہ ایک عملی چیز ہوگئی۔

خدا کی اطاعت نظری اور ذہنی نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے ایک مرکز ملت تشکیل پاتا ہے

یہ ہے عزیزانِ من! دین کی سیاست کا نقطۂ ماسکہ۔ اس میں اطاعت بھی خدا کی ہوتی ہے' اس میں فروخت بھی خدا کے ہاتھوں کی جاتی ہے' قیمت بھی خدا ہی ادا کرتا ہے' مواخذہ بھی وہی کرتا ہے۔ لیکن نظری اور ذہنی حیثیت سے نہیں۔ اس کا نمائندہ ہوتا ہے جو اس کے Behalf پہ یہ سب کچھ کر رہا ہوتا ہے۔ اور وہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ ہمارا صحیح نمائندہ ہے تمہارے ہاتھ پہ' اس کا ہاتھ نہیں ہمارا ہاتھ ہے۔ پکی بات ہوگئی۔ اب آ گیا وہ درحقیقت مالکِ ہر شے خدا' آ گیا وہ مالک' محسوس شکل میں یہاں آ گیا وہ۔ اب آپ نہیں کہہ سکتے کہ پتہ نہیں آئے یا نہ آئے' موجود ہے۔ جس وقت جی چاہے جتنا جی چاہے اپنی امانت میں سے' وہ طلب کر لے۔ لیکن بات دوسری طرف بھی ہے کہ یہ تو آ گیا لینے والا۔ اس نے جو وعدہ کیا تھا دینے کا الـجـنـة یہ کون پورا کرے گا۔ کہتا ہے یہ خود پورا کرے گا۔ یہاں ون وے ٹریفک تو ہے نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ جو کچھ دینا ہے' وہ تو ان کو دیدیجیے اور ان سے جب آپ کہیں کہ اس کے بدلے میں وہ قیمت بھی تو دیجیے تو وہ یہ کہے کہ" جاؤ اپنے اللہ کو لوں جا کے لے"۔ سوال نہیں ہے۔ اُسے یہ پورا کرنا ہوگا۔ وہاں جو کہا ہے نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ (6:151) تو یہ ٹھیک ہے کہنے والا اس میں خدا ہی ہے۔ لیکن وہ تو بیع و شریٰ کے معاملے میں بات صاف ہوتی جا رہی ہے کہ اس طرح سے عملاً یہ معاہدہ طے پاتا ہے اس کے حوالے وہ چیز کی جاتی ہے' اس کے بدلے میں وہ قیمتِ فروخت تمہیں دے گا۔ تو بات ظاہر ہے کہ معاملہ اس وقت تک ہی استوار رہے گا جب تک دونوں فریقین اپنے اپنے عہد پہ قائم ہوں۔ یہ ان کے حوالے کرے جب بھی ضرورت پڑے' جتنی ضرورت پڑے۔ اور وہ جو اس کی قیمتِ فروخت ہے وہ ان کو ادا کرے۔ اگر یہ حوالے نہ کرے' اس کی ذمہ داری ختم ہوگئی۔ کس

حسین انداز میں نبی اکرمﷺ نے فرمایا تھا کہ جس بستی میں یہ کیفیت ہو کہ رات کو ایک فرد بھی بھوکا سو جائے' اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے' بیع ٹوٹ گئی۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے لیے گئے وعدوں کو پورا کرنا مرکزیت ملت کی ذمہ داری ہوگی' اس امر کے بغیر تو خدا کا کوئی نمائندہ بن ہی نہیں سکتا

غور فرمایا آپ نے۔اور پھر جو کہا تھا کہ اگر پورا نہ کیا جائے وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا (33:15) اس کی باز پرس ہوگی۔جنہوں نے خریدی تھی وہ باز پرس جانتے تھے۔یہی باز پرس تھی جس کے متعلق حضرتِ عمرؓ نے کہا تھا کہ خدا کی قسم اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کا بھی مواخذہ ہوگا۔یہ تھا وہ مسئول عہد' سودا کیا ہوا تھا انہوں نے۔یہ نظری اور اعتقادی بات نہیں ہے عزیزانِ من! دین کے اندر عملاً یہ نظام قائم ہوتے ہیں۔اور یہ تو موضوع دوسرا چلا جائے گا سیاست کا موضوع آئے گا تو میں یہ عرض کرونگا۔اتنی سی بات نہیں ہوتی کہ بیع اس سے ختم ہو گیا' وہ جو اطاعت لی جاتی ہے By the way اسے ہی بیعت کہتے ہیں آپ کے ہاں جو آج کی اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے Oath of Allegiance حلفِ وفاداری۔یہی ہے جس کو اس دور میں خلیفہ کی بیعت کہا کرتے تھے۔اصل Allegiance کے مقابلے میں یہ بیعت کا لفظ زیادہ جامع ہے اور برابری کی حیثیت سے ہے۔یہاں Allegiance نہیں ہے صرف' یہاں معاملہ خرید و فروخت کا ہے۔اسی لیے اس کا نام انہوں نے بیعت رکھا تھا۔بیع و شرٰی کے معاملے میں جو کچھ کیا جائے گا وہ۔قرآنِ کریم میں رسول اللہﷺ کے متعلق ہے کہ جب یہ تجھ سے آ کے اس معاملے میں بیعت کریں اور اس بیعت کے اندر پھر یہ بتایا ہوا ہے کیا کیا چیزیں ہیں جن کے متعلق یہ آ کے کہیں۔اس بیعت کے اندر لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ (60:12) کہ معروف کے اندر تمہاری نافرمانی ہم نہیں کریں گے۔بات دور چلی جائے گی۔اطاعت معروف کے اندر اور المعروف ہر وہ شے جسے خدا صحیح Recognize کرتا ہے۔لفظی ترجمہ اس کا یہ ہو گیا۔صحیح تسلیم کرتا ہے جسے قرآن' وہ المعروف ہے۔اطاعت اس میں ہے۔تو جب بیعت ٹوٹتی ہے' بیعت ٹوٹنے کے معنی حلفِ اطاعت ٹوٹ جاتا ہے' حلفِ وفاداری ختم ہو جاتا ہے۔یہ ہے نظام جو وہ قائم کرتا ہے۔لیکن ون وے ٹریفک نہیں جو میں نے عرض کیا ہے۔یہ تو فرد ہے بہرحال اس نے آ کے یہ دے بھی دیا' اس کے بدلے میں جو اسے مل رہا ہے۔یہاں عمر بھر کے ان تمام تقاضوں کے پورا ہونے کی ذمہ داری کی ضمانت ہے۔اور یہیں ختم نہیں ہوتا۔

خدا کے ہاں تو قیمتِ فروخت میں مال کے علاوہ جان بھی شامل ہوتی ہے

جو کچھ اس نے بیچا تھا وہ تو اس دنیا میں ختم ہو جاتا ہے' انتہا جان کی ہے وہ بھی یہیں دیدیتا ہے۔قیمتِ فروخت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ

اسی دنیا تک محدود نہیں ہے وہ آئندہ کے لیے بھی ہے' وہاں بھی تو الجنة ملنی ہے ان کو۔ یہ ہے وہ نظام جو قرآن قائم کرتا ہے یہاں افرادِ معاشرہ میں اور نظامِ معاشرہ میں۔ اور نظامِ معاشرہ از خود کوئی شے نہیں ہوتا وہ تو خدا کے احکام کو نافذ کرنے کی ایجنسی' اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ۔ اگر وہ یہ کرتا ہے تو نظام صحیح ہے۔ اس کے پاس بیچی ہوئی چیز بھی' بیچی ہوئی ہے اس کی اطاعت بھی اطاعت ہے۔ اگر وہ ان چیزوں کو پورا نہیں کرتا' نہ وہ خدا کا نمائندہ' نہ وہ اس کے احکام کی تنفیذ کی ایجنسی' نہ اس کی ذمہ داری پورے کرنے کی ضمانت۔ اور اس لیے نہ اس قابل کہ اسکی اطاعت کی جائے۔

ہمارے ہاں اسلامی مملکت کا معیار یا مسلمان ہونے کی نشانی صرف کلمے کا پڑھنا ہی ہے

عزیزانِ من! جسے Contractual Basis کہا جاتا ہے' معاہدے کی رو سے آپس میں تعلق استوار ہونا جو بنیاد ہے اسلام کی۔ ایک شخص جو اس دائرے میں داخل ہونا چاہتا ہے' اس سوسائٹی کا ممبر بننا چاہتا ہے۔ آج تو ہمیں پتہ ہی نہیں ہے کہ اسے کیا کرنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ کئی دفعہ میں نے کہا ہے ہم نے تو کچھ کیا ہی نہیں ہے۔ جو غیر مسلم بھی یہاں داخل ہونا چاہتا ہے' اس سے وہ کچھ کلمے پڑھاتے ہیں بس' اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے لیے۔ یہ ایک معاہدہ ہے' ایک معاملہ کاروبار کا بیع وشریٰ کا۔ یہ معاہدہ کرنا پڑتا ہے پھر وہ اس سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے۔ لیکن سوسائٹی بھی تو وہ ہو جو دوسری طرف سے یہ ضمانت دے۔ یہ جو اس قسم کی ضمانت دینے والا نظام ہے' اسے کہتے ہیں اسلامی مملکت۔ اس طرح سے جو معاہدے میں Enter into داخل ہوتا ہے اسے کہتے ہیں مسلم یا مومن۔ یہ سارا نظام مل کے اسلام پھیلاتا ہے۔ یہ ہے آیہ جلیلہ وہ عروۃ الوثقیٰ بنیادی پتھر اس پورے نظام کا۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے محض ذہنی اور نظری اور اعتقادی شے نہیں یہ عملی چیز ہے۔

قرآن حکیم نے جماعت مومنین کی ترجمانی سورۃ التوبہ کے اندر بڑی جامعیت سے بیان کر دی ہے

آپ نے دیکھا کہ منافقین کا ذکر کرنے کے بعد قرآن اسے کلائمکس کے اوپر' انتہا پہ لے آیا ہے اس جماعت کو کہ جس کی یہ کیفیت ہے۔ پہلی چیز ان کے متعلق یہ کہی کہ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ (9:111) یہ بھی انتہا کی چیز ہے۔ درمیان کی چیزیں نہیں لایا' انتہا کی چیز لایا ہے کہ کیفیت یہ ہے کہ جونہی اس کی ضرورت پڑی' سربکف میدان میں آ گئے۔ اور تیسری شکل ہے ہی نہیں اس میں کہ جان بچا کے بھاگ آئے' سرنڈر کر دیا' دشمن کے ساتھ مل گئے۔ دو ہی صورتیں ہیں فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ (9:111) یا فاتح ومنصور واپس لوٹے یا وہاں جان دے کے آ گئے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (9:111) یہ ایک صفت گنائی ہے ان کی معاہدے میں فریق بننے والوں کی جنہوں نے اس دستاویز پہ دستخط کیے ہیں کہ ان کی کیفیت پھر یہ ہوتی ہے۔ اور صفات ان کی عزیزانِ من! مؤمنین کی صفات کے لیے سارا قرآن آپ

جہاں جہاں دیکھیں گے، جہاں قرآن یہ کہے گا کہ تم یہ کرو، تم یہ نہ کرو، وہ بھی مؤمنین کی صفات ہیں۔ کیونکہ مومن ہے ہی وہ کہ جو وہ کہتا ہے وہ کرتے ہیں جس سے وہ کہتا ہے رکو، وہ رکتے ہیں۔ اور بعض آیات ایسی ہیں کہ جن میں بتایا گیا ہے کہ پھر یہ جماعت کیسی ہوتی ہے تا کہ اس کے پہچاننے میں دقت نہ رہے۔ یہاں پہلی چیز یہ ہوئی کہ اس معاہدے پہ دستخط کر کے بیع وشرٰی کا معاملہ وکاروبار طے کرتے ہیں۔ پھر انتہائی شکل ان کی یہ ہے کہ جب جان تک دینی پڑے تو اسے لے کے حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور راستے میں بتایا اَلتَّـآئِبُـوْنَ الْـعٰبِـدُوْنَ الْـحٰـمِـدُوْنَ السَّـآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (9:112) کیا بات ہے!! کیا جماعت ہے!!! اَلتَّـآئِبُـوْنَ (9:112) انسان ہی تو ہیں کسی مقام کے اوپر فیصلہ کرنے میں کچھ غلطی ہوسکتی ہے اجتہادی ان سے، ارادتاً معصیت کا تو سوال نہیں پیدا ہوتا۔ غلطی ہوسکتی ہے، غلطی ہو جاتی ہے تو پھر اس کے اوپر چلے ہی نہیں جاتے، اڑے ہی نہیں رہتے۔

کسی بزرگ سے غلطی سرزد ہو جانے پر اس کے ازالے کی بجائے اسلاف پرستی کا شیوہ

اور غلطی کہیں اگر ہوئی ہے آج سے ہزار برس پیشتر، چلے جا رہے ہیں، کہہ رہے ہیں کہ میاں چلے جا رہے ہو، کہتے ہیں اسلاف کا مسلک ہے جی۔ وہ ان کی صفت بتاتا ہے اَلتَّآئِبُوْنَ (9:112) کہ جس مقام پہ بھی یہ احساس ہو جائے کہ یہ چیز قرآن کے خلاف جاتی ہے وہیں سے لوٹ آتے ہیں۔ ضد نہیں ہے پندارِ نفس راستے میں حائل نہیں ہوتا۔ اسلاف کی غلط تقلید ان کا دامن پکڑ کے نہیں بیٹھ جاتی۔ کسی مقام پہ بھی ان کے سامنے یہ بات لائی جائے قرآن کے خلاف ہے اَلتَّآئِبُوْنَ (9:112)۔ اور اس کے بعد اَلتَّآئِبُوْنَ (9:112) کے بعد الْعٰبِدُوْنَ جھٹ سے محکومیت اختیار کر لیتے ہیں خدا کے احکام کی۔ پھر اپنی روش پہ اصرار نہیں کرتے، یہ تاویلیں پیش نہیں کرتے کہ ایسا ہزار سال سے چلا آتا ہے۔ کہا یہ قرآن کے خلاف ہے، گھڑا گھڑایا فقرہ کہ وہ بھی تو قرآن جانتے تھے اور پھر وہ آپ سے مجھ سے زیادہ بہتر جانتے تھے۔ دلیل اس کی کیا ہوتی ہے؟ ہم سے بہت پہلے، یہ نہیں کہتے اس میں بھی ایک تقدس ہوتا ہے، نبی اکرم ﷺ کے زمانے سے زیادہ قریب۔

مولانا اسلم جیراجپوریؒ کے سفرِ حج کے ایک واقعہ کا ذکر ان کی اپنی زبانی

ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ مولانا اسلم جیراجپوریؒ میرے استاد تھے، حج کے بعد وہ بڑی دلچسپ باتیں سنایا کرتے تھے قرآنی آدمی اپنی نگاہوں سے ہر چیز کو دیکھ کے آتے تھے۔ کہنے لگے مکہ کے ایک نان بائی کو میں نے دیکھا کہ وہ آوازیں دے دے کے بیچ رہا تھا کہ آج کی تازہ روٹی دو پیسے میں، کل کی باسی روٹی ایک آنے میں۔ میں نے اس سے پوچھا یہ آج کی تازہ دو پیسے میں کل کی باسی ایک آنے میں یہ

کا ہے کو؟ کہنے لگے وہ کل کی جو روٹی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے ایک دن قریب ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا اپنی ذات کے متعلق فرمان اور قرآن حکیم کے الفاظ میں آپ ﷺ کا مقام کبریٰ اور آپؐ کی عظمت

میں یہ نہیں کہتا کہ دوکاندار وہ چیز مذاق سے کرتا تھا' ہوسکتا ہے کہ عقیدتاً ہی کرتا ہو۔اوران کی کیا بات ہے یہاں تو عقیدہ ہی یہ ہے۔ایک ہی دلیل ہوتی ہے ان کے پاس یہ کہنے کے لیے' یہ تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے کا قرب ہے۔قرآن میں تو خود رسول کی زبان سے کہلا دیا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کے حکم کی معصیت کروں تو اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا۔آپ زمانے کا قرب کہہ رہے ہیں۔ہمعصر آپ ﷺ کے دیکھ لیجیے گا' عزیز ترین اپنے چچا یہ ابوجہل اور ابولہب تھے۔پورے قریش کی وہ جماعت جو سات سال تک میدانِ جنگ میں آ کے مخالفت کرتی رہی مخالفت کے اندر ہی انہوں نے جان دیدی لیکن اس طرف آئے نہیں۔ان سے زیادہ قریب تر بھی کوئی ہوسکتا ہے۔یہاں تو سوال ہی نہیں ہے۔یہ قرب نہ تو زمانی ہے' نہ مکانی ہے۔

ہمارے ہاں کے تراجم نے قرآن حکیم کے الفاظ کی حرمت اور عظمت کو بدل کر رکھ دیا ہے

قرب تو دراصل ان خصوصیاتِ کبریٰ کا ہے کہ جو اس ذات ﷺ کے اندر تھیں یا اس قرآن کی تعلیم کا ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔ لہٰذا اَلتَّآئِبُوْنَ (9:112) جہاں ذرا سا بھی معلوم ہوا کہ یہ غلط بات ہے فوراً اُدھر سے ہٹے تو اَلْعٰبِدُوْنَ (9:112) جھکے ہوئے اطاعت گذار اس کے احکام کے سامنے جھکنے والے۔اَلْحٰمِدُوْنَ (9:112) بڑی چیز ہے صاحب۔ایسے الفاظ ہیں کہ ایک ایک لفظ کے لئے ایک ایک درس ناکافی ہے۔مومن کی صفات تو قران حکیم نے بڑی جامعیت سے بیان کی ہیں سارے قرآن کی تعلیم اس کے احکام اس کے اوامر اور نواھی' یہ ساری چیزیں اس کے اندر آ جائیں گی۔وہ تو ایک چلتا پھرتا مرکزِ محسوس ہے جو قران کا مومن پیش کرتا ہے۔ اَلْحٰمِدُوْنَ (9:112) ہمارے ہاں تو یہ ہو گیا کہ اَلتَّآئِبُوْنَ صبح کے وقت اٹھ کے وہ ایک پورا وظیفہ استغفر اللہ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ' یا اللہ میری توبہ۔عابدون پرستش کرنے والے' حامدون الحمدللہ کہنے والے۔سوچئے عزیزانِ من! اگر یہ اتنی اتنی ہی سی باتیں جن سے عبارت ہو جاتا ہے ایک مومن جو انسانیت کی معراج ہے' کتنا سستا ہے یہ دین۔لیکن قرآن سے جب ان کے معنی پوچھئے تو پھر پتہ چلتا ہے۔

سورۃ فاتحہ میں دیئے گئے لفظ ''حمد'' کا قرآنی مفہوم کائنات کی پستیوں اور بلندیوں پر غور وفکر کرنے والا ہی سمجھ سکتا ہے

آپ کو یاد ہے سورۃ فاتحہ کتنے مہینے میں ختم ہوئی تھی پہلی سورۃ ۔ حمد: کسی نہایت فن کے امام کی شاہکار جو بہ ہمہ وجوہ مکمل بھی ہو' اور منفعتِ انسانیت کے لیے وجود میں آئی ہو' اسے دیکھنے کے بعد بے ساختہ زبان پر جو تحسین اور تبریک کے کلمات آجاتے ہیں' انہیں حمد کہا جاتا ہے۔ بلند ترین خالق کی نادر شاہکار جو اپنی جامعیت میں کمال تک پہنچی ہوئی ہو اور محض فن برائے فن نہ ہو' نوعِ انسانی کی منفعت کا وہ سرچشمہ ہو' ان کے ان پہلوؤں کو دیکھ کے بالا رادہ نہیں' بلا ساختہ زبان پہ جو تحسین کے کلمات آئیں سبحان اللہ کیا بات ہے صاحب!! یہ حمد ہوگی' ایسا کرنے والے الحامد ہونگے۔ کون ایسا کرے گا جی؟ کائنات کی ہر شئے' ایک ایک شے کو وہ لے گا۔ وہ جو سورۃ آل عمران میں ہے کہ یہ قرآن کے اندر اولی الالباب کے لیے نصیحت ہے' یہ حقائق ہیں۔

الحمدللہ کا لفظ کہنے کا حق صرف اولی الالباب کو ہے' مومن کو ہے

يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ(3:191) کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ایک ایک شے کے اوپر کھڑے ہو کے غور وفکر کرتے ہیں' تفتیش اور تحقیق کرتے ہیں۔ کھڑے بیٹھے لیٹے ہر وقت یہ چیزیں ان کے سامنے آتی ہیں گردشِ لیل و نہار پہ' تسبیح شمس و قمر پہ۔ اور اس طرح ان کے غائر مطالعہ کے بعد Scientifically ایک ایک چیز کو دیکھنے کے بعد' پھر یہ دیکھنے کے بعد کہ انسانیت کے لیے کس پہلو سے منفعت بخش ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد وہ کہتے ہیں رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا(3:191) اے ہمارے نشو ونما دینے والے تو نے تو ایک کانٹے کو بھی یہاں بے کار پیدا نہیں کیا ہے' ایسا نہیں کہ جو کسی کو نقصان دے۔ کون یہ چیز کہے گا عزیزانِ من! يَتَفَكَّرُوْنَ(3:191) غور وفکر کرنے والے' اولی الالباب عقل ہی نہیں بلکہ لب لباب جسے کہتے ہیں ''تت کڈیا ہوایا عقل دا''۔ اور وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ایک ایک چیز کائنات کی اس کا وہ تجزیہ کرتے ہیں تحقیق کرتے ہیں اس کے بعد وہ پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا(3:191) ایسا کرنے والا الحامد ہے۔ مومن کی صفت ''الحامد'' یہاں کہی گئی ہے۔ الحامدون۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات گھر کے کمرے میں یا اپنے ریاض کے حجرے میں بیٹھے ہوئے تو نہیں ہو سکے گی' یہ تو اشیائے کائنات پر غور وفکر کی بات ہے۔ کہا(السَّآئِحُوْنَ (9:112) سیر و تفریح کرنے والے' سیاحت یہاں سے ہے۔ ''الحامد'' تو ہوا ہی نہیں جا سکتا جب تک ''السآئحون'' والی بات نہ ہو۔ اب ان غور وفکر کرنے والوں کی بھی دو جماعتیں

ہو جائیں گی۔

کائنات کی تخلیق کے بارے اہل فلسفہ کی سوچ دو حصوں میں تقسیم ہے نمبر 1 اور نمبر 2

مغرب کے اندازِ نگاہ یا فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہر چیز کے متعلق کہ میٹریل ہے Automatically کچھ ہوتا چلا جا رہا ہے۔اس کائنات کے پیچھے نہ کوئی پلان ہے نہ کوئی ایسا خالق ہے نہ کوئی اس قسم کی Wisdom ہے۔ یہ کسی طرح سے ہنگامی طور پہ وجود میں آ گیا ہے ایک دفعہ کسی نے چابی دی ہے اس گھڑی کو یہ چلی جا رہی ہے بس اس کے بعد اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اس کے اوپر پہنچے ہیں اس نگاہ کے اوپر۔ ان کے نزدیک یہ قوانین صرف باہر کی کائنات میں ہیں۔ انسانوں کی زندگی کے متعلق اس قسم کے قوانین نہیں ہیں۔ وہاں انہیں اپنے جذبات کے تابع رہنا پڑے گا یا نظامِ مملکت کا زیادہ سے زیادہ وہ اتباع کریں گے۔ یہ جو ہیں اَلتَّآئِبُوْنَ (9:112) اور الْعٰبِدُوْنَ اور الْحٰمِدُوْنَ(9:112) اور السَّآئِحُوْنَ یہ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ(9:112) جھکنے والے۔

مذہبی تصورات کی نظری صورت گری صرف وعظ ونصیحت تک محدود ہوتی ہے

ویسے تو ان دونوں لفظوں رکوع اور سجدہ کے معنی جھکنے والے ہیں' قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے۔ لیکن جس طرح سے ان کا یہ پہلو پریکٹکل یا فزیکل جو سمبل ہے ہمارے ہاں رکوع اور سجدے کا یہ معنویت اس کے اندر ہے۔ ابتدائی دور کے اندر جب یہ نظام قائم ہوتا ہے اور یہ نظام کی جماعت بھی جو ابتدائی دور میں ہوتی ہے' مکمل ترین شکل کے اندر ابھی وجود میں نہیں آیا ہوتا۔ حافظے ہوتے ہیں ابھی اس کے اندر۔ جھکنا بھی ابھی اتنا ہی ممکن ہوتا ہے جتنا رکوع میں جھکنا ممکن ہوتا ہے۔ اور جب یہ نظام انتہائی شکل میں پہنچتا ہے تو یہ جھکاؤ سجدے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں' حیات کی ہر سانس کے اندر' رکوع اور سجدہ دونوں کے اندر دل کی رضامندی شامل ہوتی ہے۔ وہ تو لفظ اطاعت میں شامل ہوتی ہے ان کے اندر شامل کیوں نہیں ہوگی۔ قوانینِ خداوندی کے سامنے اس انداز سے جھکنے والے۔ چلیئے یہاں تک سارا کچھ نظر آتا تھا' انفرادی چیز ہے۔ تائب ہے' حامد ہے' سائح ہے' راکع ہے' ساجد ہے۔ یہ چیزیں تو نظر آتا ہے کہ انفرادی ہیں۔

مذہبی اندازِ فکر کے برعکس دین کی اطاعت کے لیے عملی طریق

دین تو انفرادی ہے ہی نہیں۔ یہ سارا کچھ کرنے والوں پہ ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (9:112) اپنی ذات تک یہ کچھ کرنے کے بعد آگے یہ بات آتی ہے پھر اس دنیا میں قرآن کے جو معروفات ہیں ان کا امر'

ان کا حکم دینے والے' وعظ کہنے والے نہیں ان کا حکم کرنے والے۔ جو چیزیں اس کے خلاف جاتی ہیں اَلنَّاھُوْنَ (9:112) ان کو روکنے والے۔ اس کے لیے تو اقتدار کی ضرورت ہے۔ اور جو لفظ تمکن ہے اس کی ضرورت ہے' قرآن کا لفظ ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (22:41) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکن حاصل ہوگا دنیا میں' انہیں اقتدار ملے گا اقامتِ صلوٰۃ کریں گے' ایتائے زکوٰۃ کریں گے' معروف کا حکم دیں گے' نہی سے روکیں گے۔ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے تو تمکن شرط قرآن نے قرار دیدی ہے۔ اس لیے کہ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد۔ یہ مذہب بن کے رہ جاتا ہے وہاں صرف وعظ ونصیحت آپ کرتے ہیں' امر و نہی نہیں ہوتا۔

مذہب کو ماننے والوں کے مقابلے میں دین پر عمل کرنے والوں کا عملی انداز اور شکل وصورت

یہ ایک نظام ہے۔ یہاں دیکھئے ترتیب کے اعتبار سے نظام کو قائم کرنے والے یہ لوگ ہیں جو پہلے اس معاہدے کے اندر آتے ہیں۔ سب کچھ اپنا اس نظام کے ہاتھوں بیچ دینے والے۔ جان بھی دینے والے مال بھی دینے والے' ذاتی اعتبار سے ان صفات کے حامل تائب' عابد' حامد یہ ساری صفات جو گنائی گئی ہیں۔ سیرت اور کریکٹر انکا انداز۔ اور اس کے بعد پھر یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والے' اقتدار ہاتھ میں لے کر۔ جامع طور پر وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ (9:112) سیدھی سی بات۔ جتنی بھی حدود یہاں مقرر کی ہیں خدا نے ان کی حفاظت کرنے والے۔ یہ بھی قرآن کا بڑا عجیب انداز ہے۔ یہ جو نظام ہے اس کو اس نے حدود کہہ کے پکارا ہے۔

مذہب کے مقابلے میں دین میں حدود متعین اور نمایاں ہوتی ہیں جبکہ ایک ریفری بھی ہوتا ہے

جیسا کہ میں سمجھانے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ کسی کھیل میں فٹبال کے میدان کے اندر جو لائنز لگائی جاتی ہیں' باؤنڈری لائنز جنہیں آپ کہتے ہیں وہ حدود ہوتی ہیں۔ ان حدود کی پاسداری کے بعد ان کے اندر رہتے ہوئے آپ کو پوری اجازت ہوتی ہے کہ جس انداز سے آپ چاہیں اس گیند کو گول میں لے جائیں۔ زندگی کے گیند کو اس کے نصب العین کے گول تک لے جانے کے لیے' یہ جو طریقِ کار ہے اس کی آزادی بھی ہے۔ لیکن پابندی اتنی بڑی ہے کہ یہ جو آپ کے ہاں کی لائنیں کھینچی ہوئی ہیں ان سے آپ تجاوز نہیں کر سکتے۔ لیکن ان لائنز کا متمیز اور نمایاں ہونا اور متعین ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو ٹی وی میں نظر آتی ہے گراؤنڈ اس میں کتنی نظر آتی ہیں ابھری ہوئی' سفیدی سے انہوں نے ابھاری ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر آپ کے ہاں لکھی ہوئی تو ہوں لائنز کہیں' اس بک لیٹ میں جو اس کے متعلق ہے' اس ضابطے کے اندر جس کے مطابق آپ نے کھیل کھیلنا ہے فٹبال کا۔ میدان آپ جائیں تو لائن لگی

ہوئی نہ ہو کوئی۔تو ان کی پاسداری کا سوال پیدا ہوگا یا وہ کھیل کھیلا جاسکے گا؟ لہٰذا کسی کتاب میں یہ لکھ دینا کہ حدود ہیں' یہ کافی نہیں ہے۔ حدود کا تعین اوران کا نمایاں طور پر ابھار کے سامنے لانا نہایت ضروری ہے۔کاہے کے لیے؟ تاکہ ریفری کو معلوم ہو جائے' فاؤل ہو گیا ہے۔حدود کے نمایاں ہونے کے بغیر تو یہ ہو ہی نہیں سکتا فیصلہ ہی کوئی نہیں کرسکتا۔حدود کا نمایاں ہونا ضروری ہے۔اوراس لئے بھی ضروری کہ اگر کہیں یہ تنازع ہو جائے کہ حدود پہ پاؤں آ گیا تھا کسی حد پہ یا نہیں آیا تھا' تو کوئی فیصلہ کرے کہ آ گیا تھا یا نہیں آیا تھا۔یہ سارے انتظامات ہونگے تو اس کے بعد زندگی کا کھیل کھیلا جائے گا پھر حدود اللہ کی پاسداری ہوسکے گی۔یہ تھا مقصد جو یہ کہا تھا کَـــــذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (2:143) تمہیں ایک ایسی قوم Equally Distant پیدا کیا ہے جو ہر وقت نگرانی کرے گی کہ نوعِ انسانی میں سے کون ہے جس نے ان حدود کو توڑا ہے۔تمہاری اپنی کیا کیفیت ہوگی۔کہا تمہارے اندر بھی ایک کیپٹن ہوگا۔(وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ) (2:143) وہ تمہاری نگرانی کرے گا کہ حدود کو کہیں توڑا تو نہیں۔

صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے ہدایت طلبی کی ضرورت اوراس کی فراہمی

عزیزانِ من! حدود کا محض نظری تعین کافی نہیں ہے۔متعین طور پہ نشان' بتانا' نمودار کرنا یہ نہایت ضروری ہے۔یہ جو لفظِ ہدایت ہے جہاں پہلی آپ کی آرزو ہے اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (1:4) ہماری راہنمائی کر صراطِ مستقیم کی طرف۔یہ ہدایت ان کے ہاں بولا جاتا تھا ایسے وقت میں' سمندر میں جہاز چلا جا رہا ہے پانی پانی ہے کوئی اور چیز نظر نہیں آتی۔وہاں یہ دیکھنا ہوگا آپ نے کہ کس طرف راستہ جاتا ہے کہاں خطرہ آتا ہے۔تو اس کے لیے وہ کہتے تھے کہ کوئی چٹان جو پانی سے ابھر کے سامنے آئی ہوئی ہو وہ اسے ہدایت کہتے تھے۔پانی میں ڈوبی ہوئی چٹان کو ''ہدایت'' نہیں کہتے تھے۔کیا قوم تھی یہ صاحب!!۔اس کا ابھرا نکھرا اوراجلا ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ دور سے نظر آ جائے کہ وہ ہے نشان۔تو حدود اللہ کی بھی یہ کیفیت ہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔

دینی نظام کی تشکیل انسانی صفات کی رہین منت ہوتی ہے اوران صفات کے حامل کو ہی مومن کہتے ہیں

وَ الۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰہِ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (9:112) کہا یہ ہیں مؤمن' انہیں خوشخبری دیدے کہ ان کی یہ جو بیع وشریٰ کا معاملہ ہے یہ ہے وہ جماعت جنہوں نے یہ معاملہ کیا ہے' انہیں اس کی خوشخبری دیدے کہ کتنا سستا سودا کر کے لے گئے ہیں۔یہ تھا دین عزیزانِ من! اسے کہا جاتا ہے اسلام۔مومنین کی صفات کے متعلق میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ بڑی جامع چیز ہے اورقرآنِ مجید سے یہ متعین طور پہ سامنے آنی چاہئیں۔کم ازکم اور کچھ نہیں تو یہی دیکھنے کے لیے کہ ہم میں کتنی صفات ہیں۔یہ صفات ہی تو ہیں جن سے کوئی شے عبارت ہوتی ہے۔سرخ رنگ کا کپڑا' سرخ رنگ کا اس وقت کہلاتا ہے جب اس میں سرخی ہو۔پھول کو آپ خوشبودار اس وقت کہتے

ہیں جب اس میں خوشبو ہو۔ پھر خوشبو بھی ایک خاص متعین قسم کی ہو' دوسری خوشبو کو اس سے آپ متمیز کر سکیں۔ اور اگر یہ صفات نہ ہوں اس کے اندر وہ شے ہی نہیں رہتی۔ سرخ کپڑے میں سرخی نہیں ہوتی تو سرخ کپڑا نہیں رہتا۔ یہ صفات اگر اس کے اندر نہیں ہیں تو وہ مومن نہیں رہ سکتا۔ مؤمنین کی صفات کے متعلق سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ لیکن کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جہاں اس نے جامعیت سے دو چار آیتوں کے اندر' ویسے تو ارتکازاً ہے' اختصار کے ساتھ ہے لیکن جامعیت سے ایک جگہ کچھ صفات بیان کر دی ہیں۔ پھر کچھ آیتیں ہیں جن کے اندر کچھ صفات اور بیان کر دی ہیں۔ ان آیات کو بھی اگر آپ اکٹھا کر لیں گے تو آپ کے سامنے مومن کا ایک محسوس نقشہ آ جائے گا کہ وہ کن صفات کا حامل ہوتا ہے۔ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے لیکن چلئے اس کا ایک گوشہ تو سامنے لے لیں۔

زندگی کے اس میدان میں صفاتِ مومن کی حامل یہی وہ ٹیم ہے جو انسانیت کو منزل مقصود تک رسائی حاصل کرنے میں مدثابت ہوگی

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ (23:1) کامیاب ہونگے یہ مومن' ان کی کھیتیاں پکیں گی۔ مؤمنون کہا ہے یہاں۔ الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ (23:2-3) ایک ایک لفظ تشریح طلب ہے' تشریح فرصت چاہتی ہے۔ وقت میں نے کہا ہے آج کے درس کا ہی بہت کم ہے۔ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ (23:2) صلوٰۃ خشوع۔ بہرحال تمام منصبی فرائض جو مومن کے ذمہ لگائے گئے ہیں' وہ صلوٰۃ کے اندر آ جاتے ہیں۔ وہ سارے قوانین و اقدار کہ جن کے پیچھے پیچھے چلنا ہوتا ہے' وہ نظامِ صلوٰۃ کے اندر آ جاتے ہیں۔ ان کا اتباع ہے اور وہ Mechanically اتباع نہیں ہے' دل کے جھکاؤ کے ساتھ وہ ہونا چاہیے۔ آگے وہ چیزیں آئیں گی تو میں عرض کرونگا کہ یہ خشوع اور خضوع اور خشیتِ باری تعالیٰ یہ تقویٰ اور خوف' ان الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ پھر بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ (23:3) لغو سے اعراض برتتے ہیں وہ۔ لغو ایک لفظ لے آیا' ہر بے نتیجہ بات' ہر مہمل کام۔ بلکہ ہر وہ بات کہ جو آپ کو اس سیدھے راستے سے روکنے والی ہو۔ اگلی سٹیج تو وہ آنی ہے جہاں النَّاهُوۡنَ (9:112) انہوں نے روکنا ہے اس چیز سے۔ جہاں تک اپنا تعلق ہے اور ابھی ان کے اقتدار کے تمکن نہیں ہے کہ ان کو اس طرح قانوناً اور اقتدار کے زور پہ روک سکیں۔ اپنے متعلق یہ کہا ہے مُعۡرِضُوۡنَ(23:3)' ایک طرف دامن بچا کے تو جا سکتے ہیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ لغویت انکے سامنے آ جاتی ہے' نہایت شریفانہ انداز سے اس کے پاس سے گذر جاتے ہیں دامن بچاتے ہوئے۔ یہ وہ سٹیج ہے جہاں ابھی روکنے کی بات نہیں ہے۔

حالات حاضرہ کے تحت ایک اہم سوال اور اس کا جواب

ہمارے ہاں بھی ایک فیشن چل پڑا ہے کہ ٹھیک ہے جی' یہ جتنی چیزیں آپ کہہ رہے ہیں ان کے اوپر تو عمل کیا جائے گا لیکن یہ تو ایک نظام میں عمل کیا جائے گا جب قرآن کی حکومت قائم ہوگی' اسلامی نظام آئے گا' اس وقت یہ سب کچھ ہوگا۔ گویا اس سے پیشتر انہوں نے اپنے لیے کچھ نہیں کرنا' نہ کوئی اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنی ہے' نہ کوئی خصوصیتیں پیدا کرنی ہیں۔ وہ نظام پھر کن کے ہاتھوں سے آئے گا؟ یعنی جن میں یہ صفات نہ ہونگی تو کیا ان کے ہاتھوں سے وہ نظام وجود میں آ جائے گا؟

زکوٰۃ کے موجودہ تصور کی نوعیت اور عصمت کی حفاظت کی اجتماعی اہمیت اور اہل یورپ کی حالت زار

ملاحظہ فرماؤ۔ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (4-23:3) عجیب الفاظ آتے ہیں۔ وہاں ہے الحج کے اندر اَلَّـذِيْنَ اِنْ مَّكَّـنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ (22:41) وہاں یہ چیز ہے ایتائے زکوٰۃ کہ جب تمکن ان کے ہاتھ میں ہوگا تو یہ حکومت زکوٰۃ دے گی۔ کھڑے ہو کے سوچنے کی بات ہے۔ زکوٰۃ اڑھائی پرسنٹ جسے آپ کہتے ہیں سال کے بعد' خیرات کے طور پہ خود ہی دیدیتے ہیں۔ بہت زور لگاتے ہیں کہتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا اپنا نظام ہونا چاہیے اس نظام میں حکومت کو یہ چیزیں اکٹھی کرنی چاہئیں۔ وہی اڑھائی پرسنٹ۔ تو حکومت کو لینی چاہئے یہ زکوٰۃ۔ لیکن وہ یہ کہہ رہا ہے اگر ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ زکوٰۃ دیں گے۔ تو یہاں سمجھنا پڑے گا کہ یہ تو کوئی اور چیز ہے جسے حکومت لیتی نہیں ہے دیتی ہے۔ یہ ہوتا ہے نوعِ انسانی کو سامانِ پرورش دینا نشو ونما دینا' زکوٰۃ کہتے ہی اس کو ہیں۔ یہ فاعلون کا لفظ خود یہاں کہہ رہا ہے کہ کچھ کام کرنا ہے۔

وَالَّـذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (23:5) قرآن عصمت کی حفاظت پر بڑا زور دیتا ہے عزیزانِ من! اور آج خود مغرب کے محققین جن کے ہاں عصمت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ انہوں نے سرے سے اڑا ہی دیا ہے یہ تصور۔ ان کے ہاں کے محققین بھی عمر بھر کی تحقیقات کے بعد اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ کوئی قوم جو اپنی عصمت کا تحفظ نہیں کرتی ''انون'' نے تو یہ لکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک وہ باقی رہ سکتی ہے اس کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس چیز کا اتنا گہرا تعلق ہے۔ انفرادی نہیں قومی اور اجتماعی زندگیوں کے ساتھ اتنا گہرا تعلق ہے۔ اور انفرادی طور پہ تو بہر حال پوچھئے کہ تحفظِ عصمت کرنے والے افراد میں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں' سائیکولوجسٹ ہیں یہ لوگ۔

عصمت کی حفاظت کے متعلق قرآن حکیم کی وضاحت نیز نزول قرآن حکیم کے وقت غلاموں اور لونڈیوں کے معاملے کا حل

قرآن نے یہ کہا ہے حفاظت کرتے ہیں اپنی عصمت کی۔ تو آگے بتایا ہے کہ یہ حفاظت وہ راہبوں کی طرح نہیں کرتے جوگیوں اور

سنیاسیوں کی طرح نہیں کرتے' عیسائیوں کی خانقاہیت کی طرح نہیں کرتے کہ ان کے ہاں شادی کرنا ہی جرم ہے' گناہ ہے۔ جو صحیح اور فطرت کا جائز طریقہ قرآن نے بتایا ہوا ہے اس سے اس جذبے کی تسکین کرتے ہیں۔ **اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ** (23:6) اس معاشرے کے اندر جب ہنوز پہلے سے آنے والے غلام اور لونڈیاں وہاں موجود تھیں معاشرے نے ان کو Recgonize کیا تھا۔ قرآن جب آیا ہے تو اس نے غلام اور لونڈیوں کا تو دروازہ بند کر دیا۔ لیکن جو چیز اس وقت تھی اس کو Overnight اس نے upset نہیں کیا' یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ جسے آپ کہتے ہیں کہ ان کو Regularise کیا ضابطے کے اندر لے آیا۔ اور ضابطہ یہ تھا کہ جنہیں تم نے اب لونڈیوں کی حیثیت دے رکھی ہے' ان کی حیثیت بیویوں کی ہو جائے گی۔ یہ اس طرح سے تمہارے ہاں قائم رہیں گی۔ آئندہ کے لیے دروازہ ختم ہوتا ہے۔ یہ تھا نظام۔ تو جہاں بھی قرآن میں آتا ہے تو ازواج تو وہ بیان کرتا ہے کہ جو اس معاشرے کے اندر اس سے پیشتر بیویوں کی حیثیت سے رکھی ہوئی ہوں۔ **مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ** (23:6) کہتا ہے جو اس معاشرے کے اندر ان کے ہاں اس انداز سے چلی آتی تھیں جنہیں اس نے پھر یہ پوزیشن' یہ مقام' یہ سٹیٹس دیدیا بیویوں کا۔ تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ بھی اس میں کور ہو جاتی ہیں اور ان کی پوزیشن یہ ہوتی ہے۔ اس سے کوئی ملامت نہیں ہے۔ **فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ** (23:7) اس کے علاوہ جو کوئی طریق اختیار کرے گا اس جنسی جذبے کی تسکین کا تو وہ حدود سے تجاوز کرنے والا قرار پائے گا۔

لفظ امانت کے قرآنی مفہوم کی اہمیت اور پھر وعدہ ایفا کے ثمرات کی نوعیت

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (23:8) یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد اور اپنے وعدوں کی بڑی رعایت رکھتے ہیں بڑی حفاظت کرتے ہیں۔ امانت کا لفظ ہمارے ہاں محدود سے معنی میں آ گیا کہ کوئی چیز کسی کے پاس کسی کی امانت ہے' کوئی شے جو آپ دوسرے کو دے کے اپنے آپ کو امن میں محسوس کرنے لگ جائیں۔ جو غم ملا اسے اس نے غم جاناں بنا دیا۔ بڑے سے بڑا راز' بڑی سے بڑی چیز' اپنی کوئی عزیز تریں شے' متاع ہو کوئی شے بھی جو ہو دوسرے کے بھروسے کے اوپر۔ یہاں تو تعاون ہے باہمی۔ باہمی تعاون کے بغیر تو معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ معاشرے کا لفظ تعاون کہتا ہے' یہ عشر سے ہے۔ اکائی یونٹ جو ہے وہ معاشرہ نہیں ہوتا یہ تو ایک ساتھ زیرو ملتا ہے تو یہ عشر بنتا ہے' یہ دو مل کے معاشرہ بنیں گے۔ سوسائٹی جسے آپ کہتے ہیں اس کے اندر تو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا ایک دوسرے کے ساتھ معاملات پڑیں گے۔ ان معاملات میں ہر وہ شے جو آپ دوسرے کے سپرد کر دیں۔ کیا عجیب قوم تھی کہ لفظِ امن سے ہی انہوں نے امانت بنائی۔ ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ دوسرے کے سپرد کر دے اور خود امن میں۔ جس کے سپرد کی

گئی ہے اب سوچئے اس کے اوپر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوگئی۔ مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ پھر اس کی پاسداری کرے۔ اسی طرح سے وعدہ جسے آپ کہتے ہیں یہ بڑی چیز ہے عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو یہ اب فیشن بھی نہیں رہا وعدے کا ایفاء۔ یونہی ہم کہہ دیتے ہیں کہ صاحب آؤ گے؟ ہاں ہاں آئیں گے یار' بھئی چار بجے آنا' ٹھیک ہے چار بجے آؤنگا۔ ادھر سے پہلے تو یہی چیز ہوتی ہے کہ جانا ہے تم نے' کہنے لگے صاحب کہاں جانا ہے میں نے۔ کہا تم نے اس سے کہہ دیا تھا' کہا میں نے کہا تھا انشاء اللہ آؤنگا۔ وہ ذمہ داری اس کے اوپر کہ اگر اُس نے چاہا تو۔ اور پھر اس کے بعد اگر جانا بھی ہے' وہ کہتا ہے میاں جاؤ چار بجے کا وقت دیا ہے' کہنے لگے پاکستانی ٹائم ہے۔ یعنی پوری کی پوری قوم کی کیفیت یہ ہوگئی ہے۔ آپ کہیں حماقت کر بھی بیٹھیں' معاف رکھیے حماقت کہہ رہا ہوں کہ ٹھیک وقت پہ پہنچ ہی جائیں' جا کے پچھتانا پڑتا ہے۔ بیٹھے ہیں آپ اکیلے۔ عہد' وعدہ۔ اور یہ جو آپ کو ہر بات میں انتظار کرنا پڑتا ہے' یہ وعدہ خلافی ہے۔ صبح ہی ہمارے ہاں جو ابتداء ہوتی ہے بسم اللہ آغازِ سحر' جنہیں عادت ہے وہ اخبار دیکھنے کی ہوتی ہے۔ لگا رہے ہیں چکر دروازے کے باہر' روز آجاتا تھا یہ پانچ بجے' پتہ نہیں کیا ہوا۔ وہ تو اس کی مرضی پہ منحصر ہے' پھینکنے پہ آئے تو پانچ ہی بجے پھینک دے نہ آئے آٹھ بجے تک نہ آئے۔ مستقل طور پر کیا ہوا' کہ بجلی فیل ہوگئی اس لیے اخبار دیر سے نکلا۔ آپ دیکھئے اس دوران میں وقت۔ بس سٹینڈ کے اوپر کھڑے ہو جایئے' بس والے نے وعدہ کیا تھا کہ یہاں چار بجے آئے گا۔ دوکاندار سے معاملہ کیجیے کہ دیکھئے بڑی اہم چیز ہے شادی کا معاملہ ہے' فلاں دن آپ کو یہ دیدینا ہوگا' بالکل پکی بات ہے۔ آپ کر کے دیکھ لیجیے۔ بیس آدمیوں سے معاملہ آپ کا پڑا ہوا ہے' بیس آدمیوں نے آپ سے وعدہ کیا ہوا ہے' یہ آپ کے ہاں تقریب آرہی ہے۔ اول تو ان میں سے کوئی ملتا ہی نہیں ہے' ملتا ہے تو چلیے صاحب آپ' میں لے کے آیا''آپ اوگو جرانوالے ٹُر جاندااے''۔ بات بڑی چھوٹی چھوٹی ہے۔ آپ کو پتہ ہے ہوتا کیا ہے؟ پہلی چیز تو یہ کہ آپ کو پتہ کہ جسے زندگی کہتے ہیں' زندگی ہوتی کیا ہے؟ وقت کے مجموعے کا نام زندگی ہوتی ہے' کچھ نہیں ہے اور زندگی۔ اُس میں سے آپ کی زندگی کا اتنا حصہ اس طرح سے کٹ جاتا ہے۔ اور اس میں سوتے میں بھی کٹتا ہے۔ یہ آپ کا جس اضطراب میں کٹتا ہے جو ذہنی کوفت آپ کو ہوتی ہے' یہ ہے وہ قدم قدم کی Friction جس سے اعصاب پہ آپ کے اثر پڑتا ہے۔ یہ جو آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ قوم اس میں سہار ہی نہیں رہی' برداشت کا مادہ ہی نہیں رہا۔ جس قوم کے ساتھ صبح سے سوتے وقت تک یہ کیفیت ہو کہ قدم قدم کے اوپر اس کے ساتھ ایک Friction کی چیز آرہی ہے' اس کے اعصاب کس طرح سے ساتھ دیں گے۔ یہ جتنا وقت آپ کھڑے ہیں' کچھ پتہ نہیں کہ بس کس وقت آئے گی دھوپ میں دھکم پیل میں' وقت پہ پہنچنا ہے دفتر میں یا کسی اور جگہ' ٹائم نکلا چلا جا رہا ہے اس کا پتہ کچھ نہیں ہے۔ سوچتے ہیں آپ کہ اعصاب پہ گذرتی کیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جونہی آپ دفتر میں جاتے ہیں پہلی چیز جو آپ کی منشاء کے خلاف ہوتی ہے' وہاں

جا کے یہ سارا غصہ نکلتا ہے جو بس سٹینڈ پہ چڑھا تھا۔زندگی قوم کی اس طرح سے گذر رہی ہے صاحب۔آ کے ہمیں بتاتے ہیں اور وہ واقعہ بھی ہے کہ ہم نے دیکھا یورپ کی اقوام میں اور وہاں ہم نے دیکھا لندن میں! لوگوں میں بڑا سہار ہے' بڑی برداشت ہے۔ٹھیک ہے' کس چیز سے ہے؟ پوری قوم کی یہ کیفیت ہے کہ وہاں اس قسم کی Friction ان کے ہاں نہیں ہوتی۔نہایت Smoothly ہر چیز اپنے اپنے وقت کے اوپر ہوتی چلی جاتی ہے' آپ کو تاؤ ہی نہیں آتا' آپ کے اعصاب ٹوٹتے ہی نہیں ہیں۔آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن ان چیزوں کو جو بظاہر چھوٹی چھوٹی سی چیزیں ہیں: مومن کا شیوہ یہ ہے کہ جب کسی کی امانت اس کے پاس آتی ہے' خواہ وہ راز کی چیز ہو وہ امن میں ہو جاتا ہے کہ اب مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے' نہایت محفوظ ہاتھوں میں چلی گئی۔جب یہ وعدہ کرتا ہے اپنے آپ کا' یہی وعدہ نہیں بلکہ جو چیزیں پروگرام کے مطابق اس قوم میں ہونی ہوتی ہیں' ہر چیز شیڈول اور پروگرام کے مطابق ہوتی چلی جاتی ہے۔یہ ہیں وہ لوگ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ (23:10-11) وہاں کا فردوس تو بہرحال جا کے دیکھیں گے۔اگر یہاں ہوں یہ افرادِ معاشرہ عزیزانِ من! اور ان میں ہو چلنا پھرنا آپ کا' یہاں فردوس آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔اور وہ جو الجنة اس نے دینے کا وعدہ کیا تھا یہ ہیں وہ لوگ جو آپ کو الجنة دے رہے ہیں قدم قدم کے اوپر۔سورۃ التوبہ کی آیت 112 تک ہم آئے۔مؤمنین کی صفات کی اور آیات بھی ہیں میں سمجھتا ہوں اگلے درس میں ہم ان آیات کو بھی لے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

انیسواں باب: سورۃ توبة (آیات113 تا114)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صفاتِ مومن کی مزید تفصیل

عزیزانِ من! آج جولائی 1973ء کی 8 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 113 سے ہوگا۔

صفات مومنین قرآن حکیم کے آئینہ میں

پچھلے درس کے آخر میں 112 آیت میں مؤمنین کی کچھ صفات سامنے لائی گئی تھیں۔ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (9:112) قرآنِ کریم میں دیگر کئی ایک مقامات پر مؤمنین کی صفات صفاتِ خداوندی کے انداز میں علیٰ حدِ بشریت مختلف مقامات میں بکھری ہوئی ہیں۔لیکن بعض آیات ایسی ہیں جن میں انہیں ایک تسبیح کے دانوں کی طرح ایک رشتے میں پرودیا گیا ہے یا انہیں جامع حیثیت سے سامنے لایا گیا ہے۔تو میں نے عرض کیا تھا کہ اس آیت کے ساتھ ہی وہ دو چار آیات بھی سامنے آجائیں تو تصریفِ آیات کے اصول کے مطابق بات زیادہ واضح ہوجائے گی۔ اس میں سے ایک مقام سورۃ المؤمنون کی پہلی آٹھ نو آیات ہیں۔ یہ پچھلے درس میں سامنے آگئی تھیں۔قریب قریب انہی کا اعادہ قرآنِ کریم نے سورۃ المعارج میں کیا ہے۔لیکن وہاں انداز ذرا سا مختلف ہے۔ قرآن کا خصوصی انداز جو میں کہا کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ By Contrast تضاد کی رو سے اپنے مطلب کو زیادہ واضح کیا کرتا ہے۔ بات اس انداز سے اس نے پیش کی ہے۔

احکامِ خداوندی کے برعکس گریز کی راہیں نکالنے والے کا طرزِ عمل

کہا ہے جہنم کے متعلق تَدۡعُوۡا مَنۡ اَدۡبَرَ وَتَوَلّٰی (70:17) جہنم آوازیں دے دے کر بلائے گا اُسے۔ دو لفظ ہیں اس میں۔ کیا عرض کیا جائے قرآن کی جو آیت بھی سامنے آتی ہے ایک آئینہ ہوتی ہے حقائق کا۔ اور اتنی سمٹی ہوئی شکل میں یہ چیز ہوتی ہے کہ اسے کھولتے چلے جایئے تو ایک زمانہ بنتا چلا جاتا ہے۔ آوازیں دے دے کر بلائے گا جہنم۔ کسے؟ اَدۡبَرَ وَتَوَلّٰی (70:17) یا تو وہ کہ جس کے سامنے صحیح نظامِ حق اور صداقت کو پیش کیا اور وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا۔ ٹھیک ہے اس نے بھی انکار کیا ہے' انکار اس کا کھلا ہوا تھا وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا۔ ایک اور گروہ بھی ہے وہ ہے تَوَلّٰی (70:17) کا گروہ کہ جس نے گریز کی راہیں نکالیں اس میں سے۔ انہیں وہ آوازیں دے دے کر بلائے گا۔ کون ہیں یہ لوگ۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی کہ وَجَمَعَ فَاَوۡعٰی (70:18) ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ مال کو جمع کرتے تھے' برتن میں ڈالتے تھے اور پھر اس کے اوپر ڈھکنا دیدیتے تھے کہیں ہوا تک نہ اس کی نکلنے پائے۔

قرآن حکیم نے مال و دولت کو جمع کرنے کے برعکس ''انفاق'' کی اصطلاح استعمال کی ہے

قرآن کا بنیادی اصول آپ کو معلوم ہے وہ دولت کو ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اسے جمع رکھ کر دوسروں کو ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں کرتا۔ اصول اس کا انفاق ہے۔ پوری محنت سے پیدا کرو اور جو کچھ پیدا کرو اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لے کر' باقی دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کھلا رکھو۔ یہ ''خرچ کرو'' اس کا ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ انفاق ہے جس کے معنی ہی ہوتے ہیں دونوں سرے کھلے رکھنے۔ یہ بنیادی اصول ہے اس کا۔ ایک تو وہ دولت کو کہیں رکنے ہی نہیں دیتا۔ لفظِ دولت اس کے معنی ہی جو گردش میں رہنے والی چیز ہے۔ کسی ایک مقام پہ اگر پانی رک جائے تو وہ آبِ رواں نہیں رہتا' وہ جوہڑ بن جاتا ہے اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ دولت کو جمع نہیں کرنے دیتا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اس دولت کو جو کسی کی ضروریات سے زائد ہے' ان لوگوں کی ضروریات کے لیے کھلا رکھتا ہے جن کی ضرورتیں ان کی محنت سے پوری نہیں ہوتیں۔

قرآن حکیم کی کھلی وضاحت کے بالمقابل ڈھائی پرسنٹ کا شرعی فتویٰ

یہاں دیکھئے کس چیز کو نمایاں کیا ہے۔ آوازیں دے دے کر بلاتا ہے انہیں کہ جب اس نظام کو پیش کیا تو انہوں نے کھلے بندوں انکار کیا' پیٹھ موڑ کر چل دیے کہ ہمیں یہ منظور نہیں ہے ہم اس پہ نہیں آنے کے لیے تیار۔ دوسرے وہ جنہوں نے اس طرح سے کھلے بندوں انکار تو نہیں کیا اس میں سے گریز کی راہیں نکالتے رہے۔ کتنا خوبصورت لفظ ہے کیسا جامع نقشہ ہے ہمارا۔

مال جتنا جی چاہے جمع کیجیے کہہ دیا گیا کہ اس کے اوپر کوئی حد بندی عائد ہی نہیں کی جا سکتی۔ بے حدونہایت جمع کیا جا سکتا ہے۔ بس اس میں جو شرعی واجبات ہیں وہ دیدیے جائیں، زکوٰۃ دیدی جائے، کچھ خیرات دیدی جائے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ جہنم ان کو آوازیں دے دے کر بلائے گی کہ جس نے جمع کیا مال کو پھر اس پہ ڈھکنا دیدیا۔ اور چونکہ موضوع دوسرا ہے اس لیے میں صرف اشارے کر کے ان آیت سے آگے بڑھ جاتا ہوں ان کی وضاحت تو اپنے مقامات پر ہوگی۔

کیا انسان کی کوئی فطرت ہوتی ہے؟

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (70:19-20-21) کہتا ہے انسان کی کیفیت یہ ہے کہ بڑا ہی جسے ہمارے ہاں ندیدہ کہتے ہیں، سیر چشمی جس کے اندر نہ ہو، استغنیٰ نہ ہو، تھڑدلا ہو، بے حوصلہ ہو، تنگ نظر ہو۔ ایک لفظ کے اندر یہ سب باتیں آ جاتی ہیں۔ کیفیت اس کی یہ ہے۔ پھر ضمناً ایک سوال آ گیا یہاں کہ کیا انسان ایسا واقع ہوا ہے؟ ہمارے ہاں ایک عام چیز ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ دینِ فطرت کے معنی کیا ہیں؟ کہ یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہ انسانی فطرت کیا ہے؟ کہ انسان جیسا پیدا ہوتا ہے اگر باہر کے خیالات اس کو متاثر نہ کر دیں تو جن خیالات پر وہ پھر آگے بڑھے گا، وہ عین فطرت کے مطابق ہونگے اور وہ عین اسلامی ہونگے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایسے واقعات سامنے آئے ہیں۔ بچے پیدا ہوئے اور وہ انسانی دنیا سے Cut-off ہو گئے، الگ ہو گئے۔ جانور اٹھا کے لے گئے، کسی جنگل میں رہے۔ یعنی دوسرے انسانوں کا ان کے اوپر اثر نہیں ہوا۔ یہ جو کہتے تھے کہ دوسرے انسانوں کے اثرات سے محفوظ رہے بالغ یا بچے کی کیفیت میں اس کے دل و دماغ اس کے خیالات اس کے جذبات وغیرہ ہونگے، وہ فطرت کے مطابق ہے اور اسلام ان کے مطابق ہے۔ اکبر بادشاہ نے خود اس کا تجربہ کیا تھا یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی فطرت کیا ہوتی ہے۔ حادثاتی طور پر بھارت میں کئی بچے جنگوں سے ملے تھے اور اب تو سائیکولوجسٹ لیبارٹری میں یا کلینک میں یہ تجربے کرتے ہیں کہ بچے پہ خارجی ماحول کے اثرات نہ ہونے دیے جائیں تو وہ کیا ہوتا ہے۔ ان تجارب سے یا حادثوں سے جو بچے ملے ہیں نظریہ آیا کہ بالکل حیوان ہوتے ہیں۔ بس قریب قریب یہ جو بن مانس جیسے ہوتا ہے اس قسم کے ہوتے ہیں یہ۔ کوئی انسانی خوبی ان کے اندر نہیں ہوتی۔ تو آپ سوچئے کہ کس قدر غلط تصور ہے جو دیا جاتا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے یعنی انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ اور انسانی فطرت وہ ہے کہ جس پہ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اسے اگر خارجی ماحول سے غیر متاثر رہنے دیا جائے تو جو کچھ وہ بنے گا، وہ عین اسلامی ہوگا۔ وہ ایسا بچہ انسان تو ایک طرف رہا آدمیت کی سطح پہ بھی نہیں آتا، وہ حیوانی سطح پہ ہوتا ہے۔ ساری چیزیں اس میں حیوانات کی سی ہوتی ہیں۔

کیا انسان کو خدا نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا؟ انسان تو جلد باز بھی ہے جھوٹا بھی جاہل بھی ہے اور لالچی بھی

اتنا ہی نہیں پھر آگے ایک اور ظلم کیا ان لوگوں نے تو کہا کہ وہ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا [30:30] سورۃ الروم کی آیت تیسویں اس کی تفسیر کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے۔ایک قدم اور آگے۔تو گویا جو کچھ یہ بچہ اپنے ماحول اور ماں باپ کے اثرات کے بغیر' یہ فطرتِ انسانی وہ ہے کہ جو خدا کی فطرت ہے۔اگر بنیاد میں ایک اینٹ غلط رکھ دی جائے' ٹیڑھی رکھ دی جائے' تو 'تا ثریا می رود دیوار کج' آسمان تک دیوار ٹیڑھی چلی جاتی ہے۔ایک کے بعد دوسرا داغلط' لگا ہوا ہے۔اور پھر چلے جا رہے ہیں ہزار برس سے ایک بات کو کہتے ہوئے' سوچتے ہی نہیں کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں۔چلیے یہ باہر کے تجارب ان کی باری نہ آئی' نہ علم ابھی اتنا وسیع ہوا۔وہ کم از کم قرآن میں تو دیکھ لیتے کہ اس نے کیا کہا ہے۔قرآنِ کریم میں جہاں بھی الانسان آتا ہے اور اس کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ بعینہٖ وہی چیزیں ہیں جو یہ بچے بن کے آئے تھے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے' بالکل حیوانی صفات۔تو ان مقامات میں یاد رکھیے الانسان سے مراد ہے وہ انسان کہ چیزیں وحی نے ضابطۂ اخلاق نے دنیا میں دی ہیں جو ان کے تابع اپنے آپ کو نہیں رکھتے تو جو ان کی سیرت و کردار بنتی ہے' جو جذبات ان کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔قرآن نے وہ جذبات گنائے ہیں کہ انسان کو اگر علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایسا ہوتا ہے۔اور یہ ایک مقام نہیں ہے' متعدد مقامات میں یہ چیزیں آئی ہیں اور ان مقامات کو اگر اکٹھا کر لیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بالکل ایک حیوان' ایک درندہ' ایک جانور نظر آتا ہے۔وہی صفات اس کے اندر جن کو Animal Instincts آپ کہتے ہیں حیوانی جبلتیں' بالکل ان کا مرکب ہوتا ہے۔وہی ہے جو قرآن نے ذکر کیا ہے الانسان کے متعلق۔جلد باز پیدا ہوا ہے' ھَلُوْعًا پیدا ہوا ہے' ظالم ہے' جاہل ہے۔یہ انسان کے متعلق کہا ہے قرآن نے۔تو الانسان پھر یہی ہے جسے یہ کہتے ہیں کہ وہ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے۔جب قرآن کہتا ہے کہ پیدا ہی کیا ہے اس قسم کا تو پھر پیدائش کے اعتبار سے تو وہ ایسا ہوتا ہے۔یہ کہتے ہیں پیدائش کے اعتبار سے وہ اسلام پر ہوتا ہے' وہ دینِ فطرت پر ہوتا ہے' وہ فطرت اللہ پر ہوتا ہے۔اور فطرت اللہ انسان والا انسان اور چھوڑ دیجیے اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا (70:19) تو یہاں بتایا ہے قرآن نے۔وہ فرق جو غالب نے دو لفظوں میں کہا تھا کہ

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

فطرت کا لفظ تو صرف مجبور کے لیے مختص ہے

اس نے تو آدمی اور انسان میں فرق کیا تھا۔قرآنِ کریم لفظ انسان کا ہی استعمال کرتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ انسان کو اگر علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا

جائے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (33:72) کہنے سے مطلب یہ تھا کہ قرآن میں جہاں یہ چیزیں آئی ہیں کہ انسان کو ایسا پیدا کیا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں انسانی فطرت نہیں ہے۔ یاد رکھیے! انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ فطرت اس اٹل خصوصیت کو کہتے ہیں جس کے بدلنے کا اسے اختیار نہ ہو۔ پانی کی فطرت ہے نشیب کی طرف بہنا' آگ کی فطرت ہے گرمی پہنچانا۔ فطرت مجبور کی ہوتی ہے۔ ایک خصوصیت اس کے اندر رکھ دی جاتی ہے جسے وہ بدل نہیں سکتا۔ جسے صاحبِ اختیار بنایا گیا ہو اس کی فطرت نہیں ہوتی اس کے اندر Potentialities ہوتی ہیں اس کے اندر کچھ بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اور یہ پھر اسے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس بننے کے لیے یہ چیزیں تو ہم بتاتے ہیں کہ ایسا ایسا کرو گے تو یہ اس قسم کی صلاحیتیں تمہاری Develop ہو کے تمہیں یہ بنا دیں گی۔ جو کچھ قرآن کے مطابق بننا ہوتا ہے' اُسے وہ مومن کہتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں بڑی جامع چیز ہے۔ قرآن کے متعلق اس نے کہا ہے اور میں سمجھتا ہوں اس سے جامع ایک مصرعہ میں کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔ وہ کہتا ہے کہ قرآن

آنچہ حق میں خواہد' آں سازد ترا

آدمی کو انسان خود بننا ہوتا ہے اور یہی قانون فطرت ہے

خدا جو چاہتا ہے کہ تو اس قسم کا بن جائے قرآن تجھے اس قسم کا بنا دیتا ہے۔ تو انسان فطرت کے لحاظ سے اس قسم کا بنا ہوا پیدا نہیں ہوتا اس میں بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (95:4) Potentialities کے اعتبار سے جو صلاحیتیں ہم نے دی ہیں یہ تو احسنِ تقویم میں ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (95:5) یہ کم بخت اپنے آپ کو پست ترین درجے میں لے جاتا ہے۔ فطرت والا تو نہ اپنے مقام سے اونچا ہو سکتا ہے نہ نیچے ہو سکتا ہے نہ اس میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ Nature کہتے ہی اس کو ہیں' یہ Laws of Nature جنہیں آپ کہتے ہیں قوانینِ فطرت' اٹل قوانینِ فطرت۔ جتنی اشیائے کائنات فطرت کے قوانین پہ چل رہی ہیں وہ ان میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتیں۔ تو یہ سارے تصورات آپ کے ہاں باہر سے لائے ہوئے' مستعار تصورات ہیں اور وہ عینِ اسلام بنا کے دکھا دیے گئے ہیں۔ پہلے دور میں تو چل جاتی تھی بات' اب جو علم اور تحقیقات اس قدر وسیع ہو رہی ہیں یہ اسلام جو آپ پیش کرتے ہیں دنیا کے سامنے' وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میرا اور آپ کا نہیں عزیزانِ من! آپ اسے خدا کا دیا ہوا اسلام کہہ کے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ عام دنیاوی علم کی کسوٹی پر بھی پورا نہیں اترتا۔ آپ سوچیے ہم نے اسلام کے خلاف کتنا بڑا ظلم کیا ہوا ہے۔ بات اور آ رہی تھی۔ ضمناً بات سامنے آتی ہے جی نہیں چاہتا اُسے چھوڑ کر آگے نکل جانے کو۔

انسان کی نفسیاتی کیفیت تو یہ ہے کہ یہ بڑا بے صبرا واقع ہوا ہے

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا (70:19) ان کی کیفیت یہ ہے کہ اس قدر بے صبرا سا واقع ہوا ہے۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ۙ وَاِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا (70:20-21) ذرا سی تنگی آتی ہے تو واویلا مچانا شروع کر دیتا ہے۔ جز کہتے ہیں' ویسے سب کچھ ہوتے سوتے یہ کہتے ہیں' ہے نہیں ہے نہیں' مر گئے لٹ گئے' چھوٹی سی تکلیف آنے پر جو کچھ کیا کرتا ہے۔ کہتا ہے کیفیت اس کی یہ ہے کہ ذرا سی کوئی چیز اس کی خلافِ منشاء ذرا سی تکلیف کی کیفیت پیدا ہو تو چیخنے چلانے لگ جاتا ہے کہ ادئے میں مر گیا۔ اور جب خوشحالی کی کیفیت آتی ہے تو اس وقت بجائے اس کے کہ یہ سوچے کہ ایسے اور بہت سے لوگ ہیں جن کے پاس نہیں ہے اور میرے پاس اتنا زائد پڑا ہوا ہے کہ صرف کرنے کے لیے جگہ کوئی نہیں۔ لیکن کیا کیفیت ہوتی ہے؟ مَنُوۡعًا (70:21) وہ پھر روک کے بیٹھ جاتا ہے۔ وہی جو آخری آیات میں ہے اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يُكَذِّبُ بِالدِّيۡنِ (107:1) عجیب وغریب ہیں وہ چیزیں۔ فَذٰلِكَ الَّذِىۡ يَدُعُّ الۡيَتِيۡمَ ۙ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ؕ فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۙ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ (107:2-3-4-5) تباہی ہے ان مصلین نمازیوں کے لیے کہ نماز کے مقصد سے' اس کی غایت سے ہی بے خبر رہتے ہیں۔ اور ان کی کیفیت ہوتی ہے یہ يَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) رزق کے اس چشمے کو جسے بہتے ہوئے رہنا چاہیے تھا اس کے آگے بند لگا دیتے ہیں' روک لیتے ہیں۔ میں نے اس لیے وہ آیت پڑھی کہ وہ جو وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) ہے مَنُوۡعًا (70:21) یہاں ہے' روک دیتے ہیں بند لگا دیتے ہیں۔ وہی ہے جو کہا ہے وَجَمَعَ فَاَوۡعٰى (70:18) کیفیت یہ ہے کہ ضرورت سے ذرا زیادہ ان کے پاس آتا ہے تو اس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ وہاں بند لگا دیتے ہیں۔ اس بند لگانے کی شکلیں ہر زمانے میں بدلتی رہیں گی۔ آج کے دور میں جو کہتے ہیں کہ صاحب' یہ قلت مصنوعی پیدا کر دی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے اشیائے صرف میں اتنی گرانی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ مَنُوۡعًا (70:21) ہی تو ہوتا ہے۔ یہ چیزوں کا فقدان نہیں ہوتا' وہ موجود ہوتی ہیں' ان کو روک لیا جاتا ہے۔ اور یہ ساری تباہی کی بنیاد اس پہ ہے کہ یہ جو آپ کے ہاں چیزیں خریدنے سے ملتی ہیں۔ بہرحال یہ بات دوسری طرف نکل گئی۔

کہا کہ جہنم آوازیں دے دے کے بلائے گا جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ صحیح نظامِ زندگی سے پیٹھ موڑ کے چلے جاتے ہیں یا اس میں سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں۔ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ بڑا ہی بے صبرا واقع ہوا ہے تھوڑی سی مصیبت آ جائے واویلا مچا دیتا ہے۔ خوشحالی کا زمانہ ہو تو پھر سارا کچھ سمیٹ کے بیٹھ جاتا ہے۔

صلوٰۃ کی غایت سے بے خبر مصلّین کا کردار اور جو مصلی ہیں ان کا طرزِ عمل

کہا اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ (70:22) مصلین کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ وہاں بھی یہ صورت تھی کہا فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ (5-107:4)۔ تو اب مصلین وہ ہوئے کہ جو صلوٰۃ کی غایت سے بے خبر نہیں رہتے' اس کو سامنے رکھتے ہیں۔ ایک صلوٰۃ اس نے یہ کہی ہے کہ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ (107:6) وہ صلوٰۃ یہی جانتے ہیں کہ جو کچھ دوسرا دیکھ سکتا ہے' وہ جو مرئی Visible حرکات وسکنات اس کی ہوتی ہیں بس وہ ہے صلوٰۃ۔ کہیں آپ مسجد میں جا کے دیکھ لیجیے امام مسجد کو جو سامنے دیکھتا ہے' نماز نہیں ہوئی بھئی تمہاری' تمہارے پاؤں کے درمیان فاصلہ کم رہ گیا تھا' ہاتھ پورے اوپر تک نہیں اٹھے تھے' سینے پہ نہیں باندھے تھے' نیچے باندھے تھے' رکوع میں اتنا نہیں جھکا تھا' سجدے میں اتنا نہیں گیا تھا۔ جس کا یہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے تو کہا الحمد للہ نماز ٹھیک ہوگئی آپ کی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اگر وہ؟؟؟ ہے تو الفاظ جو ہیں وہ صحیح مخرج سے نکلے' تلفظ صحیح ہو۔ یُرَآءُوۡنَ جو چیزیں دیکھی جاسکتی ہوں۔ نہ دیکھنے والی چیز کونسی تھی۔ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) کسی نے دیکھا نہیں کہ رزق کے سرچشموں پہ بند لگا کے' نماز پڑھنے آ گیا۔ وہاں یہ ایک چیز دی تھی کہ جو مصلین اپنی صلوٰۃ کی غایت سے واقف نہیں۔ بالکل یہی چیز یہاں کہی گئی ہے۔ جہنم آوازیں دے کے بلائے گا ان کو جن کی یہ کیفیت ہے' انسان بڑا بے صبرا واقع ہوا ہے یہ اس کی کیفیت ہوتی ہے۔ اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ (70:22) لیکن مصلین کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔

صلوٰۃ کا لفظ (وسیع تر مفہوم رکھنے کے باعث) زندگی کی پوری روش کا ہی دوسرا نام ہے

اب نظر آ گیا کہ قرآن کی رو سے مصلی کہیں گے کسے۔ وہ تو آپ نمازی کہہ دیجیے بات ہی کہیں اور چلی جاتی ہے۔ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ (70:23) صلوٰۃ کوئی ایک وقتی اور ہنگامی شے نہیں ہے یہ تو زندگی کی پوری روش کا نام ہے۔ اور اس روش میں پہلی چیز یہاں یہ دکھائی کہ وَجَمَعَ فَاَوۡعٰی (70:18) والی رسم اس میں نہیں ہوسکتی۔ محنت کرنا ہے' کھلے رکھنا ہے۔ صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ (70:23) ایک دائم مسلسل زندگی کی نہج اور روش کا نام ہے جسے صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ وَالَّذِیۡنَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ۙ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (25-70:24) دیکھئے Contrast (تضاد) اس کا آ گیا ہے۔ صلوٰۃ یہ ہے۔ وہی جو وہاں کہا تھا دین کی تکذیب وہ کرتا ہے' ان کا احترام نہیں کرتا کہ جو تنہا رہ جاتے ہیں۔ جتھے اور پارٹی والوں کا احترام ہوتا ہے۔ جو اپنی محنت سے اپنی ضروریات پوری نہیں کرتے' ان کے رزق کے سامان کے لیے تحریک نہیں کرتا۔ خود بھی نہیں کچھ دیتا' پھر تحریک بھی نہیں کرتا اس کے لیے نظام قائم نہیں کرتا۔ اور یہاں بھی اس کے برعکس کہا کہ یہ مصلین وہ ہیں کہ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (25-70:24) ان کے مال میں حق ہے اور حقِ معلوم ہے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے یہ۔ سائل اور محروم۔ سائل تو وہ صاحبِ احتیاج

ہوتا ہے کہ جن کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہوں اپنی محنت سے اور کچھ باقی رہ جاتی ہوں۔ تو محروم ایسے معذور ہوتے ہیں جو کچھ بھی نہ حاصل کرنے کے قابل ہوں۔ ان سب کے لیے مصلین کے مال میں ایک حق ہے As of right اس میں سے یہ لے سکتے ہیں خیرات کے طور پہ نہیں۔ اور وہ حق حقِ معلوم ہے Recognized ہے اور معلوم ہے اسے۔

مصدق کا مفہوم یہ ہے کہ مومن جس چیز کو تسلیم کرے وہ اسے عملی طور پر اختیار بھی کرتا ہے

وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (70:26) یہ میں نے کہا تھا مؤمنین کی صفات یہاں بھی چلی آ رہی ہیں۔ اور یوں وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ یہ جو مصدق والی بات قرآن نے کہی ہے یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ ایک تو صرف مان لینا ہے کہ میں اسے سچ مانتا ہوں۔ ابتداً اس کی ضرورت ہے کہ کسی شے کو پہلے آپ سچ مانیں۔ لیکن اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ جس چیز کو آپ سچ کہتے ہیں اسے اپنے عمل سے سچ کر دکھائیں۔ اسے کہتے ہیں مصدق۔ یہ جو قرآنِ کریم کے متعلق ہے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (2:97) اہلِ کتاب سے کہا ہے جس کا ترجمہ ہمارے ہاں کیا جاتا ہے کہ یہ تصدیق کرتا ہے اس کی کہ جو کچھ پہلی کتابوں کے اندر ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ خود ہی تو بار بار کہتا ہے کہ ان میں تحریف ہو چکی ہے' انہوں نے بدل کے رکھ دیا ہے' تبدیلیاں کر دی ہیں' وہ اپنی اصلی شکل میں نہیں رہیں تو پھر یہ ان کی تصدیق بھی ساتھ کرتا ہے۔ ہر جگہ جہاں یہ لفظ آیا ہے قرآن میں اس کے لئے مصدق آیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دعوے ان میں بھی کیے جاتے ہیں کہ خدا کی تعلیم کو ماننے والوں کی یہ کیفیات ہونگی' وہ سربراہ ہونگے' وہ اعلون ہونگے' ان کو دنیا میں تمکن ملے گا' ان کی زندگیاں نہایت معزز اور مکرم ہونگی' خوشحالی ہوگی' یہ سب دعوے ہیں۔ یہ قرآن وہ ہے جو ان دعاوی کو جو تمہارے ہاں بھی موجود ہیں' سچ کر دکھائے گا۔ یہاں بھی یہ کہا ہے وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (70:26) زبان سے صرف اقرار نہیں کرتے اور اگلی چیز بھی یہ نہیں ہے کہ دل سے تصدیق کرتے ہیں۔ وہ اپنے عمل سے' اپنے کاموں سے' اپنی زندگی سے ان کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (70:27) اور وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کے جو تباہ کن نتائج ہیں' ان سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں محتاط رہتے ہیں۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ (70:28) کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس قانون کی رو سے جو تباہیاں آتی ہیں ان سے کہیں بھی انسان کو امن نہیں مل سکتا' کہیں بچ کے نہیں جا سکتا' کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اس کو ان سے حفاظت مل جائے' امن مل جائے۔

قوموں کے عروج و زوال کا راز صرف عصمت کی حفاظت میں ہے

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (70:29) وہی دہرایا جا رہا ہے جو پہلے سورۃ المؤمنون میں آئے تھے۔ عصمت کی حفاظت

کرنے والے۔قرآن میں بڑا زور دیا گیا ہے اور جیسا میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ اب تو یہ چیز محض اعتقادی اور نظری نہیں رہی۔ یورپ کی ان اقوام میں جنہوں نے اب عصمت کے پھاٹک کھول دیے ہیں کوئی بھی حد باقی نہیں رہنے دی۔ان کی بھی تحقیق یہ ہے۔انون اپنی کتاب کے آخر میں لکھتا ہے جو قوم بھی چاہتی ہے کہ وہ انسانیت کے اس مقام بلند کو حاصل کرلے جس کا کرسکنا ممکن ہے' اس کے لیے۔اس کے لیے مقدم چیز ہوگی کہ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔تو قرآنِ کریم نے اس لیے اس پہ زور دیا ہے۔یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ سوسائٹی مل کے جس قسم کا قانون جی چاہے' اس کے لیے بنادے۔بلکہ وہ حفاظت کرتا ہے بار بار یہ کہتا ہے **اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ** (70:30) میں نے پچھلی دفعہ بتایا تھا' بیویاں یا اس دور کی وہ لونڈیاں جن کو بعد میں بیویوں کا سٹیٹس دیدیا گیا تھا۔بس یہ ہے صحیح طریقہ' اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔**فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ** (70:31) اس سے الگ کوئی طریق بھی جو اختیار کیا جائے گا تو وہ سرکشی ہوگی قوانینِ خداوندی سے۔اور پھر آگے وہی صفت آئی۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (70:32) اپنی امانات کی اور اپنے وعدوں کی اور معاہدوں کی بڑی ہی پاسداری اور پابندی کرتے ہیں۔ان الفاظ کے معنی پچھلی دفعہ سامنے آگئے تھے۔**وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ** (70:33)۔شہادت کے لفظی معنی تو نگرانی کے ہوتے ہیں' کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے جو۔اس کے عام معنی ہوتے ہیں کہ جہاں کوئی بات نگاہی ہو' کسی کی دیکھی ہوئی سچی بات ہے۔عدل کا مدار شہادت پر ہوتا ہے۔وہ تو ایک ایک واقعہ کو دیکھتا نہیں ہے' دیکھ سکتا نہیں ہے اور پھر قانون کی رو سے اس نے اگر دیکھا بھی ہو تو وہ اس دیکھے ہوئے کو اپنے فیصلے پہ موثر نہیں کرسکتا۔شاہد کی حیثیت سے وہ پیش ہو جائے تو اور بات ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ عدل کا انحصار شہادت پہ ہوتا ہے۔اور یہ قانونِ شہادت بڑی اہمیت رکھتا ہے نظامِ عدل میں۔لیکن قرآن نے تو شہادت کے لیے چند ایک اصول دیے ہیں عجیب وغریب اصول ہیں۔اور جتنے اصول دیے ہیں ان میں ایک بات یہ ہے کہ ہمیشہ سچی شہادت دو خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔والدین کے خلاف کیوں نہ ہو' تمہارے اعزاء کے خلاف کیوں نہ ہو' اقرباء کے خلاف کیوں نہ ہو' وہ غریب ہو یا امیر ہو' کسے باشد۔

شہادت کا بدرجہ اتم اصول یہ ہے کہ انسان خود اپنے خلاف شہادت دے

اس میں یہ بات ہے کہ خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔ملزم خود اپنے خلاف سچی شہادت دے۔میں کہتا ہوں عدل کا تقاضا پورا کرنے کے لیے اس سے بہتر اور بھی کوئی طریق ہوسکتا ہے۔اور اس سے آسان تر سہل تر کم از کم وقت کے اندر کم از کم الجھنوں کے اندر۔یہ جتنی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں عدالتوں میں فیصلے کے لیے' دیانتداری سے بھی جو جج بیٹھے ہوتے ہیں' وہ شہادات کی وجہ سے

پیدا ہوتی ہیں۔نظامِ عدل کی جب بات آئے گی تو میں عرض کرونگا قرآن نے اس باب میں کیا کچھ نہیں کہا۔شہادت کے متعلق وہ وہاں تک جاتا ہے کہ ملزم خود اپنے خلاف شہادت دے۔وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (70:33)

اب شروع میں بھی یہ کہا تھا کہ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (70:23) آخر میں بھی کہا ہےوَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (70:34)دآئمون بھی ہیں یحافظون بھی ہیں۔تو گویا یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی محافظت کی ضرورت ہے' دوام کی ضرورت ہے' انتظام کی ضرورت ہے۔

صلوٰۃ کی حفاظت کا بنیادی مقصد خدا کے ہاں سے مکرموں کے طور پر رزق کا حاصل کرنا ہے

پوری زندگی اس قسم کی گذرے گی اور ہر وقت اس کی نگہداشت کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اس روش کے اوپر قائم ہیں کہ نہیں' کہیں میرا پاؤں ادھر اُدھر تو نہیں پڑ گیا ہے' لغزش تو نہیں کہیں ہوگئی۔یہ حفاظت ہے صلوٰۃ کی۔اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ (70:35) یہ ہیں وہ لوگ جو جنت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔خوشحالی کی زندگی کے ساتھ مکرمون بھی قرآن نے بتایا ہے۔جہاں رزق جو ملتا ہے اس کے لیے رزقِ کریم کہا ہے' عزت کی روٹی۔یہاں ان کے متعلق کہا ہے نہایت معزز۔اور دوسری جگہ تو ان کو مہمان کہا ہے قرآن نے اپنا۔مہمان تو خود ہی مستحق ہوتا ہے عزت کا۔لیکن ساتھ اس کے اُسے مہمان بھی کہا ہے' باعزت بھی کہا ہے کہ انہیں کوئی چیز بطور بخشش اور خیرات کے نہیں ملتی۔بطور حق کے ملتی ہے اور پھر بڑی عزت سے رکھا جاتا ہے ان کو۔زندگی مؤمنوں کی یہ ہے عزیزانِ من! کہ وہ مکرمون ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق اور اس کا اسلوب نگارش

اس دنیا میں بھی ان کی زندگی جنت بدآماں ہوتی ہے۔اور وہ نتیجہ ہوتی ہے ان کی ان صفات کا جو قرآنِ کریم مختلف مقامات پر گنا رہا ہے۔عربی زبان کا بھی قاعدہ یہ ہے اور قرآنِ کریم کا بھی۔یاد رکھئے قرآن چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لیے اس کا اسلوبِ بیان وہی ہے جو عربوں کے ہاں اس زمانے میں تھا۔اس کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔اور یہی طریقہ ہے قرآنِ کریم کے سمجھنے کا: محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات۔یہ دیکھا جائے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں عرب ان الفاظ اور اس اسلوبِ نگارش سے مفہوم کیا لیا کرتے تھے۔اور پھر یہ کہ قرآن نے ایک موضوع کے متعلق مختلف مقامات پر جو کچھ کہا ہے اس کو سامنے رکھ لیا جائے۔اور اس میں ایک ربط ترتیب دیا جائے' قرآن کی تفسیر ہو جاتی ہے۔زبان کے اعتبار سے بھی قرآن نے وہی اسلوب اختیار کیا ہے۔اور عام طور پہ آپ قانون کی کتابوں میں یہ دیکھیں گے لکھا ہوتا ہے کہ اس کے اندر مثلاً ضمیر Pronoun تو ہم He استعمال کریں گے جو مرد کے لیے ہوتی ہے لیکن اس میں

She بھی آئے گا جو عورت کے لیے ہوتی ہے۔اس لیے کہ جب آپ کچھ لکھیں گے تو بہرحال اس میں تو ایک ہی ضمیر استعمال کی جائے گی۔ یہ تو کچھ اچھا نہیں لگے گا کہ اس کے اندر تصریح کرتے جائیں۔ایک جگہ یہ کہہ دینا چاہیے کہ اس میں یہ دونوں جنسیں شامل ہونگی۔ عربی زبان کا قاعدہ تھا۔اورانگریزی زبان میں تو صرف ضمیریں جہاں آتی ہیں وہیں اس کی تمیز ہوتی ہے۔عربی زبان میں تو جو افعال فعل آتے ہیں Verb آتے ہیں ان کے اندر بھی یہ تمیز ہوتی ہے۔وہاں یہ صنف کے لیے Females کے لیے فعل کی شکل اور ہوتی ہے اور Male کے لیے شکل اور ہوتی ہے۔تو آپ دیکھئے کہ اگر دونوں کے لیے دو قسم کے استعمال شروع کرتا تو کس انداز کی یہ عبارت ہو جاتی۔ چنانچہ اس قاعدے کی رو سے یہ سمجھ لیجیے کہ جہاں جہاں یہ آئے گا بجز ان مقام پہ جہاں اس نے تخصیص کردی ہے کہ یہ چیز مردوں کے لیے ہے یا یہ عورتوں کے لیے ہے' وہاں اس نے مرد اور عورت الگ الگ کہا ہے۔لیکن بعض مقامات ایسے ہیں جہاں اس نے اس کی تصریح بھی ساتھ کردی ہے۔ جہاں اس نے مؤمنون کہا ہے مؤمنٰت بھی ساتھ کہا ہے۔

ایک آیت ایسی ہے جس میں مرد اور عورت دونوں دوش بدوش جاتے ہیں زندگی کی شاہراہ کے اوپر۔ انداز بیان ملاحظہ فرمایئے۔اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ(33:35) یہ عورتوں کے لیے آتا ہے وہاں اور پہلے جو آتا ہے ین جس میں آرہا ہے یہ مردوں کے لیے آتا ہے۔وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ والْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (33:35)۔کہتے ہیں جی وہ ٹھیک ہے۔جی اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ(4:34) کا ایک فقرہ کہیں سے یاد کرلیا کچھ پتہ نہیں ہے کہ زبان کے اعتبار سے بھی اس کے معنی کیا ہیں۔

عورت کے سلسلہ میں لفظ ''اَلرِّجَالُ'' کا حقیقی مفہوم اور ہمارے ہاں پائی جانے والی ذہنیت

مردوں کو خدا نے عورتوں کے اوپر داروغہ بنایا ہوا ہے' حاکم بنایا ہوا ہے' ڈانٹ کے رکھا جائے گا' یہ پست واقع ہوئی ہیں' ان کا دماغ بھی بہت چھوٹا سا ہوتا ہے۔وہ ارسطو جیسا حکیم تو ساری عمر یہ کہتا رہا کہ مرد کے منہ میں بتیس دانت ہوتے ہیں' عورت کے منہ میں اٹھائیس ہوتے ہیں۔اتنا بڑا فلاسفر اندازہ لگایئے کیفیت بعض اوقات کیا ہو جاتی ہے انسان کی۔خیر۔مسلمہ کے طور پر باقیوں کے ہاں تو ہمیں ضرورت نہیں کہ کیا کریں۔ ہمارے ہاں یہ چیز مسلمہ مانی جاتی ہے کہ عورت اور مرد کا درجہ ایک سا نہیں ہے۔آپ اندازہ لگایئے آیتِ قرآنی ہے۔کوئی صفت ایسی نہیں ہے جس میں عورت کو کمتر درجے پہ رکھا ہو یا چھوڑ دیا ہو۔وہ سائحون جو تھا قرآن میں' سیاحت کرنے والے۔وہاں تو سائحون ہے یہ جبکہ دوسری جگہ سائحٰت بھی ہے۔اس میں بھی اس نے عورت کو نہیں مستثنیٰ کیا۔تو قرآنِ کریم میں سوائے ان

فطری وظائف کے کہ جو دو جنسوں میں الگ الگ ہوتے ہیں جہاں تک ان کی انسانی سطح کا تعلق ہے وہ مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ میں گنا رہا تھا صفات جو اس نے مؤمنین کی دی ہیں۔

قرآن حکیم میں مسلم اور مومن میں فرق کی وضاحت اور لفظ 'قانت'' کا قرآنی مفہوم

پہلا لفظ آ گیا ہے اَلْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ (33:35) اور آگے ہے الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ (33:35) ۔آپ دیکھئے عام استعمال میں تو مسلمان اور مومن ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے قرآن نے بھی اکثر ان کو مرادف معنی میں استعمال کیا ہے لیکن بعض مقامات پر ان میں تفریق بھی کی ہے۔ اور وہ مقام خاص طور پہ وہ ہے جہاں یہ کہا ہے کہ یہ اعراب' یہ بدو' یہ قبائل والے نئے نئے جو اسلام لائے ہیں ان سے کہو کہ ابھی اپنے آپ کو مومن نہ کہیں۔ ان سے کہیے کہ یہ کہیں اَسْلَمْنَا (49:14) کہ ہم نے صرف سرنڈر کیا ہے اپنے آپ کو' جھک گئے ہیں مملکتِ اسلامیہ کے سامنے' اس کی فرماں پذیری ہم نے اختیار کر لی ہے اس کے سٹیزن ہو گئے ہیں لیکن مسلمان ہو کر۔ سٹیزن تو اس کے غیر مسلم بھی ہوتے ہیں' اسلام لائے ہیں لیکن کہا ہے کہ ابھی ان سے کہو کہ یہ نہ کہیں کہ ہم مومن ہیں ایمان لائے ہیں۔ اس لیے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (49:14) ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ تو گویا قرآن نے خود تصریح کر دی ہے مسلم اور مومن میں۔ یعنی جب یہ لفظ ان معنوں میں آئے گا۔ یہاں دونوں چیزیں آئیں مسلمان مرد اور عورت' مومن مرد اور عورت کا اگلا درجہ جو ہے۔

لفظ صبر کا قرآنی مفہوم حصول منزل کے لیے استقامت کے ساتھ چٹاں کی طرح کھڑے رہنے کو کہتے ہیں

وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ (33:35) پہلے بھی آ چکے ہیں یہ الفاظ۔ قانت ہوتا ہے جو اپنی توانائیوں کو اس مقام پر صرف کرے جس مقام پر صرف کرنے کے لیے انہیں دیا گیا ہے۔ بڑی جامع چیز ہے۔ یہ مقامات جہاں صرف کی جانی چاہئیں توانائیاں' قرآنِ کریم نے اپنی اقدار و اصول سے ان کی نشاندہی کی ہے کہیں تفصیل کے ساتھ کہیں اجمالاً۔ ترجموں میں تو آپ دیکھیں گے کہ صرف فرماں بردار ہی ترجمہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور عربی زبان کے الفاظ ان معنوں میں مرادف نہیں ہوتے کہ بعینہٖ وہ معنی ہو کسی دوسرے لفظ کا' یہ تو زبان کا بڑا نقص ہوتا ہے۔ ان میں شیڈز کا فرق ہوتا ہے معنی کا۔ بہر حال اَلْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ (33:35) جو اپنی صلاحیتوں کو انہی مقامات میں صرف کریں جہاں صرف کرنے کے لیے ان سے کہا گیا ہے۔ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ (33:35) یہ ہے صادق: سچ کہنے والے صداقت کی شہادت دینے والے' صدق پر قائم رہنے والے۔ بڑی چیز ہے۔ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ (33:35) اور اس راستے میں جتنی مشکلات بھی سامنے ان کے آئیں ان پر استقامت اور استقلال سے جم کر کھڑے رہنے والے۔ صبر کے معنی یہ ہوتے ہیں

''اے صبر شکر کرن والی گل نئیں جیہڑی ساڈے ہوندی اے'' انتہائی بیچارگی کا عالم۔ یہاں انتہائی عزم کا عالم ہوتا ہے' عزیمت کی انتہاء ہوتی ہے جسے صبر کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو اور وہ یوں کھڑا ہو جیسے پتھر کی چٹان ہوتی ہے۔ یہاں کہتے تھے وہ صبر۔ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ (33:35) استقامت میں یہ کیفیت لیکن شاخِ ثمر بار کی طرح جھکے ہوئے' جھوٹا تکبر نہیں ہے جھکاؤ ہے دوسروں کے سامنے۔ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ (33:35) وہاں صادق تھا صرف' یہاں متصدق ہے۔ متصدق کے معنی ہوتے ہیں عندالضرورت اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے والا۔ پہلی چیز آئی تھی کہ مؤمنوں نے بیچ دیا ہے خدا کے ہاتھوں اپنا سب کچھ۔ تو متصدق وہ ہوتا ہے کہ ایسے وقت میں سب کچھ نچھاور کر دینے والا۔ ہمارے ہاں بھی تو یہ لفظ قربان کر دینے کے معنوں میں آیا ہے تصدق' جان و مال تیرے تصدق' متصدقین۔

لفظ صوم کا مفہوم حدود اللہ کے اندر رہنے والا

وَالصّٰٓئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ (33:35) عام معنی تو اس کے ہونگے روزہ رکھنے والے روزہ رکھنے والیاں۔ لیکن یہ صرف روزہ ہی نہیں قرآن کی اصطلاحات کے معنی قرآن سے متعین کرنے چاہئیں۔ ٹھیک ہے صوم بھی اس کے اندر آتا ہے لیکن بنیادی معنی تو اس کے یہ ہیں حدود اللہ کے اندر رہنے والے' جہاں رکنا ہے وہاں رک جانے والے۔ اس کے معنی رک جانے کے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ حفاظت کرتے ہیں حدود اللہ کی' بس جہاں وہ لکیر آئی' کتنا ہی تیز رو کیوں نہ ہو یہ کھلاڑی' اچھا کھلاڑی وہی ہے کہ اس لکیر سے پہلے ہی رک جائے۔ اگر اس کا قدم بھی اس کے اوپر پڑ جاتا ہے تو فاؤل ہو جاتا ہے۔ صائم وہ ہوتا ہے کہ جہاں رکنا ہے وہاں رک جائے۔ اور روزے کو بھی اسی لیے صوم کہا جاتا ہے۔ کہا یہ ہے وہاں کہ اس دوران میں تم نے ان حلال چیزوں سے بھی رک جانا ہے عام حالات میں جن کے کھانے پینے میں کوئی بات نہیں ہوتی۔

پھر وہی وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ (33:35) عصمت کی حفاظت کرنے والے حفاظت کرنے والیاں۔ اور عصمت کے معاملے میں بھی جہاں قرآن نے کہا ہے کہ باہر نکلیں تو نگاہوں کو جھکا ہوا رکھیں۔ اور پھر اس کے لیے ہمارے ہاں ہر بندش عورت پہ' ہر بندش عورت پہ' مرد پہ کوئی بندش نہیں۔ قرآن نے پہلے مردوں کو حکم دیا ہے کہ باہر نکلیں تو اپنی نگاہوں کو جھکا کر رکھیں' جھکا کر رکھنے کے معنی ہیں کہ بیباک نہ ہونے دیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ حفاظتِ عصمت جو ہے ہمارے ہاں اس کا تقاضا صرف عورت سے ہی کیا جاتا ہے۔ اور اب تو معاشرہ ایسا ہو گیا ہے اس میں خاص طور پہ مردوں کے لیے تو سوال ہی نہیں ہے کہ ان کے لیے بھی ضروری ہے کہ حفاظتِ عصمت کریں۔ اگر کہیں کبھی کوئی شکایت کرتی ہے بیوی میاں سے کہ لڑکے کے متعلق کچھ سوچو کچھ کرو' آوارہ ہوتا چلا جاتا ہے' پتہ نہیں کہاں راتوں

کو رہتا ہے اس طرح سے تو اس کے اخلاق بگڑ جائیں گے۔ بڑی Lightly کہہ دیا جاتا ہے اوہ بھولی! اس عمر میں ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بہر حال لڑکی کے متعلق جو حفاظت ہوتی ہے وہ تو جانتے ہی ہیں آپ' ہونی چاہیے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ لڑکی کو بھی یہ اجازت دینی چاہیے (معاذ اللہ)۔ قرآنِ کریم اس حفاظت عصمت کا جہاں بھی ذکر کرتا ہے' پہلے مردوں سے تقاضا کرتا ہے اس کے بعد عورت سے تقاضا کرتا ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے اس میں اگر مرد رک جائے تو فواحش کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ غور فرمایا آپ نے اس چیز پر۔ اس لیے قرآن جہاں بھی ذکر کرتا ہے پہلے مرد کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے روکنے کا طریقہ یہ ہے۔ لیکن وہ دونوں سے تقاضا کرتا ہے۔

وَ الـذّٰكِـرِيۡـنَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ (33:35) آپ کو پتہ ہے ذکر کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ بہت جامع لفظ ایک آخر میں دیدیا کہ بات ساری یہ کہ وہ ہر زندگی کے موڑ پہ' ہر تقاضے کے زمانے میں' ہر سوال کے حل میں ہمیشہ قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ ذکر کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کو آنکھوں کے سامنے رکھنا۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے اس نے دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ مومن کی صفت یہ ہوتی ہے کہ اگر کبھی گھومتے گھماتے بھی کوئی شیطانی خیال دماغ میں آجاتا ہے یا دل میں سے گذرتا ہے' تو وہ ذکر کرتا ہے' اس سے متعلق قانونِ خداوندی کو سامنے لاتا ہے اور بالکل اندھیرا چھٹ جاتا ہے' روشنی سامنے آجاتی ہے۔ کیا خوبصورت انداز ہے!!! بات صاف ہو جاتی ہے۔ یہ ہے خدا کا ذکر کرنے والے اور کرنے والیاں۔ ان کے لیے خدا نے سامانِ حفاظت' یہ Negative پہلو آ گیا۔ ہر تباہی اور خطرے اور نقصان سے محفوظ رکھنا۔ اور Positive: اَجۡرًا عَظِيۡمًا (33:35) اور ان کا اجر عظیم ہے۔ یاد دلا دوں کہ بات ہو رہی ہے کہ مؤمنین کی صفات قرآن کی رو سے کیا ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے قرآنِ کریم ایک گوہر کی طرح' ایک ایک تابدار موتی کی طرح سامنے لا رہا ہے۔

بات عورتوں کے متعلق کہی تو ایک آیت میں قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ سے یہ کہا ہے۔ ازواجِ مطہرات کے متعلق جو سلسلہ ہے وہ تو خیر لمبا ہے وہاں بھی یہ کہا ہوا ہے مُسۡلِمٰتٍ مُّؤۡمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبۡكَارًا (66:5)۔ وہی الفاظ یہاں بھی آئے ہیں مسلم مومن قانت' تآئب' عابد عورتوں کے لیے اور وہی سٰٓئِحٰتٍ (33:35) میں السّٰٓئِحُوۡنَ (9:112) آیا ہے اور یہاں سٰٓئحٰت آیا ہے عورتوں کے لیے بھی یہ چیز آئی ہے۔ سرِ دست یہی مقامات سہی۔ آپ دیکھئے کہ اس میں ایک فرد ہو یا افراد کی جماعت ہو ان کا جس قسم کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ اگر کوئی معاشرہ کوئی سوسائٹی اس قسم کے افراد پر مشتمل ہو تو وہ زندگی کیسی زندگی ہوگی۔ لمبی چوڑی تفصیل میں نہ بھی جایئے اگر وہ معاشرے کے افراد ہوں جو جانتے ہوں یعنی وہ سچ کر کے دکھانے والے ہوں اپنے ان الفاظ سے

جن سے ایک دوسرے کو Greetings دیتے ہیں۔

دوفریقین کے مابین السلام علیکم وعلیکم السلام کو عملی طور پر اپنانے والوں کی مسرت بھری زندگی

ہمارے ہاں لفظ Greetings ہی رہ گیا ہے۔ السلام علیکم اور ردِ عمل وعلیکم السلام۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کی سلامتی اور امن ہے تیرے لیے میرے ہاتھوں۔ اور یہی وہ جواب دیتا ہے کہ یہی تمہاری کیفیت میرے ہاتھوں سے بھی۔ معاشرے کے دو افراد کا جب بھی یہ ملنا ہوگا' اگر ان کی کیفیت یہ ہو۔ ایک ہی بات میں کہہ رہا ہوں کم از کم جن سے آغاز ہوتا ہے آپ کے ملنے کا۔ کیا کیفیت نہ ہوگی عزیزانِ من! ۔آج کوئی شخص باہر سڑک پہ نہیں نکلتا کہ معلوم نہیں کہ ساتھ چلنے والا آستیں میں کس قسم کا خنجر چھپائے ہوئے ہو۔ دو بیل نہایت اطمینان سے سڑک پہ ایک دوسرے کے ساتھ چلتے جاتے ہیں انہیں ایک دوسرے کے متعلق کبھی کوئی خدشہ وسوسہ نہیں ہوتا' بدظنی بدگمانی نہیں ہوتی۔ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ چلے جارہے ہوں کن اکھیوں سے دیکھتے چلے جارہے ہوں کہ یہ کہیں سے چھری تو نہیں نکال رہا۔ حیوانات کی یہ کیفیت ہے۔ چلتے ہوئے راستے میں کوئی اجنبی آپ کے قریب دو قدم چلے تو آپ کو احساس ہو گیا۔ حیوان تک محفوظ اور مامون دوسرے حیوان سے۔ اکیلے آپ جارہے ہوں تو پھر بھی کچھ محفوظ اپنے آپ کو سمجھیں گے۔ کوئی ساتھ دو قدم آپ کے ملا ہے اور یوں چلنے لگا ہے تو پوچھو ہی نہیں کیفیت آپ کی کیا ہو جائے گی۔ مومن کا تو مادہ ہی امن تھا عزیزانِ من! مسلمان کا تو لفظی مادہ ہی امن پسند باقی صفات تو ایک طرف رہیں۔

قرآنی معاشرے کے استحکام کے لئے زیرِ بحث آنے والے موضوعات کا تعلق صرف قوانین خداوندی کے نفاذ سے متعلق ہوتے ہیں

یہ ہیں وہ صفات جن کے حامل افراد پر وہ معاشرہ متشکل ہوتا ہے جو یہاں نظامِ خداوندی قائم کرتا ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ بھی اگر گفتگو ہوتی ہے تو اس کے قوانین کے متعلق ہوتی ہے' آئین کے متعلق باتیں ہونگی' قانون کیا دیا اس نے۔ قانون تو عزیزانِ من! مستثنیات کے لیے ہوتا ہے' مجرموں کے لیے ہوتا ہے۔ اصل شے یہ ہے کہ وہ معاشرہ مشتمل کن افراد پر ہوتا ہے۔ یہ نظام قائم کن کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ وہ ان کے ہاتھوں سے قائم ہوتا ہے جن کی صفات یہ بتائی گئی ہیں۔ خود ان کے ہاتھوں سے قائم ہوتا ہے پھر وہ اس قسم کا انتظام کرتے ہیں کہ جو آگے اس سلسلہ کو اس طرح بڑھایا جائے تعلیم سے تربیت سے کہ ہماری ہر آنے والی نسل اسی قالب کے اندر ڈھلی ہوئی ہو۔ پیدائش کے اعتبار سے جیسا میں نے عرض کیا ہے کوئی بھی مومن پیدا نہیں ہوتا' کوئی بھی کافر پیدا نہیں ہوتا۔ تعلیم کے لحاظ

سے ایسا بنانا پڑے گا آپ کو۔ ہم نہ تو خود ایسے ہیں' نہ آنے والے بچوں کو ایسا بنانے کے لیے جیسا حق می خواہد' قرآن چاہتا ہے۔ کسی قسم کا ہمارے ہاں انتظام ہی نہیں' سوال ہی نہیں۔ جو کچھ وہ بن کے نکلتے ہیں' اس کے ہاتھوں سب روتے ہیں۔ سب روتے ہیں اور ویسے ہی بناتے چلے جاتے ہیں۔ عجیب قوم ہے یہ۔ ہوتا یہ ہے کہ جب قومیں اپنے سامنے زندگی کا نصب العین نہ رکھیں تو ان کی ساری عمر روتے پیٹتے گذر جاتی ہے۔

قرآن نے مؤمنین کی یہ صفات گنائیں اور وہاں کہہ دیا تھا' کریں اور یہاں کہا ہے **الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ** (9:112) حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے۔ اور ان حدود کا تعین قرآنِ کریم نے نہایت نمایاں حیثیت سے کر دیا ہے تا کہ کسی قسم کا التباس نہ رہے' کوئی ابہام نہ رہے۔ یہ نہ ہو کہ پہچان نہ سکیں ہم کہ یہ حد کہاں تھی اور کس قسم کی تھی۔ یہ ساری حدود قرآن کے اندر' نمایاں حیثیت سے موجود ہیں۔ مومن وہ ہے جو حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ مومن کی تو یہ زندگی ہوگئی۔ اور اپنے قاعدے کے مطابق قرآن پھر لے آیا اُسی Contrast میں' اسی تضاد میں وہی ایک دوسری بیک گراؤنڈ۔ یہ مومن ہے اس کے برعکس مشرک ہوتا ہے۔

مومن اور مشرک کی سوچ میں فرق

مومن وہ ہے جو صرف قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہے۔ مشرک وہ ہے جو ان کے ساتھ اور قوانین کو بھی ملاتا ہے۔ اپنے فائدے کے لیے ان میں سے کچھ لے لیے' جہاں دیکھا ذرا نقصان ہوتا ہے' دوسری طرف سے لے لیے' خود بنا لیے۔ یاد رکھئے خود بنائے ہوئے یا دوسروں سے لیے ہوئے یہ دونوں انسان کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں یہ دونوں شرک ہیں۔ خدا کے دیے ہوئے قوانین خدا ہی کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ مومن کی یہ کیفیت ہوگئی کہ ان کے لیے سامانِ حفاظت ہے' ہر مومن دوسرے مومن کے لیے سلامتی اور امن کا مدعی نہیں بلکہ ضامن ہے۔ **مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ** (9:113) **تَبَيَّنَ لَهُمْ** (9:113)' بیین کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کو ابھار کے سامنے لے آنا۔

آخر کار غلط معاشرے کے مضر اثرات کے نتائج بھگتنے ہی پڑتے ہیں

جب ان کے سامنے صحیح راستہ ابھار' کر نکھار کر لے آئے' واضح بات ہوگئی۔ اس کے باوجود یہ اس راہ پہ نہیں چلتے۔ تو اب ان کی غلط روش کے جو تباہ کن نتائج ہونگے' ان سے تم انہیں حفاظت کی ضمانت دے نہیں سکتے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ وہ روش اس قسم کی غلط اختیار کریں اور تم انہیں اس روش کے نتائج سے بچا سکو۔ اسے استغفار کہتے ہیں۔ دعائے مغفرت نہیں سامانِ حفاظت' حفاظت کی ضمانت دیدینا۔ کہا کہ یہ جو لوگ خالص خداوندی قوانین کا اتباع کرنے والے ہیں ان کے لیے یہ چیزیں ہیں۔ جو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے

دوسرے قوانین پہ چلتا ہے تو اپنی غلط روش کے مضر اثرات اور نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ نہ نبی ان کے لیے کچھ کرسکتا ہے نہ یہ جماعتِ مؤمنین ان کے لیے کچھ کرسکتی ہے۔ خواہ وہ وَ لَوۡ کَانُوۡۤا اُولِیۡ قُرۡبٰی (9:113) تمہارے کتنے ہی قریبی کیوں نہ ہوں۔ وطن کے اعتبار سے قرب ہو' نسل کے اعتبار سے قرب ہو' کتنے ہی قریبی کیوں نہ ہوں تم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ تم انہیں وعدہ بھی نہیں دے سکتے کہ ہاں ایسے وقت میں ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔

کسی جرم کی سزا یا مواخذہ قانون کی وضاحت کے بعد ہوسکے گا

اب دیکھئے مِنۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُمۡ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ (9:113) ہے۔ پہلے بات واضح کردی جاتی ہے۔ قرآن نے متعدد مقامات میں یہ کہا ہے کہ قانون کی وضاحت کے بعد قانون کی خلاف ورزی کے متعلق مواخذہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو یہ چیز کہ اُسے واضح طور پر دوسروں کے علم میں لانا ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ جس تاریخ سے جس دن سے قانون نافذ کیا جائے گا وہ اس زمانے سے لاگو ہوگا۔ قرآن نے کہا ہے اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ (4:22) کئی مقامات پہ کہ اس سے پہلے جب یہ قانون رائج نہیں تھا تو اس میں اس زمانے کی روش اور قانون کے مطابق جو تبدیل ہوئی اس پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس قانون کی بناء پر جو پچھلے اعمال یا روش ہے اس کے لیے وہ مجرم قرار نہیں دیے جاسکیں گے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ قانون کو واضح طور پہ سامنے لانا ہوگا۔ وہاں کہا گیا کہ ماضی کی جو باتیں ہیں ان کی بناء پہ مجرم قرار نہیں پائے گا۔ کہا کہ یہ چیز جب ہوجائے گی' قانون سامنے آجائے گا تو پھر اگر کوئی شخص اس طرح کے جرم کرے گا تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری کوئی نہیں دے سکتا' نہ کوئی وعدہ دے سکتا ہے۔ اب ایک بات سامنے آئی۔

قرآن میں ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے یہ کہا تھا کہ ٹھیک ہے آپ اس وقت تو بڑے بضد ہو رہے ہیں۔ اور مقام کیا تھا؟ وَ مَا کَانَ اسۡتِغۡفَارُ اِبۡرٰهِیۡمَ لِاَبِیۡهِ اِلَّا عَنۡ مَّوۡعِدَةٍ وَّ عَدَهَاۤ اِیَّاهُ (9:114) ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا تھا۔ ایک استثنٰی ایسی آتا ہے کہ پہلے انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا اپنے والد سے استغفار کا۔ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ (9:114) لیکن جب یہ بات واضح طور پر ان کے سامنے آگئی کہ نہیں وہ تو خدا کا دشمن ہے تَبَرَّاَ مِنۡهُ (9:114) فوراً اس سے الگ ہٹ گیا وہ۔ وعدہ اس زمانے میں تھا جہاں ہنوز یہ توقع تھی یا یہ ذہن میں تھا کہ یہ دشمن عداوت سے ایسا نہیں کر رہا' جہالت سے کر رہا ہے۔ جہالت سے جو کچھ کیا جائے گا اس کے بعد اصلاح کی توقع ہوسکتی ہے۔ جب یہ چیز نظر آگئی کہ نہیں یہ تو خدا کا دشمن ہے۔ باپ خدا کا دشمن ہے جب واضح ہوگیا تو وہ اس سے الگ ہوگئے۔ حالانکہ اِنَّ اِبۡرٰهِیۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیۡمٌ (9:114) حالانکہ وہ بڑا ہی نرم دل دردمند ہمدرد' اواہ آہیں بھرنے والا دوسروں کے غم کے اوپر' دوسروں کے دکھ کے اوپر' حَلِیۡمٌ (9:114) بڑا بردبار تھا۔ دو لفظوں کے متعلق دوبارہ میں ابھی آتا ہوں حضرت

ابراہیمؑ کے متعلق۔ بات یہاں یہ تھی کہ انہوں نے یہ وعدہ کیا تھا اپنے والد سے۔

حضرت ابراہیم کے اپنے والد سے تعلقات کی نوعیت

قرآنِ کریم میں حضرتِ ابراہیمؑ کے وعدے کے متعلق بھی ہے۔عجیب انداز چلا آتا ہے **وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا o اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا** (19:41-42) گھر سے بات شروع ہو رہی ہے۔سب سے پہلی تبلیغ باپ سے ہو رہی ہے۔اور یہاں تو بیٹا باپ کے ہاتھوں' ایک جھٹکے میں ہلاک کر دیا جاتا ہے''اوتوں ساہنوں جمیا یا اسی تہانوں جمیا ہیگا' جمعہ جمعہ اٹھاں دن دی پیدائش ہیگی اے''۔

اگر کسی غلطی کو پہلے دن ختم نہ کیا جائے تو پھر زمانے کی تہیں' گردشیں اسے چٹان کی طرح سخت سے سخت تر کر دیتی ہیں

وہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ بچپن سے ہمیں پڑھایا جاتا ہے ضابطہء اخلاق: خطائے بزرگاں گرفتن خطا است' بزرگوں کی غلطی پکڑنی یہ غلط ہے۔اسی لیے تو غلطی تہ در تہ چڑھتی ہوئی اس قدر منجمد ہو جاتی ہے پھر اس کے بعد پکی ہو جاتی ہے' چٹان بن جاتی ہے۔اگر پہلے ہی دن سے اس کو پکڑ لیا جائے تو آگے چلتی ہی نہیں۔ورنہ ہر صدی کی ایک تہ اس کے اوپر جم جاتی ہے۔پھر یہ ایک ایک تہ اس طرح سے منجمد ہو کے' یہ اکٹھی ایک چٹان بن جاتی ہے۔آپ کو پتہ ہے چٹان ہوتی کیا ہے؟ یہ مختلف تہیں ہوتی ہیں ان پتھروں کی' ایک دوسرے کے اوپر رکھ کے جمی ہوئیں' مرورِ زمانہ سے جم جاتی ہیں یہ' تہ بن جاتی ہے۔جب وہ تہ بن جاتی ہے تو وہ اسلاف کا مسلک کہلاتی ہے۔اسلاف کا مسلک' اس کے خلاف' سند' سند اس کی تواتر ہوتی ہے کہ جی چلا آ رہا ہے اسی طرح سے۔یہ کیسے چلا آ رہا ہے؟ اس لیے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا کے ماتحت چلا آ رہا ہے۔

حضرت ابراہیم کے والد کی پوزیشن اور آپ ﷺ کی جرأت

آپ کو معلوم نہیں ہیڈ پریسٹ کیا ہوتا تھا' بادشاہ سے زیادہ اختیارات رکھتا تھا ہامان۔اتنا بڑا معزز عہدہ رکھتا تھا۔یہ تھا باپ۔اور ابراہیم تو پیدائشی ولی عہد تھے اسی منصب کے لیے اس باپ کے۔وہ دوسری بات ہے کہ پھر کیا کچھ چھوڑ کے نہیں گئے تھے۔کیوں گئے؟ **مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ** (29:26) رکھو تم سب کچھ تمہارے لیے ہے میں چلا اپنے اللہ کی طرف' دامن جھاڑ کے اٹھ کے چل دیے۔

بت پرستی کو دوام ملنے کی وجہ یہ ہے کہ بت اسے ٹوکتا نہیں

اس باپ سے یہ کہا جا رہا ہے ابا جان! کیا کر رہے ہیں آپ ان کی پرستش کر رہے ہیں، نہ کوئی سنتا ہے نہ بولتا ہے۔ جرأتِ عرض معاف ہو تو ایک بات کروں آپ سے۔ جو سامنے سے بولتا نہیں ہے اس کی پرستش، اس کی پرستش اس لیے ہوتی ہے۔ آپ کو پتہ ہے بت کی پرستش کیوں کرتا ہے آدمی؟ وہ اسے ٹوکتا نہیں ہے۔ بڑا اطمینان اسے ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ جس خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہیں اس کی صفت کیا ہے، وہ کلام کرتا ہے آپ سے، اسی لیے قرآن کو کلام اللہ کہا گیا ہے۔ بولتا ہے، ٹوکتا ہے، قدم قدم کے اوپر۔ آپ ایسا خدا نہیں چاہتے۔ بہت پسند ہے بت جیسا خدا۔ کیا کرتے ہیں آپ خدا کی کلام کو، ناظرہ پڑھتے ہیں بغیر سمجھے ہوئے اسے پڑھ جاتے ہیں۔ تو وہی بات ہو گئی خدا آپ سے بولتا نہیں ہے، کلام نہیں کرتا، ٹوکتا نہیں۔ ایک قدم نہیں نکلنے دیتا، ایک قدم چلنے نہیں دیتا وہ، دوسرے دن ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ آؤ تو سہی اس حاکم کے سامنے کہ جس کی بات کو تم رد کر کے منہ پھیر کے چل دیے تھے۔ آؤ تو اس معبود کے سامنے جسے تم نے کہا تھا کہ میں سجدہ کرتا ہوں تمہیں، تیرے سامنے جھکتا ہوں۔ آؤ اس کے سامنے دوسرے دن، جب پہلے دن اس نے کہا تھا کہ خبردار یہ کچھ کیا۔ اور اس کے بعد یہ کچھ کر کے اس کے سامنے آؤ تو سہی۔ جرأت نہیں کر سکتا انسان۔ بت کے سامنے آنے سے تو ڈرتا ہی نہیں ہے، اس نے کیا کہنا ہے۔

ہم نے قرآن حکیم کو قرآن ناطق کے طور پر سمجھا ہی نہیں

عزیزانِ من! بولنے والے خدا کو آپ نے بت میں تبدیل کر رکھا ہے۔ ہم اس کی بات سننے کی تاب نہیں رکھ سکے، ہم سننا چاہتے نہیں ہیں۔ فریب اپنے آپ کو دے رہے ہیں۔ جیسے وہ بت کی پرستش کر کے، فریب دے کے آ جاتا ہے۔ بغیر سمجھے ہوئے قرآن کو پڑھ کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آپ کے ہاں خدا کے لیے عبادت کے لفظ کا ترجمہ پرستش ہو گیا ہے ''تیری ہی ہم پرستش کرتے ہیں''۔ اس کے معنی محکومیت اختیار کرنے کے تھے، حکم ماننے کے تھے، اس کے لفظی معنی یہ تھے۔ حکم ماننا کسی کا محکومیت ماننا، وہ خدائے زندہ ہو گا جو اس کا کریں گے نا، جو آپ سے کچھ کہے گا آپ اس کی سنیں گے۔ جو آپ سے کچھ نہیں کہے گا جس کی آپ سنیں گے ہی نہیں اس کے حکم ماننے کا سوال نہیں، اس کی پرستش کریں گے آپ۔ ترجمہ ہی اس کا پرستش کرتے ہیں۔ پوچھو نہیں کیا سازش کی ہوئی ہے۔

حضرت ابراہیم کی اپنے باپ سے کھلی گفتگو

ابراہیمؑ باپ سے یہ کہہ رہے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد ساری آیتیں پڑھیے کتنے زور سے کہے چلے جا رہے ہیں۔ یٰٓـاَبَـتِ اِنِّـیٓ اَخَـافُ اَنۡ یَّمَسَّکَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ فَتَکُوۡنَ لِلشَّیۡطٰنِ وَلِیًّا (19:45) باپ سے کہہ رہے ہیں اگر! اس روش پہ رہو گے تو

میں جانتا ہوں خدا کی طرف سے عذاب آ جائے گا اور شیطان کے دوست بن جاؤ گے۔ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (9:114) ہے ابراہیمؑ!! یہ کیفیت ہے۔ لیکن جہاں یہ مقام آ جاتا ہے جو عدو اللہ ہوتا ہے' خدا کا دشمن ہوتا ہے' باپ ہی کیوں نہ ہو' اس کی یہ کیفیت ہے۔ جواب ملتا ہے۔ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِىْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِىْ مَلِيًّا (19:46) کہا ابراہیم! جا دور ہو جا میری نظروں سے' یاد رکھو تم مجھے میرے معبودوں سے بہکانا چاہتے ہو' ہٹانا چاہتے ہو' باز نہ آؤ گے تم اپنی روش سے تو یاد رکھو سنگسار کر دونگا' پتھروں سے مروا دونگا۔ سمجھے کیا ہو' ہٹو میری نظروں سے' دور ہو جاؤ یہاں سے۔ باپ کی یہ کیفیت ہے۔ دل میں ابھی یہ چیز ہے کہ جہالت کی بناء پہ ایسا کر رہے ہیں۔ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ (19:47) کوئی بات نہیں جہالت سے اگر ایسا کر رہے ہو' میں نا امید نہیں ہوتا۔ یہ اتنی جلدی نا امید نہیں ہوتے' آخر تک توقع رکھی جاتی ہے۔ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّىْ (19:47) میں آرزو کرونگا اپنے خدا سے کہ تیرے دل کو بدل دے تو صحیح راستہ اختیار کرلے' اس طرح تجھے حفاظت مل جائے گی اس تباہی سے کہ جو تمہاری روش سے تم پر آنے والی ہے۔ میں ایسا کرونگا۔ اِنَّهٗ كَانَ بِىْ حَفِيًّا (19:47) اور مجھے توقع ہے کہ میری دل سے نکلی ہوئی یہ آرزو شاید پوری ہو جائے۔ یہ تھا جو قرآن نے کہا کہ ابراہیمؑ کا ایک وعدہ تھا اور وعدہ اس لیے تھا' اور پھر یہ کہا ہے کہ جب اس نے یہ دیکھ لیا کہ نہیں یہ عدو اللہ ہے' فوراً قطع تعلق کر کے الگ ہو گئے۔ اور قطع تعلق کن الفاظ میں کیا۔

حضرت ابراہیم کا اپنے والد سے قطع تعلق کا اعلان نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابراہیم کے اسوۂ حسنہ کو بہترین نمونہ قرار دینے کا اعلان

قرآنِ کریم میں دو ہی شخصیتیں ہیں جن کے اسوہ کے متعلق کہا ہے کہ تمہارے لیے وہ بہترین نمونہ ہیں: ایک حضورِ نبی اکرم ﷺ اور ایک ابراہیمؑ اور اس کے ساتھی۔ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِىْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (60:4) بہترین نمونہ ان کی زندگی کے اندر۔ کہاں کہا گیا' کیا بات پیش کی گئی' آگے کیا چیز تھی ان کی جس کے لیے کہا کہ دیکھئے بہترین نمونہ اس میں ہے۔ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ (60:4) جو قوم خدا کی دشمن تھی اس سے اس نے کہا۔ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (60:4) تم اور یہ جو تمہارے معبود ہیں' میں ان تمام سے دل برداشتہ ہو گیا ہوں۔ كَفَرْنَا بِكُمْ (60:4) میں انکار کرتا ہوں تمہارے ساتھ ہر تعلق کا۔

حضرت ابراہیم کا اپنے والد سے قطع تعلق کرنے کے باوجود نیک تمناؤں کا اظہار

وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا (60:4) تم میں اور مجھ میں ہمیشہ کے لیے ایک عداوت' ایک بغض پیدا ہو گیا ہے

۔خدا کا دشمن میرا دوست کیسے ہوسکتا ہے۔ابداً کہا' ہمیشہ کے لیے۔لیکن آپ دیکھئے مومن کی احتیاط' کہا نہیں ابداً نہیں گنجائش ہے اس میں۔آپ کو معلوم ہے گنجائش کیا ہے' یہ کہا ہے کہ تم معافی مانگ لو؟ مجھ سے صلح کرلو؟ تو پھر بات نہیں ہے۔ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗٓ (60:4)اگر تم بھی اسی خدا کے اوپر ایمان لے آؤ گے تو پھر بہر حال یہ ساری چیزیں بدل جائیں گی' یہ عداوتیں محبت میں بدل جائیں گی' یہ نفرتیں محبت میں تبدیل ہوجائیں گی۔ایک ہی شرط ہے کہ عداوت ہے تو اس لیے کہ تم اس سے دشمنی کرتے ہو۔اسے چھوڑ کے اس کے ہوجاؤ گے' گلے سے لگالونگا۔کہا یہ ہے وہ روشِ ابراہیمیؑ جو تمہارے لیے اسوۂ حسنہ اپنے اندر رکھتی ہے۔جو تیرا دشمن ہے اس کا ہم سے واسطہ کیا ہے۔اور آج یہاں سے آوازیں اٹھ رہی ہیں بار بار کہ دوستی کے ہاتھ بڑھاؤ ان سب کی طرف جو تمہارے بھی دشمن ہیں تمہارے خدا کے بھی دشمن ہیں۔جلی حروف میں لکھا جاتا ہے کہ سٹیٹ کا Religion اسلام ہوگا۔عزیزانِ من!

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہاں تو سب سے پہلے گھر والوں سے شروع کیا جاتا ہے۔یہ تھی وہ چیز جو ابراہیمؑ کے وعدے کے ضمن میں آئی تھی۔آج سورۃ التوبہ کی آیت 114 تک ہم آئے ہیں۔ 115 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:1270)

❀.....❀.....❀

بیسواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 115 تا 125)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1973ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 115 سے ہو رہا ہے۔ (9:115)

جہاد میں شامل ہو کر جان دینے اور اس کے برعکس اس سے جی چرانے والوں کے مقامات کا تعین

سلسلۂ کلام کے متعلق تو آپ کو یاد ہے کہ جنگ کے ضمن میں بات منافقین کی ہو رہی تھی۔ اور منافقین سے مراد تھے وہ لوگ کہ جو دیگر امور میں تو امت اور جماعت کے ساتھ تھے لیکن جہاد کے معاملے میں انہوں نے گریز کی راہیں اختیار کیں۔ اور اس وجہ سے وہ اس سنگین

جرم کے مجرم قرار پائے کہ جس سے زیادہ سنگین جرم گویا اس ملت میں کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ ایک طرف جہاں جہاد میں شرکت اتنے بڑے اجر اور صلے کا موجب ہے کہ اسمیں جان دینے والوں کو مردہ تک نہیں کہا جاسکتا۔ بہت بڑا مقام ہے ان کا۔ تو اسی جہت سے اس سے جی چرانے والے اور بغیر کسی معقول عذر کے گریز کرنے والے اسی نسبت سے اسی قدر سنگین جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی لیے انہیں کفار سے بھی زیادہ پست ترین جہنمی سطح میں رکھا جا رہا ہے۔

انسانوں کے ایک نوع ہونے کے باوجود ان کے باہمی کردار، سوچ اور عمل کے متضاد ہونے کی نوعیت اور پھر قوموں کی ہلاکت کی وجہ جواز

منافقت کی شدت جب آئی ہے تو اس کے مقابلے میں جماعتِ مؤمنین کا ذکر کیا اور نہایت والہانہ انداز سے کیا۔ پھر ان کی خصوصیاتِ کبریٰ گنائیں ایک ایک کر کے اور بتایا کہ ایک طرف وہی نوعِ انسانی اس میں اس قسم کے بھی انسان ہوتے ہیں اور اُسی نوع میں ایسے انسان بھی ہوتے ہیں۔ وہ احسنِ تقویم کے مظہر ہوتے ہیں۔ یہ اسفل سافلین کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ تو اس میں یہ بھی نظر آ جاتا ہے کہ حیوانات کی زندگی تک تو ایک نوع کی خصوصیات اس ساری نوع میں ہوتی ہیں، اس نوع کے تمام افراد میں ہوتی ہیں۔ ہر شیر شیر ہوتا ہے، ہر بکری بکری ہوتی ہے۔ لیکن انسانوں کی کیفیت یہ ہے کہ نوع کے اعتبار سے تو سب انسان ہی ہوتے ہیں لیکن اسی نوع میں جعفر و صادق بھی ہوتے ہیں اسی نوع کے اندر صلاح الدین ایوبیؒ بھی ہوتے ہیں۔ تو انسانیت کسی نوع کا نام نہیں ہے بلکہ انسانوں کے اندر کچھ صلاحیتیں دی گئی ہیں، ان صلاحیتوں کے استعمال کے اعتبار سے ان کی تقسیم عمل میں آئے گی۔ شکل وصورت کے اعتبار سے تو ہر ایک کو ہی آدمی یا انسان کہا جائے گا۔ لیکن ان صلاحیتوں کے استعمال کی رو سے ان کی تقسیم ایسی ہوتی ہے کہ گویا یہ ایک نوع کے افراد رہتے ہی نہیں ہیں۔ تو یہ افرادِ انسانیہ جو احسنِ تقویم کے مظہر تھے جماعتِ مؤمنین۔ اب آگے یہ بات آ گئی کہ قوموں کی پھر ہلاکت کس طرح سے ہوتی ہے، تباہی کس طرح سے آتی ہے۔ اور اس میں ایک اصولی بات قرآن نے بیان کی۔

قوموں کو ہلاکت سے محفوظ رکھنے کے بنیادی اصول

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا ۢ بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (9:115) کسی قوم کو راہنمائی دی اور یہ نہیں ہے کہ اس کے بعد یونہی جسے جی چاہا ہلاک کر دیا، جسے چاہا عروج دیدیا۔ قوموں کی تباہیاں اس طرح سے نہیں ہوتیں۔ کہا بنیادی شرط یہ ہے یا سنت اللہ یہ ہے، طریق کار یہ ہے اصول اور قانون یہ ہے کہ پہلے اس بات کو واضح کر دیا جاتا ہے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا چاہیے۔ دیکھئے یہاں يَتَّقُوْنَ (9:115) کس طرح سے پکار پکار کر اپنے معنی بیان کر رہا ہے کہ وہ کون سی چیزیں

ہیں کہ جن کی وجہ سے انہیں تباہی آ جائے گی اور ان سے انہیں بچنا چاہیے۔ یہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2) کے معنی واضح ہو جاتے ہیں کہ مقصد ہی وہاں یہ ہے کہ جو لوگ زندگی کے خطرات سے، راستے کے تباہ کن گڑھوں سے بچنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس کتاب میں راہنمائی ہے۔ اور یہی حقیقت یہاں بیان کی کہ ایسا نہیں ہوتا کہ خدا یونہی کسی قوم کو تباہ کر دے۔ واضح کر دیا جاتا ہے کہ اس قوم کو کن باتوں سے بچنا چاہیے۔ اور اس کے بعد جب پھر وہ ان سے بچتی نہیں یعنی اب یہ ان کا ارتکاب جہالت کی وجہ سے نہیں ہوا، سب کچھ جاننے بوجھنے کے بعد دانستہ یہ کچھ ہوا۔ تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔

انسانیت پر قانون کی حقیقت اور اس کی اہمیت واضح کرنے کا مقصد اُسے ہلاکت سے بچانا ہی تو ہے

قرآنِ کریم اس سے ہمیں عدل کے متعلق بھی اصول دیتا ہے قانون کے متعلق اصول دیتا ہے کہ مواخذہ اسی جرم کا ہوگا جس سے متعلق قانون کو وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔ يُبَيِّنَ لَهُمْ (9:115) قرآن کہہ رہا ہے یہاں۔ یہ یبین جو ہوتا ہے اس کے معنی ہوتا ہے ابھار اور نکھار کر کسی چیز کو سامنے لے آنا۔ حالانکہ پہلے بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ (9:115) آیا ہے وہ ایک اصولی راہنمائی ہے جو دی گئی ہے۔ اس اصولی راہنمائی کے اندر پھر یہ تمام متعین اور Specific Provision جنہیں آپ کہتے ہیں، وہ چورا ہے پر ان کے سامنے لائی گئی ہیں۔ خاص طور پہ وہ کہ جن سے بچنا مقصود ہے، یہ نہیں کرنا، یہ نہیں کرنا۔ قانون حقیقت میں یہی چیز بتاتا ہے کہ اس سے بچنا ہے، یہ نہیں کرنا، یہ نہیں کرنا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ چیزیں واضح طور پر بیان کر دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد جو قوم ان جرائم کی مرتکب ہوتی ہے پھر وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ انفرادی طور پہ بھی نظامِ عدل یہی ہے۔ دو باتیں قرآن نے نظامِ عدل کے سلسلہ میں کہی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہی کہ قانون کو واضح طور پر بیان کر دیا جائے اس میں کسی قسم کا شک وشبہ، ابہام اور التباس نہ رہے کہ بات صاف نہ ہو کہ قانون کہتا کیا ہے۔

صدرِ اوّل میں بادشاہتوں کے اندر مفتی مقرر کرنے کا مقصد قانون کی حکمرانی ہی تھی

یہی وجہ تھی کہ ہمارے ہاں صدرِ اول میں اور بعد میں بھی مسلمانوں کی بادشاہتوں کے اندر بھی یہ جنہیں مفتی کہا جاتا ہے ان کا کام ہی یہ ہوتا تھا کہ جو متنازع فیہ معاملہ کسی کے سامنے آیا ہے وہ ان کے پاس جاتے تھے، وہ ان کو قانون سمجھا دیتے تھے۔ وہ بتاتے یہ تھے کہ اس باب میں قانون یہ کہتا ہے۔ اور یہ حکومت کی طرف سے انتظام ہوتا تھا اور یہ بغیر کسی خرچ کے ہوتا تھا۔ کتنی آسانیاں پیدا ہو جائیں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس باب میں قانون یہ کہتا ہے بھائی۔ کتنی مقدمہ بازیاں کم ہو جائیں، کتنی الجھنیں دور ہو جائیں۔ یہاں موجود نظامِ عدل جو چلا آ رہا ہے ہمارے ہاں اس کے اندر پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قانون اس باب میں کیا کہتا ہے۔ اور جہاں قانون پوچھنے کے لیے جاتے ہیں، وہ مدعی کے حق میں بھی وکیل کہتا ہے کہ قانون تمہارے حق میں ہے، مدعا علیہ کا وکیل اسے کہتا ہے قانون

تمہارے حق میں ہے۔ اگر وہ پہلے دن ہی اسے کہہ دیں کہ نہیں بھئی خلافِ قانون ہے جو بات تم کر رہے ہو فیصلہ تمہارے حق میں نہیں ہوسکتا اسے کوئی مقدمہ ہی نہیں دے گا۔

ہمارے ہاں عدل حاصل کرنے کی نوعیت اور مصائب و آلام کی داستانیں

اب صورت یہ پیدا ہوگئی آپ نے دیکھا کہ جہاں اس کام کے لیے بھی فیس چارج کی جاتی ہے۔ کوئی وکیل یہ نہیں بتاتا اپنے مؤکل کو کہ نہیں بھئی قانون تمہارے خلاف جارہا ہے تمہارے حق میں یہ بات نہیں جائے گی۔ وکیل بھی جانتا ہے کہ قانون خلاف جارہا ہے۔ پھر اگلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح سے ان واقعات کو ایسے موڑ اتروڑا جائے کہ وہ قانون بھی اس کے حق میں چلا جائے۔ تو اسے تو عدل نہیں کہا جاسکتا۔ عدل کی پہلی بنیادی شق یہ تھی کہ یُبَیِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ (9:115) یہ نظام ہونا چاہیے عدل کے اندر کہ بتایا جائے انہیں کہ بھئی اس باب میں قانون کیا کہتا ہے۔ پہلے تو قانون ہی اتنا واضح ہونا چاہیے کہ وہ عام طور پہ سمجھ میں آجائے کہ بات کیا ہے۔ اور پھر اگر کوئی شک وشبہ ہو تو ایسا انتظام ایسی مشینری ہونی چاہیے جہاں سے یہ معلوم ہوجائے کہ اس باب میں قانون کیا کہتا ہے۔ قانون میں یہ Provision تو ہوتی ہے کہ Ignorance of Law, Excuse نہیں ہوتا قانون سے ناواقفیت بطور عذر کے آپ نہیں پیش کرسکتے عدالت میں۔ ٹھیک ہے عدالت تو یہاں سے ہی آگے چلے گی۔ لیکن قانون کی واقفیت بہم پہنچانے کے لیے حکومت کی طرف سے کیا مشینری ہوتی ہے یہ کوئی مشینری نہیں ہوتی۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے جو باہر اپنے طور پہ پرائیویٹ مشینری ہے جسے ہم وکالت کہتے ہیں اس میں تو صورت یہ ہے۔

تعزیری قوانین کی دوسری خاص شق اور پھر لفظ ''ضل'' کا قرآنی مفہوم

دوسری شق جو قرآن نے کہی ہے وہ ہے اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (4:22) کہ قانون کا اطلاق اس کے نفاذ سے ہوگا پہلے کے معاملات جو ہیں ان کے اوپر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوگا۔ بڑی چیز ہے یہ کہ جب کوئی قانون نہیں تھا یُبَیِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ (9:115) کی سٹیج نہیں تھی بتایا نہیں گیا تھا کہ کونسی چیز ہے جس سے تمہیں بچنا چاہیے۔ تو اس وقت اگر کوئی چیز ایسی کرتا ہے جو بعد میں نافذ کیے جانے والے قانون کے خلاف ہوتی ہے تو وہ کس طرح سے جرم قرار دی جاسکتی ہے۔ یہ خاص طور پہ تعزیری قوانین Retrospectively کا Effect قرآن نہیں اس کو تسلیم کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ جو پہلے ہو چکا وہ ہو چکا اب ہم نے بات واضح کی ہے اس کے بعد جو اس کا ارتکاب کرے گا وہ ہے مجرم۔ اور پھر جو انہوں نے قانون بنایا ہے تو اسے نہایت وضاحت سے سمجھا دیا بتا دیا یُبَیِّنَ لَهُمْ (9:115) کر دیا۔ کہا کہ خدا یونہی نہیں کسی قوم پر کشاد کی راہیں بند کرتا۔ لِيُضِلَّ (9:115) جو یہاں ہے۔ ہمارے ہاں تو ضلالت کے معنی گمراہی اور اس کے

بعد یہ چیز کہ خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے ہدایت دیدیتا ہے۔ وہ بات تو کئی دفعہ آ چکی ہے۔ لیکن یہ ضل کے معنی صرف گمراہی نہیں ہوتا' کشاد کی راہیں بند کر دینا کسی کے اوپر' کامیابیاں نہ ہونا' کسی کے اعمال کا بلا نتیجہ رہ جانا' کسی کا حیران وششدرہ جانا' Confused ہو جانا یہ سب چیزیں اس کے اندر آ جاتی ہیں۔ تو یہاں یہ چیز ہے کہ کسی قوم پر کشاد کی راہیں خدا بند نہیں کرتا تاوقتیکہ پہلے اسے بتا نہیں دیا جاتا کہ وہ کون کون سی چیزیں ہیں کہ جن سے تباہی آ سکتی ہے' تمہیں ان سے بچنا چاہیے۔ اور پھر بتانے والے کی کیفیت یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰـہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ (9:115) وہ اپنے علم کی رو سے ایسا کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اِنَّ اللّٰـہَ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ؕ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ (9:116)

اجتماعی زندگی میں قوموں کے عروج وزوال کے متعلق قرآن حکیم کا فرمان

اقتدارِ مطلق پوری کائنات کے اندر خدا ہی کا ہے' وہی مالک بھی ہے ان چیزوں کا' اسی کا ان کے اوپر اقتدار بھی ہے۔ اور اس لیے قوموں کی موت وحیات بھی۔ یہاں جو یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ (9:116) ہے یہ اجتماعی اور قومی ہے اس لیے کہ بات پیچھے سے ساری اجتماعی اور قومی چلی آ رہی تھی۔ اجتماعی اسے کہیے' قومی ہم کیوں کہیں۔ تو اجتماعی زندگی میں قوموں کا عروج وزوال یہ بھی اسی کے قانون کے مطابق عمل میں آتا ہے کیونکہ اس کا کنٹرول تو پوری کائنات کے اوپر ہے۔ پہلے کہا گیا تھا کہ کسی قوم پر کشاد کی راہ بند نہیں کی جاتی تاوقتیکہ اسے بتا نہ دیا جائے کہ کن باتوں سے اسے مجتنب رہنا ہوگا۔ اس کے لیے بھی یہ کہا یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ 9:1160)۔ لہٰذا زندگی اور موت قوموں کی اسی کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ جیسا سورۃ الانفال میں پیچھے یہ کہا گیا تھا کہ قرآن اس لیے دیا گیا ہے کہ جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی علیٰ بیّنہ زندہ رہے جسے تباہ ہونا ہے وہ بھی علیٰ بیّنہ تباہ ہو۔ علیٰ بیّنہ' وہی بین جس کو یہاں کہا گیا ہے۔ علیٰ وجہ البصیرت ایسا ہوتا ہے' اسے معلوم ہو کہ ایسا کیوں ہوا ہے' اسے پتہ ہو کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا۔ اور اس کے باوجود کوئی ایسا کرے گا تو کوئی Excuse نہیں ہے کہ مجھے اس کا علم نہیں تھا اس لیے مجھ سے یہ سب کچھ ہوا۔ علیٰ بیّن ہے۔ یونہی وہ کسی کو جو جی میں آئے تو تباہ کر دیا اور جی میں آئے تو کسی کو یہ کچھ بخش دیا۔ جی میں آئے والی بات نہیں ہے' قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

قرآنی اصولوں کی خلاف ورزی کے باعث ہونے والی تباہی سے کسی کو کوئی نہیں بچا سکتا

وہ کہتا ہے علیٰ بیّن یہ سب کچھ ہوتا ہے' علیٰ وجہ البصیرت سب کچھ ہوتا ہے۔ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ (9:116)

اور یاد رکھیئے کہ اس کے قوانین کے تابع یہ سب کچھ ہوتا ہے' یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کوئی قوم کر رہی ہو اور کوئی

اس کا دوست اور حامی اور ناصر بن کے ان کی تباہیوں سے اسے بچالے۔ بلکہ قرآن کہتا ہے کہ ان کا تو کوئی دوست اور حامی اور ناصر ہو ہی نہیں سکتا۔ مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی اس کا دم بھی بھرتا ہے تو وہ جو مقصد تھا کسی قوم کی نصرت اور ولایت کا کہ وہ اسے ان تباہیوں سے بچا لے گا، وہ نہیں کر سکتا۔ یہ لغزشیں، کوتاہیاں کچھ اجتہادی غلط فیصلے، تدبیری غلطیاں یہ اور چیز ہوتی ہیں، ان سے بچا بھی جا سکتا ہے، بچایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن یہ جو اصولی قوانینِ خداوندی ہیں، ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے تو کوئی قوم کسی دوسری قوم کی دوستی اور سازگاری سے بھی نہیں بچ سکتی، وہ بچا ہی نہیں سکتی ان کو اس سے۔

جنگ تبوک کی دل جلا دینے والی روئداد، قوت ایمان کا مظاہرہ اور رومن امپائر کی آخری کوشش جو ناکام ہوگئی

بات چلی آ رہی تھی جنگِ تبوک کی۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ جنگِ تبوک نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ ارضی میں آخری مہم تھی جو رومنز کے خلاف بازنطینی حکومت کے خلاف تھی۔ یہ خبر پھیل گئی تھی کہ انہوں نے ایک آخری فیصلہ کیا ہے۔ یہ سن 9 ہجری کا واقعہ کہا جاتا ہے جب عرب کی مملکت بھی Establish ہوگئی تھی اور یہ بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

جنگ تبوک کی تیاری کے لیے حضور ﷺ کا بطور سالار پروگرام

کفار نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آخری مہم اتنی یورش اتنی سختی سے کی جائے کہ اس مملکت کو ختم کر دیا جائے۔ اور حضور ﷺ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کا مقابلہ ان کی سرزمین میں جا کے کیا جائے یہ نہ کیا جائے کہ ان کو یہاں تک آنے دیا جائے۔ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ رومن امپائر آخری مہم کے طور پر فیصلہ کر کے میدان میں آتی ہے۔ اور ادھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موسم سخت گرم تھا، فصلیں پکی ہوئی تھیں، سامان بہت تھوڑا تھا۔ اسی آیت میں یہ آیا ہے کہ تیرے پاس یہ کہنے کے لیے آتے ہیں کہ ہمارے پاس سواری نہیں سفر کے لیے، سواری عطا کر۔ اور تیرے پاس بھی سوائے آنکھوں میں ڈبڈبانے والے آنسوؤں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ تو بھی معذرت کر دیتا ہے۔ تو گویا کیفیت یہ تھی، ضروریات جو تھیں معاشرے کی وہ ایسی تھی کہ سن 9 ہجری میں بھی یہ صورت تھی ابھی۔ تو ان حالات میں مدینے سے لشکر کا اٹھنا اور تبوک کے لیے بازنطین کی سرحد تک پہنچنا، سفر ہی بڑا دشوار گذار تھا چہ جائیکہ اس کے بعد کا مقابلہ، وہ کتنا صعوبت انگیز اور صبر آزما ہوگا۔

جنگی پروگرام کے دوران گریز کی راہیں اختیار کرنے والوں کا ذکر

آخری مہم بھی تھی اور اس جماعت کے لیے یہ آزمائش کا موقع بھی تھا۔ یہی وجہ ہے اس میں جس نے گریز کی راہ اختیار کی ہے، قرآن نے اتنی سختی سے ان کا مواخذہ کیا ہے۔ یقیناً وہاں جاتے ہوئے اس کی ہولناکیوں سے دل ڈوب گئے ہونگے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ

ایسے خیالات بھی ابھرے ہوں کہ ہمیں جنگ نہیں کرنی چاہیے۔ سب کچھ ہوسکتا ہے یہ۔ یہ ساری چیزیں ہونے کے بعد بھی قرآنِ کریم نے بہ ہیئت مجموعی اس قوم کو لیا ہے یہ قوم گئی' یہ جماعتِ مؤمنین جو گئی تھی۔ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (9:117) کہا یہ ٹھیک ہے ہمیں معلوم ہے کہ اسی جماعتِ مؤمنین میں کچھ وہ لوگ بھی تھے کہ جن کے ان ہولناکیوں سے دل ڈوبے۔ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ (9:117) اس کے معنی یہ ہیں کہ ہوسکتا تھا کہ ان کے دل ڈول جاتے' ان کے پاؤں میں لغزش آ جاتی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں ہے۔ لیکن ایمان کے مقابل میں تو ایسا ہونے کا امکان بھی ایک کمزوری ہوتی ہے۔ اور ہوا کس زمانے میں فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ(9:117) بڑی سختی کے زمانے میں یہ کچھ ہوا ہے۔ تو ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ اتنی زیادہ سختی' شدت کی صعوبات کے زمانے میں بھی دل میں کسی قسم کی لغزش کا خیال نہ آنے پائے۔ کہا کہ ایسے زمانے میں جو صورت ہوئی لیکن چونکہ یہ واقعہ ہوا نہیں۔ اُنہوں نے پھر بڑے ہی ثبات اور استقامت کا ثبوت دیا اس جنگ کے اندر۔ جنگ تو ہوئی نہیں تھی' اس سے پیشتر ہی جا کے معلوم ہوا کہ نہیں غالباً انہوں نے ارادہ بدل دیا تھا ان کی اس ہمت اور استقامت کو دیکھ کر۔ لیکن یہ جو عزم تھا وہاں تک چلے جانے کا جان ہتھیلیوں پر رکھ کر' اتنی صعوبات سفر کی برداشت کر کے بجائے خویش یہ بہت بڑا کام تھا۔ تو اس راستے میں وہاں تک جاتے ہوئے بھی کسی کا دل ڈولا نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ایسا ہوسکتا تھا' یہ ہوسکنا بھی جو ہے یہ بھی ایک ایسی چیز تھی کہ جس کی وجہ سے کچھ اجتماعی کمزوری آ جاتی' نقصان ہو جاتا۔ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ 99:1170 خدا لوٹ آیا جسے کہتے ہیں۔ خدا کا لوٹ آنا یہ ہوتا ہے نادانستہ طور پر کوئی لغزش کوتاہی ایسی ہو جائے یا اس کا خیال تک بھی دل میں آئے' قرآن تو خیال تک کی گرفت کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ جو اس قانون کی اطاعت اور اتباع کی بناء پہ ساری شادکامیاں اور رحمتیں حاصل ہوتی تھیں' وہ رک جائیں۔ اور اس کے بعد وہ معذرت قبول کر لی جائے' تحقیق کر لی جائے کہ نہیں کوئی جرم سرزد نہیں ہوا ہے۔ تو پھر اسی اعتدال کی حالت کے اوپر' وہی نارمل حالت پیدا ہو جائے خدا کے قانون کی رو سے ان تمام نوازشات کے ملنے کی۔ اسے کہتے ہیں خدا کا پھر لوٹ آنا۔ یعنی توبہ ہی کے لفظ سے آپ دیکھئے دونوں چیزیں کیسی مقصود ہو جاتی ہیں۔ انسان کی طرف سے توبہ' جو بھی خطا' جرم اور لغزش ہوا ہوئی تھی اس کا احساس کہ غلطی ہوگئی۔ اور اس کے بعد ندامت اس کی اعترافِ جرم' پھر پلٹ آنا اس مقام پہ جہاں سے قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا تھا اور اصلح پھر اپنی اصلاح کر لینا۔ یہ پروگرام ہوتا ہے انسان کی طرف سے۔ اور خدا کی طرف سے یہ ہوتا ہے کہ وہ اس لغزش کی بناء پر خوشگوار نتائج ملنا بند ہو گئے' اس بندش کا اٹھ جانا اور پھر اسی نارمل حالت کا پیدا ہو جانا۔ یہ خدا کی طرف سے لوٹ آنا کہلاتا ہے قرآن کی اصطلاح میں خدا پلٹ آیا۔ مہاجرین انصار یا نبی یہ سربراہِ مملکت یا

اس وقت کے سپہ سالارِ لشکر اور سارے اہلِ لشکر مہاجرین اور انصار۔ بہرحال خدا پھر لوٹ آیا۔ تو جو راستے میں یہ کچھ ہوا بھی اس کی وجہ سے کوئی کمی یا کوئی مواخذے کی بات نہیں ہوئی۔ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (9:117) اتنی بڑی استقامت کا ثبوت دینے والوں کے لیے تو واقعی اس کے قانون میں اتنی گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ رأفت اور رحمت سے کام لے۔

جنگ کے پروگرام کے دوران 3 ارکان کی طرف سے لغزش ہو جانے کے واقعہ کی روداد

آپ کو معلوم ہے (9:6) میں بات آ رہی تھی ان منافقین کی کہ جو پیچھے رہ گئے تھے' جنگ میں اور ساتھ نہیں گئے تھے۔ پھر ذکر آ رہا تھا کہ انہوں نے کس طرح سے Lame Excuses اس کے لیے پیش کیے اور وہ Excuses سارے منافقت پر مبنی تھے ان کی حقیقت کوئی نہیں تھی۔ لیکن پیچھے رہ جانے والوں میں تین ایسے تھے کہ جن کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ کیا فرق تھا؟ کیا بات تھی کہ ان تین لوگوں کو اس پوری جماعت سے الگ کر دیا۔ پیچھے یہ بھی رہے تھے پیچھے وہ بھی رہے تھے۔ تو فرق وہی تھا جو قصۂ آدم اور ابلیس میں ہوتا ہے پہلے دن سے جو بتاتا چلا آتا ہے کہ لغزش سرزد ہوئی اور اس کے بعد جب پوچھا گیا تو کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) ہاں واقعی غلطی ہوگئی ہے ہمیں ندامت ہے اس کے اوپر۔ اور دوسری طرف ابلیس کا کہا گیا کہ اس نے اس قسم کے جواب میں مدافعت ایسی پیش کی کہ جس سے ذمہ داری اس کے اوپر نہ عائد کی جائے۔ غلطی نہیں کی میں نے' لغزش میں نے نہیں کی ہے۔ اُس نے تو یہ کہہ دیا تھا میں کر کیا سکتا ہوں' تو قادرِ مطلق ہے تیرے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا' میں کون ہوں اس قسم کی غلطی اور لغزش کرنے والا' تو نے ہی یہ سب کچھ کرایا ہے۔ تقدیر کا مسئلہ ہے۔ یہاں بھی وہ چیز کہی کہ یہ پیچھے رہ جانے والے۔ پیچھے رہ جانا تو جرم یکساں تھا دونوں کا۔

خطا ہونے پر حضرت سعد بن مالک کا بیان

لیکن اب دیکھئے کہ ان دونوں کے اندر جسے Extenuative Circumstances کہتے ہیں وہ کتنی بڑی بات ہوگئی۔ اُن سے پوچھا گیا تو انہوں نے اعتراف نہیں کیا اس بات کا کہ ہاں ہم سے غلطی ہوئی جرم ہوا۔ اُنہوں نے اپنے Defence میں عجیب قسم کی معذرتیں پیش کیں جو یکسر منافقت پر مبنی تھیں۔ یہ تھے جنہوں نے یہ کہا کہ ہاں خطا ہوئی۔ تاریخ میں روایات میں تفصیل دی گئی ہے ان تینوں کی جو کہا گیا ہے ان تینوں میں جو ہیڈ تھے وہ حضرت سعد بن مالکؓ تھے۔ تو کہا گیا ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضورﷺ ہمارا کوئی عذر نہیں ہے۔ ہوا یہ تھا کہ لشکر تیار ہو گیا تھا۔ میں یہ عرض کر دوں پہلے بھی بتا چکا ہوں کئی دفعہ کہ اس زمانے میں سٹینڈنگ آرمی نہیں ہوتی تھی' یہ سارے والنٹیئرز ہوتے تھے۔ سٹینڈنگ آرمی تو بہت بعد میں جا کے کہیں آئی ہے عباسیوں کے دور میں۔ اس جماعتِ مؤمنین میں ہر ایک سپاہی ہوتا تھا' آواز جب دی جاتی تھی تو سارے کے سارے اسی طرح نکل کھڑے ہوتے تھے جیسے

ہمارے سٹینڈنگ آرمی کے سپاہی ہیں۔ یہ سپاہی جسے کہتے ہیں ڈیوٹی باؤنڈ جانا ہوتا ہے ان کو۔ اُن پر یہ فریضہ کہیں اوپر سے عائد نہیں کیا گیا تھا یہ فریضۂ خداوندی تھا جو دل کے احساس سے ابھرتا تھا۔

انسانی دنیا میں مسلط ہونے والے نظام زندگی کے برعکس حقائق اور احساسات کی بنیاد پر پرورش پانے والے نظام زندگی میں فرق

اگر آپ تحقیق کریں تو دورِ اول کے ہمارے نظام کی، ہماری فتوحات کی، ہماری فوجوں کی اس قدر استقامت اور ثبات کی تو یہ واقعی بے نظیر نظر آئیں گے۔ یہ سٹینڈنگ آرمی والے لوگ نہیں ہیں مَرْضَاتِ اللّٰهِ (2:2070) ہو رہا ہے یہ سارے والنٹیئر ز ہیں۔ جسے کہا جاتا ہے کہ پیچھے رہ جانا جرم تھا' یہ آرمی کا جرم نہیں تھا کہ قانون کی رو سے مارشل لاء ان کے اوپر عائد ہو جاتا۔ یہ Self Imposed Discipline تھا۔ اور بڑی چیز ہے یہ۔ یہی فرق قرانی ہے نظام میں اور دنیا کے دیگر نظاموں میں۔ یہ باقی نظام دوسرے ضابطے اور قانون کی رو سے مسلط کیے جاتے ہیں۔ یہ نظام دل کے احساسات سے اوپر ابھرتا ہے۔ آپ سوچئے کہ اتنی بڑی وسیع وعریض مملکت ٹکراؤ ایران اور رومن جیسی امپائر سے ہو اور سٹینڈنگ آرمی نہ ان کے پاس ہو۔ اور اس کے بعد جب آواز دی جائے تو اس آواز دیے جانے والوں میں تین ہی کے متعلق قرآن نے کہا ہے وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا (9:118) ۔

چند ساتھیوں کا جنگ میں شامل نہ ہونے کی بنا پر اظہارِ ندامت کے باعث ماتھے پر عرق انفال کے قطرے

ایک جماعت جو منافقین کی تھی، ان کو چھوڑ دیجیے۔ ان کے متعلق تو یہ کہہ دیا کہ یہ جماعتِ مؤمنین میں شامل ہی نہیں۔ خلوص سے جو جماعت میں آنے والے تھے والنٹیئر یلی، جب ان کو رضامندی سے بلایا گیا ہے اس قسم کی جنگ میں جانے کے لیے۔ تو پوری امتِ مسلمہ اس زمانے کی اس میں سے تین ایسے نکلے ہیں جو پیچھے رہ گئے ہیں۔ بڑی چیز ہے عزیزانِ من!۔ اور تین بھی وہ کہ جب ان سے پوچھا گیا ہے تو نگاہیں ندامت سے زمین میں گڑ گئی تھیں۔ ہاں حضور ﷺ غلطی ہوئی، غلطی نہیں ہوئی جرم ہوا۔ ہوا کیا تھا۔ کہنے لگے سہل انگاری تھی۔ کہ یہ کام ذرا نمٹا لیں تو پھر ہم چلے جائیں گے۔ تیار تھے ہم بالکل جانے کے لیے، وہ آج کل کرتے گئے اور آج کل کرتے کرتے میں، اتنی دیر لگ گئی کہ اس کے بعد یہ موقع ہی ہاتھ سے نکل گیا کہ ہم جا کے مل جائیں گے لشکر کے ساتھ۔ اور اس کے بعد ہم ندامت میں یہاں بیٹھ گئے۔ ہمارے ساتھ یہ ہوا۔ جیسا وہاں تھا (9:106) میں۔

تین کے علاوہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جنگِ تبوک کے مجاہدین پر تحسین وتبریک کے پھولوں کی بارش اور باقی 3 کے کیلئے خدا کی طرف سے زمین تنگ ہوگئی

جماعتِ مؤمنین جب جو وہاں سے واپس آئی ہے تو قرآن نے پوچھو نہیں کس طرح سے ان کا استقبال کیا ہے خدا اور اس کے فرشتے پھول نچھاور کر رہے تھے۔ منافقین جن کے متعلق ثابت ہوگیا کہ یہ دانستہ پیچھے رہے تھے ان کو کاٹ کے الگ رکھ دیا۔ (9:106) تین ایسے تھے جن کے متعلق فیصلہ ملتوی کر دیا تھا۔ نظر آتا ہے کہ یہ پہلا واقعہ ہوا ہے اس ساری تاریخ میں ہمارے ہاں۔ ورنہ اس سے پہلے اگر یہ ہوگیا ہوتا قرآن میں حکم بھی آ گیا ہوتا' اس کی ایک نظیر بھی ان کے پاس ہوتی۔ معلوم یہ ہو رہا ہے کہ پہلا واقعہ تھا۔

حضرت کعبؓ پر زمین تنگ ہوگئی' بیوی نے چھوڑا' بھائیوں نے چھوڑا' نبی اکرم ﷺ نے منہ پھیر لیا' جماعت نے قطع تعلق کر لیا

یہ جرم اتنا بڑا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود فیصلہ نہیں کیا۔ بڑی غور طلب یہ چیز ہے۔ یعنی پیچھے رہ جانا اتنا بڑا جرم تھا کہ ان کے اس اظہارِ تاسف اور ندامت کے باوجود حضور ﷺ نے خود نہیں فیصلہ کیا کہ جرم کی سنگینی کی نوعیت کے پیشِ نظر ان کو معاف کیا جاسکتا ہے یا نہیں معاف کیا جاسکتا۔ معافی بھی تو ہر جرم کے لیے نہیں ہوسکتی۔ نہ تو یہ ان منافقین میں شامل کیے جاسکے' نہ ان مؤمنین میں شامل کیے جاسکے حضور ﷺ کی اپنی مرضی یا فیصلے سے۔ فیصلے کو معطل کر دیا' ملتوی رکھا گیا اور وحی کا انتظار کیا گیا۔ اور یہ تھے وہ تین وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيۡنَ خُلِّفُوۡا (9:118) اور اس کے بعد ان پہ کیا گذری قرآنِ کریم نے ایجاز جسے کہتے ہیں Concentrative Form کے اندر چند لفظوں میں ساری بات کو یوں بتایا۔ کہا کہ کیفیت یہ تھی کہ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ (9:118) زمین اپنی اتنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی۔ اتنا ہی نہیں کہا۔ قرآن کا اندازِ بیان ملاحظہ فرماؤ' عزیزانِ من! جرم کی سنگینی کی جو شدت ہے اس کی بناء پہ بات کر رہا ہے۔ یہی کافی تھا' ہمارے ہاں کا بڑے سے بڑا ادیب بھی کہتا تو اتنا ہی کہتا کہ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی۔ آگے بھی ہے وَ ضَاقَتۡ عَلَيۡهِمۡ اَنۡفُسُهُمۡ (9:118) نہیں وہ خود اپنے آپ سے تنگ آ گئے تھے۔ یعنی زمین اگر تنگ نہ بھی ہوتی تو پھر بھی یہ بات نہیں تھی کہ معاملہ رفع ہوگیا ہوتا۔ جو خود اپنے آپ سے تنگ آ چکا ہو اس کو دنیا میں کون پناہ دے سکتا ہے۔ کیفیت یہ ہوگئی تھی۔ یہ ہوا کیا تھا جس سے یہ سب کچھ ہوگیا۔ انہیں قید نہیں کیا گیا انہیں کوئی سزا نہیں دی گئی' ان کے مقدمہ کا فیصلہ کوئی نہیں ہوا' اس سے پہلے ہی یہ کچھ کیا ہوگیا۔ صرف یہ تھا حضور ﷺ نے یہ کہا تھا کہ کیونکہ بات ملتوی ہے' ان کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ اپنی برادری اپنی

جماعت میں صرف بائیکاٹ یہ ہوا تھا۔ اور اس کا نتیجہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پہ تنگ ہوگئی' وہ اپنی جان سے تنگ آ گئے ۔ بڑی عبرت انگیز تفصیل ہے جو آئی ہے روایات میں ان کے متعلق ۔ جب حضورﷺ نے یہ کہا ہے کہ ان کا مقاطعہ کر دیا جائے ۔ یہ مسلمان تھے' یہ مسلمانوں کے ساتھ تھے' یہ سب چیزوں میں ان کے شریک تھے ۔ مقاطعہ معاشرتی تھا' سوشل بائیکاٹ جسے کہتے تھے ۔ حضرتِ کعبؓ نے یہ کہا ہے کہ جب یہ حکم آیا ہے میں باہر تھا' واپس گیا ہوں دروازہ بند پایا۔ اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی' دروازہ کھٹکھٹایا بیوی نے آواز دی' انہوں نے کہا دروازہ کھولیے' اُس نے کہا کہ اب دروازہ نہیں کھل سکتا حضورﷺ نے کہا ہے ان کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ حضرتِ کعبؓ نے بھی اس سے بھی زیادہ دردانگیز بات کہی' اُنہوںؓ نے کہا تھا میرے بھائیوں نے مجھے چھوڑا' ماں باپ نے چھوڑا' بیوی نے بھی دروازہ بند کرلیا' یہ چیزیں میں برداشت کیے جاتا تھا۔ نماز پڑھنے کے لیے جب مسجد میں گیا اور میں نے حضورﷺ کو سلام کیا حضورﷺ نے اپنا منہ پھیر لیا۔ کہا یہ چیز میرے لیے قابلِ برداشت نہیں تھی ۔ یہ تھی جس سے کہا کہ اپنی جان سے تنگ آ گئے تھے۔ کہا کہ اگر خودکشی ہمارے ہاں حرام نہ ہوتی تو میں ایک سیکنڈ کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ حضورﷺ کو سلام کروں اور وہ منہ پھیر لیں اور اس کے بعد میں زندہ رہوں ۔ جماعت سے منقطع ۔ یہاں دندناتے ہوئے کہا جاتا ہے کرلیں کیا کرتے ہیں میرا۔ ٹھیک ہے جی ۔ اس معاشرے میں کوئی کیا کرسکتا ہے کسی کا' کوئی کچھ بھی نہیں کرسکتا ۔ وہ جنہوں نے مقاطعہ کیا تھا انہوں نے کیا کیا تھا ان کے ساتھ؟ کوئی اذیت تو نہیں پہنچائی تھی' سلام کا جواب ہی نہیں دیا تھا۔ یہ ہوتا ہے عزیزانِ من! جو اپنے ہوتے ہیں ان سے کٹ جانا' اس سے زیادہ سنگین سزا کوئی نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہاں تو اپنا ہی کوئی نہیں ہوتا۔ قرآن نے اس معاشرے میں کہا ہے نایَتِيۡـمًـا ذَا مَقۡـرَبَةٍ (90:15) سب کے قریب ہونے کے باوجود تنہا ہے۔ تو سب کے قریب ہونے کے باوجود تنہا ہے' اس کا ان سے کٹ جانے کا کیا مطلب اس کی تو زندگی کٹ جانے میں گذر رہی ہے ۔ یہ ہے جو مقاطعہ کا تصور نہیں ہوسکتا۔

انسان کے لیے سب سے کڑی سزا برادری سے کٹ جانے کی تھی

اور ہمارے ہاں جسے انقلاب کہا جاتا ہے' کتنی جلدی یہ تباہی آ رہی ہے۔ کوئی دو جنریشنز نہیں ہوئی ہیں میں تو ایک ہی جنریشن کی بات کر رہا ہوں۔ میری اپنی زندگی کی یہ صورت ہے۔ وہ دور کل تک ہمارے ہاں موجود تھا' جب ہماری برادریاں موجود تھی۔ برادری کے اندر حقہ پانی کھینچ دینا کسی کا۔ اور ان برادریوں میں ہمارے ہاں اونچی اونچی ذاتوں والے بنے پھرتے ہیں' ان کے ہاں ابھی ایسی چیز نہیں ہوتی تھی۔ یہ بھنگڑوں کی برادری' پوربیوں کی برادری' دھوبیوں کی برادری میں نے ان کو دیکھا ہے۔

برادری سسٹم میں جرائم کی تعداد بہت کم ہو جاتی تھی

یہ پنچائیت سسٹم جسے کہتے ہیں، چائنا میں بڑی کامیاب جا رہی ہے۔ جرم کسی سے سرزد ہوتا تھا، وہ کبھی عدالت میں نہیں جاتے تھے، کبھی تھانے میں نہیں جاتے تھے، وہ بیٹھ جاتے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے ان کے فیصلوں کو، ان کی پنچائیت کے فیصلوں کو۔ اور وہ برادری بیٹھ کے کچھ نہیں کہتی تھی، پہلی چیز یہ ہوتی تھی کہ حقہ پانی کھینچتی تھی۔ اس کے معنی یہ ہوتا تھا سوشل بائیکاٹ۔ اور یہ اتنی سخت سزا ہوتی تھی کہ اس کے بعد وہ اپیل کرتا تھا کہ خدا کے لیے مجھے کوئی اور سزا دیجیے جتنی سخت سزا دینی ہے، یہ تو نہ کیجیے۔ اس طریقہ سے جرائم کی خاطر خواہ روک تھام ہو جاتی تھی۔ یہ تھا جرائم کی روک تھام کا ایک طریقہ، یہ تھی برادری کی قدر و قیمت ان کی نگاہوں میں کہ اس برداری میں ''میں بیٹھن جوگا نئیں رواں گا، منہ دکھان جوگا نئیں رواں گا''۔ یہ اتنی بڑی سزا تھی، اس کے بعد جرم نہیں ہوتے تھے۔

اس معاشرے میں جرم یا مجرم کوئی ایسی بات نہیں رہی کہ کوئی دوسرا اس کی پرواہ کرے۔ اپنے اپنے مفاد دیکھے جاتے ہیں کہ اس کے ساتھ رہنے میں کتنا فائدہ ہے، اس کو چھوڑ جانے میں میرا کتنا فائدہ ہے۔ کہیں برادریاں ہوتیں، برادریوں سے کٹ جانے سے کوئی اس قسم کے احتمالات ہوتے کبھی یہ صورت پیدا ہی نہ ہوتی۔ اور یہ تو میں نے کل کی بات ابھی آپ کو بتائی ہے، ان لوگوں کی برادریاں بتائی ہیں۔ یہ برادری جو تھی اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (8:63) جسے قرآن نے کہا ہے دل مل گئے ہوئے تھے ایک دوسرے سے۔ اُس برادری میں سوشل بائیکاٹ کسی کا ہو جانا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ (9:118) زمین اپنی اتنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ آ گئی۔ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ (9:118) اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ خدا کی بارگاہ کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہے ہمارے لیے۔ یہ بھی آیا ہے اس واقعہ کی تفصیل میں، نظر آتا ہے کہ یہ حضرت سعد بن مالکؓ اچھی پوزیشن کے مالک آدمی تھے۔ اس لیے کہ یہ غسانی ہوتے تھے یہ ایران اور بازنطینی حکومتیں تو دور تھیں، یہ جو عرب کی سرحدیں تھی ان کی مملکت میں اور عرب کے ملک میں جو سرحدیں تھی، سرحدوں کے علاقے جو تھے، ان میں انہوں نے الگ حکومتیں قائم رکھی تھیں انہی کی زیرِ نگرانی، لیکن وہاں کے وہ لوکل ہوتے تھے۔ اور وہ اپنے اپنے علاقے میں حکومت کرتے تھے۔ ان حکومتوں کے نمائندے کی حیثیت سے سمجھ لیجیے۔

علاقے کے بادشاہ کی طرف سے حضرت کعب کو رفاقت کی پیش کش، لیکن حضرت کعب نے رفاقت کی اس دعوت کو نظر آتش کر دیا

یہ ان علاقوں میں غسانی تھے۔ ان میں سے ایک علاقے کے بادشاہ نے، راجہ نے، نواب نے ان کو ایک خط بھیجا حضرتِ کعبؓ کے

پاس کہ ہم نے سنا ہے تمہارے لوگ تمہاری اتنی بے عزتی کر رہے ہیں، ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے، تم بڑے صاحبِ عزت ہو۔ وہاں اگر یہ کیفیت ہے تو کوئی بات نہیں تم چلے آؤ ہمارے ہاں، ہم اس سے زیادہ تمہیں مکرم اور معزز بنائیں گے۔ حضرتِ کعبؓ کہتے ہیں کہ جب وہ قاصد میرے پاس آیا تو اس نے مجھے خط دیا ہے بازار میں، تو میں نے خدا کے حضور وہیں گڑگڑا کے عرض کیا کہ آزمائشیں سخت سے سخت تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ الہ العٰلمین توفیق عطا فرما کہ میں ان Temptations میں کہیں نہ آ جاؤں۔ اُس نے کہا خط کا جواب، اُنہوںؓ نے خط تنور میں پھینک دیا۔ کہا اس سے کہنا کہ میرے خط کا یہ جواب ہے۔ یہ تھے وہ لوگ۔

وَ ظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ (9:118) یہ جو یقین ہو گیا تھا کہ کہیں اور پناہ نہیں ہے۔ پناہ تو ایسی مل رہی تھی کہ ایک بادشاہ کی طرف سے قاصد آ رہا تھا۔ کہا کہ یہی نہیں کہ ہم تمہیں ایک نظر بند کی حیثیت سے یہاں رکھ لیں گے، معزز اور مقرب بنائیں گے، یہاں چلے آؤ تم۔ پناہ تو یوں مل رہی تھی وہ اسے پناہ نہیں سمجھ رہے۔ پناہ تو یہیں ملنی چاہیے تھی۔ یقین ہو گیا کہ خدا کی کچہری سے بھاگے ہوئے ملزم کو اس کچہری کے سوا کہیں اور پناہ نہیں مل سکتی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ وہ خود کورٹ میں آ گیا اور اس نے اپنے آپ کو پیش کر دیا مجسٹریٹ کے سامنے۔ یہ فیصلہ کیا انہوں نے۔ تو اندازہ لگایئے کہ جن کی توبہ کی یہ کیفیت ہو، اسے توبہ کہتے ہیں۔

معذرت کی قبولیت تک کی کیفیت

ادھر سے پھر فیصلہ ہو گیا بارگاہِ خداوندی سے کہ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (9:118) ان کی معذرت قابلِ پذیرائی تھی Accept کر لی گئی۔ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا (9:118) کیا بات ہے!! یعنی ابھی چونکہ جرم معاف نہیں ہوا اس لیے وہ کھڑے ہیں کٹہرے میں۔ ورنہ عام حالات کے اندر جہاں کوئی انفرادی چیز ہوتی ہے وہاں Construction قرآن کی یہ ہوتی ہے کہ اس نے توبہ کی خدا اس کی طرف بڑھ آیا۔ عزیزانِ من! قرآن کے اسلوب پہ بڑا غور کرنا چاہیے۔ یہ بات آ گئی ہے عدالت کی، یہاں کہا ہے کہ پہلے یہ فیصلہ دیا عدالت نے کہ ہاں تمہاری معذرت قبول ہوئی۔ اور اس کے بعد پھر یہ لوٹ کے وہاں واپس آئے جہاں ان کو ہونا چاہیے تھا۔ تو گویا خالی معذرت کر دینا، اسے اس جرم سے یا اس الزام سے بری نہیں قرار دیتا۔ اس کا Accept ہو جانا بھی بڑا ضروری ہے، یہ ہے انداز کہ ہاں Accept کر لی گئی ان کی توبہ۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (9:118) لہٰذا

مذہب کے اندر انفرادی نجات کی بجائے توبہ کے معیار کا ذکر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ (9:119) عزیزانِ من! اس بیک گراؤنڈ میں اس آیت کو دیکھئے کس طرح مفہوم نکھر کے سامنے آتا ہے۔ پھر دہرا دوں کہ بات یہاں کیا کہی گئی تھی۔ یہ تین وہ تھے جو جماعت سے کہیں الگ رہ گئے تھے۔ بس اتنی سی بات تھی۔ جو

انہوں نے Defence میں پیش کی ہے وہ قابلِ قبول ہے قبول بھی کر لی گئی ہے۔ جماعت سے الگ ہو جانا جرم اتنا تھا کہ اگلی آیت میں یہ کہا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ (9:119) اے جماعتِ مؤمنین! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ کس طرح سے نگہداشت کرو؟ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (9:119) جماعت سے کہیں الگ نہ ہو جانا' سچوں کے ساتھ رہو۔ دین انفرادی نہیں ہے۔

مذہب میں تو اپنی اپنی نجات ہے' جماعت کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جس نے جس طرح سے بھی بھگتی کی' پرستش کی' پوجا پاٹ کی۔ اور اس کے بعد اپنی اصطلاحات لیجیے وہی آپ کے دین کی اصطلاحات مذہب میں آ کے' وہ پوجا بن گئیں۔ عبادت کی اپنے طور پر' اپنے گوشہ میں بیٹھ کے' اپنے مصلے پر' اپنے کمرے میں ساری دنیا سے کٹ آف۔ اور پھر عبادت کی کیفیت تو یہ ہے کہ جتنا وہ لوگوں سے کٹتا چلا جاتا ہے اتنا ہی بڑا زاہد ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جب وہ جنگلوں میں چلا جائے تو صاحب سبحان اللہ پھر تو پوچھو نہیں وہ کتنا بڑا مقرب ہو جاتا ہے۔ چالیس چالیس دن کسی انسان کی شکل نہ دیکھے۔ بڑے فخر سے لکھا ہوتا ہے حضرت اولیائے کرام کے تذکارِ جلیلہ میں۔ حضرت صاحب ایک غار میں بیس سال تک کھڑے رہے۔ آپ جماعت کے ساتھ کہہ رہے ہیں وہ انسانوں کی دنیا کے اندر ہی نہیں رہتے۔ یہ ہے دین میں اور مذہب میں فرق۔ مذہب میں جتنا انسان انفرادیت میں آتا چلا جاتا ہے اتنا ہی وہ خدا کا مقرب بنتا چلا جاتا ہے۔

جماعت سے الگ ہونے والوں کے لیے تو زمین تنگ ہو جاتی ہے جب کہ ہمارے ہاں تو ایک مسجد دوسرے سے الگ ہے

یہاں کیفیت یہ ہے کہ تین الگ رہ گئے ہیں تو ان کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد تاکید کی جا رہی ہے وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (9:119)۔ وہ جو سورۃ بقرہ میں ہے وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (2:43) یہاں یہ الگ نفل پڑھنے والی بات نہیں ہے الگ تسبیح پھیرنے والی بات نہیں ہے۔ مع الراکعین جھکو جھکنے والوں کے ساتھ مل کر۔ اور اسی لیے عزیزانِ من! قرآن نے بات واضح کر دی کہ یہاں تو جنت میں بھی اس طرح سے انفرادی طور پہ جانے کی بات نہیں ہے۔ کہا گیا ہے جنت میں جانے والے نفسِ مطمئنہ سے کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ (89:29) میرے بندوں کے ساتھ مل اور وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (89:30) اس طرح جنت کے اندر آ۔ یہ ہے قرآن کی جنت۔ یہ تو بندوں کے ساتھ مل کے جنت میں جایا جاتا ہے۔ راہبانیت کی جنت نہیں۔ یہاں یہ سوال نہیں کہ طوفان میں آپ تیر کے کس طرح آگے چلے جائیں۔ سوال یہ ہے کہ اس طوفان میں آپ نے کتنے ڈوبنے والوں کو بچایا ہے اپنے ساتھ۔ یہ ہے جو کہا گیا ہے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ فِیْ جَنَّتِیْ (89:29-30)۔ اور یہ آیت اس لیے لایا ہے قرآن کہ پہلے ذکر ہے کہ وہ تین جو کہیں الگ رہ گئے تھے۔ حالانکہ وہ بیچارے جماعت سے الگ خود رہ نہیں گئے تھے' یہ حالات تھے۔ لیکن کچھ بھی ہوا الگ تو رہ گئے تھے۔ تو

جماعت سے الگ ہونا اتنا بڑا جرم ہے دین میں اسلام میں۔ وہ اس لیے کہ

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

نبی اکرم ﷺ کے نزدیک مومنین کی جان کی قیمت

کہا اب آیئے ان کی طرف۔ پھر آ گیا انہی کی طرف جو پیچھے رہ جانے والے تھے۔ آپ دیکھتے ہیں کتنا سنگین معاملہ ہے قرآن کے نزدیک یہ پیچھے رہ جانے والا۔ یہ اتنی بڑی سورتیں جو ہیں' یہ وقف کی گئی ہیں انہی مسائل انہی معاملات کے متعلق۔ پھر آیا ہے قرآن اس طرف۔ مَا كَانَ لِاَهۡلِ الۡمَدِيۡنَةِ وَ مَنۡ حَوۡلَهُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ اَنۡ يَّتَخَلَّفُوۡا عَنۡ رَّسُوۡلِ اللّٰهِ (9:120) کہا کیا بات تھی ان کے لیے کہ یہ لوگ اس طرح سے یوں پیچھے رہ جاتے تھے۔ پہلی چیز تو یہ مقام بتایا ہے یہاں اس امت میں امام کا سربراہ کا۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تو حضور ﷺ خود یہ تھے۔ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ کیا تعلق ہونا چاہیے' کیا مقام یا پوزیشن ہوتی ہے اس کی جو بڑا ہوتا ہے اس میں۔ اَلنَّبِىُّ اَوۡلٰى بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ (33:6) بات ختم کردی اس سے آگے تو جا ہی کوئی نہیں سکتا۔ اَلنَّبِىُّ اَوۡلٰى بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ (33:6) نبی مومنین کے نزدیک ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ قریب تر ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ بات کہی بھی نہیں جاسکتی۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز۔ ہمارے ہاں تو یہ الفاظ ہی رہ گئے ہیں نا' جان سے زیادہ عزیز'۔ یہ ہے نبی کے متعلق۔ کہا پہلی چیز جہاں ان لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے وہ یہ کہ راستہ دشوار گذار تھا' موسم بڑا سخت' تکالیف راستے میں بڑی آتی تھیں۔ کہا کہ ان تمام سختیوں اور تکلیفوں کے لیے انہوں نے رسول کو تو جانے دیا' آپ بیٹھے رہے۔ واہ واہ واہ!! کیا انداز ہے کہنے کا!!!۔ حالانکہ ایمان یہ تھا ان کا کہ یہ نبی ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ ان کے لیے عزیز ہوگا۔ اور یہی چیز تھی۔

جنگ اُحد میں نبی اکرم ﷺ کی جان کی حفاظت کے سلسلہ میں صحابہ کرام کا کردار

جنگِ احد میں جب وہ وقت آیا ہے کہ نظر آتا تھا کہ دشمن کے تیر کہیں حضور ﷺ کو نہ جالگیں۔ حالانکہ جنگ کے زمانے میں افراتفری کے عالم آپ سمجھ سکتے ہیں کیا ہوتا ہے' بالکل بھگدڑ مچ گئی ہوئی ہے۔ قرآن نے وہاں بھی بڑا عجیب نقطہ بیان کیا ہے کہ اپنی اپنی جانیں بچا کے بھاگ رہے تھے یہ سارے' دشمن کے تیر اس تیزی سے آرہے تھے کہ اس بھاگنے میں اس افراتفری میں' اس جان کے بچانے کی کوشش میں یہ دیکھا کہ تیر رسول اللہ ﷺ کی طرف آرہا ہے جہاں حضور ﷺ کھڑے ہیں یہ جان بچا کے بھاگنے والے فوراً کھڑے ہو گئے اور حضور ﷺ کے گرد ایک حصار بنالیا انہوں نے۔ لکھتے یہ ہیں لکھنے والے کہ اس حصار میں جو حضور ﷺ کی طرف رخ کیے ہوئے دشمن کی

طرف پشت تو پیچھے سے بوچھاڑ اتنی ہو رہی تھی کہ تیران کی پشتوں پہ یوں اکٹھے ہوئے جیسے شہد کے چھتے کی مکھیاں ہوتی ہیں۔ اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ (33:6) یہ تھا جاں نثاری کا عالم۔

جہاد کے لیے جذبہ صادق ہو تو راستے کے کانٹے بھی پھول نظر آتے ہیں

کہا پہلی چیز کہ دعویٰ ان کا یہ تھا کہ یہ جان سے عزیز ہے اور عمل یہ ہوا کہ کہہ رہے ہیں کہ مسافت بڑی سخت تھی' موسم بڑا گرم تھا' تکلیفیں بڑی آنی تھیں۔ تو رسول ﷺ سے کہا کہ ٹھیک ہے جی آپ جایئے بھگتئے' ہم پیچھے رہیں گے۔ کہتا ہے پہلی چیز تو یہ ہوئی۔ اور اگلی چیز یہ ہوئی جو بڑی عجیب چیز ہے کہ انہیں یہ پتہ نہیں کہ جہاد کا راستہ اور اس راستے کی تکالیف ہوتی کیا ہیں۔ ایک نگاہ سے دیکھئے تو پورا راستہ کانٹوں سے اٹا پڑا ہوتا ہے اور ذرا نگاہ کا زاویہ بدلیے تو ہر کانٹا پھول نظر آتا ہے اس کے اندر۔ بات تو یہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دشوار گذار راستہ صعوبات بھی بہت سی' تکالیف بھی بڑی' انہیں اس کا پتہ نہیں ہے۔ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ لَا یُصِیۡبُهُمۡ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ (9:120) آخر میں جا کے کہتا ہے کہ یہ چیزیں کیا بن جاتی ہیں جہاد کے لیے جو نکلتا ہے اس کے لیے۔ راستے میں پیاس اور بھوک ہو' صعوبات مشکلات۔ وَّلَا مَخۡمَصَةٌ (9:120) تکالیف فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (9:120) آرہی ہیں۔ راستہ بھی یہ عام راستہ نہیں ہے یہ تو اللہ کی راہ ہے جس میں یہ چلے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس میں آ رہا ہے۔ وَ لَا یَطَـُٔوۡنَ مَوۡطِئًا یَّغِیۡظُ الۡکُفَّارَ (9:120) جس راستے پہ بھی ان کے پاؤں پڑ رہے ہیں ہر قدم جو ان کا آگے بڑھ رہا ہے' دشمن کے سینے پہ مونگ دل رہا ہے' منزل کے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے سینے میں اور زیادہ جوش کو وہ ابھار رہا ہے' غیظ و غضب کو ابھار رہا ہے' جتنا ایک ایک قدم آگے یہ بڑھ رہے ہیں۔ وَ لَا یَنَالُوۡنَ مِنۡ عَدُوٍّ نَّیۡلًا (9:120) اور دشمن کی طرف سے جو بھی ان کو تکلیف پہنچے' جو بھی مصیبت پہنچے۔ نقشہ دیکھا ہے کیسا کھینچا ہے کہ ٹھیک ہے یہ سب چیزیں جو انہوں نے کہا ہے درست ہے۔

جہاد کے راستے کی ایک ایک تکلیف ان کے نامہ اعمال کا ذرہ ذرہ موتیوں کی طرح محفوظ کیا جاتا ہے

لیکن یہ تو وہ راستہ ہے کہ جس راستے کے اندر بھوک اور پیاس مشکلات اور صعوبات راہ کے کانٹے' دشمن کی طرف سے جو تکلیف بھی پہنچے' وہ تکلیف۔ اِلَّا کُتِبَ لَهُمۡ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ (9:120) ان میں سے تو ایک ایک چیز ان کے نامۂ اعمال میں عملِ صالح بن کے لکھی چلی جا رہی ہے۔ کہا دیکھا نہیں کہ صعوبتوں پہ تو نگاہ رہی' ان صعوبتوں سے جو ملتا ہے اس پہ نظر نہ ان کی گئی۔ ہر چیز عملِ صالح بن کے ان کے اعمال نامہ میں لکھی گئی' ایک ایک قدم جو اٹھاتے چلے گئے' وہ ان کے اعمالنامے میں عملِ صالح بنتا چلا گیا۔ اور پھر یہ کس کا راستہ تھا؟ اس خدا کا راستہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (9:120) وہ خدا جو حسن کارانہ انداز سے قدم اٹھانے والوں کے

کسی قدم کو ضائع نہیں کیا کرتا' کسی عمل کو ضائع نہیں کیا جاتا۔ کہتا ہے پھر یہ ایمان کی بات ان کے دل میں ہوتی ایک تو یہ کہ یہ نبی جو جانوں سے عزیز ہو' تو ہو سکتا ہے کہ وہ نبی تو ان راستوں میں جائے اور یہ گھر میں بیٹھے رہیں؟ اور پھر اس راستے میں نکلنے سے جو کچھ ملے گا خدا کے ہاں سے اگر اس پہ ایمان ہوتا تو کیا آج یہ کہتے کہ نہیں راستہ بڑا تکلیف دہ تھا' اس لیے ہم وہاں نہیں گئے۔ یہاں تو راستے کی ہر تکلیف راحت بن کر آتی ہے' موت کو یہ عروس کی طرح گلے سے لگاتے ہیں۔ مجاہدین کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ کہا یہ ہے زاویہ نگاہ کا فرق' وہ حقیقت جو ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی' اس لیے پیچھے رہ گئے۔ وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَ نَفَقَۃً صَغِیۡرَۃً وَّ لَا کَبِیۡرَۃً وَّ لَا یَقۡطَعُوۡنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمۡ لِیَجۡزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحۡسَنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (9:121) اسی کے تسلسل میں یہ آیت ہے۔ اور پھر جو کچھ بھی اس راستے کے اندر میں خرچ کیا جائے' تھوڑا ہو یا بہت ہو' جو وادی بھی قطع کی جائے' وہ تو وادیوں کی لمبائیوں کی نسبت سے اعمالنامے کے اندر ان کے ہاں اجر لکھا جاتا ہے تاکہ خدا ان کو اجر دے۔ اَحۡسَنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (9:121) اعمال میں سے سب سے زیادہ بڑا احسنِ عمل تو یہی ہوتا ہے۔ عین شدتِ جنگ کے درمیان میں جب یہ کہا گیا جانے والوں کے متعلق' دین کی ایک بہت بڑی غایت اُسی وقت قرآن سامنے لے آیا۔ کہنے لگا اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ معاشرے کے اندر جو تقسیمِ عمل ہوتا ہے' یہ تقسیمِ عمل اس دوران میں سب ختم ہو جائے گا' پھر تو معاشرہ ہی باقی نہیں رہے گا۔ ٹھیک ہے جنگ کے لیے نکلنا جو ہے' جانا جو ہے اس کا سارا اجر موجود ہے۔

جہاد سے قبل جہاد کی تیاری کے لیے کن پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے

لیکن اس اجر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پوری کی پوری جماعت اٹھ کے جنگ کے لیے نکل جائے اور باقی سارے کام معطل ہو جائیں۔ کہا باقی کاروبار بھی چلنا چاہیے۔ حتیٰ کہ یہ جو چیز ہے دین میں تفقہ حاصل کرنا' سمجھ بوجھ غور و فکر سمجھنا سوچنا' یہ چیز بھی اس دوران میں رہے گی۔ اسی لیے کہا کہ

وَ مَا کَانَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لِیَنۡفِرُوۡا کَآفَّۃً (9:122) یہ معنی نہیں ہیں جو ہم نے پہلے کہے ہیں کہ وہ تمام کے تمام جتنی آبادیاں ہیں ساری اٹھ کے جنگ کی طرف نکل کے کھڑی ہو جائیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہیے فَلَوۡ لَا نَفَرَ مِنۡ کُلِّ فِرۡقَۃٍ مِّنۡھُمۡ طَآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّھُوۡا فِی الدِّیۡنِ وَ لِیُنۡذِرُوۡا قَوۡمَھُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَیۡھِمۡ لَعَلَّھُمۡ یَحۡذَرُوۡنَ (9:122) یہ بات کہ اس نظام کی طرف سے کیا ہدایات مل رہی ہیں' کیا قوانین جاری ہو رہے ہیں' کیا پروگرام دیے جا رہے ہیں' ان کا تو لمحہ بہ لمحہ ساتھ بہ ساتھ علم ہونا چاہیے باقی قوم کو۔ اب اس دور میں ذرائع نشر و اشاعت اسبابِ مواصلت یہ تو اتنے عام نہیں تھے جیسے آج ہیں کہ ایک مرکز میں بیٹھے ہوئے وہیں سے ساری اطلاعات ایک سانس میں پوری قوم تک پہنچا دی جائیں۔

عہد اوّل میں آبادکاری کے حالاتِ زندگی

وہ ذرائع ایسے نہیں تھے۔اس کا تو طریقہ ہی یہ تھا کہ لوگ مرکز میں آئیں۔ یہاں آ کے ان چیزوں کو خود پہلے سمجھیں پھر جا کر اپنی قوم کو بتائیں۔یہی طریقہ تھا۔کچھ یہ تھا کہ یہاں سے کچھ مبلغ بھیجے جائیں اور وہ کتنی تعداد میں بھیجے جائیں۔ یہاں مبلغین کا سلسلہ محدود ہوگا تو اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ مختلف قبائل میں بسنے والے لوگ بھی اس زمانے کے عرب کی کونسے ایک دوسرے سے متصل شہروں کی آبادیاں چلی جاتی تھیں کہ یہاں سے پشاور تک چلے جاؤ تو متصل بستیاں ہی بستیاں چلی جاتی ہیں۔وہاں تو کیفیت یہ ہے کہ تین چار شہر تھے اور شہر بھی ہمارے قصبوں جتنے شہر تھے اس کے بعد باقی جتنے بھی علاقے تھے ان میں صحرائی آبادی تھی۔ایک یہاں قبیلہ اور پتہ نہیں کس مقام پہ نخلستان مل جائے گھاس اور پانی ہو وہاں دوسرا قبیلہ بس رہا ہے۔یوں اس قسم کی آبادیاں تھیں۔اب بھی ہمارے ہاں کے جو علاقے ہیں عرب کی یہ ریاستیں جن کو آپ یہ کہتے ہیں بڑی بڑی ان کے ہاں دیکھئے آبادیاں کتنی ہیں۔پوری کی پوری ریاست مثلاً کویت وغیرہ ہمارے ایک شہر سے بھی کم آبادی ہوتی ہے ان کی۔شہر کی آبادی کے باہر تو آبادی کوئی نہیں ہوتی تھی۔ چلے جا رہے ہیں میلوں میل تک نکلے چلے جا رہے ہیں آدمی کوئی نظر نہیں آتا۔ان حالات میں ذریعہ یہ تھا کہ خود ان آبادیوں میں سے کچھ آدمی یہاں مرکز میں آئیں۔یہ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ (9:122) یہ جو نظام ہے اسلامی اس کے متعلق سمجھ بوجھ حاصل کریں۔اس کی ہدایات اس کے ضوابط قوانین فیصلے یہاں آ کے حاصل کریں۔اور پھر یہ واپس جائیں اور اپنی قوم کو اس سے آگاہ کریں اپنی جماعت کو اپنے گروہ کو اس سے آگاہ کریں۔لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (9:122) تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ہمیں کن کن باتوں سے بچنا ہے۔وہی بات جو میں نے کہا تھا کہ قانون کو اس طرح سے عام کیا جائے کہ ہر ایک کو علم ہو جائے۔اس زمانے کے حالات کے تابع یہ طریق کار اختیار کیا گیا تھا مرکز سے شائع ہونے والی ہدایات کے امت تک پہنچانے کے لیے کہ جہاں ہو سکے اپنے ہاں کے قاصد اور مبلغ بھیجے جائیں اور باقی مقامات سے خود ان مقامات کے لوگ یہاں مرکز کے اندر آئیں تفقہ فی الدین حاصل کریں اور پھر ان کو جا کے سمجھائیں۔

اسلام میں تو مذہبی پیشوائیت ہے نہیں سوال ہی نہیں ہے۔یہ سارا کچھ تو نظامِ مملکت کی طرف سے ہوتا ہے۔باقاعدہ ان کے ہاں مبلغ ہوتے ہیں ان کے ہی قاصد ہوتے ہیں ان ہی کی طرف سے جانے والے ہیں۔آنے والے بھی یہاں آتے ہیں یہاں آ کے سیکھ کے پھر چلے جاتے ہیں۔یہ کوئی الگ پیشہ وروں کی جماعت نہیں ہے کہ ان کا کام یہی ہے۔

خدا کے دین میں مذہبی پیشوائیت کی کوئی الگ جماعت نہیں ہوتی

اس کے بعد آپ کو معلوم ہے کہ جو الگ آپ کے ہاں جماعتیں بن گئی ہیں یہ مذہبی پیشواؤں کی وہ کیا سند لاتے ہیں؟ وہ اس

آیت سے سند لاتے ہیں کہ جی قرآن شریف نے یہ کہا ہوا ہے کہ ساری کی ساری جماعت نہ نکل کھڑی ہو۔ تو پہلی چیز وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ پوری امت کے لیے ضروری نہیں ہے تفقہ فی الدین حاصل کرنا۔ چل بھئی' بنی پنڈتوں کی ایک جماعت۔ قرآنِ کریم پوری امت کے متعلق یہ کہتا ہے کہ پوری امت **كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ** (3:110) یعنی امر بالمعروف نہی عن المنکر پوری امت کا فریضہ قرآن قرار دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب یہ غلط ہے' یہ دیکھئے قرآن نے کہا ہے کہ سارے کے سارے نہ نکل کھڑے ہوں ''چند آدمی وچوں چلے جایا کرو''۔ پھر وہ آ کے قوم کو بتائیں قوم والے سارے نہ علم حاصل کریں۔ یہ فریضہ ان کے ہاں رہے گا۔ اس آیت سے استدلال لیا جاتا ہے اس مذہبی پیشوائیت کا اور یہ کہنے کا کہ یہ ساری امت کے لیے نہیں ہے' یہ ایک گروہ کے لیے ہے۔ اور اگلے دنوں تو ایک نے اور کمال کیا اس نے کہا کہ تم اٹھتے بیٹھتے فرقہ بندی کے خلاف یہ کہتے ہو' قرآن نے کہا ہے **فَلَوۡ لَا نَفَرَ مِنۡ كُلِّ فِرۡقَةٍ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٌ**[9:122] دیکھو فرقے کا لفظ آ گیا۔ چل بھئی' فرقہ بندی بھی جائز ہوگئی قرآن کی رو سے' دیکھو تو فرقہ لکھا ہوا ہے۔ کیا بتایا جائے عزیزانِ من! ان لوگوں کو۔

مذکورہ آیت کا حقیقی مفہوم

پہلی آیت میں کہا کہ جہاد کے لیے جو نکلنا ہے وہ اتنا اہم ہے اور اس کا اتنا اجر ہے۔ فوراً ہی یہ بات کہی کہ اس کے یہ معنی نہ لے لیجیے کہ ساری کی ساری قوم اٹھ کے ایک کام کے اندر لگ جائے۔ سارے کام باقی جو ہیں وہ کام بھی معاشرے کے ہوتے رہیں گے۔ اب مثلاً کام دس کرتے ہیں اس میں سے' دو پیچھے رہ جائیں آٹھ چلے جائیں' کاروبار جاری رہے گا۔ حتیٰ کہ مرکز سے ہدایات حاصل کرنے کا کام یہ بھی کہیں نہ رک جائے' مملکت تو چل رہی ہے اس نظام کے تابع۔ تو یہ جو نظام ہے کہ مختلف بستیوں سے لوگ مرکز میں آئیں اور یہاں آ کر علم حاصل کریں' تفقہ حاصل کریں اور پھر یہ واپس جا کے لوگوں کو بتائیں۔ اس زمانے کا جو نظام تھا مواصلات (Communication) کا یہ نشر و اشاعت کا اس کی رو سے یہی طریق کار تھا جو ممکن العمل تھا۔ اس کی طرف توجہ دلائی کہ یہ بھی اسی طرح سے جاری رہے گا۔ یہ سارا کچھ اس طریق سے ہوگا۔ اور اس کے بعد کہا کہ

قرب و جوار کے دشمنوں پر قابو پانے کا طریق

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ يَلُوۡنَكُمۡ مِّنَ الۡكُفَّارِ وَ لۡيَجِدُوۡا فِيۡكُمۡ غِلۡظَةً ؕ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ (9:123) دیکھتے ہیں متقین کون ہوتے ہیں' کہاں آئی ہے یہ بات۔ کہا یہ ایسے انتظامات کرنے کے بعد پھر تم جنگ کے لیے اٹھو۔ اور سب سے پہلے جو تمہارے قریب تر دشمن ہے اس کے متعلق یاد رکھو۔ یہ ٹھیک ہے جو قریب تر دشمن ہے' وہی دشمن تر ہو سکتا ہے' وہ تو آستین کا

خنجر ہوتا ہے۔اس کے متعلق کہا کہ اپنے ہاں کیفیت یہ پیدا کرو۔دیکھئے یہ ایک ایسا اجتماعی نقطہ قرآن نے بتایا ہے کہ اس کے بعد جنگ کی اول تو ضرورت ہی نہیں پڑتی' پڑے بھی تو بہت پڑتی ہے۔کہا یہ اپنے ہاں کا نظام رکھو یہ اپنے ہاں اس قسم کی کیفیت پیدا کرو کہ وَ لْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً (9:123) وہ تمہارے اندر محسوس کریں کہ نہیں صاحب بڑی قوت کے لوگ ہیں یہ' تمہارے سختی کو وہاں بیٹھے ہوئے محسوس کریں کہ نہ بابا ان کی طرف انگلی نہیں اٹھانی' انگلی اٹھائی آنکھ نکال دیں گے۔اوراسی کے لیے قرآن نے کہا تھا کہ اپنی سرحدوں کو اتنا مضبوط رکھو کہ یہ ان کے پار جو تمہارے دشمن ہیں ان کے دل تمہارے تصور سے کانپتے رہیں۔

حکم خداوندی ہے کہ تم اپنی قوت مستحکم کیئے رکھو تا کہ دشمن اسے دیکھ کر ڈھل جائیں

یہ مملکت کی مصلحتیں نہیں ہیں' جنہیں آپ فرائضِ خداوندی کہتے ہیں یہ وہ ہیں۔فرض اسی کو کہتے ہیں نا جو خدا نے حکم دیا ہو کرنے کا۔لیکن آپ کے ہاں جو فرض اور واجب اور سنت اور نفل گنائے جاتے ہیں وہ سارے عبادات کے اندر ہیں' ان چیزوں کے اندر تو نہیں۔یہ فریضۂ خداوندی ہے کہ تمہاری قوم تمہاری امت یہ جماعت اتنی زیادہ طاقتور ہونی چاہیے کہ قریب تر دشمن جو تمہارے ہاں ہے وہ تمہاری سختی کو محسوس کرے۔عزیزانِ من! فریضۂ خداوندی ہے یہ' حکم دیا ہے قرآن نے۔

ہمارے ہاں متقی کے خود ساختہ مفہوم نے عقل وفکر کو ہی ماؤف کر دیا ہے متقین کا لفظ تو جنگ میں جانے والوں کے لیے استعمال ہوا ہے

یہ قَاتِلُوا کیا چیز ہے؟ یہ حکم نہیں ہے تو اور کیا ہے۔وَ لْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً (9:123) اس مقصد کے لیے یہ کچھ کہا۔وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ (9:123) یاد رکھو! یہ ہیں متقین۔امن کی حالت میں اس قدر طاقتور جماعت اور مملکت' دشمن محسوس کرے کہ ہاں صاحب ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنا۔کہا یہ ہیں متقین۔اور مذہب کا متقی "تہانوں پتہ اے نا کیہڑا اے' بڑا متقی پرہیزگار ہے جی اے' ؟؟ پھڑی ہوئی' ؟؟ قدم لڑکھڑان ڈے ہوئے ہیگے' نالا تھلے ڈگیا ہویا ہیگا تر یا جان ڈیا ہیگا میت نوں"۔جتنا زیادہ دور ہٹتا جائے دنیاوی معاملات سے' اتنا ہی متقی پرہیزگار ہوتا ہے۔یعنی متقی کو میدانِ جنگ کے ساتھ؟ متقی تو اگلا درجہ ہے آپ کے علمائے کرام میں سے بھی گذشتہ جنگوں میں کوئی شخص نہیں تھا جو رائفل لے کے واہگہ کے بارڈر پہ بھی گیا ہو۔او بابا! تم کیا کرتے ہو؟ کہنے لگے ہم تمہاری فتح اور نصرت کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ (9:123) یہ ہے متقی جس کو فریضۂ خداوندی کی ادائیگی کے لیے سب کچھ چھوڑنا پڑے۔پرہیزگار ہی اگر کہنا ہے تو اس سے پرہیز کرنا' ہر وہ چیز جو اس راستے میں حائل ہوتی

ہے اس سے پرہیز کرنے والا' اگر یہی معنی کرنے ہیں تو۔ زہد ہی ہے تو زہد ترک کردینا ہے' ہر اس کشش کو ترک کرو کہ جو اس راستے میں آپ کے دامن کو کانٹوں کی طرح الجھاتی ہے۔ یہ کرونا زہد کے معنی۔ وہ رہبانیت کا زہد تو نہ لو' وہ بن باسیوں کا اتقاء اور تقویٰ تو نہ لو۔ یہاں تو میدانِ جنگ میں جانے والوں کو متقین کہا گیا ہے۔

وَ اِذَا مَآ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ اَيُّكُمۡ زَادَتۡهُ هٰذِهٖۤ اِيۡمَانًا (9:124) کہنے لگا ان کی کیفیت یہ ہے یہ منافقین ہیں۔ قرآن میں جب اس قسم کے حکم نازل ہوتے ہیں تو ازراہِ تمسخر ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ کیوں بھئی کچھ ایمان بڑھا اس آیت سے آپ کا۔ ٹھیک ہے جی۔

جہاد کے احکامات نازل ہونے پر متقیوں کے جذبہ ایمانی کی کیفیت

فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فَزَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا (9:124) ایمان کا یہ ہے تقاضا' ایمان والوں کی یہ کیفیت ہے کہ جب اس قسم کے احکام جہاد کے حاصل ہوتے ہیں تو اس سے ان کا ایمان اور بڑھتا ہے۔ بلکہ قرآن میں دوسری جگہ ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (جمع لهم الناس) ان مخالفین نے بڑا لشکرِ جرار تمہارے خلاف تیار کرلیا ہے۔ قرآن کہتا ہے اس خبر سے ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔ اور مومن کا ایمان اور منافق کا ایمان آپ نے دیکھ لیا۔ ان کا ایمان بڑھتا ہے۔ صرف ایمان ہی نہیں بڑھتا' ایمان بڑھنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سنیے عزیزانِ من! احکام نازل ہو رہے ہیں کہ سب کچھ چھوڑ کے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے سربکف کفن بدوش آ ؤ میدانِ جنگ میں جان دینے کے لیے' یہ حکم نازل ہو رہا ہے۔ کہا ہے وَّ هُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ (9:124) خوشیاں مناتے ہیں' ایک موقعہ ہاتھ میں آ گیا جنت کے خریدنے کا۔ بک رہی ہو جنت اور یوں خریدی جا سکتی ہو' یہ خوشیاں نہ ہونگی تو اور کیا ہوگا۔ بے ساختہ آ جاتا ہے مولوی غلام رسول کا وہ مصرعہ' جب یہ چیز آئے گی کہ وہ خوشیاں منا رہے ہیں۔ تو وہ مقام ہی ایسا ہے کہ جہاں وہی زلیخا کا یوسفؑ کو خریدنا۔ اس قصہ کی رو سے کتنے سالوں تک زلیخا یہ خواب دیکھتی رہی آنے والے کا' آرزوئیں مچلتی رہیں۔ عجیب اتفاق حسنہ آ گیا کہ وہ جس کے لیے اکثر انتظار کی راتیں شمار کیں' وہ بازار میں کھڑا بک رہا ہے۔ اور یہ وہاں کے امیر کی بیوی ہے' بہت مالدار روپے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ بک رہا ہے یہ خریداروں کی صف میں کھڑی ہو رہی ہے۔ سوال ہی نہیں تھا کہ کتنی بولی لگ جائے۔

یہ مال و دولت کیا کسی عظیم مقصد کے حصول کے لیے تو جان کی بھی کوئی قیمت نہیں ہوتی

عجیب چیز ہے جو غلام رسول کہہ گیا ہے' اصل میں مقام یہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں وَّ هُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ (9:124) کہ یوں جنت بک رہی ہو' وہاں مولوی غلام رسول نے کہا ہے اور پڑھنے والو تصور سے اس نقشہ کو دیکھنے والو سوچو کہ

جس نوں یار وکیندا لبھے تے قیمت ہووے پلّے

اس دے جیڈ نہ طالع کوئی اس دے بھاگ سوتّے

اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہوسکتا ہے اس سے زیادہ سستا سودا کیا ہوسکتا ہے ''یار وکدا ہووے تے قیمت پلے ہووے''۔ جنت یوں مل رہی ہو اور اس کے خریدنے کے لیے قیمت اپنے پاس ہو۔ جان دینے کے لیے اٹھ کے ہی چلے جانا ہے۔ وَّ هُـمۡ يَسۡتَبۡشِـرُوۡنَ (9:124) ''ایہہ ایہہ لوکی سن عزیزانِ من!'' جن کے ان ایمانوں کے دھکے لگائی ہوئی گاڑی اس وقت تک چلی آ رہی ہے کہ کچھ بھی نہ ہو' بہرحال نام لینے کے تو ہم مسلمان ان کے ایمان کے صدقہ میں آ رہے ہیں۔ وہ اس طرح سے ان شہادتوں پہ خوش ہو کے میدانِ جنگ میں نہ جاتے تو جیسا حضورﷺ نے پہلے ہی جنگ بدر میں کہہ دیا تھا کہ مولا کریم یہ ایک مٹھی بھر جماعت تیرے نام لینے والوں کی' سارا سرمایہ جو ہے تیرا کائنات کا وہ لے کے آ گیا ہوں اس میدان کے اندر۔ اگر آج ان کو شکست ہو جاتی ہے اور یہ باقی نہیں رہتے تو چونکہ میں خاتم الانبیاءﷺ ہوں' نبی بھی بعد میں نہیں آنے والا' میرا کیا بگڑنا ہے' اے اللہ تیرا نام لینے والا قیامت تک دنیا میں باقی نہیں رہے گا۔ اپنے نام کے صدقے میں ان کو بچانا ہوگا تمہیں۔ کیا بات تھی!!! انداز کیا تھا دعا کرنے کا' دعا مانگنے والا بھی کون تھا' کتنا حسین انداز ہے دعا مانگنے کا۔ اس کے اوپر کچھ احسان رکھ رہے ہیں کہ آج اگر یہ جماعت یہاں ختم ہوگئی تو قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اپنے نام کو باقی رکھنے کے لیے ہی ان کو باقی رکھ۔ یہ جو انداز ہوتا ہے بات کہنے کا سب کچھ اپنے لیے مانگ رہے ہیں انداز یوں کہا جا رہا ہے جیسے اس کے لیے کچھ کہہ رہے ہیں۔

ہے دلِ پُر اثر سے غالب طلسمِ پیچ و تاب

رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

کہاں سے سیکھا تھا اس نے؟ سی دعا سے سیکھا تھا کہ آج اگر یہ جماعت نہ رہی' نہ اس جماعت کا کچھ بگڑے گا وہ چلی جائے گی جنت کے اندر' میں بھی ان کے ساتھ ہی جاؤں گا' یہاں شہید ہو جاؤں گا' کچھ نہیں ہمارا بگڑے گا۔ سوچ لے ذرا کہ اگر یہ جماعت نہ رہی تو نہ اس کے بعد نبی آنا ہے نہ اس کے بعد کوئی امت بننی ہے پھر تیرا نام لینے والا قیامت تک کوئی باقی نہیں رہے گا۔ رحم کر اپنی تمنا پر۔ وَّ هُـمۡ يَسۡتَبۡشِـرُوۡنَ (9:124)۔ وَ اَمَّا الَّـذِيۡـنَ فِـىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ فَـزَادَتۡهُـمۡ رِجۡسًا اِلٰى رِجۡسِهِمۡ وَ مَاتُوۡا وَ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ (9:125)

اور جو دل کے روگ والے لوگ ہیں' وہی احکام' وہی آیات' وہی مقامات جو ہیں ان کی یہ کیفیت ہے کہ شکوک وشبہات واضطرابات

اور بڑھ جاتے ہیں، بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ رِجۡسًا اِلٰی رِجۡسِهِمۡ (9:125) اور پانی گدلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا رجس کے معنیٰ اور پانی گدلا ہوتا چلا جاتا ہے ان کا اور شکوک بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی حالت کے اندر موت آ جاتی ہے ان کو۔ اور مسلمان نام رکھانے کے باوجود هُمۡ كٰفِرُوۡنَ (9:125) کفر کی موت مرتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی اسلام کو تو نہیں چھوڑا تھا مسلمان تھے۔ کفر کی موت مرتے ہیں۔ وقت ہو گیا عزیزانِ من! یہی سلسلہ آگے بھی چل رہا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت 125 تک ہم آ گئے 126 آیت سے آگے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

اکیسواں باب: **سورۂ توبة** (آیات 126 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1973ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التوبہ کی آیت 126 سے ہو رہا ہے (9:126)

جہاد کے سلسلہ میں منافقین اور مومنین کا اپنا اپنا کردار اور اس کا نتیجہ

اس سورۃ کی اب ہم آخری آیات تک پہنچ گئے ہیں۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ان دونوں سورتوں میں قتال کی اہمیت، جنگ کی اہمیت اور اس کے ساتھ ہی جہاد سے جی چرانے والے منافقین کی کیفیات کا مسلسل ذکر آتا رہا ہے۔ اسی سلسلے میں آخری آیات جو تھیں پچھلے درس میں جو ہمارے سامنے آئیں، ان میں یہ کہا گیا تھا کہ جب کبھی جنگ کے متعلق کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ آپس میں اس پر تمسخر کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے مقابلے میں صحیح مؤمنین کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اس پہ بہت خوش ہوتے ہیں کہ ایک موقعہ ہمارے سامنے آیا حیاتِ ابدی حاصل کر لینے کا۔ آخری آیت میں یہ کہا تھا کہ یہ کیفیت ان لوگوں کے سینے کے اندر کچھ یوں ہے کہ باہر کی زندگی اور قسم کی ہے جبکہ زبان پہ دعوے کچھ اور ہیں، اعمال زندگی کے کچھ اور ہیں۔ اور سارا وقت اس میں صرف ہو جاتا ہے کہ کسی طرح سے یہ راز افشا نہ ہو، یہ نقاب کہیں اٹھ نہ جائے۔ کہا اس سے تو زیادہ الجھاؤ پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں انسانوں کے اندر، جرأتیں مفقود ہو جاتی ہیں، بیباکیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

اپنی غلط روش کو محسوس کرنے یا تسلیم کرنے کے بجائے روش کہن پر چلے جانے کا نتیجہ

اَوَ لَا یَـرَوْنَ اَنَّهُـمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ (9:126) کیفیت ان کی یہ ہے کوئی سال نہیں گذرتا جس میں ایک دو بار یہ مصیبت میں گرفتار نہیں ہوتے۔ اور اس کے باوجود سمجھتے نہیں ہیں کہ یہ مصیبت کیوں آئی ان پر۔ اپنی روش کو ہم تبدیل کر لیں تاکہ ان مصائب سے' ان تکالیف سے جان چھوٹ جائے اور صحیح راستے کے اوپر آجائیں۔ یہ قطعاً سوچتے نہیں اس چیز کو۔ اپنی اسی روش میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اسی میں سوچتے یہ ہیں کہ یہاں کچھ کوتاہی ہوگئی' یہاں کچھ ہماری تدبیری احتیاط میں کمی رہ گئی' یوں ہم اپنی بات کے چھپانے میں کچھ ناکام رہ گئے۔ یعنی اسی سمت میں چلے جاتے ہیں' یہ نہیں ذہن میں آتا کہ یہ روش منافقت کی بجائے خویش بڑی غلط ہے۔ اور یہ سارے اسی کے نتائج ہیں جو ہمیں بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں آئے وَلَا هُـمْ یَـذَّكَّرُوْنَ (9:126) یہ اصلِ حقیقت کو اپنے سامنے نہیں لاتے اور اسی روش کے اوپر چلے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ چیزیں ہیں جو ان کے سامنے آتی ہیں۔ یہاں دو باتیں ہمارے سامنے آئیں کہ کیا یہ اس پہ غور نہیں کرتے کہ کوئی سال نہیں گذرتا کہ یہ ایک دو مرتبہ کسی مصیبت میں نہیں پھنستے' کسی تکلیف میں نہیں پھنستے۔ پھر یہ ہے ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ (9:126)

مذہبی سوچ میں قرآنِ حکیم کی طرف سے دیئے گئے حقیقی تصورات کو بالکل بدل دینے کی مثال

ہمارے ہاں تو جب دین مذہب میں تبدیل ہوا ہے' یہ سارے تصورات ہی قرآن کے بدل گئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں اگر کسی موسم میں بارش نہیں ہوتی کسی سال' گرمی بڑھتی ہے' کھیتیاں جھلستی ہیں یا کہیں بیماری پڑتی ہے' وبا آجاتی ہے' زلزلے آنے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں طبعی امور سے متعلق ہیں ان کا تعلق Physical Laws سے ہے' Nature کے' ان سے ان کا تعلق ہے۔ خشک سالی آتی ہے تو اس کے لیے یہ تدبیر کرنی چاہیے کہ پانی کہاں سے لائیں ہم' ایک لانگ ٹرم پلان ہونا چاہیے کہ اس کے لیے ڈیم بنانے چاہئیں' برسات میں جب پانی کی افراط ہوتی ہے' دریاؤں میں اسے ذخیرہ کرنا چاہیے' خشک سالی کے زمانے میں اس سے سیرابی کا کام لینا چاہیے' پھر ٹیوب ویلز لگانے چاہئیں۔ یعنی یہ تدبیری چیزیں ہیں جنہیں طبیعاتی قوانین کے مطابق حل کرنا چاہیے۔ بیماریاں آتی ہیں تو اس کے متعلق یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارے ہاں معاشرے میں کیا چیزیں پیدا ہوگئیں جس کی وجہ سے اتنی بیماریاں آتی ہیں۔ پے درپے وبائیں آتی ہیں' ان کا علاج کیا ہو' اس کے لیے حفظِ ماتقدم کیا جائے Precautionery Measures کیا لیے جائیں۔ زلزلے آتے ہیں تو اس کے لیے تحقیق ہونی چاہیے کہ زلزلہ کیوں آتا ہے۔ اور اس کی روک تھام کا انتظام کرنا چاہیے۔

ہمارے مقابلے میں ترقی یافتہ اقوام میں قدرتی طور پر ہونے والے نقصان سے بچنے کا طریقہ

جن ملکوں کے اندر متواتر زلزلے آتے ہیں انہوں نے مکان ایسے بنا لیے ہیں کہ زلزلہ آئے لیکن کوئی مکان گرے نہیں کوئی تباہی نہ آئے انسانوں کے اوپر۔ ان چیزوں کا نقصان تو وہیں ہوتا ہے جہاں ان کی وجہ سے انسانوں پر کوئی تکلیف آتی ہے۔ وہ قومیں یہ تدبیریں کرتی ہیں۔ جو قوم یہ کچھ چھوڑ دیتی ہے' آپ کے ہاں جب یہی کچھ آتا ہے محراب و منبر سے آوازیں اٹھنی شروع ہو جاتی ہیں کہ دیکھئے ہمارے گناہوں کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ قوم ساری فسق و فجور میں مبتلا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ زلزلے آتے ہیں' بیماریاں آتی ہیں' خشک سالیاں ہوتی ہیں' قحط پڑ جاتے ہیں۔ اس کا علاج کیا بتایا جاتا ہے؟ توبہ کرو' استغفار کرو' گناہوں کی معافی مانگو۔ کوئی نہیں سوچتا کہ جن قوموں میں یہ چیزیں نہیں ہوتیں یا جنہوں نے ان چیزوں پہ قابو پا لیا ہے' جسے آپ گناہ یا فسق و فجور کہتے ہیں وہ تو ڈوبی ہوئی ہے فسق و فجور میں' تمہارے ان پیمانوں کے مطابق تمہارے تصورات کے مطابق۔ انہوں نے کیوں قابو پا لیا ان چیزوں پہ؟ وہاں کیوں اس قدر شدت سے وبائیں نہیں آتیں؟ آتی ہیں تو کیوں اس کثرت سے اموات نہیں ہوتی؟ زلزلوں کے نقصانات کے روک تھام انہوں نے کیا کیے ہیں؟ خشک سالیوں کا انتظام کیا کیا ہے انہوں نے؟ خدا کے قانون کے مطابق یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ تو عارضی طور پہ بارشیں برسانے لگ گئے ہیں۔ اور یہ چیز خدائی دعویٰ نہیں ہے' خدا کا عطا کردہ قوانینِ فطرت کا علم ہے جو قوم حاصل کر لے گی۔ اور اس میں تو مومن و کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں' آدم کو اشیائے کائنات کے علم کی صلاحیت دی گئی تھی' آدمی کو دی گئی ہے۔ تو جو قومیں ان قوانین کا علم حاصل نہیں کرتیں اور ان کی رو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتیں' وہ تو مقامِ آدمی کے اوپر بھی نہیں آئی ہوتیں۔ لیکن ہمارے ہاں جب بھی یہ کچھ ہو گا فوراً یہ کہہ دیا جائے گا کہ یہ خدا کی طرف سے سب کچھ ہوتا ہے اور تمہارے گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور گناہوں سے مراد ہوتی ہے یہی جو میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ یہ کوتاہیاں نہیں' یہ نہیں کہ ہم نے تدابیر اختیار نہیں کیں' ہم نے فطرت کے قوانین کا علم نہیں حاصل کیا' ہم نے طبعی حفاظتیں اپنی قوم کی نہیں کیں۔ اس کا نام تو گناہ ہے ہی نہیں ہمارے ہاں۔ گناہ کا تصور الگ دے دیا ان چیزوں کے متعلق کہہ دیا کہ یہ گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں' گناہوں سے توبہ کے معنی ہو گئے کچھ استغفار کرو' کچھ تسبیحاں پڑھو' کچھ نوافل ادا کرو۔ کسی اور ہی روش کے اوپر ڈال دیتا ہے مذہب انسان کو۔ دین کا رہنا تو ایک طرف وہ تو دنیا کا بھی نہیں رہتا وہ جو انسان ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہا گیا کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ سال میں ایک دو مرتبہ تم پر ضرور ایک مصیبت آتی ہے۔ یہ مصیبتیں کیسے آتی ہیں؟

خدائے رحیم کسی پر مصیبت نازل نہیں کرتا بلکہ یہ انسانوں کی اپنی بدعملی کا ہی نتیجہ ہوتی ہیں جسے خدا نے عذاب کہا ہے

سوال یہ تھا کہ عذاب جسے کہتے ہیں جو ہمارے ذہن میں ہے کہ یہ خدا کی طرف سے' آسمانی قوتوں کی رو سے آتا ہے اور اس طرح سے یہ دور ہوتا ہے کہ توبہ کیجیے' استغفار کیجیے۔ کیسے آتا ہے یہ عذاب؟ قَاتِلُوْهُمْ (9:14) جماعتِ مؤمنین سے کہا گیا ہے کہ یہ جو اس قدر سرکش ہونے والی قوتیں ہیں اٹھو اور ان کے خلاف جنگ کرو۔ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ (9:14) تا کہ خدا انہیں عذاب دے۔ میں لفظِ عذاب ہی رہنے دیتا ہوں کیونکہ ہمارے ہاں یہی لفظ مروج ہے۔ خدا کا عذاب۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ جب یہ کہا جائے گا تو ذہن کدھر جائے گا۔ تا کہ خدا انہیں عذاب دے۔ اور اگلا لفظ ہے بِاَيْدِيْكُمْ (9:14) تمہارے ہاتھوں سے یہ عذاب آئے گا۔ یہ چیزیں کہیں غائب سے نہیں آتی' انسانوں کے ہاتھوں سے چیزیں آتی ہیں۔ ان کی تدبیریں بھی اسی طرح سے کی جاتی ہیں۔ یہی ہے وہ عذاب جس کا ذکر وہاں کیا گیا ہے۔ یہ سرکشیاں کرتے تھے' ان کی سرکوبی ہوتی تھی' چھوٹی چھوٹی جھڑپوں میں کبھی بڑی جنگوں میں اور ہر بار شکست ہوتی تھی ان کو۔ ہر بار پھر اس کے بعد معافی مانگتے تھے' پھر وہی کچھ کرنا شروع کرتے تھے۔ تو یہ بِاَيْدِيْكُمْ (9:14) ہے اور کس طرح سے یہ ہے عذاب قَاتِلُوْهُمْ (9:14) یہ جو سرکش قوتیں اس طرح سے بڑھے چلی آ رہی ہیں' ان کے خلاف اٹھو' جنگ کرو۔ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ (9:14) تا کہ اللہ انہیں عذاب دے۔ دیکھیے خود اللہ کا یہاں کہا ہے کہ اللہ ان کو عذاب دے بِاَيْدِيْكُمْ ۔ وَ يُخْزِهِمْ (9:14) اب عذاب کی شکل بھی بتا دی تا کہ ان کو ذلیل اور رسوا کرے۔ ذلت اور رسوائی اس دنیا میں خدا کا بدترین عذاب ہے اور یہ انسانوں کے ہاتھوں سے آتا ہے۔ یہ ذلت اور رسوائی ان لوگوں کی کس طرح سے آئی قَاتِلُوْهُمْ (9:14) ۔ جماعتِ مؤمنین اٹھی ان کی سرکشی کا جواب دینے کے لیے' جب کسی طرح سے وہ باز نہیں آئے تو پھر میدانِ جنگ میں انہیں آنا پڑا۔ میدانِ جنگ میں جو ان کو شکستِ فاش دی ہے' اس کا نام خدا کا عذاب رکھا ہے یہ ان کے ہاتھوں سے آئی ہے۔ نتیجہ یہ تھا وَ يُخْزِهِمْ (9:14) ذلت اور رسوائی پسپائی۔ یہ ہے خدا کا عذاب جس طرح آتا ہے اور یہ ہے اس کے روکنے کی تدابیر۔

کائنات کے ذرّے ذرّے کو مسخر کرتے ہوئے اس کے ماحصل کو منفعت عامہ کے لیے صرف کرنا دینِ خداوندی کا بنیادی نکتہ ہے

یہاں تو دین و دنیا کو اس طرح الگ رکھا گیا کہ اس کے بعد نہ دین کے رہے ہم نہ دنیا کے رہے۔ دین کیا ہے عزیزانِ من! ایک فقرے میں میں جو کہا کرتا ہوں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں احکامِ خداوندی کے مطابق استعمال کرنا' یہ ہے دین۔ جتنی بھی ہدایات یا

اقدار دی ہیں خدا نے ان کے مطابق دنیاوی معاملات کو حل کرنا۔ میں نے تو اپنے الفاظ میں نثر میں بات کی ہے اور اقبالؒ تو اپنے انداز میں بہت خوبصورت بات کہہ جاتا ہے اور بڑی جامع کہہ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے دین کا مقصد کیا ہے' مومن کی زندگی کا مقصد کیا ہے' قرآن کا مقصد کیا ہے۔ مقصد ہے

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

دین کی چابی سے دنیا کے ہر تالے کو کھولنا۔

ہمارے ہاں تو دین کی چابی دنیا کے دروازے کو کھولنے کے لیے استعمال ہی نہیں ہوئی

دیکھتے ہیں کیسا جامع ہے انداز اس شخص کا۔ یہ ہے فراستِ مومنانہ جو اس شخص کو حاصل ہوئی تھی۔ کہنے کا اسلوب بھی خدا نے ایسا دیا تھا۔

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

بات ختم ہوگئی۔ تو آپ سوچئے کہ اگر ہم اس چابی کو محراب و مسجد پہ ٹانگے رکھیں تو دنیا میں کوئی تالا کھل سکے گا۔ کھولنے کی ضرورت ہی نہیں وہ تو کہہ دیا کہ یہ دنیا تو کفار کے لیے ہے' لعنت ہے' قید خانہ ہے۔ اس سے تو جتنا دور رہا جائے اس سے خدا کا تقرب حاصل ہوتا ہے۔ مومن تو بھاگتا ہے اس سے۔ وہ کہتا ہے کہ دین کی چابی ملی اسی لیے ہے کہ دنیا کا ہر تالا اس سے کھولا جائے۔ اور جب وہ دین کی چابیوں سے تالے کھولے جاتے ہیں تو پھر تالے توڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ افراد یا قومیں پھر تالے توڑتی اس لیے ہیں کہ ان کے پاس دین کی چابی نہیں ہوتی۔ یہ ہے جو قرآن کہتا ہے' یہ عذاب تمہارے ہاتھوں سے انہیں آتا ہے اور عذاب یہ خدا کا کہا گیا ہے۔ اور یہ جو قَاتِلُوْهُمْ ہے جنگ کروان کے ساتھ۔ یعنی اس جنگ کے متعلق بھی تو آپ کو معلوم ہے اس سے پہلی سورۃ کے اندر وہ ہے نا کہ اس جنگ کے اندر کمانیں تمہاری تھیں ان میں' تیر ہمارے چل رہے تھے۔ تمہارے تیروں کے ساتھ ہماری قضائیں لپٹی ہوئی چلی جارہی تھیں۔

دین خداوندی کی حکمرانی انسانوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتی ہے

اب دیکھتے ہیں کہ خدا اور بندے کا تعلق کیا یہاں بتایا گیا ہے۔ خدائی فیصلوں کا نفاذ' اجراء' ظہور انسانوں کے ہاتھوں سے چلے ہوئے تیروں کے ذریعے ہوتا ہے۔ غالب نے جو کہا ہے' وہ بھی جیسا میں کہا کرتا ہوں نعت میں مثال نہیں ملتی اس شعر کی۔

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است

خدا کے فیصلوں کا تیر ٹھیک ہے خدا کے ترکش میں ہوتا ہے

اما کشودِ آں ز کمانِ محمدﷺ است

وہ تیر محمدﷺ کی کمان میں آتا ہے تو پھر چلتا ہے' ورنہ ترکش میں رہ جاتا ہے۔

کیا گم ہوئی ہے چیز یہاں۔ وہ تیر اور ترکش تو خدا کا گم نہیں ہوتا وہ تو ہے' محمدﷺ کی کمان گم ہو چکی ہوئی ہے' چلتا نہیں ہے تیرِ قضاء۔ وہ ہے کمان جو دین دیتا ہے آپ کو۔ مومن کے ہاتھ میں یہ کمان ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ کہا قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ (9:14) لاؤ اپنی کمانیں تا کہ خدا انہیں عذاب دے بِاَيْدِيْكُمْ (9:14) تمہارے ہاتھوں سے۔ وہ براہِ راست عذاب دے نہیں سکتا؟

لفظ توبہ کا بنیادی مفہوم اپنی روش زندگی کے بدلنے کا نام ہے اس لحاظ سے اس کا مفہوم قابل غور ہے

یہاں تو نظام ہی ایسا اس نے بنایا ہے کہ عذاب خداوندی انسانوں کے ہاتھوں سے ظہور میں آتا ہے۔ اور اسی طرح سے پھر عز و شرف کے مقامات خدا دیتا ہے' انسان اپنے ہاتھوں سے اسے حاصل کرتا ہے۔ میں نے اس لیے کہا ہے کہ وہاں بھی جو آیا ہے کہ دیکھتے نہیں ہو کہ یہ کس طرح سال میں ایک دو مرتبہ کتنی بڑی مصیبت میں پھنستے ہیں۔ اور پھر بھی آ گئے' جو یہ لوگ کہتے ہیں کہ توبہ نہیں کرتے۔ بات یہ ہے مصیبت میں انہیں کے ہاتھوں سے ہوگا۔ ''توبہ نہیں کرتے'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تسبیح نہیں پھیرتے اس کے بعد۔ اپنی روش سے باز نہیں آتے اس کے بعد۔ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (9:126) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پھر وہ دل کی ضربیں نہیں لگاتے جس کو ذکر کہتے ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہے نا اب ذکر کے معنی کیا ہیں۔ پہلے تو صرف خانقاہوں میں ہوا کرتا تھا اب مسجدوں میں بھی عشاء کے بعد ہوتا ہے۔ بات سمجھتے نہیں ہیں یہ۔ وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ (9:127)۔

قتال کے متعلق جنگ کے متعلق کوئی حکم نازل ہوتا ہے تمہاری مجلس میں یہ بیٹھے ہوتے ہیں اس وقت۔ کیفیت کیا ہوتی ہے؟ یہ اپنے گروہ کے لوگوں کی طرف یوں دیکھتے ہیں کن انکھیوں سے اور خاموشی سے ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے چہرے کے تغیرات سے کچھ پردہ چلمنی سا ہو رہا ہے' کسی نے بھانپ تو نہیں لی یہ بات تمہاری۔ کیا بات ہے صاحب!!۔ کسی کو محسوس تو نہیں ہو گیا کہ اس حکم کے نافذ ہونے سے تمہاری قلبی کیفیت کیا ہوئی ہے جس کے آثار تمہارے چہرے سے نمایاں ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ قابو رکھو اپنے آپ پہ' پتہ نہ چلنے پائے تمہارے چہروں سے بھی کہ ان احکام کے نزول سے تم پہ کیا گذرتی ہے۔ یہ یہاں کرتے ہیں تو اس کے بعد ثُمَّ انْصَرَفُوْا (9:127) اور پھر اس کے بعد اس راستے سے پھر جاتے ہیں۔ یہاں پھر ایک آیت بڑی اہم آ گئی ہے تقدیر کے متعلق۔ ثُمَّ انْصَرَفُوْا (9:127) کہ منافق یہ کچھ بھانپتے ہیں اور دیکھتے ہیں اور اس کے بعد پھر ایک طرف کو نکل جاتے ہیں۔

خدا کی طرف سے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے کا حقیقی مفہوم اور تقدیر کے مفہوم کی وضاحت

اس کے بعد ہے صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (9:127) خدا ان کے دلوں کو پھیر دیتا ہے' یہ لفظی ترجمہ ہے۔ آپ دیکھیں گے ہمارے ہاں قرآن کس طرح سے Quote ہوا کرتا ہے' کس طرح سے قرآن پیش کیا جاتا ہے عام طور پر۔ یہ چیز کہ خدا کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہلتا سب کچھ وہی کرتا ہے۔ اور پھر بڑے زور شور سے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (2:7) ان کے دلوں پہ مہر لگا دیتا ہے' وَتُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ (7:155) وہی گمراہ کرتا ہے وہی ہدایت دیتا ہے۔ ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے یہ ساری چیزیں ہیں۔ یہ ہیں قرآن کے الفاظ۔

خدا دلوں پر مہریں کیوں لگاتا ہے' کس طرح لگاتا ہے' اس کی وجوہات کیا ہیں؟ اور اس کا علاج کیا ہے

لیکن میں عرض کروں کہ یہ قرآن کس طرح سے تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ تقدیر کے متعلق ان کے ہاں بڑی بڑی کتابیں بھی لکھی ہوئی ہیں' ان کے ہاں وعظیں بھی کہی جاتی ہیں۔ بات اتنی کہی جاتی ہے کہ دیکھئے صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (9:127) اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو پھیر دیتا ہے صاحب' سب کچھ خدا کرتا ہے اس کے حکم سے سب کچھ ہوتا ہے' انسان مجبورِ محض ہوتا ہے۔ جب کسی کے سامنے یہ دو لفظ رکھ دیے جائیں صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (9:127) وہ تو ٹھیک ہے معنی اس کے یہی ہیں خدا پھیر دیتا ہے ان کے دلوں کو۔ لیکن ایک لفظ پہلے دیکھ لیا جائے اور دو لفظ اس کے بعد دیکھ لیے جائیں یعنی آیت پوری دیکھ لی جائے تو اس کے بعد دیکھئے جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں کس طرح سے اس کے الٹ یہاں کہا گیا ہے۔ ثُمَّ انْصَرَفُوْا (9:127) اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہے یہ سب کچھ سننے کے بعد منافقت کی یہ کیفیت احتیاط برتتے ہیں کہ کوئی بھانپ نہ لے۔ اور اس کے بعد یہ کسی دوسرے سائیڈ کے اوپر نکل جاتے ہیں راہِ راست کو چھوڑ کے۔ اور کہا یہ کہ جو یہ کرتا ہے صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (9:127) نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل ہی پھر جاتے ہیں ادھر سے۔ یہ تو پہلی آیت کے ساتھ ہے ثُمَّ انْصَرَفُوْا (9:127) یہ خود پھرتے ہیں' ان کے اپنے پھرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ایکشن ان کا صرف طبعی نہیں ہوتا کہ جسم ان کے پھرتے ہیں۔ جو شخص خود پھر جاتا ہے خدا کے قانون کے مطابق' اس کا دل پھر جاتا ہے۔ اور آگے ہے بِاَنَّهُمْ (9:127) کیونکہ۔ یہ دیکھئے قرآن کا انداز۔ پہلے کہا ثُمَّ انْصَرَفُوْا (9:127) کہ یہ خود اس طرح سے پھرتے ہیں لفظ ہی صَرَفَ ہے۔ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (9:127) نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ خدا کا قانونِ مشیت پھر ان کے دلوں کو پھیر دیتا ہے۔ کیوں پھیر دیتا ہے؟ بِاَنَّهُمْ (9:127) قرآن تو عجیب چیز ہے عزیزانِ من! کہیں کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتا۔ یہ اس لیے بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (9:127) یہ وہ لوگ ہیں جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ اور جو بھی عقل و فکر سے کام نہیں لیتا پھر اس کا دل صحیح راستے پہ رہتا ہی نہیں ہے

پھر سمجھ سوچ کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جسے کہتے ہیں دلوں پہ مہریں لگ جاتی ہیں' آنکھوں پہ پردے پڑ جاتے ہیں۔ بِـاَنَّھُـمْ قَـوْمٌ لَّا یَـــفْــقَھُـــوْنَ (9:127) کیونکہ یہ قوم وہ ہے جو عقل وفکر اور تفکر اور علم اور بصیرت سے کام نہیں لیتی۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے اس چیز کا۔ بِـاَنَّھُـمْ (9:127) بتا دیا ہے کہ یہ نتیجہ کس چیز کا ہے۔ تو جو قوم بھی عقل وفکر سے کام نہیں لے گی' اس کی یہی کیفیت ہو جائے گی۔ ان کے دل پھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ سیدھے راستے کے اوپر دل آتے ہی اس طرح سے ہیں کہ دل سے سمجھنے کا کام لیا جائے آنکھوں سے دیکھنے کا کام لیا جائے' کانوں سے سننے کا کام لیا جائے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو یہاں تو صرف اتنا ہی کہا ہے کہ دل پھرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ بتا دیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے وَ لَـقَدْ ذَرَاْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (7:179) تم دیکھو گے بہت سے لوگوں کی حالت کو ان کی کیفیت زبانِ حال سے کہہ دیتی ہے کہ ان کی زندگی جہنم کی ہے۔ کیسے پتہ چل گیا کہ جہنم کی زندگی ہے۔ لَھُـمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا وَ لَھُـمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَ لَھُـمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا (7:179) ان کی کیفیت یہ ہے کہ آنکھیں رکھتے ہیں دیکھنے کا کام نہیں لیتے' کان رکھتے ہیں سننے کا کام نہیں لیتے' دل رکھتے ہیں اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ (7:179) یہ انسان ہیں؟ یہ تو حیوان ہیں بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (7:179) ان سے بھی گئے گذرے ہیں۔ حیوان پھر بھی اپنی جبلتوں سے تو کام لیتا ہے۔ یہ کیفیت بتائی ان کی کہ عقل وفکر اور معلومات حاصل کرنے کے لئے ان سے کام نہیں لیتے' پھر مائنڈ یا قلب جو فیصلے کرتا ہے سمجھتا ہے سوچتا ہے اس سے کام نہیں لیتے۔ کہا کہ ان کی زندگی بتا رہی ہے کہ یہ جہنم والے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ یہ دل یوں پھرتے ہیں بِـاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَـفْـقَھُـوْنَ (9:127) جو قوم بھی تفقہ سے کام نہیں لے گی غور وفکر سے کام نہیں لے گی اس کی کیفیت یہی ہوگی۔ لہٰذا تو صحیح راستے پہ چلنے کے لیے پہلے قرآن کے حقائق کو سمجھنا ضروری ہے' سمجھنے کے لیے آپ کو عقل وفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اور جو یہ نہیں کرے گا نہ وہ راستے کے سائن پوسٹ پڑھ سکے گا نہ وہ صحیح راستے پہ چل سکے گا۔ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ (9:127)۔

یہاں نہ پہلے اِنْصَرَفُوْا ہوتا ہے نہ بعد کے دو لفظ ہوتے ہیں۔ صَرَفَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ 9:1270) والی بات کہ اللہ ان کے دلوں کو پھیر دیتا ہے صاحب۔ یہ ان کی کیفیت تھی۔

قوم کی قیادت کرنے والی شخصیت کے کردار کی علامت

لَـقَـدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ (9:128) حالانکہ کیفیت یہ ہے۔ آخری آیتیں آ گئیں عزیزانِ من! اور میں عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآنِ کریم میں آخری آیتوں کے اندر وہ اس کا تت نکال کے رکھ دیتا ہے۔ کہا کہ یہ کیفیت اس قوم کی۔ حالانکہ ان میں سے ہی مِّنْ اَنْفُسِکُمْ 9:1280) انہی میں سے ایک رسول ﷺ آ گیا۔ اور رسول ﷺ کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی جابر مستبد حاکم نہیں ہے' کوئی

ڈکٹیٹر نہیں ہے۔کیفیت اس کی یہ ہے کہ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (9:128) ذرا سا کانٹا تمہارے پاؤں کے تلوے میں چبھتا ہے تو اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔تمہاری ہر تکلیف اس پر شاق گذرتی ہے۔ جسے آپ کہیں گے کہ قوم کی قیادت جس کے حصہ میں آتی ہے اس کی پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ ان افراد میں سے کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھے' کسی کو ذرا سی تکلیف بھی ہو تو وہ تڑپ اٹھے' وہ اس سے زیادہ محسوس کرے۔ بے حد گراں گذرتی ہے اس پہ تمہاری ہر تکلیف۔ یہ چیز تو صرف منفیانہ ہی ہے' تمہاری تکلیف اس پہ بے حد گراں گذرتی ہے۔حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ (9:128) شدت سے یہ آرزو رکھتا ہے کہ دنیا بھر کی منفعتیں کسی طرح تمہارے حصے میں آجائیں۔ یہ مثبت پہلو آ گیا۔تمہاری ہر تکلیف سے اس کی کیفیت یہ ہے کہ راتوں کو سو نہیں سکتا۔ساری زندگی اس تگ و دو میں گذار دیتا ہے کہ کسی طرح سے تمہیں زیادہ سے زیادہ خوشحالیاں' فارغ البالیاں' سرفرازیاں' شادابیاں میسر آجائیں۔اس کی زندگی اس چیز کے لیے وقف ہے۔ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (9:128) اور پھر جو اس کی بات مانتا ہے اس کے کہنے کے مطابق چلتا ہے اس کے ساتھ رؤف رحیم۔ آپ دیکھتے ہیں یہ صفاتِ خداوندی ہیں رؤف بھی رحیم بھی۔

کائنات کو پیدا کرنے کا مقصد صفات خداوندی کا محسوس پیکر میں سامنے آنا ہے

میں نے یہ عرض کیا ہوا ہے کہ قرآنِ کریم جو نظام دیتا ہے' جن تصورات پر یہ ایمان لانے کے لیے کہتا ہے' ان کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اندر علیٰ حدِ بشریت خدا کی صفات کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ خدا کی یہ صفات حدود فراموش ہوتی ہیں کیونکہ وہ خود Infinite ہے۔انسان تو لامحدود نہیں ہے یہ محدود ہے۔صفات خداوندی انسان کے اندر حدِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے منعکس ہوتی چلی جاتی ہیں' ان کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔یاد رکھئے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے' اس ذات میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ خدا کی صفات منعکس کرلے اپنے اندر' حدِ بشریت تک وہ صفات اس کے اندر پیدا ہوتی چلی جائیں۔اور یہ پہچاننے کے لیے کہ میری ذات کی نشوونما ہو رہی ہے یا نہیں' کس حد تک ہو چکی ہے۔اس کا پہچاننے کا معیار یہ ہے کہ یہ دیکھے کہ میری ذات میں صفاتِ خداوندی کس حدِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے پیدا ہو چکی ہیں۔جتنی یہ زیادہ پیدا ہوتی چلی جائیں گی' اتنا ہی یہ سمجھا جائے گا کہ فی الواقعہ میں نے اس نظام پہ عمل کیا ہے' اتنا ہی یہ سمجھا جائے گا کہ فی الواقعہ میری ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔اور پھر ان صفات کا ظہور دنیاوی معاملات کے اندر ہوگا۔خدا کی ان صفات کا ظہور بھی اس کائنات میں ہوتا ہے۔

دراصل مومن کی ذات علیٰ حدِ بشریت صفات خداوندی کا ہی عکس ہوتی ہے

یہ محسوس کائنات پیدا اس لیے ہوئی ہے کہ صفاتِ خداوندی کا ظہور ان محسوس پیکروں کے اندر آ کے ہو۔تا کہ یہ دیکھا جاسکے خدا کی

خالقیت مخلوق کے ذریعے سے سمجھ میں آ سکتی ہے' اس کی ربوبیت یہ جو اشیائے کائنات ہمارے سامنے ہیں ان کی رو سے سمجھ میں آ سکتی ہے' اس کی رزاقیت کا ظہور اسی طرح سے ہوتا ہے نا کہ رزق کے وسائل اور رزق کا سامان اس نے اس طرح سے پیدا کر رکھا ہے۔ اس کی صفات کا ظہور محسوس کائنات کے اندر ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اگر انسان کے اندر اس کی صفات منعکس ہوتی ہیں ان کا ظہور انسانی معاشرے کے اندر ہوگا' خانقاہوں کے زاویوں کے اندر نہیں ہوگا' پہاڑوں کی غاروں میں نہیں ہوگا۔ دین کی تو ضرورت ہی اس وقت پڑتی ہے جب کسی انسان کا معاملہ دوسرے انسان سے پڑے۔ کوئی شخص جو ساری عمر کسی جنگل میں اکیلا بسر کرے اس کے لیے سوال ہی نہیں کفر و ایمان کا' اس کے لیے اعمالِ صالح کا بھی سوال نہیں ہے۔ یہ سارا تصور رہبانیت کا ہے۔ اور وہ تصور یہ ہے کہ مقصدِ زندگی انسان کا اپنی ذات کے لیے Salvation یا نجات حاصل کرنا ہے۔ اور وہ اسی طرح سے تخلیوں میں' خلوتوں میں' زاویوں میں' تکیوں میں' غاروں میں' پہاڑوں میں' دنیا کے جمگھٹوں سے الگ ہو کر خدا کی یاد میں مصروف ہوتے چلے جانا۔ بدھا کو نروان حاصل ہوتا تھا' ہندو کو اسی بن باس کے اندر خدا کے ہاں کی بدھی ملتی ہے' عیسائیت میں کوٹھڑیوں میں ان کے راہب Saints بنتے ہیں' اب انہی کے تتبع میں آپ کے ہاں بھی ان زاویوں میں تصوف گاہوں میں مقربینِ بارگاہِ خداوندی چلتے ہیں۔ یعنی جتنے مخلوق سے کٹتے چلے جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں اتنے ہی خدا سے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ قربِ خداوندی کا تو معیار یہ تھا کہ تم میں خدا کی صفات کتنی پیدا ہوتی ہیں اور صفاتِ خداوندی کا ظہور انسانوں کی دنیا میں رہتے ہوئے ہوتا ہے۔ خدا خود اپنی صفات کا ظہور اس محسوس اور طبعی کائنات کے اندر کرتا ہے انسانوں کی دنیا میں کرتا ہے۔ بات پھر وہی آ گئی جو میں نے پہلے کہی تھی کہ دین کے معنی یہ ہیں یا ایمان کے معنی' قرآن کے معنی یہ ہیں کہ

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

دین کی چابی سے دنیا کے دروازے کھولنا۔

چابی کو لیے پھریے اگر آپ دنیا سے الگ ہٹ گئے ہیں' کیا فائدہ اس چابی کا' وہ آہستہ آہستہ زنگ آلود ہو جاتی ہے پھر تمہارا اپنا دروازہ بھی نہیں کھلتا اس سے۔

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (9:128) دونوں صفتیں خداوندی ہیں' رؤف بھی رحیم بھی۔ یہاں رسول کی صفت بتائی گئی ہیں۔ ہر مومن کی یہ صفت ہو سکتی ہے' ہونی چاہیے اُسے رؤف بھی ہونا چاہیے' اسے رحیم بھی ہونا چاہیے۔ یہ انداز عجیب ہے حالانکہ معنی ان دونوں کے نہایت نرم طریقے سے حسبِ حال تقاضے کے مطابق نشو و نما کرنا۔ ان دونوں میں یہ پہلو ہوتے ہیں۔ رافت اور رحمت تو آپ بھی سمجھتے ہیں دونوں میں ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ لیکن ہے عربی زبان میں مرادف ایسا ہوتا ہی نہیں کہ دو لفظ ایسے ہوں جن میں معنویت کے اعتبار

سے کوئی فرق ہی نہ ہو۔فرق بڑا خفیف سا ہوتا ہے Shade ہوتی ہے اس میں۔رافت ہوتی ہے کسی خطرے سے کسی کو محفوظ رکھنا' نہایت نرم طریقے سے۔

عربی زبان میں مرادفات کی اہمیت اور پھر خدائی صفت رؤف کا ذکر رحمانیت سے پہلے لانے کی وضاحت

نرمی اس میں بھی ہوتی ہے لیکن اس میں خطرات سے حفاظت ہوتی ہے جیسے جنین کی رحمِ مادر میں حفاظت ہوتی ہے ہر بیرونی خطرے سے۔یہ خدا کی صفتِ رؤف ہونے کا مظہر ہے' یہ رافتِ خداوندی کہلاتی ہے۔اور رحیمیت یہ ہے کہ اس کی پھر نشوونما کی جائے تاکہ وہ بڑھے پھولے پھلے' جنین کی رحم کے اندر جو نشوونما ہوتی ہے۔رحمت تو رحم سے ہے جو میں نے عرض کیا تھا۔تو پہلی صفت رؤف آئی ہے دوسری صفت رحیم آئی ہے۔اور رافت کا تو رحمت سے پہلے ہونا ضروری ہے۔جب تک آپ کی خطرات سے حفاظت نہیں ہوگی' نشوونما کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔اس رحم کے اندر بچے کو پہلے تو ہر قسم کی بیماری سے' ہر قسم کے خطرے سے محفوظ رکھنا ضروری ہوگا نا۔جب وہ محفوظ رہے گا تو پھر اس کی نشوونما کا سوال پیدا ہوگا۔

نبی اکرم کی 13 سالہ مکی زندگی صفت رافت کا ہی مظہر تھی

رؤف اور رحیم میں رؤف پہلے آیا ہے رحیم بعد میں آیا ہے۔اور رسول ﷺ کی یہ صفتیں بتائی گئی ہیں۔کس طرح آپ رسول ﷺ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں رؤف بنے ہوئے اپنی امت کی حفاظت کرتے رہے۔اس طرح رافت کے ساتھ رحمت کا ظہور ہوتا چلا گیا۔یہ ہیں صفاتِ خداوندی۔اور یہ دونوں ہی چیزیں جو کہا ہے کہ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ (9:128) تمہارے ساتھ اس کے جب معاملات پڑیں تو اس کی کیفیت یہ ہوئی تمہاری ہر مصیبت اس پہ سخت گراں گذرتی ہے' تمہاری ہر منفعت کے لیے وہ بڑا ہی حریص رہتا ہے' تمہارے لیے وہ رؤف بھی ہے وہ رحیم بھی ہے۔کہا سوچو تو سہی ایسا رسول ﷺ ملے ایسی تعلیم ملے اور اس کے بعد بھی تم گریز کی راہیں تلاش کرو۔

کہا ان سے کہدو کہ فَاِنْ تَوَلَّوْا (9:129) اگر اس کے باوجود یہ تم سے گریز کی راہیں تلاشتے ہیں' پیٹھ پھیر کے چلتے ہیں' تمہاری رفاقت قبول نہیں کرتے۔تو یہ یہ نہ سمجھ لیں کہ تم جو ان کے ساتھ اس قدر شفقت رافت اور رحمت سے پیش آتے تھے تو اس سے کوئی اس کا اپنا مقصد تھا۔اپنا مقصد اس کا کوئی نہیں تھا۔اگر اس کے باوجود یہ تم سے پھر جاتے ہیں' ساتھ نہیں دیتے۔تو ان سے کہو فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ (9:129) ان سے کہدو کہ میرے لیے خدا کے قانون کی اطاعت کافی ہے۔لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (9:129) اس کے سوا اس کائنات کے اندر کسی اور کا اقتدار میں تسلیم نہیں کرتا' کوئی صاحبِ اقتدار اور صاحبِ اختیار نہیں ہے' اقتدارِ کُلی اسی کے قانون کو حاصل ہے۔

میرے لیے وہ کافی ہے' حفاظت کے لیے بھی کافی ہے' میری منفعتوں کے لیے بھی وہ کافی ہے۔لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ (9:129) میرا پورا بھروسہ اس کے قوانین کی محکمیت کے اوپر ہے کہ ان کا اتباع کرنے سے' وہ نتائج نکل کے رہیں گے کہ جو نتائج اس نے کہے ہیں۔حفاظت بھی ہوگی میری' کامیابیاں بھی مجھے نصیب ہونگی۔اس لیے کہ جسے میں نے کہا ہے صاحبِ اقتدار و اختیار' اس کی کیفیت تو یہ ہے کہ وَ ھُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ (9:129)

عرش یا تخت آپ کو معلوم ہے Symbol ہوتا ہے حکومت کا اقتدار کا' اختیار کا۔اس سے مراد سچ مچ کا کوئی تخت نہیں ہوتا لکڑی کا یا تختِ طاؤس جواہرات کا۔جب تختہ الٹتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں' اقتدار ختم ہوا۔تختِ حکومت کے معنی ہوتے ہیں حکومت کے اقتدارات اور اختیارات۔عربی زبان میں بھی یہ لفظِ عرش جو ہے انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔صاحبِ اختیار وہ صاحبِ اقتدار۔اب اس میں ایک طرف تو دیکھئے کہ تصور کی رو سے عرش جب ذہن میں ہمارے آتا ہے تو بلند ترین مقام کا تصور ذہن میں آتا ہے۔اور اس کے ساتھ جو عظیم کا لفظ ہے اگرچہ ہمارے ہاں تو عظمت اور عظیم بزرگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔یہ تو عظم ہے جس کے معنی ہیں وہ بنیادی ڈھانچہ' اس کے معنی ہوتا ہے جسم کی بنیادی ہڈیاں جن میں یہ گوشت پوست رگیں اعصاب' یہ سب کچھ اس کے اندر آتا ہے۔تو ہر بنیادِ محکم کو ان کے ہاں عظیم کہتے ہیں۔تو آپ دیکھئے کہ بلندیوں کی طرف عرش کا لفظ آ رہا ہے' بنیادی اعتبار سے عظیم کا لفظ آ رہا ہے۔اس کا اقتدار زندگی کی محکم بنیادوں سے لے کے انتہائی بلندیوں تک اسی کا اقتدار چھایا ہوا ہے۔اتنا بڑا صاحبِ اقتدار۔اگر اس کا قانون اور اس کی نصرت میرے ساتھ ہے تو اس کے بعد مجھے کسی اور کی پرواہ کیا ہے۔میرا اس پہ کامل بھروسہ ہے حَسۡبِیَ اللّٰہُ (9:129) وہ میرے لیے کافی ہے۔یہاں یہ اس نے کہا ہے کہ حَسۡبِیَ اللّٰہُ (9:129) میرے لیے کافی ہے۔ٹھیک ہے خدا ہی کفایت کرتا ہے' یہ خدا کیسے کفایت کرتا ہے۔

دوسرے مقام پہ سورۃ عنکبوت میں کہا گیا ہے کہ ان سے پوچھو کہ کیا یہ چیز کافی نہیں ان کے لیے کہ اس نے قرآن جیسی کتاب تمہیں دیدی ہے (29:51)۔قرآن ہے جس کی وجہ سے کفایت کرتا ہے خدا۔کیا یہ قرآن کافی نہیں ہے۔عزیزانِ من! کتنے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ غیروں نے تو کیا کہنا تھا خود مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والا یہ کہتا ہے کہ نہیں یہ اکیلا کافی نہیں ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ یہ چیز جو ہے حَسۡبُنَا کِتٰبُ اللّٰہِ کس نے کہی تھی؟ وہ جو قرآن کے ان الفاظ پہ نگاہ رکھتا تھا۔یہ خود خدا نے کہا ہے کہ کیا یہ چیز ان کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم نے قرآن نازل کر دیا ہے۔یہ حضرتِ عمرؓ نے کہا تھا کہ حَسۡبُنَا کِتٰبُ اللّٰہِ۔بڑی عظیم حقیقت کا اعلان ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی وفات ایک عظیم حقیقت کی ترجمانی ہے

جب نبی اکرم ﷺ دنیا سے جا رہے ہیں تو یہ عظیم حقیقت تھی جس کا اعلان قرآن نے کہا ہوا ہے کہ کیا ہوا یہ رسول ﷺ اگر کل کو وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ (3:144) تو کل کو اگر یہ تم میں نہ رہے، یہ ایک طبعی انسان ہے، طبعی عمر ہے، زندہ ہے اور موت بھی آئے گی۔ تو کیا تم سمجھو گے کہ دین تو سارا وابستہ تھا اس کی شخصیت اور ذات کے ساتھ، یہ نہیں رہا تو پھر تم اپنے پچھلے نظامِ کہن کے اوپر، پچھلی روش کے اوپر پلٹ جاؤ گے کہ بس وہ دین والا تو ختم ہوا۔ کہا ایسا جو کرے گا اپنا نقصان کرے گا۔ اس دین نے تو چلنا ہے قیامت تک کے لیے۔ تو کیا چیز تھی جو رسول ﷺ کے بعد باقی رہ گئی تھی۔ وہ یہ کتاب تھی جس کے مطابق رسول ﷺ چلاتا تھا، جس کے مطابق اس ﷺ کے بعد بھی اس امت کو چلنا تھا۔ تو یہ جو چیز تھی کہ رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لیے جا رہے ہیں تو حضرت عمرؓ نے یہ بات کہی، کوئی بات نہیں یہ تو خود خدا نے کہہ رکھا تھا کہ آپ ﷺ نے ایک دن ضرور اس دنیا سے جانا ہے۔ جا رہے ہیں تو اس سے کمی نہیں واقع ہوتی، خدا کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے وَهُوَ حَسْبُنَا وہ کافی ہے ہمارے لیے۔

میرے خلاف جو کفر کا فتویٰ لگا تھا ہزار علمائے کرام کا۔ اس میں کہا یہ گیا تھا کہ یہ وہ شخص ہے جو کہتا ہے حَسْبُنَا كِتٰبُ اللّٰهِ ۔ کفر کا فتویٰ لگ رہا ہے آج یہ کہنے والے کے لیے کہ حسبنا کتاب اللہ۔ جس کے لیے خود خدا نے کہا تھا کہ یہ کیا ان کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم نے قرآن اتار دیا تھا؟ اب قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل کچھ اور مثلہ معہٗ قرآن کافی نہیں ہے۔ اور جب پھر مثلہ معہٗ آیا قرآن کے باہر کچھ اس کے ساتھ تو پھر اس کی تو حد ہی نہیں، آتا چلا جا رہا ہے۔

خالق کائنات کی طرف سے ایک اہم سوال کہ کیا قرآن تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟

اس کے بعد جو آنا نہیں تھا کچھ وہ تو یہی تھا نا جس نے وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:115) کہہ دیا مکمل ہو گئی خدا کی بات ساری اس کے اندر۔ تو پھر تو کسی اضافے کی ضرورت نہیں تھی۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا لہٰذا اس میں تبدیلی کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ تو اس کے ساتھ کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن مثلہ معہ اس کی مثل اس کے ساتھ۔

خدا علیم و خبیر کی طرف سے ہر دور کے آنے والے انسان کے لیے ایک کھلا چیلنج

قرآن نے کئی جگہ یہ چیز کہی ہے کہ اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ یہ انسان کی تخلیق ہے انسانی فکر کی تخلیق ہے تو لاؤ اسکی مثل ایک سورۃ بنا کے تو

تم لاؤ۔ چیلنج تھا یہ انسانوں کے لیے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی مثل انسان پیدا نہیں کر سکتا۔ اور وہاں کہا ہے کہ ان سے کہو تم ہی نہیں وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:23) سچے ہو تو جاؤ بلاؤ ساری دنیا کے ساتھی جتنے ہیں اکٹھے کر لو۔ کتنا بڑا چیلنج ہے۔ چودہ سو سال سے یہ چیلنج چلا ہوا آ رہا ہے۔ اس کی مثل نہیں تم لا سکتے۔ وہ چیلنج دے رہا ہے ساری دنیا کے انسانوں کو۔ اس کے خود ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ مثلہ معہ اس کی مثل اس کے ساتھ اس کے باہر اور کچھ بھی ہے۔ اب حسبنا کتاب اللہ کہنا کفر ہے۔ یہ کہا اس نے رسول ﷺ سے کہ کہہ دو کہ **حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ** (9:129)

اس صاحبِ اقتدارِ مطلق کے قوانین کے سامنے میں جھک رہا ہوں یہ کافی ہے میرے لیے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اس آیت پر سورۃ التوبہ کا اختتام ہوا اور اس کے بعد ہمارے سامنے سورۃ یونس آتی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)